ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ ج

حفاظتِ قرآن کے اعتبار سے سب سے اہم اعجاز

اعجاز القرآن
و
اختلافِ قرأت

از

جامع العلوم، محدث العصر علامہ تمنّا عمادی مجیبی پھلواروی

شائع کردہ

الرحمٰن پبلشنگ ٹرسٹ (رجسٹرڈ)

۲-۷-۱ے۔ بلاک نمبر ۱۔ ناظم آباد۔ کراچی ۷۴۶۰۰

فون: ۶۲۱۴۴۹

سلسلہ اشاعت (۲۵)

بار اوّل

ستمبر ۱۹۹۳ء ——— ربیع الثانی ۱۴۱۴ھ

نام کتاب ——— اعجاز القرآن و اختلافِ قراءت

مؤلف ——— علامہ تمنّا عمادی پھلواری

کتابت ——— کمپیوٹر کمپوزنگ

صفحات ۷۹۲

طباعت اوّل ——— گیارہ سو (۱۹۹۲ء)

قیمت کتاب ——— 256/ (۹۵۰/-) روپے

طابع ——— احمد پرنٹرز ناظم آباد

ناشر

الرحمٰن پبلشنگ ٹرسٹ (رجسٹرڈ)

۳-۷-۱ے- بلاک نمبر ۱ ناظم آباد۔

کراچی ۔۔ ۷۴۶۰۰ ۔

فون: ۶۲۱۴۴۹

فہرست مضامین

عنوان	صفحہ نمبر
"شاید آجائے کوئی آبلہ پا میرے بعد"	۱۰۸
اللہ کے دو دعوے	//
پہلا دعویٰ "لاریبیت"	۱۱۰
تواتر کی تعریف	۱۱۲
تواتر کی قسمیں اور قرآن مبین	۱۱۴
۱۔ تواتر اسنادی	//
۲۔ تواتر مکانی	۱۱۶
۳۔ تواتر زمانی	۱۱۷
۴۔ تواتر ذاتی	//
۵۔ تواتر اجزائی	۱۱۸
۶۔ تواتر تعلیم و تعلم	۱۱۲
۷۔ تواتر قرأت	۱۲۳
۸۔ تواتر کتابت	۱۲۴
جنگ بدر کے قیدیوں کا فدیہ	۱۲۶
اہل عرب اور صحابہؓ کی مہارت فن املا و انشاء	۱۳۱
۹۔ تواتر تلاوت	۱۳۳
۱۰۔ تواتر حفظ	۱۳۴
۱۱۔ تواتر دور	۱۳۶
۱۲۔ تواتر تدبر	۱۳۷
۱۳۔ تواتر استنباط	۱۴۰
ماحصل	۱۴۲
۱۴۔ تواتر مصنوعی کیا ہوتا ہے؟	//
قرآن مجید کا دوسرا دعویٰ	۱۴۷
اس دعوے کا واضح ثبوت	۱۴۹

عنوان	صفحہ نمبر

عنوان	صفحہ نمبر
ذمہ داری ذمہ دار کی قوت و قدرت کے مطابق ہونی چاہیئے	۲۱۳
حفاظت امتحانی و غیر امتحانی	۲۱۴
ایک تمثیل	״
حقیقت حال	۲۱۶
ابتدائی حملہ	۲۱۷
پہلی صدی کے بعد کے حملے	״
متعدد محاذوں کا قیام	۲۱۹
حصہ دوم: ۔ محاذ روایت	۲۲۳
قرآن کے خلاف دشمنان قرآن ملحدین کی منافقانہ سازشیں	۲۲۵
مسلمانوں میں تفرقہ پھیلانے کے لئے مختلف محاذوں کا انتخاب	۲۲۸
پہلا محاذ روایت سازی	۲۲۸
مثلہ ،معہ، والی روایت کی حقیقت	۲۳۱
وحی تشریعی صرف قرآن ہے	۲۳۲
احادیث کے لئے قرآن کریم معیار ہے	۲۳۳
سکوت قرآن	۲۳۵
منافقین کے مراکز	۲۳۶
مثلہ ، معہٗ کی روایت کا جائزہ	۲۳۷
طرق روایت	۲۳۹
قابل غور نکتہ	۲۴۱
متن حدیث	۲۴۳
بائیس (۲۲) طرق کے سلسلہ اسناد	۲۴۵
ابو رافع والی حدیث	۲۵۴
عرباض بن ساریہ والی حدیث	۲۵۵
جابر بن عبد اللہ والی حدیث	۲۵۷

عنوان	صفحہ نمبر

عنوان	صفحہ نمبر

حرف اول

علامہ تمنا عمادی کی ایک اہم تصنیف " اعجاز القرآن " جس کا زمانہ ہوا، پہلا حصہ اشاعت پذیر ہوا تھا اور باقی حصے منتشر مضامین کی شکل میں تھے، ان سب کو بسیار تلاش و جستجو کے بعد یکجا کر کے ایک جامع تصنیف کی صورت میں آپ کے سامنے پیش کیا جارہا ہے۔ کتاب کیا ہے قرآن کی حقانیت کے ثبوت کے طور پر ایک مکمل انسائیکلو پیڈیا ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ قرآن کس طرح تواتر زمانی و مکانی کے عمل سے گزر کر آج تک اپنی اصلی حالت میں موجود ہے۔ اس کے ثبوت میں مختلف عہود و ادوار کے ان مصاحف کی ایک جامع فہرست بھی پیش کی ہے جو اب تک موجو ہیں اور قرآن کا یہ دعویٰ کہ " انا نحن نزلنا الذکر و انا لہ لحافظون " اس کی حقانیت پر آج تک گواہ ہے۔ محاز جمع و حفظ قرآن پر مدلل بحث کی گئی ہے، محاز تفسیر کے میدان میں بعض آیات قرآنی کی غلط تفاسیر کی نشان دہی کی گئی ہے اور اس سلسلہ میں ایلاء النبیؐ کی وضعی داستانیں، واقعہ افک سے متعلق بعض نئے گوشوں کی نشان دہی، آیہ مباہلہ و تقیہ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کی وضعی روایتوں پر باطل شکن تبصروں سے حقیقت کے مہر عالم تاب کو طلوع کیا گیا ہے۔ نبی امی کے صحیح مفہوم کی وضاحت اور محاز قرأت کے سلسلہ میں زبان عربی پر نقطوں اور حرکات کی لیجاد کا جو فتنہ برپا کیا گیا ہے اور ساتھ ہی سبعہ قرأت کا جو افسانہ گھڑا گیا ان تمام محاذات پر بڑی سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حفاظت قرآن کے سلسلے میں جو اہم اعجاز پیش کیا جاسکتا تھا اس کو بڑے مدلل اور سائنٹفک طریقہ سے زیر بحث لایا گیا ہے۔

علامہ تمنا کی شخصیت محتاج تعارف نہ تھی۔ پھر بھی مرور زمانہ سے بہت سے گوشے ذہنوں سے محو ہوجاتے ہیں۔ کوشش کی گئی ہے کہ ان سے متعلق جو مواد میسر آسکتا تھا اس کو ایک جگہ جمع کر دیا جائے تاکہ تشنگان علم اپنی پیاس بجھا سکیں۔

آپ نے اندازہ کیا ہوگا کہ علامہ تمنا کی جتنی تصانیف اس ادارے نے شائع کی ہیں (مذاکرہ، جمع القرآن، انتظار مہدی و مسیح) ان میں مفتی محمد طاہر المکی کی تقدیم کو ایک خاص امتیاز حاصل رہا ہے۔ اس مرتبہ صاحب موصوف نے قرآن کی محفوظیت کے سلسلے میں جتنے حملے قرآن کے متن کو مشکوک بنانے کے لئے کئے گئے ہیں ان کا مدلل

جواب دیا ہے اور بتایا ہے کہ "اتنے حیرت انگیز اعجاز کے باوجود بعض شیطان صفت قوتوں اور دشمنان قرآن طبقوں نے قرآن کو محرف ثابت کرنے کی جدوجہد کو ہی اپنی جولانگاہ بنایا ہے حالانکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کی حفاظت کے پیش نظر اس کو تحریر و حفظ کا اعلیٰ اور جامع اصول مرحمت فرمایا یعنی قرآن کریم کی آیات کے نزول کے فوراً بعد کاتبان وحی سے کتابت اور اس کے حفظ اور ورد کی تلقین۔ چنانچہ اسی کتابت اور حفظ قرآن کا یہ کرشمہ ہے کہ کلام الہیٰ میں آج تک زیر زبر پیش تک کا بھی فرق نہیں پڑا، لیکن دشمنان قرآن کی شیطانی کاوشیں بھی جاری رہیں۔ اس سلسہ میں مفتی ممدوح نے مشہور شیعہ عالم اور محدث "حسین بن محمد تقی النوری الطبرسی" کی کتاب "فصل الخطاب فی تحریف کتاب رب الارباب" کا تعارف بھی کرایا ہے جس میں مصنف نے دو دعوے کئے ہیں ایک یہ کہ اصلی قرآن سترہ ہزار آیات پر مشتمل تھا جبکہ موجودہ قرآن میں ساڑھے چھ ہزار کے قریب آیات ہیں جس کی وجہ ان کے نزدیک یہ ہے کہ اس میں اہل بیت سے متعلق مدح و ستائش کی آیتیں اور متعدد صحابہ کرام سے متعلق تنقیص اور ذم و تنبیہہ کی آیات نکال دی گئی ہیں۔ اس طرح قرآن میں بڑے پیمانہ پر تحریف کی گئی ہے۔ دوسرے یہ کہ تحریف کے سلسلہ میں شیعوں کے ائمہ سے دو ہزار سے بھی زائد روایتیں منقول ہیں۔ ساتھ ہی ان مقامات کی نشان دہی کی گئی ہے جہاں یہ تحریف ہوئی ہے۔ لیکن ان دعاوی باطلہ کے باوجود ان کی اور ان جیسے بے شمار حریفوں کی تمام کوششیں ناکامی سے ہمکنار ہوئیں اور قرآن کریم اپنی حقانیت کے ساتھ آج بھی سربلند اور سریر آرائے جہاں ہے۔ اس کا یہ دعویٰ کہ "باطل نہ اس کے آگے سے آسکتا ہے اور نہ اس کے پیچھے سے" اور یہ کہ "ہم نے اس نصیحت والی کتاب کو اتارا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں" روز روشن کی طرح تاباں ہے اور حضرت علیؓ سے مروی ایک حدیث نبویؑ کے مطابق کہ "یہ (قرآن) وہ کتاب ہے جس سے اہل علم کبھی سیری محسوس نہیں کرینگے اور نہ اس کے عجائبات کبھی ختم ہوں گے" اہل علم اس سے مستفیذ ہو کر انسانیت کی خدمت میں مصروف ہیں۔

نظام الدین خان

تقدیم

از مفتی محمد طاہر مکی

بسم اللہ الرحمان الرحیم

قرآنی اعجاز کے یوں تو بیشمار پہلو ہیں، اور ہر پہلو ؎

کرشمہ دامن دل می کشدکہ جا اینجا است

کا مصداق ہے مگر سب سے عام فہم، سب سے آسان، سورج سے زیادہ واضح، اور ہر ملک، ہر قوم، ہر علاقے اور ہر زبان والوں کی ہر سطح کے اشخاص کی سمجھ میں آجانے والا معجزہ قرآن کریم کا محفوظ ہونا ہے۔

قرآنی فصاحت و بلاغت بلاشبہ معجزہ ہے مگر ظاہر ہے اس کا احساس انہیں کو ہو سکتا ہے جو عرب ہوں یا عربی داں ہوں اسی طرح قرآن کا اھدیٰ (سب سے زیادہ راہ ہدایت دکھانے والا) ہونا یقیناً معجزہ ہے، اس کے لئے عربی داں ہونے کی بھی شرط نہیں ہے۔ قرآنی ترجموں کے ذریعے اس حقیقت تک رسائی حاصل کی جاسکتی ہے مگر اس کا احساس بھی اسی کو ہو سکتا ہے جو فکری صلاحیتیں رکھتا ہو۔ اس کے برعکس ایسا معجزہ جس کا احساس عرب غیر عرب، عالم غیر عالم، دانشور و غیر دانشور، ہر سطح کے فرد کو بآسانی ہوسکے وہ قرآن کریم کا لا ریب فیہ ہونا اس کا محفوظ ہونا، اور مشرق سے مغرب تک، عرب سے عجم تک، بچے سے بوڑھے تک، اور مرد سے عورت تک لاکھوں افراد کے سینوں اور کروڑوں کاغذ کے صحیفوں میں، زبر زیر کی کمی بیشی کے بغیر اس کا یکساں ہونا ہے۔

تاریخ انسانیت کی ابتدا سے آج تک ، ایشیا، افریقہ اور یورپ ہو یا ان براعظموں کا کوئی سا ملک اور کوئی سی قوم ہو، پھر ان ممالک و اقوام کے مذہبی یا غیر مذہبی مشہور یا غیر مشہور کسی بھی قسم کے لیڈر اور مصلح ہوں اور ان لیڈروں اور مصلحوں کی کوئی کتاب خواہ نظم میں ہو یا نثر میں - پھر نظم و نثر کی وہ کتاب خواہ مختصر ہو یا ضخیم ہو --- مشرق کے ہندوؤں کی رامائن اور بھگوت گیتا سے لے کر زرتشتیوں کی اوستا تک، یہودیوں کی توراۃ و زبور داؤد اور امثال سلیمان سے لیکر انجیل کے مواعظ تک، یونان کی ایلیڈ اور اوڈیسی کے نظموں سے لے کر انگلینڈ کے شکسپیئر اور جرمنی کے گوئٹے تک، عربوں کے دیوان حماسہ سے دیوان متنبی تک اور فارسی کے دیوان حافظ سے اردو کے دیوان غالب تک بلکہ قرآن کریم کے مدعیانہ حریفوں میں شیعوں کی اصول کافی سے نہج البلاغہ تک اور بابیوں کی البیان سے بہائیوں کی اقدس تک دنیا میں نظم و نثر کی مذہبی غیر مذہبی کوئی کتاب ایسی نہیں جس کے ماننے والے اور عاشقوں میں اس کتاب کے حافظ ایک فیصد بلکہ ایک فی ہزار بلکہ ایک فی لاکھ بھی پائے جاتے ہوں جبکہ قرآن کریم کے ہزاروں بلکہ لاکھوں حافظ صحابہ کرام کے زمانے سے لے کر آج تک ہر دور، ہر علاقے اور ہر ملک میں ہوتے رہے ہیں اور آج بھی ہر شخص مسلم ہو یا غیر مسلم یہ صورت حال بچشم خود دیکھ سکتا ہے اور جب دل چاہے اس بات کا امتحان لے سکتاہے۔

قرآن کریم کا دنیا کی تمام کتابوں میں یہ وہ منفرد اعزاز ہے جس کی نظیر مل ہی نہیں سکتی - یہ وہ عام فہم اعجاز قرآن ہے جس کے لئے نہ پڑھا لکھا

ہونے کی ضرورت ہے ، نہ سوچ بچار اور غور و فکر کی ، یہی وجہ ہے کہ
حضرت علامہ تمنا عمادی نے معجزات قرآن میں سے اس معجزہ کا انتخاب
کیا اور حق یہ ہے کہ اس کا حق ادا کر دیا۔
اب اس تمام صورت حال کے دوسرے پہلو پر نظر ڈالئے تو تعجب ہوتا
ہے کہ اتنے حیرت انگیز اعجاز کے باوجود بھی شیطانی طاقتوں اور دشمنان
اسلام و دشمنان قرآن نے اس میں تحریف کرنے کی جدوجہد ترک نہیں
کی ۔ شیطانی قوتیں اس سے پہلے دنیا کے تمام مذاہب کی کتابوں میں تحریف
کرکے ان کی تعلیمات کو مسخ کر چکی تھیں اور اسلام سے قبل کے تمام
مذاہب کی بنیادی کتابیں تک اپنی اصلی شکل میں محفوظ نہیں رہی تھیں۔
یہ کوئی غیر ذمہ دارانہ یا مناظرانہ بات نہیں بلکہ تاریخی حقائق ہیں۔
یورپ اور امریکہ کی رگ جاں کو کنٹرول کرنے والے یہودیوں کی مذہبی
کتاب تورات کو لیجئے جو حضرت موسیٰ پر نازل ہوئی تھی مگر اس کے موجودہ
نسخے میں حضرت موسیٰ کی وفات کا ذکر بھی موجود ہے (استثنا باب ۳۴
آیت نمبر ۵) ظاہر ہے یہ حضرت موسیٰ کے بعد کسی نے اضافہ کیا ہے جس
میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں پھر کیا معلوم ہے کہ اور کس کس
مقام پر اس میں حک و اضافہ کیا گیا ہو ۔ سب جانتے ہیں کہ جب کسی
اسٹامپ میں کوئی ایک لفظ بھی مشکوک ہو جائے تو وہ سارا تمسک ہی
نامعتبر ہو جاتا ہے۔
مسیحی حضرات کی مذہبی کتاب انجیل کو دیکھ لیجئے ۔ مسیحی خود اپنے بقول
دنیا کی سب سے بڑی مذہبی جماعت ہیں ۔ ان کی کتاب انجیل اول تو

تورات کی طرح حضرت مسیح کی پیش کردہ ہی نہیں ہے۔ بعد والوں نے اپنی اپنی صواب دید کے مطابق حضرت مسیح کے حالات و ملفوظات جمع کئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مسیحیوں کے بقول سیکڑوں انجیلیں تھیں۔ ان میں سے چار انجیلوں کو مسیحی علماء نے منتخب کرکے مسیحی امت کے لئے بنیادی ماخذ قرار دے دیا ہے غور کیجئے کہ ایسی کتابوں اور مجموعوں کو الہامی کتاب قرار دیا جاسکتا ہے؟ یہ تو زیادہ سے زیادہ ہمارے ہاں کے مجموعہ ہائے احادیث کی طرح کے مجموعے ہیں جیساکہ شاہ ولی اللہ و مولانا عبیداللہ سندھی کا خیال ہے۔ پھر جس زبان میں یہ انجیلیں جمع کی گئی تھیں ان کے نسخے بھی موجود نہیں رہے۔ اب سارا مدار ترجموں پر ہے۔ ظاہر ہے ترجمے متن کے قائم مقام نہیں ہوسکتے۔ رات دن کا تجربہ ہے کہ مترجمین اپنے اپنے تعصبات و مالوفات اور اپنی علمی صلاحیتوں کے تفاوت کی بنا پہ کچھ سے کچھ ترجمہ کر دیتے ہیں۔ اگر اصل متن محفوظ ہو تو اس کی روشنی میں ترجموں کی تصحیح کی جاسکتی ہے لیکن متن ہی محفوظ نہ رہا ہو تو پھر ترجمہ کی صحت و عدم صحت کا کیسے پتہ چلایا جاسکتا ہے؟

ان تمام کتابوں کے برعکس قرآن مجید کے پیش کرنے والے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے پہلے دن سے ہی قرآن کریم حفظ کرانا شروع کردیا تھا بل ھو آیت بینات فی صدور الذین اوتو العلم ۲۹ / ۴۹ اور ہجرت سے قبل مکہ کی کس مپرسی کے زمانے سے ہی صحابہ کرام نہ صرف زبانی حفظ کرتے تھے بلکہ نازل شدہ قرآن کریم کے نسخے تحریری شکل میں بھی محفوظ کرتے تھے۔ اور یہ تحریر شدہ نسخے برائے تصحیح رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو صبح و شام سناتے بھی تھے تاکہ اس کی تحریر میں اگر کوئی غلطی رہ گئی ہو تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی تصحیح فرمادیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کا یہ طرز عمل اتنا مشہور تھا کہ مخالفین کو بھی اس کا اعتراف تھا۔ بس یہ فرق تھا کہ رسول اللہؐ اور صحابہ کے نزدیک قرآن کریم اللہ کا کلام تھا اور ان مخالفین کے نزدیک نعوذ باللہ رسول اللہ کا خود ساختہ تھا (وقالوا اساطیر الاولین اکتتبھا فھی تملی علیہ بکرۃ و اصیلا ۲۵/۵)

حضرت شاہ ولی اللہ کے صاحبزادے شاہ عبدالقادر صاحب اس آیت کے حاشیہ پر لکھتے ہیں" اول نماز کے دو وقت مقرر تھے صبح اور شام۔ مسلمان حضرت کے پاس جمع ہوتے اور جو قرآن اترا ہوتا لکھ لیتے یاد کرنے کو، اس کو کافریوں کہنے لگے" (بحوالہ حاشیہ علامہ شبیر احمد عثمانی)

اس حقیقت کو پیش نظر رکھتے ہوئے اب آپ خود غور فرمالیجئے کہ جب مکہ کے عسرت، تنگی، پریشانی اور کس مپرسی کے زمانہ میں حفظ و تحریر قرآن کے لئے اسقدر جدوجہد تھی تو مدینہ میں حکومت حاصل ہونے کے بعد اس کے لئے کیا کچھ انتظام نہ کیا گیا ہوگا؟ --- مزید یہ کہ قرآن کریم تو مسلمانوں کا دین و ایمان، قبلہ وکعبہ اور مرکز حیات تھا، اس کی تحریر و حفاظت کے لئے تو مسلمانوں کو یہ تگ و دو کرنی ہی تھی۔ قرآن مجید نے تو قرض کے عام لین دین کے لئے بھی تحریر کو ضرور قرار دیا اور تین جملوں میں تحریر کی وہ عظمت و اہمیت ظاہر کر دی کہ فن کتابت کی تاریخ کے ہزارہا سالوں میں اس سے بڑھ کر فن تحریر کی تعریف میں الفاظ نہیں ملتے

فرمایا ذلکم اقسط عند الله ۲ / ۲۸۲ اللہ کے نزدیک عدل و انصاف کے قیام کے لئے اس سے بڑھ کر انتظام ناممکن ہے ۔

۲- و اقوم للشهادہ کیوں کہ تحریر کی گواہی سے بڑھ کر کوئی گواہی نہیں

۳ ۔ و ادنی الا ترتابوا اور شکوک و شبہات کی الجھنوں سے بچنے کا بھی اس سے بہتر کوئی طریقہ نہیں ہے۔

فرمایئے! تحریر کی عظمت ظاہر کرنے کے لئے ان تین جملوں سے بڑھ کر کوئی چیز پیش کی جاسکتی ہے تو جب کچھ عرصہ کے لین دین کے لئے قرآن کریم تحریر کو اس قدر اہمیت دیتاہے تو قیامت تک کے ہدایت نامہ کے لئے تحریر کو اس نے اسقدر اہمیت دی ہو تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے مزید سنئیے قلم ، دوات اور تحریر کی عظمت قرآن کریم کے نزدیک اسقدر ہے کہ اس میں قلم اور دوات کی قسم کھائی گئی ہے (ن و القلم و ما یسطرون (٦٨ / ١) اور اللہ کی عظمت ظاہر کرنے کے لئے یہ نرالا انداز اختیار کیا گیاہے کہ تمہارا رب اکرم وہ ہے جس نے قلم کے ذریعے علم سکھایا- اور دوسروں تک علم پہونچانے کا ذریعہ قلم کو بنایا (اقرا و ربک الاکرم - الذی علم بالقلم علم الانسان مالم یعلم (۹٦ / ۳)

قرآن کریم کے حفظ و تحریر کے لئے اتنی غیر معمولی اور محیرالعقول محنتوں اور کوششوں کو دیکھئے اس کے بعد شیطانی قوتوں کی دیدہ دلیری دیکھئے کہ اس کے باوجود انہوں نے جمع قرآن کے متعلق افسانے گھڑ کے اور معانی قرآن کے متعلق تفسیری و اختلاف قرأت کی روایات سازی

کرکے اتنی جدوجہد کی ہے کہ آج تک دنیائے مذاہب کی کتابوں کو مسخ کرنے کے لئے جو کوششیں کی گئی تھیں ان سب کو یکجا کر لیا جائے تب بھی وہ قرآن کے خلاف کی گئی اس جدوجہد کا نصف، ربع اور خمس (بیس فیصد) تو کیا عشر (دسواں حصہ) بھی نہیں ہوں گی ------ مگر یہ معجزۂ قرآن ہے کہ ان بے تحاشا شرارتوں کے باوجود قرآنی متن آج بھی اپنی اصل زبان میں اسی طرح محفوظ ہے جیسے حیات نبوی میں تھا۔ اور خالق کائنات کا یہ پر جلال اعلان کہ **انا نحن نزلنا الذکرو اناله لحافظو ن** (۱۵/ ۹) ہم نے ہی قرآن مجید نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں ---آج تک اسی طرح گونج رہا ہے جیسا عہد نبوی و خلفاء راشدین میں گونج رہا تھا۔ ہر شخص بچشم خود اس اعلان کی تصدیق دیکھ سکتا ہے کہ قرآن کریم اپنے اصل متن کے ساتھ آج بھی کوہ ہمالیہ کی طرح سر بلند ہے اور اس کے متن کے خلاف جدوجہد کرنے والے مچھروں کی طرح بھنبھنانے کے علاوہ اس کے خلاف کچھ نہ کر سکے۔ وہ قرآنی ہمالیہ سے ٹکرا ٹکرا کر ناکامی کے عمیق غاروں میں گرتے رہے ہیں۔ اور جب کبھی غاروں کی غیبت سے نکل کر دوبارہ حملہ آور ہونے کی کوشش کرتے ہیں تو دوبارہ اس سے زیادہ گہرائیوں میں دھکیل دیئے جاتے ہیں

ان کی ان ناکام کاوشوں کا یہ عبرت انگیز حشر دیکھ کر ان کے سامنے عربی کی یہ ضرب مثل دہرائی جا سکتی ہے کہ

یا ایھا النا طح الجبل العالیٰ لتکلمه

اشفق علی الراس لاتشفق علی الجبل

(مفہوم) پرجلال و پر عظمت اور بلند و بالا پہاڑ سے سر ٹکرا ٹکرا کر اسے نقصان پہنچانے کا زعم رکھنے والے۔ اس عظیم الشان پہاڑ کو تو تو کیا نقصان پہنچا سکے گا اپنے سر کی خیر منا۔

یہ جو عرض کیا گیا کہ قرآنی متن کے خلاف دشمنان اسلام نے بے تحاشا کوششیں کیں جو ناکام رہیں ان کا اندازہ اس وقت تک نہیں کیا جاسکتا جب تک اس کی ایک جھلک نہ دیکھ لیں اس جھلک کو دیکھنے کے دوران اپنے مزاج کے خلاف اگر کچھ چیزیں نظر آئیں تو ہمیں انہیں برداشت کرنا ہوگا کیوں کہ تلخ حقائق کا سامنا کرکے ہی کوئی حل تلاش کیا جاسکتا ہے۔ انہیں نظر انداز کرکے یا ان سے منہ پھیر کر یہ سمجھ لینا کہ اب ان کا وجود نہیں رہا خود فریبی ہے اور خود فریبی سے مسائل حل نہیں ہوا کرتے۔

یہ تو سب کو معلوم ہے کہ ملت اسلامیہ کی عظیم سنی اکثریت سے کٹ کر ڈیڑھ اینٹ کی علیحدہ مسجد بنانے والے کئی فرقے ہیں خواہ وہ بائی شیعہ ہوں (جنھیں خارجی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور جن کی مسقط و عمان میں آج بھی سلطنت موجود ہے) خواہ زیدی شیعہ ہوں جو کچھ دن پہلے تک شمالی یمن میں حکمراں تھے ان کے آخری حکمراں کا نام امام البدر تھا جس کا تختہ صدر ناصر کے طرفدار ایک فوجی عبداللہ السلال نے الٹ دیا تھا۔ خواہ برصغیر کے سید محمد جونپوری کو مہدی ماننے والے مہدوی ہوں، خواہ مرزا غلام احمد قادیانی کو مسیح موعود ماننے والے قادیانی یہ سب اپنے باہمی اختلافات کے باوجود اور ایک دوسرے کو کافر قرار دینے کے باوجود قرآنی متن کے محفوظ ہونے پر مکمل متفق ہیں۔

جہاں تک اسماعیلی (یعنی آغا خانی اور بوہری) شیعوں کا معاملہ ہے ان کی اکثر کتابیں منظر عام پر نہیں آئیں۔ ان کی سب سے مشہور کتاب دعائم الاسلام ہے جس میں حفاظت قرآن کے خلاف کھلم کھلا کوئی بات نہیں ہے۔ البتہ غیر مطبوعہ کتابوں کے بہت سے حوالے مشہور اسماعیلی محقق ڈاکٹر زاہد علی نے اپنی کتاب " ہمارے اسماعیلی مذہب کی حقیقت " میں دیئے ہیں۔ اس کتاب کا عکسی ایڈیشن حال ہی میں دوبارہ شائع ہوا ہے اور بنوری ٹاؤن کراچی سے مل جاتا ہے۔ چونکہ اسماعیلیوں (آغا خانی اور بوہروں) کے ہاں کتمان اور پر اسراریت جعفری شیعوں سے بہت زیادہ ہے۔ اس لئے جبتک ان کی قلمی کتابیں خود ان کے اداروں سے شائع ہو کر منظر عام پر نہ آجائیں انہیں یہودیوں کی طرح انکار کا موقع حاصل رہے گا۔ اور جب کبھی آپ ان کی کسی کتاب کا حوالہ دیں گے تو یہودیوں کی طرح یہ بھی یہی کہتے رہیں گے کہ یہ کتاب ہمارے کسی مستند ادارے کی شائع کردہ نہیں ہے اس لئے اسے ہمارے خلاف پیش نہیں کیا جاسکتا۔ اور اپنے کسی مستند ادارے کی شائع کردہ کوئی کتاب خواہ توراۃ ہو خواہ تالمود خواہ اسماعیلی مذہب کی کتاب ہو خواہ بہائیوں کی کتاب اقدس وہ بازار میں لاتے نہیں اس لئے ان کے معاملہ کو سردست چھوڑ کر اب ہم جعفری شیعوں کے مستند حوالوں سے جو خود ان کے شائع کردہ ہیں، گفتگو کرتے ہیں۔

جعفری (اثنا عشری) شیعوں کے عقائد و فقہ کی سب سے اہم، سب سے قدیم، اور سب سے مستند کتاب الکافی مولفہ کلینی متوفی سن ۳۲۹ ھ

ہے ۔ اس کتاب کا عقیدے سے متعلق حصہ اصول کافی کے نام سے اور فقہ والا حصہ فروع کافی کے نام سے موسوم ہے ۔ اس کتاب کے عقائد والے حصہ یعنی اصول کافی میں تحریف قرآن سے متعلق بے شمار روایات ملتی ہیں ۔ تحریف قرآن سے متعلق اس کتاب میں باقاعدہ ابواب قائم کئے گئے ہیں اور اس کے اثرات کا یہ عالم ہے کہ جعفری شیعوں کے آخری بڑے محدث نوری طبرسی نے اپنی کتاب " فصل الخطاب فی تحریف کتاب رب الارباب " میں نہ صرف قرآن مجید کی تحریف پر شیعوں کی دو ہزار کے قریب روایات واحادیث کا تذکرہ کیا ہے بلکہ صراحت کے ساتھ بتایا ہے کہ قدیم شیعہ اکابر میں سوائے چار علماء کے باقی تمام بڑے علماء تحریف قرآن کے قائل ہیں ۔ اس کتاب میں یہ بھی بتایا ہے کہ تحریف کے منکر یہ چار شیعہ علماء بھی شیعہ اصولوں کے مطابق اپنا یہ نظریہ ثابت نہیں کر سکتے (بالفاظ دیگر ان کا یہ نظریہ بھی تقیہ[ؔ] پر مبنی ہے ۔ تاکہ

ؔ یہ بات کہ بظاہر تحریف کا انکار کرنے والے شیعہ علماء بھی درحقیقت تحریف کے قائل ہیں اور تحریف کا انکار تقیہ کے طور پر کرتے ہیں صرف ہم ہی نہیں کہہ رہے بلکہ اس حقیقت کا اعتراف بھی مشہور شیعہ عالم اور ملا باقر مجلسی کے شاگرد نعمت اللہ جزائری نے اپنی کتاب الانوار النعمانیہ میں ان الفاظ میں کیا ہے ۔

والظاهر ان هذا القول انما صدر منهم لاجل مصالح كثيرة ... كيف وهؤلاء الاعلام رووا في مؤلفاتهم اخبارا كثيرة تشتمل على وقوع تلك الامور في القرآن وان الآية هكذا انزلت ثم غيرت الى هذا ـ (بقیہ صفحہ ۲۷ پر)

وقت ضرورت شیعوں کو ان کی آڑ لے کر یہ کہنے کا موقع حاصل رہے کہ ہم تو تحریف کے قائل نہیں ہیں دیکھئے ہمارے یہ علماء تحریف کے مخالف ہیں۔)

محدث نوری طبرسی کی اہمیت کا اندازہ آپ اس طرح لگا سکتے ہیں کہ جعفری فقہ کی بنیاد جن چار کتابوں کی روایات پر ہے ۱۔ کافی ۲۔ من لایحضرہ الفقیہ ۳۔ تہذیب الاحکام ۴۔ الاستبصار۔ ان چاروں کی روایات کے مجموعہ کا نام وسائل الشیعہ ہے جس کے مرتب حر عاملی تھے۔

شیعہ احادیث کی اس سب سے جامع کتاب پر مستدرک الوسائل کے نام سے کئی جلدوں میں ضمیمہ مرتب کرکے نوری طبرسی نے شیعہ روایات کی تکمیل کی ہے۔ اسی کارنامے کی وجہ سے مرنے کے بعد اسے نجف میں حضرت علی کے مزعومہ روضہ کے قریب دفن کیا گیا جہاں آج تک اس کی قبر زیارت گاہ خاص و عام ہے۔

مکرم و محترم مولانا محمد منظور نعمانی جس زمانہ میں اپنی مشہور عالم کتاب "ایرانی انقلاب" اور شیعوں کے متعلق فتویٰ مرتب کر رہے تھے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۶ سے آگے)

ترجمہ: تحریف قرآن کا انکار کرنے والوں (شیخ صدوق[۱]، شریف مرتضیٰ[۲]، طوسی[۳] اور مفسر طبرسی[۴]) نے جو انکار کیا ہے وہ بہت سی مصلحتوں کی وجہ سے کیا ہے (یعنی تقیہ کی وجہ سے لوگوں کو دھوکہ دینے کے لیئے ایسا کیا ہے، ورنہ اصل میں وہ بھی تحریف کے قائل ہیں) کیونکہ انھوں نے اپنی کتابوں میں بڑی تعداد میں وہ احادیث و روایات نقل کی ہیں جو بتاتی ہیں کہ قرآن میں تحریف ہوئی ہے اور یہ کہ فلاں آیت اس طرح نازل ہوئی تھی پھر اس میں تبدیلی کردی گئی ہے۔

(انوار النعمانیہ مطبوعہ تبریز ۱۳۸۹ھ جلد دوم ص ۳۵۷)

تو وہ چاہتے تھے کہ نوری طبرسی کی کتاب کا براہ راست مطالعہ کر کے اس
کے اقتباسات پیش کریں تاکہ شبہ کی کوئی گنجائش نہ رہے مگر یہ کتاب
اہنیں کہیں ہنیں مل رہی تھی ۔ بھارت کے ایک مسلمان لیڈر
پاکستان تشریف لا رہے تھے تو مولانا نے اہنیں ایک خط
لکھ کر دیا اور فرمائش کی کہ ان کا یہ خط پاکستانی اہل علم کو دکھا کر یہ کتاب
مہیا کرنے کی کوشش کریں ۔ وہ صاحب جب پاکستان تشریف لائے تو ان
کی اہم شخصیت کے پیش نظر جناب خالد اسحاق صاحب ایڈوکیٹ نے بھی
ان کو دعوت دی جس میں مولانا یوسف بنوری کے بڑے داماد مولانا محمد
طاسین صاحب مہتمم مجلس علمی ٹاور کراچی ، مولانا ناظم ندوی صاحب
سابق شیخ الجامعہ بھاولپور ، اور کئی جج اور وکلا حضرات نے شرکت کی ، راقم
بھی اس میں شریک تھا ۔ دعوت کے اختتام پر جب خالد صاحب نے
اہنیں اپنی عظیم الشان لائبریری دکھائی تو اہنیں مولانا نعمانی کی فرمائش یاد
آگئی انہوں نے اس کا تذکرہ خالد صاحب سے کیا اور خالد صاحب نے مجھ
سے بحیثیت اپنے مشیر اسلامیات کے (جو اس زمانہ میں تھا) کیا اس پر ان
صاحب نے کہا کہ اب تک کم از کم دس بارہ علماء دین کے سامنے میں اس
کتاب کی فرمائش کر چکا ہوں مگر اکثر نے تو اس سے لاعلمی کا اظہار کیا ،
بعض نے کہا کہ اس کے اقتباسات کہیں ہم نے پڑھے تو ہیں ، دیکھی ہنیں
----- میں نے عرض کیا کہ یہ کتاب میرے پاس ہے اور میں اپنا ذاتی
نسخہ مولانا نعمانی کے لئے پیش کرنے کو تیار ہوں آپ کا تجربہ بھی درست
ہے کہ عام سنی علماء شیعوں کی اہم کتابوں تک سے ناواقف ہیں بس جو
شیعہ حضرات زبانی یا پروپیگنڈہ لٹریچر میں کہہ دیتے ہیں اسے تسلیم کرلیتے

ہیں اسی لئے یہ حضرات شیعہ حقائق سے ناواقف رہتے ہیں اور جب سنی علماء شیعہ حقائق سے ناواقف ہوں تو عام مسلمانوں کو بھلا ان سے کیا واقفیت ہو سکتی ہے اور وہ حریف کی چالوں سے کس طرح محفوظ رہ سکتے ہیں؟ حالانکہ رفع اختلاف اور اصلاح احوال کا اگر کوئی امکان ہوسکتا ہے تو آگاہی اس کی پہلی اور بنیادی شرط ہے۔ بہرحال میری پیش کردہ کتاب مولانا نعمانی کو پہونچا دی گئی جس کی اطلاع محترم مولانا نے مجھے اپنے گرامی نامہ کے ذریعے دی۔

اس موقعہ پر مودودی صاحب کے ساتھ اپنا ایک مکالمہ پیش کرنے کی اجازت چاہوں گا جس کا پس منظر یہ ہے۔

بھٹو صاحب کے دور حکومت میں ان کی ایرانی نژاد شیعہ بیگم (نصرت بھٹو صاحبہ) کے زیر اثر شیعوں نے سرکاری طور پر اپنے لئے جداگانہ شیعہ دینیات کا مطالبہ منوالیا۔ اس کے نتیجہ میں جو شیعہ نصاب دینیات چھپ کر آیا اس میں اسلامی کلمہ طیبہ کے دو جملوں کے بجائے تین جملوں والا یہ

کلمہ درج تھا۔ لاالہ الا اللہ محمد رسول اللہ علی ولی اللہ

یہ تو سب کو معلوم ہے کہ کلمہ کی تبدیلی سے ملت تبدیل ہو جاتی ہے مثلاً حضرت نوح کے زمانہ میں لاالہ الا اللہ کے بعد ان کی رسالت کے اقرار کے لئے کلمہ کے دوسرے جز میں ان کا اسم گرامی تھا۔ حضرت ابراہیم کے زمانے میں ان کا اسم گرامی اور حضرت موسیٰ کے زمانہ میں ان کا اسم گرامی سب سے آخر میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو آپ کے پیغام کو ماننے والی ملت محمدیہ کے لئے کلمہ طیبہ کے پہلے جز لاالہ

الا اللہ کے ساتھ آپ کے اسم گرامی محمد رسول اللہ کا اقرار ضروری ہوا ۔ اب اگر کوئی فرقہ اللہ اور اس کے رسول کے اقرار پر مبنی کلمہ کے ان دو اجزاء کو کافی نہیں سمجھتا بلکہ جبتک کلمہ میں تیسرے جز کا اضافہ کرکے حضرت علی کی امامت معصومہ کا اقرار نہ کرلے کلمہ کے توحید و رسالت والے دونوں اجزاء کو ناقص سمجھتا ہے تو ظاہر ہے اس طرح وہ ملت اسلامیہ سے اپنے جدا ہونے کا اعلان کر رہا ہوتا ہے ۔ یعنی جس طرح ملت محمدیہ (مسلمانوں کے) نزدیک صرف لاالہ الا اللہ کہنے سے کوئی شخص مسلمان نہیں ہوسکتا جب تک وہ محمد رسول اللہ کا اقرار نہ کرلے ، اسی طرح ملت جعفریہ یعنی شیعوں کے نزدیک لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہنا بیکار ہے جبتک علی ولی اللہ کا اقرار نہ کیا جائے ۔ اسی لئے شیعہ اپنے کلمہ کے اس تیسرے جز کو اس قدر اہمیت دیتے ہیں کہ ہر اذان میں اشھدان لا الہ الا اللہ اور اشھدان محمداًرسول اللہ کی گواہی کے ساتھ اشھدان علیا ولی اللہ کی گواہی کا بھی اعلان کرتے ہیں جس کا جب چاہے شیعہ اذان سن لے

○ اسی لئے شیعہ خود کو ملت جعفریہ کہتے ہیں تاکہ وہ ملت اسلامیہ یا ملت محمدیہ سے ممتاز رہیں یہ آج کی بات نہیں ۔ ان کے عقائد کی بنیادی اور سب سے قدیم کتاب اصول کافی کے دیباچہ ہی کو دیکھ لیا جائے تو اس میں جگہ جگہ شیعوں کے لئے ملت کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔

۱۱ - اسی لئے شیعہ اپنے مذہب کو دین اسلام سے ممتاز کرنے کے لئے دین شیعہ اور دین امامیہ کہتے ہیں۔ مشہور شیعہ عالم اور ملا باقر مجلسی کے شاگرد نعمت اللہ الجزائری اپنی کتاب الانوار النعمانیہ (عربی، طبع قدیم، لیتھو جلد اول صفحہ ۲۷۶ پر لکھتے ہیں

اما (ای الکفر) فی اصطلاح فقهائنا رضوان اللہ علیہم فالکافر من جحد من دین الاسلام ضرورۃ کمن انکر الصلوۃ والزکوۃ والصوم والحج و نحوھا، و اما ما ذکر من دین الشیعۃ بالضرورۃ لامن دین الاسلام کتقدیم امیر المومنین بالخلافۃ والفضیلۃ و تکفیر من تخلف محلہ فھی لیس بمومن لکنہ لا یخرج عندھم عن دین الاسلام۔

ترجمہ: ہمارے فقہاء رضی اللہ عنہم کے نزدیک کافروں کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو نماز، روزہ، حج اور زکوۃ وغیرہ ارکان اسلام کا انکار کرے یہ دین اسلام کا کافر ہے۔ دوسرا وہ شخص ہے جو مندرجہ بالا ضروریات اسلام کا تو انکار نہیں کرتا لیکن دین شیعہ کے ارکان کا انکار کرتا ہے مثلاً حضرت علیؓ کو سب سے افضل و برتر نہیں سمجھتا یا ان کو پہلا خلیفہ نہیں مانتا اور جو ان کی جگہ خلیفہ بنے (یعنی حضرت ابو بکرؓ و عمرؓ و عثمانؓ) ان کو کافر نہیں سمجھتا تو یہ شخص مومن نہیں ہے اور دین شیعہ سے خارج ہے خواہ دین اسلام سے خارج نہ ہوتا ہو۔

(دین اسلام اور دین شیعہ کے درمیان یہ فرق اس کتاب کی دوسری جلد کے صفحہ ۳۳۹ پر بھی بتایا گیا ہے)

ان سے بھی قدیم شیخ صدوق قمی متوفی ۳۸۱ھ جن کی کتاب "من لا یحضرہ الفقیہ" شیعوں کی کتب اربعہ میں الکافی کے بعد سب سے اہم مقام رکھتی ہے، عقائد پر اپنی کتاب "اعتقادیہ صدوق" میں جو اردو ترجمہ کے ساتھ مکتبہ امامیہ اردو بازار لاہور ۱۹۶۴ء سے بھی شائع ہوگئی ہے صفحہ ۲۰۲ پر لکھتے ہیں:

و التقية واجبة لا يجوز رفعها الى ان يخرج القائم فمن تركها قبل خروجه فقد خرج عن دين الله و عن دين الامامية یعنی مہدی کی آمد تک تقیہ کرنا واجب ہے جو اسے چھوڑے گا وہ دین امامیہ سے خارج ہو جائے گا۔

o - اسی لئے شیعہ اکابرین علم و دانش حضرت علیؓ کا تذکرہ بانیان مذاہب کے ساتھ کرتے ہیں مثلاً ایران کے مشہور شیعہ عالم اور خمینی انقلاب کے اہم ترین افراد میں سے ایک، آیت اللہ منتظری، ایران کی شائع کردہ کتاب ECHO OF ISLAM VOL-1 پبلشر منسٹری آف اسلامک گائیڈنس اسلامی ریپبلک ایران۔ تہران پوسٹ بکس 2334-41 صفحہ ۲۶۸ کالم نمبر ۲ دی مسیج آف آیۃ اللہ منتظری میں کہتے ہیں:

"ابراہیمؑ کا توحیدی مذہب، محمدؐ کا اسلام اور علی کا شیعہ ازم سب کا مبتدا یہی ہے"

پاکستان کے مشہور شیعہ فلسفی سید محمد تقی (برادر جناب رئیس امروہوی) اپنی کتاب نہج البلاغہ کا تصور الوہیت شائع کردہ خود مصنف، ۱۲۹۔ الف، مانک جی اسٹریٹ۔ گارڈن ایسٹ کراچی کے صفحہ ۱۴ پر لکھتے ہیں "عظیم ارباب مذاہب زرتشت، مہاتما گوتم بدھ، تاؤ، کنفیوشس، حضرت عیسیٰ، آنحضرتؐ اور حضرت علی اسی وقت نسل انسانی کے لئے نمونہ بنتے ہیں۔۔۔"

----- ان حقائق کے پیش نظر -----

یہ بات سمجھنے میں سہولت رہتی ہے کہ شیعوں نے جداگانہ دینیات کا مطالبہ کیوں کیا؟ جب ان کا کلمہ جدا، ان کی ملت جدا، ان کا دین جدا، تو

پھر وہ اپنی جداگانہ دینیات کا مطالبہ کیوں نہ کرتے ؟ اگر ان کا اور ملت اسلامیہ کا دین ایک ہوتا تو دونوں کی دینیات جدا کیوں ہوتیں ؟ ۔

ہے سوچنے کی چیز اسے بار بار سوچ

غرض یہ زمانہ تھا جب بریلوی، دیو بندی اور اہلحدیث تمام سنی مکاتب فکر پر مشتمل کل پاکستان سنی کونسل کی بنیاد رکھی گئی۔ اس کے اولین صدر مولانا مفتی محمد اسحاق سندیلوی ندوی، سابق مہتمم و شیخ الحدیث ندوۃ العلماء لکھنو منتخب کئے گئے جن کی کتاب " اسلام کا سیاسی نظام " شائع کردہ دار المصنفین اعظم گڑھ انڈیا، پاکستان کے لئے اسلامی دستور کا وہ اولین خاکہ ہے جو تقسیم سے قبل یوپی مسلم لیگ ہائی کمان کی فرمائش پر علامہ سلیمان ندوی کے زیر سرپرستی مرتب کیا گیا۔

نائب صدر کی حیثیت سے مولانا سلیم اللہ خاں مہتمم جامعہ فاروقیہ کراچی کو اور ناظم اعلیٰ کی حیثیت سے راقم کو منتخب کیا گیا۔ میرے ذمہ یہ فریضہ بھی عائد کیا گیا کہ مختلف مکاتب فکر کو قریب لانے کے لئے ان سے رابطہ قائم کروں، میں نے جب ملک بھر کا دورہ شروع کیا تو اپنے ساتھ اپنے دوست اور شاگرد شیخ محمد یوسف بجلی والا کو بھی لے لیا جنھیں میں کراچی کا ناظم بھی مقرر کر چکا تھا۔ جب ہم لاہور پہنچے تو ہمارا قیام گرامی قدر جناب شیخین صابر کے ہاں اچھرہ میں رہا۔۔۔۔ دوسرے دن ہم نے مولانا مودودی سے ملاقات کے لئے پروگرام بنایا، اس زمانہ میں مودودی صاحب کے گھٹنوں کا درد بہت بڑھ چکا تھا، اور ملاقاتوں پر بھی پابندی عائد تھی۔ مگر اتفاقاً میرے اس دورے سے چند ہفتے قبل مولانا کے

صاحبزادے جناب حسین فاروق صاحب، جناب صلاح الدین صاحب مدیر تکبیر کی کتاب بنیادی حقوق انسانیت کے سلسلہ میں (جس کے وہ ناشر بھی ہیں) کراچی تشریف لائے تھے اور مجھے بھی ان سے شرف نیاز حاصل ہوا تھا۔ یہ ملاقات کام آگئی، میں نے جناب حسین فاروق صاحب سے ملاقات کی اور ان کی وساطت سے مولانا سے ملاقات کا موقع حاصل ہوگیا۔ جس معاملہ میں ہم سرگرداں تھے مولانا کو اس کی اطلاع ہو چکی تھی اسلئے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے مولانا نے فرمایا کہ جس قدر شدت و تعصب پاک و ہند کے شیعوں میں ہے اسقدر دوسرے ممالک کے شیعوں میں ہنیں ہے۔ میں نے عرض کیا کہ اسکا آپ کو کوئی تجربہ ہے یا سنی سنائی بات ہے فرمایا جی ہاں تجربہ ہے کیوں کہ علامہ عبدالحسین آل کاشف الغطاء جب لیاقت علی خاں کے زمانہ میں پاکستان تشریف لائے تھے تو ہماری ان سے ملاقاتیں رہیں وہ بہت معتدل تھے اسی لئے ہم نے انھیں نماز کے موقع پر امامت کے لئے آگے بڑھایا۔ ان کی ایک کتاب اصل واصول شیعہ ہے جو انھوں نے تمام شرکاء کانفرنس میں تقسیم کی۔ ان کا دیا ہوا وہ نسخہ میرے پاس موجود ہے۔ میں نے عرض کیا کہ شیعہ مذہب کی بنیاد دراصل ان کی چار کتابوں پر ہے جنھیں وہ صحاح اربعہ کہتے ہیں۔ مولانا نے فرمایا جی ہاں، میں نے عرض کیا، کیا جناب نے ان صحاح اربعہ کا یا کم از کم ان میں سے سب سے اہم کتاب الکافی کے عقائد والے حصہ کا جسے اصول کافی کہا جاتا ہے مطالعہ فرمایا ہے مولانا نے کہا ہنیں۔ میں نے عرض کیا کہ کسی بھی نقطہ نظر کی اصل حقیقت اسکی بنیادی کتابوں کے مطالعہ سے سامنے آتی ہے۔

اصل و اصول شیعہ تو اس قسم کا تعارفی کتابچہ ہے جسے پروپیگنڈہ لٹریچر کہا جاتا ہے۔ اسکے باوجود اس میں تیسری شہادت (اشھد ان علیاً ولی اللہ) کا تذکرہ موجود ہے۔ مولانا نے فرمایا میری نظر سے نہیں گذرا۔ میں نے عرض کیا آپ اشارہ فرمادیں کہ یہ کتاب کس طرف رکھی ہے (ہم لائبریری ہی میں بیٹھے ہوئے تھے) میں ابھی اس میں دکھا دیتا ہوں۔ اس پر مولانا خاموش رہے

بعد میں ایک موقعہ پر مولانا ظفر احمد انصاری مرحوم سے جناب ضیاء الدین کرمانی کی معیت میں جن کے مولانا عبدالشکور لکھنوی سے گہرے تعلقات تھے اور جنھوں نے ۴۰ء کی قرارداد پاکستان سے بھی قبل " پاکستان " نام سے ہفت روزہ جاری کیا تھا ملاقات ہوئی اور مودودی صاحب کی اس گفتگو کا تذکرہ آگیا تو انصاری صاحب نے کہا کہ مجھے بھی مولانا سے یہ شکوہ ہے کہ جب مولانا مودودی نے شیعوں کی بنیادی کتابوں کا مطالعہ نہیں کیا تو ان کے مسلمان ہونے اور ان کے پیچھے نماز پڑھنے کا فیصلہ انہوں نے کیسے دے دیا؟ ان کا یہ طرز عمل احتیاط کے خلاف ہے۔

اس سارے قصہ سے میرا مقصد یہ ہے کہ جب مودودی صاحب جیسے مطالعاتی شخص نے شیعوں کی کسی بنیادی کتاب کا مطالعہ نہیں کیا تو دوسروں سے کیا توقع کی جائے جنھیں لگی بندھی کتابوں کے درس و تدریس و خطبات و مواعظ سے ہی فرصت نہیں ملتی۔

---- o----

اب ہم پھر اپنے اصل موضوع کی طرف آتے ہیں کہ تحریف کے قائل

جعفری شیعوں کی اس سب سے جامع کتاب فصل الخطاب کا خلاصہ خود اس کے اپنے الفاظ میں پیش کر دیا جائے تاکہ قارئین کرام تصویر کا دوسرا رخ براہ راست ملاحظہ فرما کر اندازہ کر سکیں کہ قرآن کریم کے خلاف دشمنان قرآن نے کتنی خوفناک کاوشیں کیں ---- مگر کس طرح وہ تار عنکبوت سے بھی کمتر ثابت ہوئیں

اس کتاب کے تعارف سے انہیں یہ بھی اندازہ ہو جائے گا کہ مسلم اکثریت تو قرآنی متن کی حفاظت میں سرگرم ہے ہی اسے حفظ قرآن کریم اور قرآن کریم کی نشر واشاعت سے جس قدر دلچسپی ہے وہ عیاں راچہ بیاں کے مصداق ہے اس سے کٹ کر جدا ہونے والے فرقوں میں بھی خواہ باغی شیعہ (خارجی) ہوں یا زیدی شیعہ۔ مہدوی ہوں یا قادیانی کسی نے بھی تحریف قرآن کا کھلم کھلا اقرار نہیں کیا۔ اوندھی سیدھی روایات ان سب کے یہاں پائی جاتی ہیں مگر یہ سب یا تو ان کی توجیہہ کرتے ہیں ان کو ضعیف و موضوع قرار دے کر کالعدم سمجھتے ہیں یہ خصوصیت صرف جعفری (اثنا عشری) شیعوں کو حاصل ہے کہ ان کے علماء نے قرآن کریم کا مقابلہ کرنے کی جرأت کی اور بصراحت قرآن میں تحریف کا اقرار کیا بلکہ اس کے ثابت کرنے کیلئے ضخیم کتابیں لکھیں جن میں ایک یہ پیش نظر کتاب بھی ہے۔ مزید یہ کہ جعفری اثنا عشری شیعوں کے یہ علماء جو تحریف قرآن کے اقراری ہیں شیعہ مذہب کے انتہائی اہم ترین اور بلند پایہ عالم ہیں عام ذاکروں، مولویوں، نام نہاد مجتہدوں یا علاّموں کی طرح نہیں ہیں جو شیعہ محلوں کی گلی گلی لہراتے نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ

ہے کہ جو شیعہ بظاہر تحریف کے قائل نہیں ہیں وہ بھی تحریف کے اقراری اور قرآن کے مقابلے پر آنے والے اپنے ان شیعہ اکابر علماء اور ان کے ہم خیالوں کو کافر قرار نہیں دیتے حالانکہ حضرت حسینؓ کے مقابلے پر آنے والوں بلکہ اپنے بارہ اماموں میں سے کسی بھی امام کی مخالفت کرنے والوں کو کافر کہے بغیر انہیں تسلی نہیں ہوتی آخر قرآن کریم کے مخالف اپنے ان شیعہ علماء کو نہ صرف برداشت کرنا (خواہ بظاہر خود اسکے ہم خیال نہ ہوں) بلکہ ان کو شیعہ مذہب کے اکابر اور قابل فخر علماء میں شمار کرنا کس بات کی نشاندہی کرتا ہے؟

شیعہ حضرات کی اس کمزوری کو سمجھنے کیلئے ایک دوسرے انداز سے بھی غور کیجئے

سب جانتے ہیں کہ غیر مسلموں کے اثرات کے تحت اگرچہ اکثر عام مسلمان شرک کی مختلف وادیوں میں سرگرداں ہیں لیکن اسلام کا یہ اثر آج بھی دیکھا جا سکتا ہے کہ کوئی جاہل سے جاہل مسلمان بھی مجوسیوں کی طرح دو خدا یا مسیحوں کی طرح تین خدا ماننے کی جرأت نہیں کرسکا اسی طرح شیعہ اثرات کے تحت بہت سے مسلمان اپنے بزرگوں کو اگرچہ عملا معصوم ہی سمجھتے ہیں لیکن کوئی مسلمان بھی اپنے آئمہ فقہ و حدیث کو معصوم قرار دے کر شیعوں کی طرح اپنے عقائد میں شامل کرنے کی جرأت نہیں کرسکا بالکل اسی طرح قرآن دشمنی پر مبنی بہت سی روایات شیعہ اثرات کے تحت اگرچہ ان کی کتابوں میں شامل ہوگئی ہیں لیکن آج تک کسی بھی سنی عالم کو یہ جرأت نہیں ہو سکی کہ وہ نوری طبرسی اور اسکے

ہم خیال شیعہ علماء و محدثین کی طرح قرآن میں تحریف کا قائل بلکہ اس کا مبلغ بن جائے کیونکہ انہیں معلوم ہے کہ ایسی حرکت کے نتیجے میں وہ فی الفور دشمن قرآن کافر قرار دے کر معاشرے سے کاٹ دئے جائیں گے یہ موقعہ تو نوری طبرسی اور اس کے ہم خیال علماء ہی کو حاصل ہے کہ وہ نہ صرف تحریف کے قائل ہو کر بلکہ اس پر موٹی موٹی کتابیں لکھ کر بھی شیعوں کے مقدسین میں شامل ہیں۔ اگر انہیں ذرا بھی یہ احساس ہو جاتا کہ قرآن کی تحریف کا کھلم کھلا قائل ہوکر شیعہ برادری میں رہنا نا ممکن ہوگا اور انہیں غیر مسلم قرار دے کر معاشرے سے کاٹ دیا جائے گا تو وہ کبھی یہ جرأت نہیں کر سکتے تھے۔

پرانی بات چھوڑیئے آج بھی نوری طبرسی اور تحریف قرآن کے قائل اس کے ہم خیالوں کے خلاف آپ شیعوں سے کفر کا فتویٰ حاصل نہیں کر سکتے بلکہ اس کے برعکس آج کے شیعوں کے دل میں بھی وہ پوری عظمت کے ساتھ براجمان ہیں جس کا جی چاہے موجودہ دور کے سب سے بڑے شیعہ ہیرو ایرانی انقلاب کے بانی خمینی کی کتابوں میں ان کے حوالے دیکھ لے۔

تحریف کے قائل شیعہ علماء کے تین اقرار

جعفری شیعوں کے یہ علماء جو تحریف کے قائل ہیں ان تین اقراروں کے ساتھ تحریف کا کھلم کھلا اعلان کرتے ہیں۔

- پہلا اقرار یہ کہ ہم شیعوں کے یہاں تحریف کی روایت کثیر و متواتر

ہیں۔

دوسرا اقرار یہ کہ ہماری یہ روایت صراحتاً تحریف پر دلالت کرتی ہیں۔

تیسرا اقرار یہ کہ انہیں روایات کی وجہ سے ہم تحریف کے قائل ہیں۔

شیعیات کے ماہر مولانا عبدالشکور لکھنوی مرحوم جنھوں نے برصغیر میں شیخ نوری طبرسی کی اس کتاب کا سب سے پہلے تعارف کرایا تھا وہ اپنے زمانے کے شیعہ مجتہد علی حائری لاہوری کے کتابچہ "موعظہ تحریف قرآن" کے جواب میں لکھی گئی اپنی کتاب "تنبیہہ الحائرین میں "علماء شیعہ کے تین اقرار کی سرخی قائم کر کے لکھتے ہیں

اب وہ اقرار سنئے۔

(۱) کتاب فصل الخطاب مطبوعہ ایران صفحہ ۲۲۵ میں ہے۔

"بہت سی حدیثیں جو معتبر ہیں اور قرآن موجودہ میں کمی اور نقصان پر صراحتاً دلالت کرتی ہیں علاوہ ان احادیث کے جو دلائل سابقہ کے ضمن میں بیان ہو چکیں اور اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ یہ قرآن مقدار نزول سے بہت کم ہے اور یہ کمی کسی آیت یا کسی سورت کے ساتھ مخصوص نہیں اور یہ حدیثیں ان کتب متفرقہ میں پھیلی ہوئی ہیں جن پر ہمارے مذہب کا اعتماد اور اہل مذہب کا ان کی طرف رجوع ہے میں نے وہ سب حدیثیں جمع کر دی ہیں جو میری نظر سے گذریں"

اس کے بعد بکثرت کتابوں کے نام گنائے ہیں اور روایات تحریف کے انبار لگا دیے ہیں

(۲) نیز اسی کتاب کے صفحہ ۳۱ میں محدث جزائری کا قول نقل کیا ہے

سید محمد جزائری نے کتاب انوار میں لکھا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اصحاب امامیہ نے اتفاق کیا ہے ان روایات مستفیضہ بلکہ متواترہ کی صحت پر جو صراحتاً قرآن کے محرف ہونے پر دلالت کرتی ہیں یہ تحریف قرآن میں بھی ہے پارہ میں بھی اعراب میں بھی اور اتفاق کیا ہے روات کی تصدیق پر

(۳) اسی فصل الخطاب کے صفحہ ۲۵۱ میں علاوہ محدث جزائری کے اپنے دوسرے علماء سے بھی روایت تحریف کا متواتر ہونا نقل کیا ہے

روایات تحریف قرآن یقیناً بہت ہیں حتیٰ کہ سید نعمت اللہ جزائری نے اپنی بعض تالیفات میں لکھا ہے جیسا کہ ان سے نقل کیا گیا ہے کہ جو حدیثیں تحریف پر دلالت کرتی ہیں وہ دو ہزار حدیث سے زیادہ ہیں اور ایک جماعت نے اس کے مستفیض ہونے کا دعویٰ کیا ہے جیسے مفید اور محقق داماد اور علامہ مجلسی وغیرہم بلکہ شیخ نے بھی تبیان میں تصریح کی ہے کہ یہ روایات بکثرت ہیں بلکہ ایک جماعت محدثین نے ان روایتوں کے متواتر ہونے کا دعویٰ کیا ہے جس کا ذکر آگے آئے گا۔۔۔۔۔

جاننا چاہیے کہ کہ حدیثیں تحریف کی ان معتبر کتابوں سے نقل کی گئی ہیں جن پر ہمارے اصحاب کا اعتماد ہے احکام شرعیہ کے ثابت کرنے اور آثار نبویہ کے نقل کرنے میں

(۴) پھر صاحب فصل الخطاب نے اپنے وعدے کو پورا کیا ہے اور آخر کتاب میں ان تمام محدثین کے نام لکھے ہیں جنھوں نے روایات تحریف کو متواتر کہا ہے ان ناموں میں علامہ مجلسی کا نام نامی بھی ہے اور ان کی عبارت کا حسب ذیل فقرہ قابل دید ہے فرماتے ہیں

میرے نزدیک تحریف قرآن کی روایتیں معنیً متواتر ہیں اور ان سب روایتوں

کو ترک کر دینے سے ہمارے تمام فن حدیث کا اعتبار جاتا رہے گا بلکہ میرا علم یہ ہے کہ تحریف قرآن کی روایتیں مسئلہ امامت کی روایتوں سے کم نہیں ہیں لہذا اگر تحریف قرآن کی روایتوں کا اعتبار نہ ہو تو مسئلہ امامت بھی روایتوں سے ثابت نہ ہو سکے گا

(۵) علامہ محسن کاشی تفسیر صافی کے دیباچہ میں تحریف کی (نجس) روایات نقل کر کے صفحہ ۳۲ پر فرماتے ہیں (مطبوعہ طہران سن ۱۳۷۵ھ)

ان تمام حدیثوں کا اور ان کے علاوہ جس قدر حدیثیں اہل بیتؑ کی سند سے نقل کی گئی ہیں ان کا مطلب یہ ہے کہ جو قرآن ہمارے درمیان میں ہے وہ پورا جیسا کہ محمدؐ پر نازل ہوا تھا نہیں ہے بلکہ اسمیں کچھ اللہ کے نازل کئے ہوئے کے خلاف ہے اور کچھ مغیر و محرف ہے اور یقیناً اس میں سے بہت سی چیزیں نکال دی گئی ہیں جیسے علی کا نام بہت سے مقامات سے علاوہ اس کے اور ان روایات سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس قرآن کی ترتیب بھی خدا اور اس کے رسول کی پسند کی ہوئی ترتیب نہیں ہے انہیں سب باتوں کے قائل ہیں علی بن ابراہیم قمی۔

(۶) دور آخر کے مجتہد اعظم مولوی دلدار علی جن کو شیعوں کے امام والا مقام مولوی حامد حسین آیت اللہ فی العالمین فرماتے ہیں۔ عماد الاسلام میں لکھتے ہیں۔ کما نقلہ فی الاستقصاء

آیت اللہ فی العالمین یعنی مولوی دلدار علی اپنی کتاب عماد الاسلام میں بعد نقل کرنے چند احادیث تحریف کے جو سرداران خلق یعنی آئمہ اثنا عشر علیھم آلاف التحیۃ والسلام سے منقول ہے فرماتے ہیں کہ نتیجہ ان روایات کا یہ ہے کہ کچھ نہ کچھ تحریف اس قرآن میں جو ہمارے سامنے ہے بلحاظ زیادہ ہو جانے بعض

حروف کے اور کم ہو جانے بعض حروف کے بلکہ بعض الفاظ کے ، اور بلحاظ ترتیب کے بعض مقامات میں یقیناً واقع ہو گئی اس طرح کہ ان روایتوں کے تسلیم کے بعد تحریف قرآن میں شک نہیں کیا جاسکتا (اس کے بعد مولوی دلدار علی نے تحریف کی صورتیں لکھی ہیں جو خاتمے میں نقل ہوں گی)

(۷) امام الشعیہ مولوی حامد حسین استقصاء الافحام جلد اول صفحہ 9 (مطبوعہ لدھیانہ ۱۲۷۶ھ) میں یہ عنوان قائم کرتے ہیں "روایات تحریف قرآن بطریق اہل حق"، اس کے صفحہ ۱۰ میں ہے

" اگر بیچارہ شیعے بمقتضائے احادیث کثیرہ اہل بیت طاہرین مصرحہ بوقوع نقصان در قرآن حرف تحریف و نقصان برزبان آرد ہدف سہام طعن و ملام و مورد استہزاء و تشنیع گردد

صفحہ ۶۴ میں ہے اکثر اہل حق از حافظان اسرار الہی و حاملان آثار جناب رسالت پناہی کہ ولاۃ اسلام و آئمہ انام اند، روایت کنند احادیث را کہ دال است برآنکہ در قرآن شریف مبطلین و اہل ضلال تحریف نمو و ندو تصحیفش با عمل آوردند اصل قرآن کما انزل نزد حافظان شریعت موجود است کہ دریں صورت اصلا بر جناب رسالت مآب نقصی و طعنی عائد نمیشود فریاد و فغاں آغاز میکنند ۔

عبارت منقولہ بالا سے حسب ذیل امور معلوم ہوئے (۱) روایات تحریف قرآن شیعوں کی ان اعلیٰ ترین متعبر کتابوں میں ہیں جن پر مذہب شیعہ کی بنیاد ہے (۲) روایات تحریف کثیر و مستفیض بلکہ متواتر ہیں (۳) روایات تحریف رد کر دی جائیں تو شیعوں کا فن حدیث بے کار و بے اعتبار ہو جائے (۴) تحریف قرآن کی روایتیں کتب معتبرہ شیعہ میں دو ہزار سے زیادہ ہیں

(۵) تحریف قرآن کی روایتیں مسئلہ امامت سے کم نہیں ہیں معلوم ہوا کہ شیعہ مذہب میں جس درجہ ضروری مسئلہ امامت ہے اسی درجہ تحریف قرآن بھی ضروری ہے حضرت علیؑ اور دوسرے آئمہ کی امامت کا ماننا جیسا فرض ہے اسی درجے کا فرض قرآن کا محرف ماننا بھی ہے جو شخص قرآن کو محرف نہ مانے وہ از روئے مذہب شیعہ ویسا ہی گناہگار و بددین اور مذہب شیعہ سے خارج ہوگا جیسا آئمہ اثنا عشر کی امامت کا منکر

(۶) شیعہ روایات قرآن کے محرف ہونے اور پانچوں قسم کی تحریف سے ملوث ہونے پر ایسی صاف اور واضح دلالت کرتی ہیں کہ اس میں شک نہیں ہو سکتا۔

ان عبارات میں دو اقرار تو بالکل واضح ہیں یعنی روایات کے کثیر و متواتر ہونے کا اور ان روایات کے تحریف پر دلالت کرنے کا، تیسرا اقرار یعنی معتقد تحریف ہونے کا اس درجہ واضح نہیں ہے لہذا اس کے لئے اور عبارتیں درج ذیل ہیں

(۷) علامہ محسن کاشانی تفسیر صافی کے مقدمہ میں صفحہ ۳۴ پر لکھتے ہیں

ہمارے بزرگوں کا اعتقاد اس بارے میں یہ ہے کہ ثقۃ الاسلام محمد بن یعقوب کلینی قرآن کی تحریف و نقصان کے معتقد تھے کیونکہ انہوں نے اس مضمون کی روایتیں اپنی کتاب کافی میں نقل کی ہیں اور ان روایتوں پر کوئی جرح نہیں کی باوجودیکہ انہوں نے آغاز کتاب میں لکھ دیا ہے کہ جتنی روایتیں اس کتاب میں ہیں ان پر مجھے وثوق ہے اور اسی طرح ان کے استاد علی بن ابراہیم قمی کہ ان کی تفسیر بھی روایات تحریف سے پُر ہے اور ان کو اس عقیدے میں غلو ہے اور اسی طرح شیخ احمد بن ابی طالب طبرسی کہ وہ بھی کتاب احتجاج میں انہیں دونوں کے طرز پر چلے ہیں

(۸) علامہ نوری طبرسی فصل الخطاب کے صفحہ ۲۶ میں لکھتے ہیں

پہلا قول یہ ہے کہ قرآن میں تغیر و نقصان ہوگیا اور یہی مذہب ہے شیخ جلیل علی بن ابراہیم قمی استاد کلینی کا انہوں نے اپنے تفسیر کے شروع میں اس کی تصریح کی ہے اور اپنی تفسیر روایات تحریف سے بھر دی ہے اور ساتھ ہی اپنی تفسیر کے شروع میں انہوں نے یہ پابندی ظاہر کی ہے کہ وہی روایتیں ذکر کروں گا جو میرے اساتذہ اور معتبر لوگوں نے روایت کی ہیں اور یہی مذہب ہے ثقۃ الاسلام کلینیؒ کا جیسا کہ ایک جماعت نے انکی طرف منسوب کیا ہے کیونکہ انہوں نے اس مضمون کی بہت سی صریح روایتیں کافی کی کتاب الحجہ خصوصاً باب النکت والنتف من التنزیل میں اور روضہ میں نقل کی ہیں اور ان روایات کو نہ رد کیا نہ ان کی کچھ تاویل کی اور محقق سید محسن کاظمی نے شرح وافیہ میں کلینی کا مذہب اس باب سے ثابت کیا ہے جو انہوں نے کافی میں منعقد کیا ہے اور اس کا نام رکھا ہے باب انہ لم یجمع القرآن کلہ الا الائمہ علیہم السلام کیوں کہ ان کے طریقے سے ظاہر یہ ہے کہ وہ اسی مضمون کے لئے باب قائم کرتے ہیں جو مضمون ان کو پسند ہوتا ہے میں کہتا ہوں کہ محقق کاظمی کا یہ کہنا ٹھیک ہے کہ متقدمین کا مذہب اکثر ان کے بابوں کے عنوان سے ظاہر ہوتا ہے اور کلینی کے مذہب کی تصریح علامہ مجلسی نے بھی مرآۃ العقول میں کی ہے۔

اس کے بعد حسب ذیل نام اپنے اکابر علمائے متقدمین کے صاحب فصل الخطاب نے درج کئے ہیں۔

الثقہ الجلیل محمد بن حسن الصفار (مصنف کتاب البصائر)، الثقۃ محمد بن ابراہیم النعمانی کلینی مصنف کتاب الغیبۃ، الثقۃ الجلیل سعد بن عبداللہ القمی جنہوں نے اپنی کتاب ناسخ و منسوخ میں ایک باب تحریف قرآن کا بھی قائم کیا

ہے جیسا کہ علامہ مجلسی نے بحار کے انیسویں جلد میں اس کی تصریح کی ہے۔ السید علی بن احمد الکوفی مصنف کتاب بدع المحدثہ اجلتہ المفسرین وائمتہم الشیخ الجلیل محمد بن مسعود العیاشی (مصنف تفسیر عیاشی)، الشیخ فرات بن ابراہیم الکوفی الثقتہ محمد بن عباش الماہیار، شیخ المتکلمین متقدم النوبختین ابو سہل بن اسماعیل بن علی بن اسحاق بن سہل بن نوبخت مصنف کتب کثیرہ۔ اسحاق الکاتب جنہوں نے امام مہدی کو دیکھا ہے خدا امام ممدوح کی مشکل جلد آسان کرے۔ انیس الطائفہ جن کے معصوم ہونے کے اکثر یا بعض لوگ قائل ہیں یعنی ابولقاسم حسین ابن روح بن ابی بحر نوبختی جو شیعوں کے اور امام مہدی کے درمیان میں تیسرے سفیر تھے۔ العالم الفاضل المتکلم حاجب بن لیث بن سراج، الشیخ الجلیل الثقتہ الاقدم فضل بن شاذان، الشیخ الجلیل محمد بن حسن الشیبانی مصنف تفسیر نہج البیان۔ الشیخ الثقتہ احمد بن محمد بن خالد برقی مصنف کتاب المحاسن، محقق طوسی نے فہرست میں اور کشی نے اپنے اسماء الرجال میں ان کی تصانیف میں کتاب التحریف کا شمار کیا ہے، الثقتہ محمد بن خالد جو شیخ سابق الذکر کے والد تھے۔ شیخ الثقتہ علی بن حسن بن فضال جن سے کوئی غلطی علم الحدیث میں ظاہر نہیں ہوئی، محمد بن الحسن الصیرفی احمد بن محمد سیار، الشیخ حسن بن سلیمان الحلی تلمیذ الشہید۔ الثقتہ الجلیل محمد بن عباس بن علی بن مروان ماہیار ابو الطاہر عبدالواحد بن عمر القمی، محمد بن علی بن شہر آشوب، شیخ احمد بن ابی طالب طبرسی جنہوں نے تحریف قرآن کے متعلق دس حدیثوں سے زیادہ روایت کی ہیں۔ اس کے بعد مصنف فصل الخطاب لکھتے ہیں وھو مذھب جمھور المحدثین الذین عثرنا علی کلماتھم۔ یعنی یہی مذہب جمہور محدثین کا ہے جن کے کلمات سے ہم کو اطلاع ہوئی۔ مولی محمد صالح۔ الفاضل السید علی خان مولی محمد مہدی ترانی الاستاذ الاکبر البہبہانی۔ محقق کاظمی شیخ ابوالحسن الشریف

شیخ علی بن محمد المقابئ سید جلیل علی طاؤس۔ا لشیخ الاعظم محمد بن محمد بن لعمان المفید۔

یہ ایک مختصر فہرست اطلاع ناظرین کے لئے درج کی گئی ہے تاکہ جناب حائری صاحب و دیگر علماء شیعہ کی غلط بیانی اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں

حقیقت یہی ہے کہ تمام محدثین اور بڑے بڑے اکابر مذہب شیعہ کے سب تحریف قرآن کے قائل ہیں نہ کوئی شیعہ تحریف قرآن کا منکر ہوا اور نہ ہو سکتا ہے ان کے مذہب کی بنیاد ہی عداوت قرآن پر ہے

شیعون میں گنتی کے صرف چار آدمی ازراہ تقیہ تحریف قرآن کے منکر ہوگئے ہیں و لم یعرف من القدماء موافق لهم ان سے پہلے کے شیعوں میں کوئی ان کا ہم خیال ثابت ہنیں ہوتا سب تحریف کے قائل ہیں (نوری طبرسی کی فصل الخطاب صفحہ ۳۲) ان چاروں شیعہ علماء کے نام یہ ہیں :

(۱) شریف مرتضیٰ (۲) شیخ صدوق (۳) ابو جعفر طوسی (۴) شیخ ابو علی طبرسی مصنف تفسیر مجمع البیان ۔ جب علماء شیعہ کو سنیوں کے مقابلے میں ضرورت پیش آتی ہے یا اپنے مسلمان ثابت کرنے کی ہوس خام پیدا ہوتی ہے تو انہیں چار میں سے کسی نہ کسی کا قول پیش کر دیتے ہیں اور بڑی صفائی سے کہہ دیتے ہیں کہ ہمارے اوپر بالکل بے جا الزام ہے ہم تو تحریف قرآن کے قائل ہنیں ہیں چنانچہ حائری صاحب نے بھی اپنے رسالہ موعظہ تحریف قرآن میں یہی کارروائی کی ہے ناواقف شخص بے شک اس کارروائی سے دھوکہ کھا جاتا ہے مگر جو لوگ مذہب شیعہ سے واقف ہیں ان کے سامنے یہ کارروائی ہنیں چل سکتی ۔ اب بعونہ تعالیٰ ان چاروں شخصوں کے اقوال اور ان کی حقیقت و اصلیت کا اظہار

کیا جاتا ہے۔.........."

مولانا عبدالشکور لکھنوی[1] کی اس کتاب کو اور انکے اس چیلنج کو ساٹھ سال سے زیادہ ہوگئے ہیں کہ ان تین اقراروں کے ساتھ مسلم اکثریت کا تو کہنا ہی کیا، مسلم اکثریت سے کٹنے والے مہدوی، قادیانی یا کسی بھی فرقے کے ہاں حتیٰ کہ باغی شیعوں (خارجی) اور زیدی شیعوں کے ہاں بھی تحریف قرآن کا کوئی عالم قائل نظر نہیں آتا۔ جب کہ جعفری شیعوں کے ہاں تحریف کے قائل مشاہیر علماء کی اس قدر بھر بھر ہے کہ نوری طبرسی نے کئی صفحات میں ان کا ذکر کیا ہے۔ پھر باقی علماء شیعہ بھی جو بظاہر ان تحریفی علماء کے نقطہ نظر کو تسلیم نہیں کرتے وہ بھی ان کو نہ صرف مسلمان بلکہ قابل فخر علماء سمجھتے ہیں۔

مولانا کے اس سوال اور چیلنج کا جواب آج تک نہیں دیا گیا۔ یہ سوال آج کے شیعہ علماء اور دانشوروں پر بھی قائم ہے اگر پہلے لوگ اس کا جواب نہیں دے سکے تو آج والے جواب دیں اور اگر پہلوں نے کوئی

---

[1] اس کے بعد مولانا لکھنوی نے ان چاروں کے نام نہاد انکار تحریف کی حقیقت واضح کی ہے۔ ہم نے یہ تفصیل اس لیئے درج نہیں کی کہ ص۲۶ پر ہم شیعہ عالم نعمت اللہ جزائری کا یہ اعتراف نقل کر چکے ہیں کہ ان چاروں کا انکار تقیہ پر مبنی ہے۔ اس اقرار کے بعد تفصیل کی ضرورت نہیں ع

مدعی لاکھ پہ بھاری ہے گواہی تیری

جواب دیا تھا تو آج والے اسے دہرا دیں تاکہ اس سوال کا جواب سب کے سامنے آجائے۔

اب شیخ نوری طبرسی کی کتاب کا خلاصہ خود انہی کے الفاظ میں سنئے (اس کتاب کے فہرست والے صفحے کا عکس ساتھ میں منسلک ہے)

نوری طبرسی کی اس کتاب کا نام جیسا کہ عرض کیا گیا فصل الخطاب فی تحریف کتاب رب الارباب ہے اس کا ترجمہ یہ ہے "خداؤں کے خدا کی کتاب میں تحریف ہو جانے کے ثبوت پر قول فیصل"

کتاب کی ابتدا یوں ہوتی ہے:

بسم الله الرحمن الرحيم

فهرست ما فى هذا الكتاب الشريف من المطالب اجمالا

المقدمة الا ولى فى ذكر الاخبار التى وردت فى جمع القرآن و جامعه و سبب جمعه و كونه فى معرض النقص بالنظر الى كيفية الجمع و ان تاليفه يخالف تاليف المو لفين

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اس کتاب شریف میں جو مضامین ہیں ان کی مختصر فہرست۔

پہلا مقدمہ: ان روایات کے بیان میں جن میں قرآن جمع کرنے کا قصہ بیان کیا گیا ہے، نیز قرآن جمع کرنے والے کا، اور قرآن جمع کرنے کی وجہ کا ذکر ہے۔ اسی مقدمہ میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ جمع قرآن کی اس صورت حال کے پیش نظر قرآن میں تحریف کا نقص موجود ہے یہ بھی بتایا گیا ہے کہ موجودہ قرآن کی تالیف مولفین کی تالیفات سے مختلف ہے (یہ مقدمہ صفحہ ۲ سے صفحہ ۲۴ تک یعنی ۲۲ صفحات پر مشتمل ہے از مترجم)

بسم الله الرحمن الرحيم

فهرست ما في هذا الكتاب الشريف من المطالب اجمالا

المقدمة الثانيه فی بیان اقسام التغییر الممکن حصوله فی القرآن و الممتنع دخوله فیه

دوسرا مقدمہ: جس میں تحریف (تغیّر) کی وہ اقسام بتائی گئی ہیں جو قرآن میں پائی جاتی ہیں اور ان کا بھی تذکرہ ہے جو ممکن نہیں۔ (یہ مقدمہ دو صفحات پر مشتمل ہے اور اسمیں بتایا ہے کہ قرآن میں تحریف کی صرف یہ صورت ناممکن ہے کہ کوئی قرآن میں پوری سورت کا اضافہ کردے یا پوری آیت کا اضافہ کردے اس کے علاوہ باقی ہر قسم کی تحریف اس میں موجود ہے یعنی سورتوں کی کمی، آیتوں کی کمی، کلمات کی کمی، الفاظ کی کمی، حروف کی کمی، کلمات کی زیادتی، الفاظ و کلمات کی تبدیلی، حرکات کی تبدیلی، ترتیب آیات میں گڑبڑ ترتیب کلمات میں گڑبڑ وغیرہ ان سب کی مثالیں بھی دی گئی ہیں مترجم)

القدمة الثالثه فی ذکر اقوال علمائنا فی تغییر القرآن و عدمه

تیسرا مقدمہ جسمیں ہمارے شیعہ علماء کے وہ اقوال بیان کئے گئے ہیں جن میں تحریف قرآن و عدم تحریف کا تذکرہ ہے (یہ مقدمہ دس صفحات پر مشتمل ہے از مترجم)

الباب الاول فی ذکر ما یدل او استدلو به علی و قوع التغییر و النقصان فی القرآن

باب اول ان دلائل کے بیان میں جن کی رو سے قرآن میں تبدیلی اور کمی کی تحریف کا ثبوت ملتا ہے

یہ باب اول ۲۲۴ صفحات پر یعنی کتاب کے اکثر حصے پر مشتمل ہے اور

اس میں بارہ دلائل کے نام سے بارہ عنوانات قائم کئے گئے ہیں جن کا تذکرہ فہرست میں اس طرح ہے (از مترجم)

پہلی دلیل (الف) تورات و انجیل میں تحریف کا ذکر (ب) اس بات کا ذکر کہ جو کچھ قدیم اقوام میں ہوا ایسا ہی امت مسلمہ میں بھی ہوگا (ج) ان امور کا ذکر جن میں اس امت کی سابقہ امتوں سے مشابہت بیان کی گئی ہے خواہ تعریف کے طور پر خواہ برائی کے طور پر (د) شیعوں کی ان روایات کا ذکر جن کی رو سے قرآن میں تورات و انجیل کی طرح تحریف ہو چکی ہے۔

دوسری دلیل جمع قرآن کی ان روایات کے بیان میں جن کی صورت و کیفیت ایسی ہے کہ ایسی حالت میں تحریف کا ہونا لازمی ہے۔ اسی کے ساتھ کاتبین وحی کے حالات بھی بیان کئے گئے ہیں

تیسری دلیل منسوخ التلاوت کی تردید میں، یہ بھی ثابت کیا گیا ہے کہ منسوخ التلاوت کی جو مثالیں بیان کی جاتی ہیں وہ قرآن میں کمی ہو جانے کا ثبوت ہیں

چوتھی دلیل یہ کہ علیؑ کا مخصوص قرآن تھا جو موجودہ قرآن سے نہ صرف ترتیب میں مختلف تھا بلکہ اس میں بہت سی ایسی آیات تھیں جن کو نہ احادیث قدسیہ کہہ سکتے ہیں نہ تفسیر و تاویل کے جملے کہہ سکتے ہیں

پانچویں دلیل یہ کہ عبداللہ بن مسعود کے معتبر مصحف میں ایسی آیات تھیں جو موجودہ قرآن میں نہیں ہیں

چھٹی دلیل یہ کہ ابی بن کعب کا جو مصحف ہمارے نزدیک معتبر ہے

اس کے بہت سے مندرجات موجودہ قرآن میں نہیں ہیں

ساتویں دلیل اس بیان میں کہ جب عثمان بن عفان نے دوسری مرتبہ قرآن جمع کیا تو اس نے بہت سے جملے اور بہت سی آیات حذف کردیں۔ اسی عنوان میں عثمان کے طریقہ جمع قرآن کا تذکرہ بھی ہے اور جو آیات اور کلمات اس نے حذف کئے ان میں سے بعض کا ذکر بھی ہے اسکے لکھائے ہوئے مصحف کے نسخوں میں باہم اختلافات کا اور اس کے کاتبوں نے قرآن لکھنے میں جو غلطیاں کیں اس کا بھی ذکر ہے

آٹھویں دلیل مخالفوں (یعنی سنی مسلمانوں) کی ان کثیر روایات کے ذکر میں جن میں قرآن کریم میں کمی ہو جانے کا صراحتاً ذکر ہے۔

نویں دلیل یہ کہ اللہ تعالیٰ نے سابقہ کتابوں میں اپنے اوصیاء (شیعہ اماموں) کا تذکرہ کیا ہے اس لئے لازم ہے کہ اس کتاب مہیمن (قرآن) میں بھی ان کا ذکر ہوتا جو موجودہ قرآن میں نہیں ہے اسی عنوان میں ان آیات کا بھی ذکر ہے جو اصل قرآن میں اوصیاء کی تعریف میں تھیں مگر موجودہ قرآن میں نہیں ہیں

دسویں دلیل قرآنی حروف و کلمات وغیرہ میں اہل اختلاف قرآت کے تذکرے میں جب کہ اللہ نے اختلاف قرآت نازل نہیں کئے۔ یہ اس کا ثبوت ہے کہ قرآن میں تحریف ہوئی ہے۔ اسی عنوان میں قاریوں کے حالات کا ذکر بھی کیا گیا ہے اور ان کی سندوں میں تدلیس (گھپلے) کا ثبوت پیش کیا گیا ہے

گیارہویں دلیل شیعوں کی ان کثیر روایات کے بیان میں جن میں قرآن

میں کمی ہونے کا صراحت کے ساتھ تذکرہ ہے

بارہویں دلیل۔ جس میں ان تمام شیعہ روایات کو جن میں تحریف کا تذکرہ ہے، موجودہ قرآنی سورتوں کے مطابق مرتب کر دیا ہے، اس کے بعد ان روایات پر کئے گئے اعراضات کے جوابات بھی ہیں

باب دوئم (جو اڑتیس صفحات پر مشتمل ہے) جس میں ان لوگوں کے قرآنی، حدیثی اور عقلی دلائل کا مفصل جواب دیا گیا ہے جو قران میں تحریف کے قائل نہیں ہیں

اس باب میں اس کا بھی ذکر ہے کہ " عہد نبوی میں تورات میں دوبارہ تحریف ہوئی

یہ تو ترجمہ تھا فصل الخطاب کی فہرست کا۔ فصل الخطاب کے اس صفحے کا عکس ہم نے شروع میں لگا دیا ہے جہاں اصل عبارت دیکھی جا سکتی ہے اب ملاحظہ فرمائیے کتاب کی وجہ تالیف جو مصنف نے دیباچہ کتاب میں اس طرح بیان کی ہے

هذا كتاب لطيف و سفر شريف عملته فى اثبات تحريف القرآن و فضائح اهل الجور والعدوان و سميته فصل الخطاب فى تحريف كتاب رب الارباب، و جعلت له، ثلث مقدمات و ابواب و اودعت فيه من بدائع الحكمة ما تقربه كل عين و ارجو ممن ينتظر به المسينون ان ينفعنى به فى يوم لا ينفع مال و لا بنون

ترجمہ: یہ پر لطف کتاب اور مقدس صحیفہ ہے جس میں میں نے تحریف قرآن کے ثبوت پیش کئے ہیں اور (قرآن جمع کرنے والے) ظالموں اور

(شیعوں کے) دشمنوں کی برائیوں کا ذکر کیا ہے میں نے اس کتاب کا نام "خداؤں کے خدا کی کتاب میں تحریف کے ثبوت پر قطعی فیصلہ" رکھا ہے اور اس میں تین مقدمے اور دو باب قائم کئے ہیں میں نے اس کتاب میں دانائی کی اتنی اہم باتیں جمع کر دی ہیں جنھیں دیکھ کر (ہر شیعہ کی) آنکھیں ٹھنڈی ہوں گی مجھے رحمت الہی سے توقع ہے کہ میری یہ کتاب مجھے قیامت کے دن نفع دے گی جس دن مال اور اولاد بھی کچھ نفع نہیں دے سکتے
(فصل الخطاب صفحہ ۲)

یہ تو کتاب کا دیباچہ تھا۔ کتاب کے بالکل آخری صفحے پر مقام تصنیف و سن تصنیف کا ذکر کرتے ہوئے مصنف لکھتا ہے

وقد فرغ من تنميق هذه الاوراق رجاء الانتفاع بها فی یوم یکشف عن ساق، العبد المذنب المسیئی المنسی حسین بن محمد تقی النوری الطبرسی فی مشهد مولانا امیر المومنین علیه السلام للیلتین ان بقیا من شهر جمادی الاخری من سنة اثنین و تسعین بعد الالف و المائتین

ترجمہ: بندہ گناہ گار حسین بن محمد تقی نوری طبرسی کو اس کتاب کی تحریر سے فراغت ہوئی اس توقع کے ساتھ کہ یہ کتاب مجھے اس دن فائدہ پہنچائے گی جس دن سب کی برائیاں کھل جائیں گی

مقام تصنیف روضۂ امیرالمومنین مولانا علی علیہ السلام

سن تصنیف ۲۸ جمادی الاخری ۱۲۹۲ھ

نوری طبرسی کی ان تحریروں سے یہ اندازہ کرلینا مشکل نہیں کہ وہ کس قدر شدید مذہبی جذبے کے تحت تحریف قرآن ثابت کرنے پر تلا ہوا ہے اور

اس نے کتنے مذہبی ذوق و شوق سے بڑے سائز کے تقریباً چار سو صفحات کی یہ کتاب لکھی ہے۔ اگر اس کتاب کو جدید عربی ٹائپ میں ایڈٹ کر کے شائع کیا جائے تو ضخیم قسم کی چار جلدوں میں بھی بمشکل سمائے گی۔

دشمنان قرآن کی سیکڑوں کاوشوں میں سے یہ صرف ایک کاوش ہے جس کا تعارف کرایا گیا ہے اس سے آپ باقی کاوشوں کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

ظلمات کی اس سیر کے بعد اب پھر قرآنی اعجاز کی طرف توجہ کیجئے اور قرآن کا یہ معجزہ ملاحظہ فرمائیے کہ **یخربون بیوتھم باید یھم** کے مطابق خود شیعہ اپنے ان شیعہ علماء کی تردید پر مجبور ہیں۔ اگرچہ انہیں کافر نہیں کہتے اور اس طرح اپنے دل کا چور ظاہر کر دیتے ہیں۔

انا نحن نزلنا الذکر وانا له لحافظون کا یہ کتنا حیرت انگیز مظاہرہ ہے کہ ساری کوششوں کے باوجود بھی حریف اپنی ناکامی دیکھ کر پسپا ہونے پر مجبور ہے اور اس الٰہی چیلنج کی چمک دمک کے سامنے اس کی نگاہیں خیرہ ہو کر رہ گئیں ہیں

فالحمد لله وحده صدق وعده واعز جنده وھزم الاحزاب وحده ولله العزة ولرسوله وللمومنين ولكن المنافقين لا يعلمون

نقاب پوش دشمنان قرآن کے اس اعتراف شکست کے بعد آخر میں ہم ایک کھلم کھلا غیر مسلم کے اعتراف حقیقت پر اپنی بات کو ختم کرتے ہیں۔

سر ولیم میور جو صوبہ متحدہ کے لیفٹیننٹ گورنر تھے متعصب عیسائی ہونے کے باوجود اور یہ جاننے کے باوجود کہ مسلمانوں کی طرف سے ان کی انجیلوں کو محرف کہا جاتا ہے اپنی کتاب لائف آف محمدؐ میں قرآنی متن کے

محفوظ ہونے پر ان الفاظ میں شہادت دیتے ہیں :

" یہ بالکل صحیح اور کامل قرآن ہے اور اس میں ایک حرف کی بھی تحریف نہیں ہوئی۔ ہم بڑی مضبوط بنیادوں پر یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ قرآن کی ہر آیت خالص اور غیر متغیر صورت میں ہے اور آخر کار ہم اپنی بحث کو وان ہیم صاحب کے فیصلے پر ختم کرتے ہیں۔ وہ فیصلہ یہ ہے کہ ہمارے پاس جو قرآن ہے ہم کامل طور پر اس میں ہر لفظ محمدؐ کا سمجھتے ہیں جیسا کہ مسلمان اس کے ہر لفظ کو خدا کا لفظ خیال کرتے ہیں۔

فالحمد اللہ رب العلمین

غلام قرآن

محمد طاہر

- مفتی و مہتمم جامعہ مدینۃ العلوم اورنگ آباد کراچی ۱۸
- سرپرست عالمی جمعیت تدریس القرآن۔
- سرپرست بزم خاتم المعصومین صلی اللہ علیہ وسلم
- اولین ناظم اعلیٰ کل پاکستان سنی کونسل
- جنرل سیکریٹری ادارہ فکر اسلامی کراچی
- ترجمان متحدہ سنی محاذ گودھرا تحریک کراچی

تاثّرات بروفات
علاّمہ تمنّا عمادی مجیبی

مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی، ایم، اے، پی، ایچ، ڈی استاد فلسفۂ لسانیات، ملک عبدالعزیز یونیورسٹی جدہ مشیر امور اقلیات، رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ۔ حال ناظم تعلیمات ندوۃ العلماء لکھنؤ۔

برصغیر ہند و پاک کے ایک مقتدر عالم دین، وسیع النظر محقق اور اردو فارسی کے بلند پایہ ادیب و شاعر مولانا محی الدین تمناؔ نے ۸۰ سال کی عمر میں گزشتہ ماہ وفات پائی۔

وہ صوبہ بہار کے ایک مردم خیز قصبہ پھلواری کے رہنے والے تھے، اور ایک ایسے علمی و دینی خاندان کے رکن تھے۔ جہاں کچھ اوپر دو سو سال سے علم و مشیخت کا سلسلہ قائم ہے، ان کو فارسی اور فن عروض میں ماہرانہ دستگاہ حاصل تھی۔ مولانا سید سلیمان ندویؒ نے اپنے ایک مقالہ میں بہار کی باکمال شخصیتوں کا تعارف کرایا ہے، اس میں مولانا عمادی مجیبی کا تذکرہ اسی حیثیت سے کیا ہے، یہ مقالہ سید صاحب کے مجموعۂ مقالات نقوش سلیمانی میں موجود ہے۔ مولانا عمادی مجیبی بہت ہی ذہین، اعلیٰ درجہ کے طباع اور نکتہ سنج تھے، انھوں نے درس نظامی کی تکمیل اپنے والد اور خاندان کے دوسرے بزرگوں مولانا حکیم علی نعمت اور مولانا محمد منظور احمدؒ سے کی تھی، اور کچھ عرصہ[1] تک متوسطات کی کتابوں کا درس بھی دیا تھا، ان کے والد مولانا شاہ نذیر الحق فائز ایک وسیع الاستعداد

---

[1] خود علامہ تمنا کے ارشاد کے مطابق اور علامہ کے شاگرد مولانا اسد القادری کی تحریر کے مطابق درس و تدریس کا زمانہ چودہ پندرہ سال پر محیط ہے۔ اور اس دوران ابتدائی کتابوں سے انتہائی کتابوں تک سب کا درس دیا۔ (طاہر)

عالم تھے۔ فارسی میں فکر سخن کرتے تھے۔ ان کے کلام کا مجموعہ پروفیسر ڈاکٹر افضل امام صاحب نے مرتب کر کے شائع کیا ہے۔ مولانا عمادی کا ابتدائی تعارف بھی ایک شاعر کی حیثیت سے ہوا، ان کی شاعری زیادہ تر بلکہ تمام تر نعت نبوی پر مشتمل تھی، وہ فارسی اور اردو میں پرجوش اور پرکیف نعتیں کہتے تھے۔ نعتوں کے ضمن میں اصلاح و موعظت کے مضمون بھی بڑی خوبی سے نظم کرتے، ان کے شیخ طریقت اور استاد شاہ رشید الحق عمادی سجادہ نشین خانقاہ عمادیہ پٹنہ، جو ان کے آبائی رشتہ سے چچا بھی تھے۔ مولانا تمنا عمادی کو "حسان الہند" کہا کرتے تھے، چنانچہ ان کی نظموں کے ابتدائی مجموعے "حسان الہند علامہ تمنا عمادی مجیبی پھلواری" کے نام سے شائع ہوا کرتے تھے افسوس کہ ان سطور کی تحریر کے وقت ان کے اشعار کا کوئی مجموعہ نہیں ہے جو نمونہ کے طور پر پیش کیا جا سکے۔ البتہ چند متفرق اشعار جو حافظے کے گوشوں میں پراگندہ پڑے ہوئے ہیں ان کا یہاں درج کرنا نامناسب نہ ہوگا۔

حضرت جابر بن سمرہؓ کی ایک روایت شمائل ترمذی میں ہے کہ وہ ایک مرتبہ چاندنی رات میں حضور انور صلے اللہ علیہ وسلم کو یمنی چادروں میں ملبوس دیکھ رہے تھے کبھی وہ چاند کو دیکھتے اور کبھی حضور انور کو! اور کہتے کہ مجھ کو حضورؐ انور چاند سے زیادہ خوبصورت نظر آرہے تھے اس واقعہ کو مولانا تمنا عمادیؒ نے نظم کیا تھا! اس نظم کا ایک شعر یہ ہے۔

رات بھر کیوں نہ تجھے چاند میں دیکھا ہی کروں
ان کی صورت سے بہت ملتی ہے صورت تیری

شاعری ان کے فن شعر وسخن میں ماہرانہ دستگاہ کا نتیجہ تھی۔ مگر پھر بھی اکثر اشعار سلیس اور رواں ہوتے تھے مثلاً ایک نظم کا پہلا شعر ہے۔

شیوۂ احبابؔ جدا، شکوۂ اغیار جدا
میرے افسانے کے ہیں دو باب، ہر اک باب جدا

؎ یہ مصرعہ فاضل مضمون نگار کے سہو قلم نے کچھ سے کچھ بنا دیا۔ شاید اصل مصرعہ یوں ہو: "شکوۂ غیر جدا، شکوۂ احباب جدا"

ان کی شاعری کا اصلی رنگ فارسی میں کھلتا تھا، ایک مشہور زمین میں ان کے یہ دو شعر سنئے۔

حاشا کہ دل از ناوکِ جاناں گلہ دارد ⁂ برباد سرائے کہ ز مہماں گلہ دارد

دیوانہ بکار است چہ داد ند ز دستش ⁂ داماں گلہ دارد کہ گریباں گلہ دارد

مولانا تمنا عمادیؒ کے شاگردوں کی تعداد خاصی تھی جن میں بعض بہت کامیاب شعرا بھی رہے ہیں جیسے نجم، ارمان اور شفیع تمنائی پھلواروی، ان کے علاوہ خاندان کے اکثر و بیشتر نوجوان جن کے اندر شاعری کی امنگ پیدا ہوئی، مولانا سے ہی رجوع کرتے تھے۔ مگر شعر و ادب سے دلچسپی جوانی ہی کی عمر میں کم ہو گئی تھی، علمی و تحقیقی مصروفیات نے اس ذوق پر غلبہ حاصل کر لیا تھا لیکن شعر و ادب سے وہ کلیتہً مستعفی نہیں ہوئے تھے، اپنے وسیع اور عالی شان مکان کا نام انھوں نے "دارالادب" ہی رکھا تھا جو ان کی ہجرت پاکستان کے بعد دوسروں کے قبضے میں آیا مگر اس کے دروازوں کا کتبہ اب بھی باقی ہے۔

وہ خاندانی صوفی تھے، تصوف کی گودوں میں پلے تھے، ان کے جد امجد (چھٹی پشت کے دادا) حضرت تاج العارفین شاہ محمد مجیب اللہ رحمۃ اللہ علیہ تھے جن کے اخلاف کی دو خانقاہیں پھلواری اور پٹنہ میں موجود ہیں۔ ان کی خانقاہوں کے "رسوم و آداب" نہ خالص دیوبندی طرز کے ہیں نہ بریلوی انداز کے، ان دونوں کے درمیان ایک معتدل اور متوسط انداز کی رسمیں وہاں رائج ہیں جن میں رسم سماع بھی شامل ہے۔ مولانا تمنا عمادی ان مروجہ مراسم تصوف سے گہرا تعلق رکھتے تھے۔ ذکر، شغل، مراقبہ، قبور سے لے کر حال قال میں کسی سے پیچھے نہیں تھے۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد ان مراسم سے دل برداشتہ ہو گئے بلکہ ان کے سخت مخالف ہو گئے۔ اس تبدیلی کا سبب خواہ کتاب و سنت کے مطالعہ کا خاص انداز رہا ہو یا کوئی دوسرا نفسیاتی سبب اس کا تعین دشوار ہے[1]۔ بہرحال یہ باتیں راقم الحروف

---

[1] خود علامہ تمنا کے ارشاد کے مطابق (جیسا کہ مولانا ظفر احمد عثمانی کے نام خط میں انھوں نے تحریر کیا ہے) تصوف اور اس کی رسوم سے علامہ کے بُعد کی وجہ کتاب اللہ، سیرِ رسول اللہؐ اور سیرِ اصحابِ رسول اللہؐ کا غیر جانبدارانہ مطالعہ تھا۔ ورنہ ظاہر ہے ایک خاندانی پیر گھرانے کے فرد کے لئے صوفیانہ رسوم سے فائدے ہی فائدے تھے۔ (طاہر)

کے وجود سے پہلے کی ہیں۔ اس لئے ان پر رائے زنی آسان نہیں ہے کہ تصوف سے انحراف و انکار کا باعث کیا تھا۔ البتہ جو چیز ہوش سنبھالنے کے بعد دیکھی اور سُنی وہ یہ تھی کہ مولانا تصوف، خانقاہ اور خانقاہیت کے شدید منکر تھے۔ وہ اپنے گھر پر ہر جمعہ کو درسِ قرآن کا جلسہ کیا کرتے تھے۔ قرآن کریم سے ان کو شغف تھا، عربی لغت و نحو پر ان کو عبور کامل تھا تفسیروں پر نظر تھی۔ تصوف پر جب وہ نکیر کرتے تو کہا کرتے تھے کہ مجھے یہ الزام نہیں دیا جاسکتا کہ ؎ لذت ایں بادہ ندانی بخدا تا نہ چشی

تصوف کے انکار سے ان کے اندر ایک ذہنی انقلاب پیدا ہوا۔ انھوں نے اپنی عمر میں بار بار رائے نہیں بدلی۔ یہی ایک تبدیلی تھی جو اول و آخر ہوئی مگر اس کے نتائج بہت دور رس اور بعد میں تکلیف دہ حد تک غلو کی شکل میں نمایاں ہوئے۔ پہلا نتیجہ تو یہ نکلا کہ وہ تحقیق میں تقلید سے آزاد[1] ہوگئے وہ مسائل میں تحقیق کے وقت براہ راست قرآن و احادیث اور زیادہ تر قرآن کریم سے استشہاد کرتے۔ ائمہ مجتہدین اور ان کے پیرو بزرگوں کے اقوال ان کے لئے دلیل کا درجہ نہیں رکھتے تھے۔ دوسرے الفاظ میں آپ یوں کہہ سکتے ہیں کہ وہ اپنے مقالات میں حوالے کبھی ثانوی ماخذ ______ (SECONCERY SOURCES) کے نہیں دیتے تھے۔ انکارِ تصوف کا دوسرا نتیجہ یہ ظاہر ہوا کہ تصوف کے "سلسلۃ الذہب" سے ان کے اندر ایک کد پیدا ہوگئی اور مناظرانہ جوش میں وہ حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہہ اور خاندان رسالت کے افراد پر اس طرح تنقید کرتے جس طرح شیعہ سنی مناظرہ کرنے والے بعض اہل سنت علماء کرتے ہیں بلکہ ان سے بھی دو قدم آگے۔[2]

---

[1] یہ نتیجہ تو بہت مبارک تھا اسے "تکلیف دہ حد تک غلو" کہنا بڑی زیادتی ہے۔ تحقیق حق میں اگر کوئی شخص اپنے خاندانی یا علمی اکابر یا فرقہ کی تقلید سے آزاد نہ ہو تو وہ تحقیق کر ہی نہیں سکتا۔ (طاہر)

[2] علامہ تمنا خود محترم مقالہ نگار کے ارشاد کے مطابق حضرت فاطمہؓ کی اولاد سے تھے یعنی ہندی محاورہ کے مطابق سید تھے لہذا حضرت علیؓ اور حضرت حسینؓ ان کے جدِ امجد تھے۔ پھر صحابی تھے اور علامہ کا مسلک تو ازاول تا آخر اسوۂ صحابہ کی تعمیل تھا جسے وہ قرآنی اصطلاح میں سبیل المؤمنین کہا کرتے تھے اور اس عنوان پر انھوں نے باقاعدہ ایک کتاب بھی لکھی ہے۔ لہذا اگر وہ صحابۂ کرام کی اکثریت کے مقابلہ میں اپنے اجداد کی ایک آدھ خطاء اجتہادی کا اعتراف کرتے تھے تو یہ تو ان کی حق شناسی کا بہت بڑا ثبوت ہے نہ کہ تکلیف دہ حد تک غلو" کا

غالباً یہی رگ تھی جس نے ان کے قلم سے محمود عباسی کے ان خرافات کی بھی تائید کرادی ۔ جن پر تحقیق کا لیبل علم پر ایک بدترین تہمت[لے] ہے جس میں کھلا دجل، عبارتوں کی قطع و برید، غلط انتساب سب کچھ ہے۔

وہ حدیث کے منکر نہیں تھے۔ یہ ان پر اتہام ہے ۔ وہ نام نہاد اہلِ قرآن کی طرح علم حدیث سے کورے نہیں تھے۔ بلکہ رجال احادیث پر ان کا اتنا بڑا کام ہے جس کی نظیر بہت سے شیخ الحدیثوں کے یہاں نہیں مل سکتی، وہ صرف یہ کہا کرتے تھے کہ حدیثیں قرآن کی ناسخ نہیں ہوسکتیں اور جو حدیثیں نص قرآن سے متعارض ہیں وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں نہیں ہوسکتیں ۔ مگر ہند و پاک کے اس گروہ نے جو اپنے آپ کو اہلِ قرآن کہتا ہے، مولانا کی تحریروں سے خوب خوب فائدہ اٹھایا۔ احادیث کے متون اور رجال سند کی بحثیں جن کا جائزہ لینا ان کے بس میں نہ تھا۔ اس کام کو مولانا عمادی انجام دیا کرتے تھے اس میں ان کی تائید کے پہلو مل جاتے، اُس کو اجاگر کرکے پیش کرتے، اس طبقہ کے اس طرز عمل نے مولانا کو کئی نقصان پہنچائے۔ ایک طرف تو مدارس کے علماء نے ان کو بھی

(بقیہ صفحہ کا حاشیہ) اگر ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ۔ حواریٔ رسول حضرت زبیرؓ اور حضرت معاویہؓ اور حضرت عمرو بن العاصؓ کی خطأ اجتہادی پر زور دینا اور اس کا پروپیگنڈہ کرنا بلکہ اسے عقیدہ بنا لینا جرم نہیں ہے تو حضرت علیؓ و حضرت حسینؓ کی کسی خطأ اجتہادی کا قائل ہونا جرم کیوں ہو؟ کیا ام المؤمنین حضرت عائشہؓ صدیقہ اور حواریٔ رسول حضرت زبیرؓ کی خطائے اجتہادی کا تذکرہ کرنے والے بھی "تکلیف دہ حد تک غلو" کے مرتکب کہلائیں گے یا ان کے خطأ اجتہادی کا تذکرہ کرنا جرم نہیں ہے؟ حضرت! اگر اصول ہو تو سب کے لئے یکساں ہونا چاہئے۔ ورنہ صحابہ کرام میں سے کچھ کے لئے معیار جدا ہو اور کچھ دوسروں کے لئے جدا معیار ہو یہ طرز عمل اصول اور عدل کے خلاف ہے اور فی الحقیقت "تکلیف دہ حد تک غلو" یہ طرز عمل ہے نہ کہ علامہ تمنا کی اصول پسندی جس کی وجہ سے تمام صحابہ کرام کو ایک نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ (طاہر)

لے محترم مقالہ نگار کا یہ فیصلہ بھی انتہا پسندانہ ہے۔ عباسی مرحوم کی یہ کتاب نہ اس قدر بُری ہے جیسا کہ مقالہ نگار کا ارشاد ہے۔ نہ ایسی غیر معمولی جیسا کہ اس کتاب کے معتقدین سمجھتے ہیں۔ اگر محترم مقالہ نگار اس کتاب کو اس حد تک بدترین سمجھتے ہیں تو انھیں کسی مختصر مقالہ ہی میں سہی اس کتاب کی علمی تنقید کرنی چاہئے تھی۔ جذباتی انداز کے الزامات نامناسب ہیں۔

... جیسا مدعی علم سمجھ لیا اس لئے ان کی باتوں کو قابل توجہ نہیں سمجھا اور کبھی ان کا نام بھی لیا تو اسی انداز سے جس طرح پرویز صاحب کا نام تحقیر و استخفاف کے ساتھ علمی و دینی حلقوں میں لیا جاتا ہے۔

دوسری طرف ان محمود عباسیوں، پرویزیوں اور اہل قرآنوں نے مولانا تمنا کی مکمل بات سامنے نہیں آنے دی۔ چند ماہ پہلے ماہنامہ فاران میں مولانا تمنا کا ایک مضمون شائع ہوا تھا جس میں انھوں نے اس مظلومیت کا اظہار کیا تھا۔

عالم باعمل بہرحال اپنے "موتی" کا ذکر خیر کرنا چاہیے، ان کی خاص بات جس کی شہادت ان کے انتقال کے بعد دی جا سکتی ہے اور جس کی شہادت میں صرف اللہ تعالیٰ کی رضا مقصود ہے وہ یہ ہے کہ وہ مخلص اور سچے مسلمان تھے، انھوں نے جو کچھ لکھا اور کہا وہ ان کے ضمیر کی آواز تھی اور ان کی تحقیق کا نتیجہ تھا، انھوں نے اپنے نظریہ کے تحت (کسی یافت کے لئے نہیں) اپنا جما جمایا گھر بنیک نامی اور عزت کی زندگی، خوشحالی اور فارغ البالی کی معیشت کو چھوڑ کر ___ مشرقی پاکستان میں ہجرت کی، اپنے اعزہ اور خاندان کے افراد جن کی بے پناہ محبت ان کے دل میں تھی اور جن کے نازک سے نازک جذبات کا وہ احترام کرتے تھے، ان سب کی بے رخی مول لی، ان کے اخلاص و صداقت کا ایک نمونہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنی دو بیٹیوں کی شادی ایسے خاندان میں کر دی جس کو بہار کی ہندوانہ معاشرت سے متاثر مسلم معاشرہ نسبی اعتبار سے پست سمجھتا تھا، اور خاص طور سے "پھلواری" کے مشائخ کا خاندان جو اس کو "ناک کٹانے" کے مرادف سمجھتا تھا، وہاں انھوں نے کسی تنقید کی پروا نہ کی، یہ کوئی معمولی بات نہ تھی۔ یہ اقدام وہی کر سکتا تھا جس کو اپنے عقائد پر اطمینان کامل ہو، لوں وعظ کہنا اور مضمون لکھ دینا آسان ہے مگر عملی اقدام وہی کر سکتے ہیں جو اولوالعزم ہوں!

ان کا دوسرا وصف یہ تھا کہ وہ عمر بھر ایک نہ تھکنے والے محنتی طالب علم رہے۔ اپنے ہوش سنبھالنے سے لے کر بستر مرگ تک جبکہ ان کو اپنی موت صاف نظر آ رہی تھی علمی تحقیق و جستجو میں مصروف رہے، راقم الحروف کے پاس ان کا آخری خط نومبر کی کسی تاریخ کا ہے انتقال سے

دس پندرہ روز پہلے لکھا تھا۔ اس کی ابتدا اس طرح کی تھی کہ یہ خط اپنے بستر مرگ سے لکھ رہا ہوں، اس خط میں بھی قرآن کریم کے چند الفاظ اور ان کی تعبیر پر تحقیقات کا مفصل ذکر تھا۔ ان کے اس خط کو پڑھ کر مجھے ایک بزرگ عالم کا واقعہ یاد آیا کہ انھوں نے اپنے آخری لمحات زندگی میں کسی سے فرائض کے ایک مسئلہ کو دریافت کیا، لوگوں نے کہا یہ آپ کا آخری وقت ہے اس وقت آپ یہ معلوم کر کے کیا کریں گے انھوں نے جواب دیا کہ کسی شے سے واقف ہو کر مرنا زیادہ بہتر ہے بہ نسبت اس کے کہ جاہل رہ کر مروں!

مولانا تمنا عمادی مجیبی ۱۳۰۵ھ میں ایک کھاتے پیتے گھرانے میں پیدا ہوئے اور ۱۳۹۲ھ میں کراچی میں مسافرانہ بیکسی کی حالت میں فوت ہوئے حق تعالیٰ جل شانہ کی شانِ رحمت جو مغفرت کے لئے بہانہ ڈھونڈتی ہے ان کو بخش دے۔ (آمین)

(ماہنامہ فاران کراچی، مارچ ۱۹۷۲ء صفحہ ۹ تا ۱۱)

دیگر اہلِ علم کے تاثرات

۲۔ مولانا اسد القادری

گل کہوں، بلبل کہوں، گلشن کہوں یا باغباں
تو سبھی کچھ ہے کہوں میں کیا تجھے اے جانِ جاں

مفسّر، محدث، فقیہ، ادیب و شاعر، جامع العلوم وحید العصر، مولانا تمنا عمادی مجیبی کی شخصیت اس قدر جامع الکمالات، جامع الحیثیات اور جامع الجہات ہے کہ فی الحقیقت اپنی مثال نہیں رکھتی۔

چودہ سال تک بخاری و مسلم، بیضاوی و کشاف اور حماسہ و متنبّی جیسی کتابیں پڑھاتے رہے، میرزاہد، ملّا جلال اور صدرا وغیرہ فلسفہ و منطق کی معرکۃ الآراء کتابوں پر اس قدر بلند پایہ حواشی و شروح لکھیں کہ اکابر علماء نے قدر کی نگاہوں سے دیکھا، دیوان امرأ القیس و مقامات کی شرح لکھی، عربی صرف و نحو پر محققانہ کتاب لکھی، اردو، فارسی اور عربی گرامر پر ایسا عبور شاید ہی کسی کو حاصل ہو۔ علم عروض و قوافی میں امام وقت تفسیر و تنقید احادیث میں وسیع النظر ماہر۔ قرآن مجید کے مشہور مفسر، پھر عربی، فارسی، اردو شاعری میں استادانہ مہارت رکھنے والا اگر صرف ایک آدمی ڈھونڈیں تو حضرت استاد ممدوح کے سوا اور کوئی ہندوپاک کی وسیع آبادی میں آپ کو نہ ملے گا۔ شاعر کے الفاظ میں۔ ع

آپ بے بہرہ ہیں جو معتقدِ میر نہیں

۳۔ فراہی مکتب فکر کے مولانا جاوید الغامدی۔ (مدیر ماہنامہ اشراق لاہور)

علامہ تمنا کی تحقیقات سے میں نے بہت استفادہ کیا ہے۔

۴۔ مولانا حبیب الرحمن کاندھلوی

فن اسماء الرجال پر علامہ تمنا کو جو عبور ہے اس کے پیش نظر ان کے سامنے میں خود کو طفل مکتب سمجھتا ہوں۔

۵۔ مولانا افتخار احمد بلخی

مصنف "فتنۂ انکار حدیث کا پس منظر و پیش منظر" جسے جماعت اسلامی کے پروفیسر خورشید احمد نے اپنے مکتب چراغ راہ کراچی سے شائع کیا ہے۔ بلخی صاحب علامہ مرحوم کے شاگرد تھے۔ انھوں نے اپنی اس کتاب کے حصۂ سوم میں جگہ جگہ علامہ تمنا کے تبحر علمی اور حجیت حدیث کے قائل ہونے کا اعتراف کیا ہے۔

۶۔ مولانا جعفر شاہ پھلواروی

جو حضرت شاہ سلیمان پھلواروی کے چھوٹے صاحبزادے ہیں، کپورتھلہ کی جامع مسجد کے خطیب تھے جہاں سر سلطان محمد آغا خاں نے بھی ان کے پیچھے نماز ادا کی۔ جماعت اسلامی کے بانی اراکین میں سے تھے۔ پاکستان بننے کے بعد ادارۂ ثقافت اسلامیہ لاہور کے مقبول ترین مصنف تھے ـــــ مولانا جعفر شاہ صاحب نے علامہ تمنا سے بہت استفادہ کیا ہے۔ علامہ کے سوانح نگار جناب انیس الرحمن ایڈوکیٹ نے مولانا جعفر شاہ کو علامہ مرحوم کے شاگردوں میں شمار کیا ہے۔
مولانا جعفر کہا کرتے تھے کہ مجھے پیر پرستی اور اکابر پرستی کی دلدل سے نکال کر سبیل المؤمنین (راہِ صحابہؓ) پر ڈالنے والے علامہ تمنا ہیں۔ ان جیسا جامع العلوم شخص میری نظر سے نہیں گذرا۔

۷۔ مبلغ اسلام پروفیسر یوسف سلیم چشتی کا اعتراف۔

شارح اقبال اور علامہ اقبال کے قائم کردہ تبلیغی کالج لاہور کے پرنسپل۔
(جہاں سے قاضی مظہر حسین وغیرہ فضلاء دیوبند نے تبلیغ کی تربیت حاصل کی)

کہتے ہیں کہ: قرآن کریم اور قدیم فلسفہ پر علامہ تمنا کو جو عبور حاصل ہے اس کی مثال نہیں ملتی۔ فلسفہ کی قدیم کتابوں اور شیخ اکبر ابن عربی کی فتوحات مکیہ و فصوص الحکم پر گفتگو کرتے ہوئے وہ ان کے صفحوں کے صفحے زبانی سناتے چلے جاتے ہیں۔

۸۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی۔

علامہ تمنا کے بڑے صاحبزادے مولانا امام الدین فائق۔ جماعت اسلامی کے تاسیسی رکن تھے۔ مودودی صاحب نے ان سے ملاقات کے موقعہ پر کہا کہ آپ کے والد اپنے مجتہدانہ ذوق اور علمی تبحّر کے اعتبار سے برصغیر کے امام ابن حزم ہیں۔

۹۔ مولانا اسدالرحمٰن قدسی بھوپالی

جو عالم ہونے کے ساتھ مُرشد طریقت بھی تھے۔ کہا کرتے تھے کہ تصوف پر جس قدر فنّی عبور علامہ تمنا کو حاصل ہے، اتنا ان کے کسی ہم عصر کو حاصل نہیں ہے میں تصوف کا مسند نشین ہونے کے باوجود ان کی تصوف پر تنقیدات کو نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔

۱۰۔ حکیم الامت علامہ اقبال

کی فرمائش پر جب علامہ تمنا عمادی نے انتظار مہدی و مسیح کی روایات پر فن اسماء الرجال کی رُو سے تنقید کی تو علامہ اقبال بہت متاثر ہوئے اور قادیانیت کے خلاف اپنے انگریزی مضامین میں انتظار مہدی و مسیحؑ کے عقیدے کو غیر اسلامی اور مجوسی تصور قرار دیا۔ مولانا عرشی امرتسری سے (جن کی وساطت سے علامہ اقبال نے ان روایات پر تبصرے کی علامہ تمنا سے فرمائش کی تھی) اپنے تاثر کا ان الفاظ میں اظہار فرمایا کہ میرا خیال ہے علامہ ابن حجر عسقلانی کے بعد سے (جس کو عرصہ چھ سَو سال کا ہوتا ہے) اتنا بڑا ماہر فن اسماء الرجال کوئی عالم نہیں ہوا جیسا کہ علامہ تمنا عمادی ہیں۔

۱۱۔ حضرت شاہ سلیمان پھلواروی۔

جن کا احترام سرسید اور علامہ اقبال بھی کرتے تھے۔ سرسید نے اپنے رسالہ تہذیب الاخلاق

میں ان کی تقاریر شائع کی ہیں اور علامہ اقبال نے استفادہ کے لئے شاہ صاحب کو جو خط لکھا تھا وہ شاہ صاحب کے مجموعۂ مکاتیب میں شائع ہو چکا ہے۔ شاہ صاحب علامہ تمنا کے رشتہ دار تھے اور ان سے مختلف مباحث پر تحریری و تقریری مذاکرے بھی ہوتے رہتے تھے۔ مولانا جعفر شاہ کی روایت کے مطابق ان کے والد محترم نے علامہ تمنا کی مہارتِ حدیث پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ اگر دس شیوخ حدیث کی مہارتِ فن یکجا کی جائے تو ایک مولانا تمنا بنتے ہیں۔

۱۲۔ خواجہ احمد امرتسری۔

(علامہ اقبال کے وہ ممدوح جن کی وفات پر علامہ نے فرمایا تھا کہ "ایسے عالم باعمل روز روز پیدا نہیں ہوتے" اور صوفی تبسم کے نام خطوط میں علامہ نے فقہ کی جدید تدوین کی فرمائش بھی انہیں سے کی تھی) خواجہ صاحب نے ایک مرتبہ علامہ تمنا سے یہ سوال کیا کہ دو سجدوں کا قرآن مجید میں کہیں ذکر ہے؟ تو علامہ تمنا نے جواب دیا کہ جی ہاں ایک تو سجدۂ عبودیت کا حکم ہے (فَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ وَاعْبُدُوْا' سورۂ نجم $\frac{62}{53}$) اور دوسرے سجدۂ قربت کا (وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ سورۂ علق $\frac{96}{19}$) خواجہ صاحب یہ استدلال سن کر جھوم گئے اور فرمایا بلاشبہ جیسا سنا تھا ویسا ہی پایا' واقعی اللہ تعالیٰ نے آپ کو بے نظیر ذہانت سے نوازا ہے۔

۱۳۔ حضرت علامہ سید سلیمان ندوی مدظلہ العالے

علامہ تمنا عمادی کی مثنوی "مذہب و عقل" پر تقریظ لکھتے ہوئے سید صاحب لکھتے ہیں:۔

محب گرامی مولانا تمنا عمادی کی مثنوی "مذہب و عقل" پوری پڑھی۔ یہ مثنوی اپنی زبان کی شیرینی، نظم کی لطافت، طریق ادا کی دلکشی، معانی کی بلندی، اور خیالات کی صحت کے لحاظ سے بجہد قابل داد ہے۔ "مذہب و عقل" کی معرکہ آرائیوں کے انسداد کے لیے شاعر کے قلم نے مصالحت کی جو دفعات مرتب کی ہیں ہر دیندار ذی عقل کو

ان سے حرف حرف اتفاق ہو گا۔ فَبِاَيِّ حَدِيْثٍ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ ط

۱۴۔ حضرت علامہ آزاد سبحانی مدظلہٗ

حسان الہند جناب مولانا تمنا پھلواروی مدظلہٗ کی یہ کتاب خود ان کی زبانی پوری پوری، پورے غور و خوض سے سنی اور اس رائے پر پہنچا کہ یہ کتاب اپنے موضوع اپنے مسائل، اپنے دلائل، اپنی زبان، اپنے طرز بیان، ان تمام اعتبارات سے اور سب سے زیادہ اپنی روح حقیقت کے لحاظ سے ایک نادر کرشمۂ فکر اور بہترین آفادۂ عقل ہے۔

اس سے اہلِ دین اور اہلِ عقل دونوں کافی فائدہ اٹھائیں گے نیز مناظرہ بین الدین والعقل کا ایک بہترین قول فیصل جمہور کے ہاتھ آجائے گا۔

مگر افسوس کہ اس کا آفادہ فارسی داں طبقہ تک محدود رہے گا۔ کیا اچھا ہو اگر یہ روح حقیقت اردو قالب میں بھی جلوہ گر ہو کہ اردو دانوں کی وسیع دنیا بھی اس کی جلوہ آرائیوں سے مستفید ہو سکے، میری یہ مخلصانہ دعا ہے کہ یہ کتاب اپنے شایانِ شان قبولیت حاصل کرے۔ آمین

علاّمہ تمنّا ادیبوں کی نظر میں

علامہ تمنّا مرحوم نے سر علی امام کی فرمائش پر شوق سندیلوی کی کتاب اصلاح سخن پر تنقید لکھی جو ایضاح سخن کے نام سے ڈھائی سو سے زیادہ صفحات میں کئی مرتبہ شائع ہوئی اس پر اہلِ نظر ادبا ، اور شعراء نے جو خراجِ عقیدت پیش کیا اس کی چند جھلکیاں دوسرے اڈیشن (۱۹۶۱ء) سے ملاحظہ ہوں۔

۱۔ حضرت نیاز فتحپوری ایڈیٹر نگار لکھنؤ

شوق سندیلوی کی اصلاح سخن تو محض ایک تفنّن تھا، لیکن مولانا تمنّا عمادی نے جو اپنے فضل وکمال وجامعیت علوم کے لحاظ سے اس وقت اپنا جواب نہیں رکھتے، ایضاح سخن لکھ کر اسے فن میں تبدیل کردیا۔

نہ شوق کی غزل میں کوئی خاص بات تھی، نہ اس کی اصلاحوں میں۔ لیکن مولانا تمنّا عمادی نے بہ سلسلہ تشریح وتنقید سیکڑوں لغوی، لسانی، فنّی نکات ایسے پیش کردیے کہ کتاب ایک عالمانہ تصنیف بن گئی۔ سچ ہے جو بھی پارس پتھر کو چھولے تو وہ بھی سونا بن جاتا ہے۔ ص۲۶۵

۲۔ حضرت جوش ملیح آبادی

حضرت مولانا تمنّا عمادی کی کتاب "ایضاح سخن" کے سرسری مطالعے سے میں جس تعجب انگیز مسرت سے دوچار ہوا، اس کی شرح نہیں کی جاسکتی۔

یہ فیصلہ کر کے میں بہت اداس اور مایوس تھا کہ اب شعروادب اور لسانیات کے مقامات ونکات سے یہ عصر، یکسر خالی اور بیگانہ ہوچکا ہے اور

ع "آں قدح بشکست وآں ساقی نہ ماند"

کے بعد زبان وادب کی وادی پر اس قدر گھُپ اندھیرا چھا چکا ہے کہ اس گوشے سے اب کوئی کرن پھوٹ نہیں سکے گی۔

لیکن جس وقت اس کتاب کو کہیں کہیں سے پڑھا میری آنکھیں روشن ہو گئیں اور نہایت خوشی کے ساتھ کہنا پڑا کہ ع

ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

میری تمنا ہے کہ حضرت تمنا کے سے ماہر زبان وفن، تا دیر تندرست اور زندہ رہیں اور اسی کے دوش بدوش میری یہ آرزو بھی ہے کہ وہ سجادے سے دور ہو کر، پھر ایک بار مسند ادب پر جلوہ افروز ہو جائیں اور ادب اردو کے مطلع کو دوبارہ جگمگا دیں۔

مت سہل انھیں جانو، پھرتا ہے فلک برسوں

تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں (۲۶۹)

۳۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی۔

ایضاح سخن کا ایک نسخہ صادر ہوا۔ عزت افزائی کا شکر گذار ہوں۔

..... فن شعر پر آپ کو جو عبور ہے اس پر اعتقاد نہ رکھنے والا "آپ بے بہرہ ہے" آپ ایسے کامل الفن اب بہت کم ملیں گے، گویہ خراج تحسین وہ پیش کر رہا ہے جو شاعری کے فن میں کورا ہے۔

میرا کچھ اس طرح کا خیال ہے کہ ایضاح سخن سے آجکل کے طلبہ نہیں بلکہ ان کے والدین اور اساتذہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں بشرطیکہ ایسے والدین اور اساتذہ رہ بھی گئے ہوں جو فن کے غوامض سے بہرہ یاب ہوں۔ یوں تو ان دنوں والدین اور اساتذہ سے زیادہ ارزاں متاع شاید ہی کوئی اور ہو۔

میں آپ کے تبحر علمی کا جتنا قائل ہوں اتنا ہی اس پر شرمندہ اور متاسف ہوں کہ آپ نے اس کتاب پر اتنا قیمتی وقت اور بے بہا استعداد صرف کی.....

البتہ آپ نے اس سلسلہ میں جو نکات فن، زبان اور اس کے متعلقات بیان کر دئے ہیں وہ ہر اعتبار سے نہایت قابل قدر ہیں جس کے لئے خدمت گذاران شعر و ادب آپ کے احسان مند رہیں گے۔ (ص۲۶۸)

۴ ڈاکٹر عندلیب شادانی (صدر شعبۂ اردو، فارسی۔ ڈھاکہ یونیورسٹی)

ایضاحِ سخن بظاہر شوقؔ سندیلوی کی اصلاحِ سخن پر تبصرہ ہے لیکن درحقیقت یہ دلچسپ کتاب تخلیقی ادب کا مرتبہ رکھتی ہے۔ فن و شعر و ادب کے کتنے ہی مسائل اس خوبی اور شرح و بسط کے ساتھ معرضِ تحریر میں آئے ہیں کہ بے اختیار آفرین کہنے کو جی چاہتا ہے۔

..... اصلاحِ شعر کے موضوع پر اردو میں اور بھی کئی کتابیں موجود ہیں لیکن ایضاحِ سخن میں جس طرح دادِ سخن دی گئی ہے اس کی مثال دوسری جگہ مشکل سے ملے گی۔ (ص ۲۶۳)

علامہ تمناؔ کہ ہیں اک علم کا دریا
واقف نہیں کون آپ سے ادنیٰ ہو کہ اعلیٰ

اخلاق میں اطوار میں تقویٰ میں عمل میں
ذات ان کی نمونہ ہے بزرگانِ سلف کا

کُل عمر ہی گو دین کی خدمت میں لگا دی
دنیا میں صلہ اس کا کسی سے نہیں چاہا

لکھا ہے مہماتِ مسائل پہ بہت کچھ
آسان نہیں جملہ تصانیف کا احصا

بھٹکا نہ کسی تنگیٔ اسبابِ معیشت
سائل نہ ہوا غیر سے اللہ کا یہ بندا

گو شاعری ہے آپ کے رتبہ سے فروتر
جاتا ہے ادھر سے بھی دریفِ کورستا

اس رنگ میں بھی اپنے حریفوں سے ہے ممتاز
استادِ گراں مایہ، گراں پایہ تمنّا (ص ۲۷۱)

۵۔ پروفیسر ڈاکٹر شوکت سبزواری۔ (مدیر اردو لغت ترقی اردو بورڈ کراچی)

قدیم و جدید کی آویزش یوں تو قدیم [illegible] سے ہے اور ہر عہد میں جدید کو قدیم کے مقابلے میں "لذیذ" سمجھا گیا ہے۔ لیکن ہمارے زمانے میں جدید نے یورش کرکے قدیم کو تہس نہس کرنے کی جو آخری کوشش کی ہے وہ اب مجھے سپھل ہوتی نظر آتی ہے۔ جدید علوم و فنون ابھر رہے ہیں۔ قدیم مٹتے جا رہے ہیں۔ جدید تنقیدی نقطۂ نگاہ کی چمک قدیم اندازِ فکر و نظر کو ماند کر رہی ہے اور اب یہ کیفیت ہے کہ قدیم علوم کے ماہر اور قدیم فنون کے حامل جو محققانہ اندازِ فکر کے ساتھ گہری تحلیلی نظر بھی رکھتے ہوں، خال خال ہی نظر آتے ہیں۔

اوریادگار زمانہ سمجھے جاتے ہیں۔ میرے محترم بزرگ مولانا تمنا عمادی حَرَسَہُ اللّٰہُ مِنْ شَرِّ الْاَعَادِیْ انھیں یادگار روزگار میں سے ہیں وہ بقیۃ السلف ہی نہیں "بقیۃ المغتنمات" بھی ہیں۔ خدا تعالےٰ ان کی عمر دراز کرے۔ آمین

مولانا مدظلہ علم وفضل کے ساتھ ساتھ اعلیٰ ادبی ذوق بھی رکھتے ہیں۔ بہت سی علمی، فنی، ادبی کتب ورسائل کے، جن کا پایۂ نقد وتحقیق بہت بلند ہے، مصنف ہیں۔ ان کی لذیذ تر تصنیف "ایضاح سخن" اس وقت میرے سامنے ہے۔ اس میں مولانا مدظلہٗ نے شوق سندیلوی کی "کتاب اصلاح سخن" کی اصلاحات پر ناقدانہ نظر ڈال کر ان کی استادانہ شرح وتنقید کی ہے۔ ضمناً بہت سے علمی وادبی اور لغوی مسائل بھی زیر بحث آگئے ہیں۔ مولانا مدظلہٗ نے دقت نظر اور علمی تبحر سے کام لے کر جس مسئلہ پر روشنی ڈالی ہے اس کی تحقیق وتنقید کا حق ادا کر دیا ہے۔ خدا تعالےٰ ان کو اس کی جزا اور خیر الجزا عطا فرمائے۔ آمین (ص۲۶۶)

۶۔ <u>مفتی انتظام اللہ شہابی</u>۔ جنرل سکرٹری پاکستان اردو اکیڈمی

ایضاح سخن ایک صاحب فضل وکمال بزرگ کا علمی وفنی محاکمہ ہے جن کی علمی حلقوں میں بڑی قدر ومنزلت ہے۔ علامہ تمنا عمادی مدظلہ کی مذہبی اور ادبی تصانیف ایک امتیازی خصوصیت کی حامل ہیں۔ جناب کے علمی تبحر کا میں عرصہ سے معترف ہوں۔ ایضاح سخن کے مطالعہ سے واضح ہوا کہ علامہ ممدوح کو شاعرانہ بصیرت اور فن شعر کی مہارت میں بھی ید طولیٰ حاصل ہے۔ معاصر شعراء کی اصلاح کو فن کے اعتبار سے غیر جانبدارانہ طور سے جانچا، پرکھا اور ان امور کی نشان دہی کی ہے جہاں کلام ہو سکتا ہے۔

شعر وشاعری کے سلسلہ میں ایضاح سخن اپنی نوعیت کی منفرد کتاب ہے۔ سخن سنجوں اور سخنوروں کے لئے ایک دعوتِ فکر ہے۔ اس کتاب کی یہ بڑی خوبی ہے کہ اس میں تعلّی اور کج بحثی نہیں ہے۔ (ص۲۷)

۷۔ <u>پروفیسر محمد مسلم عظیم آبادی</u>۔ سابق پروفیسر سینٹ کولمبا زکالج بہار۔

ایضاح سخن مولانا تمنا عمادی پھلواروی کی اس تصنیف کی جدید اشاعت ہے جو آج سے

چالیس سال پیشتر شوق سندیلوی کی ایک غزل پر اساتذۂ عصر کی اصلاحات بر تنقیدی تبصرہ کے طور پر لکھی گئی تھی ..... مولانا نے قریب قریب ہر علمی جولانگاہ میں جولانی دکھائی ہے، وہ عروضی و نحوی بھی ہیں۔ ایک نغز گو شاعر بھی اور محقق علوم و فنون بھی، مگر اب ان کی منزل ادبیات سے بلند تر ہے اور وہ دینیات کے مرد میداں ہیں۔ بالخصوص علم الرّجال میں ان کی نظیر ہند و پاکستان میں نظر نہیں آتی۔ ان کا تفنّن طبع اور تنوع ذوق مولانا شبلی مرحوم کی یادؔ تازہ کرتا ہے۔ اللہ امت کو ان کی تحقیقات سے مستفیض رکھنے کے لئے انھیں تا دیر بخیر و عافیت سلامت رکھے۔ (ص ۲۶)

۸۔ حضرت ماہر القادری ایڈیٹر فاران کراچی

علامہ تمنا عمادی علم و فضل کا سمندر تھے۔ ان کا مطالعہ اتنا وسیع تھا کہ دور حاضر میں اس قدر کثیر المطالعہ علماء خال خال ہوں گے۔ وسیع الاطراف جامع شخصیت! تجوید کے فن سے عام طور پر بڑے بڑے علماء دین واقف نہیں ہوتے مگر علامہ تمنا اس فن میں بھی درک رکھتے تھے۔ شعر و سخن اور فن عروض میں انھیں استادی کا مرتبہ حاصل تھا۔ آخر عمر میں ہزاروں صفحے قدیم مطالعہ، یادداشت اور حافظہ کی مدد سے لکھ ڈالے! لکھنا اور مسلسل لکھنا ان کی زندگی تھی، تحریر ان کا رات دن کا مشغلہ تھا، بلکہ یوں کہئے کہ اسی شغف، جذبے اور شوق و مشغولیت کے سہارے جی رہے تھے۔

امام مالک ہوں، امام ابوحنیفہ، امام غزالی اور امام ابن تیمیہ ہوں، ان تمام اکابر کے مداح بھی تھے اور کسی نہ کسی مسئلہ میں ناقد بھی۔ اپنے مطالعہ اور تفکر و تدبر پر انھیں بڑا اعتماد تھا ـــــ مسٹر پرویز کی لغات القرآن پر علامہ تمنا عمادی نے بڑی

لہ علامہ تمنا کی سوانح میں ہے کہ پھلواری کی ابتدائی تعلیم میں سید سلیمان ندوی اور علامہ تمنا ایک ساتھ پڑھتے رہے ہیں، اس کے بعد سید سلیمان تو ندوہ لکھنؤ چلے آئے اور علامہ نے دینی تعلیم کی تکمیل تو پھلواری ہی میں کی لیکن شاعری میں وہ علامہ شبلی سے مستفید ہوئے۔ اس طرح وہ اپنے تفنّن طبع اور تنوع ذوق کے اعتبار سے تو علامہ شبلی کا پرتو کمال ہیں ہی، شعر و سخن میں باقاعدہ علامہ شبلی کے شاگرد ہیں۔ (طاہر)

کس کر تنقید کی ہے۔ ان کے کئی مضامین فاران میں بھی چھپ چکے ہیں اور اس موضوع پر نہ جانے کتنے بہت سے مضامین غیر مطبوعہ ہی رہے !

علامہ تمنا عمادی سر سے پیر تک دینی آدمی تھے اور حضرت علیؓ اور آپ کی اولاد امجاد کے لئے دل میں جذبۂ احترام رکھتے تھے لیکن شیعیت کی ضد اور مخالفت نے ان کو اس سطح تک پہونچا دیا کہ سات ہزار اشعار جمل و صفین اور حرہ و کربلا کے تاریخی واقعات پر کہے اور ان کو القصیدہ الزہراء کے نام سے کتابی صورت میں شائع کیا اپنی اس کتاب پر انھوں نے طویل مقدمہ لکھا ہے جس میں ثابت کیا ہے کہ جو روایتیں امیر معاویہ، عمرو بن العاص، مغیرہ رضی اللہ عنہم اور مروان و یزید کے بارے میں مشہور ہیں وہ شیعی مؤرخین کی پھیلائی ہوئی ہیں۔ واقدی و کلبی تو الگ رہے وہ ہشام اور سدی کو بھی کاذب کہتے ہیں۔

کوئی شک نہیں القصیدۃ الزہرا کے مقدمہ کا انداز محققانہ ہے۔ بعض باتیں دل کو لگتی ہیں مگر علیؓ و معاویہؓ کی نزاع میں حق حضرت علیؓ کے ساتھ تھا اور جو تحقیق حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو خطاکار ٹھہرائے وہ تحقیق کوئی وزن نہیں رکھتی[1]۔ حضرت حسینؓ امت کے محبوب و مخدوم ہیں اور یزید و مروان مبغوض اور ناپسندیدہ شخصیتیں ہیں۔[52]

---

[1] حضرت علیؓ اور حضرت حسینؓ معصوم نہ تھے۔ ان سے بھی نیک نیتی کے ساتھ غلطی ہو سکتی ہے۔ اگر حضرت علیؓ کے برخلاف دوسری رائے رکھنے والے صحابۂ کرام یعنی ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ عشرۂ مبشرہ میں سے حضرت طلحہؓ و حضرت زبیرؓ۔ حضرت معاویہؓ و حضرت مغیرہؓ۔ و حضرت عمرو بن العاصؓ وغیرہ کو غلطی پر کہا جا سکتا ہے تو حضرت علیؓ کو خطاء اجتہادی مان لینا جرم کیوں ہو؟ اسی طرح حضرت حسینؓ کو خروج سے روکنے والے صحابۂ کرام کی رائے برحق اور حضرت حسینؓ کی خطاء اجتہادی کیوں نہ تسلیم کی جائے؟ ——

بات یہ ہے کہ مسلمانوں میں بھی رافضیوں کی طرح ان حضرات کو معصوم سمجھنے کے جراثیم پیدا ہو گئے ہیں جس کی وجہ سے ماہر صاحب نے یہ جذباتی رویہ اختیار کر لیا ہے۔ ۵۲ کسی کے ناپسندیدہ ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بلا دلیل ہر الزام اس پر تھوپ دیا جائے۔ قرآن مجید کا صاف ارشاد ہے

لا یجرمنکم شنآن قوم ۵/۸

علامہ تمنا عمادی مرحوم اسلام اور ملت کی خیر خواہی کا بڑا شدید جذبہ رکھتے تھے، دین ان کی گھٹی میں پڑا تھا! نماز میں اللہ اکبر بڑے ہی سوز درد کے لہجے میں ان کے منھ سے نکلتا! اپنی اہلیہ کے انتقال پر مجھے خط لکھا کہ کینسر کا مریض ہوں اور میرا بھی اب چل چلاؤ کا وقت ہے! ان کا گمان ٹھیک نکلا۔ اسی مرض میں ان کا انتقال ہوا۔ عمر نوے کے قریب پائی۔ اللہ تعالیٰ اُن کی لغزشوں سے درگذر فرمائے۔

۹۔ عالی جناب ڈاکٹر ظفر الحسن صاحب پی ایچ ڈی پروفیسر فلسفہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

مولانا تمنا عمادی نے فارسی زبان میں یہ مثنوی "مذہب و عقل" بہت خوب تصنیف فرمائی ہے اور ایک بڑی مشکل فلسفی بحث کو شعروں میں بڑی خوبی سے بیان کیا ہے مولانا کے نزدیک عقل انسان کو ایک حد تک لیجا سکتی ہے، وہاں تک دین کو اس کے موافق ہونا چاہیئے۔ لیکن دین اس حد سے بھی آگے بڑھتا ہے، وہاں عقل کو اس کی مطابقت کرنی چاہیئے۔

مولانا کے نزدیک عقل کی حد محسوسات تک ہے جیسے مولانا نے اس شعر میں بیان کیا ہے۔

عقل بے ایں پنج بنود کارواں　　　چشم و گوش و بینی و جلد و زباں

اجمالاً بہت صحیح ہے اور عہدِ جدید کے سب سے بڑے حکیم کاؤنٹ کا مذہب بھی یہی ہے۔

مولانا کی فارسیت اور شاعری کی داد دینا اہل فن کا حق ہے۔ مگر قرآن مجید کی شان میں جو اشعار اُنھوں نے لکھے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دل کو کلام اللہ سے بے انتہا وابستگی ہے۔

پڑھنے والے اگر توجہ سے اس مثنوی کو پڑھیں گے تو مولانا کے بلند خیالات اور اُستادانہ شاعری سے بہت حد تک متمتع ہوں گے۔

علامہ تمنا عمادی سے انٹرویو

از مجیب الرحمٰن شامی (ایڈیٹر قومی ڈائجسٹ و ہفت روزہ زندگی)

اگر یہ سچ ہے کہ مکان کی عزت اور عظمت مکین سے ہوتی ہے تو پھر اس شہر کراچی میں ہی نہیں پورے برصغیر پاک و ہند میں معدودے چند مکان ہی "العمران"[1] کی طرح باعزت اور باعظمت ہوں گے۔ بظاہر تو العمران بھی شرف آباد کا ایک خوبصورت سا مکان ہے بالکل دوسرے مکانوں کی طرح۔ لیکن اس کے مکین اس ذات ستودہ صفات کے معنوی اور حقیقی جانشین ہیں جس کے انوار ذہنی اور روحانی کی بارش ایک مدت تک پورے برصغیر کو احاطہ کئے رہی۔ حضرت شاہ سلیمان پھلواروی ہماری ملی تاریخ کے ان نامور سپوتوں میں شمار ہوتے ہیں جن کے دم سے ایک دنیا سے اندھیر دور ہوا۔۔۔۔ اسی العمران میں آجکل ایک تراسی سالہ بزرگ علامہ تمنا عمادی ٹھہرے ہوئے ہیں۔ علامہ بھی پھلواری کے اس نامور خاندان کے ہی چشم و چراغ اور حضرت شاہ سلیمان پھلواروی کے خالہ زاد بھائی ہیں۔ قیام پاکستان کے بعد انھوں نے چاٹگام میں سکونت اختیار کی لیکن گاہے گاہے وہ کراچی تشریف لاتے رہتے ہیں۔ علامہ تمنا کے نام سے ایک دنیا واقف ہے۔ ان کے علم و فضل سے انکار ممکن ہی نہیں۔ صوبہ بہار میں انھوں نے پہلی مسلم لیگ قائم کی تھی اور اس کے بعد تو تحریک پاکستان کے لئے تن من دھن سب کچھ وقف کر دیا۔ جمعیۃ علماء ہند سے معرکے ہوئے اور متحدہ قومیت کے بُت کو پاش پاش کرنے میں انھوں نے بہت ہی نمایاں کردار ادا کیا۔

---

[1] یہ نام کراچی میں اس مکان کا ہے جہاں مولانا جعفر شاہ صاحب پھلواروی کی صاحبزادی اور مولانا شاہ سلیمان پھلواروی کی پوتی رہتی ہیں۔ اور جہاں علامہ تمنا عمادی ڈھاکہ سے تشریف لاکر کئی ماہ سے قیام پذیر تھے۔ اور ادارۂ تحقیقات اسلامی (اسلام آباد) کے لئے علمی کام کر رہے تھے۔ علامہ تمنا کی وجہ سے مولانا عبدالعزیز میمنی اور دوسرے اکابر اہل علم کا یہاں ہر وقت آنا جانا رہتا تھا۔

علامہ تمنا بابائے صحافت الحاج مولانا اکرم خاں صاحب کے پرانے رفیق ہیں۔ ان سے مولانا اکرم خاں کی دوستی

ع یہ نصف صدی کا قصہ ہے، دو چار برس کی بات نہیں

مولانا اکرم خاں نے بفضلہ عمر کے نوّیں سال میں قدم رکھا تو میں نے سوچا کہ چلئے علامہ تمنا کے حضور پہونچ کر کچھ مولانا اکرم خاں کی زندگی کے نشیب و فراز کے متعلق ہی گفتگو کی جائے۔ میں نے یہ تمنا مولانا حسن مثنیٰ ندوی کے سامنے رکھی (جو رشتہ میں علامہ تمنا کے پوتے ہیں) تو وہ اپنے مخصوص انداز میں "خوب بہت خوب" کا نعرہ لگاتے مجھے مولانا تمنا عمادی کے پاس لے گئے۔ ایک چھوٹے سے کمرے میں بڑے بڑے تکیوں سے ٹیک لگائے علامہ تمنا تشریف فرما تھے۔ سامنے ایک نوجوان بیٹھا تھا۔ مولانا کچھ بولے جا رہے تھے اور وہ نوجوان[1] لکھتا جا رہا تھا۔ چاروں طرف عربی اور فارسی کی موٹی موٹی کتابیں بکھری ہوئی تھیں۔ اگرچہ علامہ کی نظر بھی خاصی کمزور ہو چکی ہے اور سننے بھی بہت اونچا ہیں۔ اس کے باوجود تحقیق و تالیف کا مشغلہ جاری ہے۔ (اس کے بعد مولانا اکرم خاں کے متعلق علامہ تمنا سے گفتگو کی تفصیل ہے جسے یہاں درج کرنے کی ضرورت نہیں، آخر میں شامی صاحب لکھتے ہیں۔)

---

[1] جس وقت شامی صاحب مولانا حسن مثنیٰ ندوی کے ہمراہ علامہ سے انٹرویو لینے آئے تھے اس وقت علامہ اپنی ایک کتاب "تنقید لغات القرآن" کا مسودہ راقم کو املا کرا رہے تھے۔ اس کتاب میں علامہ مرحوم نے پرویز صاحب کے اس نقطۂ نظر پر سخت تنقید فرمائی ہے کہ وہ اسلامی اصطلاحات کا مفہوم بھی لغات سے متعین کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو درست نہیں، اصطلاحات کا صحیح مفہوم وہی ہے جو تعامل کے ذریعے عہد نبوی سے آج تک منتقل ہوتا چلا آرہا ہے۔ یہی نقطۂ نظر علامہ فراہی اور خود پرویز صاحب کے استاد مولانا اسلم جے راجپوری کا بھی ہے۔

(طاہر)

ظہر کی نماز کا وقت ہوگیا تھا اس لئے نشست برخواست کردی گئی۔ میں مولانا حسن مثنیٰ کے ساتھ ہی علامہ تمنا عمادی صاحب کے کمرے سے باہر نکلا۔ میرے دل و دماغ پر اس صاحب علم و عمل کی ہیبت سی چھائی ہوئی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ جس مقصد کے لئے اس مرد ذی فضل نے اپنی زندگی گذاری اور اپنی تمام صلاحیتیں اس کے لئے وقف کردیں وہ یہی تو تھا کہ پاکستان میں ایک اسلامی معاشرہ قائم ہو۔ اب اس شخص کے قویٰ جواب دے چکے ہیں۔ یہ سمٹا ہوا اجالا جانے کب رخصت ہوجائے لیکن اس کی تمنا اور آرزو — جانے کب پوری ہوگی!

(ہفت روزہ اخبارِ جہاں کراچی ۹ر جون ۱۹۷۶ء صفحہ ۱)

علامہ تمنّاؔ کی تصانیف اور ان کے شاگرد

جناب انیس الرحمٰن ایڈوکیٹ ہائی کورٹ کراچی کی مرتب کردہ علامہ تمنّا کی
سوانح جامع العلوم سے مستفاد

از: ابوالحسن حجازی

کتاب جامع العلوم کے مطابق علامہ تمنّا عمادی مرحوم کی کتابوں کو ہم تین حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

(۱) وہ کتابیں یا مضامین جو مطبوعہ ہیں اور کسی کتب فروش کے ہاں یا کسی لائبریری میں انھیں دیکھا جا سکتا ہے۔

(۲) جو مطبوعہ ہیں مگر نایاب ہیں۔

(۳) جو غیر مطبوعہ ہیں۔

ہر ایک کی تفصیل درج ذیل ہے۔

(۱) جمع القرآن

اس کتاب میں بتایا گیا ہے کہ قرآن کریم رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں کاغذ اور چمڑوں پر کتابی شکل میں لکھا جا چکا تھا، اس کے برخلاف جن روایات میں یہ بتایا گیا ہے کہ قرآنِ کریم صدیق اکبرؓ کے زمانہ میں یا حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں جمع کیا گیا، وہ سب گھڑی ہوئی ہیں اور ان سب کا منبع حدیث کے مدون اول ابن شہاب زہری ہیں جو مسلکاً شیعہ تھے۔

اسی کتاب میں "استوانۃ المصحف" والا مضمون بھی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ مسجدِ نبوی کا وہ ستون جس کے پاس عام مسلمانوں کے نقل کرنے کے لئے سرکاری مصحف نبوی رکھا رہتا تھا، عہد نبوی ہی میں "مصحف والا ستون" کے نام سے مشہور ہو چکا تھا۔

اسی کتاب میں ایک مقالہ اس پر بھی ہے کہ "قرآنِ کریم روایات کے آئینہ میں" کس طرح پیش کیا گیا ہے۔

اب یہ کتاب قرآنک سینٹر کراچی سے شائع کی جا رہی ہے۔

(۲) اعجاز القرآن واختلافِ قراءات — اس کتاب میں قرآن کریم کا سب سے بڑا اور عام فہم اعجاز، اس کے محفوظ ہونے کو بتایا گیا ہے۔ اسی کے ساتھ تاریخ مصاحف پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ قصۂ زیدؓ و زینب کی حقیقت بیان کی گئی ہے۔ محاذ حدیث کے تحت مثلہ معہ پر تنقید ہے۔ مسند احمد کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ محاذ تفسیر کے تحت آیۂ تطہیر، آیۂ ولایت، سورۂ تحریم و ایلاء النبی روایتِ افک اور جادو کی روایات پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ محاذ قراءات کے تحت قراء سبعہ کے حالات اور نقطوں کی ایجاد پر گفتگو کی گئی ہے۔

(۳) حدیث کے مدون اول ابن شہاب زہری اور تاریخ وتفسیر کے مدون اول ابن جریر طبری — اس کتاب میں ان دونوں حضرات کی سوانح اور ان کے ایسے کارناموں کا تعارف کرایا گیا ہے جو انکشاف کی حیثیت رکھتے ہیں۔

(۴) انتظار مہدی ومسیح کی حقیقت — اس کتاب میں علامہ تمنا نے علامہ اقبال کی فرمائش پر مہدی ومسیح کی روایات پر تنقید کی ہے اور انھیں قرآن کی روشنی میں پرکھا ہے۔

نمبر ۲، ۳، ۴ یہ کتابیں بھی الرحمٰن پبلشنگ ٹرسٹ کراچی نے شائع کردی ہیں۔

(۵) ایصال ثواب — یہ چھوٹا سا کتابچہ ہے جس میں مروجہ ایصال ثواب پر تنقید کی گئی ہے۔ (اسے الرحمٰن پبلشنگ ٹرسٹ کراچی نے شائع کردیا ہے۔)

(۶) ایصال ثواب (مذاکرہ) — اس کتاب میں علامہ تمنا اور مولانا ظفر احمد عثمانی کے درمیان ایصال ثواب کے جواز و عدم جواز پر جو تحریری مباحثہ ہوا تھا اس کی تفصیل ہے۔ (یہ کتاب بھی الرحمٰن پبلشنگ ٹرسٹ نے شائع کردی ہے)

(۷) القصیدة الزهراء — یہ کتاب کئی ہزار اشعار پر مشتمل ہے جس میں عہد عثمانؓ و علیؓ اور معاویہؓ کے متنازعہ تاریخی معاملات پر قرآن کریم اور درایت

کی روشنی میں نظر ڈالی گئی ہے۔ شروع میں طویل نثری دیباچہ ہے جس میں جنگ جمل وصفین و کربلا پر نہایت اعتدال و توازن کے ساتھ گفتگو کی گئی ہے۔ یہ کتاب جناب محمود احمد عباسی صاحب نے اپنے مکتبہ محمود سے شائع کی ہے۔

(۸) **القصیدۃ العظمیٰ** یہ قصیدہ زہراء کی تلخیص ہے جسے مشہور شاعر جناب عبدالعزیز خالد صاحب کے لئے لکھا گیا تھا۔ شائع کردہ مکتبہ محمود

(۹) **سبیل المؤمنین** اس میں بتایا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح سنت وہی ہے جس پر صحابۂ کرامؓ عمل پیرا رہے۔ اسی لئے قرآن مجید نے تعامل صحابہؓ (سبیل المؤمنین) کو حُجّت قرار دیا ہے۔ اور اس راہ سے جُدا رہنے والوں کو جہنمی قرار دیا ہے۔ یہ کتاب بھی عباسی صاحب نے مکتبۂ محمود سے شائع کی ہے۔

(۱۰) **کیا اختلافِ امت رحمت ہے؟** اس میں بتایا گیا ہے کہ اصول و عقائد میں اختلاف امت کے لئے رحمت نہیں ہے بلکہ بہت بڑی مصیبت ہے۔ اور اختلاف امتی رحمۃ والی روایت گھڑی ہوئی اور جعلی ہے۔

یہ کتاب بھی الرحمٰن پبلشنگ ٹرسٹ کراچی نے شائع کی ہے۔

دوسری قسم کی کتابیں علامہ تمنا کی وہ کتابیں جو اگرچہ کبھی طبع ہوئی تھیں مگر اب نایاب ہیں درج ذیل ہیں۔

(۱۱) **مثنوی کتاب وسنت** جس میں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کا باہمی تعلق واضح کیا گیا ہے۔ اور بتایا گیا ہے کہ قرآن کریم اصل ہے سب سے پہلے اس پر توجہ ہونی چاہئے۔ اس کے بعد اس کی شرح (سنت رسولؐ و صحابہؓ) پر نظر ڈالنی چاہئے۔ سنت کے صحیح یا غلط ہونے کا معیار بھی قرآن کریم ہے۔ نہ کہ اس کے برعکس قرآن کو پرکھنے کا معیار سنت ہو۔ قرآن کریم سنت پر قاضی و حاکم ہے نہ کہ حدیث و قرآن پر قاضی و حاکم ہو۔ جیسا کہ بہت سے گستاخ روایت پرست کہتے ہیں۔ وغیرہ یہ ایک سو اشعار پر مشتمل فارسی مثنوی ہے۔

(۱۲) **مثنوی مذہب و عقل** | اس میں مذہب و عقل کی جنگ کی تفصیل اور اس کا قطعی فیصلہ دکھایا گیا ہے۔ چار سو فارسی اشعار کی یہ مثنوی کتب خانہ اشرفیہ پھلواری شریف نے شائع کی تھی۔

(۱۳) **مثنوی معاش و معاد** | اس میں بتایا گیا ہے کہ مرنے کے بعد کی زندگی اتنی ہی قطعی و یقینی ہے جتنا دوپہر کے وقت روشن آفتاب۔ بغیر عقائد صحیحہ، عبادات، صادقہ اور اعمال صالحہ کے نجات آخرت غیر ممکن ہے تناسخ وغیرہ پر بھی مکمل بحث ہے۔ یہ آٹھ سو فارسی اشعار کی مثنوی بھی کتب خانہ اشرفیہ نے شائع کی تھی۔

(۱۴) **محکم و متشابہ** | قرآنی ارشاد محکمات و متشابہات کی توضیح کی گئی ہے اور عرفان نفس و عرفان رب یعنی مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ کی مغالطہ آمیز تشریحوں کی تصحیح کی گئی ہے۔ کتب خانہ اشرفیہ سے شائع ہوئی۔

(۱۵) **ہدایت و اضلال** | یعنی یھدی من یشاء اور یُضِلُّ مَنْ یشاء کی نہایت مفصل اور واضح تشریح۔ شائع کردہ کتب خانہ اشرفیہ

(۱۶) **اصولِ خمسہ** | وہ پانچ اسلامی اصول جن سے فرقہ پرور علماء اختلاف رکھتے ہیں۔ ناشر کتب خانہ اشرفیہ۔

(۱۷) **الدینُ القیّم** | اسلام کے بنیادی اصولوں کا تعارف۔ شائع کردہ کتب خانہ اشرفیہ پھلواری شریف

(۱۸) **جہالتِ کفرہ** | دنیا کے بنانے والے (اللہ) اور یوم احتساب (آخرت) کا انکار کرنے والے دہریوں کا جہل مرکب (نہ جاننے کے باوجود ہمہ دانی کا دعویٰ) شائع کردہ کتب خانہ اشرفیہ۔ پھلواری شریف۔

(۱۹) **حقیقت التقویٰ** | تقویٰ نام ہے خلوص کا۔ اور بغیر خلوص کے کوئی عمل مقبول نہیں۔ شائع کردہ کتبخانہ اشرفیہ پھلواری شریف

(۲۰) **حقیقت الصوم** | خلوص پیدا کرنے اور ریاکاری ختم کرنے کی سالانہ پریکٹس روزہ ہے۔ مگر شیطان کے غلاموں نے اسے بھی ریاکاری کا ذریعہ بنالیا ہے۔ اس لئے اس سے اصل مقصد حاصل کرنے کی کیا کیا شرائط ہیں۔ ان کی تفصیل۔ شائع کردہ کتب خانہ اشرفیہ۔ پھلواری شریف۔

(۲۱) **جوہر الصرف** | فن صرف کے بنیادی اور ضروری قواعد پر مشتمل ایک نئے انداز کی کتاب۔ شائع کردہ کتب خانہ اشرفیہ پھلواری شریف

(۲۲) **روح النحو** | نحو کے بنیادی اور ضروری قواعد پر مشتمل ایک نئے انداز کی کتاب۔ شائع کردہ کتب خانہ اشرفیہ۔ پھلواری شریف۔

(۲۳) **جوہر الادب** | قرآن کریم اور صحیح احادیث کے جملوں پر مشتمل عربی ریڈر۔ شائع کردہ کتب خانہ اشرفیہ۔ پھلواری شریف۔

(۲۴) **ایضاح سخن** | اردو ادب پر ایک نہایت بلند پایہ تنقیدی کتاب جس کا دوسرا اڈیشن نواب گنج ڈھاکہ سے شائع ہوا۔

(۲۵) **افعال مرکبہ** | اردو گرامر کی کسی کتاب میں بھی افعال مرکبہ پر اس قدر سیر حاصل بحث نہیں ملے گی جتنی ۱۰۷ صفحات کی اس کتاب میں ہے۔ اس میں افعال مرکبہ کے علاوہ افعال متصلہ اور افعال کی صرف کبیر و صرف صغیر پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اسے مکتبۂ اسلوب ۲۵۹ مسلم لیگ کوارٹرز ناظم آباد کراچی نے شائع کیا ہے۔

(۲۶) **الطلاق مرتان** | تقریباً دو سو صفحات کی اس کتاب میں قرآن مجید کے طریقۂ طلاق پر صرفی، نحوی، لغوی، ادبی اور فقہی ہر اعتبار سے بڑی تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ نواب گنج ڈھاکہ ۱ سے شائع ہوئی تھی۔

(۲۷) **نماز پنجگانہ اور قرآن کریم** | پنجگانہ کی تائید میں قرآن مجید کی آیات سے استدلال کیا گیا ہے۔ کراچی سے شائع ہوئی۔

(۲۸) **دُرِّ ثمین** | ملک یمین لونڈی اور غلاموں کے متعلق قرآنی ارشادات کی تشریح مکتبہ البیان امرتسر نے شائع کی۔

(۲۹) **تحفہ اہل بہا** | بہائیوں کے سوالات کے جوابات پر مشتمل تقریباً دو سو صفحات کی کتاب، مکتبہ البیان امرتسر نے شائع کی۔

(۳۰) **انسان اور اسلام** | تخلیق انسانی اور حیاتِ انسانی کے مختلف عنوانات پر اسلامی احکامات کا مجموعہ۔

(۳۱) **حضرت خدیجہؓ الکبریٰ اور حضرت عائشہ صدیقہؓ** | حضرت خدیجہؓ الکبریٰ کی عمر بوقت نکاح از رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم چالیس نہیں اٹھائیس سال تھی۔ حضرت خدیجہؓ کی ورقہ والی روایت کی حقیقت۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ کی عمر بوقت نکاح از رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ روایت افک اور روایت ایلا و تحریم کی حقیقت۔ کراچی سے شائع ہوئی۔

(۳۲) **بناتُ النّبی** | یہ کتابچہ خاتون پاکستان کراچی کے رسول نمبر میں شائع ہو چکا ہے۔

(۳۳) **وصیّت و وراثت** | دار القرآن نسبت روڈ لاہور سے شائع ہوئی۔ اس میں لا وصیۃ لوارث والی روایت پر تنقید کی گئی ہے۔

(۳۴) **مختلف مقالات و مضامین** | جو ہند و پاکستان کے مختلف رسائل میں شائع ہوئے۔

تیسری قسم کی کتابیں

جو غیر مطبوعہ ہیں اور ان کا تذکرہ علامہ تمنّا کے مختلف مضامین میں آیا ہے۔

(۳۵) **الکلالہ** | جس میں قرآن مجید کی آیت کلالہ پر مفصل بحث کی گئی ہے۔

(۳۶) **البدعہ** | بدعت کیا ہے اور کیا نہیں، اس پر قرآن و سنّت کی روشنی میں گفتگو کی گئی ہے۔

(۳۷) **القول الصواب فی ایصال الثواب** | مولانا محمد منظور نعمانی اور بعض دوسرے اہلِ علم کے جواب میں ایصال ثواب کے

کتاب وسنت، تعامل صحابہ اور ائمۂ اربعہ کے ارشادات کی روشنی میں تفصیلی بحث کی گئی ہے۔

(۳۸) حدیث کساء | آیۂ تطہیر کا قرآنی مفہوم بگاڑنے کے لئے گھڑی گئی روایت کسا (آل عبا) کا تحقیقی تجزیہ۔

(۳۹) رواۃ صوفیہ | اسماء الرجال کی کتابوں میں جن صوفی راویوں کا تذکرہ ہے ان کی تفصیل۔

(۴۰) رواۃ شیعہ | صحاح ستہ کی کتابوں میں جو جو راوی شیعہ ہیں ان کا تذکرہ۔

(۴۱) تنقید لغات القرآن | پرویز صاحب کی مرتب کردہ لغات القرآن کے مختلف مقامات کی تنقید۔

علامہ تمنا کے سوانح نگار جناب انیس الرحمن ایڈوکیٹ نے اپنی کتاب "جامع العلوم" کے صفحہ ۴۴ پر علامہ کی دو اور کتابوں کا تذکرہ کیا ہے۔ ردیف پر ایک رسالہ کا اور قوافی پر ایک رسالہ کا۔ اور ص۴۳ پر علامہ کے صاحبزادے مولوی امام الدین ذوتی کی کتاب "بحر العروض" کا تذکرہ کیا ہے جو ظاہر ہے علامہ کے افادات پر مشتمل ہے۔ سوانح نگار کا کہنا ہے کہ "یہ کتاب مکمل محفوظ ہے جس نے عروض جدید کی بنیاد رکھدی ہے"۔

ص۴۲ ہی پر علامہ کی ایک اور کتاب "عرفان نفس و عرفان ادب" کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ معلوم نہیں یہ سوانح نگار کی غلط فہمی ہے۔ کیونکہ علامہ نے عرفان نفس و عرفان رب کا جملہ اپنی کتاب محکم و متشابہ کے تعارف کے طور پر اس کے شروع میں لکھا ہے۔ یا ممکن ہے سوانح نگار کی معلومات کے مطابق یہ کوئی مستقل علیحدہ کتاب ہو۔

قلمی مسودات | قلمی کتب کے یہ مسودات یا تو علامہ کے چھوٹے صاحبزادے کے ہاں چاٹگام میں ہوں گے جہاں علامہ رہائش پذیر تھے، یا پھر علامہ کے داماد کے ہاں ہوں گے جو مشرقی پاکستان سے ہجرت کرکے کراچی آگئے تھے اور علامہ کا انتقال انھیں کے گھر میں ہوا۔ یا کچھ مسودات وہ ہیں جو علامہ نے لاہوری بلاغ القرآن والے اہل قرآن حضرات کے دلائل کے جواب میں لکھے تھے۔

اور مولانا جعفر شاہ پھلواروی مرحوم کے پاس تھے جو انھوں نے اپنے ایک شاگرد قاضی کفایت اللہ صاحب کے سپرد کر دیئے تھے جیسا کہ ایک ملاقات میں قاضی صاحب نے مفتی طاہر صاحب کو بتایا تھا، قاضی صاحب کا پتہ یہ ہے۔ ادارہ ندائے فرقان ۱۲۔ عالمگیر اسٹریٹ، اسلامیہ پارک لاہور ۲۵

شیعہ اور صوفی رواۃ کے متعلق علامہ کے مسودات کے متعلق سنا ہے کہ وہ جناب محمود احمد عباسی صاحب کے پاس تھے۔ ان کے انتقال کے بعد یہ مسودات اور خود مرحوم عباسی کے حضرت علیؓ کی سوانح اور نہج البلاغہ وغیرہ کے متعلق کئی مسودات بالکل غائب ہیں کہا جاتا ہے کہ کوئی رضوی صاحب سُنّی کے روپ میں اس قدر آگے بڑھے کہ عباسی صاحب کے انتقال کے فوراً بعد محمود اکیڈمی بنا کر اس کے صدر بن گئے اور مرحوم کی جس قدر علمی وراثت تھی وہ سب غائب کر دی، حتیٰ کہ عباسی مرحوم کے واحد جسمانی وارث ان کے نواسے کے پاس بھی اب کوئی مسودہ نہیں رہا (یاد رہے کہ عباسی مرحوم کا کوئی لڑکا نہیں تھا، صرف صاحبزادی تھیں، ان سے مرحوم کے نواسے عباسی صاحب کے وارث ہوئے۔ انّا للہ و انّا الیہ راجعون۔

علامہ تمنا کے شاگرد | شاعری میں تو علامہ تمنا کے شاگردوں کی تعداد بہت زیادہ ہے ایضاح سخن کے آخر میں بھی علامہ کے شاگرد کئی شاعروں کے قطعات موجود ہیں جن میں وہ اپنے نام کے ساتھ تمنائی لکھتے ہیں۔

اہل علم میں جو حضرات علامہ کے سوانح نگار نے ان کے شاگرد کی حیثیت سے گنوائے ہیں وہ یہ ہیں۔ مولانا اسد القادری (ص۹۵) مولانا جعفر شاہ پھلواروی (ص۹۶) مولانا جعفر شاہ کے بھائی مولانا غلام حسنین پھلواروی (ص۹۷) سر فخر الدین وزیر تعلیم صوبہ بہار (جنکی عربی تعلیم کے لئے علامہ نے صرف و نحو کی کتابیں مرتب کی تھیں) جناب عبد العزیز بیرسٹر ڈاکٹر عندلیب شادانی۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری، اور بہت سے اہل علم مثلاً مولانا افتخار احمد بلخی جو کراچی یونیورسٹی میں لیکچرار تھے اپنی کتاب "انکار حدیث کا پس منظر و پیش منظر" کی تیسری جلد میں علامہ کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے اس کا بھی تذکرہ کرتے ہیں کہ میں پھلواری شریف

یں علامہ کا شاگرد رہ چکا ہوں۔ اسی طرح مفتی طاہر صاحب کے سامنے علامہ نے ایک مرتبہ فرمایا کہ دکن کے نواب بہادر یار جنگ صاحب نے علامہ کو کئی ماہ اپنے ہاں بیت الامت میں ٹھہرا کر قرآن مجید کے مشکل مقامات حل کروائے۔ مولانا احمد رضا خاں بریلوی کے ایک خلیفہ جو صوبہ بہار کے تھے اور اسی حوالہ سے "صحیح بہاری" کے نام سے ایک کتاب کے مؤلف بھی ہیں جس میں بریلوی معتقدات کی تائید پر مبنی احادیث جمع کی گئی ہیں، علامہ کے ابتدائی دور کے طلبہ میں سے تھے۔ ان کے علاوہ بھی معلوم نہیں کتنے حضرات نے علامہ کے پندرہ سالہ دور تدریس میں ان سے استفادہ کیا ہوگا۔ لیکن چونکہ ان کی تفصیلات معلوم نہیں اس لئے ہم اس عنوان کو یہیں پر ختم کرتے ہیں۔

قرآن مجید

علامہ تمنا عمادی کی فارسی مثنوی "معاش و معاد" سے ماخوذ

اے زہے فرمان رب العلمین
از زبان رحمۃ للعلمین

واہ وا، رب العلمین کا ارشاد اور رحمۃ للعلمین کی زبان مبارک سے!

اے زہے توقیع رحمت کز ازل
شد بنام ما ز رب لم یزل

واہ وا، رحمت کا شاہی فرمان، ربِ لم یزل کیطرف سے اوزہم جیسے حقیر بندوں کے نام

آں کتاب اللہ فرقانِ مبین
اُنظُرُوا فیہِ ھُدًی لِلمُتَّقِینْ

لوگو یہ اللہ کی کتاب اورحق و باطل کے درمیان واضح کسوٹی ہے، بُرائی سے بچنے کا جذبہ رکھنے والوں کیلئے اسمیں عظیم الشان ہدایت ہے۔ اس کا غور سے مطالعہ کرو!

بے مثال و بے عدیل و بے شبیہ
اِقرَأُوا فِیہِ ھُدًی لَا رَیبَ فِیہْ

یہ وہ بے مثال کتاب ہے جس کے ہمسر اور ہم رتبہ کوئی کتاب نہیں، اس لاریب فیہ کتاب کا مطالعہ کرو، ہدایت پا جاؤ گے۔

ہست از نور و ہدیٰ ہر آیتش
بحرِ بے پایاں، کہ نبود غایتش

اسکی ہر آیت نور و ہدایت کا وہ بے پایاں سمندر ہے جس کی کوئی حد و نہایت نہیں!

ہم مُوثِّق ہم مُوثَّق ہم وثوق
ہم مُصَدَّق ہم مصدِّق ہم صدوق

وہ مضبوط ہے، مضبوطی بخشنے والا ہے اور نہایت قابلِ اعتماد ہے، وہ اللہ سے تصدیق شدہ ہے، سچوں کی تصدیق کرنیوالا ہے اور بھرپور سچائی ہے۔

ہم مکمَّل ہم مکمِّل، ہم کمال — ہم جلیل و ہم جلال و ہم جمال

خود مکمل ہے، دوسروں کو مکمل کرنیوالا ہے اور سراسر کمال ہے، عظیم و جلیل ہے منکروں کے لیے جلال کا اور ماننے والوں کے لیے جمال کا مظہر ہے۔

ہم کفایت ہم ہدایت ہم شفا — بہتر تو کافی چو خواہی اکتفا

زندگی کے ہر پہلو کیلئے کفایت کرتا ہے، ہدایت ہے شفاء ہے، تمہارے لیے ہر صورت کافی ہے بشرطیکہ تم بھی اسے اپنے لیے کافی سمجھو!

دفتر پر مغز قانونِ ازل — وہ چہ آئین، وہ چہ دستور العمل

ازلی قانون کا پر مغز دفتر ہے، سبحان اللہ کیا اعلیٰ درجہ کا آئین اور کتنا عظیم دستور عمل ہے۔

صفحہ اش از رہبران بزم شگرف — واندراں شمع ہدایت حرف حرف

اسکا ہر صفحہ رہنماؤں (انبیاء کرام) کی ایک اعلیٰ درجے کی مجلس ہے اسکا ایک ایک حرف شمع ہدایت ہے

ہر ورق از لطف و رحمت دفترے — عقل را ہر سطر او روشنگرے

اسکا ہر ورق لطف و رحمت کا ایک دفتر ہے۔ اسکی ہر سطر عقل کو منور کرنیوالی ہے

سورتش بیند اگر صورت پرست — جز لسوالیش ندارد تا سراست

اگر کوئی صورت پرست اس کی کسی سورت کو دیکھ پائے تو (اسکی فصاحت و بلاغت میں) محو ہو کر رہ جائے

لفظ لفظش ہمچو شوخے مہوشے — دلربائے، دلکشائے، دلکشے

اسکے ہر لفظ میں محبوبیت کی شان ہے، دل ربائی ہے دلکشائی ہے اور دلکشی ہے

در منظر ہر نقطہ اش نجم ہدیٰ — در اثر ہر شوشہ اش حبّ الشفا

دیکھنے میں اسکا ہر نقطہ راہ دکھانیوالا ستارہ ہے اور تاثیر میں اسکا ہر شوشہ حبِّ شفا ہے (صحت بخش گولی)

گلشنے، در ہر خیاباں صد بہار   بحرِ بے پایانِ حکمت در کنار

اس کی ہر کیاری ایک بہارستان ہے وہ دانائی کا ایک بحرِ بے پایاں ہے۔

دینِ حق پروردۂ آغوشِ او   کیف خبرت درمئے سرجوشِ او

دینِ حق اس کی گود میں پالا گیا۔ اسکی مئے پرجوش میں علم و آگاہی کا سرور ہے۔

معجزِ کامل باعجازِ اتم   نامد و ناید چو او تا حشر ہم

وہ ایک کامل معجزہ ہے جس کی مثال ازل سے آج تک نہیں ملتی اور نہ حشر تک مل سکے گی۔

شاہدِ مقصود را خطِ جبین   حبذا تنزیلِ ربّ العلمین

وہ معشوقۂ مقصد کا خطِ پیشانی ہے۔ واہ وا! رب العلمین کیطرف سے نازل شدہ اس کتاب کا کیا کہنا

نیست گر سر بر خطِ فرمانِ او   عقل راہ گم کند طغیانِ او

اگر عقل اس کی پیروی نہ کرے تو اپنی سرکشی میں گمراہ ہو جائے گی۔

یا الٰہی فیہ کمّل رغبتی   وھو نورٌ منہ نوّر تربتی

اے اللہ میرے دل میں قرآن کریم کی مکمل رغبت پیدا فرما دیجئے اور اس کے نور سے میری آخرت کو روشنی بخشئے۔

غیر سودائش مبادا در سرم   جلوۂ اش من بنگرم تا بنگرم

اس کے سوا مجھے کوئی اور یاد نہ آئے میرے سر میں اسی کا سودہ سمایا رہے

سعیِ من یارب نباشد جز در آں   تا زیم باشم بر آں میرم بر آں

میری کوششیں اسی کے لیے وقف ہو جائیں، جب تک زندہ رہوں اسکا مطیع رہوں اور جب مروں تو اسی کی اطاعت کرتا ہوا وفات پاؤں۔

اِعجازُ القرآن

حصّہ اوّل

بسم اللہ الرحمن الرحیم و به نستعین

الحمد للہ رب العلمین و سلام علی المرسلین لا سیما علی خاتم النبیین صلی اللہ علیه و علیٰ اصحابه اجمعین

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک سے آج تک ہر فرد مسلم جو قرآن مجید سے کسی حد تک بھی واقف ہے اور یہ ایمان رکھتا ہے کہ یہ کتاب اللہ کی طرف سے نازل ہوئی ہے، وہ اس عقیدے کا معتقد اور اس دعوے کا مدعی ضرور رہا اور ہے اور قیامت تک ہر مسلم کا یہ عقیدہ اور یہ دعوے رہے گا کہ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور یہ ایک ایسا پائیدار، ناقابل انکار کھلا اور روشن معجزہ ہے جس کی مثال دنیا پیش نہیں کر سکتی سارے عالم کے تمام جن دانس بھی چاہیں کہ سب مل کر اس کی مثال بنا کر پیش کریں تو نہیں کر سکتے۔ تاریخ اس کی شاہد ہے کہ بڑے بڑے فصحا و بلغا نے ایسا کرنا چاہا مگر ان کو اپنی ناکامی اور اپنی سعی کی ہیچ انجامی کا اعتراف کرنا پڑا۔

قرآن کا چیلنج

قرآن مجید کے ایسے روشن معجزہ ہونے کا دعویٰ نہ صرف مسلمانوں کو ہے بلکہ خود قرآن مجید نے باآواز بلند اس کی تحدی کی اور تمام منکرین کو ببانگ دہل اس کی مثال پیش کرنے کا چیلنج دیا اور بار بار چیلنج دیا مگر منکرین کی دنیا اس چیلنج کے متعلق ایسی شہر خموشاں بنی رہی کہ صدائے بر نخواست۔ سورۃ ہود میں ہے (آیت ۱۳)

ام یقولون افترنه قل فاتو ابعشر سور مثله مفتریت و ادعو امن استطعتم من دون الله ان کنتم صدقین ه فالّم یستجیبو الکم فاعلمو اانما انزل بعلم الله و ان لا اله الا هو فهل انتم مسلمون ه

کیا یہ منکرین کہتے ہیں کہ رسولؐ نے (اپنی طرف سے یہ آیتیں بنا کر اللہ تعالیٰ پر)

ان کا افتراء کیا ہے؟ کہہ دو تو ایسی ہی افترائی دس سورتیں تم (بھی) بنا کر لاؤ اور اللہ تعالیٰ کے سوا جن کو بھی پکار سکو پکارو (اور اس کام میں اس کی مدد حاصل کرو) اگر تم اس الزام افتراء میں سچے ہو تو جب یہ منکرین تمہارے اس چیلنج کو قبول نہ کریں (اور گریز کریں) تو اے مسلمانو! سمجھ لو کہ یہ کتاب اللہ تعالیٰ کے علم سے نازل ہوئی ہے اور اللہ کے سوا کوئی دوسرا معبود نہیں تو پھر تم تو مسلمان ہونا؟

یہ کھلا ہوا چیلنج جب کفار و مشرکین عرب کے پاس پہنچا تو وہ بہت گھبرائے کیونکہ قرآن مجید کی معجزانہ فصاحت و بلاغت کا سکہ ان کے دلوں پر بیٹھا ہوا تھا مگر اپنی دلی خفت مٹانے کے لئے ہٹ دھرمی کے ساتھ یوں بول گئے تھے کہ **قد سمعنا لو نشاء لقلنا مثل هذا** (یہ چیلنج ہم نے سنا، اگر ہم بھی چاہتے تو ایسا کہدیتے) اگر چاہتے تو ایسا کہدیتے مگر چونکہ چاہتے نہیں ہیں اس لئے نہیں کہتے ہیں۔ کیسی صریح ہٹ دھرمی کا جواب ہے اس کھلے چیلنج کے بعد بھی اگر نہیں چاہتے تو کب چاہتے۔ اور ان کی رگ غیرت میں کب جوش آتا۔ اس ہٹ دھرمی کے جواب کا یوں جواب دیا گیا **قل لئن اجتمعت الانس و الجن على ان یا توا بمثل هذا القران لا یا تون بمثله و لو كان بعضهم لبعض ظهيرا** کہہ دو اے رسولؐ (کہ تم کیا ہو) اگر تمام جن و انس اس بات کے لئے مجتمع ہوں کہ اس قرآن کی مثال بنا کر لائیں تو اس کی مثال نہیں لا سکتے، اگرچہ بعض بعض کے مددگار ہو جائیں (۱۷، ۸۸)

اس کے بعد پھر دوبارہ اس پہلے چیلنج کو اور پر زور کر کے یوں پیش کیا گیا۔

ام یقولون افتره قل فاتوا بسورة مثله و ادعوا من ستطعتم من دون الله ان كنتم صدقين ہ (یہ منکرین ابھی تک) یہ کہتے ہیں کہ (اس کتاب کو رسولؐ نے اپنی طرف سے) بنا کر اللہ تعالیٰ پر افترا کیا ہے؟ کہدو کہ لے آؤ ایسی ایک سورۃ بھی (بنا کر) اور اللہ کے سوا جن کو بھی (اپنی مدد کیلئے) پکار سکو

پکارو اگر تم سچے ہو۔ (۱۰/ ۳۸) فبھت الذی کفر تو پھر یہ سن کر ہر منکر مبہوت ہو کر رہ گیا اور کچھ جواب نہ چلا۔

قرآن کا پہلا دعویٰ اور تین اقسام مخاطبین

فاتحۃ الکتاب یعنی سورۃ فاتحہ جو قرآن کا مقدمہ یعنی دیباچہ ہے اس کے بعد پہلے پہل جو سورۃ آپ کے سامنے آتی ہے اس کی پہلی آیت قرآن مبین کا ایک بہت بڑا دعویٰ ہے فرمایا گیا ذلک الکتب لاریب فیہ (یہ کتاب اس میں شک کی گنجائش ہی نہیں) ھدی للمتقین ہ (تقویٰ والوں کے لئے سامان ہدایت ہے) تقویٰ والے کون ہیں اس کو اسی قرآن میں بتا دیا گیا ہے الذی جاء بالصدق و صدق بہ اولئک ھم المتقون (جو شخص سچائی لے کر آیا اور سچائی کے سچائی ہونے کو مان کر اس کا اعتراف اس نے کر لیا ایسے ہی لوگ متقی ہیں) اور اس کے برعکس ہٹ دھرم ہیں۔ یعنی ہٹ دھرم وہ ہے جو سچی بات کو سچی بات جانتے ہوئے بھی اس کا انکار کرے اور کبھی اس کو تسلیم نہ کرے، تو جو شخص ہٹ دھرم ہوگا اس کو قرآن سے کبھی کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا، وہ تو ماننے والا ہی نہیں ہاں جو شخص سچا ہو اور سچی بات مان لیتا ہو بس وہی قرآنی ہدایات سے مستفیض ہو سکتا ہے۔

قرآن کو تین جماعتوں سے سابقہ پڑا۔ ایک جماعت متقین کی جو سچے تھے اور سچی بات مان لینے کے عادی تھے، یہی لوگ چونکہ ایسے تھے جو قرآن مجید سے فائدہ ہدایت اٹھا سکتے تھے اور قرآن در حقیقت انھیں کے لئے نازل ہوا۔ اس لئے سب سے پہلے انھیں کا ذکر کیا گیا چونکہ ایسے لوگ کچھ اہل کتاب میں بھی تھے۔ اور کچھ امیّوں میں بھی یعنی جن کے پاس کوئی آسمانی کتاب نہ تھی اس لئے ان دونوں جماعتوں کے متقین کا ذکر یوں فرمایا گیا کہ پہلے "الذین" سے اُمیّین کے اہل تقویٰ اور پھر "والذین" سے اہل کتاب کے اہل تقویٰ کی تصریح کرتے

ہوئے دونوں جماعتوں کے متقین کے متعلق فرمایا گیا کہ اگر یہ تقویٰ پر قائم رہے اور اس کتاب پر ایمان لے آئے تو او لئک علیٰ ھدی من ربھم و او لئک ھم المفلحو ن یہی لوگ اپنے رب کی طرف سے آئی ہوئی ہدایت پر ہیں اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔ متقین کے بعد ان کی ضد یعنی ہٹ دھرموں کا ذکر کیا یعنی دوسری جماعت جس سے قرآن کو سابقہ پڑا، وہ ان ہٹ دھرموں کی جماعت ہے جنہوں نے انکار ہی کی ٹھان لی ہے ان کو نتیجۂ کفر سے ڈرایا جائے یا نہ ڈرایا جائے وہ کبھی ایمان لانے والے نہیں ہیں اس جماعت کا حکم یوں بیان فرمایا گیا۔ ختم اللہ علی قلو بھم و علیٰ سمعھم و علیٰ ابصارھم غشاو ۃ و لھم عذاب عظیم اللہ نے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر (ان کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے) مہر کر دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ (ہٹ دھرمی کا) پڑا ہوا ہے اور ان کیلئے بڑا عذاب ہے۔ تیسری جماعت جس سے قرآن کو سابقہ پڑا وہ منافقین کی جماعت ہے ان کا حال بیان کر کے ان کا حکم بیان فرمایا گیا کہ او لئک الذین اشترو ا الضلالۃ بالھدیٰ فما ربحت تجارتھم و ما کانو ا مھتدین یعنی یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے گمراہی کو ہدایت دے کر خرید لیا۔ مگر ان کی یہ تجارت ان کے لئے سود مند نہ ہوئی اور یہ (سچے ہدایت یافتوں کے ساتھ کھلے ملے رہنے کے باوجود) ہدایت یافتہ نہ ہوئے۔

پھر منافقین کے مناسب حال دو مثالیں دے کر سمجھایا اور یہ مضامین پہلی ہی سورۃ یعنی سورۃ بقرہ کے پہلے ہی دو رکوع میں دوسرے مضامین سے پہلے بیان فرمائے گئے تیسرے رکوع میں پورے عالم انسانیت کو مخاطب کر کے ان کو صرف اپنے رب کے بندے بنے رہنے اور شرک سے بچنے کی طرف دعوت دی گئی، جو قرآن کی اصل ہدایت ہے۔ اس کے بعد ہی ہٹ دھرموں پر اتمام حجت کے لئے ایک [illegible] دست تحدی کی جاتی ہے یعنی منکر [illegible] بذبین کو ایک کھلا

چیلنج دیا جاتا ہے کہ و ان کنتم فی ریب ممانزلنا علیٰ عبدنا فاتو بسورة من مثله و ادعو اشهداء کم من دو ن الله ان کنتم صادقین فان لم تفعلو او لن تفعلو افاتقو النار التی و تو دها الناس و الحجارة اعدت للکافرین ہ اور اے لوگو! اگر تم کسی شک میں ہو اس چیز کے بارے میں جس کو ہم نے اپنے بندے پر اتارا ہے تو ایسی ایک سورة بھی بنا کر لے آو اور اللہ کے سوا اپنے تمام مددگاروں کو پکارو، اگر تم سچے ہو۔ پھر اگر تم ایسا نہ کر سکو (یعنی ایک سورة بھی ایسی بنا کر نہ لاسکو) اور کبھی نہ کر سکو گے۔ تو پھر اس آگ سے ڈرو جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے جو کافروں کے لئے مہیا کر رکھی ہے (۲/ ۲۳۔۲۴)

شروع میں یہ دعویٰ کیا کہ یہ کتاب لاریب فیہ ہے، (اس میں ریب و شک کی گنجائش ہی نہیں) یہاں اتمام حجت کے لئے فرمایا ہے کہ تم کو اس کتاب میں کچھ شک، ہو تو ایسی ایک سورة ہی بنا کر لاؤ۔ پھر یہ بھی پیشین گوئی خود ہی فرمادی کہ تم ایسی کوئی سورة کبھی بنا کر نہ لاسکو گے اتنا بڑا زبردست چیلنج وہ بھی بالکل غیر مشروط تقریباً چودہ سو برس سے آج تک آسمان کے گنبد گرداں میں ہر طرف گونج رہا ہے مگر اس وقت سے اس وقت تک تمام منکرین و مذبذبین سرمہ در گلو مبہوت و خموش ہی رہے جیسے کسی کے منہ میں زبان ہی نہیں کیا اس کتاب کی لاریبیت اور منجانب اللہیت کے لئے ایسے زبردست اتمام حجت کے بعد بھی کسی مزید حجت طلبی کی گنجائش باقی ہے۔

قرآن کی لاریبیت

قرآن کی لاریبیت اس کے تمام دعووں کی صداقت سے متعلق ہے، اس لئے کہ اس کتاب کا یہ دعویٰ ہے کہ یہ کتاب منزل من اللہ ہے، حق ہے، رحمت ہے اور تمام عالم کے لئے سامان ہدایت ہے اگرچہ نفع بخش یہ متقین ہی کے

لئے ہے مگر ہٹ دھرم منکرین اور تذبذب و شک کے بتلاؤں کے حق میں تمام حجت ہے اس کی ہر تعلیم ساری دنیا کے لئے باعث ترقیات دنیوی و فلاح اخروی ہے - اس کتاب کی تعلیم سے روگرداں رہ کر کوئی شخص، کوئی قوم، کبھی صحیح کامیابی نہیں حاصل کر سکتی غرض قرآن کا ہر دعویٰ لاریب فیہ ہے، اس کی ہر تعلیم، ہر عبارت، ہر جملہ بلکہ ہر حرکت و سکون لاریب فیہ ہے دنیا کا کوئی صاحب عقل و ہوش اس سے انکار نہیں کر سکتا۔

دوسرا دعویٰ

قرآن کا ایک دعویٰ یہ بھی ہے کہ اس میں لفظاً و معنیً کسی طرح کا اختلاف نہیں:

و لو کان من عند غیر اللہ لو جدو افیہ اختلافاًکثیراً (۴ / ۸۲)

اگر یہ کتاب اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتی تو لوگ اس میں بہت سے اختلافات پاتے ظاہر ہے کہ جو کتاب ۲۳ برس میں تھوڑا تھوڑا کر کے مختلف احوال اور مختلف ماحول میں لوگوں کے سامنے آئی اور اس میں کبھی کسی طرح کا ردو بدل نہ ہوا ضروری ہے کہ مختلف زمانوں اور مختلف ماحول کی وجہ سے اگر کوئی انسان اس کا مصنف ہوتا تو متضاد باتیں بولنے پر مجبور ہوتا کیونکہ آئندہ کا علم کسی انسان کو نہیں جو اس کی رعایت رکھتے ہوئے بولا کرے مگر اللہ تعالیٰ تو عالم الغیب ہے آئندہ کیا کیا ہونے والا ہے وہ خوب جانتا ہے ابتداء ہی سے یکساں انداز بیان رکھا۔ مسلمانوں کے ضعف و مظلومیت کے زمانے میں بھی قرآن کا لب و لہجہ کبھی کمزور نہ رہا۔ غرض قرآن میں دعویٰ عدم اختلاف بھی اپنی لاریبیت کی ایک خاص شان رکھتا ہے - اور یہ دعویٰ لاریبیت کی ایک دلیل کی حیثیت سے ہی پیش کیا گیا ہے -

کیا فصاحت و بلاغت ہی قرآن کا اصلی اعجاز ہے

قرآن کی فصاحت و بلاغت جس طرح معجزانہ ہے اسی طرح قرآن کی ہر تعلیم معجزانہ ہے ہر طرز بیان معجزانہ ہے، قرآن مجید کی ہر چیز اپنے اندر کوئی نہ کوئی اعجاز ضرور رکھتی ہے اس لئے معیار اعجاز کے لئے صرف اس کی فصاحت و بلاغت کو پیش کرنا دراصل قرآن کی حقیقت سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔

قرآن کا اعجاز کیا ہونا چاہیئے

قرآن کے مخاطب عہد نبویؐ سے لے کر قیامت تک کے سارے جن و انس ہیں۔ یہ کتاب تمام عالم کے لئے ہدایت ہے اس لئے اس کتاب کو تمام عالم کے لئے معجزہ ثابت ہونا چاہیئے صرف اس کی فصاحت و بلاغت کے اعجاز کو اہل عرب ہی سمجھ سکتے ہیں یا وہ عجمی جو ادب عربی سے پوری طرح واقف ہوں۔ اس کی سیاسی تعلیمات کے اعجاز کو ماہرین سیاست ہی بھانپ سکتے ہیں۔ اس کی قانونی و آئینی ہدایات کی معجزیت کو قانون داں حضرات ہی جان سکتے ہیں اس کی نفسیاتی معجزانہ عنوان موعظت و انداز بیان کو فلسفیان نفسیات ہی تاڑ سکتے ہیں اور اس کے سراپا اعجاز تعلیم حکمت و تزکیہ نفس کا اعتراف نفس زکیہ والے حکماء ہی کو ہو سکتا ہے اس لئے اس میں کوئی بات ایسی بھی ضرور ہونی چاہیئے جو بلا تفریق طبقات و قبائل کو بلا امتیاز امیال و عواطف ہر دور میں ہر انسان پر اس کتاب کے اعجاز کو ایسی وضاحت و ہدایت کے ساتھ ثابت کرتی رہے جس سے کسی سچے شخص کو انکار ممکن نہ ہو اور پھر وہی بات قرآن کا اصلی اعجاز سمجھی جائے گی۔

قرآن کا اصلی اعجاز

قرآن کا اصلی اعجاز اس کی لاریبیت ہے یعنی کوئی صاحب عقل و ہوش اگر وہ سچا آدمی ہے اور سچی بات کی سچائی کا اعتراف دیانت کے ساتھ کرنے کا خوگر ہے تو اس کتاب کے حالات و مضامین کو دیکھ کر یا سن کر وہ مجبور ہوگا کہ بغیر کسی ریب و شک کے اس کتاب کو منزل من اللہ اس کی آیتوں کو کلام اللہ اور جن پر یہ کتاب اتری ان کو رسولَ اللہ. بلا چون وچرا تسلیم کرلے اور یہی اس کتاب کا اصلی اعجاز ہے۔

فرق امیال و عواطف

یہ ہو سکتا ہے کہ ایک فصیح و بلیغ، عربی زبان کا ادیب، قرآن کی فصاحت و بلاغت کی معجزانہ شان دیکھ کر اس پر ایمان لے آئے، ایک حکیم اس کی تعلیم میں حکمت و تزکیہ نفس کا اعجاز سمجھ لینے کے بعد اس کی لازمیت کا اعتراف کر لے ، ایک قانون دان اس کے قانونی ہدایات کی معجز نما استواریوں کو دیکھ کر بے اختیار کہہ اٹھے کہ ذٰلک الکتٰب لاریب فیہ مگر ایک عامی جو کسی فن، کسی علم میں کوئی دستگاہ نہیں رکھتا، اس کتاب کے اعجاز کو کس طرح محسوس کرے گا؟ خصوصاً جب یہ کتاب اس کو بھی مجبور کر رہی ہے کہ تم مجھ کو معجز مانو۔

فرق ادوار و عہود

یہ بھی بخوبی ممکن ہے کہ مختلف زمانوں میں اختلاف ماحول کی وجہ سے یا اختلاف عواطف ہی کے باعث ان تمام وجوہ اعجاز میں سے ایک ہی دو وجہ لوگوں کے سامنے ہوں اور اس وقت تک دوسرے وجوہ پر لوگوں کی نظریں نہیں پڑی ہوں، یا پڑی ہوں مگر اچٹتی سی، بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ اگلے ادوار

میں وہ وجہ پیدا ہی نہ ہوئی ہو اور بعض دور میں وہ وجہ اپنی ابتدائی مراحل میں ہو، اور اپنی عدم تکمیل کی وجہ سے اس وقت تک اعجاز کا ثبوت نہ سمجھی جا سکتی ہو۔

غرض قرآن کا اصل اعجاز اس کی لاریبیت ہے، چاہے جو شخص یا جماعت یا جس دور یا جس زمانے کے لوگ جس وجہ سے بھی اس کی لاریبیت کا اعتراف کریں، اعتراف کے وجوہ و اسباب میں فرق ہوگا۔ اور ضرور ہوگا مگر اعتراف لاریبیت ہر زمانے اور ہر دور میں ہر جماعت اور ہر شخص کے لئے یکساں رہے گا۔ عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر خلافت بنی عباس کے ابتدائی دور تک تو قرآن مبین کا کھلا ہوا اعجاز عموماً اس کی فصاحت و بلاغت ہی کو سمجھا جاتا رہا۔ مومنین اس کی حکمت و موعظت کی دلکشی اور اس کے آئین و قوانین کی استواری و ہمواری کو بھی ضرور سمجھتے تھے مگر منکروں اور ہٹ دھرموں کے سامنے اس کے معجزانہ انداز بیان اور اس کی فصاحت و بلاغت ہی کو وہ پیش کرتے رہے۔ چونکہ یہ ایک ایسی چیز تھی کہ کوئی کیسا ہی ہٹ دھرم ہو، اگر وہ عربی ادب سے باخبر ہے تو اس کو قرآن مبین کی اس آفتاب سے زیادہ روشن صفت کے آگے سرنگوں ہو جانا ہی پڑتا تھا اور آج بھی سرنگوں ہو جانا ہی پڑتا ہے۔ مصر و بیروت اور عراق کے اکثر اطراف میں یہود و نصاریٰ ماہرین ادب عربی ہیں، یورپ کے علمائے مستشرقین میں جن کو ادب عربی کی اچھی مہارت حاصل ہے۔ آج بھی ان کا ہر فرد قرآن مجید کی فصاحت و بلاغت کا معترف ہے زبان سے وہ اس کی فصاحت و بلاغت کو بحد اعجاز نہ مانے اور اس کے اعجاز کا اعتراف و اقرار نہ کرے مگر ہر ایک کا دل ضرور اس کی شہادت دیتا ہے اور بعض وقت ان کی زبان و قلم سے بھی اشارہ ہی سہی مگر اس کا اظہار ہو جاتا ہے

دوسرے اعجازات کی نمود

مگر جیسے جیسے دنیا میں علوم و فنون کی ترقی ہوتی گئی، اس کتاب کے اور دوسرے وجوہ اعجاز بھی اہل نظر کے سامنے آتے گئے، لیکن چونکہ اس کے معجزانہ انداز بیان، اس کی معجزانہ فصاحت و بلاغت کا غلغلہ عہد نبویؐ سے بلند چلا آرہا ہے اور ہر زمانے میں بلند رہا اور اس کے طرز بیان، حتیٰ کہ تناسب الفاظ و حسن ادا و مترنمانہ تلفظ میں ایسی معجز نما دلکشی ہے کہ عربی سمجھنے والے ہی نہیں، بلکہ اگر کوئی خوش آواز قاری اس کی کچھ آیتیں پڑھتا ہے تو جو شخص ایک حرف بھی عربی نہیں جانتا، وہ بھی سن کر جھومنے لگتا ہے۔ اور میرا یہ ذاتی مشاہدہ ہے کہ رونے لگتا ہے۔ اس لئے باوجود اس کے کہ اس کتاب کے دوسرے وجوہ اعجاز بھی اہل نظر کے سامنے آگئے تھے اس کی فصاحت و بلاغت کے نقار خانے میں ان طوطیوں کے چہچہے کی طرف زیادہ کان نہیں دیئے گئے اور اہل نظر نے بھی اس کی ضرورت محسوس نہیں کی، کہ خواہ مخواہ دوسرے وجوہ کو بھی نمایاں کر کے ان کا بھی نقارہ پیٹا جائے۔ غرض تھی اعجاز قرآن کے ثابت ہونے سے اور وہ ساری دنیا پر ایک وجہ کے اعتبار سے مسلم ہو چکا ہے، تو پھر دوسرے وجوہ کو پیش کر کے منکروں کے سامنے ایک نیا موضوع بحث کیوں چھیڑا جائے۔

جدید عربی ادب

اس زمانے میں دنیا کی اکثریت عربی زبان اور اس کے ادب سے بالکل بے بہرہ ہے۔ یہاں تک کہ عربی ملکوں بلکہ مکہ اور مدینے میں بھی اب عام لوگوں کی زبان وہ قرآنی عربی نہ رہی۔ ادب عربی پر مصر و بیروت و دمشق وغیرہ میں عیسائی عرب نے وہ اثر ڈالا ہے کہ جدید عربی میں فصاحت و بلاغت کا معیار بھی

بدلا جارہا ہے ہماری نئی نسل کی خود فراموشی اور اغیار پرستی ہر جگہ بڑھتی ہی جارہی ہے ۔ مسلم نوجوانان عرب بھی عیسائی عربی ادیبوں کے ساتھ ساتھ قرآنی عربی ادب اور طرز نگارش کو چھوڑ کر جدید رنگ جو عیسائی عربوں کا پیدا کردہ ہے اسی کو اختیار کرتے جارہے ہیں، اسی لئے قرآنی فصاحت و بلاغت سے وہ ناآشنا سے ہوتے جارہے ہیں اور دور ہوتے جارہے ہیں ۔ اور عرب کے عوام تو قرآنی عربی سے اس قدر دور ہوگئے ہیں کہ اب انہیں لفظی ترجمہ سمجھنا بھی مشکل سا ہوگیا ہے ۔ تو پھر وہ فصاحت و بلاغت کو کیا سمجھیں گے مدارس عربیہ میں ادب عربی کی تعلیم جہاں بھی ہے وہاں معلمین اور طلبہ کو جتنی دلچسپی مقامات بدیعی و حریری و زمخشری سے یا سبعہ معلقہ و حماسہ و دیوان متبنی و ابی العتاہیہ سے ہے اتنی دلچسپی انہیں قرآن مبین سے نہیں ۔ ان باتوں کا نتیجہ یہ ہے کہ علمائے عربی بھی تدبر فی القرآن کی توفیق سے محروم ہی نظر آتے ہیں ۔ الا ماشاء اللہ ۔ جو حضرات قرآن پر نگاہ غور بھی ڈالتے ہیں تو یورپ کی عینک لگا کر ان کا اصل مقصد یہ ہوتا ہے کہ یورپ کے فلسفے اور سائنس کی تحقیقات کو قرآنی آیات سے ثابت کیا جائے اور اس طرح قرآن کا ایک نیا اعجاز دنیا کو دکھایا جائے کہ دیکھو جو نئے نئے ایجادات آج یورپ نے نکالے ہیں آج سے پونے چودہ سو برس پہلے قرآن مبین ان کی طرف اشارے کر چکا ہے ۔ اور فلاں فلاں آیت سے فلاں فلاں تحقیق جدید اس اس طرح قرآن مبین کی فلاں فلاں آیتوں سے صاف اور واضح طور سے نکل رہی ہے ۔

وہ یہ نہیں سمجھتے کہ ان کی یہ دماغ سوزی نہ قرآن کے لئے مفید، نہ اسلام کے لئے عوام مسلمانوں کے لئے محض دل خوش کن ہو تو ہو مگر قرآن اور اسلام کی تبلیغی روح کے لئے سخت مضر، اور اہل نظر، حکماء اسلام کے لئے شرمندگی کا باعث ہے ۔ اس لئے کہ ان کی ان لفاظیوں کو دیکھ کر اہل یورپ یہ کہہ سکتے

ہیں بلکہ کہتے ہوں گے کہ تمہاری کتاب میں یہ فلسفہ و سائنس پہلے سے موجود تھا
ان تحقیقات اور ان ایجادات کے متعلق قبل سے اشارے موجود تھے مگر
تمھیں اور تمہارے اسلاف کو کبھی نہ سوجھے باوجود اس کے کہ تمہارے ہر طبقہ
کے لوگ ہمیشہ اس کتاب کو پڑھتے پڑھاتے رہے تلاوت و حفظ میں سرگرم رہے
مگر یہ حقائق کبھی کسی کو نظر نہ آئے ۔ اور ہم لوگ بغیر آپ کی کتاب کو پڑھے خود
بخود ان حقائق کو جان گئے اور اس فلسفہ و سائنس سے واقف ہی نہیں ہوئے،
بلکہ ان میں ماہر ہوگئے ۔ اس لئے آپ لوگوں کو اس کتاب کی ضرورت ہو تو
ہو ۔ ہم لوگوں کو تو اس کی مطلق ضرورت نہیں ۔ بلکہ آپ لوگوں کے لئے بھی
یہ کتاب بیکار ہی ہے اس لئے کہ آپ کو بھی جو ہمارے ایجادات اور ہمارے
بتائے ہوئے فلسفے اور سائنس اس کتاب میں نظر آنے لگے تو ہمارے ایجاد و
اختارع کے بعد اور ہماری تصنیفات کو پڑھ کر ۔ اور اس پر بھی آپ ابھی تک
ہم سے پڑھنے اور سیکھنے کے بعد بھی اپنی کتاب کی مدد سے کوئی نئی چیز نہیں نکال
سکتے بلکہ ہماری چیزوں کی نقل تک نہیں اتار سکتے ۔ کیا ہمارے مفکرین کے
پاس اس کا کوئی جواب ہے ۔

قرآن کا مطالعہ یورپ کی عینک سے

مرحوم علامہ طنطاوی نے جو ایک عمر گزار کر اتنی لمبی چوڑی تفسیر لکھی اور
قرآن مبین کو ایک بساط بنا کر اس پر یورپ کے فسلفے اور سائنس کے جواہر
ریزے لا لا کر بکھیر کر رکھ دیئے ہیں ۔ ان کا مطالعہ اہل یورپ کے لئے تحصیل
حاصل ہے اور مسلمانوں کے لئے سعی لاحاصل ۔ اس لئے کہ اس تفسیر کو پڑھ
کر کوئی شخص نہ قرآن مبین ہی کو صحیح طور سے سمجھ سکتا ہے نہ فلسفہ و سائنس ہی
کا ماہر ہو سکتا ہے ۔ جتنا وقت ایک پڑھنے والا اس تفسیر کی ضخیم ضخیم متعدد

جلدوں میں صرف کرکے بے ترتیب اور منتشر مضامین فلسفہ و سائنس کے معلوم کرسکے گا اس سے کہیں کم وقت میں ابواب و فصول کے ماتحت مرتب مضامین کسی فلسفے یا سائنس کی کتاب کو دیکھ کر ذہن نشین کر سکتا ہے غرض اس تفسیر سے فلسفہ و سائنس کی محض سطحی معلومات وہ بھی بالکل منتشر معلوم ہو سکتی ہیں کوئی ایک فلسفہ بھی اپنے سارے جزئیات مسائل کے ساتھ معلوم نہیں ہو سکتا اور نہ نفس تفسیر کے متعلق کوئی نئی بات دوسری تفسیروں سے فاضل معلوم ہو سکتی ہے جس کو فلسفہ و سائنس دیکھنا ہوگا وہ فلسفہ و سائنس کی کتابیں دیکھے گا نہ کہ تفسیر طنطاوی اور جس کو ادب عربی کے اعتبار سے نفس تفسیر دیکھنا ہوگا تو وہ زمخشری کی کشاف دیکھے گا جس کو فقہا کے اختلافات و دلائل کی تصریحات درکار ہوں گی وہ تفسیر کبیر وغیرہ کی طرف رجوع کرے گا۔

کاش علامہ طنطاوی اور ان جیسے دوسرے مصنفین و مفکرین، یورپ کی بساط پر قرآنی جواہرات بکھیر کر یورپ کے بازار میں وہاں کے اہل نظر کے سامنے پیش فرماتے اور انھیں قرآنی و اسلامی جواہرات سے آشنا کرتے تو یہ اہل یورپ کے لئے بھی مفید ہوتا اور ان کا تبلیغی مقصد بھی پورا ہوتا اور قرآن و اسلام دونوں کی خدمات کا حق بھی ادا ہوتا۔

قدیم تفسیریں اور تفسیری روایات

بدقسمتی سے قدیم مفسرین کے ہاں بھی بہت سی وضعی روایات راہ پاگئی ہیں، کیونکہ تفسیری روایات کے اکثر راوی وضاع و کذاب اور ناقابل اعتبار تھے۔ امام احمد بن حنبلؒ جیسے روایت پسند امام کو بھی یہ اعتراف کرنا پڑا کہ ثلاثة کتب لیس لها اصول المغازی و الملاحم و التفسیر یعنی غزوات مشاجرات، اور تفاسیر کی کتابیں ناقابل اعتبار ہیں (مقدمہ سیرت النبیؐ مولفہ

علامہ شبلی) اسکے باوجود اکثر قدیم مفسرین ہر آیت کے تحت ان راویوں کی متضاد اور خلاف حقیقت روایتیں اور اقوال جمع کر کے آیات قرآنی کے معانی کو عام پڑھنے والے کے لئے مشتبہ کر دیا قدیم مفسرین کی اس سہل پسندی کے نتیجہ میں عام پڑھنے والوں کو پتہ ہی نہیں چلتا کہ قرآن کے اصل اور صحیح مطالب کیا ہیں؟ کوئی ایک روایت اور قول کو لے کر بیٹھ جاتا ہے اور کوئی دوسرے، تیسرے قول اور روایت کو۔

جب فرقہ بندیوں کی بنیادیں مضبوط ہو گئیں تو پھر ہر فرقے نے اپنے فرقہ وارانہ مسلک کی پشتیبانی کے لئے تفسیریں لکھنا شروع کیں اور قرآن کو اپنی مخصوص فرقہ وارانہ ذہنیت کے تابع کرنے کی کوشش کی۔ ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ قرآن جیسی آسان اور سریع الفہم کتاب دشوار فہم بن کر رہ گئی۔

غرض ان اگلی اور پچھلی تفسیروں کے غبار میں قرآن مبین کی لاریبیت کا آفتاب اس طرح چھپ گیا ہے کہ بس اتنا تو معلوم ہوتا ہے کہ دن کا وقت ہے مگر یہ پتہ نہیں چلتا کہ ظہر کا وقت ابھی باقی ہے یا عصر کا وقت شروع ہو گیا۔

فصاحت و بلاغت کے بحد اعجاز ہونے کے غلغلے سے لوگوں کے کان بھر چکے ہیں اور یہ غلغلہ بھی ایک حد تک مدھم پڑ چکا ہے اور مدھم پڑتا ہی جا رہا ہے چونکہ اب اس دعویٰ کے جانچنے والے اور علیٰ وجہ البصیرۃ اس کو صحیح سمجھنے والے غالباً ہزار میں ایک سے زیادہ نہ ملیں گے۔ بعض پرانے خیال کے لوگ قرآن کی فصاحت و بلاغت کو محض عقیدۃ معجزہ مان رہے ہیں، ورنہ بعض لوگ تو بول جاتے ہیں کہ سعدی کی گلستاں اور فردوسی کے شاہنامے کا بھی تو کسی سے جواب آج تک نہ ہو سکا۔ حالانکہ یہ لوگ یہ نہیں سمجھتے کہ سعدی یا فردوسی نے اپنے اپنے وقت کے اہل قلم کو چیلنج نہیں کیا تھا۔ اگر سعدی چیلنج کرتے تو اسوقت ایسی ایسی کتنی گلستاں تیار ہو جاتیں اور اگر فردوسی چیلنج کرتے تو متعدد

شاہنامے تیار ہو جاتے جس بلند آہنگی کے ساتھ قرآن مبین نے مخالفوں اور منکروں کو مقابلے کے لئے للکارا ہے اور غیرت دلائی ہے اور پھر یہ بھی پہلے ہی کہدیا کہ تم کبھی مقابلے میں نہیں آسکتے۔ اس کی کوئی مثال تحدی اور چیلنج کی دنیا میں نہیں مل سکتی۔ یہ اللہ کے کلام ہی کی شان ہے جو اتنا بڑا چیلنج ساری دنیا کو دے اور چیلنج کے ساتھ ساتھ یہ پیش گوئی بھی کر دے کہ ساری دنیا بھی اگر چاہے کہ سب کے سب مل کر اس چیلنج کو قبول کرلیں اور مقابلے کے میدان میں آجائیں تو کبھی نہ آسکیں گے دنیا کے کسی انسان میں یہ ہمت نہیں کہ ایسا اور اتنا زبردست چیلنج ساری دنیا کو للکار کر دے۔ خصوصاً ایسا چیلنج جو قیامت تک باقی رہے۔

وقت کا تقاضا

مذکورہ وجوہ کی بنیاد پر وقت کا تقاضا یہ ہے کہ اس وقت دوسرے وجوہ اعجاز جو عوام تو عوام ہیں، اہل نظر کی نگاہوں سے بھی اوجھل ہو رہے ہیں۔ ان کو دنیا کے سامنے پیش کر دیا جائے خصوصاً وہ وجہ اعجاز جو مرور ایام کے بعد پیدا ہوئے اور جیسے جیسے زمانہ گذرتا گیا یہ نمایاں ہوتے گئے اور نمایاں تر ہوتے جاتے ہیں اس طرح کہ گویا ہر ایک کے پیش نظر ہیں لیکن دنیا کی کم نظری کی وجہ سے بزبان حال کہہ رہے ہیں کہ

از غایت ظہور نشانم پدید نیست

یہ وجہ اعجاز گو مرور ایام کے بعد پیدا ہوئی مگر اس کی تخم ریزی عہد نبویؐ میں آغاز نزول ہی کے وقت ہوگئی تھی اور برابر قدرت الٰہیہ کے غیبی ہاتھوں سے اس کی پرورش و پرداخت ہوتی رہی۔ کام کرنے والے ہاتھ بظاہر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اور ان کے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے تھے مگر

ان کے مبارک ہاتھ سبب تھے ۔ خود ان کا ذہن ہی اس طرف نہیں گیا ہوگا کہ یہ خدمت آخر زمانے میں قرآن کا ایک زبردست معجزہ ثابت ہو کر رہے گی۔

ضرورت تو یہ

کہ قرآن پر ایمان رکھنے والے اہل علم و اہل قلم قرآن مبین کی سیاسی تعلیم، معاشرتی تعلیم، اقتصادی تعلیم، تمدنی، قانونی تعلیم اور نفسیاتی تعلیم وغیرہ، ہر ایک کی معجزانہ شان کو اجاگر کر کے دنیا کے سامنے رکھدیں یہ کام ایسا نہیں جس کو ایک شخص پوری طرح انجام دے سکے۔ اگر میری زندگی نے وفا کی اور توفیق الہیٰ نے میری مدد فرمائی تو ان موضوعوں پر بھی اپنی بضاعت علمی کے مطابق کچھ لکھوں گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ ۔ ورنہ

شاید آجائے کوئی آبلہ پا میرے بعد

وقت کا تقاضا یہ ہے کہ سب سے پہلے میں قرآن مجید کے ایسے معجزے کو دنیا کے سامنے پیش کر دوں جو قرآن کا اصل دعویٰ ہے جس دعوے کو منوانے کے لئے قرآن نے ساری دنیا کو چیلنج کیا جس دعوے کو مختلف زمانوں میں مختلف حیثیتوں سے دنیا والوں نے تسلیم کیا، جن کی زبان ہٹ دھرمی کی وجہ سے اعتراف و تسلیم نہ کر سکی، ان کے دل نے ضرور تسلیم کر لیا۔

آج میں قرآن کے اس دعوے کا ثبوت اس کی ایسی نمایاں وجہ اعجاز کے ذریعے پیش کر رہا ہوں کہ اس کے معلوم کر لینے کے بعد کوئی عقل و ہوش والا انسان، اگر کچھ بھی صداقت اور دیانت رکھتا ہے، ہٹ دھرم نہیں ہے تو اس کو قرآن کے اعجاز کا اعتراف کرنا پڑیگا چاہے وہ عربی زبان سے بالکل ناواقف ہو۔

اللہ کے دو دعوے

اللہ تعالیٰ نے قرآن مبین کے متعلق دو بہت اہم دعوے فرمائے پہلا

دعوے بہت زیادہ اہم ہے اس لئے اس کو بڑے زوردار طریقے سے پیش کیا اور اس کی دلیل میں چیلنج کا ایک پہاڑ منکرین کے سامنے لاکر رکھدیا۔ وہ پہلا دعوے تو یہ ہے ذلک الکتب لا ریب فیہ یہ کتاب، اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں۔ دوسرا دعوے لا یاتیہ الباطل من بین یدیہ و لا من خلفہ تنزیل من حکیم حمید باطل نہ اس کے آگے سے آسکتا ہے اور نہ اس کے پیچھے سے، یہ ایک بڑی حکمت والے مستحق ہمہ ستائش کی طرف سے اتری ہوئی کتاب ہے۔ ۴۲/۴۱

سب سے اہم اور زبردست وعدہ الٰہی تو قرآن کی حفاظت کا ہے۔ فرمایا گیا۔

انا نحن نزلنا الذکر و انا لہ لحافظون (الحجر آیت ۹)

ہم نے اس نصیحت والی کتاب کو اتارا ہے اور ہم ہی اسکی حفاظت کرنے والے ہیں۔

دوسرا اہم ترین وعدہ جو کئی وعدوں پر مشتمل ہے یوں فرمایا گیا:

ان علینا جمعہٗ و قرانہ (القیامہ (آیت ۱۷)

میرے ہی ذمے اس کتاب کو جمع کرادینا اور پڑھوا دینا ہے

چونکہ یہ کتاب بیک دفعہ پوری کی پوری تعلیم و تبلیغ کے لئے نہیں اتری بلکہ اس کی آیتیں تھوڑی تھوڑی کرکے اتریں، اس لئے ان منتشر آیتوں کو ایک مناسب ترتیب کے ساتھ جمع کرادینا اور اس پر ایمان لانے والوں سے اس کا پڑھوا دینا آسان کام نہ تھا تو فرمایا جاتا ہے کہ یہ کام ہمارا ہے اس کو جمع بھی کرادیں گے اور لوگوں سے پڑھوا بھی دینگے۔ اس کے بعد وعدہ فرمایا جاتا

۱۔ پہلے جمع کا ذکر فرمایا اس کے بعد "قرآن" یعنی پڑھوا دینے کا۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ جمع قرآن حسب منشاء الٰہی کا کام آغاز نزول ہی کے وقت سے شروع ہو گیا تھا کیونکہ جب تک آیات مجتمع نہ ہوں سورتوں کا پڑھنا ہی ناممکن تھا۔

ہے کہ ثم ان علینا بیانه یعنی ہم نے جو تبیین قرآن کی خدمت تمہارے سپرد کی ہے لتبین لھم مانزل الیھم تاکہ لوگوں کی طرف جو کچھ اتارا گیا ہے تم اس کو ان لوگوں کے سامنے واضح طور سے بیان کردو تو تم سے اس کا بیان کرا دینا بھی ہمارے ہی ذمے ہے۔

دعوے اور وعدے تو اور بھی ہیں جن میں سے بعض اہم دعووں اور وعدوں کا ذکر انشاء اللہ تعالیٰ آگے آئے گا۔ اسوقت مذکورہ بالا دونوں دعووں اور دونوں وعدوں کو پیش کر کے ان پر مجھے بحث کرنا ہے مگر وعدے تو ہمیشہ آئندہ کے لئے ہوا کرتے ہیں، اور دعوے زمانہ حال سے زمانہ مستقبل کی لامعلوم مدت تک طول کھینچا ہوا ہوتا ہے، اس لئے دعوے عقلاً وعدوں پر تقدم اہمیت رکھتا ہے۔ اسی بناء پر میں سب سے پہلے اسی دعوے کو پیش کرتا ہوں جس کو خود اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے پیش فرمایا ہے یعنی۔

ذلک الکتب لاریب فیه (البقرہ)
یہ کتاب، اس میں کسی شک کی گنجائش ہی نہیں۔

پہلا دعویٰ۔ لاریبیت

جن جن چیزوں میں لاریبیت کی صفت پائی جاتی ہے اور آپ ان کو لاریب فیہ سمجھتے ہیں۔ ان پر غور فرمایئے۔ آپ یا تو حواس خمسہ کے ذریعہ ان کو محسوس کر کے ان کے متعلق یقین حاصل کر لیتے ہیں۔ اس کے بعد اس کو لاریب فیہ سمجھتے ہیں یا کسی محسوس کی ہوئی چیز پر قیاس کر کے یقین حاصل کر لیتے ہیں اور کسی چیز کو لاریب فیہ مانتے ہیں مگر چکھنے کی چیز کا صحیح مزا آپ چکھ ہی کر لاریب فیہ کی حد تک جان سکتے ہیں صرف دیکھ کر یا سونگھ کر آپ کو اس کے مزے کے متعلق وہ قطعیت علم حاصل نہیں ہو سکتی جو چکھ کر حاصل ہو سکتی ہے۔ اسی طرح ایک اچھے گویئے کی خوش لحنی و خوش نوائی کو آپ صرف اس

کے لبوں کی حرکت اور تان لیتے وقت منہ چیرنے اور گردن کی رگوں کے پھلانے کو دیکھکر لاریبیت کی حد تک کبھی ہنیں سمجھ سکتے جب تک آپ اس کی خوشنوائی اپنے کانوں سے سن نہ لیں۔ وغیر ذلک۔ غرض جس حاسے جس قوت ادراک سے جس چیز کی جس صفت کو محسوس اور دریافت کر سکتے ہیں، جب تک اسی حاسے اور اسی قوت ادراک سے اس چیز کی اس صفت کو آپ محسوس و دریافت نہ کرلیں اس وقت تک اس چیز کو اس صفت کے ساتھ اس حد تک کبھی موصوف ہنیں سمجھ سکتے کہ اس کے اس اتصاف کو آپ لاریب فیہ کہہ سکیں۔ مگر یہ اسی وقت ممکن ہے کہ وہ چیز آپ کے سامنے موجود ہو، یا موجود ہو سکے۔ یا آپ اس تک خود پہنچ سکیں جو چیز نہ آپ کے سامنے موجود ہو سکے نہ آپ اس تک پہنچ سکیں، ایسی چیز کی لاریبیت آپ کو صرف ایک ہی ذریعہ سے پوری طرح حاصل ہو سکتی ہے اور وہ ذریعہ صرف تواتر خبر ہے۔ چاہے وہ چیز زمانہ موجودہ کی ہے مگر آپ کی دسترس سے باہر ہو، چاہے وہ چیز زمانہ گذشتہ کی ہو اور زمانہ موجودہ میں اس کی صرف داستان رہ گئی ہو اور کچھ آثار باقی نہ ہوں۔ یا وہ اصل شے تو علیٰ حالہٖ موجود ہو مگر اس کے متعلق کچھ باتیں کہی جاتی ہوں تو ان کا یقین بحد لاریبیت صرف تواتر ہی کے ذریعے حاصل ہو سکتا ہے اگر اس تواتر کے ساتھ ساتھ دوسرے دلائل بھی ہوں، قرائن بھی ہوں تو کیا کہنا ہے اور اگر اس تواتر خبر کے ساتھ عملی تواتر بھی ہو تو نورٌ علیٰ نور ہے اگر اس بات کا تعلق عمل سے بھی ہے۔

غرض موجودہ زمانے کی محسوس چیزوں کا یقین بحد لاریبیت حواس خمسہ میں سے جس حاسےؔ سے اس چیز کا تعلق ہے اسی حاسےؔ کے ذریعے حاصل ہو سکتا ہے اور گذشتہ زمانے کی کسی چیز کے متعلق علم الیقین بحد لاریبیت صرف تواتر ہی کے ذریعے حاصل ہو سکتا ہے تواتر نہ ہو تو فقط قرائن و دلائل سے بھی ہوتا ہے

مگر ممکن ہے کہ اس قدر نہ ہو۔

عہد نبویؐ میں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے قرآنی آیات سن کر اس کے معنی مطلب سمجھ کر اہل عرب جو اس کے پہلے مخاطب تھے اس کی فصاحت و بلاغت اس کے نصائح و مواعظ کے نفوذ فی القلوب اور اس کے اسلوب بیان کی دلکشی، پھر اس کی تحدی کے زوردار اعلانات کو سن سن کر اس کی لاریبیت کے معترف ہو جاتے تھے۔ اہل تقویٰ و اہل صداقت ایمان لے آتے تھے اور ہٹ دھرم کے دل ضرور مان لیتے تھے جس کا ثبوت تحدی اور چیلنج سن کر بھی ان کے مقابلے کے لئے نہ آنے سے مل رہا تھا۔ بعد والوں کے لئے تو پھر لوگوں سے تواتر کے ساتھ سننا ہی ایک ذریعہ رہ گیا اس کی لاریبیت پر یقین لانے کا اور اس تواتر کے ساتھ ساتھ اس کی تحدی جو قیامت تک کے لئے اس کتاب کے منزل من اللہ ہونے کو لاریب فیہ ثابت کر رہی ہے۔

تواتر کی تعریف

تواتر خبر کی صحیح تعریف یہ ہے کہ آپ کوئی خبر بار بار اتنے لوگوں سے سنیں کہ عقل اس کو تسلیم نہ کرے کہ اتنی بڑی جماعت اور اتنے لوگ خلاف واقعہ ایک غلط بات بلاوجہ ہم سے اور دوسروں سے متفق اللفظ ہو کر بیان کرینگے۔ ایسا ہو سکتا ہے کہ کسی ایک خیال کی یا ایک غرض کی ایک بڑی جماعت اپنی کسی غرض کے ماتحت باہم مشورہ کر کے ایک بالکل جھوٹی بات جی سے گھڑ کر اس طرح متفق اللفظ ہو کر متفرق جگہ جا جا کر بیان کرے اور اپنے ساتھ چند دوسری جماعت کے بھی سیدھے سادھے لوگوں کے کان بھر کر ان کے ذریعے بھی اور بعض لالچی عیاروں کو کچھ دے کر ان سے بھی اس خلاف واقعہ بات کا

اس طرح پروپیگنڈہ شہر بشہر کرائے کہ عام سامعین کو اس خبر کے متواتر ہونے کا گمان ہونے لگے اور کچھ دنوں کے بعد یہ جھوٹا پروپیگنڈہ ایک نہایت سچی اور متواتر خبر ہر خاص و عام میں سمجھی جانے لگے۔ اس کی مثالیں بہت ہیں اس لئے خبر متواتر کی ابتدائے تواتر اور ابتدائے اشتہار کی نوعیت اور اس کے اشتہار کا منشاء، مشتہرین کی غرض، اس خبر سے مشتہرین کے کسی مفاد خصوصی و پوشیدہ کے تعلق کا پتہ لگالینا ضروری ہے۔ پھر تواتر کا خود بخود پیدا ہو جانا اور تواتر کا پیدا کرنا دونوں کا فرق بھی ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ تواتر کا آغاز جہاں کا واقعہ ہے وہاں سے شروع ہوا ہے یا کسی دوسری جگہ سے، یہ سب باتیں تواتر میں قابل غور ہیں۔ مثلاً واقعہ تو مدینہ کا ہو، مگر تواتر کا آغاز ہوا ہو کوفے اور بصرے سے۔ یا واقعہ ہو ۱۲ھ کا اور تواتر کا سرچشمہ دوسری صدی ہجری سے پھوٹے۔ اس قسم کے تواتر یقیناً کسی خلاف واقعہ ہی کے پھیلانے کے لئے بزور قائم کئے جاتے ہیں۔ ورنہ قصہ سرزمین بر سرزمین کے مطابق جہاں کا واقعہ ہے وہیں سے تواتر خبر کا آغاز ہونا چاہیئے اور جس زمانے کا واقعہ ہو اسی زمانے میں اس کی شہرت سرزمین واقعہ پر عام ہونی چاہیئے۔ اور پھر وہیں سے اس خبر کو الاقرب فالاقرب کے مطابق رفتہ رفتہ دور دور پھیلنا چاہیئے۔ یہ تو کوئی قابل وثوق بات نہیں کہ واقعہ کب کا اور اس کا چرچا شروع ہو کب، واقعہ کہاں کا اور اس کا پروپیگنڈہ کیا جائے کہاں۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ ایک تواتر خبر کے خلاف دوسرا تواتر خبر پیش کیا جائے۔ ایسی صورت میں جو تواتر مقام و وقت وقوع کی رعایت کے ساتھ عقل و درایت کے مطابق ہوگا وہی قابل قبول ہوگا۔ مکمل اور بدرجہ اتم، قابل قبول و موجب یقین تواتر وہی ہے جس کی خبر مختلف الخیال اور متغائر العقیدہ جماعت و افراد جن کو اصل واقعہ سے سروکار نہیں سب کو واقعے کے وقوع کا اعتراف ہو۔

ممکن ہے کہ مخالفین کو جزئیات واقعہ یا سبب واقعہ جو بیان کئے جاتے ہیں ان سے کسی قدر اختلاف ہو مگر واقعہ سے مخالفین کو بھی اختلاف نہ ہو۔ جہاں کی بات ہو وہیں سے اس کے تواتر کا سلسلہ شروع ہوا ہو، اور جس زمانے میں اس کا وقوع ہوا ہو اسی زمانے سے اس کے تواتر کی بھی ابتدا ہوئی ہو۔ جس تواتر کا سرا ہی معلوم نہ ہو کہ کب سے آغاز ہوا اور کہاں سے شروع ہوا وہ تواتر عقلاً کوئی سند کوئی حجت اپنی صحت کے لئے نہیں۔ جب تک تواتر کا منبع معلوم نہ ہو اس وقت تک اس تواتر کا کوئی اعتبار نہیں۔

تواتر کی قسمیں اور قرآن مبین

۱۔ تواتر اسنادی، یہ مرکب ہے تین تواتر سے (ا) تواتر مسند (ب) تواتر مسندالیہ (ج) تواتر اسناد۔ مثلاً حافظ شیرازی کی ذات، ان کی شہرت شاعری کے وقت سے آجتک پورے تواتر کے ساتھ علم وادب کی پوری دنیا میں مشہور ہے۔ اسی طرح دیوان حافظ کی شہرت پورے تواتر کے ساتھ ساری دنیائے علم وادب میں آپ دیکھ رہے ہیں کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ حافظ شیرازی کا کبھی وجود ہی نہ تھا۔ دیوان حافظ کوئی کتاب ہی نہیں دیوان حافظ کی نسبت حافظ شیراز خواجہ شمس الدین محمد کی طرف ہے۔ خواجہ حافظ مسندالیہ ہیں اور ان کا دیوان حافظ مسند اس دیوان کی نسبت جو خواجہ حافظ کی طرف ہے وہ بھی تواتر نام کے ساتھ ہر جگہ مشہور و معروف ہے یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ دیوان کسی اور کا ہے جو حافظ شمس الدین شیرازی کی طرف غلطی سے منسوب ہوگیا ہے جس طرح لوگ دیوان مخفی کو کہتے ہیں کہ یہ اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ کی بیٹی زیب النساء کا دیوان نہیں ہے۔ مخفی تخلص ایک درباری شاعر تھا یہ اس کا دیوان ہے جو زیب النساء کی طرف منسوب ہے۔ اسی طرح بعض لوگ کلیات ظفر کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ بہادر شاہ کا کلیات نہیں ہے بلکہ ابراہیم ذوق

یا کسی اور کا ہے اس طرح کا شبہ کبھی کسی نے دیوان حافظ کے بارے میں نہیں کیا۔ اس لئے دیوان حافظ کی سند یعنی اس کی نسبت جو خواجہ شمس الدین کی طرف ہے وہ بھی متواتر ہے۔ اسی طرح قرآن مبین مسند ہے اس کا وجود قطعی اور ایسا متواتر کہ دنیا کی کسی کتاب کو بھی یہ تواتر حاصل نہیں۔ دنیا میں قلمی اور مطبوعہ قرآن مجید کے نسخے زمانہ خیرالقرون یعنی پہلی صدی ہجری کے اوائل ہی سے آج تک کے لکھے ہوئے اور چھپے ہوئے جتنے نسخے دنیا میں ہیں۔ اس کی عشر عشیر تعداد بھی کسی کتاب کی، ہاتھوں کی لکھی ہوئی ہو یا چھپی ہوئی پیش نہیں کی جا سکتی۔ اس پونے چودہ سو برس کی طویل مدت کا کوئی دن ایسا وہم میں بھی نہیں آسکتا جس میں دنیائے اسلام میں اس کی تلاوت اس کی قرأت، اس کے حفظ، اس کی تعلیم، اس کی کتابت اور اس کی طباعت (جب سے طباعت کا عام رواج ہوگیا) کسی نہ کسی جگہ نہ ہو رہی ہو اسلئے اس مسند یعنی اصل قرآن کے تواتر کا کیا پوچھنا ہے۔ باقی رہا مسندالیہ تو ساری دنیا یہ جانتی ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا دعوے تھا کہ میں اللہ کا رسولؐ ہوں، اور یہ قرآن مجھ پر اللہ کی طرف سے اترا ہے اور اسی پر تقریباً چودہ سو برس سے ہر مسلمان کا ایمان ہے۔ جو غیر مسلم عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے لیکر اس وقت تک دنیا سے گذر گئے اور جو اس وقت موجود ہیں ان میں کا ہر باخبر شخص یہ جانتا ہے کہ یہ قرآن وہی ہے جس کے بارے میں آج سے چودہ سو برس پہلے مکے کے رہنے والے محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب ہاشمی قریشی کا یہ دعوے تھا کہ یہ کتاب اللہ کی طرف سے مجھ پر اتری ہے اور میں اللہ کا رسولؐ ہوں۔ ایک ایک ایسی متواتر بات ہے جس کا انکار کبھی کسی زمانے میں بھی کسی نے نہیں کیا اور نہ کبھی کسی کو یہ شبہ ہوا کہ محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب جو مکے کے رہنے والے تھے جن کا دعوے تھا کہ میں اللہ کا رسولؐ اور نبیؐ ہوں، جن کی رسالت اور نبوت پر

دنیائے اسلام کا تقریباً چودہ سو برس سے ایمان ہے، ان کی شخصیت ہی نہ تھی، اس کا کسی کو کبھی وہم بھی نہ ہوا نہ ہو سکتا ہے کہ یہ ایک فرضی نام ہے یا یہ کتاب بعد کو کسی نے تصنیف کرکے ان کی طرف منسوب کردی تھی۔ غرض قرآن جو مسند ہے وہ قطعی و متواتر، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو مسندالیہ ہیں، ان کی ذات مبارک قطعی و متواتر، اور قرآن کی نسبت قرآن کی اسناد جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے کہ آپ کا یہ دعوے تھا کہ یہ کتاب اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجھ پر نازل ہوئی ہے یہ اسناد قطعی و متواتر اور یہ تینوں قسم کا تواتر اس حد تک قطعی، واضح اور مکمل ہے کہ ایسی تکمیل تواتر کی مثال کسی دوسرے مسند، کسی دوسرے مسندالیہ، اور کسی دوسری اس قسم کی اسناد میں دکھائی نہیں جا سکتی۔

(۲) تواتر مکانی

یعنی جو واقعہ جس بستی کا ہوتا ہے، پہلے اسی بستی میں مشہور ہوتا ہے اور اہمیت کے مطابق اس بستی کے اکثر افراد یا ہر فرد کو معلوم ہو جاتا ہے اور پھر آگے بڑھتا ہے اور اس بستی کے قرب و جوار کے لوگ بھی اس سے واقف ہو جاتے ہیں، اسی طرح اور آگے بڑھتا ہے اور پھر دور دور مشہور ہو جاتا ہے مگر جس قدر تواتر اس بستی کے افراد میں اس واقعے کے متعلق ہوتا ہے دور کے لوگوں میں نہیں ہوتا۔ یہاں تک کہ زیادہ دور کے لوگوں میں بہت کم لوگ اس واقعے سے باخبر ملیں گے بلکہ زیادہ دور والوں میں واقعہ محض افواہ ہی کے طور سے ہوگا جس کو تواتر کہنا بھی صحیح نہ ہوگا۔

قرآن مجید کا یہ ایک خاص معجزہ ہے کہ اس کا مکانی تواتر وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا اور اتنا وسیع ہوا کہ ساری دنیا کے باخبر لوگ اس کے اسنادی تواتر کے معترف ہیں اور سب کے سب اس کی نغمہ سرائی میں ہم آہنگ، صرف مسلمان ہی نہیں بلکہ غیر مسلم بھی۔

(۳) تواتر زمانی

عموماً جو واقعہ جس زمانے میں ہوتا ہے اس کی اہمیت کے مطابق اس کا چرچا اسی زمانے میں زیادہ ہوتا ہے جیسے جیسے زمانہ گذرتا جاتا ہے لوگ اس کو بھولتے جاتے ہیں یہاں تک کہ اگر وہ بہت اہم واقعہ بھی ہے تو دو تین چار صدی یا اس سے کچھ زیادہ مدت کے بعد پھر وہ واقعہ محض ایک داستان ایک افسانہ ہی بن کر رہ جاتا ہے۔ اگر اس داستان کی مجموعی حیثیت کا زبانی یا کتب تواریخ میں تواتر ہو بھی تو اس کے جزئیات کی تفصیل یا تو ملتی ہی نہیں اور اگر ملتی بھی ہے تو طرح طرح کے اختلافات اور اوہام کے ساتھ جن کے متعلق وہ تواتر بھی صحیح طور سے باقی نہیں رہتا اور عقل اس کی صحت میں متامل ہوتی ہے۔

مگر قرآن مجید کا معجزانہ تواتر اس کی پہلی آیت کے وقت نزول سے شروع ہوا تو پھر ہر آیت اور ہر سورۃ کا تواتر اس کے نزول کے وقت سے روز افزوں شہرت و شیوع کے ساتھ پھیلتا اور بڑھتا ہی رہا۔ آج بھی اس کا تواتر باخبر دنیا کے ہر گوشے میں گونج رہا ہے محض داستان و افسانہ کے طور سے نہیں بلکہ واقعہ صادقہ و حقیقت ثابتہ کی حیثیت سے جس سے دنیا کا کوئی صاحب علم و خبر انکار نہیں کر سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن مجید کا تواتر اسنادی اور اس کا تواتر مکانی و زمانی خود ایک معجزہ ہے جو اس کی لاریبیت کی واضح ترین دلیل ہے۔

(۴) تواتر ذاتی

یعنی اصل شے اور اس کی ذات، اس کی ہیئت مجموعی اور اس کے اجزائے ترکیبی کا تواتر کہ جب سے قرآن کا نزول شروع ہوا، اس وقت سے جیسے جیسے

اس کی آیتیں مرتب ہوتی گئیں اور سورتیں بنتی گئیں۔ یا پوری سورتیں اترتی گئیں اور پھر سب کو مرتب و مدون کرا کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوری کتاب اپنی امت کو دیدی اور اس کے ایک ایک حکم کی علمی و عملی تعلیم اور ایک ایک عقیدے اور وعظ و تذکیر کی تبلیغ فرما کر اپنے مفوضہ فریضہ رسالت سے باحسن وجوہ سبکدوشی حاصل کی اس وقت سے وہی کتاب اپنی اس ہیئت مجموعی اور اسی ترکیب اجزائی کے ساتھ اس وقت تک بالکل اسی حالت و ہیئت میں مکمل تواتر کے ساتھ ہر ملک ہر بستی اور ہر محلے کے ہر مسلمان گھر میں ابًا عَنْ جَدٍّ چلی آرہی ہے۔ اس کو تواتر مسند بھی کہا جاسکتا ہے جس کا بیان اوپر گذرا مگر وہاں اس کی اسنادی حیثیت دکھائی گئی تھی اور یہاں اس کی ذاتی صفت تواتر کو ثابت کیا گیا۔ اس لئے یہ تکرار مضمون نہیں ہے۔

(۵) تواتر اجزائی

ایک تو تواتر مجموعی ہے، یعنی پورے مجموعے کا تواتر بحیثیت اس کی ذات کے اور پھر اس کی اسناد کے، وہ دونوں تو بیان ہو چکے۔ تواتر ذاتی اور تواتر اسنادی کے زیر عنوان، اسلئے تواتر مجموعی کا الگ عنوان قائم نہیں کیا، کہ ایک ہی مضمون کا اعادہ بے فائدہ ہوگا مگر تواتر اجزائی کے ضمن میں تواتر مجموعی کا ذکر بھی ضروری ہے تاکہ آپ تواتر اجزائی کو آسانی کے ساتھ سمجھ سکیں۔

تواتر مجموعی سے میری مراد یہ ہے کہ ہر چیز کے بہت سے اجزاء ہوتے ہیں، انھیں اجزاء سے اس کی ذات مرکب ہوتی ہے اور انھیں اجزاء کے مجموعے کو آپ اس چیز کے نام سے یاد کرتے ہیں مثلاً ایک مکان کا تصور جب آپ کرتے ہیں تو اس مکان کے اجزاء یعنی دیوار، دروازے چوکھٹ، کواڑ، کڑی، شہتیر، چھپر، اور ستون سب کے مجموعے کا ایک نقشہ آپ کے سامنے آجاتا ہے جب

آپ کسی مکان کی نسبت کسی کی طرف کرتے ہیں کہ یہ مکان فلاں کا ہے تو یقیناً آپ اس مکان کی ہر دیوار، اور دیوار کی ہر اینٹ، اس کی چوکھٹ، کواڑ، کڑی، شہتیر اور ستون وغیرہ سب کی نسبت ملکیت بھی اسی شخص کی طرف قرار دیں گے کیونکہ کُل کے ضمن میں اس کے اجزاء بھی ہوتے ہیں تو آپ دیوان حافظ کی نسبت جو خواجہ شمس الدین حافظ شیرازی کی طرف کرتے ہیں تو اس ضمن میں اس دیوان کے ہر قصیدے، ہر غزل بلکہ ہر شعر اور ہر شعر کے ہر لفظ کی نسبت خواجہ حافظ کی طرف کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں۔ مگر یہ ہر قصیدے، ہر غزل، ہر شعر اور ہر شعر کے ہر لفظ کی نسبت جو خواجہ حافظ کی طرف آپ سمجھتے ہیں تو یہ اس پورے دیوان کے ضمن میں سمجھتے ہیں اسلئے یہ ضمنی نسبت اتنی یقینی اور قطعی نہیں ہو سکتی، جتنی پورے مجموعے کی نسبت قطعی اور یقینی ہے۔ چنانچہ دیوان حافظ کے بعض قصیدوں کو اکثر محققین الحاقی کہتے ہیں اور بعض غزلوں اور شعروں کو بھی چنانچہ بعض قدیم نسخوں میں وہ قصیدے، وہ غزلیں اور وہ اشعار نہیں ملتے ہیں اس لئے ان الحاقی قصیدوں، غزلوں اور شعروں کی نسبت خواجہ حافظ کی طرف یقینی و قطعی طور سے صحیح نہیں سمجھی جا سکتی یہاں تک کہ حافظ کی پہلی غزل کا مقطع

حضوری گر ہمے خواہی، از و غائب مشو حافظ
متیٰ ماتلق من تهوی دع الدنیا و امهلها

اگر کوئی شخص کہے کہ اس مقطع کا دوسرا مصرع اس طرح حافظ شیرازی نے نہیں کہا تھا۔ ہم نے ایران کے شاہی کتب خانے میں خواجہ حافظ کے ہاتھ کا لکھا ہوا ان کا دیوان دیکھا ہے جس میں انھوں نے اس مقطع کے دوسرے مصرع کو یوں لکھا ہے: دع الدنیا متیٰ ماتلق من تهوی و امهلها۔ تو آپ یقیناً

فوراً مان لیں گے اور یقین کر لیں گے کہ خواجہ حافظ نے ضرور اسی طرح لکھا ہوگا بعد والوں نے نقل کرنے میں غلطی کی کیونکہ متیٰ ما کے ماتحت جو شرط آئے اس کی جزاء میں "ف" کا آنا ضروری ہے ہاں اگر جزاء مقدم آجائے تو پھر "ف" نہیں آسکتی یعنی متیٰ ماتلق من تھوی فدع الدنیا کہنا چاہیئے تھا۔ مگر اس طرح مصرع موزوں نہیں ہوتا اور اگر دع الدنیا متیٰ ماتلق من تھوی وا مھلھا کہیئے تو وہ نحوی غلطی نکل جاتی ہے اور مصرع بھی موزوں ہو جاتا ہے اس لئے آپ کا یہ سمجھ لینا کہ عام طور سے یہ مقطع جس طرح ہر دیوان قلمی و مطبوعہ میں نظر آتا ہے غلط ہے حافظ شیرازی نے اس طرح نہیں کہا ہوگا اور یہ شخص جو ایران سے شاہی کتب خانے میں خواجہ حافظ کے دست خاص کے لکھے ہوئے دیوان کو دیکھکر آیا ہے اور اس میں دیکھ کر جو کہہ رہا ہے وہی صحیح ہے اور اسی کی نسبت خواجہ حافظ کی طرف صحیح ہے اور عام نسخوں میں جس طرح ہے اس کی نسبت خواجہ حافظ کی طرف صحیح نہیں۔ یہاں تو ایک نحوی غلطی بھی آپ کو یہ سمجھنے پر مجبور کریگی، اگر نحوی غلطی نہ ہو جب بھی دوسروں کے ہاتھوں کے لکھے ہوئے اور مطبوعہ نسخوں سے اور خاص مصنف کے یا اس کے کسی شاگرد رشید یا خلف الصدق کے ہاتھ کے لکھے ہوئے نسخے میں کچھ فرق ہو تو ہر شخص خاص مصنف یا اس کے شاگرد یا بیٹے کے لکھے ہوئے نسخے کو دوسروں کے لکھے ہوئے نسخوں سے زیادہ صحیح ماننے پر مجبور ہوگا اس لئے کہ تواتر پورے مجموعے کی نسبت کا ضرور ہے مگر اس کے ہر جز کا تواتر اسناد، اس کے مسند الیہ کی طرف مستقل طور سے نہیں ہے۔ اگر ہے تو پورے مجموعے کے ضمن میں ہے۔

مگر قرآن مجید کا تواتر اسنادی کہ یہ وہی کتاب ہے جس کے بارے میں محمد رسول اللہ صلی اللہ وسلم کا یہ دعویٰ تھا کہ یہ کتاب ان پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اتری ہے جس طرح پورے مجموعے کے متعلق ہے بالکل اسی طرح اس

کے ہر سورے ہر آیت، ہر جملے اور ہر جملے کے ہر لفظ، بلکہ ہر حرف یہاں تک کہ ہر حرکت و سکون اور ہر نقطے کے متعلق ہے اس لئے کہ اس مجموعے سے پہلے اس کے اجزآء ہی کا تواتر شروع ہوا۔ جیسے جیسے آیتیں اترتی گئیں لوگ سنتے گئے سیکھتے گئے، پڑھتے گئے، یاد کرتے گئے، اور لکھتے گئے، پھر دوسروں کو پڑھاتے گئے جس کا سلسلہ ہر مسلم گھر میں چودہ سو برس سے آج تک چلا آرہا ہے پھر جیسے جیسے اس کے اجزا باہم ملتے گئے، ان چند اجزاء کے مجموعے کے بھی ہر جہتی تواتر کا سلسلہ شروع ہوگیا پورا سورۃ مرتب ہوگیا تو اب پورے سورے کا تواتر شروع ہوگیا تواتر اجزائی کی ایسی مکمل مثال جب سے دنیا بنی اس وقت سے اس وقت تک دنیا نہیں دکھا سکتی، نہ قیامت تک اس کی کوئی مثال دکھا سکتی ہے اس کو کہتے ہیں زندہ معجزہ قرآن مبین میں خود فرمایا گیا ہے۔

و قال الذین کفرو الو لانزل علیه القران جملة و احدة کذلک لنثبت به فو ادک و رتلناه ترتیلا (الفرقان آیت ۳۲)

اور کافروں نے کہا کہ ان پر پورا قرآن ایک مرتبہ کیوں نہیں اتار دیا گیا؟ ایسا ہی ہوا اسلئے کہ اس کے ذریعے تمہارے دل کو ہم تقویت پہنچائیں۔ تمہارے دل میں اس کو ثابت و جاگزیں کریں اور ہم نے اس کو ٹھہراؤ اور ایک نظم و ترتیب کے ماتحت رکھا ہے۔

یعنی اگر پورا قرآن ایک بار تعلیم و تبلیغ کے لئے اتر جاتا تو صحابہؓ نہ اس کو یاد کر سکتے، نہ اس کے مضامین پر پوری طرح حاوی ہو سکتے، اور نہ اس کے ہر ہر جزء کا تواتر قائم ہو سکتا۔ اسلئے ممکن تھا کہ اس کے بعض اجزاء کے متعلق بعد کو کچھ لوگوں کے دلوں میں کسی طرح کا شک و شبہ رہ جاتا کہ یوں اترا ہے یا یوں مذکورہ بالا آیت میں اگرچہ مخاطب صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں مگر صرف آپؐ ہی کی تثبیت قلب مراد نہیں ہے بلکہ پوری امت کا ہر وہ شخص جو

قرآن پر ایمان رکھتا ہے اور قرآن میں ایمان داری کے ساتھ تدبر کرتا ہے سب کی تثبیت قلب مقصود ہے کیونکہ قرآن صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے لئے نہیں اترا ہے بلکہ سارے عالم کے لئے اترا ہے:

لیکون للعلمین نذیرا (۱/۲۵)

تاکہ سارے عالم کے لئے نتائج نافرمانی سے ڈرانے والا ثابت ہو

صحابہؓ کو تثبیت قرآنی آیات کے نجماً نجماً یعنی تھوڑا تھوڑا کر کے اترنے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کے پڑھنے ان کے معانی اور مطالب کے سمجھنے سے ہوتی تھی، وہ لوگ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے سنتے اور سیکھتے تھے۔ اس لئے اس وقت تواتر و عدم تواتر ان کے لئے کوئی زیر غور مسئلہ ہی نہ تھا بلکہ وہی وقت تو قرآن کے اجزائی تواتر کے آغاز کا تھا، گو صحابہؓ اس کو سمجھ نہیں رہے تھے کہ قرآن مجید کے ہر جزء کا تواتر کس طرح بہم پہنچایا جا رہا ہے اور بہم پہنچ رہا ہے، مگر ہر آیت اور اس کے ہر لفظ بلکہ ہر حرکت و سکون کا تواتر پیدا ہو رہا تھا اور اس طرح اللہ تعالیٰ بعد والوں کے لئے تثبیت قلب کا سامان مہیا کر رہا تھا کیونکہ تثبیت قلب کی محتاج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہیں زیادہ آپ کی امت، بالخصوص آخری زمانے کی امت تھی جس کے پاس ایمانی سہارا قرآن کے سوا اور کچھ نہیں۔

(۶) تواتر تعلیم و تعلم

جس وقت سے قرآن مجید کا نزول شروع ہوا، جیسے جیسے آیتیں اور سورتیں اترتی گئیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہؓ کو ان آیتوں اور سورتوں کی تعلیم فرماتے رہے اور صحابہؓ تعلیم حاصل کرتے رہے اکابر صحابہؓ جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں برابر حاضر رہنے کا موقع حاصل تھا وہ

بذات خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن مجید کی تعلیم حاصل کرتے رہتے تھے اور آفاقی صحابہؓ یا جو اپنے کاروبار کی وجہ سے برابر حاضر نہیں رہ سکتے تھے وہ ان حاضر باش صحابہؓ سے قرآن مجید کی تعلیم حاصل کرتے تھے پھر ہر صحابی سے ان کی عورتیں، ان کے لڑکے اور لڑکیاں قرآن کی تعلیم حاصل کرتی تھیں ۔ جس سے مسلمانوں کا کوئی گھر خالی نہ تھا تعلیم و تعلم قرآن کا یہ تواتر نزول قرآن کے آغاز سے آج تک بلاناغہ چودہ سو برس سے ہر مسلم گھر میں ساری دنیائے اسلام میں چلا آرہا ہے جس کی کوئی مثال ساری دنیا مل کر بھی اگر چاہے تو نہیں پیش کر سکتی۔

(۷) تواتر قرأت

پڑھنے والے بہتیری کتابیں پڑھتے ہیں، پڑھنے کے بعد طاق پر رکھدیتے ہیں بعض دلچسپ کتابیں اگر بار بار بھی پڑھتے ہیں تو پھر آخر اس سے جی بھر جاتا ہے اور کچھ دنوں کے بعد اس کتاب کے دیکھنے سے دم اُبھرنے لگتا ہے کہ بار بار کی دیکھی ہوئی چیز کو کب تک دیکھتے رہیں۔

قرآن مجید کا یہ خاص معجزہ ہے کہ هو المسک ماکررته یتضوع - یعنی مشک کو جتنا بھی ملئے، الٹ پلٹ کیجئے، اس کی خوشبو بڑھتی اور پھیلتی ہی جائے گی ۔ قرآن مجید کا بھی یہی حال ہے کہ جس قدر پڑھئے، اس کے پڑھنے سے کبھی دم نہیں گھبراتا ۔ کبھی سیری نہیں حاصل ہوتی، مطلب سمجھ کر پڑھنے والوں کا کیا پوچھنا ہے، بے معنی مطلب سمجھے لوگ بیٹھے ہوئے ہل ہل کر پڑھا کرتے ہیں، اور روزانہ پڑھے جاتے ہیں اور بڑے ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں، زبانی پڑھتے ہیں، جس قدر جس کو یاد ہے حفاظ برابر اس کا دور کرتے رہتے ہیں ۔ نمازوں میں پڑھتے ہیں ۔ اگرچہ قرأت کا لفظ عام ہے کتاب دیکھکر پڑھنے کو بھی

قرأت کہتے ہیں، زبانی پڑھنے کو بھی، نمازوں میں پڑھنے کو بھی اور نماز سے باہر پڑھنے کو بھی - غرض ہر صورت سے قرآن مجید کے پڑھنے کا تواتر چودہ سو برس سے آجتک بلا ناغہ ہر مسلم گھر میں ساری دنیائے اسلام میں چلا آرہا ہے - مگر یہاں میری مراد زبانی پڑھنا ہے -

(۸) تواتر کتابت

قرآن کے لکھنے کا آغاز بھی اس کے نزول کے ساتھ ساتھ ہوا اور اس وقت سے جو کتابت قرآن کا سلسلہ تواتر شروع ہوا تو وہ چودہ سو برس سے زیادہ کی مدت سے آج تک بلا ناغہ جاری ہے - اس چودہ سو برس کا کوئی دن ایسا نہیں بتایا جاسکتا جس دن دنیائے اسلام میں کتابت قرآن کسی نے بھی نہ کی ہو، خیالی طور سے بھی ایسا کوئی دن تصور نہیں کیا جاسکتا - شاید کوئی کہے کہ مکہ مکرمہ میں اسوقت کتابت لکھنے پڑھنے کا بہت کم رواج تھا، محض چند نفوس کسی قدر لکھنا پڑھنا جانتے تھے، کاغذ سے عرب کا پورا خطہ بالکل محروم تھا، جو لوگ کچھ لکھتے تھے وہ ہڈی پتے، کھال، چھال، پتھر کے ٹکڑے اور ٹھیکریوں پر اور ظاہر ہے کہ ان چیزوں پر وقتی طور سے وقتی ضرورت کے لئے کوئی یادداشت وغیرہ ہی لکھی جاسکتی ہے، کوئی مستقل چیز نہیں لکھی جاسکتی - تو یہ کہنا صحیح نہیں کیونکہ مکہ معظمہ میں زمانہ جاہلیت ہی سے بہت کافی لوگ لکھنا پڑھنا جانتے تھے مکے کے آس پاس اہل کتاب بھی رہتے تھے - ان کے پاس ان کی کتابیں تورات و انجیل کے نسخے لکھے ہوئے تھے[۱] خانہ کعبہ کی دیواروں سے شعراء سو سو اشعار کے

۱۔ حضرت خدیجہؓ کے عزیز ورقہ بن نوفل کے متعلق تمام مؤرخین و سیرت نگار بالاتفاق لکھتے ہیں کہ انھوں نے توراۃ و انجیل نہ صرف اپنے پاس لکھ رکھی تھیں بلکہ ان کا عربی ترجمہ بھی کر لیا تھا (طاہر)

قصیدے لکھ لکھ کر لگادیتے تھے کہ آنے جانے والے ان کو پڑھیں جس ملک کے سارے لوگ ان پڑھ ہوں اس ملک میں کس کے پڑھنے کیلئے یہ قصائد لگائے جاتے تھے؟ اور جب کاغذ ہی نہ تھا تو کس چیز پر لکھ کر وہ قصائد دیواروں سے لگائے جاتے تھے اور اہل کتاب اپنی کتابیں کس چیز پر لکھتے تھے یہ جو مشہور ہے کہ مکہ میں اہل کتاب نہ تھے، خاص مکہ میں نہ ہوں مگر وہاں اہل کتاب بالکل نہ تھے۔ تو پھر انبیائے بنی اسرائیل کے واقعات کس کو سنانے کیلئے مکی سورتوں میں مذکور ہوئے۔ مشرکین مکہ تو انبیائے بنی اسرائیل سے پوری طرح واقف بھی نہ تھے، نہ ان کے ماننے والے تھے، وہ ان کی داستانیں سن کر کیا متاثر ہوتے۔ سورۃ زخرف بالاتفاق مکی سورۃ ہے اور مکہ میں اترنے والی چھیاسی سورتوں میں سے تریسٹھویں سورت ہے جس میں بنی اسرائیل و انبیائے بنی اسرائیل کا ذکر موجود ہے۔ اس سورۃ کے چوتھے رکوع کے آخر میں ارشاد ہے

و سئل من ارسلنا من قبلک من رسلنا اجعلنا من دو ن الرحمن الھۃ یعبدو ن (الزخرف)

(ای و سئل امم من ارسلنا) یعنی تم سے پہلے اپنے جن رسولوں کو ہم نے بھیجا تھا ان کی امتوں سے پوچھو کیا اللہ رحمن کے سوا دوسرے معبود ہم نے قرار دیئے جو پوجے جا سکیں؟

اگر مکہ یا حوالئ مکہ میں اہل کتاب نہ تھے تو پھر یہ کن سے پوچھنے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوا تھا؟ اور یہ جو بعض مفسرین نے لکھدیا ہے کہ یہ حکم شب معراج میں جو تمام رسولوں سے ملاقات ہوئی تھی اس موقع پر آپؐ کو پوچھنے کے لئے فرمایا گیا تھا پھر یہ بھی لکھا ہے کہ مگر آپؐ کو کوئی شک تو تھا ہنیں اسلئے آپؐ نے کسی سے ہنیں پوچھا۔ کس قدر لغو مہمل ہے کیا یہ ممکن ہے کہ اللہ تعالی کا ایک حکم ہو اور آپؐ اس کو بے ضرورت سمجھکر ٹال دیں اور

تعمیل نہ کریں؟ معاذ اللہ من ذالک ۔

اور پھر اللہ تعالیٰ اپنے رسول کو ایسا حکم کیوں دینے لگا جو لایعنی ہو، کیا اس میں نعوذ باللہ العظیم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو شک تھا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی دوسرے کی عبادت کرنی چاہئے یا نہیں؟ کوئی دوسرا معبود ہو سکتا ہے یا نہیں؟ اور اس کے متعلق اللہ تعالیٰ کی ہدایتوں سے نعوذ باللہ آپؐ کی تشفی نہ ہوئی تو شب معراج میں فرمایا گیا کہ دوسرے رسولوں سے اس کو پوچھکر اپنی تشفی کرلو؟ اور اگر آپؐ پوچھتے تو وہ اگلے انبیاء و مرسلین علیہم وعلیٰ نبینا الصلوٰۃ والسلام آپؐ کے بارے میں کیا سمجھتے؟ یہ تو یہود و نصاریٰ سے محض بغرض اتمام حجت پوچھنے کیلئے فرمایا گیا تھا جس کو آپؐ نے ان لوگوں سے یقیناً پوچھا ہوگا اور وہ کچھ جواب نہ دے سکے ہوں گے ۔

غرض یہ روایت بالکل موضوع و مکذوب ہے کہ آپؐ سے کہا گیا تھا کہ شب معراج میں اس کو دوسرے رسولوں سے پوچھنا ۔ مختصر یہ ہے کہ حوالیٔ مکہ میں اہل کتاب یہود و نصاریٰ اور صائبین کی بود و باش بہت کافی تھی اور مکے والوں سے ان کے گہرے تعلقات تھے جب ہی تو سورۃ مریم وغیرہ بہتیری سورتیں جن میں انبیائے بنی اسرائیل کا کافی ذکر ہے مکہ ہی میں اتریں ۔ اور یہ لوگ اپنی اپنی کتاب رکھتے تھے تورات یہودیوں کے پاس تھی اور انجیل عیسائیوں کے پاس صحف ابراہیمی کے نام سے صائبین بھی ایک مجموعہ رکھتے تھے ۔ گو قرآن مجید نے ان کے اس مجموعے کو تسلیم نہیں کیا ہے اسلئے کہ وہ بالکل من گھڑت تھے مگر تھے ضرور کتابی ہی صورت میں تو اگر لکھنے پڑھنے کا رواج مکہ و حوالیٔ مکہ میں نہ تھا تو پھر یہ کتابیں کہاں سے ان لوگوں کے پاس ہوتی تھیں اور جب پڑھنے والے ہی نہ تھے تو ان کتابوں کو کون پڑھتا تھا؟

جنگ بدر میں بیسیوں قیدیوں کا فدیہ یہی قرار دیا گیا تھا کہ وہ مدینے کے

لڑکوں کو کتابت کی تعلیم کر کے ایک اچھا کاتب بنا دیں۔ اگر مکے کے کفار و مشرکین لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے تو یہ جنگ بدر کے قیدی جو سب کے سب مکے کے مشرکین تھے کس طرح مدینے کے لڑکوں کو لکھنے کی تعلیم کر سکے؟ انھیں مکے والوں میں سے بیسیوں آدمی ایمان لائے اور ایمان لانے والے کیا صرف وہی لوگ تھے جو لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے؟ حضرت ابو بکر صدیق اکبر، حضرت طلحہ، حضرت زبیر، حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت عثمان ذوالنورین حضرت علی حضرت فاروق اعظم، حضرت حمزہ سیدالشہداء وغیرہم رضی اللہ عنہم اجمعین یہ سب شرفائے مکہ سے تھے۔ کیا یہ سب لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے؟ تاریخ شاہد ہے کہ یہ سب لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ ان میں سے بہتیروں نے کتابت وحی کا کام بھی انجام دیا تھا۔

حضرت فاروق اعظم عمر بن الخطاب بن نفیل رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے کا واقعہ مشہور و معروف ہے کہ ان کی بہن فاطمہ بنت الخطاب رضی اللہ عنہا جو سعید بن زید بن عمرو بن نفیل یعنی حضرت فاروق اعظم کے چچیرے بھائی کے بیٹے تھے ان کی بیوی تھیں اور یہ دونوں زن و شو ایمان لا چکے تھے اور دونوں زن و شو لکھے پڑھے تھے۔ حضرت خباب بن الارت رضی اللہ عنہ جو ایک کمسن صحابی تھے ان کے مصحف میں قرآن پڑھا کرتے تھے اور وہ مصحف حضرت خبابؓ جیسے کمسن صحابی ہی کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو جو بہن کے اسلام قبول کر لینے کی خبر ملی تو غصے میں ان کے یہاں پہنچے اس وقت حضرت خبابؓ رضی اللہ عنہ ان کے یہاں موجود تھے اور قرآن پڑھا رہے تھے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے بہنوئی اور بہن پر کچھ تشدد بھی کیا آخر میں وہ مصحف مانگا جس میں یہ لوگ پڑھ رہے تھے ان کی بہن نے دینے سے انکار کیا اور کہا کہ تم مشرک ہو اور مشرک نجس ہوتے ہیں تم

غسل جنابت نہیں کرتے اسلئے جب تک غسل نہ کر لو ہم تمہارے ہاتھوں میں یہ کتاب نہیں دے سکتے کیونکہ اس کتاب کی شان یہ ہے کہ[1] لا یمسہ الا المطہرون حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے ان کے اصرار کو دیکھکر غسل کیا اور کتاب ہاتھ میں لیکر پڑھنا شروع کیا۔ پہلی نظر بسم اللہ الرحمن الرحیم پر پڑی۔ سب سے پہلے اسی سے متاثر ہوئے پھر سورۃ طٰہٰ کو پڑھ گئے جب لتجزی کل نفس بما تسعیٰ تک پہنچے تو بولے ما اطیب ھذا الکلام واحسنہ کیا اچھا کلام ہے اور کتنا حسین انداز بیان ہے پھر اذا الشمس کورت کا سورۃ پڑھنے لگے جب علمت نفس ما احضرت تک پہنچے بیحد متاثر ہوئے آگے بڑھے تو بسم اللہ کے بعد دیکھا سبح للہ ما فی السموت والارض پڑھا تو کچھ مرعوب سے ہوگئے اور ان کے رونگٹے کھڑے ہوگئے اور کانپنے لگے یہاں تک کہ پڑھا فامنو اباللہ و رسولہ[3] تو بے اختیار آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے اور کہہ اٹھے کہ اشھد ان لا الٰہ الا اللہ و اشھد ان محمد الرسول اللہ اس کے بعد بارگاہ نبویؐ کی طرف چلے۔ سورۃ طٰہٰ پنتالیسواں سورۃ کہا جاتا ہے۔ اس وقت مکی سورتوں میں سے نصف سے زیادہ سورتیں اتر چکی تھیں اور یقیناً اس صحیفے میں جس کو حضرت عمر فاروق

۱۔ یہ آیت سورہ واقعہ کی ہے جو مکی سورتوں میں سے بقول علماء چھیالیسواں سورہ ہے اور سورہ طہ کے بعد اترا تھا۔

۲۔ روض الالف شرح سیرۃ ابن ہشام جلد اول ص ۲۱۷، ۲۱۸ و ریاض النضرہ وغیرھما

۳۔ "سبح للہ ما فی السموت والارض" اور "فامنوا باللہ ورسولہ" اور بھی کچھ آیتیں جو اس روایت میں ریاض النضرہ وغیرہ میں لکھی ہیں یہ سب سورہ حدید کی آیتیں ہیں اور علماء اس سورہ کو مدنی لکھتے ہیں اسلئے یا تو یہ روایت غلط ہے یا اس سورہ کا مدنی ہونا صحیح نہیں مگر روایت پھر بھی مسند ہونے کی وجہ سے اقوال علماء سے زیادہ قریب الی الصحۃ ہے جبکہ اس روایت میں کوئی بات نص قرآنی کے خلاف نہیں۔ اسلئے میرے نزدیک یہ روایت صحیح ہے اور سورۃ حدید مکی سورہ ہے ورنہ کم سے کم یہ ماننا چاہیئے کہ اس کے کچھ حصے مدینے میں اترے اور کچھ حصے مکے میں۔

اعظم رضی اللہ عنہ نے اپنی بہن رضی اللہ عنہا سے لیکر دیکھا تھا اس میں وہ سب سورتیں جو اس وقت تک اتری تھیں، لکھی ہوئی تھیں کیونکہ حضرت خباب رضی اللہ عنہ، حضرت سعید بن زید اوران کی بیوی حضرت فاطمہ بنت خطاب رضی اللہ عنہما کو قرآن کی تعلیم ہی کے لئے وہ مصحف لیکر آئے تھے، کوئی وجہ نہیں کہ بعض سورتوں کی وہ تعلیم کریں اور بعض سورتوں کی تعلیم نہ کریں۔ یا یہ لوگ بعض سورتوں کی تعلیم حاصل کریں اور بعض کی تعلیم حاصل کرنے کی ضرورت نہ سمجھیں۔ اور نہ یہ بلا دلیل کہا جاسکتا ہے کہ اس صحیفے میں صرف سورۃ طٰہٰ اور تکویر ہی لکھی ہوئی تھی یا سورۃ حدید کی وہ آیتیں جو مکے میں اتری تھیں اور سورتیں اس میں لکھی ہوئی نہ تھیں کیونکہ صحیفہ لکھنے والے نے یقیناً پہلے انھیں سورتوں کو لکھا ہوگا جو پہلے اتریں۔ اگر کہا جائے کہ ترتیب نزول کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جمع نہیں کرارہے تھے بلکہ لوح محفوظ کے مطابق جمع کرارہے تھے، جب بھی سورۃ مریم و سورۃ اعراف کو تو بہر حال اس صحیفے میں ہونا چاہیئے اور پھر یہ تو ممکن ہی نہ تھا کہ جو سورتیں اتر چکی تھیں ان کو آپؐ صرف اس انتظار میں لکھواتے ہی نہیں کہ ابھی وہ سورتیں نہیں اتری ہیں جو لوح محفوظ میں ان سے پہلے ہیں۔ سورتوں کی ترتیب لوح محفوظ کے مطابق مصاحف میں تو پورے قرآن کے اتر جانے کے بعد قائم کی گئی۔

حضرت فاطمہؓ بنت الخطاب نے جو **لا یمسه الا المطھرون** کی آیت پڑھکر حضرت عمرؓ کو بغیر غسل کئے قرآن ہاتھ میں لینے کی اجازت نہ دی تو اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ سورۃ واقعہ بھی جو بقول علماء چھیالیسواں مکی سورۃ ہے اور سورۃ طٰہٰ کے بعد اترا تھا، اس کو اس واقعے سے پہلے حضرت فاطمہؓ حضرت خبابؓ سے پڑھ چکی تھیں اور اس صحیفے میں سورۃ واقعہ بھی لکھا ہوا ضرور ہوگا

اسلئے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے صرف سورۃ طٰہٰ و سورۃ تکویر و آیات سورۃ حدید کے پڑھ لینے سے یہ سمجھنا کہ بس اسی قدر اس صحیفے میں لکھا ہوا تھا، حضرت سعید بن زیدؓ و حضرت فاطمہؓ بنت الخطابؓ نے بس اسی قدر حضرت خبابؓ سے پڑھا تھا، ایسا ہی ہے کہ یہ کہا جائے کہ اس وقت تک بس اسی قدر قرآن اترا تھا حقیقت یہ ہے کہ وہ پورا قرآن مصحف تھا جو کچھ اس وقت تک اترا تھا وہ سب اس میں موجود تھا۔ حضرت عمرؓ نے جا بجا سے الٹ پلٹ کر پڑھا تھا بہر حال یہاں اس سے تو بحث ہی نہیں ہے کہ اس صحیفے میں کتنا حصہ قرآن لکھا ہوا تھا، جتنی سورتیں اسوقت تک اتری تھیں وہ سب اس میں لکھی ہوئی تھیں یا نہ تھیں اس صحیفے میں وہ ساری سورتیں ہوں یا نہ ہوں مگر یقیناً کتنے صحیفے کتنے صحابہؓ کے پاس ایسے ضرور اس وقت ہوں گے جن میں اسوقت تک کی اتری ہوئی سب سورتیں لکھی ہوئی مجتمع ہوں گی اور وہ لوگ لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ لکھنے پڑھنے کا سامان رکھتے تھے فقط مرد ہی نہیں عورتیں بھی لکھی پڑھی تھیں حضرت شفا بنت عبداللہ رضی اللہ عنہا کا ذکر میں اپنی کتاب جمع قرآن میں کر چکا ہوں جن سے حضرت ام المومنین حفصہ رضی اللہ عنہا نے کتابت سیکھی تھی۔ یہ حضرت شفاؓ اسلام قبول کرنے کے پہلے ہی سے کتابت جانتی تھیں اور قدیم الاسلام تھیں۔

غرض جب یہ معلوم ہو چکا کہ مہاجرین صحابہ رضی اللہ عنہم لکھنا پڑھنا جانتے تھے ان میں سے جو نہیں جانتے ہوں گے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تاکید تحصیل علم اور قرآن کی تصریح کہ علم بالقلم یعنی علم قلم کے ذریعے حاصل ہوتا ہے یقیناً جو کتابت نہیں جانتے تھے انھوں نے بھی سیکھ لی ہوگی۔ اور تحصیل علم سے مراد تحصیل قرآن کے سوا ان لوگوں کے لئے کچھ اور تھا ہی کیا اس لئے کون صحابی ہوگا جو قرآن کی تلاوت و حفظ اور کتابت میں مصروف نہ

ہوگا قرآن لکھکر اگر اپنے گھر نہ لاتا تو اپنی بیوی اور اپنے بچوں کو کس طرح قرآن کی تعلیم دیتا ۔ زبانی یاد کرانے کے لئے کافی وقت چاہیئے اور حروف شناسی کے بعد کتاب دیکھکر پڑھنے والا بطور خود بھی یاد کر سکتا ہے ، قرآن ان کی مادری زبان میں اترا تھا سمجھنے میں کوئی دشواری کسی کو تھی ہی ہنیں اسلئے یاد کرنے کی دو ہی صورتیں تھیں یا تو اندھے حافظوں کی طرح صرف زبانی سن سن کر یاد کرتے ۔ یا کتاب دیکھ دیکھ کر یاد کرتے کتاب دیکھکر یاد کرنا ان کے لئے خصوصاً بالکل سہل تھا اور ہر شخص کے لئے سہل ہوتا ہے ورنہ زبانی یاد کرانے والے کو دیر تک ساتھ بیٹھکر یاد کرانے میں وقت بہت صرف کرنا پڑتا ہے اسلئے عورتیں بچے سب نے لکھنا پڑھنا سیکھ لیا ہوگا اور پھر ہر گھر میں قرآن مجید کے متعدد نسخے ہونگے غرض آغاز نزول قرآن کے وقت ہی سے کتابت قرآن کا سلسلہ صحابہؓ نے عام طور سے شروع کر دیا تھا اور اس وقت سے اس کا تواتر آج تک چلا آرہا ہے اس درمیان کا کوئی دن ایسا تصور ہنیں کیا جا سکتا ہے بلکہ کوئی ساعت ایسی خیال ہنیں کی جا سکتی ہے جس میں قرآن مجید کی کتابت دنیائے اسلام میں کہیں نہ کہیں نہ ہوتی رہی ہو ۔

اہل عرب اور صحابہؓ کی مہارت فن املاؤ انشاء

یہاں یہ بھی بیان کر دینا ضروری ہے کہ اہل عرب زمانہ جاہلیت میں بھی لکھنا پڑھنا محض معمولی طور سے ہنیں جانتے تھے بلکہ فن املاؤ انشاء سے بھی پوری طرح واقف تھے ۔ ان ماہرین میں سے جو لوگ ایمان لائے تھے وہی لوگ کتابت وحی کے لئے منتخب کئے جاتے تھے ڈاکٹر زکی مبارک عبدالسلام المصری نے اپنی کتاب النثر الفنی جلد اول ص ۴۸ کے حاشیے میں لکھا ہے کہ:

یذکر ابو ھلال فی کتاب الصناعتین ۳۵۱ ان اکثم بن صیفی کان

اذا کاتب ملوک الجاهلیه یقول کاتبه افصلوا بین کل منقضی معنی، و صلوا اذا کان الکلام معجونا بعضه ببعض" و ان الحارث بن شمر الغسانی کان یقول لکاتبه المرقش "اذا نزع بک الکلام الی الابتداء بغیر ما انت فیه فافصل بینه و بین تبیعة من الالفاظ، فانک ان مذقت الفاظک بغیر مایحسن ان تمذق، نفرت القلوب عن وعیها و ملته الاسماع و استثقلتها الرواة" و فی امثال هذه الکلمات دلیل علی ان الرواة نقلوا عن الجاهلیین احکاما فی صناعة الکلام ..... الخ"

یعنی ابو ہلال[1] کتاب الصناعتین کے ص ۱۵۳ میں لکھتے ہیں کہ اکثم بن صیفی کے مکاتبات جب شاہان زمانہ جاہلیت سے ہوتے تھے تو یہ اپنے کاتب سے کہتے تھے کہ "جب مضمون تمام ہو جائے تو تحریر میں فصل قائم کرو۔ (یعنی اس پیراگراف کو ختم کرکے دوسرا پیرا شروع کرو یا ڈیش دیدو) اور حارث بن شمر الغسانی اپنے کاتب "مرقش" سے کہتے تھے کہ "تم جس مضمون کے لکھنے میں لگے ہو، اس کے سوا جب کسی کلام کی ابتداء کی طرف آؤ تو اسمیں اور اسکے متابع الفاظ میں فصل پیدا کرو کیونکہ تم نے اگر اپنے الفاظ کو خلط ملط کر دیا ایسے موقع پر جہاں ان کا خلط ملط کرنا اچھا نہیں معلوم ہوتا تو تم نے پڑھنے والوں کے دلوں کو اس کے ذہن نشین کرنے سے متنفر کر دیا اور کان ان کے سننے سے پر ملال ہوں گے اور اس کے روایت کرنے والوں پر وہ تحریر بار ہوگی" اس طرح کے کلام اس بات کی دلیل ہیں کہ روایت کرنے والے زمانہ جاہلیت والوں سے صنائع کلام، تحریری و تقریری نقل کرتے رہے۔ اور اس کتاب النثر الفنی جلد

۱۔ ابو ہلال حسن بن عبد اللہ بن سہل العسکری۔ یہ پانچویں صدی ہجری کے علمائے ادب میں سے ہیں ان کی کتاب کتاب الصناعتین مشہور و معروف ہے۔

اول کے صفحہ ۵۶ میں لکھا ہے کہ

و کذلک یری ابن فارس ان معرفة القدماء من الصحابه بکتا بة المصحف علی النحو : الذی یعلله النحو یون فی ذوات الواو و الیاء و الھمزة و المدو القصر تدل علی فھمھم لا صول اللغة و قواعد الکتابة و ھو یری ان العلوم العربیه کانت معروفه قبل الاسلام

یعنی ابن فارس کو اس کا یقین ہے کہ قدمائے صحابہؓ کو کتابت قرآن میں جو واقفیت ان باتوں سے تھی جن میں علمائے نحو فرق کرتے ہیں لغات وادی دیائی و مہوز میں اور مد قصر وغیرہ میں، اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ وہ اصول لغت اور قواعد کی کافی دانست رکھتے تھے اور اس سے اس کا پتہ ملتا ہے کہ علوم عربیہ اسلام کے قبل ہی سے ایک حد تک لوگوں میں متعارف تھے۔

مختصر یہ ہے کہ اہل عرب اور خصوصاً اہل حجاز کو بالکل جاہل اور ان پڑھ سمجھنا نہایت خطرناک غلطی ہے اور جن لوگوں نے اس پروپیگنڈہ کی ابتداء کی انھوں نے بعد والوں کو ایک افسوسناک اور گمراہ کن مغالطے میں ڈالا جسکی تفصیل انشاءاللہ تعالیٰ آگے آئے گی۔

(۹) تواتر تلاوت

"تلاوت" کے معنی ہیں کسی کے پیچھے پیچھے چلنا، یا کسی کے فوراً بعد آنا کتاب کی تلاوت کے معنی کتاب کا مطلب سمجھ سمجھ کر پڑھنا کتاب میں لکھے ہوئے حروف دیکھ دیکھ کر پڑھنا قرآن پاک کے لئے اس لفظ کا استعمال خاص طور سے ہے۔ اہل کتاب بھی جو تورات وانجیل و زبور معنی سمجھ سمجھ کر یا دیکھ دیکھ کر پڑھتے ہیں تو اس کو بھی تلاوت کہا جاتا ہے قرأت عام ہے اور تلاوت خاص۔ تو

قرآن مجید کی تلاوت یعنی اس کی آیتوں کے معنی مطلب سمجھ سمجھ کر پڑھنے کا
اور کتاب دیکھ دیکھ کر پڑھنے کا تواتر زمانہ نبویؐ سے آج تک بلا فصل چلا آرہا ہے
اتنی طویل مدت میں کوئی دن ایسا نہیں ہے کہ دنیائے اسلام میں ہزاروں بلکہ
کروڑوں صاحب توفیق مسلمان قرآن کی تلاوت میں مصروف نہ رہے ہوں۔

صحابہؓ میں قرآن کے حفاظ کی تعداد تقریباً ننانوے فی صد تھی اس لئے وہ
لوگ زبانی قرآن پڑھا کرتے تھے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں
فرمایا کہ

اعطوا اعینکم حظها من القرآن (مسند احمد)

قرآن میں جو حصہ تمہاری آنکھوں کا ہے وہ اپنی آنکھوں کو بھی دیا کرو۔
(یعنی قرآن دیکھکر پڑھا کرو) اور مشکوۃ میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ
وسلم نے فرمایا کہ قراءۃ الرجل فی غیر المصحف الف درجۃ و قراءته
فی المصحف تضعف علی الفی درجة یعنی قرآن بلا مصحف کے زبانی
پڑھنا ہزار گونہ ثواب کا درجہ رکھتا ہے اور مصحف میں دیکھکر پڑھنا دو ہزار گونہ
ثواب کے درجے تک پہنچ جاتا ہے۔ (مشکوۃ باب فضائل القرآن ۱۸۰ آخر صفحہ

غرض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس ترغیب اور تاکید کی وجہ سے
صحابہؓ حتی الوسع مصحف دیکھ دیکھ کر ہی قرآن مجید کی تلاوت کے عادی سے
ہوگئے تھے اور آج بھی جو لوگ حافظ نہیں ہیں وہ تو قرآن مجید دیکھ دیکھ کر پڑھتے
ہی ہیں۔ حفاظ بھی اپنے سامنے قرآن مجید کھلا رکھ کر عموماً تلاوت کیا کرتے ہیں۔

(۱۰) تواتر حفظ

قرآن مجید کے حفظ کرنے کا سلسلہ آغاز نزول قرآن ہی کے وقت سے شروع

ہوگیا جو مسلمان ہوا اس نے قرآن کی آیتیں سنیں اور یاد کرلیں، کیونکہ قرآن ان لوگوں کی اپنی مادری زبان میں اترا تھا، اس کی فصاحت اور بلاغت کا تقاضا ہی یہ تھا کہ جس آیت کو وہ لوگ ایک بار سن لیتے تھے وہ آیت ان کے دلنشین ہو جاتی تھی، آج بھی کوئی اچھا شعر کوئی دلچسپ مقولہ کوئی سن لیتا ہے اور اس کا ذوق اس کو مل جاتا ہے تو صرف ایکبار سن لینے سے وہ شعر یا وہ مقولہ یاد ہو جاتا ہے اور ایسا یاد ہو جاتا ہے کہ ذہن سے نکلتا نہیں۔ اور قرآن مجید تو اس وقت ہر مسلمان کا تنہا سرمایہ ایمان تھا کسی صحابی سے یہ ممکن ہی نہ تھا کہ وہ کسی نازل شدہ آیت کے نزول کی خبر سننے کے بعد اس کو بغیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پڑھے اور اس آیت کو بغیر یاد کئے رہتا۔ جبھی تو قرآن مجید کے متعلق فرمایا گیا ہے:۔

بل هو ایت بینت فی صد و رالذین او تو االعلم بلکہ وہ واضح اور روشن آیتیں ہیں ان لوگوں کے سینوں میں جن کو علم دیا گیا ہے۔ (۲۹ ۴۹)

"جن کو علم دیا گیا" سے مراد سارے مومنین ہیں یعنی جتنے لوگ اسوقت ایمان لے آئے تھے ان کا ایمان لے آنا ہی ان کے صاحب علم ہونے کا ثبوت ہے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ طلب العلم فریضة علی کل مسلم و مسلمة (علم حاصل کرنا ہر مسلم مرد اور ہر مسلمہ عورت پر فرض ہے) تو پھر اس وقت کا کونسا مسلم مرد ہوگا اور کونسی مسلمہ عورت ہوگی جو طلب علم میں مصروف نہ ہوگی اور اس وقت علم حاصل کرنے کے معنی ہی یہی تھے کہ قرآن یاد کیا جائے اس کے معانی اور مطالب پر عبور حاصل کیا جائے اسی لئے ہر صحابی حفظ قرآن میں مصروف تھا اور اپنی دماغی اور ذہنی صلاحیت کے مطابق قرآن سمجھتا تھا اور قرآن میں تدبر و فکر کرتا تھا۔ ذہنی و دماغی صلاحیتوں کے تفاوت کی وجہ سے جماعت صحابہؓ میں علمی تفاوت بھی

ضرور تھا۔ آج جتنے علماء ہیں سب کے سب علم و فضل و وسعت نظر میں کیا برابر ہیں؟ مگر سب علماء ہی کہے جاتے ہیں۔ اسی طرح ہر صحابی الذین او تو ا العلم " جو لوگ علم دیئے گئے ہیں" میں داخل تھا سب صاحب علم تھے اسی لئے اسلام سے قبل کے زمانے کو " جاہلیت کا زمانہ " کہتے ہیں اسلام آیا اور " عالمیت کا زمانہ " آیا جن لوگوں نے اسلام قبول کیا اور قرآن کا علم حاصل کیا وہ " عالم " ہو گئے جنھوں نے اسلام قبول کرنے سے انکار کیا اور اپنے کفر پر قائم رہے وہ جاہلیت پر قائم رہے اور جاہل رہے۔

غرض حفظ قرآن کا سلسلہ بھی عہد نبویؐ سے آج تک قائم ہے اور قیامت تک قائم رہے گا اس تمام عرصہ میں کوئی دن ایسا نہیں گذرا جس میں ہزاروں بلکہ لاکھوں حافظ قرآن دنیا میں موجود نہ ہوں اور نئے نئے حافظ نہ ہو رہے ہوں اور کچھ نہ کچھ مختلف شہروں اور بستیوں میں حفظ قرآن میں مصروف نہ ہوں۔

(۱۱) تواتر دور

" دور " سے مراد ایک حافظ قرآن کا دوسرے حافظ قرآن کو اپنے حفظ کی جانچ اور مشق و مہارت کے لئے قرآن کا زبانی سنانا ہے۔

خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر سال حضرت جبرئیل علیہ السلام کو قرآن سناتے تھے اور حضرت جبرئیل علیہ السلام آپؐ کو سناتے تھے جس سال آپؐ کی وفات ہوئی اس سال دو بار آپؐ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ساتھ دور فرمایا، یہ مشہور روایت ہے جس سے کسی کو انکار نہیں صحاح و غیر صحاح کی متعدد کتابوں میں موجود ہے۔ پھر صحابہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن سناتے تھے اور ایک صحابی دوسرے صحابی کو سناتے تھے۔ اس کا سلسلہ آج تک جاری ہے کہ حفاظ ایک دوسرے کو سنایا کرتے ہیں۔

تنہا بھی حفاظ روزانہ قرآن کا دور کرتے ہیں صرف اپنے حفظ کو باقی رکھنے کے

لئے دور کے وقت معانی و مطالب کا خیال رکھنا ضروری نہیں ہوتا۔ صرف یاد کی مشق مقصود ہوتی ہے۔ اور یہ چیز ایسی ہے جو حفاظ کے لئے ضروری ہے۔

(۱۲) تواتر تدبر

قرآن مجید میں آیا ہے کہ

افلا یتدبرون القران ام علیٰ قلوب اقفالھا ۴۷ ۲۴ کیوں نہیں لوگ قرآن میں تدبر یعنی غور و فکر کرتے؟ کیا دلوں پر تالے لگے ہوئے ہیں۔ اسی لئے صحابہ رضی اللہ عنہم کے وقت ہی سے ہر مسلم تلاوت قرآن تدبر یعنی اس کے معنی و مفہوم کو سمجھتے ہوئے غور و فکر کے ساتھ کرتا تھا۔ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے بعد تابعین اور ان کے بعد اتباع تابعین، اتباع کے اتباع۔ پھر ان کے اتباع۔ غرض چار پانچ صدی تک مسلسل ہر مسلم تلاوت قرآن تدبر و تفکر کے ساتھ ہی کرتا تھا اور اس وقت تک ہر مسلم اتنی عربی جاننا اپنے اوپر فرض سمجھتا تھا کہ وہ قرآن مجید کی آیات کریمہ کے معنی و مفاہیم کو عموماً سمجھ سکے۔ عجمی مسلمان بھی اتنی عربی ضرور سیکھ لیتے تھے۔

اس کے بعد منافقین عجم نے یہ پروپیگنڈہ شروع کیا کہ جب تک قرآنی آیات و سور کے متعلق یہ علم پوری طرح حاصل نہ ہو کہ کون آیت اور کون سورت پہلے اتری ہے اور کون بعد میں اتری ہے، کون مکی ہے اور کون مدنی، کون ناسخ ہے اور کون منسوخ، کون محکم ہے اور کون متشابہ، کون عام ہے اور کون خاص، کس آیت کی کون سی شان نزول ہے۔ اور کس آیت کی تفسیر روایت میں کیا آئی ہے وغیر ذلک۔ اس وقت تک ان لوگوں کے لئے جو ان باتوں سے پوری طرح واقف نہیں ہیں قرآن میں بطور خود تدبر و تفکر کرنا حرام ہے۔ بس جو اگلے مفسرین و فقہاء و مجتہدین جس آیت کے جو معنی لکھ گئے ہیں اسی کے

مطابق سمجھنا چاہیئے اور اسی پر ایمان رکھنا چاہیئے - اگلوں کی رائے کے خلاف رائے قائم کرنا چونکہ تفسیر بالرائے ہے اسلئے حرام ہے غرض اگلے مفسرین جن کے امام اور استاد الکل ابو جعفر محمد ابن جریر طبری ہیں جو ایک شیعہ مفسر تھے جن کے بارے میں حافظ ابو الفضل احمد بن علی البیکندی متوفی ۴۰۵ ھ جیسا محدث اور جلیل القدر امام الحدیث و الرجال، جن کے متعلق انساب سمعانی ورق ۳۰۵ میں لکھا ہے کہ لم یکن له نظیر فی زمانه اسناداً[۱] و حفظاو درایةبالحدیث و ضبطاو اتقاناً- اور جن پر کسی شخص کی کوئی جرح نہیں ہے - انھوں نے ان ابن جریر مفسر و مورخ مشہور کے بارے میں تحریر فرمایاہے کہ کان یضع للرو افض - یعنی ابن جریر طبری رافضیوں کی حمایت میں حدیثیں گھڑا کرتے تھے اور انھیں کے پیچھے پیچھے تقریباً سارے مفسرین چلتے رہے اور انہیں کی پیش کردہ روایتوں کے مطابق تفسیریں لکھتے رہے - الا ماشاء اللہ - اور ابن جریر سے بھی پہلے سدی و کلبی و ضحاک و جُوَیبِر ہی جیسے لوگوں سے پچانوے فی صد تفسیری روایتیں ہیں اور باوجود اس کے کہ ان میں سے ہر ایک کے مجروح اور سخت مجروح ہونے پر ائمہ حدیث ورجال کا اتفاق ہے مگر ان کو وضاع یا کذاب یا کم از کم منکر الحدیث و متروک قرار دیتے ہوئے بھی تفسیری حدیثیں سب کے سب انہی جیسوں سے لیتے رہے چنانچہ حافظ ابن حجر عسقلانی تہذیب التہذیب ج ۲ - ۱۲۴ ترجمہ جبیر بن سعید الازدی ابو القاسم البلخی (متوفی ۱۴۰ سے ۱۵۰ تک کے اندر) میں لکھتے ہیں:-

قال ابو قدامة السرخسی قال یحیی القطان تساھلو افی اخذ التفسیر

۱- اس کتاب کے بعد انشاء اللہ امام زہری و طبری کے متعلق علامہ تمنا عمادی کی تحقیقات پر مشتمل ایک مستقل کتاب ہم پیش کرنے والے ہیں تفصیلات اس میں ملاحظہ فرمائیں۔ (طاہر)

عن قوم لایو ثقو نهم فی الحدیث ثم ذکر الضحاک و جو یبرا و محمد بن السائب (الکلبی) و قال ھو لاء لا یحمل حدیثهم و یکتب التفسیر عنهم۔

یعنی امام ابو قدامہ سرخسی نے فرمایا کہ امام الحدیث یحیی القطان نے ارشاد فرمایا کہ لوگوں نے ایسی جماعت سے تفسیر لینے میں تساہل برتا جن کو حدیثوں کے موقع پر قابل وثوق نہیں سمجھتے پھر ضحاک اور جویبر اور محمد بن السائب الکلبی کا ذکر فرمایا اور کہا کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کی حدیث تو برداشت نہیں کی جاتی مگر ان کی تفسیر لکھی جاتی ہے (یہ تین نام مثالاً پیش کئے گئے ہیں ورنہ ایسے اور بھی بہت ہیں مثلاً سدی و مقاتل وغیرہ) غرض یہ عالم ہے دنیائے تفسیر کا جس کے نتیجہ میں اللہ کا کلام، راویوں کی گڑھی ہوئی روایات کے نیچے دب کر رہ گیا ہے اور قران کریم کے پر تاثیر چھوٹے چھوٹے جملوں کی وجد آفریں کیفیت روایتوں کے پردے میں چھپ کر رہ گئی ہے۔

تقریباً چھ سات سو برس سے یا اس سے کچھ بعد سے ہمارے علماء آج تک یہی کہتے آرہے ہیں ۔ تم خود اپنی عقل اور اپنی سمجھ سے کام نہ لو، بس جو اگلے مفسرین لکھ گئے ہیں اسی پر ایمان رکھو اور اسی کو قرآن کا صحیح معنی و مفہوم مانے رہو ۔ چاہے وہ تفسیر، وشان نزول کی روایت، قرآنی آیت کے سیاق و سباق کے مطابق ہو یا نہ ہو ۔ غرض اس گمراہ کن پروپیگنڈے کے اثر سے اگرچہ بہت لوگ قرآنی آیات میں تدبر و تفکر کا وہ آزادانہ طریقہ جو خیرالقرون میں ہر مسلم کا تھا اس کو تو بہت حد تک چھوڑ بیٹھے مگر انھیں تفسیری روایتوں کے حدود میں رہ کر تدبر اور تفکر ضرور کرتے رہے اور جہاں کسی روایت کو ان کی دیانت نے قبول نہ کیا تو پھر وہ روایت لکھکر اس کی تردید بھی کر دیا کرتے تھے ۔ مثلاً سورۃ اعراف کے آخری رکوع کی پہلی آیت پڑھئے ۔ اور **فلما تغشها حملت**

حملا خفیفا فمرت بہ کی تفسیر وشان نزول کی روایت ملاحظہ فرمایئے اور پھر قاضی بیضاء نے جو اپنی کتاب تفسیر بیضاوی میں اس روایت کی تردید کی ہے اس کو دیکھئے اور اس کے بعد محشی بیضاوی نے جو ان کی تردید پر خفگی ظاہر کی ہے اور اس روایت کو صرف اس سبب سے صحیح ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ روایت فلاں فلاں کتابوں میں مذکور ہے، اس پر بھی نگاہ عبرت ڈالئے۔

مختصر یہ کہ فرقہ بندی اور روایت پرستی کا جب دور دورہ ہوگیا تو پھر تدبر فی القرآن کا رخ بھی بدل گیا اور تدبر کا مقصد صرف اپنے فرقے کی حمایت یا روایت پرستی کے صنم خانے کی کھوکھلی دیوار کی پشتیبانی ہی رہ گئی مگر صحیح یا غلط تدبر فی القرآن کرنے والے ہر زمانے میں رہے۔ عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے لیکر اس وقت تک کوئی ایسا دن نہیں پیش کیا جاسکتا جس میں کوئی نہ کوئی تدبر فی القرآن نہ کر رہا ہو۔ اور وہ اپنے نزدیک صحیح ہی معنی میں تدبر نہ کر رہا ہو چاہے کسی کا تدبر درحقیقت غلط ہی کیوں نہ ہو۔ غرض اس تدبر فی القرآن کا تواتر بھی مذکورہ بالا تواترات کی طرح آج تک عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے اسوقت تک بلاانقطاع چلا آرہا ہے جس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔

(۱۳) تواتر استنباط

احکام شرعی میں سے وہ احکام جن کا تعلق حقوق و معاملات سے ہے، اس کے متعلق چونکہ آئے دن بعض ایسی ایسی صورتیں پیش آتی رہتی ہیں جو پہلے کبھی پیش نہیں آئی تھیں۔ یا اگر عقلاً پیش آئی بھی ہوں تو اس کے بارے میں کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ اس قسم کی کون صورت پہلے عہد نبویؐ یا عہد خلفائے راشدین میں بھی پیش آئی تھی اور اس وقت اس صورت کے بارے میں یہ فتویٰ صادر ہوا تھا اور ایسی کوئی روایت نہیں ملتی یا ملتی تو ہے مگر ناقابل قبول

ذرائع سے تو یقیناً اس وقت کے مدبرین فی القرآن اور مفکرین فی الکتاب کا یہ فرض ہوگا کہ وہ قرآنی آیات میں تدبر کرکے اس صورت حال کے متعلق کوئی حکم منشائے قرآنی کے مطابق استنباط کریں۔ عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے لیکر ائمہ مجتہدین تک پھر مجتہدین کے تلامذہ اور پھر ان کے تلامذہ یہاں تک کہ اسوقت تک جب کوئی نیا مسئلہ سامنے آجاتا ہے جس کی کوئی نظیر سابق میں ہنیں ملتی تو آج کے علماء بھی استنباط مسائل پر مجبور ہو جاتے ہیں اور قرآنی آیات میں تدبر کرکے استنباط حکم کی سعی کرتے ہیں ۔ مثلاً بینک کا سود، انشورنس، وغیرہ کہ ان چیزوں کے متعلق سوالات کا جواب ہدایہ و شرح وقایہ یا بخاری و مسلم میں صراحتاً ہنیں ملنے کا لامحالہ استنباط ہی کرنا پڑے گا اور دینی احکام کا استنباط قرآن مبین ہی سے ہوسکتا ہے جو اصل قانون الٰہی ہے۔ اس کے بعد حدیثوں سے عہد نبویؐ و عہد خلفائے راشدین و زمانہ مجتہدین وغیرہ کی نظیریں زیر غور آئیں گی۔ البتہ جو لوگ اصل قانون اور نظائر کا فرق ہنیں سمجھتے وہ قرآن مجید کو معزول یا منسوخ یا معطل قرار دے کر صرف روایات و اقوال ہی سے استنباط بھی کریں یہ اور بات ہے مگر وہ بھی مجبور ہیں کہ صحیح یا غلط اپنے استنباط کو قرآن سے بھی مستند و مؤید قرار دینے کے لئے دو ایک آیات بھی ضرور پیش کر دیں کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ قرآن مبین کے بغیر ان کا کوئی دینی استنباط والا حکم قابل قبول ہنیں ہوسکتا۔

غرض تدبر فی القرآن کی طرح قرآن سے استنباط احکام کا تواتر بھی عہد نبویؐ سے آج تک مسلسل بلا انقطاع چلا آرہا ہے اس چودہ سو برس کے اندر دنیائے اسلام میں کوئی ایسا دن ہنیں گزرا جس میں کوئی نہ کوئی عالم دین کسی نہ کسی دینی مسئلے میں قرآن سے استنباط نہ کر رہا ہو۔

ماحصل

تواتر اسنادی کی تینوں قسموں کو الگ الگ ایک ایک قسم شمار کیجئے تو یہ سولہ قسموں کے تواترات ہوئے اور ہر تواتر ایسا مسلسل اور غیر منقطع جو چودہ سو برس سے آج تک اس طرح چلا آرہا ہے کہ اسی طویل مدت کا کوئی دن ایسا نہیں پیش کیا جاسکتا جس میں ان تواترات شانزدہ گانہ میں سے کسی ایک تواتر کو بھی منقطع کہا جاسکے۔ کیا قرآن مجید کے سوا دنیا کی کسی اور چیز میں اس قسم کا تواتر تام و کامل و مکمل اپنے شانزدہ گانہ اقسام کے ساتھ دکھایا جاسکتا ہے؟ لا و اللہ!

میں تواتر کو آغاز بحث میں "لاریبیت" کی سرخی کے ماتحت کسی گذشتہ چیز یا گذشتہ بات یا کسی ایسی چیز کے متعلق جو بہت زمانے سے چلی آرہی ہے، یقین قطعیت حاصل کرنے کا واحد ذریعہ ثابت کر چکا ہوں۔ جو شخص کوئی بات نہ جانتا ہو وہ دوسروں سے پوچھ کر یقین حاصل کرے اس کا حکم خود قرآن مبین میں موجود ہے۔ فرمایا گیا کہ فاسئلوا اھل الذکران کنتم لا تعلمون ۱۶/ ۴۳ تم نہ جانتے ہو تو جو لوگ یاد رکھنے والے ہیں (یا علم رکھنے والے ہیں) ان سے پوچھ لو۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ دس واقف کار جس بات کو یک زبان ہو کر بیان کریں وہ بات یقین کر لینے کے قابل ہے تو پھر جن باتوں کو ساری دنیا متفق اللفظ ہو کر بیان کر رہی ہے وہ باتیں کیوں موجب یقین نہ ہوں گی۔

(۱۴) تواتر مصنوعی

تواتر کی ایک قسم مصنوعی بھی ہے یعنی کسی ایک جماعت نے اپنے کسی خاص مقصد کے ماتحت ایک جھوٹی بات گھڑی اور باہمی صلاح و مشورہ کرکے

اس جماعت کے افراد مختلف دور و نزدیک مقامات میں پھیل کر اس جھوٹی بات کو سچی قرار دے کر مشہور کرنے لگے اور پھر جن لوگوں نے اس جماعت کے افراد سے سنا وہ لگے اس کو دوسروں سے بیان کرنے یہاں تک کہ کچھ دنوں کے بعد وہ جھوٹی بات ایک سچی خبر متواتر بن کر دنیا میں رفتہ رفتہ مشتہر ہو گئی عجمی ملحدین و منافقین نے ایک زبردست سازش کر کے اس طرح کتنی جھوٹی حدیثیں گھڑ گھڑ کر پھیلائیں اور باوجود محدثین کی کافی چھان بین کے آج تک ان کے مجلدات میں کتنی موضوع و مکذوب روایات موجود ہیں اور انھیں روایات کی بدولت آج امت میں اسقدر دینی فرقہ بندیاں اور اختلافات نظر آرہے ہیں۔

اسی قسم کے مصنوعی متواترات آپ کو روایت پرستوں اور فرقہ بندوں میں بہت ملیں گے مگر ان مصنوعی متواترات کا اگر آپ تجزیہ کریں گے تو ان کے تواتر کی حقیقت کھل جائے گی اور ان کا مصنوعی ہونا آپ پر آفتاب نیمروز کی طرح روشن ہو جائے گا یعنی اس خبر متواتر کے تواتر اسناد و تواتر مسند و تواتر مسندالیہ کو دیکھئے۔ اس کے تواتر زمانی و تواتر مکانی کو دیکھئے صرف انھیں پانچ تواتروں پر نگاہ نقد و نظر ڈالنے کے بعد ہر متواتر مصنوعی اور ہر تواتر غلط کی حقیقت معلوم ہو جائے گی اور بدیہی قرائن بھی ایسے جھوٹے متواترات کو جھوٹا ثابت کرنے کے لئے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ اگر غلو و تعصب اور ضد اور ہٹ دھرمی سے الگ ہو کر دیانتاً ان مصنوعی متواترات کو دیکھا جائے اور ان کے تجزیہ کے بعد قرائن کی روشنی میں حقیقت کی جستجو کی جائے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ حقیقت امر کا پتہ نہ ملے۔

مثلاً جمع قرآن ہی کا واقعہ لے لیجئے عوام میں مشہور ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جامع قرآن تھے یہاں تک کہ جمعہ و عیدین کے خطبوں میں عام طور سے حضرت عثمانؓ کے نام مبارک کے ساتھ جامع القرآن کا لفظ پڑھا جاتا

ہے اور جاہل خطیب ہی نہیں بلکہ علمائے کرام بھی بغیر کسی جھجک کے وعلیٰ جامع القران امیرالمؤمنین عثمان بن عفان خطبوں میں پڑھا کرتے ہیں۔

مگر جب علماء کو چھیڑیئے تو وہ کہتے ہیں کہ نہیں اصل جامع قرآن تو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ہیں حضرت عثمانؓ نے تو اسی عہد صدیقی کے جمع کئے ہوئے قرآن کی متعدد نقلیں کرا کے مختلف ملکوں میں بھجوادی تھیں اور ایک نقل اپنے پاس رکھ لی تھی جیساکہ امام بخاری نے اپنی کتاب میں درج فرمایا ہے اور ترمذی ونسائی وغیرہ میں بھی ہے۔ مگر عرب سے لے کر عجم تک ہر جمعہ کے خطبہ میں عثمان جامع القران کی تکرار نے عوام میں حضرت عثمانؓ کو جامع قرآن مشہور کر رکھا ہے۔

غرض حضرت عثمانؓ کے جامع قرآن ہونے کا جو تواتر عوام میں ہے اس کو تو علماء خود ہی غلط کہتے ہیں باقی رہا حضرت صدیقؓ کا جامع قرآن ہونا، جو علماء و محدثین و مورخین کے نزدیک متواتر ہے اب اس کے تواتر کا حال سنئے روایت بخاری وغیرہ میں یہ ہے کہ سب سے پہلے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو قرآن جمع کرنے کا خیال پیدا ہوا انھوں نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ قرآن کو جمع کرالیجئے۔ انھوں نے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے کہا اور انھوں نے قرآن جمع کرنا شروع کر دیا جس جس کے پاس جس جس چیز پر لکھا ہوا قرآن ان کو ملا اور پھر صدور الرجال سے بھی یعنی لوگوں کو جو زبانی یاد تھا۔ سورۃ توبہ کی ایک آیت خزیمہ یا ابو خزیمہ کے پاس ملی۔

جمع قرآن کا اتنا بڑا اہم واقعہ جس کے لئے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ حسب روایت بخاری وغیرہ بمشکل حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بار بار اصرار اور تقاضے کے بعد تیار ہوئے اور پھر زید بن ثابت رضی اللہ عنہ بھی جس کے لئے بمشکل آمادہ ہوئے اور دونوں یہ محسوس کر رہے تھے کہ جو کام رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا وہ کام ہم کیونکر کریں۔ یقیناً دوسرے اکابر صحابہ بھی ضرور صلاح مشورہ میں شریک ہوں گے اور رائے قائم ہو جانے کے بعد جس صحابی کے پاس جتنا قرآن بھی کسی چیز پر لکھا ہوا ہوگا وہ اس کو لیکر زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے پاس آیا ہوگا جس کو جتنا یاد ہوگا اس نے ان کو سنایا ہوگا۔ غرض اگر یہ واقعہ جو بخاری وغیرہ میں جمع صدیقی کا مذکور ہے صحیح ہوتا تو یقیناً ہر صحابی اور ہر صحابیہ اس سے واقف ہوتے یہاں تک کہ مراہق بچے بھی اس سے بے خبر نہ ہوتے۔ مگر اس واقعے کی روایت نہ حضرت عمرؓ سے ہے نہ حضرت صدیق اکبرؓ سے، نہ خزیمہ سے نہ ابو خزیمہ سے نہ کسی اور صحابی سے۔ بس صرف زید بن ثابتؓ ہی سے یہ واقعہ روایت کیا جاتا ہے، اور کون روایت کرتا ہے؟ عبید بن سباق جو زید بن ثابتؓ کی وفات کے وقت چار برس سے زیادہ کا کسی طرح بھی ثابت نہیں کیا جاسکتا اور صرف اسی عبید بن سباق سے تنہا ابن شہاب زہری روایت کرتے ہیں۔

اب دیکھئے واقعہ عہد صدیقی کا اور اتنا بڑا اہم واقعہ مگر آغاز عہد صدیقی سے سو برس تک کے اندر اس واقعے کی اطلاع صرف زید بن ثابتؓ کو تھی اور ان سے صرف ایک چار برس کے بچے نے سنا تھا جس کو اس نے برابر پوشیدہ رکھا کبھی کسی سے نہ کہا۔ یہاں تک کہ اپنے بیٹے سے بھی بیان نہ کیا۔ کہا تو اپنے سن کہولت میں صرف ابن شہاب زہری سے۔

کوئی صاحب انصاف و دیانت بتائے کہ جو واقعہ ایسا اہم ہو جس کی اطلاع ساری دنیائے اسلام کو ہونی چاہیئے اس کی خبر سو برس تک کی طویل مدت میں صرف ایک ہی شخص کو ہو اور اس سے صرف چار برس کے ایک بچے کو ملے اور

۱۔ تفصیل کے لئے دیکھیئے مری کتاب "جمع قرآن"

وہ اپنے سن کہولت میں صرف ایک ہی شخص سے بیان کرے؟ کیا ایسی خبر کبھی متواتر کہی جاسکتی ہے؟ چاہے اس کے بعد وہ خبر دنیا بھر میں مشہور کر کے اس پر تواتر کا لبادہ اڑھا ہی کیوں نہ دیا جائے۔

ہاں اس بات کو متواتر کہا جاسکتا ہے کہ یہ خبر صحیح بخاری، ترمذی، نسائی اور مسند احمد وغیرہ میں ہے۔ چاہے یہ روایت بذات خود موضوع ہو یا جیسی بھی ہو کیوں کہ ان سے پہلے کی مستند کتابوں موطا امام مالک و امام محمد وغیرہ میں اسکا وجود ہی نہیں ہے تو صرف بخاری وغیرہ کتب میں اس روایت کا مذکور ہونا بخاری کے زمانے سے اور ان کے بعد کے زمانوں میں متواتر تو کہلا سکتا ہے مگر اس سے واقعہ جمع صدیقی کو متواتر نہیں کہا جاسکتا کیوں کہ بخاری وغیرہ سے پہلے کی مستند کتابوں میں اس کا ذکر ہی نہیں اگر یہ متواتر ہوتا تو موطا وغیرہ میں اسکا ذکر لازماً ہوتا۔ کیا طلسم ہوشربا میں جو قصے جادوگروں کے مذکور ہیں ان قصوں کا طلسم ہوشربا میں مذکور و موجود ہونا قطعی نہیں ہے؟ اور اس کے پڑھنے والوں میں متواتر نہیں ہے؟ مگر کون ذی عقل و صاحب ہوش ہے جو ان قصوں کو بھی قطعی و متواتر کہے۔ غرض یہ کہ حضرت عمرؓ کا حضرت صدیق اکبرؓ کو جمع قرآن پر آمادہ کرنا ان دونوں بزرگواروں کے زمانے میں متواتر نہیں اسی طرح صرف ابو خزیمہ یا خزیمہ کے پاس آخر سورۃ توبہ کا ملنا ان کے زمانے میں متواتر نہیں۔ غرض تواتر زمانی کا بالکل فقدان۔ اسی طرح اہل مدینہ زید بن ثابتؓ کے سوا سب کے سب اس سے بے خبر، اس لئے تواتر مکانی بھی سرے سے معدوم۔ حضرت عمر فاروقؓ و حضرت صدیق اکبرؓ و حضرت زید بن ثابتؓ و حضرت ابو خزیمہ و حضرت خزیمہ رضی اللہ عنہم یعنی مسند الیہم کا وجود تو ضرور متواتر ہے مگر جس جس بات کی اسناد ان بزرگوں کی طرف اس روایت میں کی گئی ہے نہ وہ مسند باتیں متواتر نہ ان کی اسناد متواتر۔ اور ظاہر ہے کہ صرف مسند الیہ

کے متواتر ہونے سے ن بات کو متواتر ہنیں کہا جاسکتا۔ ورنہ ساری جھوٹی سچی حدیثیں متواتر ہو جائیں گی۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو ان حدیثوں کے مسند الیہ ہیں ان کی ذات مطہر یقیناً متواتر اور قطعی ہے۔ اسی لئے کوئی محدث بھی اس کا قائل ہنیں کہ ساری حدیثیں متواتر ہیں۔ بلکہ وہ تواتر میں صرف تواتر اسناد کا اعتبار کرتے ہیں اور وہی اس جمع قرآن والی روایت میں ہنیں ہے۔

غرض اس طرح ہر مصنوعی متواتر کی جانچ کی جائے تو ہنایت صفائی اور غایت وضاحت کے ساتھ ان تمام مصنوعی متواترات کا ملمع تواتر کا مصنوعی رنگ اڑا کر اس کے کذب وافتراء کی اصل حقیقت نمایاں کر دی جاسکتی ہے۔ یہ کوئی مشکل بات ہنیں ہے۔ ضرورت ہے تو صرف حق طلبی اور دیانت کی ورنہ غلو اور تعصب سے ضرور ہٹ دھرمی پیدا ہو جاتی ہے اور جب طبیعت میں ہٹ دھرمی آگئی تو پھر انسان دن کو رات اور رات کو دن کہنے پر اتر آتا ہے۔

الحمد للہ کہ قرآن مجید کا پہلا دعویٰ جو لاریبیت کا ہے، میں اس کو ہنایت واضح طور سے ثابت کر چکا وماتوفیقی الا باللہ اب قرآن مجید کے دوسرے دعوے پر نگاہ انصاف ڈالئے۔

قرآن مجید کا دوسرا دعویٰ

لا یاتیه الباطل من بین یدیه و لا من خلفه تنزیل من حکیم حمید ۴۱-۴۲

(باطل نہ اس کے آگے سے آسکتا ہے نہ اس کے پیچھے سے۔ یہ حکمت و حمد کے مالک کی طرف سے اتری ہوئی کتاب ہے۔) یہ دعویٰ دراصل اس بات سے متعلق ہے کہ اس کتاب میں کسی طرح کی تحریف و تصحیف اور کسی قسم کی تغیر

و تبدیل نہیں کی جاسکتی کیونکہ اگر کوئی لفظ یا کوئی عبارت کسی لفظ سے پہلے کسی آیت میں بڑھادی گئی تو یقیناً بڑھانے والا کسی ایسے مفہوم کے پیدا کرنے کیلئے وہ لفظ یا وہ عبارت بڑھائے گا جو مفہوم قرآن پاک کے مقتضائے کلام کے مخالف ہوگا یا کم سے کم قرآن مبین کا وہ منشا نہیں ہے۔ اور جو بات قرآن کی نہیں ہے، اگر قرآن میں داخل کی جائے گی تو وہ یقیناً باطل ہی ہوگی۔

قرآن مجید کی ہر آیت اور اس کا ہر لفظ قرآن ہے۔ جیسا کہ خود قرآن کا ارشاد ہے۔ و ماتتلو امنہ من قرآن (سورۃ یونس آیت ۴۲) یعنی اس کتاب الہیٰ میں سے قرآن کا جو حصہ بھی تم تلاوت کرتے ہو۔" اس ارشاد قرآنی سے واضح ہے کہ قرآن کی ہر آیت اور اس کا ہر لفظ قرآن ہے اور اسکا ہر لفظ اور ہر حرف منزل من اللہ ہے اسی لئے فرمایا کہ یہ قرآن نہایت حکمت اور تعریفوں والے کی طرف سے نازل کیا گیا ہے۔ (تنزیل من حکیم حمید ۴۲/۴۱) اس لئے اس کے کسی حرف کے بھی آگے پیچھے سے باطل نہیں آسکتا۔ اگر کسی حرف پر ایک نقطہ بھی بڑھ گیا تو وہ نقطہ باطل ہوا۔ اسلئے ایک نقطہ کا بھی اضافہ نہیں ہو سکتا تو کسی حرف یا کسی کلمے یا کسی عبارت کا اضافہ کیا ہو سکتا ہے اسی طرح کوئی عبارت یا کوئی لفظ یا کوئی حرف بلکہ ایک نقطہ بھی اگر اپنی جگہ سے ہٹا دیا گیا اور نکال دیا گیا، یا آگے پیچھے کر دیا گیا تو یقیناً ایسا کرنے والا کسی ایسے ہی مفہوم پیدا کرنے کے لئے کریگا جو مفہوم قرآن کا منشا نہیں ہے۔ پھر بھی وہ قرآن سے زبردستی نکالا جائے تو یقیناً باطل ہی ہوگا اس لئے لا یاتیہ الباطل کا زبردست اعلان ببانگ دہل پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ جس طرح قرآن مبین میں کسی طرح کی زیادتی نہیں ہو سکتی اسی طرح کسی طرح کی کمی اور کسی طرح کی تغیر و تبدیلی بھی نہیں ہو سکتی۔

اس دعوے کا واضح ثبوت

حقیقت یہ ہے کہ یہ دعویٰ ایک بڑا اہم دعویٰ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی دوسرا کر بھی نہیں سکتا کون نہیں جانتا کہ یہود و نصاریٰ نے توریت وانجیل و زبور کو کس طرح مسخ کر کے رکھدیا وید اور اوستا کا حال بھی تاریخ کے ماہرین سے پوشیدہ نہیں مسلمانوں کے یہاں بھی ان کی حدیثیں منافقین و ملاحدہ کے دستبرد سے بچ نہیں سکیں ۔ محدثین کی کافی چھان بین کے باوجود ان کے مجلدات موضوع و مشتبہ حدیثوں سے محفوظ نہ رہ سکے مفسدین نے مستقل کتابیں تصنیف کر کر کے بعض ائمہ کی طرف منسوب کر دیں کتنے مفسدین کا مستقل کام ہی یہی تھا کہ جلد بندی و خوش نویسی کا پیشہ اختیار کر کے لوگوں کی کتابوں میں اپنی طرف سے "گھٹا بڑھا" دیا کرتے تھے ۔ جس نے انہیں اپنی کتاب جلد باندھنے کے لئے یا خوشخط صاف کرنے کیلئے دی ، بس اس کی کتاب کی شامت آگئی ۔

جن منافقین و ملاحدہ کا یہ برتاؤ احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہو وہ کتاب اللہ کو کب محفوظ چھوڑ سکتے تھے ۔ چنانچہ کتاب اللہ کے ساتھ بھی ان منافقین و ملاحدہ نے کیا کچھ نہ کیا ۔ جس کی تفصیل آگے آئے گی ۔ مگر آفتاب پر خاک ڈالنے سے آفتاب پر گرد نہیں پڑتی ۔ باوجود اس کے کہ اختلاف قرأت کا ایک انبار ان مفسدین نے لگا دیا مگر قرآن مجید حفاظت الٰہیہ کے ماتحت عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے آج تک صرف ایک ہی قرأت ثابتہ و صحیحہ و متواترہ کے ساتھ قرأۃ، تلاوۃً، تعلیماً، تعلماً، حفظاً، کتابۃً، اور پھر طباعۃً چلا آرہا ہے ۔ اور ساری دنیائے اسلام میں صرف اسی ایک قرأت متواترہ

قدیمہ کے مطابق لکھا اور پڑھا جارہاہے اور جب سے طباعت کا فن ایجاد ہوا اسی ایک قرأت کے مطابق ہر جگہ چھپ رہاہے۔

قرآن مجید کے قدیم تاریخی نسخے دنیا کے بڑے بڑے کتب خانوں میں موجود ہیں حضرت عثمان ذی النورینؓ، حضرت علیؓ اور بعض دوسرے صحابہؓ اور بعض ائمہ اور بعض تابعین واتباع تابعین رضی اللہ عنہم اجمعین کے مبارک ہاتھوں کے لکھے ہوئے نسخے بھی موجود ہیں مگر ان سبھوں کے درمیان ایک نقطے کا بھی فرق ہنیں ہے اور نہ ان نسخوں میں اور آجکل جو دنیائے اسلام میں نسخے مسلمانوں کے مکانوں اور کتب فروشوں کی دکانوں میں موجود ہیں، ان میں کسی طرح کا بھی کوئی اختلاف ہے۔

یہ صحیح ہے کہ بعض قدیم نسخوں میں نقطے اور اعراب ہنیں ہیں مگر جن نسخوں یں نقطے اور اعراب دیئے ہوئے ہیں ان سے ان کو مختلف کہنے کی کوئی وجہ ہنیں ہے. جہاں تمام نقطے دیئے نسخوں میں یعلمون یائے تحتانیہ سے ہے وہاں بے نقطے والے نسخوں میں خواہی نخواہی تائے فوقانیہ سے تعلمون پڑھنا ہٹ دھرمی ہنیں تو اور کیاہے؟ اسی طرح جہاں تمام اعراب دیئے ہوئے نسخوں میں یحسبون کی سین کو فتحہ ہے وہاں بغیر اعراب والے نسخوں میں خواہ مخواہ یحسبون کی سین کو کسرہ دیکر پڑھنا شرارت کے سوا اور کیا کہا جائے گا؟

قرآن مجید کے بعض نسخے

عوام میں مشہور ہے کہ پٹنہ (صوبہ بہار) کی مشہور عالم خدا بخش خان بہادر سی آئی ای مرحوم کی اورنٹیل لائبریری میں قرآن مجید کا ایک ایسا نسخہ ہے جو شیعوں کی روایت کے مطابق چالیس پاروں کا ہے۔ یہ محض افترا اور بہتان ہے۔ اگرچہ ایک مدت ہوگئی مگر میں نے خود اپنی آنکھوں سے اس نسخے کو دیکھا

پورا قرآن مجید صحیح قرأت متواترہ کے مطابق لکھا ہوا ہے آخر کتاب میں کچھ اوراق پر شیعوں کے مطابق روایات سے نکال نکال کر کچھ الفاظ اور کچھ عبارتیں لکھکر ان کی نشاندہی کی ہے کہ یہ لفظ فلاں سورۃ میں فلاں جگہ پر فلاں آیت میں فلاں لفظ کے بعد تھا جس کو نکالنے والوں نے نکال دیا۔ اور فلاں سورۃ میں فلاں جگہ پر یہ عبارت بھی تھی وغیر ذلک اور بعض طویل عبارتیں بھی ہیں جن کا نام سورۃ ولایت وغیرہ رکھدیا ہے غرض یہ سارا اضافہ چند اوراق پر اخیر میں ہے نفس قرآن مجید میں ان اضافوں کو داخل کرنے کی ہمت اس خبیث کاتب کو بھی نہ ہوئی۔

اسی طرح ایک نسخے کا ذکر خواجہ حسن نظامی صاحب دہلوی نے اخبار منادی میں کیا تھا وہ نسخہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ترتیب دی ہوئی آیتوں اور سورتوں کے مطابق ہے۔ میں نے اس نسخے کو خود یکھا نہیں ہے کہ میں اس کی حقیقت پر روشنی ڈالوں۔ مگر عقل و درایت سب سے بڑھ کر ہے عقل سلیم اس شخص سے جو اس کو حضرت علیؓ کا ترتیب دیا ہوا نسخہ یقین کر رہا ہے حسب ذیل سوالات کرتی ہے۔

(۱) یہ نسخہ جس کے پاس ہے، اس کے پاس کس سلسلے سے پہنچا؟

(۲) اس نسخے پر حضرت علیؓ ان کے صاحبزادوں، ان کے پوتوں اور پھر ان کی اولاد کے دستخط اور مہریں بھی ہیں یا نہیں؟ نہیں ہیں تو کیوں؟ اور اگر ہیں تو ان کی صحت کی کیا دلیل ہے؟

(۳) حضرت علیؓ کی شہادت ۴۰ھ میں ہوئی تھی۔ اگر یہ نسخہ انھیں کے دست مبارک کا لکھا ہوا ہے تو یقیناً ۴۰ھ سے پہلے کا لکھا ہوا ہوگا۔ اس نسخے کا ذکر ان کی اولاد اور احفاد میں سے کبھی کسی نے کہیں کیا یا نہیں؟ نہیں کیا، تو کیوں؟ اور کیا تو کہاں کیا؟ کس کتاب میں اس کا ذکر ہے؟

(۴) حضرت علیؓ کے متعلق یہ روایت ناقابل اعتبار ہے کہ حضرت صدیق اکبرؓ جب خلیفہ منتخب ہو چکے تو حضرت علیؓ گوشہ عزلت میں بیٹھ گئے اور نماز کے وقتوں کے سوا اور کسی وقت گھر سے باہر نہیں نکلتے تھے۔ کسی نے حضرت صدیقؓ سے کہا کہ وہ آپ کی خلافت کو پسند نہیں کرتے اس لئے گھر سے باہر نہیں نکلتے تو حضرت صدیق اکبرؓ نے ان سے پوچھوا بھیجا۔ انھوں نے کہا کہ میں نے یہ عہد کیا ہے کہ جب تک قرآن جمع نہ کر لوں گا اپنی چادر نہ اوڑھوں گا بجز نماز کے وقتوں کے۔ میں جمع قرآن میں مشغول ہوں اسلئے باہر نہیں نکلتا۔ حضرت صدیق اکبرؓ نے فرمایا کہ تم بہت اچھا کام کر رہے ہو۔ محدثین نے اس روایت کو صحیح مان کر اس کا مطلب ان میں سے کسی نے یہ بتایا کہ جمع کرنے کے معنی ہیں یاد کرنا۔ چونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ حافظ قرآن نہ تھے اسلئے پورا قرآن حفظ کر کے اپنے سینے میں جمع کر رہے تھے۔ کسی نے کہا کہ ایک نسخہ اپنے لئے لکھ رہے تھے، قرأت متواتر جس طرح سارے صحابہؓ پڑھتے تھے اسی کے مطابق۔ مگر جن لوگوں کا رجحان تشیع کی طرف تھا انھوں نے کہا کہ حضرت علیؓ ترتیب نزول کے مطابق قرآن جمع کر رہے تھے۔ یعنی جو آیت سب سے پہلے اتری تھی اس کو سب سے پہلے جو اس کے بعد اتری اس کو اس کے بعد، جو اس کے بعد اتری تھی اس کو اس کے بعد۔ و ھلم جرا۔ یہاں تک کہ الیوم اکملت لکم دینکم والی آیت پر انھوں نے قرآن کو ختم کیا تھا۔ مگر یہ لوگ یہ نہیں بتاتے کہ آخر وہ نسخہ ہوا کیا؟ البتہ شیعوں کے ہاں یہ روایت ہے کہ جب حضرت صدیق اکبرؓ زید بن ثابتؓ سے قرآن جمع کرانے لگے تو حضرت علیؓ اپنا جمع کیا ہوا قرآن ان کے پاس لے گئے اور کہا کہ یہی صحیح قرآن ہے جس کو ہم جمع کر چکے ہیں، اب پھر زید بن ثابتؓ سے کیوں جمع کرا رہے ہیں؟ مگر ان کے جمع کئے ہوئے قرآن کو حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما نے قبول نہ کیا اور اس کو لینے

سے انکار کیا اور زید بن ثابتؓ سے قرآن کو جمع کراتے رہے تو حضرت علیؓ نے کہا کہ جب تم لوگ اس صحیح نسخے کو قبول نہیں کرتے تو پھر اس نسخے کو کبھی نہ دیکھو گے اور نہ امام آخر الزماں کے آنے سے پہلے کوئی مسلمان اس کو دیکھے گا۔ اب وہی جب قیامت کے قریب آئیں گے تو اس کو نکالیں گے اور اس کی اشاعت کریں گے۔ اسی لئے حضرت علیؓ نے اپنی خلافت کے زمانے میں اپنے خاص عقیدتمندوں میں بھی اپنے اس جمع کردہ نسخے کی اشاعت نہیں فرمائی اور نہ کسی کو دکھایا۔

شیعوں کی حدیث کی کتابوں میں ان کے بعض ائمہ کی طرف منسوب اس قسم کی روایتیں ہیں[۱] کہ فلاں سورۃ میں فلاں جگہ پر فلاں عبارت تھی یا فلاں لفظ تھا تو ان کے بعض معتقدین نے پوچھا کہ کیا ہم لوگ اب اسی طرح اس اضافہ کے ساتھ پڑھا کریں؟ تو ان کے ائمہ نے سختی کے ساتھ منع کیا۔ اور کہا کہ جب تک امام آخر الزماں نہ آئیں اسی موجودہ مروجہ قرأت کے مطابق قرآن مجید پڑھو۔ اس میں کسی جگہ بھی کمی بیشی نہ کرو۔ جب امام آخر الزماں آئیں گے تو وہی اصلی اور صحیح قرأت کے مطابق قرآن شائع کریں گے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ ان کے ائمہ کے بھی ہاتھوں کے لکھے ہوئے قرآن کے جو نسخے نجف، کربلا، کاظمین وغیرہ شیعوں کے متبرک مقامات میں وہاں کے متولی مجتہدوں کے پاس موجود ہیں مگر وہ نسخے ایک حرف اور نقطے کا بھی اختلاف اس دائرو سائر قرآن مجید سے نہیں رکھتے تو پھر یہ نسخہ جس کا ذکر خواجہ حسن نظامی صاحب نے کیا تھا کہاں سے آگیا؟ غرض یہ نسخہ اہل سنت کے نزدیک تو افترائی نسخہ ہی ہے

---

۱ دیکھیئے شیعوں کی سب سے پہلی اور سب سے زیادہ معتبر حدیث کی کتاب اصول کافی ص ۱۷۰، ۶۷ (مطبوعہ نولکشور لکھنؤ)

شیعوں کے عقیدے کے مطابق بھی کسی طرح صحیح نہیں ہوسکتا۔

غرض قرآن مجید کے تمام قدیم سے قدیم اور جدید سے جدید اور درمیانی زمانوں کے نسخوں کا غیر مختلف فیہ ہونا، دنیا بھر کے سارے اگلے پچھلے اور موجودہ حفاظ کا ایک ہی طرح قرآن کا پڑھنا، قرآن کے اس دعوے کی زبردست تصدیق کر رہا ہے **لا یاتیہ الباطل من بین یدیہ و لا من خلفہ تنزیل من حکیم حمید** - ۴۱ / ۴۲

اس جگہ بیجانہ ہوگا اگر میں قرآن مجید کے کچھ نایاب تاریخی نسخوں کی ایک فہرست پیش کردوں جو دنیا کے بعض مشہور کتب خانوں میں اس وقت موجود ہیں۔ یہ فہرست رسالہ معارف اعظم گڑھ دارالمصنفین کے آرگن ۶ - جلد ۱۶ سے میں نے کسی زمانے میں نقل کرلی تھی، اب یہ نقل بھی کرم خوردہ اور کسی قدر ضائع شدہ میرے پاس ہے افسوس یہ ہے کہ صاحب مضمون کا اسم گرامی بھی پھٹ کر غائب ہوگیا ہے جس کا مجھ کو سخت افسوس ہے۔ بہر حال نفس مضمون اور اصل فہرست ایک حد تک محفوظ ہے جس کو میں کچھ اختصار کے ساتھ یہاں پیش کرتا ہوں۔

قرآن مجید کے بعض نایاب و قدیم نسخوں کی فہرست

یہ مضمون چار قسم کے مصاحف پر منقسم ہے اول وہ نسخے جنھیں صاحب مضمون نے کتب خانوں کی فہرست سے چنا ہے۔ دوم وہ نسخے جن کو مؤرخین نے تواریخ میں ذکر کیا ہے۔ سوم وہ نسخے جو خاص کسی شخص کی ملک ہوں۔ چہارم جن کو صاحب مضمون نے خود اپنی سیاحت کے موقع پر کتب خانوں میں معائنہ کیا۔

پہلی قسم کے مصاحف

(۱) خاص حضرت امیرالمومنین عثمان ذی النورین رضی اللہ عنہ کے دست مبارک کا لکھا ہوا مصحف اس مصحف نے شاہان مغلیہ کے کتب خانوں کو بھی شرف بخشا ہے ۔آخر صفحہ میں اکبر بادشاہ کی مہر اور دستخط بھی ہیں اور دوسرے سرداروں کی مہریں بھی ہیں ۔ یہ نسخہ متبرکہ مسلمانوں کی بدقسمتی سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ذریعے انڈیا آفس لندن کی لائبریری کی زینت بڑھا رہا ہے ۔

یہ مکمل نسخہ نہیں ہے صفحات ۱۸۱ ہیں ۔ اور ہر صفحے میں ۱۶ سطریں سورتوں کے نام ٹیڑھے خطوط میں لکھے ہوئے ہیں اور ہر آیت میں ایک ایسا نشان ہے جو ایک قدیم مغربی حرف کی شکل میں ہے ۔ اور ہر دو سو آیت کے بعد حاشیے پر ایک نشان ہے ۔ آخر کتاب میں کاتب کا نام یوں لکھا ہوا ہے ۔ کتبہ عثمان بن عفان ۔ خط کوفی سے قریب تر ہے ۔

(۲) حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دست مبارک کا لکھا ہوا نسخہ ۔ ناتمام ، چند سورتیں ، ۶۴ صفحات ہر صفحے میں پانچ سطریں بخط کوفی ، مگر مدور لکھا ہوا ہے ۔ ہر دو سطروں کے درمیان بہت زیادہ بعد ہے اور درمیان میں حرکات کی جگہ سرخ نقطے ہیں سنہرے نقوش سے آیات بنی ہیں ۔ دس دس آیتوں کے بعد ایک سنہرا بڑا نقش ہے عنوان میں سورتوں کے ناموں کی جگہ خالی ہے بعد میں کسی نے حواشی پر دبیز کاغذ وصل کر کے طلائی کاموں سے مرصع و مزین کر دیا ہے اور ابتداء و آخر صفحات کو اعلیٰ درجے کے نقش و نگار سے آراستہ کر دیا ہے ۔ اخیر میں خاتمہ پر صدق اللہ العلی العظیم لکھا ہوا ہے جو اب نقوش کے اندر نظر آتا ہے اور اس کے بعد بالکل اخیر میں کتبہ علی بن ابی طالب لکھا ہوا ہے یہ نسخہ تیمور کے ساتھ ہندوستان آیا پھر لاہور کے کسی کتب خانے میں پہنچا ، یہاں سے

پیرس پہنچا اور اب لندن کی انڈیا آفس لائبریری کی رونق بڑھا رہا ہے۔

(۳) دو سو صفحات کا ایک نامکمل نسخہ بخط کوفی ہے، ہر صفحے میں دس سطریں حرکات ظاہر کرنے کے لئے سبز و سرخ نقطے ہیں آیات سنہرے نقوش سے بنائے گئے ہیں ہر دس آیت پر ایک بڑا نقش ہے جا بجا حروف مٹتے جا رہے ہیں آخر میں کاتب کا نام یوں لکھا ہے کتبه علی بن حمدان[1]۔ اس نسخے کو دو شاہان صفویہ اسماعیل اول اور عباس اول کے کتب خانوں میں رہنے کا موقع بھی ملا ہے پھر ہندوستان میں اکبر بادشاہ کے کتب خانے کی زینت رہا ہے پھر شاہ جہاں کے کتب خانے میں رہا، عنایت خاں، فاضل خاں وغیرہ عہدیداروں کی مہریں بھی سلاطین کے مہروں کے بعد ہیں اعتماد خاں منصب دار کی مہر بھی ہے لارڈ ڈلہوزی نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے کتب خانے کو تحفہ دیا اور اب لندن کے انڈیا آفس کے کتب خانے کو زینت بخش رہا ہے۔

(۴) یہ نسخہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے دست مبارک کا لکھا ہوا ہے یہ بھی مکمل مصحف نہیں، چند سورتیں ہیں بخط کوفی۔ صرف باون صفحات ہیں۔ ہر صفحے میں تین سطریں ہیں اور چوب خط، ترچھی لکھی ہوئیں۔ اس میں " لام الف " لا کو ایک نئے طریق سے لکھا ہے۔ سرخ نقطوں سے حرکات کے نشانات ہیں سنہرے نقوش سے آیات ہیں حواشی اعلیٰ درجے کے مطلیٰ و مذہب ہیں اخیر ورق پر بھی خط کوفی میں لکھا ہوا ہے جو مٹنے کے قریب ہے نقوش کے اندر ہی کاتب کا نام ہے کتبه حسن بن علی یہ نسخہ بھی انڈیا آفس لندن ہی میں موجود ہے۔

(۵) یہ نسخہ متبرکہ بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دست مبارک کا لکھا ہوا ہے

---

[1] ۔غالباً رائے مہملہ کو دال مہملہ پڑھ کر حمدان سمجھ لیا گیا اور یہ "علی بن حمران" ہوں۔ یعنی حضرت حمران بن جابر الیمامی صحابی کے صاحبزادے۔ واللہ اعلم (تمنا)

یہ بھی چند سورتیں ہیں۔ بخط کوفی چوب خط لمبے حرفوں میں چھیالیس صفحات، ہر صفحے میں نو سطریں۔ حرکات سرخ، سبز، زرد اور نیلے رنگوں سے بنے ہیں۔ آیات زرافشاں ہیں دس دس آیتوں پر طلائی کام کا ایک بڑا نقش ہے۔ سورتوں کے نام ہر سورۃ کے عنوان پر زرافشاں زمین پر لکھا ہوا ہے کاتب کا نام کاتب کے قلم سے نہیں ہے مگر آخری صفحے پر کسی دوسرے کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے کہ یہ فلاں کے دست مبارک کا لکھا ہوا ہے یہ نسخہ بھی انڈیا آفس میں ہے۔

(۶) صرف چند سورتیں ہیں جو سیستان میں ۵۰۵ میں لکھی گئی تھیں۔ کاتب کا نام نہیں ہے۔ یہ نسخہ اس وقت پیرس کے بیلیو تھیکا نیشنل کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

(۷)(الف) یاقوت مستعصمی (متوفی ۶۹۸ کے ہاتھ کا لکھا ہوا مکمل قرآن مجید۔ یہ بھی بیبلو تھیکا نیشنل پیرس کے کتبخانے میں ہے۔ یاقوت مستعصمی کے ہاتھ کے لکھے ہوئے چار مکمل نسخوں کا ذکر یہاں پر کیا ہے ایک وہی جو ابھی ۷ میں گذرا اور تین نسخے اور ہیں جو حسب ذیل ہیں۔

(۸)(ب) پٹنہ اورینٹل لائبریری میں بھی ایک مکمل مصحف ہے۔

(۹)(ج) مدراس احتشام الدولہ کے کتب خانے میں بھی ایک مکمل مصحف ہے۔

(۱۰)(د) لکھنؤ واجد حسین کتب فروش کے ذخیرے میں نصف اول پندرہ پارے تک ہے۔ نہایت مطلیٰ و مذہب ہر صفحے پر ۱۳ سطریں اول درمیان اور آخر کی سطریں چوب خط ہیں خط نسخ میں ۶۰۱ھ میں لکھا گیا۔

(۱۱)(ہ) اسی نمبر ۱۰ والے نسخے کا دوسرا حصہ ہے یعنی آخر کے پندرہ پارے۔ یہ نسخے واجد حسین صاحب کے بھائی عبدالحسین صاحب کے پاس تھے۔ بالکل اسی پہلے حصے کی طرح خط نسخ میں مطلیٰ و مذہب۔ صاحب مضمون نے واجد حسین

صاحب سے ڈھائی سو روپے ہدیہ دیکر ان کے پاس والے نسخے کو حاصل کرنا چاہا تھا، بشرطیکہ اسی طرح ان کے بھائی بھی ڈھائی سو کے ہدیہ پر دوسرا حصہ دیدیں مگر ان کے بھائی نے پانچ سو کی رقم طلب کی۔ اس لئے صاحب مضمون ان دونوں حصوں کو حاصل نہ کرسکے۔ چونکہ وہ اس وقت اتنی رقم دے ہنیں سکتے تھے۔ اب غالباً وہ دونوں حصے دونوں صاحبوں کے ورثاء کے پاس موجود ہوں،

(۱۲) ٹیپو سلطان کی تلاوت کا قرآن مجید۔ اس کے شروع میں سورتوں کی فہرست بھی ہے۔ اور آخر میں دعائیں بھی۔ صفحہ ۲۵ سے اصل قرآن مجید شروع ہوتا ہے اور صفحہ ۵۲۰ پر قرآن مجید ختم ہوتا ہے۔ بے حد خوشخط اور ہنایت مطلیٰ و مذہب ہے خط نسخ میں ہے اصل کتابت اور نام کاتب کا پتہ ہنیں، یہ نسخہ بھی اب انڈیا آفس لندن میں ہے۔

(۱۳) یہ نسخہ احمد الانصاری المدنی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ جو دسویں صدی ہجری میں زندہ تھے بخط نسخ خوشخط ۹۹۵ھ کی تحریر ہے۔ فارسی ترجمہ بھی بین السطور بخط نستعلیق خوشخط لکھا ہوا ہے ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی کے وقت لکھنؤ میں ایک شخص قرآن مجید کو لئے بھاگا جارہا تھا کہ مارا گیا۔ مرحوم شہید نے قرآن کو نہ چھوڑا اور سینے سے لگائے رہا کہ روح نکل گئی یہ قرآن بھی اب انڈیا آفس میں ہے۔

(۱۴) نامکمل، بہت قدیم، بخط کوفی، چمڑے کے کاغذ پر (۱۲۱) صفحات چوب خط کتابت کھنی۔ یوروپین ماہرین آثار قدیمہ اس کو بہت قدیم ترین نسخہ تصور کرتے ہیں، برٹش میوزیم میں موجود ہے غرض یہ نسخہ متبرکہ بھی لندن ہی پہنچا ہوا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی مکمل مصحف کے اجزاء ہیں باقی اجزاء ضائع ہوگئے۔

(۱۵) یہ بھی نمبر ۱۴ کی طرح قدیم ترین اور اہم تر نسخہ ماہرین آثار قدیمہ کے نزدیک ہے چمڑے ہی کے کاغذ پر لکھا ہوا ہے اور خط کوفی ہی میں ہے، کتابت بھی گھنی ہے مگر ۱۴ کا بقیہ حصہ نہیں ہے کیونکہ اس کی کتابت لمبائی میں ہے۔

خدیو مصر کے کتب خانے کے مصاحف

(۱۶) نصف اول مصحف شریف ہرن کی کھال پر بخط کوفی لکھا ہے گویا فی رقٍّ منشور کا نمونہ ہے طلا کاری سے مزین ہے۔ (۲۰۹) اوراق ہیں اور ہر صفحے میں انیس سطریں دو لوح میں مجلد ہیں۔ خرمائی چھال اور تنے کی جلدیں ہیں۔ یعنی جلد بھی اسی وقت کی بندھی ہوئی ہے۔ آخر میں بخط معمولی لکھا ہوا ہے "الامام جعفر الصادق" حضرت ممدوح کی ولادت مدینے میں ۸۳ھ میں ہوئی مطابق ۷۰۲ء اور وفات ۱۴۸ھ میں مطابق ۷۶۵ء مدینے ہی میں ابو جعفر المعتمد کے عہد خلافت میں ہوئی۔ آخری صفحے پر یہ عبارت لکھی ہوئی ہے۔ **ان ھذا النصف بخط الامام الصادق عبد الله الامین جعفر بن الامام محمد ن الباقر بن الامام ابی الحسن علی زین العابدین بن الا مام السبط الحسین بن الامام علی بن ابی طالب کرم الله و جھه و رضی عنه اوراق ۲۳۲** ہیں اور ہر صفحے میں ۱۸ سطریں۔ اوراق بہت بوسیدہ ہوگئے ہیں بعض اوراق غایت بوسیدگی سے غائب ہوگئے ہیں تو نئے سفید اوراق اس کی جگہ لگا دیئے گئے ہیں اور لکھا ہے کہ ۳۶۸ھ میں احمد بن اسکاف نے وراقی کی۔

(۱۷) و (۱۸) و (۱۹) و (۲۰) یہ چاروں نسخے مذکورہ بالا نسخوں سے بھی قدیم ہی معلوم ہوتے ہیں بخط کوفی لکھے ہوئے ہیں اور ہرن کی کھال ہی پر۔ سال کتابت اور کاتب کے نام مرقوم نہیں ہیں۔ مگر ان کی قدامت اور صورت حال بتا رہی ہے کہ یہ چاروں نسخے عہد نبویؐ یا عہد خلفائے راشدین کی یادگاریں ہیں اور صحابہؓ

ہی کے مبارک ہاتھوں کے لکھے ہوئے ہیں ۔ صاحب مضمون نے اس کو واضح نہیں کیا ہے کہ یہ چاروں نسخے مکمل ہیں یا نامکمل مگر نامکمل ہوتے تو اس کو ضرور لکھدیتے ورنہ صرف چار نسخے لکھنے کے معنی ہی یہی ہیں چاروں مکمل نسخے ہیں۔

(۲۱) محمد بن عمر الطنبومی الشافعی الازہری نے یہ مصحف وزیر اعظم مصر الحاج محمد بن علی پاشا کے حکم سے ۱۲۴۷ھ میں لکھا تھا۔

(۲۲) ہرن کی کھال پر بخط کوفی ابتدائی رسم خط میں بغیر اعراب اور نقطوں کے یہ مکمل مصحف ہے ۔ حضرت امیر المومنین عثمان ذی النورین رضی اللہ عنہ کی تلاوت میں رہتا تھا ۔ شہادت کے وقت یہی نسخہ ان کے سامنے تھا۔ ان کے پاک خون کے داغ بھی اس وقت تک اس کے اوراق پر موجود ہیں ۔ خلیفہ مقتدر کے کتب خانے سے برآمد ہوا۔ اس پر بنت ابو بکر بن عبدالعزیز ابن مروان کا نام بھی ہے تعزیری نے بھی اس نسخہ کا ذکر کیا ہے اور اس کو وہی نسخہ بتایا ہے جس پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا پاک خون ہے ۔ جامع عتیق مصر میں موجود ہے ایک منقوش و مرصع لکڑی میں لگادیا گیا ہے۔

(۲۳) بخط مغربی طلا کار اور الوان سے مرصع سلطان محمد کے کتب خانے کیلئے ۱۱۴۲ھ میں لکھا گیا۔

(۲۴) یہ نسخہ بخط محمد اولاف کاتب (۲۶۳) ورقوں میں ہے کہنگی سے کیڑوں نے جا بجا سوراخ کر دیئے ہیں ۔

(۲۵) بخط مغربی ۔ کاتب مبارک بن محمد کوری (۲۴۰) اوراق پر مشتمل ہے ہر صفحے میں ۱۸ سطریں ہیں ۔

(۲۶) بخط مغربی ۔ ۱۲۶۲ھ کی تحریر ہے ۔ اوراق (۱۲۹) ہر صفحے میں ۱۶ سطریں ۔ صرف نصف ثانی ۔ بقیہ نصف کے اوراق ۱۱۲ ۔ سطریں مختلف ۔ کاتب کا نام

معلوم نہ ہوسکا۔

(۲۷) بخط مغربی۔ سورۃ مریم سے اخیر تک مطلیٰ و مذہب زر افشاں اوراق ۱۱۲ سطور مختلف کاتب کا نام اور سال کتابت لکھا ہنیں ہے۔

(۲۸) بخط مغربی۔ صرف نصف اول وہ بھی ناتمام اوراق ۱۰۹ سطریں ۱۶۔ کاتب کا نام اور سال کتاب مذکور ہنیں۔

(۲۹) بخط مغربی۔ صرف سورۃ جمعہ سے آخیر تک اوراق ۲۲۔ سطریں ۱۹۔

(۳۰) یونس بن محمد اندلسی کے ہاتھ کا لکھا ہوا مکمل نسخہ اوراق ۶۷، سطور ۹۔ سال کتابت ۱۱۶۶ھ (اوراق کی تعداد کم ہے ممکن ہے کہ سینکڑے کا ہندسہ لکھنے میں چھوٹ گیا ہو، یا خفی کتابت بہت گھنی ہو یا تقطیع بڑی ہو)

دولت فاطمیہ کے مصاحف

(۳۱) جلی قلم مسعود بن الکاتب الاصفہانی کے ہاتھ کا لکھا ہوا جنھوں نے اس کو غرہ ذیقعدہ ۵۵۵ھ میں تمام کیا۔ ابتدائی چند اوراق، اور آل عمران کا ایک ورق کرم خوردہ ہے محلیٰ بالذہب والالوان۔ اوراق ۴۱۰، سطور ۱۱۔

(۳۲) جلی قلم محلی بالذہب والالوان۔ اوراق ۳۴۱۔ سطور ۱۱ لیکن سورۃ بروج سے آخر تک کرم خوردہ ہے۔

اول قرن رابع کے اجزائے مکتوبہ

(۳۳) سورۃ الحجر بخط نسخ۔ کاتب ابو علی محمد بن مقلہ بانی خط نسخ و دیگر خطوط متوفی ۳۲۸ھ یہ نسخہ ۳۰۸ھ کا لکھا ہوا ہے۔ ہر سطر کے نیچے فارسی ترجمہ بھی ہے۔ جدول مطلا و مذہب اور بہت مرصع ہے اوراق ۱۶، سطور ۹۔

دولت ایوبیہ کے زمانے کے مصاحف مکتوبہ

(۳۴) اس نسخے کو عبدالرحمن بن ابوالفتح نے ۵۶۶ھ میں ملک معظم ابن ابی المظفر سعد بن زنگی اتابک کے کتب خانے کے لئے لکھا تھا خط نسخ ہے اس کے اول میں ایک رسالہ ہے جس میں قرأت عشرہ کا بیان ہے اور اس کے اصطلاحات ہیں اور ہر سورۃ کے شروع میں تعداد آیات بیان کیا ہے اور مکی ہے یا مدنی۔ یہ بھی مذکور ہے اور تعداد کلمات و حروف کا بھی ذکر ہے۔ اوراق ۴۹۰ سطور ۱۱ مطلا و مذہب بھی ہے۔

(۳۵) اس نسخہ کو اسمٰعیل بن ابراہیم بن احمد نے ۶۳۵ء میں بخط جلی لکھا ہے ہر آیت محلی بالذہب ہے اور کل سورتوں کی ابتداء بھی مرصع و مزین ہے بعض اوراق نمی سے مرطوب اور خستہ ہوگئے ہیں۔ اوراق ۳۹۵ سطور ۱۱۔

(۳۶) یہ نسخہ مسعود بہ محمد بن مسعود الخطاط الاصفہانی نے ۵ ذیقعدہ ۶۰۷ھ کو معمولی خط میں لکھ کر تمام کیا تھا دو نسخوں میں منقسم ہے۔ پہلا حصہ سورۃ کہف تک دوسرا آخر قرآن تک۔ نصف اول کے اوراق ۲۹۱ اور نصف ثانی کے (۳۰۸) سطور دونوں میں نو۔ دونوں نسخوں کے ابتدائی حصے مطلا و مذہب ہیں۔

مصاحف مکتوبہ ممالک بحریہ کے عہد کے

(۳۷) یہ نسخہ بخط ثلث جلی قلم سونے کے پانی سے لکھا گیا ہے سلطان ملک ناصر محمد قلاؤن نے ۷۰۳ھ میں اس کو وقف کیا تھا (لکھا ہوا یقیناً اس سے پہلے کا ہے) سطریں ۱۸ اوراق ۷۰۳ آخری ورق کے اوپر کا حصہ کچھ خراب ہوگیا ہے۔

(۳۸) جلی قلم مطلا و مرصع اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ سلطان حسن نے اس کو وقف کیا تھا سطریں ۱۱، اوراق ۳۷۴، بعض اوراق خراب ہوگئے ہیں۔

(۳۹) جلی قلم۔ محلی بالذہب والالوان۔ اس نسخے کو سلطان ملک اشرف کی

والدہ ماجدہ (خوندیرکر) نے ۷۶۹ھ میں وقف کیا تھا (لکھا ہوا پہلے کا ہے) سطریں ۱۱، اوراق ۳۲۰۔

(۴۰) جلی قلم مطلا و مذہب و مرصع۔ سلطان اشرف ابو المظفر شعبان بن المعز اشرف حسین بن السلطان ناصر محمد بن قلاؤن صالحی نے شعبان ۷۷۰ھ میں اس کو وقف کیا تھا سطریں ۱۱، اوراق ۴۱۰

(۴۱) اس نسخے کو بھی ملک اشرف ابو المظفر نے ماہ ذیقعدہ ۷۶۹ھ میں وقف کیا تھا اور اس کو ۷۵۶ھ میں خلیل بن محمد بن عبدالرحمن الحنفی نے لکھا تھا۔ یہ بھی مطلا و مرصع ہے سطریں ۱۱، اوراق ۴۱۰ ہیں (عجب کیا ہے کہ اس کے اوپر والا نسخہ ۴۰ بھی خلیل بن محمد الحنفی ہی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہو۔ واللہ اعلم۔

(۴۲) اس نسخے کو بھی ملک اشرف نے ۷۷۰ھ میں وقف کیا تھا۔ دو جلدوں میں ہے سطریں ۷ ہیں جلد اول سورۂ اسریٰ تک ہے جس کے اوراق ۳۵۹ ہیں۔ اور جلد دوم آخر تک ہے جس کے اوراق ۴۲۵ ہیں۔ دونوں جلدیں مطلا و مرصع ہیں۔

(۴۳) اس کو بھی سلطان ممدوح نے ۷۷۸ھ ماہ شعبان میں وقف کیا تھا۔ خط جلی ہے علی بن محمد المکتب الاشرفی نے ۷۷۴ھ میں اس کو لکھا تھا محلی بالذہب والالوان ہے ہر اول سورۃ میں نام اور تعداد آیت خط کوفی میں ہے۔ اور تعداد کلمات و حروف خط ثلث میں اخیر میں طلا سے عدد آیات اور عدد احکام امر و نہی و وعد و وعید و قصص و اخبار و عبر و امثال و حلال و حرام و دعاء و تسبیح اور آیات ناسخ و منسوخ لکھا ہوا ہے بعض اوراق خستہ ہوگئے ہیں۔ سطریں ۱۳، اوراق ۲۱۷ ہیں۔

(۴۴) یہ نسخہ بخط ثلث اور نسخ میں لکھا گیا ہے بیان ہے کہ اسے امیر سیف الدین الجامعی الیوسفی نے وقف کیا تھا۔ مطلا و مذہب ہے۔ سطریں ۱۳، اوراق ۵۶۰ ہیں۔

(۴۵) اس کو محمد المکتب الشہابی نے المعز الاشرف کے حکم سے ۷۷۶ھ میں لکھا تھا۔ جلی قلم ہے۔ محلی بالذہب والالوان ہے یہ نسخہ مصحف الکاف کے نام سے مشہور ہے۔ کسی قدر کرم خوردہ بھی ہے۔ سطریں ۱۱، اوراق ۲۹۳ ہیں۔

(۴۶) بخط نسخ بدست یاقوت مستعصمی ۶۹۰ھ کی کتابت ہے محلی بالذہب والا لوان، ۔ سطریں ۱۷، اوراق ۱۹۲ ہیں۔

(نوٹ) یاقوت مستعصمی کے ہاتھ کے لکھے ہوئے نسخے ۷ سے ۱۱ تک پہلے مذکور ہو چکے ہیں یہ چھٹا نسخہ ہوا۔ اور ایک مشتبہ نسخہ ۵؎ ۷ میں آئے گا اور ۱۰۶ اور ۱۰۷ میں بھی آئے گا۔

(۴۷) یہ نسخہ شیخ عبدالفتاح العریف کے ترکے کا گویا ایک ممتسک ہے۔ خط جلی ہے مطلا و مرصع ہے سطریں ۱۱، اوراق ۴۰۹۔

(۴۸) معمولی قلم۔ ہر سطر کے نیچے تفسیر۔ سطریں ۱۳، اوراق ۳۹۱۔

(۴۹) بخط جلی۔ احمد بن حمد بن کمال الانصاری نے جو شہر قاہرہ کے طبیب تھے ۷۳۴ھ (۱۳۳۳ء) میں اس کو لکھا تھا۔ اس کے ساتھ ایک رسالہ رسم مصحف میں کاتب موصوف ہی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے مطلا و مذہب ہے۔ سطریں ۱۱، اوراق ۳۱۸ ہیں۔

(۵۰) بخط ثلث۔ محمود بن حسین بن علی النجوانی نے ۷۶۲ھ (۱۳۶۰ء) میں اس کو لکھا تھا مطلا و مرصع ہے سطریں ۱۳، اوراق ۳۵۰ ہیں۔

(۵۱) جلی قلم۔ موسیٰ محمد بن الحسن التنوخی المالکی الاشرفی نے ربیع الاول ۷۷۶ھ (۱۳۷۴ء) میں بمقام قاہرہ لکھا تھا جسکو ۱۰۶۰ھ (۱۶۵۰ء) میں سید احمد بن ادریس الحسینی نے مقام امام شافعی میں وقف کیا۔ مذہب و مرصع ہے سطریں ۹، اوراق ۳۹۷ ہیں۔

(۵۲) جلی قلم ہے عبداللہ الشافعیؒ نے ۷۴۰ھ (۱۳۳۹ء) میں لکھا تھا۔ مطلا و

مرصع ہے سطریں ۱۳، اوراق ۲۴۸ ہیں۔

(۵۳) ۷۴۳ھ (۱۳۴۲ء) میں بخط ثلث لکھا گیا مذہب و مرصع بھی ہے ۱۲۶۶ھ (۱۸۴۹ء) میں محمد الجرانہ نے اس کو وقف کیا۔ سطریں ۱۷، اوراق ۲۴۹۔

(۵۴) جلی قلم۔ حسن بن قاسم الجعفری نے رمضان ۷۲۲ھ (۱۳۲۲ء) میں اس کو لکھا تھا۔محلی بالذہب ہے سطریں ۱۱اوراق ۳۵۰۔

(۵۵) جلی قلم۔ عبدالرحمن بن صائغ نے ساٹھ دنوں میں اس قرآن مجید کو لکھا ۶ ذی الحجہ ۸۰۱ھ (۱۳۹۸ء) کو کتابت سے فراغت حاصل کی۔ محلی بالذہب والالوان ہے۔ سلطان برقوق نے اس کو وقف کیا تھا۔ سطریں ۱۱، اوراق ۲۵۹۔

(۵۶) خط ثلث بخط طلا۔ اور مسطر بخط سیاہ محلی بالذہب والالوان سطریں ۱۰، اوراق ۲۵۵۔ اس کو بھی سلطان برقوق نے وقف کیا تھا۔

(۵۷) اس کو ۸۱۴ھ (۱۴۱۱ء) میں عبدالرحمن بن صائغ نے جلی قلم سے لکھا تھا۔ اول وآخر واوائل سورۃ وآخر آیات محلی بالذہب ہے اس کو سلطان ناصر فرح بن سلطان برقوق نے وقف کیا تھا۔ سطریں ۱۰، اوراق ۴۰۸۔

(۵۸) اس کو سلطان ملک ناصر فرح بن سلطان برقوق کے کتب خانے کیلئے عبدالرحمن بن صائغ نے ماہ رمضان ۸۱۴ھ (۱۴۱۱ء) میں جلی قلم سے لکھا تھا، محلی بالذہب والالوان ہے سلطان المؤید شیخ ابوالنصر نے اس کو وقف کیا۔ سطریں ۱۱، اوراق ۲۵۴۔

(۵۹) موسیٰ بن اسمٰعیل کتابی الحنفی المعروف بالجہینی نے ماہ شعبان ۸۲۰ھ (۱۴۱۷ء) میں اس کو جلی قلم سے لکھا تھا محلی بالذہب والالوان ہے۔ الملک المؤید شیخ ابوالنصر نے اس کو بھی وقف کیا تھا۔ سطریں ۱۱، اوراق ۳۲۴۔

(۶۰) اس نسخے کو ملک اشرف ابوالنصر قاتیبائی کے کتب خانے کے لئے جانم سیفی جان بیگ روادار الکبیر نے جلی قلم سے لکھا تھا بہت بڑی تقطیع ہے۔ کتب خانہ

خدیویہ میں ہے۔ سطریں ۱۰، اوراق ۳۲۸۔
(۶۱) جلی قلم، محلی بالذہب والالوان۔ سنہری جلد سطریں ۱۲، اوارق ۳۰۵۔
(۶۲) بخط نسخ۔ سعد الحافظ سرائی نے ۸۰۶ھ (۱۴۵۵ء) میں لکھا۔ محلی بالذہب والالوان ہے۔ سطریں ۱۵، اوراق ۲۹۸۔
(۶۳) محمد آفندی الشہر لغرابی روز نامچی کاتب دیوان مصر کی لڑکی عائشہ نے ماہ صفر ۱۰۶۸ھ (۱۶۵۷ء) میں اس کو وقف کیا تھا۔ سال کتابت ۹۰۲ھ (۱۴۹۶ء) ہے بخط ثلث لکھا ہوا ہے محلی بالذہب والالوان بھی ہے۔ سطریں ۱۳، اوراق ۳۴۸۔

(۶۴) ۸۳۷ھ (۱۴۳۳ء) میں کسی نے اس کو لکھا تھا۔ ولی الدین آفندی خلوصی جو محمد علی پاشا کے کتب خانے کا کاتب تھا اس نے اس کو ۱۲۲۳ھ (۱۸۰۸ء) میں وقف کیا محلی بالذہب اور مرصع ہے۔ سطریں ۱۳، اوراق ۲۹۹۔
(۶۵) جلی قلم۔ ۸۷۹ھ (۱۴۷۴ء) میں اس کو خطاب بن عمر الانجاوی نے المعز الاشرف مولوی امیر کبیر سیفی جان بیگ امیر اخور کبیر کے کتب خانے کے لئے لکھا تھا۔ محلی بالذہب والالوان بھی ہے سطریں ۱۳، اوراق ۳۷۵۔
(۶۶) جلی قلم۔ احمد بن علی القیومی نے اس کو ماہ رمضان ۹۰۸ھ (۱۵۰۲ء) ملک الاشرف قانصوہ الغوری کے حکم سے لکھا تھا محلی بالذہب والالوان ہے۔ سطریں ۱۳، اوراق ۲۹۰۔
(۶۷) بخط ثلث اس کو احمد بن محمود الدشتی نے ۷۸۹ھ (۱۳۸۷ء) میں لکھا تھا محلی بالذہب والالوان ہے سلطان برقوق نے اس کو وقف کیا تھا۔ سطریں ۱۱، اوراق ۳۷۴۔

(۶۸) جلی قلم ملک ظاہر ابو سعید خوش قدم کے کتب خانے کے لئے لکھا گیا۔ شروع میں ایک رسالہ آداب کتابت مصحف میں بھی ہے۔ محلی بالذہب والا

لوان ہے۔ جلد منقوش۔ سطریں ۱۲، اوراق ۳۱۹۔

(۶۹) جلی قلم۔ جس لفظ میں جلال و شان ہے وہ سونے سے لکھا ہوا ہے محلی بالذہب سلطان اشرف برسبائی نے ۸۳۶ھ (۱۴۳۳ء) میں اس کو وقف کیا تھا۔ (لکھا ہوا قبل کا ہے) سطریں ۱۱، اوراق ۳۰۲۔

(۷۰) ۸۳۰ھ (۱۴۲۶ء) میں ابراہیم بن احمد بن عثمان الرقی نے جلی قلم سے لکھا تھا حاشیہ پر قرأت و تجوید ہے۔ اسماء قرأت اور اس کے رموز ہیں۔ محلی بالذہب سطریں ۱۱، اوراق ۲۳۱، اس کو بھی سلطان اشرف بن النصر برسبائی نے ۸۴۱ھ (۱۴۲۷ء) میں وقف کیا تھا۔

(۷۱) خطاب بن عمر الانجاوی نے یاقوت مستعصمی کے طرز پر خط نسخ میں ۸۸۹ھ (۱۴۳۷ء) میں اس کو لکھا تھا اور ۱۹ محرم ۸۹۰ھ (۱۴۸۵ء) میں ملک اشرف ابو النصر قاتیبائی نے وقف کیا تھا محلی بالذہب ہے سطریں ۱۳، اوراق ۲۹۴۔

(۷۲) خط نسخ میں۔ جسکو ۹۱۱ھ (۱۵۰۵ء) میں مملوک قائم بن جانم نے جو طبقہ زیامہ ملکی الاشرفی سے تھا لکھا تھا محلی بالذہب، عبدالرحمن کتخدا نے اس کو وقف کیا تھا۔ سطریں ۱۳، اوراق ۲۹۲۔

(۷۳) جس کو عبداللہ بن حجاج البرماوی نے ۸۴۳ھ (۱۴۳۹ء) میں جلی قلم سے لکھا تھا اس کو ابراہیم کتخدا کی لڑکی عائشہ نے وقف کیا تھا محلی بالذہب ہے۔ سطریں ۱۱۔ اوراق ۱۴۴۔

(۷۴) جس کو مملوک کرتبائی بن اقبائی شاگرد محمد بن علی السہیلی نے ۸۷۹ھ (۱۴۷۴ء) میں جلی قلم سے لکھا تھا۔ علم قرآت میں ایک مقدمہ بھی اس کے ساتھ ہے۔ سلطان قاتیبائی نے اپنی جامع مسجد کے لئے جو دمیاط کے اطراف میں واقع ہے اس کو ۸۸۰ھ (۱۴۷۵ء) میں وقف کیا تھا۔ محلی بالذہب ہے۔ سطریں ۱۱، اوراق ۳۵۸۔

(۷۵) یاقوت مستعصمی کے طرز پر خط نسخ میں لکھا ہوا ہے (ممکن ہے کہ یاقوت ہی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہو) اول و آخر سے یہ نسخہ محروم ہے۔ محلی بالذہب ہے۔ حاشیہ پر بخط سرخ تفسیری اشارات ہیں۔ سطریں ۹، اوراق ۳۸۹۔ (یاقوت کے لکھے ہوئے نسخوں کی تفصیل ۴۶ میں گذر چکی اگر اس کو ملا لیجئے تو سات نسخے ہوئے)

(۷۶) ماہ رمضان ۸۸۵ھ (۱۴۸۰ء) میں علی بن اخی قاسم بن رستم الرفاعی نے خط ثلث و خط نسخ میں لکھا تھا مذہب ہے۔ ملک الاشرف ابو النصر قاتیبائی نے اس کو بھی وقف کیا تھا۔ سطریں ۱۳، اوراق ۲۹۶۔

(۷۷) یہ دولت ممالک جراکسو برجیہ کے مصاحف میں سے ہے۔ سیدہ نفیسہ (وفات رمضان ۲۸۰ھ (۸۹۳ء) بنت ابو محمد بن الحسن بن زید بن الحسن بن ابیطالب و زوجہ موتمن اسحاق بن جعفر صادق نے اپنی مسجد میں جو مصر میں تھی یہ قرآن پاک رکھدیا تھا وہاں سے چوری ہوگیا تھا اور دس سال کے بعد پھر مسجد کے دروازے پر لٹکا ہوا پایا گیا جب حسین بیگ حسنی کو اس کی خبر ملی تو اس نے اس قرآن پاک کو لیا اور مضبوط سرخ مرکو کے چمڑے سے مجلد کیا۔ جہاں جہاں خراب ہوگیا تھا اس کی ترمیم کی اخیر میں تین ورق محمد بن وہبی نے ۱۲۸۳ھ (۱۸۶۶ء) میں لکھکر چسپاں کئے، کلمات تفسیریہ بھی بین السطور لکھے حاشیہ پر قراتیں بھی درج کیں۔ یہ نسخہ خط ثلث میں مطلا و مذہب ہے اسماء سوز و عدد آیات سونے سے لکھے ہوئے ہیں اور سیاہ روشنائی سے مجدول ہے۔ اول میں آٹھ ورق مجدول و منقش و طلاکار ہیں۔ اس میں تصفین و اثلاث و ارباع و اسماء قراء سبعہ و ناسخ و منسوخ و ترتیب نزول آیات کو بھی بتایا ہے اور اسی طرح کی بعض اور مفید باتیں لکھی ہیں۔ (غالباً یہ سارے اضافے ناسخ و منسوخ و ترتیب نزول وغیرہ کے ۱۲۸۳ھ (۱۸۶۶ء) میں یا اس سے کچھ پہلے محمد بن وہبی نے کئے ہوں گے۔ سطریں ۱۱ اوراق ۳۸۲۔

(۷۸) اس نسخے کو محمد بن احمد حنبلی تبریزی نے ۹۸۸ھ (۱۵۸۰ء) میں خط نسخ میں لکھا ایک سطر طلائی ایک سطر سیاہ روشنائی سے۔ مطلا و مرصع اس کو ۱۰۳۲ھ (۱۶۲۲ء) میں سلطان محمد خاں کی والدہ صفیہ نے وقف کیا تھا۔ سطریں ۱۰، اوراق ۳۵۷۔

(۷۹) ۱۲۸۲ھ (۱۸۶۵ء) میں ابراہیم خلیل معروف شبکشی نے خط ثلث میں لکھا مذہب و مرصع ہے۔ ۱۲۸۲ھ ہی میں حاجی عنبر آغا باش آغائی برنجی قادن آفندی نے مصر میں وقف کیا۔ سطریں ۱۵، اوراق ۳۰۴۔

(۸۰) اس کو قطب الدین کاتب نے خط نسخ میں لکھا۔ اس میں چار تفسیریں بھی ہیں۔ دو حاشیہ پر انوار التنزیل بیضاوی اور جواہر التفسیر للمولی حسین الکاشفی اور جلالین اور ایک تفسیر فارسی صلب میں ہے۔ منقش و مذہب ہے۔ سطریں ۹، اوراق ۷۷۷۔

(۸۱) محمد روح اللہ بن حافظ محمد لاہوری نے اس کو ۱۱۰۷ھ (۱۶۹۵ء) میں لکھا تھا بخط نسخ تیس (۳۰) ورق میں تیس پارے، ہر ورق میں ایک پارہ یہ بھی بہت محلی و مذہب و ملون ہے۔ سطریں ۴۱ ہیں ہر سطر کے اول کا الف سرخ روشنائی سے لکھا گیا ہے یہ التزام کیا ہے کہ ہر سطر الف ہی سے شروع ہو۔

(۸۲) کاتب مذکور ہی نے خط نسخ میں یہ نسخہ بھی اسی پہلے التزام کے ساتھ تیس ورق میں لکھا ہے ہر ورق میں ایک پارہ بالکل اسی پہلے نسخے کی طرح لکھا ہے اس لئے اس کی سطریں بھی ۴۱ ہی ہیں۔

(۸۳) سلیمان کاتب نے معمولی خط میں ۱۲۸۴ھ (۱۸۶۷ء) میں لکھا ہے محلی بالذہب ہے حاجی سرور آغا تابع والد مرحوم حسین بیگ نے اس کو ۱۲۹۱ھ (۱۸۷۴ء) میں وقف کیا سطریں ۱۵، اوراق ۳۶۳۔

(۸۴) سید حافظ عثمان بن رشدی بن خلیل جو محمد داسم کے شاگرد تھے انھوں نے اس کو بخط نسخ ۱۲۵۹ھ (۱۸۴۳ء) میں لکھا تھا محلی بالذہب والالوان سطریں ۱۵، اوراق ۲۰۲۔

(۸۵) بہاء الدین محمد بن الشیخ ابو الفضل الاہجانی نے بخط نسخ ۱۱۹۷ھ (۱۷۸۲ء) میں لکھا۔ شروع میں ایک فارسی رسالہ ہے بین السطور بخط سرخ بعض کلمات کی تفسیریں ہیں حاشیہ پر تفسیر طبری ہے۔ ۱۲۴۷ھ (۱۸۳۱ء) میں یعقوب آفندی بن عبداللہ وزیر محمد علی پاشا والی مصر کے محاسب سوم، خزانہ مصر نے اس کو وقف کیا۔ سطریں ۱۲، اوراق ۳۰۴۔

(۸۶) ۱۲۸۸ھ (۱۸۷۱ء) میں سید حافظ احمد معروف بہ شاملی زادہ کاتب نے اس کو بخط نسخ لکھا اور ۱۲۹۰ھ (۱۸۷۳ء) میں الہامی پاشا کی والدہ نے اس کو وقف کیا۔ دائروں سے مرصع و مزین ہے۔ سطرین ۱۵، اوراق ۳۰۷۔

(۸۷) حافظ اسماعیل حقی شاگرد سید محمد الحلمی نے ۱۲۸۸ھ (۱۸۷۱ء) میں اس کو بخط نسخ لکھا۔ اس کو بھی الہامی پاشا کی والدہ مرحومہ نے ۱۲۹۰ھ (۱۸۷۳ء) میں وقف کیا یہ بھی مرصع و مزین ہے سطریں ۱۵، اوراق ۳۰۷۔

(۸۸) حاجی حافظ برہان الدین المعروف بعمر حافظ زادہ کاتب نے ۱۲۷۷ھ (۱۸۶۰ء) میں اس کو بخط نسخ لکھا۔ اس کو بھی الہامی پاشا کی والدہ نے وقف کیا۔ سطریں ۱۵، اوراق ۳۰۴۔

(۸۹) سید محمد الحمدی شاگرد ابی بکر الوصفی نے ۱۲۶۵ھ (۱۸۴۸ء) میں بخط نسخ لکھا۔ سلطان عبدالعزیز خان کی والدہ نے اس کو وقف کیا ہے۔ چھوٹے دائروں سے مرصع و مزین ہے سطریں ۱۵، اوراق ۳۰۵۔

(۹۰) احمد خلوصی بن حاجی خلیل شاگرد ابراہیم ادہمی الحصاری نے بخط نسخ ۱۲۲۸ھ (۱۸۱۳ء) میں لکھا۔ ولی پاشا کی دختر عائشہ ہاتم نے وقف کیا یہ بھی ماسبق کی طرح مرصع ہے سطریں ۱۵، اوراق ۳۰۳۔

(۹۱) معمولی خط ہر سطر کا اول و آخر سرخ حاشیہ پر بعض قراتیں، ۱۱۴۷ھ (۱۷۳۷ء)
میں شیخ عبدالرحمن انصاری کی لڑکی نے اس کو وقف کیا تھا (لکھا ہوا بہت پہلے کا
ہے)۔ سطریں ۱۷، اوراق ۱۴۷۔

(۹۲) عبدالکریم بن احمد طلموسی نے معمولی خط میں ۱۰۷۸ھ (۱۶۶۷ء) میں لکھا
بین السطور بخط سرخ بعض تفسیریں ہیں محمد آغا بیگ شہری نے اس کو وقف
کیا سطریں ۱۷۔ اوراق ۱۴۷۔

(۹۳) حافظ سلیمان جرولی نے ۱۲۰۸ھ ۱۷۹۳ء میں لکھا ہر صفحہ میں تین سطریں
بخط ثلث، بیچ کی سطریں سرخ۔ امید رضوان نے اس کو وقف کیا۔ سطریں ۱۷
اوراق ۲۳۰۔

(۹۴) اول و آخر سطریں ازرق رنگ بیچ کی سطر مذہب بخط ثلث و نسخ مذہب و
ملون ۱۲۰۰ھ (۱۷۹۴ء) میں امیر اللواء ایوب بیگ دفتدار مصر نے وقف کیا۔
سطریں ۱۳، اوراق ۲۹۷۔

(۹۵) سلیمان بن یسار نے بخط نسخ ۱۲۸۵ھ (۱۸۶۸ء) میں لکھا خدیو مصر کی حرم
چشم آفت خانم نے ۱۲۹۳ھ (۱۸۷۶ء) میں وقف کیا مذہب ہے سطریں ۱۱،
اوراق ۳۹۵۔

(۹۶) علی حلمی شاگرد حافظ اسماعیل نے بخط نسخ ۱۲۸۶ھ (۱۸۶۹ء) میں لکھا جس کو
علی آفندی مرشد نے وقف کیا منقش و مرصع ہے۔ سطریں ۱۵۔ اوراق ۳۰۴۔

(۹۷) سعیدی بن اسماعیل حامدی نے ۱۲۸۴ھ (۱۸۶۹ء) میں بخط نسخ لکھا۔ اسی
سال اس کو حسن کامی پاشا کی حرم رفیعہ ہانم کے غلام شعبان آغا نے وقف کیا۔
مرصع ہے: سطریں ۱۵، اوراق ۳۰۲۔

کتب خانہ مصطفیٰ پاشا میں دولت عثمانیہ کے مصاحف مکتوبہ

(۹۸) اسماعیل یساری زادہ شاگرد حسین آفندی حفاظت زادہ نے بخط نسخ ۱۱۶۶ھ

(۱۷۵۲ء) میں لکھا مصطفیٰ عرف جہانگیر نے طلا کاری کی اور نقوش بنائے ایک ورق میں حلیہ نبوی بھی ہے، سطریں ۱۵، اوراق ۳۰۰۔

(۹۹) سلیمان الوہبی القادری شاگرد ابراہیم شوقی خلیفہ الزاہدی نے ۱۲۴۲ھ (۱۸۲۶ء) میں بخط نسخ لکھا۔ مطلا و مذہب و منقش اخیر میں دعائے ختم قرآن۔ سطریں ۱۵، اوراق ۳۲۴۔

(۱۰۰) احمد المعروف نبائلی ساکن غلطہ نے ۱۱۹۵ھ (۱۷۸۰ء) میں بخط نسخ لکھا مطلا و مذہب ہے سطریں ۱۵، اوراق ۳۷۲۔ اس کاتب نے اس نسخے سے پہلے ۸۲ مکمل قرآن لکھے۔ یہ نسخہ ۸۳ واں ہے۔

(۱۰۱) سید عبداللہ المعروف بالامام شاگرد حافظ عثمان نے ۱۱۱۸ھ (۱۷۰۶ء) میں بخط نسخ لکھا عبداللہ مصطفیٰ نے مرصع و منقوش کیا سطریں ۱۵، اوراق ۳۴۴۔

(۱۰۲) احمد اللہ المعروف بابن الشیخ نے بخط نسخ لکھا۔ اخیر میں فارسی زبان میں دعائیں ہیں اور دعائے ختم قرآن عربی میں ہے سطریں ۱۲، اوراق ۵۵۳۔

(۱۰۳) ۱۱۴۰ھ (۱۷۲۷ء) میں ابن علاء الدین محمد بن محمد الحسینی نے حاجی مرزا محمد باقرزادہ کے حکم سے بخط نسخ لکھا حاشیہ بین السطور میں فارسی ترجمہ ہے اخیر میں دعائے ختم قرآن ہے مکمل مطلا و منقش ہے سطریں ۱۲۔ اوراق ۳۷۱۔

(۱۰۴) سورۃ فتح و فاتحہ الکتاب شاہ محمد نیشاپوری نے بخط نستعلیق ۹۶۹ھ (۱۵۵۷ء) میں لکھا۔ منقش و مطلا مذہب ہے۔ سطریں ۷، اوراق ۹، مجلد۔

(۱۰۵) ۹۴۴ھ (۱۵۳۷ء) میں احمد قرہ حصاری شاگرد سید اسد اللہ الکرمانی نے صرف سورۃ انعام کو خط ثلث و نسخ میں لکھا ہنایت مطلا و مذہب و مزین ہے سطریں ۱۳، اوراق ۱۲۔

(۱۰۶) یاقوت مستعصمی نے بخط نسخ ۶۸۹ھ (۱۲۹۰ء) لکھا بایں التزام کہ ہر صفحے کی آخری آیت اور پہلی آیت کو مطلا و مذہب و مزین ہے سطریں ۱۲، اوراق ۱۲ (یاقوت کے ہاتھ کے نسخوں کو نمبر ۴۶ میں دیکھئے)۔

(۱۰۷) سورۃ فاتحہ و انعام و کہف و سبا و فاطر آخر کی دو آیتوں کے سوا بخط نسخ یاقوت مستعصمی نے لکھا ہے۔ منقش و مذہب ہے۔ (یاقوت مستعصمی کے ہاتھ کے نسخے ٦ سے ۱۱ تک ۴٦ سے پہلے گذر چکے تھے یہ دو نسخے اور بھی ہیں جن میں ۱۰۷ نامکمل ہے اور ۷۵ ذرا مشتبہ ہے اس حساب سے نو یا دس نسخے ہوئے۔)

(۱۰۸) بدست علی بن سلطان محمد القاری الہروی المعروف بہ ملا علی القاری۔ مکتوبہ ۱۰۰۰ھ (۱۵۹۱ء) بخط نسخ خوشخط منقش و مذہب آخر میں دعائے ختم قرآن۔ سطریں ۱۵، اوراق ۴۱۲۔ ملا علی قاری متوفی ۱۰۱۴ھ (۱٦۰۵ء) تھے۔

(۱۰۹) پارہ عم کا بھی ربع عبداللہ بن محمد بن محمود ہمدانی نے ملک ناصر کے حکم سے ۷۱۳ھ (۱۳۱۳ء) میں بخط نسخ خوشخط لکھا مرصع و مطلا و مذہب و منقش ہے ۷۲٦ھ (۱۳۲۵ء) میں امیر سیف الدین بکتمرین عبداللہ ساقی نے اسے وقف کیا یہ ربع پارہ بھی دولت ممالک بحریہ کا ایک بیش بہا جوہر ہے سطریں ۵، اوراق ۳٦۔

(۱۱۰) ۷۸۹ھ (۱۳۸۷ء) میں احمد اصفہانی نے بخط ثلث ملک ظاہر ابو سعید کے مدرسہ میں پارہائے ۳، ۵، ۸، ۹، ۱۱، ۲۸، ۲۹ (سات پارے) لکھے تھے۔ مذہب ہے سطریں ۱۱، اوراق علی الترتیب ۱۷، ۱۸-۱۷، ۱۷-۱٦، ۱۷، ۱۸ ہیں۔

خدیو مصر کے کتب خانے کے مصاحف کی مجمل فہرست

نمبر شمار	نام کاتب	سال کتابت	نوعیت خط
۱	علی محمد بن مقلہ	۳۰۷ھ - ۹۲۰ء	نسخ
۲	مسعود بن محمد الکاتب الاصفہانی	۵۵۵ھ - ۱۱٦۰ء	"
۳	عبدالرحمان بن محمد بن ابی الفتح	۵۹۹ھ - ۱۲۰۲ء	"

نمبر شمار	نام کاتب	سال کتابت	نوعیت خط
۴	مسعود بن محمد بن مسعود بن الخطاط الاصفہانی	۶۰۷ھ - ۱۲۱۰ء	نسخ
۵	یاقوت مستعصمی	۶۹۰ھ - ۱۲۹۱ء	"
۶	" "	" "	"
۷	احمد بن محمد بن کمال الا نصاری (قاہرہ)	۷۳۴ھ - ۱۳۳۳ء	"
۸	ابن خلیل بن محمد بن عبدالرحمن الحنفی	۷۵۷ھ ۱۳۵۶ء	"
۹	علی بن محمد المکتب الاشرقی	۷۷۴ھ - ۱۳۷۲ء	"
۱۰	محمد المکتب الشہابی	۷۷۶ھ - ۱۳۷۲ء	"
۱۱	العبد الشافعی	۷۴۰ھ - ۱۳۳۹ء	"
۱۲	حسن بن القاسم الجعفری	۷۲۲ھ - ۱۳۲۲ء	"
۱۳	موسیٰ بن محمد بن الحسن التنوخی المالکی الاشرفی (قاہرہ)	۷۷۶ھ - ۱۳۷۲ء	"
۱۴	مبارک شاہ	-	"
۱۵	عبدالرحمن بن صائغ	۸۰۱ھ ۱۳۹۸ء	"
۱۶	عبدالرحمن بن صائغ	-	"
۱۷		-	
۱۸	احمد اصفہانی	۷۸۹ھ ۱۳۸۷ء	"
۱۹	موسیٰ بن اسماعیل الکتانی الحنفی	۹۳۰ھ - ۱۴۱۷ء	"

نمبر شمار	نام کاتب	سال کتابت	نوعیت خط
	المعروف بالحسینی		
۲۰	جانم سیفی جان بیگ	ابو النصر ملک اشرف کا زمانہ	نسخ
۲۱	سعد الحافظ السرائی	۸۰۷ھ - ۱۴۵۵ء	،،
۲۲	ابراہیم بن احمد بن عثمان الرقی	۸۳۰ھ - ۱۴۲۶ء	،،
۲۳	خطاب بن عمر الذنجاوی	۸۸۹ھ ۱۴۸۴ء	،،
۲۴	احمد بن علی القیومی	۹۰۸ھ ۱۵۰۲ء	،،
۲۵	عبداللہ بن حجاج البرماوی	۸۴۳ھ - ۱۴۲۹ء	،،
۲۶	مملوک کرتبائی بن اقبائی تلمیذ محمد بن علی السہیلی	۸۷۹ھ - ۱۴۷۴ء	،،
۲۷	علی بن اخی قاسم بن رستم الرفائی	۸۸۵ھ - ۱۴۸۰ء	،،
۲۸	احمد بن جمال الدین الحافظ الاصفہانی	۹۰۶ھ - ۱۵۰۰ء	،،
۲۹	مملوک قانم بن جانم	۹۱۱ھ - ۱۵۰۵ء	،،
۳۰	عبداللہ بن نصر اللہ	۸۴۰ھ - ۱۴۳۶ء	،،
۳۱	محمد بن احمد الخلیلی التبریزی	۹۸۸ھ - ۱۵۸۰ء	،،
۳۲	قطب الدین	X	،،
۳۳	محمد روح اللہ بن حافظ محمد حسین لاہوری	۱۱۰۷ھ - ۱۶۹۵ء	،،
۳۴	محمد روح اللہ بن حافظ محمد حسین		،،
۳۵	بہاء الدین محمد بن الشیخ ابی الفضل اللاہجائی	۱۱۹۷ھ - ۱۶۹۵ء	،،

نمبر شمار	نام کاتب	سال کتابت	نوعیت خط
۳۶	حبیب اللہ الداعی از تلامیذ حسن	۱۱۸۵ھ - ۱۷۷۱ء	نسخ
۳۷	ایضاً	۱۱۸۸ھ - ۱۷۷۴ء	//
۳۸	احمد العطائی تلمیذ اسماعیل وہبی آفندی		//
۳۹	عبدالقادر بن عیسیٰ	۱۱۰۴ھ - ۱۶۹۲	//
۴۰	محمد سعید المعروف بصری تلمیذ الشکری	۱۱۸۸ھ - ۱۷۷۴ء	//
۴۱	مصطفےٰ بروسی تلمیذ محمد نوری		//
۴۲	عبدالرحمن السعید الیاقوتی		//
۴۳	احمد الشکری تلمیذ محمد نوری	۱۱۸۸ھ - ۱۷۷۴ء	//
۴۴	اسماعیل الظہوری	۱۱۸۸ھ - ۱۷۷۴ء	//
۴۵	صالح النجیب		
۴۶	احمد ابو المعز الاحمدی الشافعی	۱۱۵۸ھ - ۱۷۴۵ء	//
۴۷	محمد تمام		//
۴۸	حاجی اسماعیل بن ابراہیم الغسطموتی	۱۰۶۲ھ - ۱۶۵۱ء	//
۴۹	غیاث الدین محمد بن احمد خلیل التبریزی	۹۷۷ھ -	//
۵۰	ملا علی قاری محدث	۱۰۰۰ھ - ۱۵۵۱ء	//
۵۱	اسماعیل لیساری زادہ تلمیذ حسین آفندی معروف نجفاف زادہ	۱۱۶۶ھ - ۱۷۵۲ء	//

نمبر شمار	نام کاتب	سال کتابت	نوعیت خط
۵۲	حافظ عثمان	۱۰۲۸ھ	نسخ
۵۳	احمد المعروف بنائلی ساکن غلطه	۱۱۹۵ھ	
۵۴	عبداللہ المعروف بامام تلمیذ حافظ عثمانی	۱۱۱۸ھ	
۵۵	احمد اللہ المعروف بابن الشیخ	-	
۵۶	ایضاً	-	
۵۷	سید حافظ عثمان المعروف بقائش زاده	۱۱۷۳ھ	
۵۸	حافظ احمد	۱۰۹۳ھ	
۵۹	علاؤالدین محمد بن الحسینی	۱۱۴۰ھ - ۱۷۲۷ء	
۶۰	سید مصطفیٰ ملقب بجہدی محمد آفندی بن حاجی مصطفیٰ	۱۱۹۸ھ - ۱۷۸۳ء	
۶۱	حافظ یوسف کاتب لسرائی القاہرہ	۱۱۹۸ھ - ۱۷۸۳ء	
۶۲	درویش علی	۱۰۸۹ھ	
۶۳	احمد المقری الحصاری تلمیذ اسد اللہ الکرمانی	۹۴۴ھ - ۱۵۲۷ء	
۶۴	علی بن اخی بن رستم الرفاعی	۸۸۵ھ ۱۴۹۷ء	ثلث
۶۵	علی بن احمد بن امیر علی بن الحسینی البہائی	۹۰۳ھ ۱۴۹۷ء	ثلث
۶۶	محمد علی الامام		

نمبر شمار	نام کاتب	سال کتابت	نوعیت خط
۶۷	احمد الاصفہانی	۷۸۹ھ ۱۳۸۷ء	ثلث
۶۸	عبداللہ بن نصر اللہ	۸۴۰ھ ۱۴۳۱ء	
۶۹	یحییٰ بن الحسن بن احمد القاضی العوشی العراقی	۷۵۷ھ ۱۳۵۶ء	
۷۰	عبداللہ بن محمود بن محمود الہمدانی	۷۱۳ھ ۱۳۱۳ء	
۷۱	احمد بن محمود والدشتی	۷۸۹ھ - ۱۳۸۷ء	
۷۲	احمد المقری الحصاری تلمیذ اسد اللہ الکرمانی	۹۴۴ھ - ۱۵۳۷ء	
۷۳	محمود بن حسین بن علی التنجوانی	۷۶۲ھ - ۱۳۶۰ء	
۷۴	وہبی	۱۲۸۲ھ ۱۸۶۵ء	
۷۵	خیرت آفندی		
۷۶	ابراہیم خلیل المعروف بہ شبکشی	۱۲۸۲ھ ۱۷۹۰ء	
۷۷	محمد بن کزل العیادی	-	نسخ
۷۸	محمد امین التبریزی المعروف بہ ابن عبدالسمیع	۱۲۰۵ھ - ۱۷۹۰ء	
۷۹	سید حافظ عثمان الرشدی بن خلیل تلمیذ محمد راسم	۱۲۵۹ھ - ۱۸۴۳ء	
۸۰	حافظ احمد المعروف بہ شاملی زادہ	۱۲۹۰ھ - ۱۸۷۳ء	
۸۱	حافظ اسماعیل حقی تلمیذ محمد حلمی	۱۲۸۸ھ - ۱۸۷۱ء	
۸۲	حافظ برہان الدین معروف بعمر حافظ زادہ	۱۲۷۷ھ - ۱۸۶۰ء	

نمبر شمار	نام کاتب	سال کتابت	نوعیت خط
۸۳	سید محمد حمدی تلمیذ ابی بکر الوصفی	۱۲۶۵ھ - ۱۸۴۸ء	نسخ
۸۴	احمد خلوصی بن حاجی خلیل تلمیذ ابراہیم ادہمی حصاری	۱۲۲۸ھ - ۱۸۱۳ء	
۸۵	عبداللہ الراسخ تلمیذ عبداللہ الصدقی	۱۲۹۶ھ	
۸۶	سید سلیمان النطقی تلمیذ امام زادہ	۱۲۱۵ھ - ۱۸۰۰ء	
۸۷	شیخ صالح	۱۲۳۶ھ - ۱۸۲۰ء	
۸۸	سلیمان لیساری	۱۲۸۵ھ	
۸۹	علی الحلمی تلمیذ حافظ اسماعیل	۱۲۸۶ھ	
۹۰	محمد سعید بن اسماعیل الحامدی	۱۲۸۴ھ	
۹۱	شیخ مصطفیٰ القیسی تلمیذ حسن بن محمود الجوری	۱۲۳۲ھ	
۹۲	سید عبداللہ الزہدی	۱۲۷۷ھ	
۹۳	سید صالح المعروف بہ جمشید	۱۲۱۱ھ	
۹۴	سلیمان الوہبی القادری الاشرقی تلمیذ ابراہیم الشوقی	۱۲۴۴ھ - ۱۸۲۸ء	
۹۵	محمد عطاء اللہ المعروف لعریزادہ	۱۲۸۶ھ	نستعلیق
۹۶	شاہ محمود نیشاپوری	۶۵۶ھ - ۱۵۵۷ء	
۹۷	محمد عمدی بکوتاہی المعروف بحافظ الکتب تلمیذ سید المعروف بداماد	۱۲۴۶ھ	نسخ

نمبر شمار	نام کاتب	سال کتابت	نوعیت خط
۹۸	سید حافظ محمد راشد المعروف بہ تربت دار حضرت خالد بن زید ابو ایوب الانصاری رضی اللہ عنہ	۱۲۶۵ھ	نسخ
۹۹	سید عبداللہ		
۱۰۰	محمد امین المعروف بعزتی	۱۲۰۰ھ	
۱۰۱	سید صالح صلاحی	۱۲۰۳ھ	
۱۰۲	محمد بن عمرالطنبومی الشافعی	۱۲۴۷ھ ۱۸۳۰ء	
۱۰۳	ابوالحسن بن ابی طاہر	۱۲۱۹ھ - ۱۸۰۷ء	معمولی
۱۰۴	محمد ابوالخیرالمقری بن صالح السواق	۱۲۸۶ھ	"
۱۰۵	عبدالکریم بن احمد الطلموسی	۱۰۷۸ھ - ۱۶۶۷ء	"
۱۰۶	مصطفیٰ بن محمد (قسطنطنیہ)	۹۳۵ھ	"
۱۰۷	محمد الاجہوری	۱۲۷۱ھ	"
۱۰۸	یونس بن محمد الاندلسی	۱۱۶۶ھ - ۱۷۵۲ء	مغربی
۱۰۹	محمد اولاف	-	"
۱۱۰	مبارک بن محمد کوری	-	"
۱۱۱	امام جعفر صادق المتوفی مکمل نسخہ	(۱۴۸ھ - ۷۶۵ء)	کوفی

یہ ایک سو گیارہ صرف خدیو مصر کے کتب خانے کے ہیں اور اس سے پہلے ایک سو دس مصاحف کی فہرست آپ پڑھ چکے - سب ملا کر دو سو اکیس

مصاحف ہوئے - ان میں سے خدیو مصر کے کتب خانے میں صرف ایک ہی نسخہ قدیم ۱۱۱ بخط حضرت جعفر صادقؓ ہے اور یہ مکمل نسخہ ہے بخط کوفی اور پہلی فہرست کے ۱۲ میں بھی نصف اول یعنی پہلے پندرہ پارے پورا سورۃ کہف تک ان ہی کے ہاتھ کا لکھا ہوا نسخہ مذکور ہے حضرت جعفر صادقؓ کی وفات ۱۴۸ھ مطابق ۷۶۵ء میں ہوئی تھی - یقیناً یہ دونوں مصاحف جن کو ڈیڑھ مصحف کہنا غلط نہ ہوگا ۱۴۰ھ یا اس سے پہلے یا کچھ بعد کے لکھے ہوئے ہوں گے اور حفص بن سلیمان الاسدی ابو عمر البزار الکوفی جن کی طرف اس قرأت متواترہ کو منسوب کیا جاتا ہے انھوں نے بقول امام بخاری ۱۸۰ھ اور ۱۹۰ھ کے درمیان وفات پائی تھی - ابن حجر ۱۸۰ھ سال وفات لکھکر یہ بھی لکھتے ہیں کہ کہا گیا ہے کہ ۱۹۰ھ کے قریب انہوں نے وفات پائی - تو اس قول اور امام بخاریؒ کی تحریر کے پیش نظر ان کی وفات ۱۸۵ھ میں سمجھ لیجئے تو حضرت جعفر صادقؓ کی وفات سے ۳۷ برس کے بعد ان کی وفات ہے اور حفص بن سلیمان کی عمر ابن حجر تہذیب التہذیب جلد ۲ - ۴۰۱ میں ساٹھ برس لکھتے ہیں تو یہ جعفر صادقؓ کی وفات کے وقت ۲۳ برس کے نوجوان تھے - یہ ناممکن ہے کہ امام ممدوح نے ایک بیس برس کے نوجوان کی قرأت کا اتباع کیا ہو اور اپنے ہاتھ سے اس کی قرأت کے مطابق دو دو بار پورا قرآن لکھا ہو -

نمبر ۱۶ والا نسخہ جو نصف اول ہے اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ انھوں نے نصف اول ہی لکھا تھا بہت زیادہ ممکن ہے کہ نصف دوم بھی دوسری جلد میں لکھا ہو مگر وہ ضائع ہوگیا ہو -

پھر نمبر ۲ حضرت عثمان ذوالنورینؓ کے دست مبارک کا لکھا ہوا اور نمبر ۲۳ بھی اور نمبر ۳ حضرت علیؓ کے دست مبارک کا لکھا ہوا اور نمبر ۵ بھی - اور نمبر ۴ حضرت حسنؓ کے دست مبارک کا لکھا ہوا نسخہ ہے اور حضرت عثمانؓ، حضرت

علیؓ اور حضرت حسن رضی اللہ عنہم تینوں کی وفات حفص بن سلیمان کی ولادت سے پہلے ہے اسلئے کوئی دیوانہ بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ ان بزرگوں نے قرأت حفص کے مطابق قرآن لکھا تھا۔

یہی حال نمبر ۱۴، نمبر ۱۵، نمبر ۱۶، نمبر ۱۷، نمبر ۱۸، نمبر ۱۹، نمبر ۲۰، سات نسخوں کا ہے جو قدیم ترین نسخے ہیں، اور یقیناً صحابہؓ ہی کے دست مبارک کے لکھے ہوئے ہیں۔ ان کے ساتھ پہلے پانچ نسخوں کو ملا لیجئے تو گیارہ نسخے ایسے قدیم ہوئے جو حفص کی پیدائش سے برسوں قبل کے ہیں مگر نہ ان گیارہ نسخوں کے آپس میں کسی قسم کا اختلاف ہے نہ دوسرے بعد کے نسخوں سے ان میں سے کسی نسخے کو آپ ذرا بھی مختلف پائیں گے اور نہ یہ دو سو اکیس نسخے مندرجہ فہرست مذکور آپس میں مختلف ہیں۔ پھر اسی قرأت متواترہ کو حفص کی طرف منسوب کرنا صرف اس لئے ہے کہ اس قرأت کی اہمیت تواتر کو کم کر دیا جائے اس کی پوری بحث انشاء اللہ اس کتاب کے دوسرے حصہ میں بضمن بیان اختلاف قرأت آئیگی۔ یہاں صرف یہ دیکھنا مقصود ہے کہ قرآن کے قدیم و جدید نسخے باہم ذرا بھی مختلف نہیں ہیں۔

واضح رہے کہ مذکورہ بالا فہرست مصاحف چونکہ شائع شدہ ہے اور ملک کے ایک وقیع رسالے میں بہت پہلے چھپ چکی ہے اور ایک معتبر بزرگ کے تفحص و جستجو کا نتیجہ ہے اس لئے میں نے اس کو اس کتاب میں شائع کر دینا مناسب سمجھا۔ اگر تھوڑی اور کوشش کی جائے تو اس سے زیادہ نسخہائے مصاحف کی فہرست تیار ہو سکتی ہے۔ خود میرے پاس چار نسخے نہایت قدیم لکھے ہوئے مطلا و مذہب تھے۔ دو نسخے بخط کوفی تھے۔ ایک کے ابتدائی چند اوراق غائب ہو گئے تھے جن کو میرے جد اعلیٰ حضرت شاہ محمد مجیب اللہ پھلواروی (متوفی ۱۲۰۰ھ) کے والد ماجد حضرت شاہ ظہور اللہ رحمہا اللہ تعالیٰ نے اپنے دست

خاص سے لکھ کر پورا کر دیا تھا۔ اور دوسرا نسخہ کرم خوردہ ہوگیا تھا مگر مکمل تھا۔ ۱۹۴۷ء میں جب میں بہ نیت ہجرت ترک وطن پر آمادہ ہوا تو اپنے کتب خانے کی منتخب کتابیں اپنے ساتھ لے آیا اور فاضل کتابیں بعض اعزہ میں تقسیم کر دیں۔ وہ دونوں مصاحف اور کتابوں کے ساتھ اخی الاعظم حضرت مولانا شاہ محمد سلیمان پھلواروی رحمۃ اللہ کی خانقاہ سلیمانیہ کے کتب خانے میں داخل کر دیئے اور دو قدیم قلمی نسخے جو بخط نسخ ہیں وہ میرے پاس یہاں موجود ہیں۔ خانقاہ منیر (صوبہ بہار) میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دست مبارک کا لکھا ہوا نسخہ بھی موجود ہے اسی طرح پتہ لگایا جائے تو بہت سے گھرانوں میں قدیم مصاحف کے نسخے ملیں گے۔ مگر میری غرض فہرست مصاحف قدیمہ پیش کرنے کی نہیں ہے بلکہ یہ دکھانا مقصود ہے کہ قدیم و جدید جتنے نسخے بھی قرآن مجید کے جہاں کہیں بھی دنیا میں ہیں سب کے سب اسی ایک قرأت متواترہ ثابتہ صحیحہ کے مطابق لکھے ہوئے ہیں۔ ان میں باہم کسی طرح کا کوئی اختلاف نہیں۔

الحمدللہ کہ قرآن مبین کا ہر دعویٰ صحیح ثابت ہوا

مذکورہ بالا تصریحات سے قرآن مبین کے دونوں دعوے کہ نمبرا۔ ذلک الکتٰب لا ریب فیه (البقرہ آیت ۲) اور نمبر ۲۔ لا یاتیه الباطل من بین یدیه و لا من خلفه (سورۃ حم سجدہ آیت۔۴۲) پوری طرح صحیح ثابت ہوگئے۔ اور ایک ضمنی دعویٰ عدم اختلاف کا بھی صحیح ثابت ہوگیا۔ یعنی اس اعتبار سے کہ اس کے نسخوں میں باہم کوئی اختلاف نہیں اور اختلاف قرأت کا شاخسانہ جو ملاحدہ عجم نے کوفہ میں بیٹھ کر قائم کر رکھا تھا، اور اس کو اس قدر شہرت دی کہ ایک ہزار برس سے تقریباً تمام مسلمانوں کے ایمانیات میں داخل ہو رہا ہے قرآن پاک اور اس کے قدیم و جدید سارے نسخے ان اختلافات کی آلائشوں سے بالکل پاک ہیں فالحمد الله علی تو فیقه تائیده ۔ اس کی

مکمل بحث انشاء اللہ آگے آتی ہے

قرآن مجید کے متعلق اللہ تعالیٰ کے وعدے

ایک وعدہ تو ایسا ہے جو تین وعدوں پر مشتمل ہے سورۃ قیامہ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے ۔ ان علینا جمعہ و قرآنہ اس میں دو وعدے ہیں یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا جاتا ہے کہ اس کتاب کو جمع کرا دینا اور پڑھوا دینا ہمارے ذمہ ہے اس کے بعد پھر تیسرا وعدہ فرمایا گیا کہ ثم ان علینا بیانہ پھر اس کو بیان کرا دینا بھی ہمارے ہی ذمے ہے ۔ (سورۃ قیامت آیات ۱۷ تا ۱۹)

اب دیکھئے کہ یہ تینوں وعدے اللہ تعالیٰ نے کہاں تک پورے کئے یہ ایک مرتبہ جو تین اہم کاموں کا یکجائی وعدہ فرمایا گیا تو اب ان میں کی ہر بات کو الگ الگ دیکھئے ۔

۱۔ جمع قرآن

اس کی مکمل بحث میری کتاب جمع القرآن میں دیکھ لیں ۔ یہاں اس پوری بحث کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے البتہ اس بات کی ضرورت ہے کہ ایک ساتھ وارد ہونے والے ان تینوں وعدوں پر تدبر کیا جائے ۔

پہلے پوری کتاب کو جمع کرا دینے کا وعدہ فرمایا اس کے بعد اس کے پڑھوا دینے کا، پھر اس کے بیان کرا دینے کا وعدہ فرمایا ۔

ظاہر ہے کہ جب تک پوری کتاب مجتمع نہ ہو جائے اس کے الفاظ و کلمات مطابق وحی اعراب و سکون نقاط سے منضبط نہ ہوں ، اس کی آیتیں اپنے جملہ الفاظ و کلمات کے مطابق وحی ترتیب کی جامع نہ ہوں اور اس کی سورتیں اس کی ساری نازل شدہ آیات پر مطابق وحی جب تک حاوی نہ ہوں اور پھر جب تک اس کی ساری سورتیں منشائے الٰہی کے مطابق یکے بعد دیگرے مرتب نہ

ہوں اس وقت تک "جمع" کے لفظ کا اطلاق ہی اس کتاب پر نہیں ہو سکتا۔ اور نہ مطابق وحی الٰہی اس کی قرأت و تلاوت ممکن ہے اور جب تک منشائے الٰہی کے مطابق اس کی قرأت و تلاوت نہ ہو اس کے معنی و مفہوم کا بیان کس طرح منشائے الٰہی کے مطابق ممکن ہو سکتا ہے؟

اس لئے یہ ماننا پڑیگا کہ جیسے جیسے آیتیں اور سورتیں اترتی گئیں منشائے الٰہی کے مطابق خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو جمع کرتے اور صحابہؓ سے جمع کراتے رہے اور جمع کرانے کے بعد اس کو پڑھتے پڑھاتے رہے اور پھر صحابہؓ کے سامنے اس کو بیان فرماتے رہے۔ جیسے جیسے باقی حصے آیتوں یا سورتوں کی شکل میں اترتے گئے جمع ہوتے گئے، پڑھے جاتے رہے اور بیان کئے جاتے رہے۔ یہاں تک، کہ آخری مضمون اور آخری آیت اتر گئی اور قرآن مکمل ہو گیا تو پھر پورا قرآن جمع بھی ہو گیا اور پھر پورے قرآن کی قرأت بھی ہونے لگی اور پورے قرآن کا بیان بھی ہونے لگا اس لئے ایسا سمجھنا کہ جمع قرآن کا کام تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے نہ ہو سکے آپؐ کی وفات کے بعد عہد صدیقی میں کسی حد تک نامکمل سارہ جائے اور اس کی تکمیل عہد حضرت عثمانؓ میں ہو اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم غیر مجتمع آیات و سُور کی قرأت و بیان زندگی بھر کرتے رہے۔ قرآن و رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ سخت ترین گستاخی ہے اور در حقیقت ان علینا جمعہ و قرآنہ[ہ] کے وعدہ صادقہ کی تکذیب ہے اللہ تعالیٰ نے اپنے وعدوں کے مطابق پہلے آیتوں کو جمع کرایا اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پڑھوا دیا پھر صحابہؓ سے اسی جمع کے مطابق پڑھوا دیا اور پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے معانی و مفاہیم کو بیان کرا دیا۔

ہ القرآن ۷۵/۱۷

مفسرین کا دھیان چونکہ بخاری کی جمع قرآن والی روایت پر ہے اور ان کے عقیدے کے مطابق قرآن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد عہد صدیقی میں جمع ہوا اور عہد عثمانی میں صحیح طور سے یا پوری طرح شائع ہوا اسلئے یہاں ان علینا جمعه[1] سے وہ مراد لیتے ہیں جمعه فی صدرك صلے الله علیه و سلم یعنی اللہ تعالیٰ نے ذمہ لیا تھا صرف اس بات کا کہ ہم اس قرآن کو تمہارے سینے میں جمع کر دیں گے یعنی تم پورے قرآن کے حافظ ہو جاؤ گے، جیسا کہ بعض مفسرین لکھتے ہیں - حالانکہ قرآن ہی میں قرآن کے متعلق فی صحف مکرمہ موجود ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن[2] دونوں کے بارے میں ارشاد ہے رسول من الله یتلوا صحفا مطهرة اللہ کے رسول تلاوت کرتے ہیں پاک صحیفے کی - اسلئے اگر قرآن صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سینہ مبارک ہی میں جمع کیا گیا تھا تو ان صحیفوں میں کیا تھا جن کی تلاوت آپ صلی اللہ علیہ وسلم برابر فرماتے تھے اور جن صحیفوں کو مکرم صحیفے فرمایا گیا؟

قرآن صرف رسول[3] اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے تواتر نہیں تھا بلکہ لیکون للعلمین نذیرا سارے عالم کیلئے اترا تھا اور تمام مومنین کو اس سے فائدہ اٹھانے کا موقع ملنا چاہیئے - اور وہ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک سینے میں جمع کر دیا گیا تو دوسرے مومنیں بس اسی قدر اس سے فائدہ اٹھا سکیں گے جتنا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سن کر یاد رکھ سکیں گے - اہل علم صحابہؓ کے سینوں میں بھی پورا قرآن جمع ہو چکا تھا - بل هو ایت بینت فی صدور الذین او توا العلم و ما یجحد بایتنا الا الظلمون[4] (بلکہ وہ کھلی ہوئی واضح آیتیں ہیں ان لوگوں کے سینوں میں (حفظ کے ذریعے) جن کو

---

[1] القرآن ۱۷/۷۵ [2] القرآن ۲/۹۸ [3] القرآن ۱/۲۵ [4] القرآن ۲۹/۴۹

علم دیا گیا ہے اور ہماری آیتوں سے ظالموں کے سوا کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا۔ (عنکبوت ۵) تو جب صحابہؓ کو بھی جیسے جیسے قرآن اتر تا رہا، یاد ہوتا گیا، یہاں تک کہ قرآن پورا ہوا تو وہ بھی پورے قرآن کے حافظ ہو گئے تو پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت کہاں رہی، اور اگر کوئی خصوصیت ملحوظ نہ سمجھی جائے تو پھر یہ ذمہ داری کا اعلان کیسا؟ یہ وعدہ ذمہ داری تو صاف بتا رہا ہے کہ یہ جمع کا کام جس کے ذمہ کیا جا رہا ہے کوئی ایسا ہی اہم کام ہے جو اللہانہ ذمہ داری کے بغیر صحیح طور سے انجام ہی نہیں پا سکتا تھا اور یہ واقعہ ہے کہ منتشر آیات و سُور جو وقتاً فوقتاً تیئیس برس کی طویل مدت میں کچھ مکے میں اور کچھ مدینے میں اترتے گئے ان کو اسی ترتیب کے ساتھ حفظاً و تحریراً جمع کرا دینا بغیر تائید الٰہی کے ناممکن تھا، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اس کا ذمہ خود لے لیا، تاکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی طرف سے پورا اطمینان رہے غرض ان علینا جمعہ سے مراد صحیفوں ہی میں جمع کرا دینا ہے اور اسکی دلیل اس کے بعد کا فقرہ و قرآنہ بھی ہے کہ صحیفوں میں جمع کرا کے ان کو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اور صحابہؓ سے پڑھوانا مقصود ہے، یعنی وہ صحیفے جن میں قرآن جمع ہوگا ایسے ہوں گے کہ ان کی نقل در نقل ہو کر ساری دنیا میں پڑھے جائیں گے اور اللہ ہی اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اور صحابہؓ سے اور پھر تمام مسلمانوں سے پڑھوا دیگا۔

قرأت قرآن

ان علینا جمعہٗ و قرآنہٗ[۵] میں "قرآن" کا لفظ اپنے معنی مصدری میں بمعنی قرأت و اقراء آیا ہے اسی لئے اس کے معنی پڑھنا اور پڑھوانا یا پڑھانا لیا جاتا ہے مگر کتاب دیکھکر پڑھنا، یا زبانی پڑھنا، دوسرے سے سن سن کر اس کو دہرانا

۵ القرآن ۷۵ / ۱۷

سب کو قرأت کہتے ہیں لیکن قرأت کا تعلق لکھنے سے ضرور ہے، اس لئے کہ صرف بولنے کو قرأت ہنیں کہتے قرأت یا تو کتاب کی یعنی کسی لکھی ہوئی عبارت کی اسکو دیکھکر ہوتی ہے چاہے باآواز بلند ہو یا آہستہ یا صرف جی میں، یا فقط نظر سے۔ یا کوئی لکھی ہوئی چیز کسی کو زبانی یاد ہو، اور وہ اسکو زبانی پڑھے۔ غایت سے غایت کبھی کسی ایسی چیز کے زبان سے ادا کرنے کو بھی کہتے ہیں جو لکھی جائیگی یا لکھی جاتی ہو مگر ایسا استعمال بھی قلیل ہے البتہ دو مفعول کے ساتھ آئے اور مفعول اول پر علیٰ ہو تو کہدینے اور کسی بات کے پیش کر دینے کے معنی میں آتا ہے جیسے زید یقرء علیک السلام - اقرا علیہ السلام اور یہی حال "تلاوت" کا ہے کہ تلاوت کتاب دیکھکر پڑھنے کو کہتے ہیں مگر تلیٰ علیہ کے معنی زبانی کسی کے سامنے بیان کرنے کے بھی آتے ہیں جیسے و اتل علیھم نبا الذی اٰتینٰہ اٰیتنا[1] غرض قرأت ہو یا تلاوت جب دو مفعول کے ساتھ آئے اور پہلے مفعول پر علیٰ ہو تو زبانی پڑھنے یا زبانی بیان کرنے یا کہدینے کے معنی یا پیش کرنے کے مفہوم میں بھی آتا ہے اسی لئے یتلوا علیھم اٰیتہ[2] میں عام مفہوم ہے کتاب دیکھکر اور بغیر کتاب دیکھے زبانی دونوں مفہوم کو شامل ہے لیکن ایک ہی مفعول کے ساتھ ہو تو "تلاوت" کتاب دیکھ کر ہی پڑھنے کے معنی میں آئیگی، اور قرأت کتاب دیکھکر ہو یا لکھی ہوئی چیز کی زبانی ہو سب کیلئے ہے اتنی تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ ان علینا جمعہ و قراٰنہ[3] میں "جمع" سے مراد صحیفوں میں اس کتاب اللہ کو جمع کرا دینا ہے اور قراٰنہ سے انھیں صحیفوں کی قرأت مراد ہے چاہے صحیفے دیکھکر ہو چاہے یاد کرلینے کے بعد زبانی ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دونوں طرح تلاوت فرماتے تھے بطور خود

---

[1] القرآن ۷/۱۷۵ [2] القرآن ۳/۱۶۴ [3] القرآن ۷۵/۱۷

مصحف دیکھکر بھی تلاوت فرماتے تھے اور لوگوں کے سامنے تعلیم و تبلیغ کے وقت زبانی بھی پڑھتے تھے ۔ جہاں آپؐ کے زبانی پڑھنے کا ذکر ہے وہاں دو مفعول کے ساتھ " تلاوت " کا صیغہ لایا گیا ہے اور مفعول اول پر علیٰ آیا ہے جیسے یتلو اعلیھم ایٰتہٖ[1] اور جہاں کتاب دیکھکر پڑھنے کا ذکر ہے وہاں ایک ہی مفعول آیا ہے بغیر کسی صلے کے جیسے رسول من اللّٰہ یتلو اصحفا مطھرۃ[2] ۔ اور بطور خود تنہا زبانی پڑھنے کو یا نماز میں پڑھنے کو قرأت کہتے ہیں آپؐ تنہا زبانی بھی پڑھتے تھے اور پھر نمازوں میں تو برابر پڑھتے ہی تھے ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پڑھنے کی صلاحیت معانقہ جبرئیلؑ کے بعد پیدا ہو گئی تھی اس کا ذکر بھی ہم " جمع قرآن " کے ضمن میں بیان کر چکے ہیں امام رازی نے بھی تفسیر کبیر جلد ہشتم میں بضمن تفسیر سورۃ بینہ (پارہ عم) رسول من اللہ یتلو اصحفا مطھرۃ[3] کی تفسیر لکھتے ہوئے تحریر فرمایا ہے کہ

فان قلت کیف نسبت تلاوۃ الصحف المطھرۃ الی الرسول مع انہ کان امیاً قلنا اذا تلیٰ مثل المسطور فی تلک الصحف کان تالیاما فیھا و قد جاء فی کتاب منسوب الی جعفر الصادق انہ صلی اللہ علیہ و سلم کان یقرأ من الکتاب و ان کان لایکتب و لعل ھذا من معجزاتہ (صفحہ ۶۴) یعنی " اگر تم کہو کہ صحف مطہرہ کی تلاوت کی نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اور کس طرح کی گئی باوجود اس کے کہ آپؐ امی تھے ؟ تو ہم کہیں گے کہ جب آپؐ نے صحیفوں میں لکھی ہوئی چیز بالکل تحریر کے مطابق پڑھی تو گویا اس کی تلاوت ہی فرمائی ۔ اور ایک کتاب جو جعفر صادقؒ کی طرف منسوب ہے اس میں مذکور ہے کہ " آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

[1] القرآن ۳/۱۶۴ [2] القرآن ۲/۹۸ [3] القرآن ۲/۹۸

اگرچہ لکھتے نہ تھے مگر کتاب سے پڑھتے تھے اور یہ غالباً آپؐ کے معجزات میں سے تھا۔"

امام رازی کی اس تحریر سے دو باتیں ثابت ہوئیں ایک تو یہ کہ تلاوت کتاب دیکھکر ہی پڑھنے کو کہتے ہیں اسی لئے عجمیوں کے پروپیگنڈہ سے جو امی کے غلط معنی عام طور سے مفسرین و محدثین میں مشہور ہیں اور یہ جو شہرت دی گئی ہے کہ رسول اللہ صلی للہ علیہ وسلم تادم وفات بالکل ان پڑھ ہی رہے اسکے مطابق ان کو اسکی تاویل کرنا پڑی کہ یہاں جو ایک امی کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ وہ پاک صحیفے تلاوت فرماتے تھے اس سے مراد یہ ہے کہ وہ صحیفوں میں لکھی ہوئی آیتوں کو بالکل تحریر کے مطابق زبانی پڑھتے تھے حالانکہ اگر یہ مراد ہوتی تو یتلو ایات اللہ فرمایا جاتا اصل تو آیات اللہ ہیں نہ کہ صحیفے صحیفوں میں جو پاکی و بزرگی آئی ہے وہ تو آیات ہی کی وجہ سے کوئی ضرورت صحیفوں کے ذکر کی نہ تھی۔ یہاں صحیفوں کا ذکر صرف اسی لئے ہے کہ یہ بتا دیا جائے کہ آپؐ صحیفوں کو دیکھ کر ایک پڑھے ہوئے آدمی کی طرح پڑھتے تھے۔ اگر یہ معنی مراد نہیں ہیں تو یہاں صحیفوں کا ذکر بالکل بے سود ہے مگر عام شہرت کی وجہ سے امام رازی کو تاویل کرنا ہی پڑی لیکن اس تاویل کی رکاکت خود انھیں محسوس ہوئی اور ایک سند جوان کو جعفر صادقؒ کی کتاب کی مل گئی اسکو لکھ ہی دیا کہ اس کتاب میں یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم لکھنا تو نہیں جانتے تھے مگر پڑھنا جانتے تھے اور یہ قول بالکل قرآن کی اس آیت کے مطابق ہے کہ و ماکنت تتلو امن قبلہ من کتاب و لا تخطہ بیمینک اذا لا رتاب المبطلون ۵ اور تم اس کتاب کے نزول سے پہلے کوئی کتاب پڑھ نہیں سکتے تھے اور نہ تم لکھتے ہو۔ اگر تم پہلے سے لکھے پڑھے ہوتے تو باطل پرست لوگ اور بھی شک و شبہ میں پڑتے (۲۹/۴۸) اور امی کے

لفظ کے صحیح معنی ہم اپنے ایک مقالہ میں لکھ چکے ہیں[1] پھر یہاں لکھدیتے ہیں کہ قرآن کی اصطلاح میں مسلمانوں کے علاوہ دو جماعتیں تھیں ایک تو اہل کتاب جن کے پاس کوئی ایسی کتاب تھی جس کو قرآن نے کتاب اللہ تسلیم کیا ہے یا کم سے کم وہ خود کوئی کتاب اپنے دینی استناد کیلئے رکھتے ہیں ۔ دوسرے وہ لوگ جن کے پاس کوئی کتاب ہی نہیں ہے وہ محض مادر زاد دین پر ہیں جو کچھ ماں باپ سے بچپن کے زمانے سے سنتے چلے آرہے ہیں بس اسی کو وہ اپنا دین و مذہب سمجھتے ہیں ۔ خود قرآن میں فرمایا ہے و منھم امیون لا یعلمون الکتب الا امانی اور ان کفار میں سے کچھ لوگ امی ہیں جو کتاب کو نہیں جانتے بجز من گھڑت توہمات کے (سورۃ بقرہ نمبر ۹ ۔ نمبر۱) اور فرمایا گیا قل للذین اوتوالکتاب والامیین اسلمتم جن لوگوں کو کتاب دی گئی ہے ان سے اور امیوں سے پوچھو کہ کیا تم لوگوں نے اسلام قبول کیا (آل عمران نمبر ۲۔ نمبر ۳) یہاں اہل کتاب کے بعد ان کے مقابلے میں امیوں کا ذکر کر کے اس کو صاف بتادیا کہ امی وہی لوگ تھے جو اہل کتاب نہ تھے اور یہ اصطلاح خاص قرآن کی نہیں ہے بلکہ اسلام سے پہلے اہل کتاب مشرکین مکہ بلکہ سارے بنی اسماعیل کو امی ہی کہا کرتے تھے چنانچہ قرآن ہی میں اہل کتاب کا قول نقل فرمایا گیا ہے کہ ذلک بانھم قالو الیس علینا فی الامیین سبیل (اہل کتاب بنی اسماعیل کے ساتھ بدمعاملگی کیا کرتے تھے، ان کی امانتیں غصب کر جاتے تھے خیانت کرتے تھے ۔ ایسا کیوں کرتے تھے اس کے متعلق فرمایا جاتا ہے کہ) یہ اسلئے کہ یہ لوگ کہتے تھے کہ ان امیوں کے بارے میں (اگر ہم ان کے ساتھ کچھ کریں تو) ہم پر کوئی الزام نہیں ہے (آل عمران نمبر ۳/۷۵ ، بہرحال قرآن مجید میں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یا بنی اسماعیل کو امی یا امیین کہا گیا ہے اس سے مراد ان

۱۔ یہ مقالہ اس کتاب کے آخر میں شامل کر دیا گیا ہے (طاہر)

پڑھ نہیں ہے، بلکہ وہی اہل کتاب کے مدمقابل یعنی غیر اہل کتاب کے معنی میں آیا ہے اس لقب کو عرب اور قریش تو فخر کے طور پر استعمال کرتے تھے یعنی ام القریٰ سے (مکہ مکرمہ) تعلق رکھنے والے کے معنی ہیں، اور مخالفین یہود وغیرہ اسے برے معنی میں میں جاہل وحشی کے طور پر استعمال کرتے تھے جیساکہ ان کی عادت تھی اور جیسے قرآن نے بھی راعنا کے تحت بیان فرمایا ہے میرا یہ دعویٰ مذکورہ بالا آیات اور اس قسم کی اور دوسری آیات وغیرہ سے پوری وضاحت کے ساتھ ثابت ہے (تفصیل کے لئے میرا مقالہ النبی الامی ملاحظہ ہو)۔

یہ امی کی بحث تو محض امام رازی کی عبارت کی وجہ سے سامنے آگئی اس کو اس موضوع بحث سے چنداں سروکار نہیں۔ اسی طرح تلاوت کی بحث بھی قرأت کے طفیل میں یہاں چھڑ گئی مجھ کو کہنا یہ تھا کہ جب "جمع" سے یہاں مراد صحیفوں میں قرآن کا جمع کرانا ہے تو یہاں پڑھنے سے بھی مراد صحیفے دیکھکر ہی پڑھنا ہے کہ ایک ان پڑھ سے کتاب کا پڑھوا دینا ضرور ایک ایسی اہم بات ہے جو اللہ تعالیٰ ہی کی ذمہ داری سے حاصل ہو سکتی ہے، ورنہ بغیر کتاب دیکھے صرف زبانی یاد کرکے پڑھنا تو کوئی ایسی اہم بات نہیں جس کی ذمہ داری کا اعلان قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرمایا جائے یہ کام تو ایسا ہے جس کو اس وقت کم عمر نابالغ صحابہؓ کر رہے تھے اور آج تک کرنے والے کر رہے ہیں کتنے نابینا حضرات زبانی سن سن کر ہی پورے قرآن کے حافظ ہوتے ہیں۔

بیان قرآن

"بیان" کے معنی ہیں توضیح کشف اور کسی بات کو اس طرح واضح طور پر کھول کے کہنا کہ سننے والا اسکے ہر پہلو کو پوری طرح سمجھ جائے۔ رسول اللہ صلی

اللہ علیہ وسلم پر قرآن مجید نازل ہوا تو اس کے متعلق تین خدمتیں آپ کو تفویض ہوئیں ۱۔ تبلیغ ۔ حکم ہوا کہ یا یھا الرسول بلغ ما انزل الیک اے رسول! جو کچھ تمہاری طرف نازل کیا گیا ہے تم اس کو لوگوں تک پہنچا دو (مائدہ ۱۰)
۲ ۔ تعلیم ۔ لقد من اللّٰہ علی المؤ منین اذ بعث فیھم رسو لا من انفسہم یتلو اعلیھم اٰیٰتہٖ و یزکیھم و یعلمھم الکتٰب و الحکمہ اللہ نے مومنین پر بڑا احسان کیا جو انہی میں سے ایک رسول ان کی طرف بھیجدیا کہ ان کو اللہ کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتے رہیں اور ان کو (کفر و شرک و گمراہی کی ناپاکیوں سے) پاک کر دیں اور انھیں کتاب اللہ اور حکمت کی تعلیم کریں ۔ (آل عمران ۳/۱۶۴) تبین ۔ و انزلنا الیک الذکر لتبین للناس مانزل الیھم ور ہم نے اس نصیحت کی کتاب کو تمہاری طرف اسلئے اتارا ہے تاکہ لوگوں کی ؎رف جو کچھ اتارا گیا ہے اس کو تم لوگوں کیلئے کھول کر بیان کر دو ۔ (نحل ۱۶-۴۴)

یہ تین خدمتیں بظاہر تین معلوم ہوتی ہیں کیونکہ تبلیغ عام ہے اس لئے کہ پہنچا دینے والا صرف پہنچا دینے کا ذمہ دار ہے چاہے جس کے پاس اللہ کی کتاب پہنچائی گئی ہو اس کو سمجھ سکے یا نہ سمجھ سکے اسی لئے بعض لوگوں نے ماعلی لرسول الا البلٰغ رسول کے ذمے پہنچا دینے کے سوا کچھ نہیں (مائدہ ۹۹) سے دھوکا کھایا اور سمجھے کہ سمجھنا یا نہ سمجھنا امت کا کام ہے رسول اللہ نے اللہ کا پیغام پہنچا دیا اور وہ اپنے فرض سے سبکدوش ہوگئے ۔ لوگ اسکو سمجھیں یا نہ سمجھیں ۔ حالانکہ یہ مطلب نہیں ہے ۔ دوسری جگہ بلکہ تقریباً دوسری تمام جگہوں میں البلٰغ المبین ہے یعنی وضاحت کے ساتھ سمجھاتے ہوئے آیات الہیٰ کو امت تک پہنچا دینا دیکھئے سورۃ نحل ع ۵ ۔ ۱۱ اور سورۃ مائدہ ۱۲ و نور ۷ و عنکبوت ۲ و یٰسٓ ۲ و تغابن ۲ غرض صرف الفاظ کا پہنچا دینا بلاغ نہیں ہے بلکہ آیات الہیٰ کو اس طرح پہنچا دینا بلاغ ہے کہ جن کے پاس یہ آیتیں پہنچائی

جائیں ان کو ان آیتوں کا پورا مفہوم بھی سمجھا دیا جائے کیونکہ اصل مقصود مفہوم کا پہنچانا ہے نہ کہ صرف الفاظ کا اور یہ جو حصر کے ساتھ فرمایا گیا کہ رسولؐ کے ذمے پہنچا دینے کے سوا کچھ نہیں" اس حصر کے معنی یہ ہیں کہ رسولؐ کے ذمے صرف آیات الہٰی کے الفاظ و معانی کو پہنچا دینا ہے لوگوں سے منوا دینا یا لوگوں کو تسلیم کرا دینا نہیں ہے کوئی مانے یا نہ مانے، رسولؐ اس کے ذمہ دار نہیں۔ یہ مطلب ہے اس حصر کا جو الا البلٰغ او رالا البلاغ المبین میں ہے۔ یہ کھول کر بیان کر دینا کیا ہے" یہ وہ چیز ہے جسے قرآن کریم نے دوسری جگہ اسوہ حسنہ ۳۳۔۲۱ کہا ہے یعنی عملی نمونہ۔ تاکہ کسی کو یہ کہنے کا موقعہ نہ رہے کہ اللہ کی یہ ہدایات تو بہت مشکل ہیں، قابل عمل نہیں ہیں اسلئے ہر نبی اپنے اوپر نازل ہ وحی کو لوگوں تک پہونچانے کے ساتھ ساتھ اس پر سب سے پہلا عامل بھی ہوتا ہے (انا اول المسلمین ۶۔۱۶۳) ان اتبع الا مایو حیٰ الیَّ الیٰ اخاف ان عصیت ربی عذاب یوم عظیم (۱۰۔۱۵) --- اسکے علاوہ مخاطب (جس کے سامنے تبلیغ کی جارہی ہے) کے مزاج اور ماحول کو دیکھ کر، اس کے فہم کے مطابق اسے سمجھانا جسے ادع الی سبیل ربک بالحکمۃ و الموعظۃ الحسنۃ ١٦۔١٢٥ میں بتایا گیا ہے، یہ بھی تبیین ہے۔ اسکی مزید توضیح آگے آتی ہے۔

اتنی تفصیل سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ تبلیغ و تعلیم و تبیین درحقیقت ایک ہی بات کی تین نوعیتیں ہیں۔ بغیر تبیین کے تعلیم ناقص ہے اور بغیر تعلیم کے تبلیغ نامکمل۔ اس لئے مکمل تبلیغ وہی ہے جو تعلیم و تبیین کے ساتھ ہو۔

رسولؐ کی تعلیم مختلف نہیں ہوسکتی

تبیین کا ایک مقصد اور بھی اسی سورۃ نحل کے آٹھویں رکوع میں بیان فرمایا گیا ہے و ما انزلنا علیک الکتاب الا لتبین لھم الذی ختلفوا فیہ و ھدی و رحمۃ لقوم یومنون[۱۶/۲۴]، اور ہم نے اس کتاب کو اسی لئے تم پر اتارا ہے کہ جو لوگ دینی باتوں میں اختلاف رکھتے ہیں تم اس کتاب کے ذریعے ان کے دینی اختلاف کا فیصلہ واضح طور سے ان کے سامنے بیان کردو اور یہ کتاب ایمان رکھنے والی قوم کے لئے وثیقہ ہدایت اور وسیلہ رحمت ثابت ہو۔ اس آیت سے صاف ثابت ہو رہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کتاب اللہ کی جو تبیین بھی فرمائیں گے قولی ہو یا عملی وہ مختلف نہیں ہوسکتی کیونکہ آپ کی تبیین کتاب اللہ اختلاف مٹانے کے لئے تھی نہ کہ اختلاف پیدا کرنے کیلئے۔ اسلئے کسی ایک حکم کی تعمیل کے جو مختلف طریقے حدیثوں میں ملتے ہیں ان میں سے وہی ایک طریقہ اور وہی ایک حدیث صحیح ہے جو قرآن سے قریب تر ہو، اور باقی سب غلط۔ چاہے ان باقی کے راوی کیسے ہی ثقہ کیوں نہ ہوں، اور وہ صحاح ستہ کی متفق علیہ ہی حدیثیں کیوں نہ ہوں۔ اور وہ ایک حدیث جو قرآن سے قریب تر ہے، اسکا راوی کیسا ہی مجروح کیوں نہ ہو، اور وہ صحاح ستہ سے باہر ہی کی حدیث کیوں نہ ہو۔ کیونکہ مقصود قرآن، اور مطابقت قرآن ہے نہ کہ کوئی دوسری کتاب یا راوی۔ گوہر مقصود جہاں بھی ملے اسکو لے لینا چاہیئے اور اپنی جیب میں اگر کنکر پتھر ہوں تو ان کو پھینک ہی دینا مقتضائے عقل و دیانت ہے۔ نہ یہ کہ انھیں کنکر پتھر کو موتی کہہ کہہ کر اپنے کو دھوکا دینا ہی مقتضائے دیانت سمجھا جائے ع متاع نیک ہر دکاں کہ باد شد۔

خیر یہ تو ایک مضمون ضروری و مفید تھا اسلئے استطراداً اس جگہ زبان قلم

پر آگیا اور خارج از موضوع ہوتے ہوئے بھی یہاں داخل کتاب ہوگیا میں عرض کر رہا تھا "بیان قرآن" کو گذشتہ تصریحات میں میں عرض کر چکا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمے قرآن سے متعلق تین خدمتیں تھیں۔ تبلیغ، تعلیم اور تبیین اور یہ بھی عرض کر چکا ہوں کہ تبیین کے بغیر تعلیم ناقص ہے اور تعلیم کے بغیر تبلیغ نامکمل تو اصل چیز تبیین ہی ٹھہری اور اسی لئے تبلیغ و تعلیم سے یہ زیادہ اہم اور زیادہ مشکل ہے کیونکہ ہوسکتا ہے کہ تبلیغ و تعلیم کے بعد بھی کسی کی تشفی نہ ہو مگر ایسا نہیں ہوسکتا کہ تبیین کے بعد بھی اس کی تشفی نہ ہو تبیین کے بعد بھی انکار وہی کریگا جو ہٹ دھرم ہو۔ سچا آدمی جو سچی بات کو مان لینے کا خوگر ہے وہ ہوسکتا ہے کہ صرف تبلیغ یا تعلیم کے بعد بھی کسی شک و شبہ میں رہ جائے مگر تبیین کے اعتراض کی کوئی وجہ ہی نہیں رہتی تبیین بغیر بیان کے نہیں ہوسکتی بیان کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے لے لی تو پھر رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے تبیین آسان بھی ہوگئی اور اسکی صحت بھی قطعی ہوگئی کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر تبیین جو کسی آیت کے متعلق ہو بیان الہٰی کے ماتحت ہے اس لئے اس میں غلطی اور بھول چوک کا احتمال بھی نہیں ہوسکتا۔

تبلیغ و تعلیم کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے نہیں لیا، اس لئے کہ یہ دونوں ہلکے کام تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بطور خود اپنی فراست نبویہ سے باحسن وجوہ تبلیغ و تعلیم کے فرائض انجام دے سکتے تھے مگر تبیین کا فرض انجام دینے میں تائید الہٰی کی ضرورت تھی اس لئے صرف تبیین کے موقع پر بیان کی ذمہ داری اللہ نے لیکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مطمئن کر دیا۔ ان الینا بیانہ کے یہ معنی نہیں ہیں کہ رسول تو تبیین کرینگے اور اللہ تعالیٰ بیان فرمائیگا، اس معنی میں جس معنی میں اردو فارسی زبان والے "بیان" کا لفظ بولتے ہیں یا عربی میں

بھی بولا جاتا ہے تبیین بھی رسولؐ ہی کی زبان سے اور بیان بھی رسولؐ ہی کی زبان سے، مگر تبیین کے وقت قوت بیانیہ عطا کرنا اور اس تبیین میں بیانی کیفیت یعنی توضیح و کشف کی صفت پیدا کر دینا اور ان باتوں کو جو تبیین کے وقت بیان فرمائی جائیں، سننے والوں کے دل میں اتار دینا یہ اللہ کے کام ہیں اور وہ یہ باتیں ہیں جو تبیین کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک قلب مبارک اور زبان مبارک سے اور پھر سننے والوں کے دل و دماغ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیدا کر دی جاتی تھیں، تو یوں سمجھئے کہ تبیین کا حاصل مصدر بیان ہے اصل فعل یعنی تبیین جب رسولؐ اللہ کرتے تھے تو اسکا حاصل مصدر جو تبیین سے پیدا ہوتا تھا اسکو اللہ تعالیٰ پیدا کر دیتا تھا۔

تو پہلا بیان قرآن تو وہ ہوا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تبیین قرآن کے سلسلے میں بتائید الٰہی آپؐ کی زبان مبارک سے ہوتا رہا اس کے بعد اللہ کا یہ وعدہ ہر اس سچے متقی مسلمان کے ساتھ پورا اترتا رہا جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تبیین قرآنی کو شمع ہدایت بنا کر فرقہ بندیوں اور اتباع نفس سے بالکل کنارہ کش ہو کر دیانت داری کے ساتھ تدبر فی القرآن کیا اور تبیین قرآن کا فرض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نیابت میں انجام دینے لگا، اس دوسرے بیان قرآن کا سلسلہ عہد صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین سے آجتک جاری ہے اور قیامت تک جاری رہیگا سنائی نے کیا خوب کہا ہے۔

عروس معنی قرآں نقاب آنگہ براندازد
کہ خلوت خانہ دل را مجرد سازی از غوغا

جب تدبر فی القرآن کرنیوالے کا دل فرقہ پرستی و اسلاف پرستی اور اتباع نفس و اتباع ہوا کے غوغا سے خالی ہو اور اسکے پاس تدبر فی القرآن کا سامان بھی ہو، یعنی وہ عربی زبان اصول ادب سے کافی واقفیت رکھتا ہو اور پھر وہ اللہ

پر اور قیامت کی باز پرس و ثواب و عذاب آخرت پر ایمان بھی رکھتا ہو اس کے دل میں اللہ کے عذاب اور قیامت کے محاسبے کا سچا ڈر بھی واقعی موجود ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ اسکے لئے ثم ان علینا بیانہ ۷۵ ۱۹ کا وعدہ پورا نہ ہو۔

جمع قرآن کا وعدہ قرأت و اقراء قرآن کا وعدہ اور پھر بیان قرآن کا وعدہ یہ تینوں وعدے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے مبارک زمانے میں آپؐ ہی کی ذات مبارک سے اور آپؐ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کے ذریعے پورے کرا دیئے گئے اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے بعد سے برابر پورے ہوتے چلے آرہے ہیں، اور قیامت تک پورے ہوتے رہیں گے۔ یہ اللہ کے وعدے ہیں اور اللہ کے وعدے جھوٹے نہیں ہو سکتے۔

قرآن مجید کی ایک سو چودہ سورتوں میں سے ہر سورۃ کی آیتیں، ہر سورۃ کے کلمات یعنی الفاظ، ہر سورۃ کے حروف، ہر سورۃ کے اعراب یعنی زبر، زیر، پیش، جزم اور نقطے تک گن لئے گئے جسکی تصریح و تفصیل پر متعدد کتابیں اہل توفیق نے لکھی ہیں۔ اسکی طویل بحث سے قطع نظر کرکے مختصر سی تفصیل ناظرین کے استفادے کے خیال سے یہاں لکھدیتا ہوں۔

سورتیں	۱۱۴	فتحے (زبر)	۳۵۲۴۳
مدات	۱۷۷۱	معانقے	۴۴
آیتیں	۶۶۶۶	ضمے (پیش)	۸۸۰۴
نقطے	۱۰۵۶۸۴	رکوع	۵۵۲
کلمات یعنی الفاظ	۸۶۴۳	کسری (زیر)	۳۹۵۸۲
سجدے (متفق علیہ)	۱۴	تشدیدات	۱۲۵۳
حروف	۳۲۰۳۶۷۰	(سورتوں کی حساب سے)	

اجزا یعنی پاروں کی تقسیم بہت بعد کی ہے، جو غالباً کاتبوں اور حافظوں کی سہولت کے لئے کی گئی ہے، اور رکوعوں کی تقسیم اس سے پہلے کی ہے تاکہ مفہوم سمجھنے والوں کو سہولت رہے اسلئے رکوعوں کا حساب سورتوں ہی کے اعتبار سے صحیح تھا مگر بعد کو لوگوں نے پاروں کے حساب سے بھی رکوعوں کی گنتی قائم کی تو پھر دونوں حسابوں میں فرق ہوگیا یعنی پاروں کے حساب سے ۱۵۵۷ رکوع ہوتے ہیں اسکی وجہ یہ ہوئی کہ کتنے پارے درمیان رکوع (بحساب سورۃ) کے ختم ہوتے ہیں تو وہ رکوع باعتبار اپنے نصف اول کے تو سابق پاروں میں پڑتا ہے اور نصف آخر کے بعد والے پارے میں تو اس رکوع کا نصف اول تو سابق پارے کا رکوع گنا گیا اور نصف آخر بعد والے کا رکوع ۔ اس لئے سورۃ کا وہ ایک رکوع پارے میں دوبارہ ہوگیا اور دو بار گنا گیا اسی لئے سوروں کے اعتبار سے جو تعداد رکوعوں کی ہے اس سے ان رکوعوں کی تعداد بڑھ گئی جو اجزاء یعنی پاروں کے حساب سے تعداد قائم کی گئی ہے ۔

قرآن مجید کی سات منزلیں تو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے قائم فرمائی تھیں جو پہلے منزلیں نہیں کہی جاتی تھیں عہد نبویؐ و عہد صحابہؓ میں ان کو سات احزاب کہتے تھے جسکے حساب یاد رکھنے کیلئے علما نے فمی بشوق کا لفظ بنالیا ہے یعنی ف سے سورۃ فاتحہ جس سے پہلا حزب یعنی پہلی منزل شروع ہوتی ہے م سے سورۃ مائدہ جہاں سے دوسرا حزب یعنی دوسری منزل شروع ہوتی ہے ۔ ی سے سورۃ یونس ب سے سورۃ بنی اسرائیل ش سے سورۃ شعراء و سے سورۃ والصفت ق سے سورۃ قاف ۔

رسم خط

قرآنی رسم خط کی حفاظت بھی تمام لکھنے والوں نے پوری طرح ملحوظ رکھی

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے پہل جس آیت کو جس کاتب وحی سے لکھوایا اور اس کاتب وحی نے جس طرح لکھا جب اس کی نقل کی گئی تو پھر ہر نقل کرنیوالے نے بالکل اسی طرح لکھا جس طرح پہلے کاتب نے لکھا تھا۔ اس میں کسی قسم کا ردو بدل کسی نقل کرنے والے نے جائز نہ رکھا اور رسم خط کی حفاظت کا یہ سلسلہ عہد نبویؐ سے آج تک بالکل ایک طرح سے چلا آرہا ہے اسی لئے آپ جتنے مصاحف قدیمہ وجدیدہ کو دیکھیں گے یہاں تک کہ جب سے طباعت کی صنعت نکلی ہے اور قرآن مجید کی طباعت کا سلسلہ شروع ہوا ہے اس وقت سے جس مطبوعہ نسخہ کو بھی دیکھئے چاہے وہ مصر کا چھپا ہوا ہو یا عراق کا عرب کا مطبوعہ ہو یا ہندوستان کا کسی دو نسخوں میں رسم خط کا کوئی اختلاف نہ پا سکیں گے۔ مثلاً" صلوٰۃ" کا لفظ پورے قرآن میں ۶۷ جگہ ہے لیکن ۸ جگہوں کے سوا باقی ۵۹ جگہوں میں واؤ پر کھڑا زبر دیا جاتا ہے اور صرف آٹھ مقامات پر صاد کے بعد لام الف لکھتے ہیں جس قدیم سے قدیم اور جدید سے جدید قلمی یا مطبوعہ نسخے کو اٹھا کر دیکھئے آپ آٹھ جگہوں میں صلاۃ لام الف سے لکھا ہوا پائیں گے اور باقی ہر جگہ صلوٰۃ واؤ پر کھڑے زبر کے ساتھ دیکھیں گے۔ وہ آٹھ جگہیں حسب ذیل ہیں۔

(۱) سورۃ انعام، رکوع ۱۱۔ وهٰذا كتٰب انزلنٰه مبارك مصدق الذي بين يديه و لتنذرام القرىٰ و من حولها و الذين يو منو ن بالاخرة يو منو ن به و هم علىٰ صلاتهم يحافظون۔ ۹۳/۶ یہ وہ کتاب ہے جس کو ہم نے اتارا ہے برکت والی ہے اور جو کتابیں اسکے آگے (اتر چکی) ہیں انکی تصدیق کرنیوالی تاکہ تم مکے والوں کو اور مکے کے ارد گرد رہنے والوں کو (نتیجہ نافرمانی سے) ڈرا دو۔ اور جو لوگ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں وہ (ضرور) اس پر ایمان لے آئیں گے اور

اپنی نماز کی محافظت کرتے رہتے ہیں[5]۔

(۲) سورۃ انعام کا آخری رکوع ۲۰ قل ان صلاتی و نسکی و محیای و مماتی لله رب العلمین[6]۔ کہدو کہ میری نماز میری قربانی میری حیات اور میری موت سب اللہ رب العالمین کے لئے ہے۔ (ففدیہ من صیام او صدقہ او نسک[7] میں نسک کے معنی بالاتفاق ذبیحہ ہے جو اردو محاورے میں قربانی کہا جاتا ہے اسلئے میں نے یہاں نسک کا ترجمہ قربانی لکھا۔ بعض لوگوں نے نسک کا ترجمہ حج لکھا ہے چونکہ ارکان حج کو مناسک حج کہتے ہیں۔ بعض لوگ صرف "عبادت" ترجمہ لکھتے ہیں کیونکہ عابد اور عبادت گذار کو ناسک کہتے ہیں۔ مگر میں دیکھتا ہوں کہ نسک کا لفظ کہیں بھی حج یا عام عبادت کے معنی میں نظر نہیں آتا۔ جہاں بھی ملتا ہے "ذبیحہ" ہی کے معنی میں ہے اسلئے میں نے قربانی ترجمہ کیا۔ نسک و مناسک و ناسک سے میں اس وقت بحث نہیں کرتا اور نہ ان کے استعمال پر قیاس کرکے نسک کے مستعمل معنیٰ کو چھوڑ کر کوئی دوسرے معنی لینا صحیح سمجھتا۔ صلاہ کا تعلق زندگی کے ایک کام سے

۱۔ یہ واقعی بات ہے کہ جو شخص آخرت پر یعنی مرنے کے بعد ایک دوسری زندگی اور قیامت کی سزا و جزا پر یقین نہیں رکھتا قرآن پر کیوں ایمان لانے لگا؟ بلکہ وہ اللہ ہی کو کب مانیگا کہ اللہ کی کتاب اور اللہ کے رسول پر ایمان لائے مگر ایمان و یقین تو ایک قلبی چیز اور پوشیدہ بات ہے۔ زبان سے ایک منکر بھی کہہ سکتا ہے کہ مجھ کو قیامت کی باز پرس اور سزا و جزا پر یقین کامل ہے۔ اس لئے آخرت کا ایک عملی ثبوت بھی بتادیا کہ اور وہ لوگ اپنی نماز کی محافظت کرتے رہتے ہیں یعنی اگر ان کو دیکھو کہ وہ نماز کے پابند ہیں تو سمجھ لو کہ بیشک وہ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں اور اگر نماز بالکل نہیں پڑھتے تو سمجھ لو کہ آخرت پر ایمان ہی نہیں ہے اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ من ترک الصلوٰۃ متعمدا فقد کفر جس نے نماز قصداً ترک کردی تو سمجھ لو کہ اس نے کفر اختیار کیا۔ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو کفر و شرک سے محفوظ رکھے۔ آمین (تمنا)

[5] القرآن ۲/۱۹۶ [6] القرآن ۶/۱۶۳

ہے اور ذبیحہ کا تعلق ایک جانور کو اللہ کے نام پر اللہ کے حکم کے مطابق موت دینے سے ہے۔ اسلئے اس کے بعد محیای و مماتی کا ذکر گویا لف و نشر مرتب کی شان اور ادبی لطافت دکھارہا ہے۔ غرض معنوی و لفظی دونوں اعتبار سے یہاں نسک کا ترجمہ قربانی ہی صحیح ہے۔

(۳) سورۃ انفال رکوع ۴۔ وما کان صلاتھم عند البیت الا مکآء و تصدیہ[۱]۔ اور نہ رہی ان (مشرکین مکہ) کی نماز سوا خانہ کعبہ کے پاس سیٹی بجانے اور تالیاں پیٹنے کے۔

(۴) سورۃ بنی اسرائیل رکوع ۱۲۔ و لا تجھر بصلاتک و لا تخافت بھا و ابتغ بین ذلک سبیلا۔ تم اپنی نماز کو نہ بلند آواز سے پڑھو نہ اس کو آہستہ آواز سے پڑھو ان دونوں کے درمیان ایک راہ اختیار کرلو (یعنی اوسط درجے سے پڑھنے کی نکال لو)

(۵) سورۃ مومنون رکوع اول آیت دوم الذین ھم فی صلاتھم خاشعون۔ ان مومنین نے فلاح پائی جو اپنی نماز میں خشوع و خضوع رکھتے ہیں۔

---

[۱] القرآن ۸ / ۳۵ [۲] القرآن ۱۷/ ۱۱۰

۴۔ میں جہاں تک سمجھتا ہوں اس آیت اور اس حکم کا تعلق نماز تہجد سے ہے صلاتک کی اضافت صاف بتارہی ہے کیونکہ تہجد کی نماز کو نافلۃ لک فرمایا گیا ہے یعنی یہ ایک فاضل فرض خاص تم پر ہے۔ چونکہ اس نماز میں دوسروں کو قرآن سنانا مقصود نہیں اسلئے باواز بلند پڑھنے کی کیا ضرورت، قریب پاس کے لوگ بھی آواز سن کر چلے آئیں گے ان کا دل شوق عبادت سے مجبور ہوگا مگر وہ اسکو برداشت نہ کرسکیں گے جیسا کہ سورہ مزمل میں مذکور ہے اگر یہ حکم عام نمازوں کیلئے ہوتا تو بالصلوۃ بلکہ بالصلوات کہا جاتا۔ صلاۃ کا واحد لفظ لانا اور پھر اسکو خاص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرنا اسکی دلیل ہے کہ یہ وہی نماز ہے جو آپ پر مخصوص طور سے فرض تھی۔ رسم خط اسی لئے بدل گئی کہ صیغہ جمع نہ سمجھا جائے کیونکہ اگر صیغہ جمع سمجھا جاتا تو لوگ پنجگانہ نمازیں ہی سمجھتے اور مخصوص تھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خاص نماز غرض رسم خط بدل کر صیغہ احد کو معین اور حتمی کردینا بتارہا ہے کہ یہاں تہجد ہی کی نماز مقصود ہے۔

(٦) سورۃ نور۔ رکوع ٦ ۔ کل قدعلم صلاتہ و تسبیحہ (جو کچھ آسمان وزمین میں ہے یہاں تک کہ پرندے بھی جو صف باندھ کر اڑتے ہیں) سب اپنی نماز اور اپنی تسبیح جانتے ہیں، (اس کی مفصل بحث میری فارسی مثنوی معاش و معاد میں بڑی تفصیل کے ساتھ موجود ہے۔)

(۷) الذین ھم علی صلاتھم دائمون۔ (سورۃ معارج رکوع اول) (وہ نمازی ان برائیوں میں مبتلا نہیں ہیں جن کا ذکر اوپر کی آیتوں میں فرمایا گیا ہے اور وہ نمازی کیسے ہیں؟) وہ ایسے لوگ ہیں جو اپنی نماز پر ہمیشگی رکھنے والے ہیں۔ یعنی برابر نماز پڑھا کرتے ہیں۔ کبھی نماز چھوڑتے نہیں۔

(۸) سورۃ ماعون رکوع اول - الذین ھم عن صلاتھم ساھون۔ افسوس ہے ان نمازیوں کے حال پر جو اپنی نماز سے بے خبر رہتے ہیں۔ یعنی نماز تو پڑھ لیتے ہیں مگر بے وقت، وقت کی پابندی کا خیال نہیں کرتے۔

رسم خط بدلنے کی وجہ

اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ ٦٧ جگہوں میں سے ۵۹ جگہوں پر تو وحی کے لکھنے والوں نے صلوۃ یہ سمجھکر واؤ سے لکھا کہ پڑھنے والے یہاں پر کھڑا زبر سمجھیں گے یا اس واؤ کو الف ہی پڑھیں گے۔ واؤ کا تلفظ کبھی ادا نہ کریں گے۔ مگر ان آٹھ جگہوں پر جو واؤ سے نہ لکھا اور لام الف سے لکھا تو یہ ان کی بھول چوک تھی، یا بلا ارادہ اس طرح قلم سے نکل گیا، یا جیساکہ بعض لوگ کہدیا کرتے ہیں کہ بعض قبائل کا رسم خط بعض دوسروں سے مختلف تھا اور مختلف قبیلوں کے کاتب تھے، ہر کاتب نے اپنے قبیلے کی رسم خط کے مطابق لکھا، اسوجہ سے رسم خط کا اختلاف پیدا ہوگیا۔ اس طرح کے اختلاف رسم خط کو کاتبین وحی کی غلطی یا بھول چوک یا ناواقفیت قرار دینا تو بہت بڑی گستاخی ہے

جن کی توثیق و تعریف قرآن میں موجود ہے جنکو سفرہ یعنی ماہرین فن کتابت و املا و انشاء اور کرام بررۃ ہمچشموں میں بزرگ اور اللہ کے نزدیک نیک کار فرمایا گیا۔ ان کی شان بلند میں ایسے خیالات ہنایت افسوسناک جرأت ہے۔
باقی قبائل کے اختلاف رسم خط کا فرق، تو سوچنا یہ ہے کہ ان آٹھ مقاموں میں سے چھ مقام مکی سورتوں میں ہیں اور دو مقام مدنی سورتوں میں ۔ یعنی سورۃ انفال اور سورۃ نور تو مدنی ہیں باقی پانچ سورتیں انعام، بنی اسرائیل، مومنون، معارج اور ماعون یہ سب مکی ہیں اور مکے میں کاتبین وحی صرف قریشی ہی تھے کسی اور قبیلے کے نہ تھے اور مدنی کاتبین بھی وہی تھے جنھوں نے قریشیوں ہی سے کتابت سیکھی تھی یا قریشی ہی رسم خط کے خوگر تھے پھر انھیں سورتوں میں اور دوسری جگہ بھی صلوٰۃ کا لفظ واؤ سے لکھا ہوا ملتا ہے کوئی وجہ ہنیں کہ جو پورے سورۃ میں بلکہ ہر جگہ تو صلوٰۃ کا لفظ واؤ سے لکھے وہی صرف ایک جگہ لام الف سے لکھدے ۔ صرف سورۃ انعام ہی ہے جس میں دو جگہ صلاۃ لام الف سے ہے باقی ان تمام سورتوں میں صرف ایک ایک جگہ ہے حالانکہ ان ہی سورتوں میں واؤ سے صلوۃ کا لفظ کئی جگہ موجود ہے سورۃ انعام کا نواں رکوع، انفال کا پہلا رکوع، بنی اسرائیل کا نواں رکوع اور سورۃ نور کا آٹھواں رکوع ملاحظہ کیا جائے ۔ آخر کوئی وجہ ہی ہے کہ کاتبین وحی جو ماہرین فن کتابت و املا و انشا اور عند الناس کرام اور عند اللہ بررۃ (نیک کار) تھے انھوں نے ایک ہی سورۃ میں ایک جگہ تو صلوٰۃ واؤ سے لکھا اور دوسرے جگہ لام الف سے ۔ رضی اللہ عنہم اجمعین یہ تفریق بلا وجہ ہنیں ہوسکتی۔

کاتبانِ وحی کی مہارت فن

میں نے اپنی کتاب "جمع قرآن" میں اس موضوع پر پوری بحث کی ہے مگر یہاں صرف کتاب النثرالفنی مصنفہ ڈاکٹرز کی مبارک المصری جلد اول ۵۶ کی ایک عبارت میں نقل کرتا ہوں جس سے کاتبین وحی کی حذاقت و مہارت فن کا ثبوت ملے گا وہ لکھتے ہیں: و کذلک یری ابن فارس ان معرفتالقد ماء من الصحابه مکتابه المصحف علی النحو الذی یعلله التحویون فی ذوات الواو و الیاء و الهمزة و المد و القصر تدک علی فهمهم لا صول اللغته و تو اعه الکتابه یعنی مصنف نے جو باتیں اوپر لکھی ہیں کہ اہل عرب ماہر عربیت اور عالم فصاحت و بلاغت اور واقف اصول فن بدیع وانشاء وشعر تھے اور فن کتابت و انشاء میں کافی دستگاہ رکھتے تھے اسکے ثبوت میں وہ لکھتے ہیں کہ " اسی لئے ابن فارس اس کا یقین رکھتے ہیں کہ قدما صحابہؓ کی واقفیت کتابت مصحف میں اس طرح تھی جس طرح علم نحو کے علماء واؤ والے، ی والے، ہمزہ والے اور مدو قصر والے کلمات میں فرق وامتیاز رکھتے ہیں اور یہ بات اس پر دلالت کرتی ہے کہ وہ لوگ اصول لغت اور قواعد کتابت سے واقف تھے" ۔ غرض کاتبین وحی رضی اللہ عنہم اجمعین نے جو ہر جگہ صلوۃ واؤ سے لکھا اور ان آٹھ جگہوں میں لام الف سے تو یقیناً اس کی کوئی معقول وجہ ان کی دانست میں تھی ۔ بلاوجہ انھوں نے یہ تفریق ہنیں کی۔

واؤ اور لام الف کے فرق کی وجہ

اس فرق کو سمجھنے سے پہلے یہ دیکھئے کہ جہاں جہاں صلوٰۃ کا لفظ کسی ضمیر متصل کی طرف مضاف ہوئے بغیر آیا ہے ان تمام جگہوں میں واؤ کے ساتھ لکھا گیا ہے اور ان آٹھ جگہوں میں جو لام الف کے ساتھ لکھا گیا ہے یہ آٹھوں جگہیں ایسی ہیں جہاں یہ لفظ کسی ضمیر متصل کی طرف مضاف ضرور ہے۔ سورۃ انعام کے رکوع ۱۱ میں اور مومنون، معارج اور ماعون میں صلاتھم ہے اور انفال میں صلاتھم یعنی ان ۵ جگہوں میں ضمیر جمع مذکر غائب کی طرف مضاف ہے اور انعام کے رکوع ۲۰ میں یائے متکلم کی طرف مصاف ہے اور بنی اسرائیل میں ضمیر واحد مذکر حاضر کی طرف۔ اور سورۃ نور میں ضمیر واحد مذکر غائب کی طرف مضاف آیا ہے۔ اور آپ یہ جانتے ہیں کہ عربی زبان میں مضاف الیہ کی ضمیر بلکہ ہر ضمیر مجرور متصل ہی ہوتی ہے منفصل نہیں آتی۔ تو اس اتصال ضمائر کی وجہ سے ان آٹھ جگہوں میں صلوۃ کا لفظ لام الف سے نہیں لکھا جاتا واؤ ہی سے لکھا جاتا تو اس طرح لکھا جاتا **صلوتھم صلوتی صلوتک اور صلوتہ** تو کیا صلوٰۃ کو صیغہ جمع سمجھکر پڑھنے والے ان کو **صلوتھم صلوتی صلوتک اور صلوتہ** نہیں پڑھ سکتے تھے معنوی اعتبار سے ان تمام جگہوں میں صیغہ جمع بھی بخوبی کھپ سکتا ہے مگر ادبی بلاغت مقتضی اسی کی ہے کہ یہاں واحد کا صیغہ بحیثیت اسم جنس کے ہی لایا جائے تاکہ قلیل وکثیر دونوں پر دلالت کر سکے مگر ایسی باریک ادبی لطافت کو ہر پڑھنے والا نہیں سمجھ سکتا۔ خصوصاً غیر عرب۔ اور قرآن مجید سارے عالم کیلئے آیا ہے اس کے پڑھنے والے عربی و عجمی سب ہوں گے اسلئے کاتبین وحی رضی اللہ عنہم اجمعین نے ان آٹھ جگہوں میں جہاں صیغہ واحد کا صیغہ جمع سے التباس کا خطرہ تھا

وہاں صلوٰۃ کے لفظ کو واوٴ سے نہیں لکھا بلکہ لام الف سے لکھ کر ان جگہوں میں لفظ صلوٰۃ کے بصیغہ واحد ہونے کو قطعی و غیر مشتبہ بنا دیا۔ اس کو کہتے ہیں مہارت فن کتابت و املا اور اس کا نام ہے سفارت۔ جبھی تو قرآن مبین میں ان کو کاتبین نہیں فرمایا گیا بلکہ سفرہ فرمایا گیا اور اس طرح اللہ تعالیٰ نے ان کی مہارت فن کتابت و املا و انشا کی سند عطا فرمادی۔ دیکھئے وہی سورۃ مومنون، جس کی دوسری آیت میں صلاتھم لام الف سے لکھا گیا ہے اسکی ساتویں آیت و الذین ھم علیٰ صلوٰتھم یحٰفظون اور وہ لوگ جو اپنی نمازوں کی محافظت کرتے رہتے ہیں۔ یہاں صلوٰت جمع کا صیغہ ہے اسلئے واوٴ سے لکھا تاکہ بصیغہ جمع ہی پڑھا جائے باوجود اس کے کہ یہاں بھی یہ لفظ ضمیر جمع مذکر غائب کی طرف مضاف ہے۔ غرض جہاں واحد و جمع کے التباس کا خطرہ نظر آیا وہاں صیغہ واحد لفظ صلوٰۃ کو لام الف سے لکھا اور صیغہ جمع لفظ صلوت کو واوٴ سے تحریر کیا اور جہاں لفظاً و تحریراً یا معنیً التباس کا خطرہ نہیں نظر آیا وہاں ہر جگہ صیغہ واحد کو بھی واوٴ سے لکھا اور صیغہ جمع کو بھی۔ کیونکہ بغیر ضمیر سے ملائے الگ لکھیں گے تو صیغہ واحد کو گول ۃ سے لکھیں گے اور صیغہ جمع کو لمبی ت سے یعنی واحد صلوٰۃ ہے اور جمع صلوٰات اسلئے الگ لکھنے میں التباس کا کوئی خطرہ ہی نہیں ہے۔ البتہ ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ سورۃ انعام کے رکوع ۱۱ میں ہے و ھم علیٰ صلوٰتِھم یحٰافظون میں کون سی وجہ ہے کہ وہاں صیغہ واحد ہی ادبی بلاغت کے اعتبار سے مناسب ہے کہ وہاں لام الف سے صلاتھم لایا گیا اور یہاں سورۃ مومنون کی ساتویں آیت میں صیغہ جمع ہی مناسب ہے کہ صلوٰتھم بصیغہ جمع آیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جہاں کلام میں معنوی خوبیاں پیدا کرنا ایک بلیغ متکلم کے لئے ضروری ہے وہاں سلسلہ کلام میں تکرار لفظ سے بچنا بھی اس کیلئے ضروری ہے کیونکہ کلام کے بلیغ ہونے کیلئے

اس کلام کے کلمات یعنی مفرد الفاظ کی فصاحت شرط لازمی ہے اور فصاحت کی ایک شرط لازمی یہ بھی ہے کہ اس عبارت کے کلمات میں تنافر نہ ہو اور بلاغت کی شرط لازمی ہے کہ ترکیب کلمات میں بھی تنافر نہ ہو۔ اور جو لفظ اسی سلسلہ عبارت میں ایک بار بولا جاچکا پھر دوبارہ چند ہی جملوں کے بعد اس کا اعادہ اسی طرح ضرور باعث تنافر ہے اور سورۃ مومنون کی دوسری آیت الذین هم فی صلاتهم خاشعون میں صلاتهم کا لفظ آچکا تھا۔ اور پھر چار ہی جملوں کے بعد والذین هم علیٰ صَلوٰتِهِمْ یحافظون اگر کہا جاتا تو دونوں جملوں کا عنوان بیان بھی اور صلاتھم کا لفظ بھی مکرر لایا جاتا تو کتنا برا معلوم ہوتا اس لئے دوسری جگہ یعنی ساتویں آیت میں صلاتھم بصیغہ واحد نہیں لایا گیا بلکہ تکرار سے بچنے کے لئے بصیغہ جمع لایا گیا اور کلام کو فصاحت و بلاغت کے پائے سے گرنے سے بچالیا گیا، باقی رہی وہ معنوی خوبی جو صیغہ واحد اسم جنس میں تھی کہ اس کی دلالت قلیل و کثیر سب پر ہوتی ہے ایک نماز اور ایک سے زیادہ نمازیں بھی صلوۃ صیغہ واحد سے سمجھی جاسکتی ہیں مگر صیغہ جمع سے ایک ہی نہیں بلکہ دو سے بھی زیادہ ہی نمازیں سمجھی جائیں گی اور مطلب یہ ہوگا کہ زیادہ نمازوں کی حفاظت کرنی چاہیئے۔ دو یا دو سے کم نماز کی حفاظت کا حکم نہیں ہے، تو ایسا نہیں ہے۔ کیونکہ بصورت اضافت صیغہ جمع بھی کبھی اسم جنس کے معنی میں آکر قلیل و کثیر سب پر دلالت کرتا ہے جیسے مانکحم اباؤ کم و ابناؤ کم میں اگرچہ اباء اور ابناء جمع کے صیغے ہیں مگر اسم جنس کے معنی میں ہیں اور اباء سے باپ دادا پردادا سب اور ان میں سے کوئی ایک بھی مراد ہے اسی طرح ابناء سے بیٹا پوتا پرپوتا سب اور ان میں سے کوئی ایک بھی سمجھا جائیگا یہ نہیں کہا جاسکتا کہ چونکہ کم کی ضمیر جمع متکلم کے سارے مسلمان مخاطب ہیں اس لئے آباء اور ابناء جمع کے صیغے آئے ورنہ کسی مسلمان کے باپ یا بیٹے

کی منکوحہ مطلقہ یا بیوہ سے کسی دوسرے مسلمان کا نکاح بھی جائز نہ ہونا چاہیئے یہاں اگرچہ سارے مسلمانوں سے فرمایا جارہا ہے مگر فرداً فرداً ہر شخص کو گویا الگ الگ حکم ہے۔ یہ ایک بہت باریک ادبی نکتہ ہے اس کو غور سے سمجھنا اور یادرکھنا چاہیئے۔

مگر ایک سوال پھر بھی پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ سورۃ توبہ رکوع ۱۳ میں ہے ان صلوتک سکن لھم - اور سورۃ ہود رکوع ۸ - میں ہے یٰشعیب اصلوٰتک تامرک ان نترک مایعبد اباؤ نا آلایہ - ان دونوں جگہ صلوٰۃ کا لفظ ضمیر متصل واحد مذکر حاضر کی طرف ہی مضاف آیا ہے جس طرح بنی اسرائیل کے رکوع ۱۲ - میں بصلاتک ہے مگر ان دونوں جگہوں میں بصلاتک کی طرح صلوٰۃ کو الف لام سے نہیں لکھا اس کی کیا وجہ ہے؟ - اس کا جواب یہ ہے یہ دونوں جگہیں ایسی ہیں جہاں التباس کا مطلقاً خطرہ ہی نہیں - یہاں پر وہ شخص جو عربی زبان جانتا ہے صیغہ واحد بمعنی اسم جنس ہی پڑھیگا اور کبھی بصیغہ جمع نہیں پڑھ سکتا - اگر بصیغہ جمع کوئی پڑھیگا تو معنی یہ ہوں گے کہ زیادہ نمازیں تمہاری ان کیلئے باعث تسکین ہیں یعنی ایک دو نماز نہیں - اسی طرح حضرت شعیبؑ سے ان کی قوم نے ان کی متعدد نمازوں کے بارے میں کہا کہ تمہاری دو ایک نماز نہیں متعدد نمازیں تمہیں حکم دیتی ہیں کہ ہمیں اس پر مجبور کرو کہ ہم اپنے ان معبودوں کی پرستش ترک کردیں جنکی پرستش ہمارے باپ دادا کرتے رہے اور یہ کسقدر غلط معنی ہوں گے - تو چونکہ ان جگہوں میں صیغہ واحد کا صیغہ جمع سے التباس کا مطلق خوف نہ تھا اس لئے ان دونوں جگہوں میں باوجود مضاف بسوئے ضمیر ہونے کے صلوٰۃ کو اس کی اصلی رسم خط سے لکھا اور جہاں التباس کا ڈر تھا وہاں لام الف سے لکھا - مضاف بسوئے ضمیر متصل ہونا ہی صرف رسم خط بدلنے کی وجہ نہیں ہے بلکہ خوف التباس اسکی اصلی وجہ ہے۔

قرآنی رسم خط

قرآن مجید میں جہاں کہیں بھی متعارف رسم خط سے اختلاف کیا گیا ہے یقیناً اسکی کوئی نہ کوئی معقول وجہ ہے۔ یہ ایک اتنا بڑا طوالت طلب موضوع ہے کہ اگر اس پر پوری بحث کی جائے تو ایک ضخیم جلد خاص اس کے لئے چاہیئے۔ اس کتاب کی تکمیل کے بعد اگر اللہ تعالیٰ نے توفیق دی تو انشاء اللہ المستعان میں اس کے لئے بھی کمر ہمت باندھ لوں گا۔ واللہ ولی التوفیق۔

ضرورت وعدہ حفاظت

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کو نازل فرمایا اور پھر اس کی حفاظت کا بھی وعدہ فرمایا تو آخر اس وعدہ حفاظت کی ضرورت ہی کیا تھی؟ یہ ایک سوال پیدا ہوتا ہے۔

مگر اس کا جواب بھی صاف اور بالکل واضح ہے کہ اس سے قبل جتنی کتابیں جن جن رسولوں پر اتریں ان کی امتوں نے یا تو اس کتاب کو بالکل ضائع کر دیا جس طرح حضرت نوحؑ اور ان کے بعد انبیاء مرسلین کی کتابوں کا کہیں نام و نشان بھی نہیں۔ حضرت ابراہیمؑ کے صحیفوں کا ذکر قرآن مبین میں ہے ضرور مگر صحف ابراہیمؑ کا وجود کہیں باقی نہیں ہے۔ اور اگر بعض رسولوں کی کتاب انکی امت کے پاس موجود بھی ہے تو وہ اپنی اصلی حالت میں باقی نہیں، کمی و بیشی، تحریف و تصحیف ان میں اس طرح اور اسقدر کی گئی ہے کہ صحیح و غلط کی تمیز محال سی ہو گئی ہے۔ خود ان کتابوں پر ایمان رکھنے والوں کو ان کتابوں کے صحیح ہونے کا یقین نہیں جیسے تورات، زبور اور انجیل۔ کہ ان کتابوں کی تاریخ خود یہود و نصاریٰ کی لکھی ہوئی دیکھ لیجئے۔

جب تک نبیوں کے بھیجنے کا سلسلہ جاری تھا ایک کتاب کے مفقود یا ضائع یا رد و بدل ہونے کے بعد دوسری کتاب مانسخ من اٰیۃ او ننسھا نات بخیر منھا او مثلھا ۱۰۶/۲ کے مطابق (یعنی جب کبھی کوئی آیت[۱] ہم منسوخ کر دیتے ہیں یا اس کو ذہنوں سے بھلا دیتے ہیں تو دوسری آیت اس سے بہتر یا اس کے مانند (اسکی جگہ، اسکے بدلے) لے آتے ہیں۔ بقرہ ع ۱۳) برابر آتی رہی اور کسی کتاب کو بھی محفوظ رکھنے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ جب نبیوں کے بھیجنے کا سلسلہ ختم کر دینے کا ارادہ ہوگیا اور آخری نبی حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم بھیجے گئے اور ان پر آخری کتاب اتار دی گئی تو اس کتاب کو محفوظ رکھنا ضرور و لازمی تھا کیونکہ نہ اس کتاب کے بعد اب کوئی دوسری کتاب بھیجی جائیگی اور نہ حضرت

۱۔ یہاں آیۃ فرمایا گیا کتاب نہیں فرمایا گیا اسلئے کہ کوئی کتاب پوری کی پوری منسوخ نہیں ہوئی۔ در نہ پوری بھلائی گئی اور اسکے بعض احکام بعد کو بھی باقی رہی جیسے انجیل کے آنے کے بعد توریت و زبور کے بعض احکام اسی طرح اپنی جگہ پر رہے۔ آج تک آپ بائبل میں عہد نامہ قدیم و عہد نامہ جدید دیکھتے ہیں عیسائی تورات سے مستغنی نہیں ہوسکتے اسلئے وہ تورات بھی ضرور پڑھتے ہیں اور اسکے بعض غیر منسوخ احکام پر عمل کرتے ہیں۔ البتہ قرآن مجید نے ہمیں اگلی کتابوں سے مستغنی کر دیا ہے چونکہ یہ کتاب اگلی کتابوں کے تمام غیر منسوخ احکام پر خود ہی حاوی ہے اسلئے اس کتاب کو اگلی کتابوں کا مہیمن فرمایا گیا "مصدقا لما بین یدیہ من الکتب و مھیمنا علیہ" یعنی یہ کتاب اپنی اگلی کتابوں کی تصدیق کرنے والی ہے اور ان پر مہیمن یعنی نگہبان و حاوی ہے۔ بغیر حاوی ہوئے پوری نگہبانی نہیں ہوسکتی اسلئے نگہبانی میں حاوی ہونے کا مفہوم از خود موجود ہے اور نگہبانی اسلئے کہ کہاں اگلی کتابوں میں تحریف و رد و بدل ہوا ہے اس کا پتہ اسی کتاب سے مل سکتا ہے تو جب اگلی کتابوں کی یہ مہیمن کتاب آگئی تو پھر اس کتاب کے بعد اگلی محرف کتابوں کی کوئی ضرورت نہیں رہی اسلئے یہ کتاب اگلی کتابوں سے بہتر (خیرا منھا) ہے اور تورات کیلئے انجیل (مثلھا) تھی مگر پہلے (خیرا منھا) کا ذکر کیا گیا اس کے درجہ اور مرتبہ میں متقدم ہونے کی وجہ سے اور پھر اس لئے بھی کہ اس وقت موضوع بحث یہی کتاب تھی۔ جو لوگ اس آیت سے قرآن ہی کی بعض آیتوں کو ناسخ اور بعض کو منسوخ سمجھتے ہیں وہ مجوسیوں اور ملحدوں کے فریب میں آکر اس غلطی میں پڑ گئے ہیں۔ انشاء اللہ ناسخ و منسوخ کی بحث آئندہ آجائے گی اور وہ سیر حاصل بحث ہوگی۔ (تمنا)

خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی دوسرا نبی آئیگا تو پھر یہ کتاب اگر ضائع ہوگئی یا اس میں بھی تحریف وتبدیلی وکمی بیشی کردی گئی تو پھر دنیا کے لئے ذریعہ ہدایت کیا رہ جائے گا؟ ۔ غرض اس آخری کتاب کی ہر حیثیت سے حفاظت اور ہر تغیر وتبدل اور ہر کمی وبیشی اور ہر تصحیف و تحریف سے قیامت تک اس کو محفوظ رکھنا ضروری تھا اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس آخری کتاب (قرآن مجید) کی حفاظت کا خود ذمہ لیا۔

ذمہ داری ذمہ دار کی قوت و قدرت کے مطابق ہی ہونی چاہیئے

کھانا خوانچے پر رکھا ہوا ہے آپ نے ایک آٹھ دس برس کے بچے سے کہا کہ دیکھتے رہو کوئی جانور خوانچہ سے منہ نہ لگائے تم اسکی پوری حفاظت کرو ۔ آپ یہ کہہ کر وہاں سے کچھ دور چلے گئے ۔ اگر کوا، بلی یا مرغا مرغی نے خوانچے کے کھانے کو خراب کیا تو ضرور آپ اس لڑکے کو الزام دینگے کہ تم نے حفاظت کا حق خوب ادا کیا اور وہ لڑکا ضرور مورد الزام سمجھا جائے گا۔ لیکن اگر کوئی خوفناک کتا آگیا، لڑکے نے اس سے خوانچے کے بچانے کی ہر ممکن کوشش کی مگر وہ کتا اس لڑکے ہی پر جھپٹا غریب نے بھاگ کر اپنی جان بچائی مگر خوانچے کا سارا کھانا کتا کھا گیا تو کیا آپ اس لڑکے کو مورد الزام قرار دیں گے؟ اور وہ لڑکا حفاظت نہ کرسکنے میں غفلت برتنے کا مجرم کہا جاسکتا ہے؟ ہرگز نہیں اس لئے کہ اس خوفناک کتے کے حملے کی تاب اس لڑکے میں نہ تھی۔

اللہ تعالیٰ کی قوت و قدرت کو پیش نظر رکھتے ہوئے قرآن کی ذمہ دارانہ حفاظت کے حتمی وعدے کو سمجھئے کہ اگر قرآن مجید کا ایک حرف، بلکہ ایک نقطہ بھی ادھر سے ادھر ہوگیا، بدل گیا۔ اگر اس کی کوئی حرکت اسکا کوئی سکون بھی نازل شدہ حیثیت میں نہ رہا تو کیا اللہ تعالیٰ کی ذمہ دارانہ حفاظت کا وعدہ

پوری طرح پورا اترا ؟ کیا اللہ تعالیٰ کی ذمہ داری کامیاب رہی؟ تو جب ایک حرف ایک نقطے۔ ایک حرکت اور ایک سکون کے بھی ادھر ادھر ہو جانے یا بدل جانے یا کم و بیش ہو جانے سے اللہ تعالیٰ کی قوت و قدرت کے پیش نظر قرآن کی ذمہ دارانہ حفاظت کا حق پوری طرح ادا نہیں ہوتا تو پھر پورے کسی لفظ، کسی فقرے کسی جملے، کسی آیت اور کسی سورۃ کے قرآن مجید سے نکل جانے اور غائب ہو جانے سے، یا بڑھا دیئے جانے سے یا کسی آیت میں تصحیف و تحریف یا تغیر و تبدل کر دیئے جانے سے اللہ تعالیٰ کی ذمہ دارانہ حفاظت کا وعدہ کس طرح وفا شدہ سمجھا جاسکتا ہے۔ اس لئے حفاظت الہیٰ کا ذمہ دارانہ اعلان خود ببانگ دہل پکار پکار کے کہہ رہا ہے کہ قرآن مجید ہر طرح کی تغیر و تبدیل، ہر قسم کی تحریف و تصحیف اور ہر حیثیت کی کمی و بیشی سے ہر زمانے میں، آغاز نزول سے قیامت تک محفوظ رہیگا اور اس طرح محفوظ رہیگا کہ لایاتیه الباطل من بین یدیه و لا من خلفه تنزیل من حکیم حمید - باطل نہ اسکے آگے سے آسکے گا نہ اسکے پیچھے سے، یہ حکمت و حمد کے مالک کی طرف سے اتری ہوئی کتاب ہے(۴۲/۴۱) اسلئے جو لوگ بھی قرآن مجید کی کسی آیت میں کسی طرح کی بھی کمی بیشی یا رد و بدل کا گمان بھی رکھتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے ذمہ دارانہ وعدہ حفاظت قرآن کو جھوٹا سمجھتے ہیں، ان کا ایمان ہی درحقیقت قرآن مجید پر نہیں اور جب قرآن مجید پر ان کا ایمان نہیں ہے تو پھر اللہ کے رسولؑ پر بھی ان کا ایمان نہیں، اور جب اللہ کے رسولؑ اور اللہ کی کتاب پر ان کا ایمان نہیں تو پھر اللہ تعالیٰ پر بھی ان کا صحیح ایمان نہیں ہوسکتا۔ اگر وہ مسلم رہنا چاہتے ہیں تو ان کو اپنے ادہام باطلہ سے صدق دل سے توبہ کرنا چاہئیے۔ اور نئے سرے سے اللہ، اللہ کے رسولؑ اور اللہ کی کتاب پر ایمان لانا ان پر واجب ہے ان هذه تذکرہ فمن شاء اتخذ الیٰ ربه سبیلاً ۷۶/۲۹ یہ ایک یاددہانی ہے جس کا

جی چاہے اپنے رب کی طرف والی راہ اختیار کرے۔ ورنہ ماعلینا الا البلاغ۔

مانو نہ مانو جان جہاں اختیار ہے
ہم نیک و بد حضور کو سمجھائے جاتے ہیں

حفاظت امتحانی و غیر امتحانی

کہا جاسکتا ہے کہ یہ صحیح ہے کہ اگلی امتوں نے اپنے رسولؑ پر نازل شدہ کتابوں کو ضائع کیا۔ اس میں تحریف و تصحیف و تبدیل و تغیر کی۔ اس لئے قرآن مجید کے متعلق بھی اس کا خطرہ تھا کہ امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم یہ کہیں اس کو بھی ضائع نہ کر دے اور اس میں بھی تحریف و تصحیف و تغییر و تبدیل نہ کر ڈالے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے اسکی حفاظت کا ذمہ دارانہ وعدہ کیا۔ اور یہ وعدہ اس طرح پورا کیا کہ امت محمدیہؐ ہی کے دل میں یہ بات ڈال دی کہ وہ اسکی حفاظت کی ذمہ داری خود محسوس کریں اور اس میں کسی طرح کی کمی و بیشی اور تحریف و تصحیف گوارا نہ کریں۔ اور اس کی حفاظت کے لئے ہر ممکن تدبیر کرتے رہیں اس کو حفظ کر لیا کریں، ہر زمانے میں اس کے سیکڑوں ہزاروں حافظ ہوتے رہیں۔ اسکے کلمات و حروف و حرکات و سکونات و نقاط کو گن ڈالیں وغیر ذلک۔ تو بیشک اللہ تعالیٰ نے اس طرح قرآن کی پوری حفاظت کر دی اور ایسی حفاظت کر دی کہ اس پر کبھی کسی دشمن کو حملے کا ارادہ بھی پیدا نہ ہوا اور نہ کبھی کسی نے اس کو ضائع کرنے یا نقصان پہنچانے کی ہمت کی۔

ایک تمثیل

ایک بادشاہ نے اپنے پایہ تخت سے ایک بڑا خزانہ کسی دوسرے ماتحت ملک میں اپنے ایک وزیر کے ہاتھ بھیجا اور راستے میں ڈاکوؤں چوروں، لٹیروں

سے حفاظت کے خیال سے فوج کا ایک دستہ بھی ساتھ کرنا چاہا مگر کسی پہلوان نے ذمہ لیا کہ فوج بھیجنے کی ضرورت نہیں ہے میں تنہا اسکی حفاظت کے لئے کافی ہوں آپ مجھ ہی کو ساتھ کر دیجئے۔ بادشاہ نے اس پہلوان کو وزیر کے ساتھ کر دیا مگر بادشاہ نے بطور خود بھی راہ میں حفاظت کا انتظام بہ نظر احتیاط کر رکھا تھا۔ وزیر اس خزانہ کو لیکر اس پہلوان کے ساتھ منزل مقصود تک پہنچ گیا اور جہاں خزانہ پہنچانا تھا وہاں اس نے پوری ذمہ داری کے مطابق خزانہ پہنچا دیا راستے میں کسی قسم کا کوئی خطرہ پیش نہ آیا اور نہ چوروں، لٹیروں یا ڈاکوؤں سے سامنا ہوا کہ اس پہلوان کی بہادرانہ حفاظت کا امتحان ہوتا۔ مگر وہ برابر ساتھ ساتھ محافظ و نگراں کی طرح راہ میں رہا ضرور اور کبھی فکر حفاظت سے غافل نہ رہا۔ اسکے بعد وزیر اور پہلوان دونوں بادشاہ کے پاس اپنی اپنی مفوضہ خدمات انجام دیکر آ گئے اس صورت میں اس پہلوان کو کوئی بھی کسی خاص انعام و اکرام و اعزاز کا مستحق نہیں کہہ سکتا۔

بخلاف اسکے کہ اگر راہ میں ڈاکوؤں نے وزیر کو معہ خزانہ گھیر لینا چاہا ہو اور یہ پہلوان دونوں ہاتھوں سے اس وقت بانا گھمانے لگا ہو اور اسکے بانے کی ضرب سے متعدد ڈاکو موت کے گھاٹ اتر گئے ہوں اور متعدد زخمی ہوئے ہوں اور آخر باقی سارے ڈاکو بھاگ نکلے ہوں اور اس طرح کا واقعہ راہ میں دو چار جگہ ہوا ہو، اور ہر جگہ بہادر پہلوان نے اپنی پہلوانی کے جوہر دکھا کر وزیر کی جان بھی بچائی ہو اور خزانے کو بھی لٹنے سے بچایا ہو اور پھر خزانہ ہر طرح سے محفوظ منزل مقصود تک پہنچا کر وزیر اور وہ پہلوان دونوں بادشاہ کے پاس واپس پہنچے ہوں تو اس وقت ہر شخص اس پہلوان کو مستحق صد انعام و اکرام و اعزاز قرار دیگا اور یقیناً بادشاہ اس سے بہت زیادہ خوش ہوگا۔ پہلی صورت میں وعدہ حفاظت بغیر امتحان حفاظت پورا ہوا تھا اور دوسری صورت میں وعدہ حفاظت امتحان حفاظت کے بعد پورا ہوا۔

تو اگر قرآن مجید پر کسی طرح کا حملہ ہی نہ ہوا ۔ کبھی کسی نے اس کو ضائع کرنے کی اور اسکو کسی قسم کا نقصان پہنچانے کی کوشش ہی ہنیں کی ۔ امت محمدیہ بتوفیق الہیٰ خود برابر اس کی حفاظت کا سامان کرتی رہی اور یہ سب اللہ ہی کی توفیق اور اللہ ہی کی بہم رسانی اسباب کے ماتحت ہوا تو اس میں شک ہنیں کہ اس طرح بھی اللہ تعالیٰ نے اپنا وعدہ حفاظت پورا کر دیا مگر یہ حفاظت امتحانی نہ ہوا ۔ یہ ذمہ دارانہ حفاظت کا اعلان تو صاف اشارہ کر رہا ہے کہ اس کتاب پر بھی دشمنوں کے حملے ہوں گے اور کتنے نادان دوستوں کو اسکی ایسی دوستی کا خیال پیدا ہوگا جو دشمنوں کی دشمنی سے زیادہ اس کے حق میں مضر ثابت ہو سکتی ہے ۔ مگر ہر حملے اور ہر ضرر سے ہم اس کو محفوظ رکھیں گے ۔ یہ اس ذمہ دارانہ اعلان کے فحوائے کلام سے ظاہر ہو رہا ہے اور جب تک یہ نہ ہو اس وقت تک یہ وعدہ حفاظت اور اس کا ذمہ دارانہ اعلان اعجاز کا درجہ ہنیں حاصل کر سکتا ۔ تو اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا واقعی قرآن مجید پر دشمنوں نے کچھ حملے کبھی کئے یا ہنیں؟ اور وہ حملے کب کب شروع ہوئے اور پھر کب کب ختم ہو گئے یا ابتک جاری ہیں ۔ اور اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی طرف سے دشمنوں کے ان حملوں کی کس کس طرح مدافعت فرمائی اور کس کس طرح قرآن مجید کو دشمنوں کی دشمنی اور نادان دوستوں کی مضر و مہلک دوستی کے شر سے محفوظ رکھا ۔

حقیقت حال

حقیقت یہ ہے کہ قرآن مجید پر جسقدر اور جس جس طرح کے حملے ہوئے، ہوتے رہے بلکہ آج تک ہو رہے ہیں اس کی مثال دنیا ہنیں پیش کر سکتی ۔ دنیا کی کسی چیز یا کسی شخص پر اتنے مخالفانہ حملے، متعدد محاذ قائم کر کے ہر محاذ سے مسلسل حملوں کی بوچھار اور وہ بھی آغاز نزول سے اس وقت تک یعنی اس چودہ سو برس میں سے کوئی دن ایسا ہنیں بتایا جا سکتا ہے جس میں قرآن مجید پر کسی نہ

کسی محاذ سے حملے نہ کیئے گئے ہوں۔ پہلے سولہ اقسام کے تواتر پر ایک اور تواتر حملہ اور پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسکی مدافعت کا تواتر بھی ملا لیجئے تو یہ سب اٹھارہ قسم کے تواتر ہوئے۔

ابتدائی حملہ

شروع شروع یعنی آغاز نزول سے عہد خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم اجمعین تک تو اسی قدر حملے ہوا کرتے تھے کہ کفار و مشرکین اس کو کذب و افتراء و بہتان اور سحر و شاعری کہا کرتے تھے۔ اور اس حملے کا سلسلہ آغاز نزول سے اس وقت تک چلا آرہا ہے ہر زمانے میں کفار و مشرکین و ملاحدہ قرآن مجید پر اسی قسم کے ناپاک حملے اپنی ناپاک ذہنیت کے ماتحت کرتے رہے اور آجتک کر رہے ہیں۔ اس حملے کا تواتر تو عہد نبویؐ سے اس وقت تک چلا آرہا ہے، کسی زمانے میں بلکہ کسی زمانے کے کسی حصے میں یہ حملہ موقوف نہ ہوا۔

پہلی صدی کے بعد کے حملے

جب کفار و مشرکین کے سامنے قرآن کی تحدی (چیلنج) بار بار پیش ہوئی کہ اگر تم اس قرآن کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ وحی نہیں مانتے، ایک انسان کی بنائی ہوئی کتاب سمجھتے ہو اور اس کے مضامین کو کذب و افترا، یا شاعری کہتے ہو تو پھر تم لوگ بھی اپنے بڑے بڑے شاعروں اور فصحاء و بلغاء کو جمع کرو اور ان سے کہو کہ سب مل کر ایسا ایک سورۃ بھی بنا کر لے آئیں۔ اور پھر یہ بھی لکھ دیا گیا کہ اس کے ایک مختصر سے سورۃ کے برابر بھی کوئی عبارت فصاحت و بلاغت میں اس رتبے کی تم لوگ کبھی نہ لاسکو گے، اگرچہ سارے شاعر اور تمام فصحاء و بلغاء باہم مل کر بھی اس کی کوشش کریں۔ یقیناً اتنے بڑے زبردست چیلنج کو سن کر عرب کے کافر و مشرک شعراء و فصحاء و بلغاء کبھی

خموش نہ بیٹھے ہوں گے، ضرور اس کی کوشش کی ہوگی مگر اپنی کوششوں کو ناکام دیکھکر اس کی ہمت نہ پڑی کہ مقابلے کے میدان میں سامنے آئیں اور ادھر قرآنی اعجاز نے اہل انصاف کے قلوب اپنی طرف کھینچنا شروع کئے، اور و رایت الناس یدخلون فی دین اللہ افواجا ۲/۱۱۰ کا منظر برابر سامنے آتا رہا کہ لوگ فوج در فوج دین اسلام قبول کرتے ہی چلے جارہے تھے اور مسلمانوں کی تعداد روز بہ روز ہی بڑھتی جارہی تھی تو ہٹ دھرموں کی ایک جماعت منافق بن کر اور اپنے کو مسلمان ظاہر کر کے مسلمانوں کو طرح طرح سے پریشان کرنے لگی اور چاہا کہ کھلے بند دشمن بن کر ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے تو بظاہر دوست بن کر مسلمانوں کو نقصان پہنچائیں۔ منافقین و ملاحدہ بھی فتح ایران کے بعد اواخر عہد فاروقی میں مسلمانوں میں مل کر فتنہ و فساد کے بیج بونے لگے۔ یہاں تک کہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی شہادت انہی منافقین کی سازشوں کی وجہ سے ہوئی پھر اواخر عہد حضرت ذی النورین رضی اللہ عنہ میں منافقین کی سازش سیاسی حیثیت سے اپنے شباب پر آگئی جس کا نتیجہ حضرت عثمان ذی النورین رضی اللہ عنہ کی شہادت کی صورت میں ظاہر ہوا اور پھر مسلسل خانہ جنگیاں جو جنگ جمل و جنگ صفین و سانحہ کربلا وغیرہ فسادات کی شکل میں مسلمانوں کے درمیان ہوتی رہیں یہ سب انھیں منافقین و ملاحدہ کی فتنہ انگیزیوں کے سبب سے ہوئیں جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں لیکن باوجود ان تمام خانہ جنگیوں کے مسلمانوں کا دینی شیرازہ منتشر نہ ہوسکا اور ان میں کسی طرح کا قومی و اجتماعی ضعف پیدا نہ ہوا۔ یہ دیکھ کر منافقین و ملاحدہ نے کافی غور و خوض کے بعد اس کو محسوس کیا کہ مسلمانوں کا شیرازہ دینی و قومی جو کچھ ہے وہ صرف قرآن ہے جب تک یہ کتاب ان کے پاس ہے یہ کبھی شکست خوردہ نہیں ہوسکتے۔ یہ معلوم کر لینے کے بعد ان منافقین کی ایک نہایت مدبرین و ماہرین علوم عجمیہ و عربیہ کی جماعت نے ایک سازشی پروگرام مرتب

<u>کیا جس کے ماتحت قرآن مجید کو مسلمانوں کے ہاتھوں سے چھین لیا جاسکے اور اگر اس کتاب کو ضائع و برباد نہ کیا جاسکے تو اس کو بالکل غیر مفید و بیکار بنا دیا جائے۔</u>

اس کو وہ خوب سمجھتے اور جانتے تھے بلکہ آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ ہر مسلم گھر میں قرآن مجید کے متعدد نسخے موجود ہیں۔ حافظوں کی کثیر تعداد سارے اسلامی ممالک میں پھیلی ہوئی ہے۔ ہر گھر میں ہر مسلمان مرد عورت اور کمسن بچے بچیاں سب کے سب روزانہ اس کی تلاوت کرتے رہتے ہیں نمازوں میں پڑھتے ہیں۔ اس کی تعلیم و تعلم کا سلسلہ ہر مسلم گھر میں قائم رہتا ہے ایسی چیز کو ان سے چھین لینا تو محال ہے اور اسی طرح اس کو ضائع و برباد کر دینا بھی ناممکن ہے۔ البتہ اس کے سوا کوئی اور صورت نہیں ہے کہ مسلمانوں کی توجہ اس کی طرف سے ہٹا کر کسی اور طرف پھیر دی جائے اور قرآن کے متعلق ایسی ایسی باتیں ان کی جماعت میں مشہور کی جائیں کہ یہ یا تو قرآن کی طرف سے شک و شبہ میں مبتلا ہو جائیں، یا غلط خیالات قائم کر لیں، اور ایسی صورت ان میں پیدا ہو جائے کہ یہ قرآن کو صرف عقیدۃً ہی پڑھا کریں، باقی ان کا دین و مذہبی سرمایا اس وقت جو صرف قرآن مجید ہی ہے یہ بات باقی نہ رہے اور ان کا دین و مذہب سب قرآن سے باہر کی باتیں ہو جائیں اس کے لئے اس جماعت نے متعدد محاذات قائم کئے اور ہر محاذ کے لئے قابل افراد اپنے میں سے چن کر ہر محاذ پر مقرر کئے کہ جو لوگ اس محاذ پر مقرر کئے گئے ہیں وہ اپنے محاذ سے برابر مسلسل حملے جاری رکھیں، کسی زمانے میں بھی حملے موقوف نہ کریں اور ہر محاذ سے جو حملہ بھی ہو وہ صرف قرآن ہی پر ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابہؓ پر بھی کچھ حملے ہوں مگر اصل ہدف قرآن ہی رہے۔

اور پھر اس کا سلسلہ قائم کیا کہ ہر محاذ کے لوگ اپنے جانشین بھی بناتے رہیں تاکہ ان کے مرنے کے بعد اس محاذ کا کام ان کے جانشین جاری رکھیں

اور اس محاذ سے قرآن پر حملے کا سلسلہ کبھی منقطع نہ ہو۔

غرض اس طرح متعدد محاذان منافقین ملاحدہ نے قائم کئے جن کی تفصیل انشاء اللہ تعالیٰ جلد آئیگی اور ہر محاذ سے رفتہ رفتہ حملوں کا سلسلہ بڑی دانائی و ہوشمندی کے ساتھ شروع کر دیا جس کا زمانہ پہلی صدی کے اواخر کا دور تھا۔ بلکہ یوں سمجھئے کہ واقعہ کربلا کے بعد سے، مگر اللہ تعالیٰ کے حلم نے باوجود ان تمام ریشہ دوانیوں اور فتنہ سازیوں کے علم کے انھیں پورا موقع دیا کہ وہ جب تک چاہیں، جتنے محاذوں سے چاہیں اور جسقدر چاہیں قرآن مجید پر حملے کریں اور مسلسل حملوں کی بوچھار قائم کر دیں اور کبھی حملوں کے سلسلوں کو منقطع نہ ہونے دیں۔ چنانچہ خود قرآن مجید میں ارشاد فرمایا ہے۔ ان الذین یلحدو ن فی ایٰتنا لایخفو ن علینا افمن یلقیٰ فی النار خیر ام من یاتی اٰمنا یو ما القیٰمہ اعملو ا ماشئتم انہ بما تعملو ن بصیر۔ جو لوگ ہماری آیتوں کے ساتھ الحاد کرتے ہیں وہ ہم سے چھپ نہیں سکتے، کیا وہ جو دوزخ میں ڈالا جائے گا اچھا ہے یا وہ اچھا ہے جو قیامت کے دن امن وامان کے ساتھ آئے گا؟ کرلو جو کچھ تم کرنا چاہتے ہو، تمہارے ہر عمل پر اللہ کی نظر رہتی ہے۔ (۴۱○۴۰)

غرض اللہ نے ان کو پوری ڈھیل دیدی اور اتنی لمبی ڈھیل کہ آجتک باوجود اس کے کہ بارہ سو برس سے زیادہ ہوگئے مگر ان کے وہ محاذات قائم ہیں اور ابتک ہر محاذ سے ان منافقین و ملاحدہ کے حملوں کی تجدید اب زیادہ نادان دوستوں ہی کے ہاتھوں سے مسلسل طور سے برابر ہوتی رہتی ہے مگر قربان جایئے اللہ تعالیٰ کے ذمہ دارانہ وعدہ حفاظت کے کہ اس کے معجزانہ اثر سے قرآن پاک اس چودہ سو برس کے بعد بھی اتنے شدید مسلسل حملوں کے باوجود بالکل اسی طرح محفوظ ہے جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو دیا تھا۔ قرآنی آفتاب پر ہزار گرد و غبار اڑایا گیا مگر وہ سارا غبار، گرد اڑانے والوں ہی کی آنکھوں پر ماڑے اور جالے کی طرح چھایا ہوا ہے

قرانی آفتاب کا دامن ذرا بھی میلا نہ ہوسکا۔ یہ ہے قرآن مجید کی حفاظت کا وہ ذمہ دارانہ وعدہ اور اس کی معجزانہ طاقت جس کا مظاہرہ اللہ تعالیٰ اپنی قدرت سے آج اپنے اس حقیر بندے کے حقیر قلم سے کرا رہا ہے۔

اسکی قدرت کا بھی واللہ عجب فیض ہے عام
ایک مچھر سے کیا قصۂ نمرود تمام

مندرجہ بالا صفحات میں آپ نے تفصیل سے ملاحظہ فرمالیا کہ اعجاز القرآن کا کیا مطلب ہے۔ عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے خلافت بنی عباس تک اعجاز کی کن کن وجوہ کا رفتہ رفتہ ظہور ہوا اور آج کے زمانہ میں قرآن کے اعجاز کی کیا وجہ ہوسکتی ہے۔ نیز آپ نے یہ بھی ملاحظہ فرمالیا ہے کہ قرآن کریم کن کن اعتبارات سے متواتر ہوکر ہم تک پہنچا ہے۔ اس کے تواتر کو توڑنے کے لئے جو جو حربے ملاحدہ نے آجتک استعمال کئے ان کی حقیقت بھی آپ کے سامنے آچکی ہے لیکن میرا خیال ہے کہ صرف اتنا ہی کافی ہنیں ہے بلکہ ان ملاحدہ کی اس سازش کا پردہ چاک کرنے کے لئے جو انھوں نے قرآن کریم کے خلاف مختلف محاذوں سے کھڑی کی تھی قدرے تفصیل سے روشنی ڈالنے کی ضرورت ہے چنانچہ آئندہ صفحات میں ان محاذات سے بحث کی جائے گی۔ و باللہ التوفیق۔

اعجاز القرآن

حصّہ دوم

محاذِ روایت

قرآن کے خلاف دشمنان قرآن ملحدین کی منافقانہ سازشیں

ملحدین جو تابعین کے لبادے اوڑھ کر منافقانہ زہدو ورع اور ریا کارانہ پابندی صوم و صلوٰۃ کے ذریعے عام مسلمانوں میں بآسانی اپنا اثر و رسوخ قائم کرلیتے تھے انھوں نے عجمی اسیران جنگ میں سے (جو غلامی سے آزادی حاصل کرکے موالی کے لقب سے مشہور تھے) ایک بڑی جماعت کو اپنا شریک کار بنا کر مسلمانوں اور اسلام کے خلاف ایک زبردست جدو جہد شروع کی۔ سب سے پہلے ایران کے ایک مجوسی قیدی ابو لولو فیروز کے ہاتھوں حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو منصب شہادت تک پہنچانے کے بعد جب انتخاب خلیفہ کے وقت کوئی فتنہ برپا نہ کر سکے تو منتخب خلیفہ حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ کے خلاف مرکز اسلام سے دور دراز مقامات میں جا جا کر عوام میں ایسی باتیں بیان کرنے لگے جن سے عام مسلمانوں میں خلیفہ وقت کی طرف سے نفرت کے جذبات پیدا ہوں ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ضرورت محسوس کی گئی کہ ان کے مقابل کسی دوسرے کو بھی پیش کیا جائے تاکہ عوام اگر کسی وقت موجودہ خلیفہ کے خلاف شورش برپا کرکے ان کو معزول کر دیں تو فوراً اس متبادل کو ان کی جگہ خلیفہ بنا دیا جائے اس کے لئے انھوں نے حضرت علیؓ کو اطلاع دیئے بغیر ان کا نام استعمال کرنا شروع کر دیا۔ ان کے فضائل و مناقب میں جھوٹی حدیثیں بنا بنا کر ہر جگہ ان جھوٹی حدیثوں کو مشہور کرنا شروع کیا چنانچہ ایران کے وہ علاقے جو حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ ہی کے زمانے میں فتح ہوچکے تھے اور کوفہ و بصرہ اور شام و عراق کے علاقوں میں حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کے اہل بیت کی منقبت کی حدیثیں

پھیلائی جانے لگیں، اور خاندان پرستی کی بنیاد مسلمانوں میں تفریق ڈالنے اور اپنے پنجے گاڑنے کے لئے کوششیں شروع کر دیں۔ دور دراز ملکوں کے عوام سیدھے سادھے نو مسلم ان منافقین کو مقدس تابعین اور ان کی من گھڑت حدیثوں کو واقعی حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم سمجھ کر یقین کرلیتے تھے ، بلکہ ان جھوٹی حدیثوں کو یاد کر لیتے تھے اور پھر وہ بھی دوسروں سے روایت کیا کرتے تھے۔ آخر منافقین کوفہ بصرہ اور مصر سے ایک جماعت بلوائیوں کی مہیا کر کے آخر ماہ شوال ۳۵ ھ میں ایسے وقت مدینے طیبہ میں فتنہ برپا کرنے کے ارادے سے پہنچے جب کہ مدینے سے ایک بہت بڑی جماعت حج کے ارادے سے مکہ معظمہ روانہ ہو چکی تھی اور مدینے سے کچھ بوڑھے کچھ بچے کچھ عورتیں اور کچھ بیمار لوگوں کے سوا تقریباً کل آدمی باہر تھے ، ان منافقین اور ان کے چیلوں نے آخر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کر کے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلافت قبول کرنے پر مجبور کیا جسے انھوں نے بادل ناخواستہ قبول کیا، مگر ان بلوائیوں اور منافقوں کے سبب سے ان کو ایک دن بھی آزادانہ فرائض خلافت اپنی مرضی کے مطابق انجام دینے کا موقع نہ مل سکا ۔ جنگ جمل و جنگ صفین انھیں منافقین اور ان کے تیار کئے ہوئے بلوائیوں کی وجہ سے واقع ہوئیں اور پھر آخر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھی انہیں ظالموں کی ریشہ دوانیوں کی بدولت جام شہادت پینا پڑا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد انھیں منافق بلوائیوں نے حضرت حسنؓ بن علی کو خلافت کی گدی پر بٹھا کر باپ کے بعد بیٹے کی جانشینی کی رسم بد اور بدعت کی ابتدا کی مگر حضرت حسنؓ ان منافقین کے رویے سے بہت حد تک واقف ہو چکے تھے بتقاضائے مصلحت اس وقت تو فتنہ فرد کرنے کے

لئے اپنے والد کی طرح ان لوگوں کی بات مان لی، اور منصب خلافت کو بادل ناخواستہ قبول کرلیا ۔ مگر چھ ہی ماہ کے بعد خلافت سے دست بردار ہوکر الگ ہوگئے اور اپنا جانشین حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو مقرر کرکے خود سبکدوش ہوگئے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کا یہ مصلحانہ فعل اور ان کی یہ عاقلانہ صلح ان فتنہ پردازوں پر بہت شاق گذری کہ اب تو فتنوں کے سارے دروازے بند ہوگئے اور اس کے ذمہ دار تنہا حضرت حسن رضی اللہ عنہ تھے۔ اس لئے ایک خانگی سازش کرکے ان کو زہر دلوا کر شہید کر ڈالا ۔ اور اس طرح اس مصالحت کا انتقام لیا۔ ان کی شہادت کا الزام حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ یا یزیدؒ پر رکھنا بھی انہی منافقین کے چیلوں کا کام ہے ان دونوں کا تو ان کی زندگی ہی میں فائدہ تھا ان کی شہادت ہی کی وجہ سے تو کوفی مفسدین کو اس کا موقع ملا کہ اب حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو خلافت کے لئے کھڑا کریں۔ اگر حضرت حسنؓ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے بعد زندہ رہتے تو اس وقت بھی خلافت قبول کرنے کے لئے کبھی تیار نہ ہوتے اور نہ حضرت حسینؓ کو تیار ہونے دیتے۔ ان کی صلح جو فطرت اور مصالحانہ روش کا تجربہ ہوچکا تھا اس لئے کوئی وجہ ہی نہ تھی کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ یا یزیدؒ کوئی بھی حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی وفات چاہتا ۔

بہر حال حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے وقت تک تو ان کی شہرہ آفاق سیاست دانی و دور اندیشی کی وجہ سے ان فتنہ پردازوں کو کسی کامیاب فتنہ پردازی کا موقع نہ مل سکا ۔ جہاں کہیں بھی ذرا سر اٹھایا وہیں کچل دیا گیا ۔ مگر ان کی وفات کے بعد آخر حضرت حسینؓ کو کسی طرح دعویٰ خلافت پر تیار کرلیا گیا اور ان کو فریب دے کر کوفیوں نے کوفے

بلایا اور راستے ہی میں بمقام کربلا شہید کر ڈالا انھیں کی سازشوں سے تین برس بعد واقع حرہ ہوا ۔ پھر حضرت عبداللہ بن الزبیر رضی اللہ عنہما کو بھی جام شہادت پینا پڑا ۔ اس کے بعد پھر مسلسل کئی سال تک مسلمانوں میں خونریزیاں ہوتی رہیں مگر اسقدر سیاسی انتشار کے بعد بھی مسلمانوں کا دینی شیرازہ منتشر نہ ہوا ، اور عقائد و عبادات اور اصول اخلاق و اصول معاملات میں سب کے سب متحد رہے اگر بعض فروعی اجتہادی مسائل میں کچھ شخصی اختلاف دو قاضیوں کے درمیان ہوا تو اس کو دینی انتشار نہیں کہا جاسکتا، اجتہادی مسائل میں اس قسم کے دینی اختلافات کا ہونا ناگزیر ہے تفاوت فکر و عقل اور اختلاف طریق غور و فکر کے علاوہ مقام ضیق و مقام و سعت کا فرق بھی ایک ایسی چیز ہے کہ ایک ہی جیسے مسئلے میں دو جگہ دو قاضی دو طرح کے باہم مختلف فتوے اور فیصلہ کریں۔

مسلمانوں میں تفرقہ پھیلانے کے لئے مختلف محاذوں کا انتخاب

پہلا محاذ روایت سازی

غرض ملحدین کو یہ دیکھ کر سخت تعجب ہوا کہ یہ عجب طرح کی قوم ہے کہ اس کے رسول ؐ کے تین خلفا شہید کر دیئے گئے دو نواسوں کو جام شہادت پلا دیا گیا ان کے درمیان اتنی خونریزیاں کرا دی گئیں پھر بھی ان کا شیرازۂ قومیت ایک ہی ہے اور اتنے انتشار کے باوجود آج بھی دوسروں کے مقابل یہ سب کے سب ایک ہی ہیں چونکہ ان سبھوں کا دین ایک ہے اس لئے ضرورت اس کی ہے کہ ان لوگوں کے درمیان

دینی فرقہ بندیاں پیدا کر کے ان کے دینی شیرازے کو توڑ دیا جائے تاکہ ان کی مختلف جماعتیں ہو جائیں اور ہر جماعت کا دین دوسرے سے اتنا الگ اور مختلف ہو جائے کہ ایک دوسرے کو کافر ورنہ گمراہ تو ضرور کہے مگر یہ دشواری بھی محسوس کی کہ اس قوم کا قومی شیرازہ صرف دین ہے اور ان کا دین ان کی کتاب قرآن میں منحصر ہے۔ قرآن میں فرما دیا گیا ہے کہ **و ما اختلفتم فیه من شئی فحکمه الی الله** (   ) تم نے جس کسی بات میں اختلاف کیا اس کا فیصلہ اللہ کی طرف رجوع ہو کر رہے گا یعنی اللہ کی کتاب قرآن تمہارے پاس موجود ہے اس کے سامنے پیش کر دو۔ ہر دینی اختلاف کا فیصلہ ہو کر رہے گا۔ اور اگر تم نے دنیا میں قرآن کے سامنے اپنے اختلاف کا فیصلہ نہ کیا تو پھر قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے سامنے تمہارے سارے باہمی اختلافات پیش ہو کر رہیں گے اور اس دن تمہارے اختلافات کا صحیح فیصلہ ہو جائے گا۔ تو جب یہ لوگ قرآن کی طرف متوجہ ہوں گے ان کا اختلاف بڑی آسانی کے ساتھ مٹ جائے گا۔ اس لئے ایسی صورت نکالنی چاہیئے کہ ان سے قرآن بالکل چھن جائے مگر فوراً ہی اس کو بھی محسوس کر لیا کہ ان سے قرآن کا چھین لینا ممکن ہی نہیں۔ کیونکہ اول تو ہر گھر میں قرآن کے متعدد نسخے موجود ہیں، عورت، مرد، بوڑھے، جوان، یہاں تک کہ بچے اور بچیاں قرآن پڑھا کرتی ہیں اور روزانہ تلاوت کا معمول ہے پھر تقریباً اسّی فیصد مرد اس قوم کے حافظ قرآن ہیں۔ اس لئے اس قوم سے اس کتاب کا چھین لینا بالکل محال ہے تو پھر کوئی ایسی صورت نکالنے کی ضرورت ہے کہ قرآن کے مقابل کوئی دوسری ایسی چیز ان کے سامنے پیش کر دی جائے جس کو یہ قرآن کے برابر سمجھ کر اس کی طرف متوجہ ہو جائیں اور اس دوسری چیز کی طرف

ان کی توجہ اس قدر مبذول کرا دی جائے کہ یہ قرآن سے دور ہو جائیں اور ان کا انہماک جو قرآن کی طرف ہے وہ باقی نہ رہے ۔ ان مفسدین کو ان کی سابق فتنہ پردازیوں کے درمیان اس کا تجربہ ہوچکا تھا کہ یہ جھوٹی جھوٹی حدیثیں فضائل و مناقب وغیرہ کی بنا بنا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرکے عام مسلمانوں کے سامنے پیش کرتے تھے ۔ تو بیچارے سیدھے سادھے عوام فوراً اس کو قبول کرلیتے تھے، بلکہ یاد کرلیتے تھے اور خود اس کی روایت دوسروں سے کرنے لگتے تھے۔ اس سے ایک چیز تو ان کو یہ معلوم ہوگئی کہ ہم جو بات قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہہ کر عوام کے سامنے بیان کرینگے ۔ عامۃ المسلمین ضرور اس کو مان لینگے ۔ اس لئے دین اسلام کے ہر رکن ہر کام اور ہر بات کو مختلف طریقے سے ان جھوٹی حدیثوں کے ذریعے مختلف کر دیا جائے تاکہ ان مسلمانوں کا عقیدہ و عمل ایک طرح سے باقی نہ رہے جب مختلف عقیدے اور مختلف طرح سے ان کے اعمال ہو جائیں گے تو ضروری ہے کہ یہ ایک قوم مختلف جماعتوں میں ان مختلف حدیثوں کی وجہ سے بٹ جائے اور پھر ایک دوسرے کو بر سر غلط اور گمراہ سمجھنے لگے اور بالآخر ایک دوسرے کو کافر کہنے اور سمجھنے لگے۔ اور چونکہ حدیثیں نئی چیز ہوں گی اور ہر نئی چیز کی طرف طبائع کا رجحان عموماً زیادہ ہوا کرتا ہے اس لئے قرآن سے زیادہ لوگ حدیثوں کی طرف متوجہ ہو جائیں گے چنانچہ یہی ہوا کہ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتنا شور ان منافقین نے مچایا اور لوگوں کو جمع احادیث پر اس قدر ابھارا کہ رفتہ رفتہ تمام ممالک اسلامیہ میں ہزاروں راویان احادیث اور سینکڑوں جامعین احادیث پیدا ہوگئے اور لوگوں کی توجہ قرآن کی طرف سے اس قدر ہٹ گئی کہ علماء و فقہا و

مفتیین وغیرہم اپنے فتووں اور فیصلوں میں قرآن سے استنباط مسائل و استدلال کے عوض حدیثوں ہی سے کام نکالنے لگے۔ اس روایت پرستی کو منوانے کے لئے انھوں نے ایک حدیث گڑھی جسمیں قرآن کو بے مثل ماننے سے انکار کیا گیا ہے اور حدیثوں کو قرآن کا مثل بتایا گیا ہے نعوذ باللہ من ذلک حالاں کہ یہ روایت بالکل جعلی اور گڑھی ہوئی ہے ۔ اس کا وجود نہ بخاری میں ہے نہ مسلم میں، موطا میں تو اسکے ہونے کا سوال ہی پیدا ہنیں ہوتا ، اسکے راویوں کی حقیقت خود ان محدثین کے اصول کے تحت بالکل گئی گذری ہے ، تفصیل ملاحظہ ہو۔

مثلہٗ معہٗ والی روایت کی حقیقت

قرآن مبین کا یہ دعویٰ ہے کہ مافر طنافی الکتب من شئی (۶ / ۳۸) اس کتاب میں ہم نے کوئی کمی ہنیں چھوڑی ہے اور ارشاد ہے ونزلنا علیک الکتب تبیانا لکل شئ (۱۶-۸۹) ہم نے اس کتاب کو تم پر اتارا ہے دین کی ہر بات کو واضح طور سے بیان کر دینے کیلئے ۔" تبیان کے معنی ہیں کسی بات کو وضاحت کے ساتھ بیان کرنا۔ احکام دین اور اوامر و نواہی کے لئے کتاب اللہ کی صاف و صریح آیتیں ہی رکھی گئیں جو حضرت جبرئیل امین کے ذریعے رسول تک پہنچتی رہیں۔ ابتدائے نزول سے ختم نزول تک جن کی کتابت، جن کے حفظ اور روزانہ کی تلاوت اور تعلیم و تعلم کا سلسلہ بلاناغہ رات دن تمام صحابہؓ میں رہا۔ اس طرح ان آیات کا ایک ایک حرف ہر طرح محفوظ رہا ۔کتاب اللہ کی حفاظت کا جو وعدہ کیا گیا ہے انا نحن نزلنا الذکر و اناله لحافظون۔ (۱۵-۹) ہم نے اسی نصیحت

کی کتاب کو اتارا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں تو اس سے مراد اوراق یا حروف و نقوش کی حفاظت نہیں ہے بلکہ اصل دین کی حفاظت کا وعدہ مقصود ہے۔ اگر دین ہی محفوظ نہ رہا تو کتاب رہی تو کیا اور نہ رہی تو کیا کتاب تو دین ہی کی تعلیم کے لئے آتی ہے اس لئے اس کتاب کی حفاظت کے معنی ہی یہ ہیں کہ دین ہر طرح محفوظ رہے۔ اسی لئے دین کے تمام احکام، سارے اوامر ونواہی اسی کتاب میں محصور رکھے گئے اور اسی کتاب کو "تبیانا لکل شئی ۱۶/ ۸۹" کہا گیا۔ اگر قرآن سے باہر حدیثوں میں بھی بعض ایسے احکام، بعض ایسے اوامر و نواہی، اور بعض ایسے حلال و حرام ہیں جن کا تعلق قرآن سے کچھ نہیں یعنی قرآن مبین ان کے متعلق اثبات و نفی دونوں حیثیت سے بالکل خموشی ہے۔ تو پھر قرآن کا یہ دعویٰ کہ یہ کتاب۔ تبیانا لکل شئی دین کی ہر بات بیان کرنے کے لئے اتری ہے اور اس میں کسی طرح کی کمی نہیں چھوڑی گئی" یہ دونوں دعوے غلط ہو جاتے ہیں۔ معاذ اللہ من ذالک و من اصدق من اللہ قیلا۔ اللہ سے بڑھکر بات کا سچا کون ہو سکتا ہے؟

وحی تشریعی صرف قرآن ہے

وہ وحی جس کا تعلق احکام شریعت دینی اوامر و نواہی اور حلال و حرام سے یا تبشیر و تنذیر سے ہے وہ صرف قرآن مبین اور اس کی آیتیں ہیں۔ جیساکہ خود قرآن ہی میں فرمایا گیا ہے کہ قل اللہ شھیداً بینی و بینکم و اوحی الی ھذا القران لا نذرکم بہ و من بلغ (٦ ۔ ١٩) "کہدو (اے رسولؐ) کہ اللہ میرے اور تمہارے درمیان گواہ ہے کہ میری طرف یہی قرآن وحی کیا گیا ہے تاکہ اس کے ذریعے ہم تمہیں (نتیجہ کفر سے)

ڈرائیں ، اور جس کے پاس یہ پہنچ جائے اس کو بھی۔" اور فرمایا گیا آخر سورۃ قاف میں **وفذکر بالقران من یخاف وعید (۵۰۔۴۵)** جو میری دھمکیوں سے ڈرتا ہو اس کو قرآن کے ذریعے نصیحت کریئے تو خیال کیجئے کہ تذکیر و تنذیر تک میں قرآن ہی کا پابند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو رکھا گیا اس لئے اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے الفاظ میں بھی لوگوں کو دینی باتیں سکھاتے ہوں گے تو قرآنی ہی مضامین بیان فرماتے ہوں گے۔ کیونکہ آپ ؐ کو قرآن ہی کی تبلیغ و تبیین اور قرآن ہی کے مطابق تنذیر و تذکیر کا حکم تھا۔ تو جب تبیین و تنذیر و تذکیر میں قرآن کی پابندی تھی تو پھر قرآن سے باہر اوامرونواہی اور حلال و حرام بیان کرنے کی اجازت کب ہو سکتی ہے؟ اور کہاں سے ہو سکتی ہے؟

احادیث کے لئے قرآن کریم معیار ہے

اسی لئے حدیثوں کی صحت کا اصلی اور قطعی معیار مطابقت قرآن مبین ہے اسلئے کہ یہ ناممکن ہے کہ قرآن میں کچھ فرمایا جائے اور حدیث میں کچھ اور وارد ہو ۔ جس رسول ؐ پر قرآن کا اتباع فرض ہو وہ قرآن کے خلاف کس طرح بول سکتے ہیں؟ اور قرآن سے باہر دینی احکام کیا اپنے جی سے بیان فرمائیں گے؟ جبکہ دینی احکام قرآن سے باہر ہو ہی ہنیں سکتے اسی لئے حدیث میں وارد ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ **تکثر لکم الا حادیث بعدی فما روی لکم حدیث عنی فاعرضوہ علیٰ کتب اللہ فما وافقہ فاقبلوہ و ما خالفہ فردوہ۔** " میرے بعد حدیثوں کی بڑی کثرت ہوگی تو جو حدیث میری طرف منسوب کرکے تمہارے سامنے روایت کی جائے ۔ اس کو کتاب اللہ کے سامنے پیش

کرو۔ اگر اس کے موافق ہو تو قبول کرو اور اگر اس کے خلاف ہو تو رد کرو ۔ یہ حدیث صحیح بخاری میں پہلے موجود تھی، بعد کو یاران طریقت نے دیکھا کہ اس حدیث سے تو سینکڑوں حدیثیں غلط اور قابل رد ٹھہر جائیں گی۔ اسلئے اس حدیث کو بخاری کے نسخے سے نکال پھینکا مگر قدیم کتابوں میں بخاری کے حوالے سے یہ حدیث موجود ہے۔ چنانچہ "توضیح و تلویح" جو اصول فقہ حنفی کی نہایت مشہور و معروف کتاب ہے اور تقریباً تمام عربی مدارس کے نصاب تعلیم میں داخل ہے ۔ اس میں بخاری کے حوالے سے یہ حدیث مذکور ہے۔ اس پر علامہ تفتازانی نے کچھ خفگی کا بھی اظہار کیا ہے مگر اس راویت کو بخاری کی روایت مانتے ہوئے۔ پھر سید السند نے علامہ تفتازانی کا جواب بھی اپنے حاشیہ میں دیا ہے، اور کہا ہے کہ یہ بخاری کی حدیث ہے جسکا تمہیں انکار نہیں لہٰذا اس حدیث کی صحت کیلئے یہی کافی ہے کہ اس کو امام بخاریؒ نے اپنی کتاب میں درج فرمایا ۔ غرض ان تینوں بزرگوں کے وقت تک یہ حدیث صحیح بخاری میں موجود تھی۔ صحیح بخاری کے علاوہ مسند امام احمد میں، جاحظ کی کتاب البیان ج ۲۔ ۱۴ میں، تفسیر ابن جریر طبری ج ۲۵۔ ۶۱ میں، ملاجیون کی تفسیر احمدی میں اور شیعوں کی سب سے پہلی اور سب سے زیادہ مستند کتاب حدیث "اصول کافی" میں بھی موجود ہے تھوڑے تھوڑے الفاظ کے فرق کے ساتھ[۵] ۔ اس لئے صحیح حدیثیں وہی ہیں جو قرآن کے مطابق ہوں جو حدیث

۱۔ امام اعظم ابوحنیفہ کے سب سے اہم شاگرد اور تاریخ اسلام کے پہلے قاضی القضاۃ امام ابویوسف نے اپنی کتاب الرد علی سیر الاوزاعی (مطبوعہ دکن) میں حدثنا الثقۃ کہہ کر یہ حدیث بیان کی ہے اور اسے احناف کا بہت اہم اصول قرار دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حنفی اصول فقہ کی تمام معتبر کتابوں اصول سرخی اور اصول بزدوی سے لے کر نور الانوار اور اصول الشاشی تک میں اس حدیث کو پیش

بھی خلاف قرآن ہو خواہ وہ کیسے ہی قوی سے قوی اور اعلیٰ سے اعلیٰ اسناد سے کیوں نہ مروی ہو اور کتنے ہی طرق سے اسکی روایتیں آئی ہوں یقیناً اس کے وہ تمام طرق موضوع و مکذوب ہیں۔

سکوت قرآن

کہا جاتا ہے کہ جو حدیث قرآن کے موافق ہو تو وہ تو فریقین کے نزدیک صحیح ہے اور جو حدیث قرآن کے مخالف ہو وہ فریقین کے نزدیک غلط اور موضوع ۔ مگر تیسری قسم کی ایسی حدیث بھی ہوسکتی ہے جو ایسے مضامین پر مشتمل ہو جن سے قرآن خاموش ہے اس لئے ایسی حدیثیں اگر قرآن کے موافق نہیں ہیں تو مخالف بھی تو نہیں ہیں۔

مگر یہ سخت دھوکا ہے۔ اگر وہ حدیثیں دینی احکام، شرعی اور اوامر و نواہی اور حلال و حرام کے متعلق نہیں ہیں یعنی غیر تشریعی ہیں اور درایت کے بھی خلاف نہیں تو غیر تشریعی ہونے کی وجہ ہوسکتا ہے کہ وہ صحیح ہوں ۔ تو غیر تشریعی حدیثیں ہمارا موضوع بحث نہیں ہیں ۔ اور اگر دینی احکام اور حلال و حرام سے ان کا تعلق ہے اور ایسے احکام اور ایسے حلال و حرام بیان کر رہی ہیں جن سے قرآن خاموش ہے تو ایسی حدیثیں ضرور قرآن کے خلاف ہیں ۔ ایک موٹی بات تو یہی ہے کہ قرآن جس مسئلے میں خاموش ہے حدیث اگر قرآن کے موافق ہے تو اس کو بھی خاموش ہی رہنا چاہیئے۔ ایسی جگہ حدیث کا زبان کھولنا ضرور قرآن کی مخالفت ہے۔

کر کے اس اہم اصول کی تائید کی جاتی ہے۔عالم اسلام میں حنفی حضرات کل مسلم آبادی کا دو تہائی ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اس حدیث میں بیان کردہ اصول کی صحت پر مسلمانوں کی عظیم ترین اکثریت متفق ہے۔(طاہر)

مگر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ " مثلہٗ معہٗ " ایسی حدیثوں کو قرآن کے اس دعوے سے انکار ہے کہ قرآن دین کی تمام باتوں کو بیان کر دینے کے لئے اتارا گیا ہے اور یہ کہ دین کی باتوں میں قرآن نے کوئی کمی نہیں چھوڑی ہے اگر وہ احکام جن کے متعلق قرآن خاموش ہے اور حدیث انکو بیان کر رہی ہے یہ اگر دینی احکام ہیں تو ضرور قرآن میں ان احکام کی کمی رہ گئی اور اس کا مطلب ہوگا کہ تمام دینی باتوں کو قرآن نے بیان نہیں کیا اس لئے ایسی حدیثیں قرآن کے خلاف ہی سمجھی جائیں گی۔ کیونکہ یہ حدیثیں در اصل قرآن کو ناقص ثابت کرنے کے لئے اور اس کے دعویٰ جامعیت کو غلط قرار دینے کے لئے منافقین و ملحدین نے گھڑی ہیں ایسی ناپاک باتیں نعوذ باللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں تو کیا ہونگی کسی سچے ایماندار مومن کا بھی قول نہیں ہوسکتیں ۔ محدثین اپنی روایت پرستی کے تحت ان حدیثوں کے معنوی فساد اور اندرونی فتنوں کو نہ سمجھ سکے اور ان کو اپنے مزعومات کے لئے بزعم خود سند اور حجت سمجھتے ہوئے ان کو اپنی کتابوں میں درج کرنے لگے۔

منافقین کے مراکز

منافقین نے جھوٹی اور مفسدانہ حدیثیں گھڑنے کے اور اسلام کے خلاف مسلسل جدو جہد جاری رکھنے کے لئے جو مراکز بنا رکھے تھے ان میں سب سے پہلا مرکز تو خراسان تھا۔ پھر دوسرا مرکز کوفہ اور تیسرا مرکز شام بنا ایران میں نیشا پور بھی ایک وقت میں اچھا خاصہ مرکز ان منافقین کا رہا ہے مگر آخر میں مستقل اور سب سے بڑا مرکز کوفہ ہوگیا خراسان میں مرو، موصل اور شام کے درمیان نصیبین کا علاقہ، اور شام

کے شہروں میں حمص اس میں بہت پیش پیش رہا اور پھر دمشق، قیساریہ فلسطین اور مصیصہ وغیرہ ان منافقین کی خاص خاص اشاعت گاہیں تھیں قدیمی ٹکسال تو خراسان اور اس کے مشہور قصبے مثلاً مرو وغیرہ تھے اور نیشاپور، بخارا اور پھر کوفہ۔ بعد کو ٹکسال بنتے گئے مگر کوفہ چونکہ اس طبقے کے اکابر کا آخر میں مرجع بن گیا اس لئے سب سے بڑی ٹکسال کوفہ ہی بن کر رہا۔ مگر شام کے علاقہ میں حمص، مصیصہ دمشق وغیرہ میں بھی ٹکسال کا انتظام ضرور تھا۔ ٹکسالوں میں جھوٹی جھوٹی حدیثیں باہمی صلاح و مشورہ سے گھڑی جاتی تھیں اور ان اشاعت گاہوں سے ان کی اشاعت کا سلسلہ جاری کیا جاتا تھا۔ یہ ایک زبردست سازش کے ماتحت سلسلہ جدو جہد تھا جس میں ہزاروں آدمی کام کر رہے تھے۔ خاص منافقین تو تابعین کے زمرے میں داخل ہوکر عامۃ المسلمین میں اپنا کافی رسوخ پیدا کر چکے تھے جن کی تعداد کئی سو سے کم نہ ہوگی۔ مگر ان کے تلامذہ و ذریات جو تبع تابعین سمجھے جاتے تھے وہ شام و عراق و مصر میں بہت کافی پھیلے ہوئے تھے جن میں منافقین کی تعداد تو کم تھی مگر وہ منافقین کے تربیت یافتہ تھے اس لئے منافقین عجم کے برابر آلہ کار بنے رہے اور ان کی گھڑی ہوئی حدیثوں کو صحیح سمجھ کر ان کی اشاعت ایک دینی خدمت سمجھکر تا زندگی کرتے رہے۔

مثلہٗ معہٗ کی روایت کا جائزہ

ابو بکر خطیب بغدادی (ولادت ۳۹۲ھ متوفی ۴۶۳ھ) نے اپنی کتاب کفایہ کے ۸ سے ۱۲ تک اس حدیث کے جتنے طرق ان کو ملے ان سب کو جمع کر دیا ہے اور ایک باب ہی اس کا اس عنوان سے باندھا ہے: باب

ماجاء فی التسویة بین حکم کتاب اللہ تعالیٰ و حکم سنة رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی وجوب العمل و لازم التکلیف

" یعنی یہ باب ہے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ دونوں کے حکم کی حیثیت سے برابر ہونے میں اور وجوب عمل اور تکلیف شرعی کے عائد و لازم ہونے میں یکساں ہونے میں۔ جہاں تک نفس عنوان کا تعلق ہے وہ تو بالکل صحیح ہے اسلئے کہ سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تو معنی ہی یہ ہیں کہ کتاب اللہ کے احکام کی تعمیل جس طرح خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کی، اور رسولؐ کی تعلیم کے مطابق صحابہؓ نے کی، اسی کو قرآن میں دوسری جگہ اسوۂ حسنہ فرمایا گیا ہے ۔ یہ چیز امت کو ہزاروں صحابہؓ کرام کے تعامل کے ذریعے حاصل ہوئی جسے پہلے والے بعد والوں کو اسی تعامل و توارث اور تواتر کے ذریعے پہونچاتے رہے ۔ انہی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ما انا علیہ و اصحابی سے تعبیر فرمایا۔ یعنی میرا وہ طریقہ جس پر صحابہؓ کرام عمل پیرا رہے کیونکہ بعض احکام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے خاص تھے اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع میں کسی کام کو صحابہؓ کرام نے اختیار کیا تو وہ کام ہم سے بھی مطلوب ہے اس لئے سنت رسولؐ حاصل کرنے کا مستند ذریعہ سنت صحابہؓ ہے یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے راہ صحابہؓ کو سبیل المومنین (۴-۱۱۵) فرمایا (اس پر میری ایک مستقل کتاب بھی شائع ہو چکی ہے) ۔ اگر تعامل صحابہؓ سے ہٹ کر صرف احادیث کا مطالعہ کیا جائے تو سوائے ذہنی انتشار کے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ تمام باطل فرقوں کا طریقہ یہی رہا ہے کہ وہ سنت صحابہؓ سے قطع نظر کر کے اپنے حق میں مختلف روایات پیش کر کے ان پر اپنی عمارت کی بنیاد قائم کر لیتے ہیں۔

صحیح طریقہ یہ ہے کہ ہم دیکھیں کہ کسی کام کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابی خلفاء کے زمانہ میں عام طور پر سب لوگ کرتے تھے یا نہیں قرآن کریم کی تعمیل جس طرح عہد نبوی اور عہد صحابہؓ میں ہوئی ہمیں بھی اسی کی اتباع کرنی چاہئے کیونکہ قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا ہے من یطع الرسول فقد اطاع الله - جس نے اسوۂ رسولؐ کی تعمیل کی اس نے درحقیقت اللہ کی اطاعت کی (۴-۸۰) اور فرمایا و من یتبع غیر سبیل المومنین نولہ ماتولی و نصلہ جھنم (۴-۱۱۵) جس نے تعامل صحابہؓ کے علاوہ کسی اور راہ کو اختیار کیا وہ جہنمی ہے - اس سے واضح ہے کہ جس طرح اللہ کی اطاعت محمد رسولؐ کی اطاعت ہی سے ممکن ہے اسی طرح رسولؐ کی اطاعت صحابہؓ کرام ہی کے ذریعے ممکن ہے - مگر ان محدثین کے ہاں تو مراد ہی کچھ اور ہے- ہر حدیث مروی کو سنت قرار دیکر تمام حدیثوں کو وجوب عمل میں قرآن کا ہم پلہ بنانا ان کا مقصود ہے جیسا کہ اس قسم کی حدیثوں سے ظاہر ہے- اس لئے اس باب میں جو حدیثیں جمع کی گئی ہیں ان کو دیکھئے اور عبرت حاصل کیجئے-

طُرق روایات

یہ حدیث مختلف الفاظ و عبارت میں طول و مختصر متعدد طرق سے پانچ صحابیوںؓ سے اور تابعی سے مرسلاً مگر مرفوعاً مروی ہے-

(۱) حضرت مقدام بن معدی کرب الکندی الشامی سے جو شام ہی میں رہے اور شام ہی میں ۸۷ ھ میں ۹۱ برس کی عمر پاکر فوت ہوئے - ان سے دس طرق سے مروی ہے-

(۲) حضرت ابو رافع مولیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو کوفہ میں رہے

اور بقول صحیح حضرت علیؓ کے زمانہ خلافت میں فوت ہوئے ان سے چھ طرق سے مروی ہے۔

(۳) حضرت عریاض بن ساریہؓ جو اصحاب صفہ میں سے تھے اور شام میں آکر رہ گئے تھے اور شام ہی میں ۷۵ ھ میں وفات پائی۔ ان سے صرف ایک ہی طریق سے مروی ہے۔

(۴) حضرت جابر بن عبداللہ الخزرجی السلمی الانصاری، جن کے سال وفات کے متعلق بہت اختلاف ہے۔ ۷۳۔ ۷۴۔ ۷۷۔ ۷۸ اور ۹۴ ھ یہ سب لوگوں نے لکھا ہے ۔ ابن عبدالبر نے استیعاب میں ۷۴ ھ یا ۷۸ ھ لکھا ہے۔ مدینہ میں وفات پائی۔ ان سے دو طریق مروی ہیں۔

(۵) حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے بھی دو طریق مروی ہیں، ایک تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول کہکر اور دوسرا حضرت فاروق اعظمؓ کی طرف منسوب ہے۔

(۶) چھٹا قول علقمہ بن قیس الکوفی کا ہے جس کو مرفوعاً یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرکے انھوں نے روایت کیا ہے۔ حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات ہی میں مگر جس سال آپ ؐ کی وفات ہوئی ہے اسی سال ان کی پیدائش ہے اسلئے بلاواسطہ ان کی روایت مرسل ہے متصل ہنیں۔ ان کی وفات اور عمر میں بہت سے اقوال ہیں ۶۲۔ ۶۳۔ ۶۵۔ ۷۲۔ ۷۳ سب لوگ لکھ گئے ہیں اور نوے برس کی عمر بتائی ہے جو کسی طرح صحیح ہنیں ہوسکتی ۔ جب ۱۰ یا ۱۱ ھ میں ان کی ولادت ہے اور زیادہ سے زیادہ ۷۳ ھ میں ان کی وفات ہے تو ان کی عمر ۶۳ برس کی ٹھہرتی ہے ۔ بہر حال ان سے صرف ایک طریق مروی ہے۔

ان بائیس طرق میں سے گیارہ طرق تو خطیب بغدادی کی کتاب کفایہ میں ہیں اور دو طرق سنن ابو داؤد میں، اور دو ترمذی میں اور دو ابن ماجہ میں۔ اور دو سنن دار قطنی میں اور تین مسند امام احمد میں ۔ بہت مناسبت کے ساتھ ان کتابوں میں یہ حدیثیں داخل کی گئیں۔

قابل غور نکتہ

یہ حدیثیں اکابر صحابہؓ مہاجرین و انصار سے مروی نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرات خلفائے راشدین اور اجلہ صحابہؓ اس حدیث سے بالکل بے خبر تھے ۔ جو صحابہؓ شام ہی میں رہے اور وہیں وفات پائی، یا کوفہ میں رہے یا اصاغر صحابہؓ سے یہ حدیثیں روایت کی گئی ہیں ۔ حضرت جابر بن عبداللہ اس قدر کم عمر تھے کہ جنگ بدر و جنگ احد میں شرکت سے ان کو ان کے والد نے روک دیا تھا اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ تو وفات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت زیادہ سے زیادہ ۱۳ برس کے تھے۔

دوسری بات قابل غور یہ ہے کہ امام مالکؒ کی موطاء اور صحیح بخاری و صحیح مسلم یہ تین کتابیں جو علمائے حدیث کے نزدیک سب سے زیادہ معتبر ہیں ان روایتوں سے بالکل خالی ہیں۔ خطیب بغدادی کو نیشا پور میں یہ حدیثیں ملیں۔ مگر امام مسلم جو خود نیشا پوری تھے ان حدیثوں سے بالکل بے خبر رہے۔

آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ جس طرح اکابر صحابہؓ ان حدیثوں سے بالکل بے خبر رہے اسی طرح اکابر محدثین بھی ان حدیثوں سے بے خبر

رہے مسند احمد کے متعلق تو میرا ایک مضمون التاریخ المستند لمسند الامام احمد اس بحث کے بعد آرہا ہے یہ ساٹھ ہزار حدیثوں کا مجموعہ دراصل امام احمد بن حنبلؒ کے بہت بعد ایک جماعت و ضاعین و کذابین نے مل کر مرتب کیا تھا اس کو امام احمد بن حنبل یا ان کے صاحبزادے عبداللہ سے کوئی سروکار نہیں ۔ اس لئے مسند احمد میں ان حدیثوں کے ہونے سے دھوکا نہیں کھانا چاہیئے وہ تو موضوعات و مکذوبات کا خزانہ ہی ہے اگر اس میں یہ حدیثیں نہ ہوتیں تو تعجب ہوتا۔ بلکہ اس پر تعجب ہے کہ عرباض بن ساریہ والی روایت مسند احمد میں نہیں ہے۔ جابر بن عبداللہ والی حدیث ہے اور نہ ابن عباسؓ والی۔ حالانکہ بعض اکابر محدثین کا قول ہے کہ جو حدیث مسند احمد میں نہ ہو سمجھ لو کہ وہ مشتبہ ہے اس لئے کہ تمام کے ذخائر اس میں مجتمع ہیں۔

مشکوٰۃ میں بھی عرباض بن ساریہ کی حدیث نقل کی ہے اور ابو داؤد کا حوالہ دیا ہے ۔ مگر تعجب ہے کہ ابو داؤد کے متداول نسخوں میں یہ حدیث باوجود کافی جستجو کے نہیں ملی مگر خود صاحب مشکوٰۃ لکھتے ہیں کہ ابو داؤد کے سلسلہ روایت میں اشعث بن شعبہ المصیصی کا نام بھی آتا ہے ، اور ان کے متعلق ائمہ رجال کو کلام ہے ۔ یہ اشعث صاحب خراسانی ہیں۔ شام کے مشہور قصبہ مصیصہ[۱] میں سکونت اختیار کرلی تھی۔ حافظ ازدی نے ان کو ضعیف الحدیث لکھا ہے ۔ اسی کی طرف صاحب مشکوٰۃ نے

۱۔ "مصیصہ" لب اللباب میں بکسر میم و تشدید صاد اول لکھا ہے مگر قاموس میں مصیصہ کو بفتح اول اور بغیر تشدید کے "سفینۃ" کے وزن پر لکھا ہے اور تصریح کردی ہے کہ ولا تشدد۔ ابو العلاء المعری کا یہ مصرعہ بھی صاحب قاموس کی تائید کر رہا ہے۔ لولا المصیصی کان المجد فی مضر مگر ابن السمعانی کتاب الانساب میں صاحب لب اللباب ہی کی تقلید کر رہے ہیں اور بالکسر بتشدید صاد اول لکھتے ہیں۔ (تمنا)

اشارہ کیا ہے۔

متن حدیث

ان بائیس طرق کی ہر حدیث کو معہ اسناد لکھنا اور ان کا ترجمہ پیش کرنا بہت طوالت طلب ہے ۔ اس لئے چونکہ ان تمام طرق میں سب سے زیادہ روایتیں حضرت مقدام بن معدی کرب سے مروی ہیں اس لئے انھیں سے جو سب سے بڑی اور مکمل حدیث روایت کی گئی ہے میں اسی کو نقل کرکے اس کا ترجمہ کر دیتا ہوں ۔ باقی حدیثوں کو اسی پر قیاس کر لیجئے ۔ اختلاف الفاظ و اضطراب مضامین کو کہاں تک دکھاؤں گا۔ نفس مضمون حدیث کے اختلاف و اضطراب سے قطع نظر کرکے صرف ان کے راویوں کو دیکھئے ۔ اسی قدر ایک دیانتدار انصاف پسند کے سمجھنے کے لئے کافی ہے ۔تو حضرت مقدام سے یوں روایت کی گئی ہے۔

(قال ابو بكر الخطيب في الكفايه) اخبرنا ابو محمد الحسن بن على بن احمد بن بشار النيسا بو رى بالبصره قال ثنا ابو بكر محمد بن احمد بن محمويه العسكرى قال ثنا سليمان بن عبدالحميد البهرانى قال ثنا على بن عياش و ابو اليمان قالا حد ثنا حريز بن عثمان قال حد ثنى عبدالرحمن بن ابى عوف الجرشى عن المقدام بن معديكرب عن رسول الله صلى الله عليه وسلم ان قال الا انى او تيه الكتاب و مثله معه ، الا انى قد او تيت القران و مثله - الا يو شك رجل شيعان على اريكه بقول عليكم بهذا القران فما و جد تم فيه من حلال فاحلوه - و ما و جد تم فيه من حرام فحرموه - الا لايحل لكم الحمار الا هلى و لا كل ذى ناب من السباع و لا لقطة من مال معاهد الا ان يستغنى عنها صاجها-

یعنی ابو بکر خطیب بغدادی نے اپنی کتاب کفایہ میں لکھا ہے کہ ہمیں خبر دی ابو محمد الحسن بن علی بن احمد بن بشار النیسابوری نے بصرہ میں ان سے حدیث بیان کی ابو بکر محمد بن احمد بن محمویہ العسکری نے ان سے بیان کی سلیمان بن عبدالحمید البھرانی نے ۔ ان سے علی بن عیاش اور ابوالیمان (حکم بن نافع) نے ۔ ان دونوں نے کہا کہ ہم سے حدیث بیان کی حریز بن عثمان نے ۔ انھوں نے کہا کہ ہم سے حدیث بیان کی عبدالرحمان بن ابی عوف الجرشی نے انھوں نے حضرت مقدام بن معدی کرب سے انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ یاد رکھو کہ میں کتاب دیا گیا ہوں اور اس کے مانند (اور بھی) اسی کے ساتھ ۔ یاد رکھو کہ میں قرآن دیا گیا ہوں اور اس کے مانند ۔ یاد رکھو کہ عنقریب ایک شخص جس کا پیٹ بھرا ہوگا اپنے تخت پر بیٹھا ہوا کہے گا کہ لازم پکڑ لو اسی قرآن کو ۔ تم جو کچھ اس قرآن میں حلال پاؤ اس کو حلال سمجھو اور جو کچھ اس میں حرام پاؤ اس کو حرام سمجھو[1] ۔ یاد رکھو

۱۔ غالباً یہ اشارہ اس حدیث کے گھڑنے والے رافضی نے صدیق اکبرؓ کی طرف کیا ہے۔ کیونکہ محدثین نے انھیں کا یہ ارشاد نقل کیا ہے جب کہ امام ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں بیان کیا ہے اور مولانا مناظر احسن گیلانی نے بھی اپنی کتاب تدوین حدیث میں اسے درج کیا ہے کہ صدیق اکبرؓ نے رسول اللہ کی وفات کے بعد لوگوں کو جمع کیا اور فرمایا کہ تم لوگ رسول اللہ سے ایسی حدیثیں روایت کرتے ہو جن میں باہم اختلاف کرتے ہو اور تمہارے بعد کے لوگ اختلاف میں زیادہ سخت ہو جائیں گے۔ پس چاہیئے کہ رسول اللہ کی طرف منسوب کر کے کوئی بات نہ بیان کیا کرو۔ پھر اگر تم سے کوئی کچھ پوچھے تو کہہ دیا کرو کہ بیننا و بینکم کتاب اللہ فاستحلوا حلالہ وحرموا حرامہ ہمارے اور تمہارے درمیان اللہ کی کتاب موجود ہے۔ اسکے حلال کو حلال سمجھا اور اسکے حرام کئے ہوئے کو حرام قرار دو۔ (تدوین حدیث مطبوعہ مجلس علمی کراچی ص ۳۲۱) علامہ تمنا کے اسی مضمون کے آخر میں خود بخاری کے حوالہ سے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا اسی قسم کا ارشاد نقل کیا گیا ہے جس سے صدیق اکبرؓ کی تائید اور اس رافضانہ روایت کی تردید ہوتی ہے جس میں قرآنی چیلنج فلیاتوا بحدیث مثلہ (۳۴-۵۲) کا مقابلہ کر کے مثلہ معہ کو مسلمانوں سے منوانے کی کوشش کی گئی ہے۔

تمہارے لئے اہلی حمار (پالتو گدھے) کا گوشت حلال نہیں اور نہ کسی نوکیلے دانت والے درندے کا گوشت ۔ اور نہ پڑا ہوا مال کسی ایسے کافر کا جس سے صلح کا معاہدہ ہو چکا ہو مگر یہ کہ وہ اپنے اس مال سے بے پرواہ ہو چکا ہو۔[1]

یہی روایت ہے جو تھوڑے ادل بدل اور کمی بیشی کے ساتھ بائیس طرق سے پانچ صحابہؓ اور ایک تابعی سے مروی ہے ۔ بعض روایت میں کچھ غیر معمولی اور اہم فرق ہے اس کو اس روایت کی تنقید کے وقت ظاہر کر دیا جائے گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ

بائیس طرق کے سلسلہ اسناد

حضرت مقدام بن معدی کرب کی طرف منسوب جو دس طریقوں سے

---

[1] پالتو گدھے کا گوشت خود محدثین کے نزدیک مختلف فیہ ہے حضرت عبداللہ بن عباسؓ اس کو حرام نہیں سمجھتے تھے جیسا کہ آخر کتاب میں آپ پڑھیں گے باقی رہا ان دونوں کا گوشت تو وہ قرآن ہی سے حرام ہے۔ احلت لکم بھیمۃ الانعام سے ظاہر ہے کہ غیر بھیمۃ الانعام یعنی درندے حرام ہیں۔ پڑا ہوا مال کسی کا بھی ہو جب اس کا مالک معلوم ہو یا جب تک اس کا گمان ہے کہ اس کا مالک آجائے گا اس وقت تک عقلاً حرام ہے اور قرآن سے بھی معاہد کفار یا ذمیون کا معاملہ وہی ہے جو عام مسلمان کا ہے۔ معاہدے جس انداز کے ہوں ان کی پابندی قرآن کی رو سے فرض ہے غیر معاہد بھی جو غیر حربی ہیں ان کے مال پر بھی بے جا تصرف جائز نہیں البتہ جو حربی ہیں جن سے جنگ جاری ہے یا جو جنگ پر تلے ہوئے ہیں ان کو ضرور ہر ممکن نقصان پہنچانا عقلاً جائز ہے۔ قرآن بھی اس کی اجازت دیتا ہے (تمنا)

یہ حدیث منسوب کی گئی ہے اس کے سلسلہ اسناد کو ملاحظہ فرمایئے:۔

یہ روایتیں جو مقدام بن معد یکرب کی طرف منسوب ہیں ان کو حضرت مقدام سے صرف دو شامی روایت کرتے ہیں ایک تو حسن ابن جابر اللخمی الشامی دوسرے عبدالرحمان بن ابی عوف الجرشی الشامی الحمصی۔ اول الذکر صاحب سے اس حدیث کے سوا اور کوئی حدیث مروی نہیں ہے ۔ یہ صرف اسی حدیث کو روایت کرنے کے لئے زمرہ رواۃ میں داخل ہوگئے یا داخل کر دیئے گے ۔ دوسرے صاحب شامی تو تھے ہی، شام کے مشہور شہر حمص کے قاضی بھی تھے اسی لئے بعضوں نے شامی تابعی ثقہ لکھدیا ہے مگر یحییٰ بن سعید القطان نے صاف کہہ دیا کہ یہ مجہول الحال ہیں یعنی ان کا ثقہ یا غیر ثقہ ہونا معلوم نہ ہوسکا۔ صرف تابعی ہونے سے ثقہ کہدینا صحیح نہیں۔

پھر اول الذکر یعنی لخمی صاحب سے معاویہ بن صالح الحمصی الشامی ہی صرف اس کی روایت کرتے ہیں۔ معاویہ بن صالح کے متعلق تہذیب التہذیب میں ہے کہ یحییٰ بن سعید ان کو بالکل پسند نہیں کرتے تھے، اور ابن معین ان کو ناپسندیدہ شخص قرار دیتے تھے اور جب عبدالرحمان بن مہدی ان کی حدیث روایت کرتے تھے تو یحییٰ بن سعید ابن مہدی کو ڈانٹتے تھے۔ اور ابو اسحٰق الفرازی نے کہا کہ " یہ شخص اس قابل نہیں ہے کہ اس کی کوئی حدیث روایت کی جائے ۔" اور ابو حاتم نے کہا کہ " ان کی حدیثیں سند و حجت نہیں ہیں ۔"

زید بن حباب الخراسانی الکوفی اس حدیث کو بواسطہ معاویہ بن صالح ہی روایت کرتے ہیں مگر ایک طریق میں بلاواسطہ یہ حسن بن جابر اللخمی الحمصی سے روایت کرتے ہیں جو نا ممکن ہے اس لئے کہ حسن بن جابر

الہٰی کی وفات ۱۲۶ھ میں ہے اور زید بن حباب کی وفات ۲۰۳ھ میں ۷۰ برس کی عمر میں ہے یعنی زید بن حباب حسن بن جابر الہٰی کی وفات کے چار سال بعد پیدا ہوئے تھے اس لئے یقیناً اس سلسلہ روایت میں جو مسند امام احمد میں مذکور ہے راوی کو دونوں کا سال وفات معلوم نہ تھا اس لئے دروغ بے فروغ کا مرتکب ہوگیا اور یہ نہیں کہا جاسکتا کہ غلطی سے معاویہ بن صالح کا نام زید بن حباب کے نام کے بعد چھوٹ گیا ہے اس لئے کہ پہلے زید بن حباب کی روایت بواسطہ معاویہ بن صالح، حسن بن جابر الہٰی سے لکھکر پھر تحویل کی نوعیت قائم کرکے زید بن حباب کی روایت بلاواسطہ حسن بن جابر سے بیان کی ہے اگر یہاں بھی معاویہ بن صالح کا نام موجود ہی ہے اور کاتب سے چھوٹ گیا ہے تو یہ اصل روایت کا اعادہ فضول ہوا، تحویل نہ ہوئی - اس لئے ضرور یہ تحویلی نوعیت معاویہ بن

۱- اصل روایت یوں ہے حدثنا عبد اللہ قال حدثنی ابی ثنا عبد الرحمن و زید بن حباب قالا ثنا معاویہ بن صالح عن الحسن بن جابر- قال زید فی حدیثہ حدثنی الحسن بن جابر قال سمعت المقدام بن معدی کرب یقول- یعنی امام احمد سے عبدالرحمن بن مہدی اور زید بن حباب دونوں نے معاویہ بن صالح سے اور انھوں نے حسن بن جابر سے روایت کی مگر تنہا زید بن حباب نے بلاواسطہ بذات خود حسن بن جابر سے بھی روایت کی)۔ ۲اس روایت کو بھی سن لیجئے قال سمعت المقدام بن معدی کرب یقول حرم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یوم خیبر اشیاء ثم قال یوشک احدکم ان یکذبنی و ھو متکی علی اریکتہ یحدیث بحدیثی فیقول بیننا و بینکم کتاب اللہ فما وجدنا فیہ من حلال استحللناہ و ما وجدنا فیہ من حرام حرمناہ - الا و ان ما حرم رسول اللہ مثل حرم اللہ - یعنی حسن بن جابر نے کہا کہ میں نے مقدام بن معدی کرب کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کے دن چند چیزیں حرام کیں پھر آنحضرت نے فرمایا کہ عنقریب تم میں کا کوئی مجھکو جھٹلائے گا اور وہ تکیہ لگائے اپنے تخت پر ہوگا میری حدیث بیان کی جائیگی تو وہ کہے گا ہمارے تمہارے درمیان کتاب اللہ ہے تو ہم لوگ کتاب اللہ میں جس کو حلال پائیں گے اس کو حلال سمجھیں اور جس کو اس

صالح کی بغایت مجروحیت کو دیکھتے ہوئے قائم کی گئی تاکہ یہ کہنے کا موقع ملے کہ زید بن حباب، معاویہ بن صالح کی وساطت ہی سے یہ روایت نہیں کر رہے ہیں کہ معاویہ بن صالح کی مجروحیت کا اثر اس روایت پر پڑے، بلکہ بلاواسطہ معاویہ بن صالح بذات خود بھی حسن بن جابر سے اس حدیث کی روایت کر رہے ہیں اس لئے معاویہ بن صالح کی مجروحیت اس حدیث پر اثر انداز نہیں ہو سکتی مگر دروغ گورا حافظہ نباشد ۔ زید بن حباب کی عمر اور حسن بن جابر کا سال وفات راوی صاحب کو یاد نہ رہا اور اس کا خیال نہ رہا کہ زید بن حباب کی تو ولادت ہی حسن بن جابر کی وفات کے تین چار برس بعد ہے اس لئے زید بن حباب کی روایت بلاواسطہ کسی کے حسن بن جابر سے کس طرح ممکن ہے؟

تو حسن بن جابر اللخمی الشامی سے جتنی روایتیں بھی حضرت مقدام بن معدی کرب کی طرف منسوب ہیں وہ سب کی سب بلا استثنا معاویہ بن صالح الشامی الحمصی ہی سے مروی ہیں اور انھیں کی من گھڑت ہیں ۔ اور ان کا حال ہم اوپر لکھ چکے ۔

اب عبدالرحمان بن ابی عوف الجرشی الحمصی جو حضرت مقدام بن

میں حرام پائیں اس کو حرام قرار دیں ۔ یاد رہے اللہ کے رسول نے جس کو حرام کیا وہ اس کے مانند ہے جس کو اللہ نے حرام کیا ہے" تقریباً بالکل انہی الفاظ میں یہی حدیث ابو بکر خطیب نے عبید اللہ بن ابی الفتح الفارسی سے ، انھوں نے ابو حفص عمرو بن محمد بن علی بن زیات سے ح اور پھر ابو بکر خطیب نے ابو الحسن علی بن طلحہ بن محمد المقری اور ابو الحسن احمد بن عمر بن روح النہروانی سے اور ان دونوں نے ابو حفص عمر بن محمد بن علی بن زیات مذکور سے اور ابن زیات مذکور نے عبداللہ بن محمد بن ناجیہ سے انھوں نے عمرو بن علی ابو حفص المصیرفی سے انھوں نے عبدالرحمن بن مہدی سے ح اور پھر ابو بکر خطیب نے علی بن محمد بن عبداللہ سے انھوں نے دعلج بن احمد سے انھوں نے ابن شیرویہ سے انھوں نے اسحٰق بن راہویہ سے اور وہ عبدالرحمن بن مہدی مذکور سے اور

معدی کرب سے روایت کرتے ہیں۔ اس سلسلہ روایت کو بھی سن لیجئے تو صرف ایک سلسلہ روایت جو دار قطنی میں ہے اس میں عبدالرحمان بن ابی عوف الجرشی الحمصی سے مردان بن روبہ الحمصی ان سے محمد بن الولید الزبیدی الحمصی۔ ان سے بقیہ ابن الولید الحمصی، ان سے ابو عتبہ احمد بن الفرج الحمصی، ان سے محمد بن سلیمان النعمانی، ان سے دار قطنی روایت کرتے ہیں۔ دار قطنی کے شیخ محمد بن سلیمان النعمانی تو بالکل مجھول الحال ہیں جن کا ذکر کتب رجال میں نہیں ملتا۔ مگر ان سے اوپر مقدام بن معدی کرب کے بعد سے ہر راوی شامی حمصی ہے۔ بقیہ بن الولید الحمصی کے متعلق ہتذیب التہذیب میں ابن حجر لکھتے ہیں کہ ہر آنے والے جانے والے سے یہ حدیث لکھ لیا کرتے تھے۔ ابن عیینہ لوگوں کو منع

عبدالرحمن بن مہدی مذکور معاویہ بن صالح سے اور وہ حسن بن جابر سے اور وہ مقدام بن معدی کرب سے۔ کفایہ میں لکھتے ہیں فرق صرف اس قدر ہے کہ اس روایت میں یوشک احد کم ان یکذبنی کا لفظ نہیں ہے صرف یوشک رجل متکی علی اریکتہ یحدیث بحدیثی الخ ہے۔ اور آخر میں مثل ماحرم اللہ کے بعد عزوجل کا لفظ بڑھا ہوا ہے اور اس کے اسناد میں زید بن حباب کا نام نہیں ہے۔ بہر حال یہ تمام طرق اور ساری تحویلات معاویہ بن صالح الشامی الحمصی کی شکم زاد ہیں۔ ان کے بعد والوں کی کثرت طرق و تحویلات اس روایت کو مطلق قوت نہیں پہنچا سکتے۔ جب کہ اس کی جڑ ہی کھوکھلی ہے اس لئے کہ جو شخص بھی اس کو روایت کرتا ہے وہ معاویہ بن صالح ہی سے روایت کرتا ہے اور ان کا حال متن میں، ہم لکھ چکے ہیں کہ یہ اس قابل نہیں ہیں کہ ان کی کوئی حدیث روایت کی جائے۔ خصوصاً جو حدیث درایت قرآنیہ کے بالکل خلاف ہو۔ بلکہ قرآن کی تکذیب کر رہی ہو۔ ان تمام حدیثوں کے الفاظ ان کا عنوان بیان اور ان کی رکاکت مضمون پکار پکار کر اپنی موضوعیت و مکذوبیت کی شہادت دے رہی ہے۔ جس کو تھوڑی سی بھی بصیرت فی الحدیث ہو وہ اسکو پہلی نظر میں سمجھ سکتا ہے۔ مگر اللہ برا کرے جذبۂ روایت پرستی کا کہ کیسے کیسے ماہرین و ناقدین حدیث اپنی غرض کے ماتحت ایسی لغو اور لچر موضوعات کو حدیث نبوی قرار دے کر اس سے استناد کرنے لگے۔ سچ ہے حبک الشئی یعمی و یصم..... آدمی غرض کے پیچھے باؤلا ہو جاتا ہے۔ حق و باطل کچھ نہیں سمجھتا۔ (تمنا)

کرتے تھے کہ بقیہ سے سنن کی حدیثیں نہ لکھا کرو۔ یہ متروکین اور ضعفاء سے روایت کیا کرتے ہیں اور ان کے ناموں اور کنیتوں میں ہیر پھیر کیا کرتے ہیں۔ ابو حاتم نے کہا کہ ان کی حدیث لکھ لی جائے مگر وہ سند وحجت نہیں ہے۔ ابو مسہر غسانی نے کہا کہ **بقيه ليست احاديثه نقية فكن منها على تقية** یعنی بقیہ کی حدیثیں (غلطیوں سے) پاک نہیں ہیں اس لئے ان کی حدیثوں سے بچتے ہی رہنا چاہیئے۔ امام احمد نے کہا کہ بقیہ نے عبیداللہ بن عمر سے بہت سی منکر حدیثیں روایت کی ہیں۔ ابن خزیمہ نے کہا کہ بقیہ کی حدیثوں کو میں حجت نہیں سمجھتا۔ امام احمد نے یہ بھی فرمایا کہ میں سمجھتا تھا کہ بقیہ صرف غیر معروف ہی لوگوں سے منکر حدیثیں روایت کرتے ہیں مگر یہ تو مشہور لوگوں سے بھی منکر حدیثیں روایت کرتے ہیں پائے جاتے ہیں۔ تو ہم نے غور کیا کہ آخر کہاں سے یہ حدیثیں لائے، تو پتا ملا کہ تدلیس کے ذریعے۔ (یعنی مجہول راویوں کا نام اڑا کر ان کی جگہ مشہور راویوں کا نام رکھدیا کرتے تھے) اور بھی بہت کچھ بقیہ کے متعلق لکھا ہے۔ بقیہ ۱۱۵ ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۹۷ ھ میں وفات پائی۔ مگر اب بقیہ کے شاگرد صاحب کا حال سنئے اس حدیث کو بقیہ سے احمد بن الفرج ابو عتبہ الحمصی روایت کر رہے ہیں۔ یہ جامع حمص میں مؤذن تھے۔ محمد بن عوف نے ان کو جھوٹا کہا اور ان کی بری حالت بتائی، ابو ہاشم عبدالغفار بن سلامہ نے بھی بیان کیا کہ ہم نے اپنے اکثر شیوخ سے ان کے جھوٹے ہونے کے متعلق سنا۔ یہ بھی صاف لکھدیا کہ بقیہ کی جو حدیث بھی یہ روایت کرتے ہیں اس کی کوئی اصل نہیں ہوتی۔ ان کی حدیثوں کے متعلق یہ اکذب الخلق ہیں۔ اتنی تصریح کے بعد دار قطنی کی اس روایت کے متعلق کچھ کہنے کی اب ضرورت باقی نہیں

معلوم ہوتی۔

اب ایک آخری سلسلہ حضرت مقدام بن معدی کرب کی طرف منسوب حدیث کا رہ گیا اور وہ صرف حریز بن عثمان الحمصی سے چلتا ہے یہ حریز صاحب ہنایت کٹر قسم کے خارجی مشہور ہیں، ان کا معمول تھا کہ صبح شام ستر ستر مرتبہ حضرت علی رضی اللہ عنہ پر لعنت کیا کرتے تھے اور مسجد میں جاتے تھے تو نماز کے بعد بغیر ستر مرتبہ لعنت کئے مسجد سے باہر ہنیں نکلتے تھے۔ شیعوں نے ایک جھوٹی حدیث بنا کر جو مشہور کی کہ انت منی بمنزله هارون من موسیٰ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو فرمایا کہ تم میرے لئے ویسے ہی ہو جیسے ہارونؑ موسیٰؑ کے لئے تھے، تو اس کو سن کر حریز حمصی نے کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں ہنیں فرمایا تھا بلکہ یوں فرمایا تھا کہ انت منی بمنزله قارون و من موسیٰ- تم میرے لئے ویسے ہی ہو جیسے موسیٰؑ کے لئے قارون تھا- معاذ الله من ذالک-

مگر تعجب ہے کہ ان کے بعض شیوخ بھی شیعے تھے اور بعض تلامذہ بھی شیعے اور حدیثیں یہ شیعوں کے مسلک کے مطابق بہت روایت کیا کرتے ہیں جس سے شبہ یہ ہوتا ہے کہ شاید یہ بھی تقیہ کی ایک شکل ہو کہ اپنے کو خارجی مشہور کرکے شیعہ مذہب کے مطابق روایت کرتے رہو کہ یہ کہنے کا موقع ملے کہ یہ حدیث تو ایک سخت کٹر خارجی روایت کر رہا ہے۔ کوئی شیعہ اس کا راوی ہنیں ہے۔ بہر حال محدثین ان کی حدیثیں روایت کرتے ہیں اور ان کو ثقہ سمجھتے ہیں مگر آپ کو ان کا حال معلوم ہوگیا کہ یہ شامی ہیں حمصی ہیں اور شیعوں نے ایک جھوٹی حدیث بنائی تو انھوں نے اس کے جواب میں اس سے زیادہ ناپاک جھوٹی حدیث بنا کر

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اس کی تہمت لگائی۔ کیا اس پر بھی یہ ثقہ ہی رہیں گے؟

تو اب ان حریز سے یزید بن ہارون الواسطی العراقی ان سے احمد بن حنبل، ان سے عبداللہ بن احمد روایت کرتے ہیں۔ یزید بن ہارون واسط کے رہنے والے بین العراقین یعنی کوفہ و بصرہ کے درمیان شہر واسط ان کا گھر تھا ان کے متعلق تہذیب التہذیب میں ہے کہ لا یمیز و لا یبالی عمن روی یہ کچھ تمیز نہیں کرتے تھے اور کچھ پرواہ نہیں کرتے تھے کہ کس سے روایت کر رہے ہیں۔ آنکھ سے معذور ہوگئے تھے تو اپنی لونڈی سے اپنی کتاب نکلوا کر لوگوں کو حدیث اس سے پڑھوا کر روایت کیا کرتے تھے جس سے حدیث لکھواتے تھے اس کا نام ہارون تھا وہ ان کی حدیثوں میں گھٹا بڑھا دیا کرتا تھا تو اس کو ڈانٹتے تھے اور کہتے تھے کہ تم جو کچھ کر سکتے ہو کرو مجھکو تیئس ہزار حدیثیں یاد ہیں مگر پھر بھی لونڈی سے پڑھوا پڑھوا کر حدیث روایت کرتے تھے۔ اور اسی کاتب کے ہاتھ کی لکھی ہوئی حدیثیں۔

تہذیب التہذیب میں ضحاک بن عبدالوہاب کا قول حریز کے متعلق لکھا ہے هو متروک متهم۔ ازدی، ابن عدی وغیرہ نے ان کے متعلق لکھا ہے کہ ان سے روایت کرنا نہیں چاہیئے۔ لیکن مسند امام احمد کے متعلق تو ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ اس کو وضاعین و کذابین ہی نے مرتب و مدون کیا ہے اس لئے اگر عالی سے عالی اسناد کے ساتھ بھی مسند احمد میں کوئی حدیث درایت قرآنیہ کے خلاف ہو تو اس کو موضوع ہی سمجھنا چاہیئے۔ متن حدیث کے ساتھ ساتھ اس کے وہ اسناد بھی موضوع ہیں۔ غرض مسند احمد کی کوئی حدیث بھی حجت و سند نہیں ہو سکتی۔

دوسرا طریق سنن ابو داؤد والا ہے جس کو حریزی عثمان سے ابو عمرو بن کثیر بن دینار ان سے عبدالواہاب بن نجدہ ان سے ابو داؤد روایت کرتے ہیں۔ مگر نہ فقط شارحین ابو داؤد بلکہ دنیائے محدثین کو حیرت ہے کہ یہ ابو عمرو بن کثیر کون شخص ہے تمام شارحین ابو داؤد نے تمام کتابیں اسماء الرجال کی چھان ماریں مگر اس نام کا کوئی آدمی ملتا ہی ہنیں خلیل احمد دیو بندی رحمتہ اللہ اپنی کتاب البذل المجہود فی شرح سنن ابی داؤد میں اس حدیث کی شرح لکھتے ہوئے، لکھتے ہیں کہ ابو داؤد کے تمام قلمی و مطبوعہ نسخوں میں اسی طرح ہے مگر میں نے اسماء الرجال اور حدیث کی تمام کتابیں چھان ڈالیں کہیں بھی اس نام کے مسمیٰ کا پتہ نہ چلا۔ یہی خال شمس الحق" صاحب عون المعبود شرح سنن ابی داؤد کا ہے۔ بلکہ انھوں نے یہ بھی لکھدیا کہ منذری کے نسخہ ابو داؤد میں یہ حدیث ہی ہنیں ہے۔ غرض یہ ایک مفقود الخبر اسم بے مسمیٰ سے روایت ہے اس کا کیا اعتبار ہو سکتا ہے اور اس حدیث کو جو اس اسم بے مسمیٰ سے روایت کر رہے ہیں۔ عبدالوہاب بن نجدہ یہ بھی حمصی ہی ہیں اس لئے ممکن ہے کہ اگر واقعی ابو عمر بن کثیر بن دینار کوئی شخص تھا تو حمصی ہی ہوگا جو ایسا گمنام ہے جس کا کہیں پتہ ہنیں ملتا کیوں کہ عبدالرحمن بن ابی عوف الجرشی خود بھی حمصی تھے اور ان سے جتنے طرق سے بھی یہ حدیث روایت کی گئی ہے ان میں صرف حمصی ہی حمصی نظر آتے ہیں۔

اب ایک طریق اور باقی رہ گیا جس کو حریز بن عثمان الحمصی سے ابوالیمان حکم بن[1] نافع الحمصی اور علی بن عیاش[2] الحمصی دونوں روایت کرتے ہیں اور ان دونوں سے سلیمان[3] بن عبدالحمید البہرانی الحمصی روایت

۱۔ ابوالیمان مات علی ماقال البخاری ۲۲۲ھ۔ ۲۔ علی بن عیاش ولادت ۱۴۳ھ وفات ۲۱۹ھ۔
۳۔ سلیمان وفات ۲۷۴ھ بعمر ۵۹ سال (تمنا)

کرتے ہیں - یہ سلیمان بن عبدالحمید البہرانی الحمصی ۵۹ برس کی عمر میں ۲۷۴ ھ میں دنیا سے رخصت ہوئے اور ابو الیمان کی وفات ۲۲۲ ھ میں ہے اس لئے ابو الیمان کی وفات کے وقت یہ بہرانی صاحب سات برس سے زیادہ کے نہ تھے اور علی بن عیاش کی وفات ۲۱۹ ھ میں ہے اس لئے ان کی وفات کے وقت بہرانی صاحب صرف چار برس کے تھے۔ تو یہ بہرانی، ابو الیمان اور علی بن عیاش سے کس طرح روایت کر رہے ہیں۔ جب ہی تو ان بہرانی صاحب کے متعلق امام نسائی نے فرمایا ہے کہ کذاب لیس بثقه ولا مامون - کذافی تہذیب التہذیب ج ۴ - ۲۰٦ ترجمه سلیمان بن عبدالحمید-

تو حضرت مقدام بن معد یکربؓ کی طرف منسوب تمام طرق کا حال آپ کو آئینے کی طرح معلوم ہوگیا اور یہ بھی معلوم ہوگیا کہ یہ تمام طرق شام کے مشہور شہر حمص ہی میں گھڑے گئے اور وہیں سے پھیلے۔

ابو رافع والی حدیث

دوسری حدیث وہ ہے جو حضرت ابو رافعؓ کی طرف منسوب کی گئی ہے۔ حضرت ابو رافعؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام تھے - یہ روایت ان سے ان کے صاحبزادے حضرت عبید اللہ بن ابی رافع اور ان سے سالم ابو النضر روایت کرتے ہیں۔ یہ سالم ابو النضر عمر بن عبداللہ التیمی کے آزاد کردہ غلام تھے۔ ان کی وفات ۱۲۹ ھ میں اکسٹھ سال کی عمر میں ہوئی۔ اور عبیداللہ بن ابی رافع کی وفات فتنہ عبداللہ بن الزبیر میں ۷۳ ھ میں ہوئی۔ جس وقت سالم ابو النضر صرف چار برس کے تھے اسلئے سالم ابو النضر کا بلا واسطہ عبیداللہ بن ابی رافع سے روایت کرنا عقل کے خلاف ہے - ابن حجر نے تہذیب التہذیب میں اسلم ابو النضر

کی روایت عوف بن مالک سے بھی مرسل ہی لکھی ہے اور عوف بن مالک کی بھی وفات ۷۳ھ ہی میں ہے۔ اس لئے حضرت ابو رافعؓ کی طرف منسوب حدیث کے بھی سارے طرق کو چونکہ سالم ابو النضر ہی عبیداللہ بن ابی رافع سے روایت کر رہے ہیں اور سالم ابو النضر کی روایت عبید اللہ بن ابی رافع سے بلاواسطہ صحیح نہیں ہو سکتی اس لئے یہ تمام طرق بھی حضرت مقدام بن معد یکرب کی طرف منسوب حدیث کے طرق کی طرح سرے سے موضوع اور محض افتراء اور عبید اللہ بن رافع پر بہتان ہے۔

ابو رافع والی حدیث کے راویوں میں بھی خراسانی، کوفی اور مجروحین ہی کی تعداد نظر آتی ہے۔ مگر اس شجرہ روایت کی جڑ ہی جب کٹی ہوئی ہے تو خواہ مخواہ باقی راویوں کے حالات پر بحث کرکے مضمون کو طول کیوں دیا جائے اس لئے اس حدیث ابو رافع کے متعلق اب کچھ اور لکھنے کی ضرورت نہیں محسوس کرتا ہوں۔ درخانہ اگر کس است حرفے بس است۔

عرباض بن ساریہ والی حدیث

حضرت عرباض بن ساریہ کی طرف جو حدیث منسوب کی گئی ہے اسکی راویت حضرت عرباض سے حکیم بن عمیر الحمصی کرتے ہیں اور ان سے ارطاۃ بن المنذر الحمصی، ان سے اشعث بن شعبہ الخراسانی المصیصی جن کے ضعیف الحدیث ہونے کی طرف صاحب مشکوۃ نے خود اس حدیث کو نقل کرکے اشارہ کیا ہے اور ازدیؔ وغیرہ نے جن کو ضعیف الحدیث کہا ہے ان سے محمد بن عیسیٰ بن الطباع روایت کرتے ہیں جو اذنۃ ساحل

۱۔ محمد بن الحسین ابو الفتح بن بریدہ الازدی الموصلی المتوفی ۳۷۴ھ ان کی کتاب جرح و تعدیل میں مشہور ہے ان کا ترجمہ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ ص ۱۶۶ ج ۳ میں اور ابن حجر نے لسان المیزان ص ۹ ۱۳۹ ج ۵ ہے (تمنا)

شام کے رہنے والے تھے ان سے محمد بن احمد بن الولید بن بردالانطا کی روایت کرتے ہیں ان سے مکرم بن احمد بن محمد بن مکرم القاضی۔ ان سے ابو علی الحسن بن ابی بکر بن شاذان اور ان سے ابو بکر خطیب بغدادی اپنی کتاب کفایہ میں لکھتے ہیں یہ ابو بکر بن شاذان در اصل فضل بن شاذان النیساپوری مشہور شیعہ محدث ہیں۔ ان کے بیٹے ابو علی الحسن یں نیشا پور کے رہنے والے اور کٹر رافضی تھے، یہ اور ان کے بھتیجے ابو سعید محمد بن موسیٰ بن فضل بن شاذان وضع احادیث میں بڑے ماہر تھے۔ خود شیعوں میں بھی ان دونوں چچا بھتیجے کا کوئی اعتماد و اعتبار نہ تھا۔ غیر معروف لوگوں سے باہر والوں کے سامنے روایت کیا کرتے تھے۔ چونکہ فضل بن شاذان باوجود شیعہ ہونے کے عام لوگوں میں ایک وقار و اعتماد رکھتے تھے اس لئے ان کے بیٹے اور پوتے ان کے اثر سے ناجائز فائدہ اٹھا کر باہر والوں کے سامنے اپنی من گھڑت حدیثیں روایت کیا کرتے تھے۔ سنیوں کے رجال کی کتابوں میں تو ان جیسوں کا ذکر ہونے کی کوئی خاص وجہ نہ تھی مگر غیر ثقہ ہونے کی وجہ سے شیعوں کی بھی مختصر کتابوں میں ان دونوں کا ذکر نہیں ملتا۔ البتہ علامہ تفریسی نے اپنی کتاب نقدالرجال میں ان دونوں کا ذکر کیا ہے اور دونوں کو وضاع و کذاب لکھا ہے اور پھر خطیب بغدادی جن کی ولادت ۳۹۲ھ میں ہے یہ ۴۱۵ھ میں ۲۳ سال کی عمر میں نیساپور گئے تھے۔ اس وقت ان کو اتنی مہارت کہاں تھی کہ کھوٹے کھرے کی تمیز کرتے فضل بن شاذان کا غلغلہ نیشا پور میں سنا۔ ان کے [illegible]تے سے ملے اور ان سے حدیثیں بھی لے لیں۔

مگ[illegible] یہ فضل بن شاذان صاحب کے بیٹے ابو علی الحسن جن سے روایت کر رہے ہیں یعنی مکرم بن احمد بن محمد بن مکرم القاضی یہ بالکل

مفقودالخبر شخص ہیں ان کا پتا کہیں نہیں ملتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی کوئی اسم بے مسمیٰ ہے۔ اور یہ مکرم بن احمد صاحب روایت کرتے ہیں۔ محمد بن احمد بن الولید بن بردالانطاکی سے۔ ابن حجر اور حافظ ذہبی تو ان کا ذکر نہیں کرتے ہیں، مگر ابن السمعانی نے ان کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے ۴۷۸ ھ میں ۵۹ سال کی عمر میں وفات پائی۔ مگر یہ انطاکی صاحب روایت کرتے ہیں محمد بن عیسیٰ بن اطباع سے جن کی وفات ۲۲۴ ھ میں اور ولادت ۱۵۰ ھ میں ہے۔ تو انطاکی صاحب توابن الطباع کی وفات کے وقت پانچ برس سے زیادہ کے نہیں ٹھہرتے۔ پھر یہ انطاکی روایت سے ابن الطباع سے کس طرح صحیح ہوسکتی ہے؟ دراصل یہ سلسلہ اسناد سی ابو علی حسن بن ابی بکر بن شاذان کی من گھڑت ہے۔ متن حدیث بھی گھڑلی اور اسناد بھی جوڑلئے۔ راویوں کے سنین ولادت و وفات کا یاد رکھنا خصوصاً اس وقت جبکہ یہ فن پوری طرح مرتب و مدون بھی نہیں ہوا تھا کچھ کھیل نہ تھا اور پھر کون اتنی جستجو کرتا ہے یہ سمجھکر انداز و قرائن سے کام نکالا مگر دروغ کو فروغ نہیں ہوتا۔ آخر کبھی نہ کبھی جھوٹ طشت از بام ہوکر رہتا ہے جس کے لئے اللہ تعالیٰ نے ایک ہزار برس کے بعد یہ وقت رکھا تھا۔

جابر بن عبداللہ والی حدیث

حضرت جابر بن عبداللہ کی طرف جو حدیث منسوب کی گئی ہے اس کی روایت حضرت جابر سے محمد بن عبدالمنکدر کرتے ہیں اور ان سے صرف دو شخص عباد بن کثیر اور یزید الرقاشی یزید بن آبان البصری الرقاشی کے بارے میں تہذیب التہذیب میں ہے کہ امام شعبہ فرماتے تھے کہ میں

ان سے حدیث روایت کرنے سے زنا کرنا بہتر سمجھتا ہوں ۔ امام احمد بن حنبل فرماتے تھے کہ اس کی حدیث لکھنی نہیں چاہیئے۔ یہ سخت منکر الحدیث ہے ۔ نسائی اور حاکم نے کہا کہ یہ متروک الحدیث غیر ثقہ ہے اور یہ بھی کہا کہ اس سے حدیث روایت کرنا جائز نہیں ہے ۔ وغیر ذالک۔
اور عباد بن کثیر البصری کو تو صاف وضاع و کذاب لکھا ہے ۔ عباد بن کثیر سے اس حدیث کی روایت عباد بن صہیب ۔۔۔۔ کرتے ہیں جو اپنے استاد عباد بن کثیر سے بھی زیادہ اکذب الناس ہیں۔

قیاس کن زگلستان من بہار مرا

ابن عباسؓ والی حدیث

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی طرف منسوب دو حدیثیں ابو بکر خطیب نے کفایہ میں اس موقع پر نقل کی ہیں جن میں سے ایک مذکورہ بالا قسم کی حدیث ہے وہ یہ ہے ۔ ابو بکر خطیب لکھتے ہیں کہ مجھے خبر دی حسن بن ابی طالب نے ، ان سے عمر بن احمد بن عثمان الواعظ نے ان سے احمد بن اسحاق بن البہلول نے ان سے ان کے والد (اسحاق بن بہلول) نے ۔ ان سے سمرہ بن حجر نے ان سے حمزہ بن ابی حمزۃ النصیبی نے ان سے عمرو بن دینار نے ان سے حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ ۔

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم مابال اصحاب الحشايا يكذبو نى عسىٰ احدكم يتكى وعلىٰ فراشه يا كل مما فاء الله عليه فئوتى يحدث عنى الا حاديث يقول لا ارب لى فيها- عندنا كتاب الله مانهاكم عنه فانتهوا و ما امركم به فاتبعوه -

(یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا حال ہے فرشوں

والوں کا کہ جھٹلاتے ہیں مجھ کو۔ عنقریب کوئی تم میں کوئی اپنے فرش پر تکیہ لگائے کھاتا ہوگا جو کچھ اللہ نے اس کو دیا ہے تو اس کے پاس میری حدیثوں میں کوئی حدیث بیان کی جائیگی تو وہ کہے گا کہ مجھ کو ان سے کچھ کام نہیں۔ ہمارے پاس کتاب اللہ ہے، جس سے کتاب اللہ نے تمہیں روکا ہے اس سے باز رہو اور جس کا تمہیں حکم دیا ہے اس کا اتباع کرو)۔ اس روایت میں وہ مثلہٗ معہٗ وغیرہ الفاظ تو نہیں ہیں مگر مضمون وہی ہے تو اب اس کے راویوں کو بھی دیکھ لیجئے۔ ابو بکر خطیب کے بعد ان کے شیخ سے پانچ سیڑھی تک تو مجاہیل اور غیر معروف لوگوں کے نام ہیں چھٹے صاحب حمزہ بن ابی حمزہ النصیبی ہیں جن کے بارے میں ابن حجر تہذیب التہذیب میں لکھتے ہیں کہ یہ عام طور سے جو حدیث بھی روایت کرتے ہیں وہ منکر ہی ہوا کرتی ہے اور موضوع ۔ ثقہ لوگوں سے یہ موضوع حدیثیں روایت کیا کرتا ہے۔ ابن عدی نے کہا کہ یہ خود حدیثیں گھڑا کرتا ہے۔ وغیر ذالک ۔ اب اس کے بعد اس حدیث کے متعلق نہ کچھ کہنے کی ضرورت ہے نہ کچھ پوچھنے کی۔

روایت رجم

حضرت ابن عباسؓ کی دوسری حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں ہے بلکہ حضرت عمرؓ سے منسوب ہے اور مسئلہ رجم سے متعلق ہے مسئلہ رجم کے متعلق بھی ایک مسودہ مضمون میرے پاس تیار ہے اللہ نے چاہا تو کبھی وہ بھی ہدیہ ناظرین ہو جائے گا بہر حال یہاں چونکہ یہ

---

۱ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی جو حدیث اس کے بالکل برعکس بخاری میں ہے وہ آگے متن میں آتی ہے یہ حدیث صحیح ہے یا صحیح بخاری والی؟

چیز سامنے آگئی ہے تو اس کی تنقید پیش کئے دیتا ہوں۔

ابو بکر خطیب کفایہ میں روایت کرتے ہیں حسن بن ابی بکر سے، وہ ابو سہل احمد بن محمد بن عبداللہ بن زیاد القطان سے وہ اسمٰعیل بن اسحاق القاضی سے، وہ عبداللہ بن محمد بن اسماء سے، وہ مالک بن انس سے وہ زہری سے وہ عبیداللہ بن عبداللہ بن عتبہ بن مسعود سے وہ عبداللہ بن عباسؓ سے کہ انھوں نے کہا کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث کیا اور ان پر کتاب اتاری اور جو کچھ نازل کیا تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اس میں آیت رجم بھی تھی تو ہم لوگوں نے پڑھا اس کو اور سمجھا اس کو اور یاد کیا اسکو۔[۲] اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رجم کیا اور آپ کے بعد ہم لوگوں نے رجم کیا۔ اور میں ڈرتا ہوں کہ لوگوں پر طول زمانہ گزر جائے تو کوئی شخص کہے کہ ہم کتاب اللہ میں آیت رجم نہیں پاتے ہیں تو ترک ہو جائے ایک فریضہ جس کو اللہ نے نازل کیا ہے تو بیشک رجم کتاب اللہ میں ہے حق ہے اس پر جو زنا

۲۔ آیت رجم قرآن کی دوسری آیتوں کی طرح جب اتری اور صحابہؓ نے اس کو پڑھا اور سمجھا اور یاد بھی کیا پھر اس پر عمل بھی ہوتا رہا عہد نبوی میں بھی اور عہد خلفائے راشدین میں بھی تو پھر قرآن سے اس کو خارج کس نے کیا؟ اور یہ کیوں قرآن سے نکال باہر کی گئی کہ بعد والوں کو اس کے متعلق یہ شبہ ہونے کا اسی وقت گمان ہوا تھا کہ کوئی آیت منزل من اللہ نہیں ہے؟ اگر یہ واقعی حضرت عمرؓ کا قول ہوتا تو حضرت عمرؓ ضرور اس کو واضح فرما دیتے کہ فلاں وجہ سے اس آیت کو قرآن میں نہیں لکھا گیا۔ اس روایت کے الفاظ ہی اس کے کذب و افترا کی شہادت دے رہے ہیں۔ یہ ہر لحاظ سے کسی منافق کی گھڑی ہوئی کہانی ہے۔ (تمنا)

اس پر تفصیلی بحث کے لئے ادارہ فکر اسلامی کاشانہ حفیظ، گارڈن ایسٹ کراچی کی شائع کردہ کتاب "رجم حد ہے یا تعزیر" ملاحظہ ہو جس میں رجم والی روایت اور مسئلہ رجم پر نہایت مفصل اور مدلل گفتگو کی گئی ہے اور رجم کی روایت کے خلاف مولانا عبیداللہ سندھی اور کئی مصری و عرب علماء کے دلائل پیش کئے گئے ہیں۔ (طاہر)

کرے جب کہ وہ شادی شدہ ہو مردوں سے اور عورتوں سے جب کہ متنبہ (گواہ در دلیل) اس پر قائم ہو جائے اگر وہ حمل ہو، یا اعتراف ہو۔

اس حدیث کے سلسلہ اسناد میں اسماعیل بن اسحاق القاضی کا نام آپ نے دیکھا ان کے متعلق ابن حجر لکھتے ہیں کہ کان یضع الحدیث یعنی یہ حدیثیں گھڑا کرتے تھے۔ باقی تفصیلی بحث انشاء اللہ مسئلہ رجم والے مضمون میں آئیگی یہاں اتنا ہی کافی ہے۔

علقمہ والی روایت

اب رہ گئی صرف علقمہ والی روایت یہ بھی کوئی حدیث نبویؐ نہیں ہے اور نہ اس کا کوئی صریح تعلق مثلہ' معہ' کے مضمون سے ہے۔ بلکہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا ایک استدلال ان سے روایت کیا گیا ہے وہ یہ ہے۔ ابو بکر خطیب روایت کرتے ہیں عبداللہ بن یحییٰ العسکری سے وہ محمد بن احمد بن الحسن سے وہ بشر بن موسیٰ سے وہ حمیدی سے وہ سفیان سے وہ منصور ابن معتمر سے وہ ابراہیم نخعی سے وہ علقمہ سے کہ بنی اسد کی ایک عورت عبداللہ بن مسعودؓ کے پاس آئی اور اس نے ان سے کہا کہ مجھ کو خبر ملی ہے کہ تم نے ایسے ایسے کہا ہے واشمہ[1] اور متوسمہ کے متعلق۔ تو وہ کون سی قرأت ہے دو لوحوں کے درمیان میں تو نہیں پاتی ہوں جس کو تم کہتے ہو اور میں اپنے متعلق اس کی وجہ سے گمان کرتی ہوں کہ میں ہلاک ہو جاؤں گی۔ حضرت ابن مسعودؓ نے اس سے کہا کہ جا گھر میں داخل ہو اور غور سے دیکھ۔ تو میں داخل ہوئی اور میں نے دیکھا تو کچھ بھی نہں دیکھا تو پھر نکلی اور کہا حضرت ابن مسعودؓ سے کہ میں نے تو کچھ نہیں

---

[1] یعنی گودنا گودوانے والی۔

دیکھا۔ تو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے اس سے فرمایا کیا تو نے نہیں پڑھا
ما اتکم الرسول فخذ وہ وما نھکم عنہ فانتھو ۵۹ / ۷ تو اس
عورت نے کہا کہ ہاں ۔ تو ابن مسعودؓ نے فرمایا کہ وہ یہی ہے ۔

یہ استدلال ان روایت پرست راویان حدیث کا بہت پرانا مگر سخت
بودا استدلال ہے اور اس کو قوی و مستحکم کرنے کے لئے اس استدلال کو
کبھی امام شافعیؒ کی طرف منسوب کیا ہے کبھی کسی کی طرف اور یہاں کفایہ
میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی طرف اس کو منسوب کر دیا ہے ۔ اس
سلسلہ میں ابو بکر خطیب کے شیخ اور شیخ الشیخ تو مجہول الحال ہیں۔ مگر ان
کے شیخ الشیخ کے شیخ بشر بن موسیٰ عجیب و غریب شخص ہیں معروف بھی
اور مجہول بھی مجہول اس لئے کہ رجال کی تمام کتابیں چھان ڈالئے کہیں
آپ کو بشر بن موسیٰ کا پتا نہیں مل سکتا اور معروف اس حیثیت سے کہ
اگر " بشر " کی شین پر تشدید دے کر کھڑا زبر دیدیجے اور اس کو بشّار بن
موسیٰ پڑھئے تو پھر بشار بن موسیٰ کو رجال کی جس کتاب میں ڈھونڈیئے
آپ کو مل جائیں گے ۔ مگر محدثین محض بخیال تدلیس سلسلہ روایت میں
ان کا نام ہمیشہ بغیر الف ہی کے لکھتے ہیں تاکہ ناواقف غریب کتب
رجال میں اگر بے الف والے کو ڈھونڈے تو کہیں نہ ملے اس لئے کہ اس
نام کا کوئی راویٔ حدیث ہے ہی نہیں اور الف کے ساتھ دیکھے تو سمجھے کہ

۔ یہ آیت سورہ حشر کے پہلے رکوع ۱ میں ہے ۔ مال غنیمت کی تقسیم کے
سلسلے میں وارد ہے ۔ عموم لفظ سے مفہوم کو وسعت بھی دی جائے گی تو کسی مناسبت کے ساتھ نہ
کہ بے جوڑ مال غنیمت پر صدقات و زکوۃ وغیرہ کی تقسیمیں بھی اس آیت کا عموم لفظ اثر انداز ہو سکتا
ہے نہ کہ اس کے تحت میں حدیثیں بھی زبردستی کھینچ لی جائیں ۔ بہرحال اگر حدیثیں بھی اسکے عموم
میں کھینچ کر داخل کرلی جاسکتی ہیں تو صحیح حدیثیں جو واقعی ماانکم الرسول ہوں نہ کہ وضاعین و
کذابین کی بر من گھڑت روایت ؟ جو حدیثیں قرآن کے خلاف ہوں وہ تو مانھکم عنہ میں داخل ہیں نہ
کہ ماانکم میں ۔ (تمنا)

یہ تو الف والا کوئی اور ہے۔ اور ہے درحقیقت وہی الف والا بشار بن موسیٰ جس کے متعلق ابن حجر تہذیب التہذیب میں لکھتے ہیں عمرو بن علی نے انھیں ضعیف الحدیث کہا۔ نسائی نے غیر ثقہ کہا۔ امام بخاری نے منکر الحدیث کہا۔ ابن معین نے بھی غیر ثقہ کہا اور دجالوں میں شمار کیا۔ وغیر ذالک۔ ۲۲۸ھ میں دنیا سے سدھارے۔

غرض اس باب میں جتنی حدیثیں ابو بکر خطیب بغدادی نے اپنی کفایہ میں لکھی تھیں اور بھی بعض دوسری کتابوں میں مثلہٗ معہٗ والی روائیتیں ملیں، میں نے ان سب کی تنقید کرکے دکھا دی کہ یہ سب روایتیں در اصل اہل شام خصوصاً اہل حمص و اہل نیشاپور اور خراساں و کوفہ و بصرہ و واسط والوں کی من گھڑت حدیثیں ہیں جو ایک مستقل سازش کے ماتحت گھڑی گئیں اور ان کی اشاعت کی گئی اور مصنفین کتب حدیث کی کتابوں میں کسی طرح سے داخل کرا دی گئیں جن کی کتابوں میں داخل کی جاسکیں۔

حُرمتِ حُمُرِ اہلیّہ

ان بائیس طرق میں سے بعض طرق میں حمر اہلیہ یعنی پالتو گدھے کے گوشت کی حرمت کا بھی ذکر ہے۔ چنانچہ اوپر ایک مقام پر جو حضرت مقدام بن معد یکرب سے ایک روایت بطور مثال پیش کی گئی ہے اس میں پالتو گدھے کے گوشت کی حرمت کا ذکر موجود ہے ان بائیس طرق میں سے چھ طرق میں حضرت مقدام کی طرف جو دس طرق منسوب ہیں ان میں سے پانچ طرق میں اور حضرت عرباض کی طرف تو ایک ہی حدیث منسوب ہے۔ اس ایک حدیث میں پالتو گدھے کی حرمت کا ذکر

ہے ۔ اور ابو رافع یا جابر بن عبداللہ وغیرہم کی روایتوں میں پالتو گدھے کا ذکر ہی نہیں ہے اور صرف مقدام بن معد یکرب کی دو روایتوں میں جن میں عبدالرحمان بن مہدی کا نام اسناد میں مذکور ہے یوم خیبر کا ذکر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کے دن چند چیزوں کو حرام کیا اور جو کچھ فرمایا کہ قرآن کے علاوہ بھی ہمیں قرآن ہی کے برابر ملا ہے یا جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حرام کیا وہ ویسا ہی ہے جیسا کہ اللہ نے حرام کیا وغیر ذالک ۔ یہ سب خیبر ہی کے دن فرمایا تو ان بائیس طرق میں سے صرف دو طرق میں یوم خیبر کا ذکر ہے مگر چونکہ ان بائیسوں طرق کے گھڑنے والے خراسانی، شامی، کوفی اور دوسرے عراقی وغیرہ ہیں جن میں شیعوں کی بھی کافی تعداد تھی اس لئے حمر اہلیہ کے گوشت کی حرمت کا تو ذکر کیا مگر مُتعہ کی حرمت کا ذکر کسی ایک روایت میں بھی نہیں کیا گیا حالانکہ صحیح بخاری ، صحیح مسلم کی حدیثوں میں یوم خیبر میں پانچ چیزوں کی حرمت یا ممانعت کا ذکر ہے جن میں عورتوں کے ساتھ متعہ کرنے کی حرمت کا بھی ذکر ہے اور یہ سب لغویات کہ " ہم کو قرآن ملا ہے اور " مثلہٗ معہٗ " بھی ۔ یا " جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حرام کیا وہ اس کے مثل ہے جس کو اللہ نے حرام کیا ۔" اور یہ کہ " عنقریب ایک شخص اپنے تخت پر تکیہ سے ٹیک لگائے ہوئے کہے گا کہ ہم کو حدیث کی ضرورت نہیں قرآن ہمارے لئے کافی ہے " ۔ وغیرہ ذالک یہ سب بخاری و مسلم کی کسی ایک روایت میں بھی نہیں ہے ۔

صحیح بخاری و صحیح مسلم کی حدیثیں

صحیح بخاری میں " باب لحوم الحمر الانسیہ " ایک مستقل باب باندھ کر

اس باب میں آٹھ حدیثیں درج کی ہیں جن میں سے بعض میں یوم خیبر کی تصریح موجود ہے اور بعض میں لحوم الحمر کے ساتھ سباع ذی ناب (نوکیلے دانت والے درندے) کی بھی حرمت کا ذکر ہے اور بعض میں متعہ کی حرمت کا بھی۔

اسی طرح صحیح مسلم میں بھی "باب تحریم اکل لحم الحمر الانسیہ" کے تحت میں سترہ حدیثیں نقل کی ہیں۔ ان میں بھی بعض میں یوم خیبر کا ذکر موجود ہے اور بعض میں متعہ کی حرمت کا بھی ذکر موجود ہے مگر بخاری و مسلم کی ان پچیس حدیثوں میں سے کسی ایک میں بھی وہ مثلہٗ معہٗ وغیرہ خرافات جو کفایہ و ابو داؤد و ترمذی و ابن ماجہ و مسند احمد کی بائیس حدیثوں میں مذکور ہیں کہیں ان کی طرف کوئی اشارہ بھی نہیں۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ اضافے خراسان و نیشاپور و شام و کوفہ و دیگر بلاد عراق میں بعد کو گھڑے گئے اور متاخرین کی کتابوں میں ان کے داخل کر دینے کا موقع مل گیا، مگر متقدمین کی کتابیں جن کی نقلیں کافی طور سے ممالک اسلامیہ میں اس وقت شائع ہو چکی تھیں ان میں بعد میں داخل کرنے کی گنجائش نظر نہ آئی۔ اسی لئے موطاء اور صحیح بخاری و صحیح مسلم میں یہ اضافے درج نہ ہو سکے۔

محدثین کی کتابوں میں جھوٹی حدیثیں داخل کر دی جاتی تھیں

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی اپنی کتاب تحفہ اثناء عشریہ ص۶۹ کید سی و دوم (۳۲) مطبوعہ نول کشور میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"در شہر دہلی در عہد بادشاہ محمد شاہ دو کس بود نداز امرائے ایں فرقہ یعنی مرتضیٰ خاں و مرید خاں کہ کتب اہل سنت را مثل صحاح ستہ مشکوۃ و بعضے تفاسیر بخط خوش مے نویسانیدند، ودراں احادیث مطلب خود از کتب

امامیہ برآوردہ داخل مے نمودندوآں نسخ را مجدول و مطلا مذہب نمودہ بقیمت سہل درگذری مے فروختند۔ و در اصفہان آغا ابراہیم بن علی شاہ، کہ یکے از امرائے کبار سلاطین صفویہ بود بہ ہمیں اسلوب عمل کردہ۔"

مگر یہ کوئی نیا دستور اس جماعت کا نہ تھا۔ ابتدا سے روافض اور ملاحدہ عجم جو خراسان، شام، عراق اور مصر وغیرہ میں تخریب اسلام کی جدو جہد میں لگے ہوئے تھے، ان میں سے ایک جماعت کا یہی دستور تھا چنانچہ ابن حجر تہذیب التہذیب ج ۸ - ۳۶۱ ترجمہ قتیبہ بن سعید بن جمیل میں لکھتے ہیں کان خالد المد اینی یدخل الحدیث علی الشیوخ - خالد مداینی اساتذہ حدیث کی کتابوں میں حدیثیں داخل کر دیا کرتا تھا اس کی موت ۲۱۱ ھ میں ہوئی۔

حماد بن سلمہ کے ترجے میں لکھتے ہیں کہ ان بعض الکذبتا دخل فی حدیثہ مالیس منہ بعض کذابین نے ان کی حدیثوں میں ایسی حدیثیں داخل کر دیں جو ان میں نہ تھیں۔ آگے چل کر صاف لکھتے ہیں کہ انھا دست فی کتبہ یعنی وہ حدیثیں ان کی کتابوں میں داخل کر دی گئیں۔

محمد شاہ بادشاہ کے عہد میں شہر دہلی میں دو اشخاص مرتضٰی خان اور مرید خان رہتے تھے جو فرقہ شیعہ کے امراء میں سے تھے وہ اہل سنت کی کتابوں (مثلاً صحاح ستہ و مشکوۃ اور بعض تفاسیر) کی بہت خوبصورت اور دیدہ زیب کتابت کراتے اور اپنے مطلب کی حدیثیں کتب امامیہ سے لیکر ان میں داخل کرا دیتے تھے پھر ان نسخوں کی جلد بندی اور اُن کو منقش و مطلا کرا کر بہت سستے داموں اہلِ سنت کے ہاتھوں فروخت کر دیا کرتے تھے۔ اسی طرح شہر اصفہان میں آغا ابراہیم بن علی شاہ جو سلاطین صفویہ کے امرائے کبار میں سے ایک تھا اسی طریقہ پر عمل کرتا تھا۔

ورّاقین و کاتبین

ان وضاعین و کذابین میں کچھ لوگوں نے وراقی یعنی جلد بندی اور کتابت کا پیشہ اختیار کر لیا تھا جو محدثین کے تلامذہ میں داخل ہوکر پہلے محدثین میں اپنا رسوخ قائم کرتے تھے پھر اپنا پیشہ ظاہر کرکے ان سے کتابت کے لئے یاوراقی کے لئے ان کی کتابیں لیکر ان میں --- اپنی طرف سے حدیثیں داخل کردیا کرتے تھے اور ان کی حدیثوں میں گھٹا بڑھا بھی دیتے تھے۔ ابن حجر، احمد بن جوصا کے ترجے میں لکھتے ہیں کہ ان کا ایک وراق تھا جو ان سے حدیثیں پڑھتا بھی تھا اور ان کی کتابیں نکالتا رکھتا بھی تھا۔ اس سے ان کی کچھ ان بن ہوگئ تو انھوں نے اس کی جگہ ایک دوسرا وراق رکھنا چاہا تو اس پہلے وراق نے ان کی کتابوں میں کچھ ایسی حدیثیں داخل کر دیں جو ان کی حدیثیں نہ تھیں جن کو یہ نادانستہ اپنی حدیثیں سمجھ کر روایت کرنے لگے۔ (لسان المیزان ج۔ ۱ ۔ ۲۴۰)

حبیب بن ابی حبیب ابو محمد البصری ۔ امام مالکؒ کا کاتب تھا۔ وراقی بھی کیا کرتا تھا۔ حافظ ذہبی میزان الاعتدال میں اور ابن حجر لسان المیزان میں اس کا مفصل حال لکھتے ہیں اور اس کو " اکذب الناس " لکھا ہے۔ حافظ ذہبی لکھتے ہیں کہ " مدینے میں وراقی کرتا تھا محدثین کی کتابوں کی، اور ثقہ لوگوں سے موضوع حدیثیں روایت کیا کرتا تھا۔ ان کی کتابوں میں وہ حدیثیں داخل کر دیتا تھا جو ان کی حدیثیں نہیں ہوتی تھیں۔ لکھا ہے کہ اس کی کل حدیثیں موضوع ہی ہوا کرتی تھیں۔ ۲۱۸ ھ میں مرا ۔ (میزان الاعتدال ج ۱ ۔ ۲۱۰)

غرض جب یہ زبردست سازش تھی تو اگر صحاح ستہ اور خود موطا میں بھی بعض موضوع حدیثیں داخل کر دی گئی ہوں تو اس میں تعجب کی کون سی بات ہے۔ بخاری و مسلم کو حدیث کی دوسری کتابوں کے اعتبار سے ہم بھی زیادہ صحیح سمجھتے ہیں مگر ان کی حفاظت کا وعدہ قرآن کی طرح اللہ تعالیٰ نے نہیں کیا ہے۔ اس لئے اگر ان میں بھی دوسری کتابوں سے کم ہی سہی مگر تصحیف و تحریف ہو اور کچھ غلط حدیثیں داخل کر دی گئی ہوں اور بعض صحیح حدیثیں ان میں سے نکال دی گئی ہوں تو ان منافقین و ملاحدۂ عجم کی زبردست سازش کے ہوتے کیا استحالۂ عقلی لازم آتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ حفاظت کا وعدہ صرف قرآن مجید ہی کے متعلق ہے اس لئے باوجود اتنی گہری سازشوں اور اسقدر اختلافات قرأت کے زبردست پروپیگنڈے کے ساری دنیائے اسلام میں صرف وہی ایک قرأت متواترہ و متوارثہ مروج ہے جو عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے آج تک کتابۃ تلاوۃ، قراۃ، اور حفظاً چلی آرہی ہے اور دوسری قرأتیں صرف علم قرأت کے مجلدات تفسیر اور روایات کے دفاتر اور فقہاء کی کتابوں ہی میں مدفون ہیں کتابت و تلاوت و قرأت و حفظ سے ان قراتوں کا کوئی تعلق نہیں۔ تو جو حفاظت اللہ تعالیٰ نے صرف قرآن ہی کے لئے مخصوص رکھی ہے تو اس کو صرف قرآن ہی کے لئے مخصوص رہنا چاہیئے۔ دوسری کوئی کتاب اس حفاظت و محفوظیت میں اس کی شریک نہیں ہو سکتی۔

ابن عباسؓ کی حدیث بخاری میں

مگر صحیح بخاری ہی میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت تو یہ ہے کہ انھوں نے پالتو گدھے کے گوشت کے حرام ہونے سے انکار کیا ار قرآن کی

یہ آیت پڑھی کہ قل لا اجد فیما اوحی الی محرما علی طاعم یطعمہ لآیہ یعنی حضرت ابن عباسؓ نے قرآن سے استدلال کیا کہ بس قرآن نے جن چیزوں کو حرام کیا ہے وہی حرام ہیں ان کے سوا اور کسی چیز کے حرام ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ دیکھئے بخاری باب لحوم الحمر الانسیہ ج ۲ ۔ جسکی شرح میں ابن حجر فتح الباری میں حضرت ابن عباسؓ کا ایک قول اور نقل فرماتے ہیں لکھتے ہیں کہ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ جاہلیت والے بعض چیز کھاتے تھے اور بعض چیز کو ترک کر دیتے تھے اس کو نجس سمجھ کر۔ تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو مبعوث کیا اور ان پر اپنی کتاب اتاری اور اس کتاب کے بتائے ہوئے حلال کو حلال کیا اور اسکے بتائے ہوئے حرام کو حرام کیا جس کو اس کتاب میں حلال کیا ہے وہ حلال ہے اور جس کو اس کتاب میں حرام کیا ہے وہ حرام ہے اور جس سے سکوت اختیار کیا ہے تو وہ معاف ہے اور یہ آیت پڑھی قل لا اجد آخر تک (فتح الباری ج ۲۔ صفحہ ۳۱۳ مطبوعہ مطبع انصاری دہلی) اب بتلیئے حضرت ابن عباسؓ کی طرف جس حدیث کو حمزہ بن ابی حمزہ النصیبی جیسے وضاع و کذاب کی روایت سے منسوب کرکے ابو بکر خطیب اپنی کتاب کفایہ میں نقل کر رہے ہیں وہ صحیح ہے یا حضرت ابن عباسؓ کی وہ حدیث صحیح ہے جس کو امام بخاری اپنی کتاب صحیح بخاری میں روایت کر رہے ہیں اور ابن حجر فتح الباری میں نقل کر رہے ہیں؟

مشکوۃ میں حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قرآن پانچ عنوانات پر اترا ہے حلال و حرام اور محکم و متشابہ اور امثال تو اسی کے حلال کو حلال سمجھو اور حرام کو حرام سمجھو اور محکم پر عمل کرو اور متشابہ پر ایمان رکھو اور امثال سے عبرت حاصل کرو

دوسری حدیث حضرت ابو ثعلبہ الخشنی سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ نے کچھ فرائض فرض کئے ہیں ان کو ضائع نہ کرو اور کچھ چیزوں کو حرام کیا ہے تو ان کی خلاف ورزی نہ کرو اور کچھ حدود مقرر کئے ہیں ان سے تجاوز نہ کرو اور بغیر بھول چوک کے بعض چیزوں سے قصداً سکوت اختیار کیا ہے، ان کی کرید میں نہ پڑو۔

ترک بعض وحی

اگر واقعی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن کے ساتھ مثلہ' معہ' بھی ملا تھا تو پھر آخر جس طرح آپ نے قرآن کی کتابت و تلاوت و قرأت و حفظ کا اور اسکی تعلیم کا انتظام فرمایا، حدیثوں کو کیوں بالکل چھوڑ دیا؟ کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نعوذ باللہ فلعلک تارک بعض مایوحیٰ الیک[1] کے خود سے مصداق بنے؟ یعنی جو آپ سے فرمایا گیا کہ شاید تم بعض وحی کو چھوڑ دو گے ان کفار و مشرکین کے خیال سے؟ (ہود ۲) تو آپ نے اس مثلہ' معہ' کو جو قرآن کے ساتھ آپ کو ملا تھا خود سے چھوڑ دیا اور ضائع ہونے دیا؟

سب سے پہلے حسبنا کتاب اللہ کہنے والے

اگر یہ کفایہ وغیرہ کی مثلہ' معہ' والی حدیثیں صحیح ہوتیں تو حضرت صدیق اکبرؓ پانچسو حدیثوں کو جمع کر کے جلا نہ دیتے اور حضرت فاروق اعظم (جمع سنن) کا ارادہ کر کے پھر اس سے رک نہ جاتے اور یہ نہ فرماتے کہ "حسبنا کتاب اللہ ، یعنی ہمارے لے کتاب اللہ کافی ہے

---

[1] القرآن ۱۱/۱۲

حضرت صدیق اکبرؓ حضرت فاروق اعظمؓ اور حضرت علی رضی اللہ عنہم کے بعض خطبوں میں یہ موجود ہے کہ قرآن کے بتائے ہوئے حلال کو حلال سمجھو اور قرآن کے بتائے ہوئے حرام کو حرام سمجھو اور جس چیز سے قرآن نے سکوت اختیار کیا ہے اسکی کرید میں نہ پڑو۔ چونکہ طوالت کا خوف ہے ورنہ اس مضمون کے اقوال اکثر صحابہؓ کے ملیں گے اور اسکی متعدد مثالیں مل سکتی ہیں مگر جو لوگ یستمعون القول فیتبعون احسنہ[1] اور او القی السمع و ھو شھید[2] کے مصداق ہیں الذی جاء بالصدق و صدق بہ اولئک ھم المتقون[3] کے مطابق سچی بات کے قبول کرلینے کے لئے ہر وقت تیار ہیں ان کے لئے جتنا لکھا جا چکا ہے وہی بہت کافی ہے اور جو لوگ روایت پرستی ہی کو دین سمجھتے ہیں ان کی ہٹ دھرم طبیعت کے لئے لاکھ دلائل پیش کئے جائیں وہ تو ماننے والے ہی نہیں ہیں اس لئے اسی قدر پر اکتفا کرتا ہوں۔

القرآن [1] ۱۸/۳۹ [2] ۳۷/۵۱ [3] ۳۳/۳۹

مسند احمد کی حقیقت

فتنہ پرداز راویوں نے نہ صرف یہ کہ ہزاروں جعلی حدیثیں گھڑیں، غضب یہ ہے کہ بعض دیدہ دلیروں نے ہزاروں صفحات کی پوری پوری کتابیں گھڑ کر اکابر آئمہ امت کے نام منسوب کرکے مشہور کر دیں ان میں سے ایک جعلی کتاب مسند احمد جو دس جلدوں میں تیس چالیس ہزار کے قریب روایات کا سمندر ہے۔ یوں تو حدیث کی کئی کتابیں متاخرین نے خود جمع کیں اور ان کو اگلے بزرگوں میں سے کسی کے نام کے ساتھ منسوب کر دیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عوام تو عوام ہیں بعض خواص بھی کچھ دنوں کے بعد اس نسبت سے دھوکا کھا گئے اور اس کتاب کو انھیں بزرگ کی تالیف سمجھنے لگے، جن کی طرف اس کی نسبت کر دی گئی۔ مثلاً حافظ ابن حجر نے تعجیل المنفعۃ کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ محمد بن علی بن حمزہ الحسینی نے مسند امام شافعیؒ اور مسند امام ابی حنفیہؒ کا ذکر اس طرح کیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان کتابوں کو ان بزرگوں کی خاص تالیف سمجھتے تھے۔ حالانکہ مسند شافعی کو بعض نیشاپوریوں نے کتاب الام وغیرہ سے اور بعض حدیثیں ابو العباس الاصم سے لیکر جن کو وہ تنہا ربیع بن سلیمان سے روایت کرتے تھے۔ ایک مسند شافعی مرتب کر رکھی تھی۔

اسی طرح امام ابو حنیفہؒ کے تین سو برس بعد ان سے منسوب روایات کو ابو محمد الحارثی نے امام ابو حنیفہؒ ہی کے شیوخ پر مرتب کرکے ایک مجموعہ تیار کیا اور اس کا نام مسند ابی حنیفہ رکھ دیا، اس کے بعد اسی میں سے مرفوع حدیثیں چن کر ابو بکر بن المقری نے ایک مختصر سی مسند ابی حنیفہ مرتب کی ۔ مسند حارثی ہی کی طرح ابن خسرو نے بھی ایک مسند

ابی حنیفہ جمع کی جو کافی مشہور ہے اور سب سے آخر میں خوارزمی نے ایک ضخیم جامع المسانید مرتب کر ڈالی، جو اگلی کتابوں کی جامع ہے۔

تو جب ابن حمزہ الحسینی جیسے محدث ماہر رجال، جو ابن حجر سے بھی متقدم تھے صرف نسبت کی وجہ سے دھوکا کھا گئے تو ۔ تا بدیگراں چہ رسد

مگر یہ جامعین مسند چونکہ امام شافعیؒ و امام ابو حنیفہؒ سے بہت زیادہ متاثر تھے اور پھر ان کی یہ جمع و تالیف کسی خاص اجتماعی سازش کے ماتحت نہ تھی بلکہ مختلف اشخاص کی الگ الگ کوششیں تھیں اور ہر مؤلف کی کوشش خاص اپنے ہی فرقہ کی تائید میں تھی، جس کی وجہ سے دوسرے فرقہ والوں نے ان کتابوں کی نسبتوں کو صحیح ثابت نہ ہونے دیا اور خود اس فرقہ کے ثقہ لوگوں نے بھی دوسروں کی تکذیب کی تائید کی، جیسا کہ ابن حجر نے خود اعتراف کیا کہ مسند شافعی امام شافعیؒ کی تالیف نہیں بلکہ ان سے منسوب روایات کو ان کے بہت بعد بعض نیشاپوریوں نے مسند شافعی کے نام سے جمع کیا ہے۔

بخلاف مسند امام احمد کے کہ یہ ایک خاص اجتماعی سازش کے ماتحت جمع کی گئی اور اس کے جامعین کی غرض ہی یہی تھی کہ اس کو جس طرح بھی ہو خاص امام احمد کی تالیف ثابت کر کے رہیں اور اس کا اہتمام امام احمد کی وفات کے کچھ بعد ہی سے نہیں بلکہ عجب کیا ہے کہ ان کی گوشہ نشینی کے وقت ہی سے اس کی تالیفی داغ بیل ڈال دی گئی ہو۔ و اللہ اعلم بالصواب۔ مسند امام شافعی کی جامع کی غرض اس کتاب سے مسلک امام شافعی کی تائید تھی اور مسند امام ابی حنیفہ کے جامع کی غرض اس کتاب سے مذہب امام ابو حنیفہ کی تائید تھی، اس لئے ان میں سے ہر ایک میں اپنے اپنے رنگ کی حدیثیں جمع کی گئی تھیں۔

مگر مسند احمد میں مسلک امام احمد کے موافق و مخالف ہر طرح کی رطب و یابس روایتیں جمع کر دی گئی ہیں اور اتنا بڑا ذخیرہ جمع کر دیا گیا ہے کہ ہر فرقہ کے موافق بھی کچھ حدیثیں اس میں ملتی ہیں اور مخالف بھی۔

مسند شافعی سے صرف شوافع ہی فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور مسند ابی حنیفہ سے صرف احناف ہی کام نکال سکتے ہیں۔ دوسرے فرقے والے ان کتابوں سے بہت کم مستفید ہو سکتے ہیں۔ مگر مسند احمد سے جس طرح حنابلہ مستفیض ہوتے ہیں بالکل اسی طرح شوافع و احناف و مالکیہ بھی۔ اور صوفیہ اور شیعہ کے لئے تو یہاں خزانے کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ یہاں تک کہ زنادقہ و ملاحدہ بھی اس کی بارگاہ سے محروم نہیں جا سکتے۔

عزازیل گوید نصیبے برم

یہی وجہ ہے کہ مسند شافعی سے احناف کو اختلاف ہو سکتا ہے اور ہے۔ مسند ابی حنیفہ پر شوافع وغیرہم طعن کر سکتے ہیں اور کرتے ہیں۔ مگر مسند احمد کی پالائش سب کے سب کر رہے ہیں۔ کیونکہ یہ مجموعہ کل حزب بمالد یھم فرحون کی ایک عجیب و غریب تماشا گاہ ہے۔ مسند احمد میں چونکہ ہر فرقے کے موافق بھی روایتیں ہیں اور مخالف بھی، اس لئے ہر فرقہ اس کی بعض حدیثیں لینے کے لئے جس طرح ہاتھ بڑھانا چاہتا ہے اسی طرح بعض کی طرف سے ہاتھ کھینچ بھی لیتا ہے اس کے لئے بات یوں بنائی جانے لگی کہ اس میں کچھ تو حدیثیں خاص امام احمد کی ہیں، وہ تو بالکل صحیح ہیں اور کچھ امام احمد کے صاحبزادے عبداللہ کے اضافے ہیں۔ ان میں کچھ ضعیف حدیثیں بھی ضرور ہیں اور کچھ حدیثیں عبداللہ بن احمد کے شاگرد ابو بکر قطیعی کی بڑھائی ہوئی ہیں۔ جن میں ضعیف ہی نہیں

بلکہ کچھ موضوعات بھی ہیں۔ اس تقسیم کے بعد ہر فرقے کو اس کا موقع مل جاتا ہے کہ جو حدیث اس کے موافق اس ذخیرہ میں ملتی ہے، اس کو وہ خاص امام احمد کی حدیث بتاتا ہوا اس کو دانتوں سے پکڑ لیتا ہے۔ اور جو حدیث اس کے مخالف ملتی ہے اس کو عبداللہ کے زیادات یا ابو بکر قطیعی کے اضافے قرار دیکر رد کر دیتا ہے۔

رجال کی چھان بین کرنے والوں کی کافی تعداد دوسری صدی کے اواخر ہی سے پیدا ہو چکی تھی اور یہ فن روز افزوں ترقی پر مدتوں تک رہا۔ مگر باوجود کافی تفحص اور قابل رشک دیانت داری کے مسلکی رجحانات سے آئمہ رجال بھی محفوظ نہ رہ سکے۔ اور جس طرح امام مالک و امام احمد اور بخاری و مسلم کے شیوخ سے جہاں تک ہوسکا چشم پوشی سے کام لیا گیا۔ اسی طرح ایسے لوگوں کے متعلق بھی عفوو درگذر سے حتی الوسع کام لیا گیا جن سے روایات کا کوئی خاص مقصد وابستہ تھا۔ مثلاً حفص و حمزۂ زیات وغیرہما جیسوں کے احکام و سنن کی کبھی کوئی روایت معتبر نہیں سمجھی گئی، مگر اختلاف قرأت کی روایتیں ضرور ان سے لے لی گئیں، ورنہ وہ قرأتیں جو ان سے مروی ہیں معدوم ہو جاتیں اور ان کے معدوم ہونے سے قاریوں کے نزدیک قرآن کا ایک حصہ ہی معدوم ہو جاتا۔

اسی طرح سُدّی و کلبی وغیرہما کہ ہرچند احکام و سنن میں ان جیسوں کی کوئی روایت مقبول نہیں ہوئی۔ کیونکہ یہ لوگ بالاتفاق وضاع و کذاب ہیں۔ مگر تفسیری روایتیں کم سے کم پچانوے فیصدی انہیں جیسوں سے مروی ہیں۔ اگر ان لوگوں کو نامعتبر قرار دے کر ان کی تفسیری روایتیں رد کر دی جائیں تو پھر یہ تفسیر کا ذخیرہ تو بالکل غائب ہی ہو جائے گا۔

بالکل اسی طرح مسند احمد کے دو راوی ابو بکر قطیعی جو مسند کی روایت عبداللہ بن امام احمد سے تنہا کر رہے ہیں اور ابن المذہب جو ابو بکر قطیعی سے تنہا سند کی روایت کرتے ہیں۔ اگرچہ یہ دونوں غیر متقن اور حقیقۃً ناقابل اعتبار ہیں مگر ان کو ناقابل اعتبار قرار دے کر ان کے واسطے سے جو مسند احمد کا ذخیرہ مل رہا ہے اس کو غیر مستند سمجھتے ہوئے محدثین رد کر دیتے تو پھر ایسی نعمت عظمیٰ جس سے ہر فرقہ کا کام نکل رہا ہو کہاں ملتی؟ اس لئے جس طرح قرأت کے لئے حفص و حمزہ کو گلے لگانا پڑا اور تفسیری روایتوں کی خاطر سدی و کلبی کے سامنے زانوئے ادب تہ کرنے کو گوارا کیا گیا۔ اسی طرح مسند احمد کی ضرورت نے ابو بکر قطیعی و ابن المذہب کی پالائش کرنے پر محدثین و ائمہ رجال کو مجبور کر دیا۔

پھر متقدمین نے کم از کم اتنا تو اعتراف کیا تھا کہ اس انبار روایات میں بعض موضوع روایتیں بھی ہیں مگر وہ صرف ابو بکر قطیعی کے اضافے والی روایتیں ہیں۔ چنانچہ ابن[1] جوزی و علامہ عراقی[2] نے مثالاً بعض روایتوں کو موضوع قرار دے کر پیش بھی کیا تھا مگر بعد والے اس مسند کے ساتھ اس قدر غلو پیدا کر چکے تھے کہ اس کو بھی برداشت نہ کر سکے کہ ابو بکر قطیعی پر الزام رکھتے ہوئے بھی اس کتاب میں کسی موضوع حدیث کا وجود تسلیم کیا جائے۔ چنانچہ حافظ ابن حجر متوفی ۸۵۲ھ جو خود اپنی

۱۔ ابو الفرج عبد الرحمن بن علی الجوزی۔ ولادت ۵۰۸ سے ۵۱۰ھ تک کے اندر وفات ۵۷۰ھ

۲۔ حافظ زین الدین عبد الرحیم بن الحسین العراقی ولادت ۷۲۵۔ وفات بروایت صحیحہ ۸۰۶ھ ان کی کتاب "الفیۃ الحدیث" مشہور و معروف ہے۔

کتاب لسان المیزان جلد ۲ صفحہ ۱۳۷ میں ابن المذہب ہی کے ترجمے کے آخر میں ابن المذہب اور ان کے شیخ ابو بکر قطیعی دونوں کو غیر متقن قرار دیتے ہوئے امام ذہبی کا قول نقل کر رہے ہیں کہ " اسی لئے مسند احمد میں ایسی ایسی چیزیں واقع ہوگئیں جن کی نہ تو متن ہی محکم ہے نہ اسناد ہی" انھیں ابن حجر نے ابن جوزی و عراقی کے جواب اور مسند احمد کی حمایت میں ایک کتاب لکھ ڈالی جس کا نام **القول المسدد فی الذب عن مسند احمد** ہے اس میں ان تمام حدیثوں کو جنھیں ان دونوں میں سے کسی ایک نے بھی موضوع قرار دیا تھا، صحیح ہنیں بلکہ بعض کو تو متواتر یا قریب متواتر تک بزعم خود ثابت کر دکھایا ہے۔

اخی المکرم مولانا عبید اللہ الامجھری مدرس سنیر مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ رحمہ اللہ علیہ کے سامنے بر سبیل تذکرہ ابن حجر کی اس بے جا حمایت کا ذکر کیا تو انھوں نے مجھ سے کہا کہ آپ ان میں سے کسی ایک حدیث کو بھی اب پھر کوشش کرکے موضوع ثابت کر دیجئے اور ابن حجر کے دلائل کو باطل کر دکھایئے تو میں جانوں، میں نے ان کی خدمت میں عرض کیا کہ " آپ ہی ان میں سے کسی ایک حدیث کو چن دیجئے ۔" بھائی صاحب مرحوم و مغفور نے **سدو ا ابو اب المسجد الا باب علی** والی حدیث پیش کی کہ اس کو ابن جوزی و عراقی دونوں ہی نے موضوع قرار دیا ہے اور ابن حجر نے اس کی تصحیح کرتے ہوئے اس کو قریب بمتواتر دلائل قاطعہ و براہین ساطعہ سے ثابت کر دکھایا ہے۔ آپ ابن حجر کے دلائل کو غلط ثابت کرکے اس حدیث کو واقعی موضوع اور حقیقتاً شیعوں کا افترا ثابت کر دکھایئے۔ بتوفیقہ تعالیٰ میں نے ایک ہفتہ کے اندر خود ابن حجر ہی کی کتابوں سے ابن حجر کے اقوال و دلائل کی دھجیاں اڑا کر رکھ دیں اور

دکھا دیا کہ یہ حدیث در حقیقت موضوع ہی ہے۔ بھائی صاحب ممدوح میرے مختصر سے رسالے کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ اور بڑی داد دی اور ابن حجر کی اس بے جا حمایت پر سخت متاسف ہوئے۔ رحمهم الله تعالیٰ و عفا عنهم۔

اسناد مسند احمد

اس مسند کے اسناد جہاں کہیں ملتے ہیں اسی سلسلۂ روایت سے ملتے ہیں کہ صرف حنبل بن عبداللہ الرصاقی سے اس مسند کو لوگ روایت کرتے ہیں اور حنبل بن عبداللہ الرصافی تنہا اس کی روایت شیخ ابوالقاسم ہبۃ اللہ بن محمد بن عبدالواحد[1] ابن احمد بن الحسین الشیبانی سے کرتے ہیں اور وہ تنہا ابو علی الحسن بن علی بن محمد التمیمی الواعظ عرف ابن المذہب سے۔ وہ تنہا ابو بکر احمد بن جعفر بن حمدان بن مالک القطیعی سے۔ وہ تنہا عبداللہ بن الامام احمد سے۔ وہ تنہا اپنے والد ماجد امام احمد بن محمد بن حنبل سے یعنی پانچ نسلوں تک اس مسند کو صرف ایک ایک راوی ہی روایت کرتے رہے ہیں۔

مسند احمد کے تمام قدیم و جدید، قلمی و مطبوعہ نسخوں کو دیکھ لیجئے۔ بسم اللہ کے بعد ہی اس کا آغاز اخبرنا سے ہوتا ہے۔ یہ اخبرنا کہنے والے کون ہیں اللہ ہی کو معلوم ممکن ہے کہ اس جمع یا تثنیہ متکلم میں حنبل بن عبداللہ الرصافی بھی ہوں۔ مگر حنبل بن عبداللہ الرصافی اور ابو القاسم ہبت اللہ کا حال مجھ کو باوجود جستجو کے رجال کی کسی کتاب میں کہیں نہیں

۱۔ مسند کے موجود، مطبوعہ مصری نسخے میں یہاں پر عبدالواحد کی جگہ عبدالوہاب لکھا ہوا ہے مگر جہاں تک میں نے تحقیق کی صحیح عبدالواحد ہی ہے۔ واللہ اعلم

ملا - ممکن ہے کہ طبقات الحنابلہ وغیرہ میں کہیں مذکور ہوں - مگر اتنا ضرور ہے کہ حنبل بن عبداللہ اور ابو القاسم ہبت اللہ ان دونوں کے نام صرف اسی مسند ہی کے سلسلۂ اسناد میں آتے ہیں - اس کے سوا اور کہیں بھی دیکھنے میں نہیں آتے - دفیہ مافیہ -

بہر کیف ان کے بعد ابن المذہب ہی کا نام آتا ہے تو اب ابن المذہب کا حال سنیے -

ابن المذہب

ابوالقاسم ہبۃ اللہ کے شیخ ابن المذہب یعنی الحسن بن علی بن محمد ابو علی بن المذہب الواعظ التمیمی البغدادی - ابوالقاسم ہبت اللہ کی طرح یہ واحد راوی اس پورے ذخیرۂ روایات یعنی مکمل مسند احمد کے ہیں - یہی تنہا اس مسند کی روایت ابو بکر قطیعی سے کرتے ہیں اور ابو بکر قطیعی، عبداللہ سے، وہ اپنے والد امام احمد سے -

امام ذہبی میزان الاعتدال میں اور ابن حجر لسان المیزان میں ان کا مفصل حال لکھتے ہیں - دونوں ہی ان کے متعلق خطیب بغدادی کا قول نقل کرتے ہیں کہ ابن المذہب کا ابو بکر قطیعی سے مسند احمد کا سننا تو صحیح[1] ہے مگر پوری کتاب کا نہیں کیونکہ بعض اجزاء کا سننا ثابت نہیں - مگر ابن المذہب نے ان غیر مسموعہ اجزاء کو بھی مسموعہ کے ساتھ ملا لیا تھا اور امام احمد کی کتاب الزہد کو دیکھ کر اس کی بھی روایت کرنے لگے -

---

۱- اگر ذہبی و ابن حجر اتنا نہ لکھیں اور اس سماعت کی صحت تسلیم نہ کریں تو پھر مسند احمد کا وجود ہی غائب ہو جاتا ہے - اس لئے اتنا اعتراف مجبوراً ضروری تھا - اس کے بعد مگر پوری کتاب کا نہیں" یہ فقرہ بے لوثی و حق گوئی ثابت کرنے کے لئے لکھ دینا لازمی تھا -

حالانکہ اس کا اصل[۲] نسخہ ان کے پاس نہ تھا۔ خود اپنے ہی ہاتھ سے لکھے ہوئے نسخے سے روایت کیا کرتے تھے۔

ذہبی و ابن حجر لکھتے ہیں کہ ابن المذہب ۳۵۵ ھ میں پیدا ہوئے اور نواسی سال کی عمر پاکر ۴۴۴ ھ میں وفات پائی۔ مسند فضالہ بن عیاض اور مسند عوف بن مالک ابن المذہب کے نسخہ مسند میں نہ تھے۔ اسی طرح مسند جابر کی وہ بعض حدیثیں بھی نہ تھیں، جن کو حرانی[۱] نے قطیعی سے روایت کیا ہے۔"

پھر حافظ ابن حجر، امام ذہبی کا معترفانہ اعتراض نقل کرتے ہیں کہ "جب ایک شخص بقول خطیب کسی کتاب کی روایت کے سلسلے میں اپنا نام جوڑ سکتا ہے تو یہ جو کچھ ہم نے ذکر کیا ہے، یعنی مسند فضالہ و مسند عوف اور مسند جابر میں کی چند احادیث کا الحاق بھی (اپنی طرف سے کر لیا ہوگا۔")

اتنا لکھ کر پھر حافظ ابن حجر، امام ذہبی کا یہ قول بھی نقل کرتے ہیں کہ "شجاع ذہلی نے کہا ہے کہ ابن المذہب روایتوں میں معتمد علیہ نہ تھے۔

۱۔ اس کا اصل نسخہ دنیا میں کہیں نہ تھا۔ یہ پوری کتاب مجزّد ابن المذہب اور ان کے رفقاء کی تصنیف کردہ تھی، جس کو انھوں نے اپنے ہاتھ سے لکھ کر امام احمد کی طرف منسوب کر رکھا تھا۔ ابن حجر فرماتے ہیں "اس لئے وہ محل حجت نہیں" تو پھر اور کس کی روایت سے کتاب الزہد محل حجت ہو سکے گی؟ دنیا میں ہے کوئی؟ جو ابن المذہب کے علاوہ کسی اور کی روایت سے کتاب الزہد کو پیش کر سکے۔

۲۔ حرانی سے مراد ابو شعیب عبداللہ بن الحسن الحرانی کے سوا اور کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔ جیسا کہ خود ابن حجر اور ذہبی کی تصریحات سے ثابت ہے اور نہ کوئی دوسرا اس لقب کا ایسا ہے جس کو کہا جا سکے کہ شاید وہ ہو۔ تفصیل دیکھیئے۔

سلفی نے کہا ہے کہ یہ ہمیشہ محل گفت گو رہے کتاب الزہد کے معدوم[۲] ہو جانے کے بعد بغیر اصل کتاب کے خود اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے نسخہ کتاب الزہد کی روایت کیا کرتے تھے۔ خطیب نے کہا کہ ابن المذہب نے ایک ایسی حدیث ابو بکر قطیعی سے روایت کی جس کو ان سے ہرگز نہیں سنا تھا۔"

اس پر ذہبی نے ابن المذہب کی طرف سے یہ تاویل کی ہے کہ شاید وِجَادَۃ" اجازت بنا لی ہو (یعنی وہ حدیث کہیں قطیعی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی دیکھی ہو، یا کسی اور جگہ قطیعی کی طرف منسوب نظر آئی ہو اور انھوں نے اسی پالینے کو اجازت قرار دیدی ہو۔ اور حدثنا ابو بکر القطیعی کہکر روایت کرنے لگے ہوں۔) تو کیا یہ بھی جھوٹ نہ ہوا؟

پھر ابن حجر لکھتے ہیں " خطیب بغدادی نے یہ بھی بیان کیا کہ ابن المذہب نے ہم لوگوں سے بواسطہ دار قطنی و وراق و ابو عمر و بن مہدی ایک مرتبہ ایک حدیث محاطی سے روایت کی، تو میں نے کہا یہ حدیث تو ابو عمرو بن مہدی کے پاس نہ تھی۔ تو ابن مذہب نے ابن مہدی کے نام پر ہاتھ مار کر کہا کہ بہتیری حدیثیں میرے سامنے پیش کی جاتی ہیں جن میں نام غیر منسوب ہوتے ہیں تو میں ان کو اپنی طرف سے منسوب کر لیا

۲۔ کتاب الزہد کا وجود ہی پہلے کہاں تھا کہ معدوم ہوتی
اس کو تو نہاں خانہ عدم سے مصاحب وجود پر غریب ابن الذہب ہی پہلے پہل لایا۔ اگر اس کو اپنے نام سے پیش کرتا تو مانتا ہی کون؟ اس لئے بے چارے نے اس کو امام احمد کی طرف منسوب کر دیا۔

اتنی سی بات تھی جسے افسانہ کر دیا

ورنہ امام احمد کے بعد ان کی اس تصنیف سے ان کے تلامذہ نے ایسی بے اعتنائی کیوں برتی؟ اور یہ چیز معدوم کیوں اور کس طرح ہو گئی؟

کرتا ہوں، اس طرح اصل روایت میں وہ نسبت ملحق ہو جایا کرتی ہے۔

اتنا لکھ کر ابن حجر لکھتے ہیں کہ ابن مذہب کے ہم عصر ان کی ان حرکتوں کو بہت ناپسند کرتے تھے، مگر یہ کبھی ان حرکتوں سے باز نہ آئے۔[۵]

ان تمام باتوں کو لکھ کر آخر میں حافظ ابن حجر پھر ذہبی کا آخری قول نقل فرماتے ہیں کہ ان تمام باتوں سے یہ ضرور ظاہر ہوگیا کہ ابن المذہب ایک غیر مُتقِن و آدمی تھے اور انھیں کی طرح ان کے شیخ (ابو بکر قطیعی) بھی۔ اور اسی وجہ سے مسند احمد میں ایسی ایسی چیزیں واقع ہوگئیں جن کی نہ تو متن ہی محکم ہے نہ اسناد ہی واللہ اعلم (دیکھئے لسان المیزان جلد دو ۲ صفحہ ۱۳۷ و میزان الاعتدال جلد اول ۲۲۷)

یہی ابن المذہب ہیں جو ابن مالک ابو بکر القطیعی سے مسند احمد کے تنہا راوی ہیں ان کے سوا کوئی دوسرا راوی مسند احمد کا دنیا میں پیدا نہیں ہوا۔ امام ذہبی نے میزان الاعتدال میں اور ابن حجر نے لسان المیزان میں جو اتنا بھی ان کے متعلق لکھا ہے وہ بھی مجبوراً اس لئے کہ کہاں تک چھپاتے۔ اور اگر ان کے تمام حالات واضح کر دیتے تو پھر مسند احمد کی کوئی حیثیت باقی نہ رہتی۔

ابھی ابھی ابن المذہب کے آغاز تذکرہ میں آپ نے پڑھا کہ ابن

ڈھوئے

۱۔ یہی وجہ ہے کہ باوجود اس کے کہ ابن المذہب، مسند احمد اور کتاب الزہد کو ڈھوئے پھرے، مگر بجز ابو القاسم ہبۃ اللہ کے ان کو اور کوئی ایسا نہ ملا جو ان سے مسند احمد یا کتاب الزہد کی سند لیتا۔ بادی النظر جس نے بھی الٹ پلٹ کر دیکھا، چیز: چپی نظر آئی اس لئے امام احمد کی نسبت کا انتہائی احترام کیا تو بہت کیا کہ ان کو زبان سے جھٹلایا نہیں مگر ہر شخص دل میں ضرور ان کتابوں کی طرف سے غیر مطمئن ہی رہا، ورنہ کچھ بھی وثوق اگر ہوتا تو خود خطیب بغدادی اور ان کے دوسرے، ہم عصر مسند احمد اور کتاب الزہد کی سند ان سے ضرور لیتے۔ امام احمد کی کتابیں ایسی نہیں ہو سکتی کہ خطیب جیسے حدیثوں کے رسیا ان کی طرف سے بے اعتنائی اور بے پروائی برتیں۔

المذہب کے نسخہ مسند احمد میں مسند جابر کی بعض وہ حدیثیں نہ تھیں جن
کو حرانی نے قطیعی سے روایت کیا ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ
ابو بکر قطیعی سے حرانی (یعنی ابو شعیب عبداللہ بن الحسن الحرانی) نے بھی
مسند احمد کی روایت کی ہے تو قطیعی سے[1] مسند احمد کے تنہا راوی ابن
المذہب نہ ہوئے بلکہ دوسرے راوی حرانی بھی ہیں۔ مگر یہ صحیح نہیں
ہے اس طرح کے داؤ پیچ چالاک محدثین کو خوب آتے ہیں کہ بعض غلط
باتیں ضمنی طور سے کسی دوسرے تذکرہ میں کہہ جاتے ہیں تاکہ خارج
از بحث بات ہونے کی وجہ سے اس غلط بات کی تغلیط کی طرف کوئی توجہ
نہ کرے اور اس طرح وہی غلط آئندہ کے لئے صحیح بن جائے۔ بعد کو جب
یہی بات جو اس وقت خارج از مبحث ہے ۔ خود موضوع بحث بنائی جائے
گی تو یہ تحریر اس وقت ثبوت میں پیش کر دی جائے گی کہ فلاں جگہ اس
کا ذکر آچکا ہے ۔ اگر یہ بات غلط ہوتی تو اسی وقت اس کی تردید کی جاتی ۔

حقیقت یہ ہے کہ حرانی کا ابو بکر قطیعی سے پوری مسند احمد یا اس کے
کسی جزء کا بھی بلکہ کسی ایک حدیث کا بھی روایت کرنا کسی کتاب سے
ثابت نہیں۔ خود ابن حجر لسان المیزان جلد ۳ صفحہ ۲۷۱ میں حرانی کا ترجمہ
لکھتے ہیں مگر ان کے شیوخ میں ابو بکر قطیعی کا نام نہیں لکھتے اور نہ مسند
احمد ہی کی روایت کا ذکر کرتے ہیں اور اس کی امید بھی نہیں کی جا سکتی
کہ ایک تقریباً نوے برس کا بوڑھا آدمی[1] ایک بائیس برس کے چھوکرے

۱۔ تعجب ہے کہ امام ذہبی اور ابن حجر دونوں ہی ابن المذہب کو مسند احمد کا ابو بکر قطیعی سے تنہا
راوی بھی لکھتے ہیں، پھر حرانی کو بھی قطیعی سے مسند احمد کا راوی بتاتے ہیں۔ اگر دونوں قطیعی سے
مسند کی روایت کرتے تھے تو پھر ابن المذہب تنہا راوی کس طرح ہوئے؟

۱۔ ابو شعیب الحرانی کے متعلق ابن حجر لسان المیزان میں لکھتے ہیں کہ یہ ۱۵۶ھ میں پیدا ہوئے اور
۲۹۵ھ میں ۸۹ برس کی عمر پا کر وفات پائی۔ ظاہر ہے کہ اس حساب سے ان کی عمر ۸۹ نہیں ہوتی

سے مسند احمد کی سماعت کرنے جائے، دو چار حدیثیں نہیں بلکہ تقریباً ساٹھ ہزار حدیثیں۔ اگر کہا جائے کہ جس سال حرانی جنت کو سدھارے، اسی سال نہیں بلکہ اس سے چند سال پیشتر ان کی اتنی ہمت شاید ہو گئی ہو، تو چند سال پیشتر تو قطیعی صاحب اور بھی زیادہ کم سن اور نو عمر ہوں گے اور پھر حرانی نے تو عبداللہ بن احمد کا وقت قطیعی سے کہیں زیادہ پایا، بلکہ خاص امام احمد یا عبداللہ ہی سے مسند احمد کی سند لینے میں کیا دشواری تھی جو کم سن چھوکرے غیر و متنفین سے مسند کی سند لیتے؟

ابوبکر قطیعی حرانی کی وفات کے وقت زیادہ سے زیادہ بائیس ہی سال کے ہو سکتے ہیں، کیونکہ قطیعی کی ولادت ۲۷۳ھ کی ہے، جیسا کہ آگے آتا ہے۔ تو اگر خود قطیعی حرانی سے کچھ حدیثیں روایت کرتے، جب بھی شبہ ہوتا کہ انھوں نے[۱] تو حرانی کے اختلاط حواس کا زمانہ دیکھا، ان کی سماع صحیح ہے یا نہیں۔ نہ کہ یہ کہا جا رہا ہے کہ حرانی نے اس کبر سنی میں ایک نوجوان سے دو چار حدیث نہیں بلکہ ساٹھ ہزار حدیثوں کا مجموعہ جاکر

بلکہ اس حساب سے ان کی عمر ۱۳۹ سال ہو جاتی ہے۔ ابن حجر یہ بھی لکھتے ہیں کہ احمد بن کامل کا قول ہے کہ حرانی نے ۲۹۲ھ میں وفات پائی۔ اس لئے یقیناً سال ولادت ہی غلط ہے۔ غالباً ۲۰۳ھ یا ۲۰۶ھ میں حرانی کی ولادت ہوئی۔ جب ہی ۸۹ سال کی عمر پاکر ۲۹۲ھ یا ۲۹۵ھ میں ان کی وفات ہوئی۔ مگر بہر حال یہ عبداللہ بن احمد سے عمر میں بڑے ہی تھے اور خاص امام احمد سے مسند کی روایت کر سکتے تھے اور اگر امام احمد یا عبداللہ کے وقت میں مسند کا وجود ہوتا تو قطیعی تو کیا حرانی سے بھی زیادہ معتمد علیہ محدثین مسند کی روایت خاص امام احمد اور نیز عبداللہ سے کرنے والے دنیا میں مشہور و معروف ہوتے۔

۲۔ ابن المذہب کے ترجمے میں ابن حجر، لسان المیزان جلد ۲ ص ۲۷۳ میں ایک موقع پر لکھتے ہیں کہ ابن المذہب نے (ایک روایت میں) قطیعی کے ساتھ ابو سعید الحونی کا نام بھی بالعکس لگاکر کہا ہے کہ ان دونوں نے کہا کہ ہم سے ابو شعیب الحرانی نے حدیث بیان کی الخ" اس سے اتنا معلوم ہو گیا کہ قطیعی نے خود حرانی سے حدیث سنی اور روایت لی ہے نہ کہ حرانی نے قطیعی سے۔

اول سے آخر تک سنا یا سنایا - او بالفرض اگر ایسا تھا تو پھر حرانی کے ترجے میں ابن حجر یا امام ذہبی نے یہ کیوں نہیں لکھا کہ انھوں نے قطیعی سے مسند احمد کی اس بڑھاپے میں سند لی- یا یہ قطیعی سے مسند کی روایت کرتے ہیں - پھر ابن سمعانی نے بھی اپنی کتاب الانساب میں حرانی کا ترجمہ لکھا ہے ، وہ بھی یہ نہیں لکھتے کہ مسند احمد کی یہ قطیعی یا کسی سے بھی یہ روایت کرتے ہیں یا قطیعی سے حدیث بھی سنی غرض حرانی کا مسند احمد سے در اصل کوئی واسطہ نہیں ہے اور یہ مسند احمد سے بالکل اسی طرح بے خبر ہیں جس طرح دوسرے محدثین جو قطیعی سے متقدم تھے. مسند سے بے خبر تھے ، اس لئے کہ قطیعی کی ولادت سے پہلے مسند احمد کا دنیا میں کہیں نام و نشان بھی نہ تھا[1]-

ابو بکر قطیعی

احمد بن جعفر بن حمدان بن مالک بن شعیب ابو بکر القطیعی ۲۷۳ ھ میں پیدا ہوئے اور ۳۶۸ ھ میں وفات پائی چونکہ یہی مسند احمد کے تنہا راوی ہیں، اس لئے اگر ان کی توثیق نہ کی جاتی تو پھر ذخیرۂ روایات کہیں کا بھی نہ رہتا- اسی لئے امام ذہبی نے میزان الاعتدال جلد اول صفحہ ۲۱ میں ان کے ترجے کے ضمن میں اتنا تو اعتراف کیا ہے کہ " ابن الفوارس ان کو حدیث میں کچھ یونہی سا سمجھتے تھے اور مسند احمد کے بارے میں ان کے بعض اصول[2] محل نظر ہیں اور برقانی نے کہا کہ ان کی کتاب کا کچھ حصہ

۱- امام ذہبی ہوں یا ابن حجر، مسند کے بھرم کو بہر حال برقرار رکھنا چاہتے ہیں- اس لئے اس کے ناقل اور واحد تنہا راویوں پر جرح بھی کرتے ہیں تو مسند کو بچاتے ہوئے- مسند پر بھی حرف آتا ہے تو کم سے کم اتنی کوشش رہتی ہے کہ اتنا تو ہو کہ مسند بالکل ہی سرے سے مشتبہ نہ ہو جائے- ابن الفوارس کا قول اس طرح نقل کیا ہے، جس سے محل نظر پورا مسند ہی نہ ٹھہر جائے- حالانکہ ابن الفوارس پورے مسند ہی کو محل نظر ٹھہراتے ہیں-

غرق ہوگیا تھا، تو ایک دوسری[۳] کتاب جس کے متعلق ان کی سماع نہ تھی، اس سے انھوں نے حدیثیں نقل کر لیں۔ اس وجہ[۴] سے محدثین کی ان پر چشمکیں تھیں، اتنا لکھ کر امام ذہبی لکھتے ہیں کہ " ورنہ (یعنی اگر یہ سب باتیں نہ ہوتیں، تو) وہ فی نفسہٖ ثقہ ہیں" پھر خود لکھتے ہیں کہ " ورنہ (خود ان سے سخت متنفر اور بے حد خفا تھا۔ مگر معلوم[۵] ہوگیا کہ نہیں یہ سچے آدمی ہیں، ان کی سماع میں شک نہیں کیا جاسکتا۔ اور میں نے سنا ہے کہ وہ مجاب الدعوۃ بھی تھے۔" ان کی توثیق کی اتنی کوشش صرف مسند احمد کا بھرم رکھنے کے لئے ہے، چنانچہ ابن حجر، امام ذہبی کی اتنی

۱۔ وہ دوسری کتاب کس کے پاس تھی اور جس کے پاس تھی اس نے کہاں سے حاصل کی تھی؟ اور پھر وہاں صرف ابو بکر قطیعی کو اپنی کتاب درست کرلینے کا موقع ملا اور کسی کو وہاں سے مسند کی اجازت یا نقل کا موقع کیوں نہ مل سکا، اور پھر اس شخص نے خود مسند کی روایت کیوں نہ کی۔ اگر عبداللہ بن احمد سے اس کو وہ کتاب ملی تھی تو پھر قطیعی ہی تنہا عبداللہ سے مسند کے راوی نہ ہوئے۔ وہ بھی تو ایک ہوا اور اگر اس کو امام احمد ہی سے مسند ملی تھی جب تو بڑی چیز ہوئی۔

۲۔ محدثین کی چشمکیں تو دراصل اس مسند احمد کے اختراع و اختلاق ہی کی وجہ سے تھیں مگر برقانی نے پردہ ڈالنے کیلئے کچھ حصہ کتاب کے غرق ہوجانے کو چشمک کا سبب قرار دیدیا۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کے ہمعصروں نے ان سے مسند احمد کے اصل نسخہ کا مطالبہ کیا تو انھوں نے کہا وہ فلاں سفر میں غرق ہوگیا، تو میں نے اپنی یاد سے اور کچھ ردی پرزے پر جو مسودہ تھا اس سے مرتب کرلیا، اسی لئے ان کے ہمعصروں نے اس مسند کو مشکوک قرار دیا اور ان پر چشمکیں ہونے لگیں۔ اتنے بڑے اہم واقعہ کو برقانی نے کس قدر ہلکا کر دکھایا، صرف مسند احمد کا بھرم رکھنے کے لئے۔

۳۔ کس ذریعے سے معلوم ہوا؟ اس کے ذکر کی ضرورت نہ تھی مگر مجھ کو وہ ذریعہ معلوم ہے یعنی یہی کہ دوسرے ہمعصر محدثین نے کہا اگر ان کی سماع کو معتبر نہیں مان لیتے ہیں تو مسند احمد جیسا ذخیرہ روایات ہاتھ سے جاتا ہے اس لے جس طرح ہم لوگوں نے ان کی سماع صحیح مان لی ہے آپ بھی مان لیجئے اور اس تنفر اور خفگی کو دور کیجئے اور پھر مسند کے پروپاگنڈا کرنے والوں نے قطیعی کے ولی اور مواجب الدعوات ہونے کا بھی پروپیگنڈا کر رکھا تھا۔

عبارت نقل کر کے لسان المیزان جلد ا صفحہ ۱۴۵ میں لکھتے ہیں کہ " ذہبی نے جو ابن فرات (کی جرح) پر انکار کیا ہے ، اس سے تعجب ہے۔ کیونکہ ابن فرات ہی کچھ اس (جرح) میں مُتفرِّد نہیں ہیں بلکہ خطیب نے بھی اس کو احمد بن المسیبی کے ترجمہ میں لکھا ہے ۔ پھر آگے چل کر لکھتے ہیں کہ " اور ذہبی سے تعجب ہے کہ ابن الفرات کے قول کی تو (یہاں) تردید کرتے ہیں مگر (انھیں قطیعی کے شاگرد خاص) حسن بن علی التمیمی (ابن المذہب) کے ترجمے کے آخر میں خود لکھتے ہیں کہ یہ بات[۵۲] ظاہر ہے کہ ابن المذہب ایک غیر متقن شیخ تھے، اور انھیں کی طرح ان کے شیخ ابن مالک (القطیعی) بھی اور اسی وجہ سے مسند احمد میں ایسی چیزیں واقع ہو گئی ہیں، جن کی نہ متن ہی درست ہے نہ اسناد ہی ، واللہ اعلم ۔"

غرض ذہبی اور ذہبی سے زیادہ ابن حجر، قطیعی سے بالکل مطمئن نہیں ہیں، مگر دونوں ہی مسند کی وجہ سے مجبور ہیں ۔ اس لئے باوجود دلی تنفر کے کسی نہ کسی حد تک قطیعی کی توثیق ضرور کئے جاتے ہیں تاکہ مسند احمد کا بھرم رہ جائے ۔ اگر مسند کا خیال نہ ہوتا تو اللہ جانے یہ لوگ قطیعی اور ابن المذہب دونوں کے متعلق کیا کیا لکھتے۔

قطیعی کے شیوخ دراصل قطیعی کے شیوخ نہ تھے

قطیعی کے شیوخ میں عبداللہ بن احمد کے سوا تین چار امام اور بھی ائمہ رجال نے لکھے ہیں۔ جن میں اکثریت وضاعین و کذابین ہی کی ہے ۔ مثلاً محمد بن یونس السامی الکدیمی وغیرہ، مگر تعجب یہ ہے کہ جہاں ان لوگوں کے تلامذہ کی فہرست ہے، وہاں قطیعی کا کوئی ذکر نہیں اور نہ قطیعی

۵۲۔ میزان الاعتدال جلد ا ص ۲۲۷

کی اتنی عمر ہو سکتی ہے کہ ان لوگوں سے یہ حدیثیں سنیں اور روایتیں اخذ کر سکیں۔ البتہ قطیعی کے حقیقی استاد اور رفیق مذہب و مسلک ابو بکر شافعی کا نام ان لوگوں کے تلامذہ میں آتا ہے۔ جس طرح عبداللہ بن احمد کے ساتھ بھی در اصل ابو بکر شافعی ہی رہے اور ان کے ساتھ بچوں کی طرح یہ قطیعی صاحب بھی لگے لپٹے رہتے تھے۔ ان کو جو کچھ بھی ملا ابو بکر شافعی ہی سے ملا، مگر یہ درمیان سے ابو بکر شافعی کا نام اڑا کر اپنی نسبت کو بلاواسطہ ابو بکر شافعی کے شیوخ سے جوڑ دیا کرتے تھے۔ اسی لئے ان کے اکثر شیوخ ایسے ہی ہیں جو ان کی کم سنی یا آغاز شباب ہی کے وقت دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ غرض یہ خوب سمجھ لینا چاہئے کہ در اصل قطیعی کے استاد و شیخ جو کچھ بھی تھے صرف ابو بکر شافعی ہی تھے اور کوئی بھی نہ عبداللہ بن احمد نہ کوئی اور جس کی تصریح آگے ابو بکر شافعی کے ترجمہ میں آتی ہے۔ سلسلہ قائم رکھنے کے لئے ابھی عبداللہ کا ترجمہ ملاحظہ فرمایئے۔

عبداللہ بن امام احمد بن حنبل

ان کی ولادت ۲۱۳ھ کی ہے اور ۲۹۰ھ میں انھوں نے وفات پائی۔ حضرت امام احمد کی وفات ۲۴۱ھ میں ۱۲ ربیع الاول کو ہے یعنی تقریباً آغاز سال ہی میں اور عبداللہ کی پیدائش ۲۱۳ھ کے وسط میں ہے، اس لئے امام احمد کی وفات کے وقت عبداللہ زیادہ سے زیادہ ۲۷ برس کے تھے۔

ابو بکر قطیعی کی عمر عبداللہ کی وفات کے وقت زیادہ سے زیادہ ۱۷ سال کی ٹھہرتی ہے۔ اس لئے اسی قدر پتا مل سکتا ہے کہ یہ چند سال عبداللہ بن امام احمد کی خدمت میں شاید رہے ہوں مگر اس عمر میں ساٹھ ہزار حدیثوں کے مکمل مجموعے کا سننا اور اخذ کرنا بالکل خلاف عقل ہے کوئی صاحب انصاف اس کو تسلیم نہیں کر سکتا۔

قطیعی دراصل ابو بکر شافعی کے چیلے تھے

البتہ یہ بچپن ہی سے ابو بکر شافعی[1] کے ساتھ لگے رہتے تھے اور ابو بکر شافعی، عبداللہ ابن احمد کے شاگردوں کی جماعت میں داخل ہوگئے تھے۔ عبداللہ اور ابو بکر شافعی کی وفات کے بعد یہ بذات خود عبداللہ بن احمد سے تلمذ کے مدعی ہوگئے۔ اس لئے لوگوں نے ابو بکر شافعی کے ساتھ ان کو بھی عبداللہ بن احمد کے تلامذہ میں شمار کر لیا اس وقت مسند احمد کا کوئی وجود تو تھا نہیں کہ واقعی مسند احمد کو کوئی عبداللہ سے سنتا یا ان کو سناتا اور لوگ یہ خیال کرتے کہ ان کی عمر عبداللہ کے وقت میں اتنی تھی یا نہیں کہ ساٹھ ہزار روایات کا مجموعہ یہ عبداللہ سے اخذ کر سکیں۔

قطیعی نے عبداللہ بن احمد کا وقت نہیں پایا

ان کے ادعائے تلمذ سے ابتدا میں لوگ اسی قدر سمجھے کہ کچھ حدیثیں شاید آخر وقت میں عبداللہ بن احمد سے سنی ہوں گی، اس وجہ سے یہ تلمذ کا دعویٰ کر رہے ہیں۔ کسی کو کیا پڑی تھی کہ خواہ مخواہ اتنی سی بات کو جھٹلاتا جس کے امکان کا قرینہ بھی موجود تھا۔ ہاں اگر یہ عبداللہ بن احمد کے مشہور تلامذہ کے سامنے مسند احمد کا نام لیتے، جب البتہ اکابر محدثین ان کی خبر لینے کو تیار ہو جاتے اور پوچھتے کہ مسند احمد کس جانور کا نام ہے اور تم کہاں سے لائے؟ ہم لوگوں کو تو یہ نعمت عظمیٰ عبداللہ سے نہ ملی جو برسوں عبداللہ کی خدمت میں رہے اور ساری زندگی حدیث کی خدمت میں گذاری اور گذار رہے ہیں۔ اور تم کو ہم سب لوگوں سے چھپا کر بلا کسی

۱۔ ابو بکر شافعی کا ترجمہ آگے آتا ہے۔

استحقاق کے عبداللہ بن احمد نے اتنی بڑی دولت چپ چاپ سونپ دی!
آخر تم میں کون سے سرخاب کے پر لگے تھے۔

یہ مسند احمد کب اور کس طرح وجود میں آئی، اس کی تفصیل آگے آتی ہے۔ خاص مسند احمد کے ذکر میں۔ ابھی سلسلے کی آخری کڑی یعنی احمد بن محمد بن حنبل کا مختصر سا ترجمہ سن لیجئے۔

امام احمد بن محمد بن حنبل

ان کی ولادت ۱۶۴ھ میں اور وفات ۲۴۱ھ میں ہوئی ۷۷ سال کی عمر پائی۔ امام شافعی، ابن مہدی، ابو الولید، عبدالرزاق، وکیع، یحییٰ بن آدم اور یزید بن ہارون سے یہ خود بھی روایت کرتے ہیں اور یہ لوگ بھی ان سے روایت کرتے ہیں، یعنی یہ سات آدمی ان کے شاگرد بھی ہیں اور استاد بھی۔ اور قتیبہ داؤد بن عمرو اور خلف بن ہشام ان سے عمر میں بڑے تھے، مگر ان کے تلامذہ میں تھے۔ اور احمد بن الحواری، یحییٰ بن معین، علی بن المدینی۔ حسین بن منصور، زیاد بن ایوب ابو قدامۃ السرخسی، محمد بن رافع، محمد بن یحییٰ بن ابی سمینہ اور عبدالرحمان بن ابراہیم جن کا لقب "رحیم" تھا یہ نو آدمی ان کے اقران میں سے اور ان کے خاص شاگرد اور خود بلند پایہ محدثین میں سے تھے۔ اور عبداللہ اور صالح ان کے دونوں صاحبزادے بھی ان کے خاص شاگرد تھے۔ ان اکابرین محدثین کے علاوہ ابو بکر الاثرم، بقی بن مخلد، حرب الکرمانی، حنبل بن اسحق، شاہین بن السمیدع اور میمون بھی ان کے مشہور تلامذہ میں سے تھے۔ پھر امام بخاری، امام مسلم اور ابو داؤد بذات خود بلا واسطہ بھی ان سے روایت کرتے ہیں اور بواسطہ ابو عبدالرحمان اسود بن عامر

الشافعی ملقب بہ شاذان بھی۔ امام احمد کے آخری شاگرد، جو ابو امام احمد کے بعد عبداللہ بن احمد کے بھی شاگرد ہوئے۔ مشہور محدث ابو القاسم البغوی ہیں۔ اور ان بزرگوں کے علاوہ ایک جماعت کثیر امام احمد کے تلامذہ میں ہے جن میں سے بہتیروں کے نام تہذیب التہذیب وغیرہ کتب رجال میں مذکور ہیں۔

سلسلہ اسناد کے تمام افراد کو جان لینے کے بعد اب خاص مسند احمد کے وجود اور اس کی نوعیتوں پر غور فرمایئے۔

مسند احمد

اب یہ چیز ہر صاحب عقل بغیر ذہن پر زور ڈالے سمجھ سکتا ہے کہ اگر امام احمد بن حنبل اپنی زندگی میں کوئی مجموعہ اپنی حدیثوں کا قلم بند کر جاتے یا اپنے صاحبزادے عبداللہ سے لکھواتے تو جس طرح امام مالکؒ سے ان کی مؤطا ان کے سینکڑوں شاگردوں نے سنی، اور ہر سننے والا ان سے مؤطا کی روایت کرتا تھا۔ اسی طرح امام احمد کے مسند کو بھی عبداللہ کے علاوہ ان کے دوسرے تلامذہ بھی ضرور امام احمد سے سنتے اور اس کی روایت کرتے۔ اتنے بڑے بڑے محدثین، جو نہ صرف امام احمد کے شاگرد تھے، بلکہ استاد بھی تھے، یا خاص اقران میں تھے، یا عمر میں بڑے تھے یا اپنے علم و فضل کی وجہ سے علم حدیث میں بہت بلند پایہ رکھتے تھے، باوجود اس کے کہ یہ سب کے سب امام احمد کے شاگرد تھے، آخر یہ سارے کے سارے اس ضخیم مسند کے وجود سے بالکل بے خبر کیوں رہے اور امام احمد نے ان سب کے سب سے اپنی اس کتاب کو پوشیدہ کیوں رکھا؟ یہاں تک کہ اپنے دوسرے بیٹے صالح کو بھی اس نعمت عظمیٰ سے بالکل محروم ہی رکھا! تعجب ہے کہ امام بخاری اپنی تاریخ میں امام احمدؒ

ذکر خیر کرتے ہیں، مگر نہ مسند کا کوئی ذکر فرماتے ہیں نہ کتاب الزہد کا۔ آخر امام احمد کو کیا ہوگیا تھا کہ اشاعت حدیث و اشاعت دین کے عوض اپنے تمام شاگردوں سے بالکل کتمان حدیث وکتمان علم فرمایا اور صرف اپنے ایک ہی صاحبزادے عبداللہ کو اس کتاب مکنون کا محرم راز بنایا؟ آخر دوسرے لوگوں سے اخفاء و کتمان کی کیا ضرورت پڑی؟ کیا ان کے تلامذہ میں سے عبداللہ کے سوا کوئی بھی اس امانت عظمیٰ کا امین نہیں ہوسکتا تھا؟

عبداللہ کے تلامذہ ابو القاسم البغوی

اسی طرح عبداللہ بن احمد کے تلامذہ میں ابو القاسم البغوی جن کی ولادت ۲۱۳ ھ کی ہے یعنی عبداللہ سے ایک سال بڑے ہی تھے اور خاص امام احمد کے آخری شاگرد تھے یعنی عبداللہ کے خواجہ تاش استاد بھائی بھی تھے اور شاگرد بھی۔ اور خود مشہور بلند پایا محدث تھے ۳۱۷ ھ میں عبداللہ بن احمد کے ستائیس سال بعد وفات پائی۔

سلیمان بن الطبرانی

سلیمان بن حرب احمد بن ایوب اللخمی الطبرانی جن کی ولادت ۲۶۰ ھ کی اور وفات ۳۶۰ ھ میں ہے، پورے سو برس کی عمر پائی، عبداللہ کی وفات کے وقت تیس برس کے تھے۔ اور قطیعی سے تیرہ سال بڑے تھے اور بقول ابن حجر ۱۳ سال کی عمر سے حدیثیں سننے لگے اور برابر عبداللہ بن احمد کے ساتھ لگے رہے۔

احمد بن کامل بن شجرہ

احمد بن کامل بن شجرہ القاضی البغدادی ، ان کی ولادت بھی ۲۶۰ ھ ہی کی ہے ۔ نوے سال کی عمر پاکر ۳۵۰ ھ میں راہی جنت ہوئے، ابن حجر نے ان کو من اوعیۃ العلم (علم کا ظرف) لکھا ہے۔

محمد بن مخلد

محمد بن مخلد بن حفص، جنھوں نے کافی عمر پاکر ۳۳۱ ھ میں وفات پائی۔ دار قطنی جیسے مشہور محدث کے شیوخ میں تھے اور قطیعی سے کافی بڑے تھے عمر میں بھی اور علم و فضل میں بھی۔ ابن حجران کے متعلق لکھتے ہیں کہ اپنے وقت میں سب سے بڑے عالم تھے۔ وغیرہم ۔

غرض ایسے ایسے تلامذہ کے ہوتے ہوئے عبداللہ بن احمد کو کیا ہوگیا تھا کہ وہ اسی کتاب مکنون مسند احمد جس کو امام احمد نے اپنے تمام شاگردوں سے چھپا کر صرف انھیں کو بطور ایک پوشیدہ راز کے عطا فرمایا تھا۔ ایسی نعمت عظمیٰ کو انھوں نے بھی اپنے تمام شاگردوں سے چھپا کر بلا استحقاق دیا بھی تو صرف ایک سترہ سال کے چھوکرے ابو بکر قطیعی کو!

تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو !

جس طرح امام احمد نے اپنے دوسرے تمام تلامذہ سے حتیٰ کہ اپنے دوسرے بیٹے سے بھی اس مسند کو پوشیدہ رکھا بالکل اسی طرح عبداللہ نے بھی اپنے تمام شاگردوں سے باپ کی دی ہوئی نعمت کو پوشیدہ ہی رکھا اور

ایک گھر سے باہر کے کم عمر چھوکرے کے حوالے کر دیا!

امام احمد کو تو شاید اولاد کی محبت نے اس راز داری پر مجبور کر دیا ہو اور دوسرے بیٹے سے شاید وہ کچھ خفا سے رہتے ہوں، اس لئے اپنی ساری عمر کی کمائی صرف ایک ہی بیٹے کو دے گئے اور دوسرے کو بالکل محروم کر دیا۔ مگر یہ ابو بکر قطیعی جیسے سترہ سال کے چھوکرے سے عبداللہ کو کون سا رشتہ محبت تھا کہ عبداللہ نے اپنے تمام برابر والے اور علم و فضل میں مستند شاگردوں میں اس چھوکرے کو ترجیح دی؟ اور سب کو اس نعمت سے محروم ہی نہیں، بلکہ بالکل بے خبر رکھا، کسی سے کہا تک نہیں کہ میرے پاس والد ماجد کی ایک کتاب ہے۔

پھر ابو بکر قطیعی کے تلامذہ میں بھی ابن المذہب کے علاوہ کچھ لوگ مثلاً حافظ ابو نعیم احمد بن عبداللہ بن اسحق صاحب حلیۃ الاولیاء اور علی بن الحسن الصقلی القزوینی[1] وغیرہما بھی تھے، مگر ابن المذہب کے سوا کوئی دوسرا شخص اس مسند کی روایت نہیں کرتا، آخر اس کی کیا وجہ ہے؟

ابن المذہب کے بھی دو چار شاگرد ضرور ہونگے مگر ابن المذہب سے بھی صرف ابو القاسم ہبۃ اللہ ہی تنہا اس کی روایت کرتے ہیں اور کوئی دوسرا نہیں۔

اور ابو القاسم ہبۃ اللہ صاحب کے بعد صرف حنبل بن اسحق الرصانی ہی اس کو لئے پھرتے ہیں، یعنی چھٹی پشت سے اس مسند کی روایتی نسل کی چھوٹی چھوٹی شاخیں پھوٹنا شروع ہوتی ہیں۔ اور رفتہ رفتہ ادھر ادھر پھیلنے لگتی ہیں مگر پانچ پشت اوپر تک برابر مکمل راز داری اور پورے

۱۔ علی بن الحسن الصقلی القزوینی کا ترجمہ لسان المیزان جلد ۴ ص ۲۲۰ میں ہے ۴۰۳ھ میں وفات پائی واعظ تھے۔

اخفا و کتمان کے ساتھ ایک ایک ہی شخص ہر دور میں اس مسند کا تنہا
راوی چلا آتا ہے ۔ اگر کوئی حدیث اس طرح کی ہو جس کا راوی مسلسل
ہر عہد میں ایک ایک ہی شخص رہا ہو، اور وہ بات ایسی ہو جس کے
جاننے والوں کے تعدد کو عقل چاہتی ہو، تو ایسی حدیث آحاد قرار دے کر
ضعیف اور ناقابل احتجاج قرار دے دی جاتی ہے اور یہاں ساٹھ ہزار
حدیثوں کا پورا مجموعہ پانچ پانچ دَور تک ایک ایک ہی شخص کی وساطت
سے چلا آ رہا ہے مگر کسی محدث کے منہ میں زبان نہیں کہ اس پورے
مجموعے کو آحاد کہکر ٹھکرا دے، خصوصاً جب اس کے دو آخری راوی بالکل
مجہول الحال ہیں اور اس کے اوپر کے دو راوی ابن المذہب اور ابو بکر
قطیعی غیر متقن اور ناقابل احتجاج۔

سلسلہ مسند کی اصلی اور ابتدائی مگر پوشیدہ کڑی
ابو بکر شافعی

عبداللہ بن احمد کے تلامذہ میں ابن حجر اور تمام ائمہ رجال ابو بکر
شافعی کا نام لکھتے ہیں اور یہ ضرور عبداللہ بن احمد کے ساتھ کچھ مدت تک
لگے لپٹے رہے ابن حجر ان کا مطلق ذکر ہی نہیں کرتے ۔ البتہ امام ذہبی نے
تذکرۃ الحفاظ جلد ۳ صفحہ ۹۱ میں ان کا ترجمہ سپرد قلم فرمایا ہے، مگر افسوس
کہ وہ ان کی حقیقت حال تک نہ پہنچ سکے اور نہ ان کو کوئی خاص
ضرورت محسوس ہوئی کہ ان کے متعلق اتنی کرید کرتے۔ ابن حجر غالباً
ان کی حقیقت سے واقف ہوگئے تھے، اس لئے ان سے قطع نظر ہی کرنا
مناسب سمجھا۔ نہ تہذیب التہذیب میں ان کا ذکر کیا نہ لسان المیزان میں
نہ تقریب میں ۔ نہ تعجیل المنفعہ میں۔ تعجب یہ ہے کہ دولابی نے بھی

الاسماء و الکنی میں ان کا ذکر نہ کیا۔ البتہ سمعانی نے ان کو کتاب الانساب میں یاد کیا ہے۔ لکھا ہے کہ یہ مقام ختلی میں پیدا ہوئے اور بغداد میں سکونت اختیار کی۔ اس لئے ختلی بھی اپنے آپ کو لکھتے ہیں اور بغدادی بھی، یعنی کبھی یہ کبھی وہ، عمر زیادہ پائی، یہاں تک کہ دار قطنی نے بھی ان سے روایت کی ہے۔ لکھا ہے کہ ابو علی بن شاذان وغیرہ نے ایک بار مسجدوں میں سب صحابہؓ لکھا ہوا پایا، تو فوراً انھوں نے اپنی برأت کے لئے لوگوں کو فضائل صحابہؓ لکھوانا شروع کیا۔ ۲۶۰ھ میں پیدا ہوئے ۳۵۴ھ میں مرے۔ دار قطنی وغیرہ نے ان کی توثیق کی ہے۔ الخ۔

محمد بن عبداللہ بن ابراہیم بن ثابت ابو بکر بغدادی

ابن حجر نے لسان المیزان جلد ۵ صفحہ ۲۲۸ میں محمد بن عبداللہ بن ابراہیم بن ثابت ابو بکر البغدادی کا ترجمہ لکھا ہے۔ اور لکھا ہے کہ ان کو زعم تھا کہ یحییٰ بن معین اور امام احمد بن حنبل سے یہ روایت کرتے ہیں مگر دار قطنی نے ان کو دجال کہا ہے، اور خطیب نے لکھا ہے کہ یہ حدیثیں گھڑا کرتے تھے۔ مجھے تو اس کا شبہ سا ہوتا ہے کہ یہ حضرت ابو بکر شافعی ہی ہیں۔ دار قطنی کی توثیق و روایت کا ذکر جو سمعانی نے کیا ہے وہ کسی معتبر ذریعے سے سمعانی تک نہیں پہنچی ہوگی۔ واللہ اعلم۔ اس لئے کافی تفحص و جستجو کرکے میں جس صحیح نتیجے پر پہنچا ہوں، وہ حسب ذیل ہے۔

موسیٰ بن سہل الوشاء

ابو بکر شافعی ۲۶۰ھ مین پیدا ہوئے اور ۳۵۴ھ میں دنیا سے رخصت ہوئے۔ ان کے سب سے پہلے استاد موسیٰ بن سہل الوشاء شافعی تھے،

جن کو عقیلی نے غیر مشہور دار قطنی نے ضعیف اور برقانی نے قطعی ضعیف لکھا ہے، ابن علیہ کے سب سے آخری شاگرد تھے۔ ۲۷۸ھ میں وفات پائی۔

محمد بن شدادا لمستملی

جب ابو بکر شافعی موسیٰ بن سہل کی آغوش تربیت سے بقضائے الہیٰ محروم ہوگئے تو محمد بن شدادا لمستملی کی گود میں آگرے اور ان سے تعلیم پانے لگے۔ ان کو بھی برقانی نے ضعیف، امام ذہبی نے معتزلی اور منکر الحدیث اور دار طقنی نے ضعیف و ناقابل احتجاج قرار دیا ہے۔

درحقیقت ابو بکر شافعی کی پوری دماغی پرورش انہی دونوں کی آغوش تربیت میں ہوئی۔ ۲۶۰ھ میں ابو بکر شافعی پیدا ہوئے اور ۲۷۲ھ سے دشاء کی خدمت میں رہنے لگے، یعنی ۱۲ سال ہی کی عمر سے۔ گذشتہ دو اساتذہ کے علاوہ محمد بن سعید البورقی کے بھی یہ شاگرد رشید ہیں۔

محمد بن سعید البورقی

یہ بورقی صاحب وہی ہیں، جو سلیمان بن جابر سے روایت کرتے ہیں اور مشہور و معروف وضاع ہیں یعنی جھوٹی حدیثیں گھڑنے والے۔

محمد بن یونس الکدیمی

اور پھر محمد بن یونس الکدیمی، جو جانے بوجھے کذاب اور افترا پرداز ہیں، ان کے بھی بہنایت خاص شاگرد ہیں اور اسی قسم کے۔

ابو بکر شافعی کے بعض دوسرے شیوخ

چند اور مثلاً محمد بن حزین ، بن نصر اور ابو جعفر الترمذی، اسحق بن ابراہیم بن سنین الحنفی جن کی کتاب الدیباج مشہور ہے ۔ محمد بن ہارون بر بیۃ الہاشمی، سعید بن ہاشم الظیری، ابو عمارۃ محمد بن احمد بن مہدی ، محمد بن الحسن بن محمد بن سماء الحضرمی، ابراہیم بن اسمعیل المسمعی البصری، اور انھیں جیسے بعض دوسرے مجروحین و متروکین و ضعفاء کے حلقۂ فیض سے یہ استفاضہ کرتے رہے۔

مگر در حقیقت یہ بورقی اور کدیمی کی تیار کردہ ایک پوشیدہ پارٹی تھی، جو ایک پوشیدہ گہری سازش کے ماتحت باہم تقسیم اسمائے صحابہؓ و اکابر تابعینؒ کرکے ان کے ناموں سے موضوعات کا انبار لگا رہی تھی اور اس کے لئے ابو بکر شافعی تیار کئے گئے تھے کہ یہ عبداللہ بن احمد کے پاس آیا جایا کریں اور ان کے تلامذہ کی فہرست میں اپنا نام لکھوالیں تاکہ عامہ محدثین ان کو عبداللہ کا شاگرد جان جائیں۔

یہ باوجود عبداللہ بن احمد کی شاگردی کا شرف حاصل کرنے کے حنبلی نہ بنے بلکہ شافعی بنے رہے اور اپنے کو حنبلی نہیں بلکہ شافعی مشہور کیا تاکہ دونوں فرقوں سے تعلقات رہیں۔ مگر یہ ابو بکر شافعی در اصل امامی شیعہ تھے۔

ابو بکر شافعی در اصل شیعہ تھے۔

اور تقیتہً اپنے کو شافعی مشہور کئے رہے اور تقیہ ہی کرکے عبداللہ بن احمد کے شاگرد بھی بنے تھے۔ اب اس دعوے کی دلیل اور اجمال کی تفصیل یوں سنئے۔

تذکرۃ الحفاظ میں ابو بکر شافعی

ان ابو بکر شافعی صاحب کا پورا نام امام ذہبی تذکرۃ الحفاظ میں یوں تحریر فرماتے ہیں دیکھئے جلد ۳ صفحہ ۹۱ محمد بن عبداللہ بن ابراہیم بن عبدویہ البغدادی ، انھوں نے اہل سنت کو دھوکہ دینے کے لئے جس طرح مسلک شافعی بظاہر اختیار کرکے اپنے ساتھ شافعی کی نسبت کو شہرت دے رکھی تھی، اسی طرح اپنی اصلی کنیت جو ابو الحسن تھی، اہل سنت کو دھوکا دینے کے لئے ابو بکر سے بدل کر مشہور کر رکھی تھی اور اسی طرح ابو بکر شافعی ہی کے لقب سے مشہور و متعارف رہے۔ یہ بھی خوب یاد رکھئے کہ ان کے پر دادا کا اصلی کسی نام کے بعد ح کی علامت جو بنی ہوتی ہے ممدوح کا مخفف ہے ۔ خود مصنفین کتب رجال شیعہ نے اس کی تصریح کر دی ہے، دیکھئے وجیزہ صفحہ ۱۹۳

ابو بکر شافعی کے عوض ابو بکر القتانی

مگر اسی رسالہ کے باب الکنیٰ میں ابو بکر شافعی کے عوض " ابو بکر القتانی" لکھ کر وہی علامت ح کی بنا دی ہے ، جو ان کے نام کے ساتھ بنائی ہے ۔ اور ابو بکر شافعی کا ذکر باب الکنیٰ میں ہنیں کیا۔

شرح تصریحات علمائے شیعہ

علامہ حلّی اور صاحب منتہی المقال نے ابو بکر شافعی کی نشان دہی کی ۔ مگر علامہ مجلسی نے نام کی تصریح تو کی ، مگر کنیت کا مطلق ذکر ہی نہ کیا صاف کھا گئے ۔ اور ابو بکر شافعی کے عوض ابو بکر القتانی لکھ کر اس طرح

اس پر پردہ ڈالا کہ کسی کا ذہن ہی نہ جائے کہ یہ ابو بکر شافعی ہی ہیں اور ان تینوں نے مل کر ابو بکر شافعی کے باپ کا نام یعنی عبداللہ کو درمیان سے بالکل غائب ہی کر دیا یا ممکن ہے کہ ابو بکر شافعی نے خود ہی تقیہ کے ماتحت اہل سنت کو اپنا سلسلہ نسب بتانے میں ایک نام عبداللہ کا بڑھا دیا ہو ۔ واللہ عالم ۔ پھر کوئی تو محمد بن ابراہیم بن یوسف لکھتا ہے اور کوی صرف محمد بن یوسف ۔ وہ تو غنیمت ہوا کہ خود صاحب منتہی المقال نے یہ گتھی اس طرح سلجھا دی کہ کوئی ان کو ان کے باپ کی طرف منسوب کرتا ہے اور کوئی ان کے دادا کی طرف مگر ان کے دادا یا پردادا کا لقب جو عبدویہ انھوں نے خود دے رکھا تھا، اس کو ان میں سے کوئی بھی ہنیں لکھتا۔ تماشا یہ ہے کہ سال وفات کا بھی مطلق ذکر ہنیں کیا جاتا ۔ صرف علامہ حلّی سال ولادت لکھتے تو ہیں مگر متعارف طریقہ جو سال ہجری کا ہے اس سے گریز کر کے ایک بالکل غیر متعارف چیز یعنی حسینی[1] کے حساب سے نام یوسف تھا، مگر انھوں نے عبدو یہ لقب دے کر اہل سنت میں مشہور کیا اسی لئے شیعوں کی بعض کتب رجال میں ان کا نام یوں ہے " محمد بن ابراہیم بن یوسف ۔

۱۔ سال حسینی کا حال مجھ کو اخی الاعظم حضرت مولانا قاری شاہ محمد سلیمان پھلواروی سے او، ان کو نواب محسن الملک سے معلوم ہوا کہ رحمہا اللہ تعالیٰ ہیں نے اس کی پوری تفصیل اپنے رسالے آیۃ التطہیر میں لکھ دی ہے۔ یہاں طوالت کے خوف سے اس کا اعادہ ضروی ہیں سمجھتا ہوں۔ مختصر یہ ہے کہ اس کا آغاز بعثت نبوت سے آٹھ سال پیشتر سے اہل تشیع کرتے ہیں اور جس کی بنیاد ایک خواب بتاتے ہیں، جو شیعوں کی روایت کے مطابق رسول اللہ صلعم کو امام حسینؓ کے متعلق بعثت سے آٹھ سال پہلے دکھایا گیا تھا اور ان کے یہاں اس خواب کا اخفاء و کتمان بھی فرض ہے اور سال حسینی کا اخفاء بھی۔ مگر زندگی بھر میں واقف کاروں پر دو ایک مرتبہ اس کا استعمال بھی واجب ہے۔ غالباً اسی بناء پر علامہ حلی نے یہاں استعمال کر لیا۔

خلاصۃ الاقوال میں ابو بکر شافعی

الکاتب یمنیٰ اباالحسن" جیسا کہ "خلاصۃ الاقوال" میں علامہ حلّی مشہور محدث شیعہ نے لکھا ہے اور اس طرح ان کا نام تحریر فرما کر لکھتے ہیں کہ "قال احمد بن عبدون هو ابو بکر الشافعی مولده سنه ۲۸۱ الحسینیه وکان علی الظاهر یتفقه علی مذهب الشافعی و یریٰ رای الشیعه الامامیه فی الباطن وکان فقیها علی المذهبین و له علی المذهبین کتب یعنی احمد بن عبدون نے فرمایا کہ وہ ابو بکر شافعی ہیں ان کی ولادت حسینی سال کے حساب سے ۲۸۱ میں ہوئی اور یہ بظاہر مذہب شافعی کی فقہ پر تھے، مگر باطن میں شیعہ امامیہ کا عقیدہ رکھتے تھے اور دونوں مذہب کے فقیہ تھے اور دونوں مذہب پر ان کی کتابیں ہیں۔ دیکھئے خلاصۃ الاقوال صفحہ ۷۰

منتہے المقال میں ابو بکر شافعی

اور دوسرے شیعہ محدث امام فن رجال ابو علی محمد بن اسمٰعیل بن عبدالجبار اپنی کتاب منتہی المقال میں لکھتے ہیں کہ "ابو بکر الشافعی هو محمد بن یوسف، کذا فی المجمع فلعله ینسب تارة الیٰ ابیه و تارة الی جده و ذکره من طبقه ثقاتهم۔ یعنی ابو بکر شافعی وہ محمد بن یوسف ہیں۔ ایسا ہی کتاب المجمع میں ہے۔ شاید ان کی نسبت کبھی ان کے باپ کی طرف کی جاتی ہو اور کبھی ان کے دادا کی طرف۔ یعنی کسی نے محمد بن ابراہیم کہا کسی نے محمد بن یوسف کہہ دیا۔ اور لوگوں نے ان کو

۱۔ یعنی محمد بن ابراہیم بن یوسف الکاتب جن کی کنیت ابوالحسن ہے جیسا کہ ابتدائے ترجمہ میں علامہ حلی نے لکھا ہے۔

ثقہ لوگوں کے طبقے میں ذکر کیا ہے۔

علامہ مجلسی کی الوجیزہ

علامہ مجلسی تیسرے مشہور شیعہ مجتہد و محدث اپنی کتاب الوجیزہ میں لکھتے ہیں، محمد بن ابراہیم بن یوسف ح" شیعوں کی کتب رجال میں جس سے علمائے اہل سنت تو کجا شیعوں میں سے بھی خاص خاص ہی لوگ واقف ہیں۔ اس طرح کی تدلیس یعنی ناموں میں ادل بدل شیعی علماء بہت کیا کرتے ہیں کہ علمائے اہل سنت اگر یہ کہیں کہ یہ تو شیعہ ہے، تو جواب میں کہدیا جائے کہ نہیں تو، شیعہ تو دوسرا ہے، جس کے بار میں آپ کہتے ہیں وہ سنی ہے، چنانچہ دونوں کے ناموں میں کافی فرق موجود ہے ۔ آپ کا ابو بکر شافعی محمد بن عبداللہ بن ابراہیم بن عبدویہ ہے، جس کی ولادت ۲۶۰ھ کی ہے ۔ اور ہمارا ابو بکر شافعی محمد بن ابراہیم بن یوسف یا محمد بن یوسف جس کا سال پیدائش ۲۸۱ھ ہے۔ باقی رہا سال حسینی تو اگر امام حسینؓ کی ولادت سے بھی لیجئے، تو سال ہجری سے بھی کم ہی ہوگا نہ کہ اکیس برس آگے، اس لئے یہ دوسرے ہی ابو بکر شافعی ہیں، جو پہلے شافعی مذہب رکھتے تھے۔ اس کے بعد شیعہ امامیہ مذہب اختیار کر لیا۔ مگر پہلے لقب سے مشہور رہ گئے۔

علمائے شیعہ کی تدلیس

اسی طری کی تدلیس شیعے ہمیشہ کرتے رہتے ہیں۔ مثالاً ملاحظہ ہو۔

مندل بن علی الغزی

مندل بن علی الغزی اہل سنت کی کتابوں میں ایک شیعہ راوی ہے،

مگر شیعوں نے ان کو اپنی کتابوں میں مبدل بہ علی الغزی لکھا ہے اور تصریح کر دی کہ مبدل بائے موحدہ تحتانیہ سے اور الغزی تائے شناۃ فوقانیہ و رائے مہملہ سے۔ تاکہ دونوں دو شخص سمجھے جائیں اور مبدل کے حقیقی بھائی حبان بن علی بن الغزی کو صرف حبان۔

حبان بن علی الغزیؒ

گویا حبان بنا کر تصریح کردی کہ یائے شناۃ تحتانیہ سے اور بس یہاں غزی کو عتری نہیں بنایا، تاکہ یہ دونوں ایک دوسرے کے بھائی بھی نہ سمجھے جائیں۔ دونوں کے نام بھی کتابوں میں اتنے فاصلے سے تیار ہوتے ہیں کہ دونوں میں کسی مناسبت کا خیال بھی نہ جاسکے گا۔
مندل کا نام باب المیم میں بہت بعد کو آئے گا اور حبان کا نام باب الحاء المہملہ میں کتاب کے دوسرے ہی ربع میں موجود ہوگا۔

اسی طرح ابو جعفر محمد بن جریر بن یزید الطبری کو جن کی تفسیر اور تاریخ مشہور ہے اور جو بالاتفاق شیعہ تھے، ابو جعفر محمد بن جریر بن رستم الطبری لکھ دیا۔ تاکہ اہل سنت دونوں کو دو شخص سمجھ لیں، چنانچہ یہی ہوا اور امام ذہبی و ابن حجر جیسے علمائے رجال دونوں کو دو سمجھتے رہے، حالانکہ رستم طبرستان کا رہنے والا تھا، اسلام قبول کرنے کے بعد اس کا نام یزید رکھا گیا۔ ابن جریر نے خود یہ تدلیس کی کہ جو کتابیں خاص شیعوں کے لئے لکھیں، اس میں اپنے دادا کا نام اس نے رستم ہی رہنے دیا اور جو کتابیں عام مسلمانوں کے لئے تصنیف کیں، ان میں اپنے دادا کا نام یزید لکھا۔ شیعوں کے لئے جو کتابیں لکھیں وہ عام نگاہوں سے اس وقت تک برابر پوشیدہ رہیں، جب تک کہ ایران میں حکومت صفویہ قائم نہ

ہوئی تھی۔ جس طرح شیعوں کی تمام خاص کتابیں اور مخصوص عقیدے
اس سے پہلے تک برابر پردۂ کتمان میں رہے - ابن جریر کی خاص شیعی
تصنیفیں بھی نہاں خانۂ کتمان ہی میں محفوظ رہیں۔ حکومت صفویہ کے
استحکام کے ساتھ ہی ساری پوشیدہ چیزیں منصہ شہود پر آگئیں۔ اور شیعے
اپنے اصلی عقیدے اور حقیقی رنگ وروپ میں نمایاں ہوگئے۔ اس وقت
اس کا خیال ہوا کہ ایسا نہ ہو کہ ابن جریر کی تصنیفات سے علمائے اہل
سنت بد ظن ہو کر اس کو حجت و سند نہ سمجھیں، تو پھر جو جو تخم ریزیاں
ابن جریر اپنی اس تفسیر اور تاریخ میں کر گئے ہیں بار آور نہ ہو سکیں گی،
اس لئے فوراً علمائے شیعہ نے اپنی کتابوں میں ایسی تصریحیں لکھنا شروع
کر دیں، جس سے یہ معلوم ہو جائے کہ ابن جریر ایک نہیں بلکہ دو تھے
اور وہ علماء و عقلائے شیعہ جو ایران سے باہر اہل سنت کے ساتھ گھلے
ملے تھے، اہل سنت میں زبانی اس کا پروپیگنڈا بھی کرتے رہے اور یہ ایک
خیال اہل سنت کو بھی ایسا رہا کہ اگر اس چیز کو ہم فلاں فلاں صحیح اور
حقیقی وجوہات کی وجہ ہی سے سہی مگر رد کر دیتے ہیں یا مشتبہ وغیر مستند
مان لیتے ہیں تو پھر یہ چیز ہمیشہ کے لئے ہمارے ہاتھ سے چلی جاتی ہے اور
ایسی دوسری چیز ہمارے پاس ہے نہیں جو اس کا نعم البدل ہو۔ اس لئے
ہم ان صحیح و واقعی وجوہات سے چشم پوشی کرلیں گے یہاں تک کہ بر
بنائے ضرورت اس کی واقعیت ہی سے انکار کر دیں گے، مگر اس دولت
کو ہاتھ سے جانے نہ دیں گے - یہ حلوائے بادام کی قاب فی الجملہ زہر آلود
ہی سہی، مگر ہے تو حلوائے بادام - اس کی زہر آلودگی سے انکار کر کے تھوڑا
تھوڑا کھاتے رہیں تو اس کا مزہ تو آئے گا ہوس تو مٹے گی۔ زہر آلود کہہ کر
واپس کر دینے سے ہوس اور ستائے گی اور یہ یاد کر کر کے کہ ہائے کیا

خوش رنگ اور خوش بو حلوا تھا اور بھی رہ رہ کے طبیعت بے چین ہوگی۔ بس یہی وجہ تھی کہ تفسیر طبری و تاریخ طبری کو بھی اہل سنت نے گلے لگایا اور مسند احمد کو بھی۔ اور اسی طرح سنن نسائی اور مستدرک حاکم وغیرہ کو بھی۔

رجوع بسوئے مقصد

غرض اتنی تفصیل کے بعد آپ کو ابو بکر شافعی کی پوری حقیقت معلوم ہوگئی کہ یہ ایک پکا منافق شخص تھا، درحقیقت شیعہ رافضی تھا اور تقیہ کرکے شافعی بنا ہوا عبداللہ بن احمد کے ساتھ لگا رہا۔ اور اس کی پیٹھ پر وہ کدیمی اور بورتی والی پارٹی تھی۔ جو درحقیقت بالکل اُسی کی طرح تقیہ باز تھی۔

تصریح سلسلہ تالیف مسند

اور وہ سب کے سب شیعہ ہی تھے مگر اہل سنت بنے ہوئے۔ عبداللہ بن احمد کی وفات کے بعد اپنی پارٹی کی جمع کردہ جھوٹی سچی روایات کو یک جا کرکے پورا ذخیرہ "حد ثنا عبدالله حد ثني ابي لکھ لکھ کر مرتب کر ڈالا (یہ شخص تھا بڑا لکھاڑ اور خوشخط، چنانچہ شیخ حلّی نے ان کے نام کے ساتھ الکاتب کا لفظ لکھا بھی ہے۔) اور اس کی متعدد نقلیں بھی اپنی جماعت کی مدد سے اس نے مہیا کر لیں مگر فوراً اُس کی اشاعت ہوتی تو پھر عبداللہ کے دوسرے تلامذہ نہایت سختی کے ساتھ تکذیب کرتے، اس کا ڈر لگا ہوا تھا، اس لئے جب تک عبداللہ کے تمام بڑے بڑے تلامذہ ایک ایک کرکے راہئ عدم نہ ہولئے، اس وقت تک تو کسی سے مسند احمد کا نام تک ہنئیں لیا گیا۔ یہاں تک کہ اس انتظار میں ابو بکر شافعی خود ہی ۳۵۴ھ

میں دنیا سے رخصت ہونے لگے اور ابھی طبرانی جیسا جلیل القدر محدث متوفی ۳۶۰ھ میں عبداللہ بن احمد کے شاگرد رشید موجود تھے۔ آخر ابو بکر شافعی نے مرتے وقت ابو بکر قطیعی کو یہ امانت سپرد کر دی اور بزبان حال کہا کہ

سپردم بتو مایہ خویش را

قطیعی تو ابو بکر شافعی کے ساتھ رہتے ہی تھے، اور انھیں کے تربیت یافتہ وہم مسلک وہم خیال، پھر سن شعور کے بعد سے برابر شریک کار بھی رہے، یعنی ترتیب مسند میں بھی ابو بکر شافعی کے معین و مدد گار رہے، اس لئے انھوں نے اس مہم کو اپنے ذمے بشوق تمام لے لیا، اور اب کام ہی کیا تھا، پکی پکائی کھیر تو سامنے تھی صرف کھالینا تھا۔ طبرانی کے انتقال کے بعد یہ ادھر ادھر گھومنے لگے۔ مگر پھر بھی کہیں مسند احمد کا نام لینے کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔ اپنے کو عبداللہ بن احمد کا شاگرد بھی مشہور کر ہی چکے تھے اور لوگوں نے تسلیم بھی کر لیا تھا کہ عبداللہ کے آخر وقت میں کچھ حدیثیں ان سے سنی ہوں گی۔ ۱۶ - ۱۷ سال کی عمر محض بچپن کی عمر نہیں۔

پھر جس طرح ابو بکر شافعی کو یہ ابو بکر قطیعی مل گئے تھے، بالکل اسی طرح ابو بکر قطیعی کو بھی "جوئندہ یابندہ" کے مطابق آخر ایک ہم راز شاگرد ابن المذہب مل ہی گیا جو درحقیقت منافقت میں ابو بکر شافعی اور ابو بکر قطیعی دونوں کا ہم مذہب تھا۔ اسی ابن المذہب نے مسند احمد کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا اور ابو بکر قطیعی کے انتقال کے کم سے کم پچاس برس بعد یعنی پانچویں صدی ہجری کے پہلے ربع کے گزر جانے کے بعد دیکھا کہ

اب میدان بالکل صاف ہے۔ عبداللہ بن احمد ہی نہیں بلکہ ان کے اکابر تلامذہ کے دیکھنے والے بھی اب بہت کم رہ گئے۔ تکذیب کا خطرہ اب بہت زیادہ نہیں رہا، اس لئے ادھر ادھر مسند احمد کا ذکر کرنے لگے۔ چنانچہ خطیب بغدادی سے بھی انھوں نے اپنے سلسلے کا ذکر کیا، جیسا کہ ابن حجر نے خطیب کا قول نقل کیا ہے مگر خطیب جیسا نقاد، ابن المذہب کے دام تزویر میں کب آ سکتا تھا۔ اگر واقعتاً خطیب کو ابن المذہب پر کچھ بھی اعتماد ہوتا تو خطیب ضرور ابن المذہب سے مسند کی سند و اجازت لے لیتے، خطیب ہی نہیں، بلکہ خطیب کے ہم عصر اللہ جانے کتنے محدثین ابن المذہب سے مسند کی سند و اجازت لئے ہوتے، مگر کسی نے بھی ان کے اس دعویٰ کی طرف توجہ نہ کی۔ بخوبی ممکن ہے کہ خطیب اور اس وقت کے دوسرے محدثین نے ابن المذہب کی تکذیب بھی کی ہو، مگر بعد والوں نے فقط مسند کا بھرم رکھنے کے لئے اس پر پردہ ڈال دیا، مگر عملی تکذیب پر کس طرح پردہ ڈالا جا سکتا ہے؟ اگر زبانی تکذیب کا کوئی ثبوت نہیں تو یہ تو روز روشن کی طرح واضح ہے کہ خطیب اور اس وقت کے سارے محدثین نے عملی بے اعتنائی و بے توجہی سے درحقیقت ان کی تکذیب کر کے دکھا دی۔ ذہبی و ابن حجر زبانی تکذیب کا ذکر نہ کریں مگر اس عملی تکذیب کو جو آفتاب کی طرح چمک رہی ہے، کس طرح چھپا سکتے تھے، مگر زبانی تکذیب بھی ضروری تھی۔ جبھی تو ذہبی و ابن حجر باوجود توثیق مسند کی ضرورت کے ابن المذہب و قطیعی کو زبان روکتے ٹوکتے بھی غیر متقن وغیرہ لکھ گئے۔

مختصر یہ کہ باوجود اس کے کہ یہ اپنے ہم عصر محدثین کے پاس مسند کو عمر بھر لئے پھرے مگر کسی نے کبھی توجہ نہ کی۔ آخر اپنے دونوں اگلے

مقتداؤں کی طرح یہ بھی صرف ایک شاگرد ابو القاسم ہبۃ اللہ کو ڈھونڈ نکالنے میں کسی طرح کامیاب ہوگئے۔ اور مسند کی امانت انھیں کے سپرد کرکے ۴۴۴ھ میں دنیا سے سدھار گئے۔

ان ابوالقاسم ہبۃ اللہ صاحب کا بھی بالکل وہی ابن المذہب جیسا حال ہوا ساری عمر مسند احمد کو ہر جگہ ڈھوئے ڈھوئے پھرے، مگر علمائے حدیث میں سے ایک شخص نے بھی نگاہ اٹھا کر ان کی طرف نہ دیکھا۔ مجبوراً اپنے اسلاف کی طرح یہ بھی ایک غیر معروف شخص حنبل بن عبداللہ الرصافی کو اشاعت مسند کی خدمت کسی طرح تفویض کر گئے۔ چنانچہ حنبل بن عبداللہ الرصافی کے سوا اور کوئی شیخ القاسم ہبۃ اللہ یا کسی سے بھی مسند کا راوی نظر نہیں آتا۔ اگر کوئی ہو بھی تو اس سے مسند کی کوئی اہمیت نہیں ثابت ہوتی، جس طرح حنبل بن عبداللہ الرصافی کے بعد دو چار راویوں کی تعداد مل جانے سے کوئی فائدہ نہیں، مگر اب تک رصافی کے سوا ہبۃ اللہ سے کوئی اور مسند کا روایت کرنے والا کہیں نظر سے نہیں گزرا۔

مشتبہ احاد روایتیں کبھی قابل قبول نہیں ہوتیں

محدثین کا متفقہ اصول ہے کہ کوئی ایسی روایت جس کے متعلق عقل اس کی مقتضی ہو کہ کسی خاص عہد یا ہر عہد میں اس کے جاننے والے اور اس کی روایت کرنے والے بہت کافی لوگ ہوں۔ ایسی حدیث کو اگر اس خاص عہد یا ان سب عہدوں میں صرف ایک یا ایک ایک ہی راوی ایک دوسرے سے روایت کرتے چلے آرہے ہوں، تو وہ حدیث صرف احاد ہونے کی وجہ سے ظنی ہی نہیں کہی جائے گی بلکہ موضوع یا مشتبہ ہونے کی حیثیت سے رد کر دی جائے گی۔

حدیث آحاد ظنی اور آحاد مشتبہ اور دونوں کا فرق

عہد صحابہؓ یا عہد تابعی یا عہد تبع تابعی میں کسی حدیث کو صرف ایک ہی شخص اگر روایت کر رہا ہو تو وہ حدیث آحاد ہے۔ اگر تینوں زمانوں میں صرف ایک ہی ایک شخص روایت کرتا ہو یا دونوں میں، تو دہرے یا تہرے آحاد ہونے کی وجہ سے اس کی ظنیت زیادہ قوی ہو کر اشتباہ سے قریب یا قریب تر ہوگی۔

مگر ایسی حدیث جس میں ایسی بات بیان کی جا رہی ہو جس کے متعلق عقل اس کا یقین رکھے کہ اس حدیث کے جاننے والوں اور روایت کرنے والوں کی کچھ زیادہ تعداد ضرور ہونی چاہیئے۔ مثلاً ۱۔ وہ واقعہ بیان کیا جا رہا ہے ایک مجمع یا جماعت کے سامنے کا ۲۔ امر یا نہی ہونے کی وجہ سے اس کا حکم پوری یا کسی[۱] خاص جماعت پر عائد ہو رہا ہو، اس لئے اس پر اس جماعت کا عمل درآمد ضرور ہونا چاہیئے۔ ۳۔ کہا گیا ہو کہ اس کی اطلاع سب کو یا کسی خاص جماعت کو دیدو۔ ۴۔ کسی خاص جماعت یا عامۃ المسلمین کو مخاطب کیا گیا ہو۔ ۵۔ کسی خاص قبیلے یا جماعت کی تعریف میں وہ حدیث وارد ہوئی ہو۔ ۶۔ وہ واقعہ جو بیان کیا گیا ہے کوئی غیر معمولی ہو تعجب خیزی کی وجہ سے مثلاً معجزہ وغیرہ یا کسی اور اعتبار سے۔ ۷۔ جو واقعہ مروی ہو وہ اپنی اہمیت کے اعتبار سے غیر معمولی ہو، وغیر ذلک۔

اس قسم کی روایت کا صرف کسی ایک ہی صحابیؓ سے مروی ہونا ضرور شبہے میں ڈالتا ہے کہ آخر دوسرے صحابہؓ اس کے متعلق خاموش کیوں رہے اور تابعین نے اس کے متعلق کسی دوسرے صحابی سے کیوں نہیں

۱۔ مثلاً صرف عورتوں یا مردوں یا صرف جوانوں یا صرف بوڑھوں یا صرف مسافروں پر وغیرہ۔

دریافت کیا؟ اگر اسی ایک صحابی سے متعدد تابعی اور ہر تابعی سے متعدد تبع تابعین بھی روایت کرتے ہوں، جب بھی صرف ایک ہی صحابی سے اس کا مروی ہونا محل اشتباہ ہونا ضرور ہے۔ اسی طرح متعدد صحابہؓ سے صرف ایک ہی تابعی اگر روایت کر رہے ہوں، جب بھی وہ اشتباہ سے خالی ہنیں۔ علیٰ ہذا القیاس اگر صحابہ و تابعی سب کا تعدد ہو، مگر سب سے صرف ایک ہی تبع تابعی روایت کر رہا ہو۔

اور اگر ایک صحابی سے ایک تابعی اور اس ایک تابعی سے کئی تبع تابعین روایت کر رہے ہوں تو یقیناً اشتباہ دہرے ہونے کی وجہ سے مؤکد ہوجائے گا اور اگر ایک صحابی سے ایک تابعی اور اس ایک تابعی سے صرف ایک ہی تبع تابعی روایت کرے۔ جب تو تہرے اشتباہ کی وجہ سے وہ روایت بہت زیادہ مشتبہ تر ہو جائے گی۔ اور ان تمام صورتوں میں اس قسم کی روایتیں اپنے مراتب اشتباہ کے مطابق مشتبہ ہوں گی اور ان میں سے کوئی روایت بھی کسی بات میں بھی حجت و سند ہنیں سمجھی جائیگی اور ضرور وجب الرد ہوگی، اس لئے کہ ہم کو تو قرآن مجید میں اتباع ظن اور اتباع ماتشابہ سے منع کیا گیا ہے اور یہ شان کفار و مشرکین اور گم راہوں کی بتائی گئی ہیں۔ اسی لئے حدیث میں حکم ہے کہ و ایاک و ا لمشتبھات یعنی مشتبہ باتوں سے سخت احتیاط کرو۔

تو جب ایک روایت جو اس طرح کی آحاد ہو، وہ مشتبہ ہو جاتی ہے اور اس کا یہ حال ہے تو پورا ذخیرہ جس میں تقریباً چالیس ہزار روایتوں کا انبار لگا ہوا ہے، یہ سارا دفتر مجھ کو کتابی صورت میں مجتمع ایسی بھیانک اور غیر معمولی آحادیث سے پہنچتا ہے جس کی احادیث کا سلسلہ تین سو برس تک مسلسل متفرد و مشتبہ راویوں کی پانچ چھ روایتی پشتوں تک

یکے بعد دیگرے بلا شرکت دیگرے و بے مداخلت غیرے چلا آرہا ہے۔
اس کے ناقابل اعتبار اور مشکوک ہونے میں کیا شک ہے؟ حقیقت یہ ہے
کہ یہ امام احمد کے نام پر اسی قسم کی ناروا ساحرانہ حرکت ہے، جیسی کہ
سامری نے قبضة من اثر الرسول کے ذریعہ کی تھی۔ اور جس طرح
اس وقت سامری اپنا اثر جمانے میں کامیاب ہوگیا تھا اسی طرح ابو بکر
شافعی اور اس جیسے دوسرے سامری مسلمانوں کو دھوکہ دینے میں
کامیاب رہے۔ و سیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون ۲۶۵/ ۲۲۷

جعلی روایات کے سیلاب کے آگے بند باندھنے کی کوششیں

مؤطا: بعض مخلص علماء نے روایات کا اتنا بڑا طوفان دیکھ کر اسکی ضرورت محسوس کی کہ صحیح روایات کو ایک جگہ مجتمع کرلیا جائے اور اس کے بعد روایت احادیث کا دروازہ بند کر دیا جائے تاکہ یہ طوفان کسی طرح ختم ہو۔ سب سے پہلے یہ قدم امام مالک رحمہ اللہ نے اٹھایا۔ انھیں جتنی حدیثیں صحیح مل سکیں انھوں نے ان کو مؤطا میں جمع کر دینا چاہا۔ مگر حبیب بن حبیب جب کاتب ان کو ایسا ملا کہ جسے بعد والوں نے کذاب و ضاع قرار دیا۔ مگر اس کا کذب وافترا، امام مالک کے انتقال کے بعد لوگوں پر کھلا بھی تو اس سے خاص فائدہ نہیں ہوا، کیوں کہ مؤطا میں جو کچھ کارستانیاں وہ کر گیا وہ تو کتاب میں برقرار رہیں۔

بقیہ کتب ستہ: پھر امام بخاری، امام مسلم۔ و دارمی و ترمذی، ابو داؤد و نسائی وغیرہ کے مؤلفین نے بھی کمر ہمت باندھی اور اس طوفان روایات کے آگے اپنے اپنے طور پر بند باندھنے کی کوششیں کیں۔ ان میں سے ہر ایک نے اسکی کوشش کی کہ میں ایسا کچھ لکھدوں جس کے بعد جمع و تدوین کا دروازہ بند ہوجائے اور مزید جعل سازی نہ ہوسکے۔ مگر اسی نیت اور شوق تدوین کی وجہ سے ان میں سے ہر ایک نے پہلے کی کوششوں کو ناکافی سمجھ کر جب نئی کوشش کی تو پہلے کے بند دروازے کو پھر کھول دیا اور کئی صدی تک جمع و تدوین کا یہ سلسلہ جاری رہا جن حدیثوں کو اگلوں نے ناقابل قبول سمجھ کر رد کر دیا تھا بعد والوں نے ان کو قبول کر لیا۔ جس راوی پر ایک نے جرح کی دوسرے نے اس کی توثیق کر دی اور

اس کی روایت مان لی۔ ایک نے کسی راوی کو کذاب و مفتری قرار دیا تو دوسرے نے کہدیا کہ یہ تو ایسا سچا تھا کہ اگر آسمان سے اس کو پٹک دیا جاتا تو وہ اس کو قبول تھا مگر جھوٹ بولنا اس کو کسی حال میں بھی قبول نہ تھا۔

امام شعبہ مشہور محدث نے اپنے ایک شاگرد سے کہا تھا کہ کلما تقد متم فی الحدیث تاخر تم عن القران تم حدیث کی طرف جس قدر آگے بڑھو گے اسی قدر قرآن سے پیچھے ہٹتے جاؤ گے ۔ ان کا یہ فرمانا اس قدر صحیح ثابت ہوا کہ تعجب ہوتا ہے۔

حدیثوں میں انہماک کی بدولت قرآن سے محدثین کی غفلت و بے اعتنائی

یہاں اس کا موقع نہیں کہ اس موضوع پر بالتفصیل گفتگو کی جائے اس لئے یہاں صرف تین مثالیں پیش کر دی جاتی ہیں تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ بعض اہل علم حدیثوں میں انہماک رکھنے کی وجہ سے قرآن سے کس حد تک غافل ہو گئے تھے۔

مثال نمبرا | مقدمہ صحیح مسلم میں امام مسلم باب " صحة الا حتجاج بالحدیث المعنعن اذا امکن لقاء المعنعین لم یکن فیه مدلس " کے شروع ہی میں اپنے کسی ہم عصر پر حملہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں " لو ضربنا عن حکایته و ذکر فساده صفحا " یعنی " اگر ہم اس کے قول کی حکایت اور اس کے فساد کے ذکر سے باز رہیں۔" یہاں امام مسلم نے " ضرب الصفح عن شیئی " کا محاورہ استعمال کیا ہے ۔ مقدمہ صحیح

مسلم کی شرح میں صحیح مسلم کے شارح امام نوویؒ نے تحریر فرمایا ہے اور پھر اس کو بجنسہٖ ہمارے شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی مرحوم نے بھی اپنی شرح مسلم فتح الملہم میں نقل کر دیا ہے کہ ضربنا و هو صحیح و ان کانت لغة قلیلة قال الازھری یقال ضربت عن الامر و اضربت عنه بمعنی کففت و اعرضت و المشھور الذی قاله الاکثرون اضربت بالالف" یعنی یہاں ضربنا کا لفظ صحیح ہے اگرچہ لغت قلیل الاستعمال ہے ۔ ازہری (امام لغت) نے کہا ہے کہ ضربت عن الامر اور ضربت عنہ (دونوں) کففت باز رہا میں، رکا رہا میں، رک گیا میں، اور اعرضت اعراض کیا میں نے، منہ پھیر لیا میں نے، قطع نظر کیا میں نے، کے معنی میں مستعمل ہے ۔ مگر جو مشہور ہے جس کو اکثر لوگ بولتے ہیں وہ اضربت ہے الف کے ساتھ ۔

مگر نہ امام نووی کو یاد آیا، نہ مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہما اللہ کو کہ یہ محاورہ امام مسلم نے قرآن مجید سے سیکھا تھا اور قرآن مجید میں بغیر الف کے ضرب ہے یعنی باب مجرد ہی سے آیا ہے ازہری نے کہاں سے لکھدیا کہ مجرد سے قلیل الاستعمال ہے مشہور اور اکثروں کی زبانوں پر الف سے یعنی باب افعال ہی سے مستعمل ہے؟ قرآن کی یہ آیت ازہری کو بھی یاد نہ آئی اور پھر مشہور اور قول اکثر کے ثبوت کے لئے شعرائے جاہلیت کے کچھ اشعار تو پیش کر دیئے ہوتے ۔

سورۃ زخرف کے شروع ہی میں آیا ہے جو چوتھی ہی آیت ہے کہ افنضرب عنکم الذکر صفحا ان کنتم قوما مسرفین ۔ کیا ہم صرف اس لئے تمہیں نصیحت کرنے سے باز رہیں کہ تم حد اعتدال سے گذر جانے والی قوم ہو ۔ اگرچہ کہا جاسکتا ہے کہ ممکن ہے کہ کوئی قرأت نُضرب بضم

نون کی بھی ہو اور اس قرأت سے یہاں باب افعال ہی آیا ہو مگر اول تو اختلاف قرأت منافقین کا ایجاد کردہ ہے اور اسی موضوع پر یہ کتاب ہے جس کی تفصیل آگے آتی ہے ۔ دوم یہ کہ قرأت متواترہ کے مقابل کسی دوسری قرأت کو پیش نہیں کیا جاسکتا۔ سوم یہ کہ ایسی کوئی قرأت کسی قاری سے مروی ہی نہیں ہے کسی نے کبھی انضرب یہاں بضم نون پڑھا ہی نہیں ہے۔

اس محاورے کے ثبوت میں جو شعر زمخشری نے پیش کیا ہے وہاں باب مجرد اور باب افعال دونوں کا امکان ہے ۔ مگر بعد کو مفعول مطلق باب مجرد ہی کا ہے اس لئے قرینہ غالب یہی ہے کہ فعل بھی مجرد ہی ہو ۔ غرض امام نووی نے ازہری کا قول تو نقل کر دیا مگر قرآن کی آیت ان کو یاد نہ آئی اور نہ ہمارے شیخ الاسلام ، پاکستان کو یاد آئی ۔ رحمہما اللہ تعالیٰ۔

مثال نمبر۲ | حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ کی مشہور کتاب "الانصاف فی وجوہ الاختلاف" جو درحقیقت ایک مختصر سا رسالہ ہے جو ایک سرسری غور و فکر کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے اس کے دیکھنے کے بعد ہر صاحب تمیز یہ کہہ دیگا کہ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ نے قلم برداشتہ ہی اس کو لکھدیا ہے۔ اس کا ترجمہ ۱۹۴۵ء کے اواخر مہینوں سے ماہنامہ ترجمان القرآن میں مولوی صدر الدین صاحب اصلاحی کے قلم سے شائع ہونا شروع ہوا تھا ۔ میرے پاس یہاں اصل کتاب نہیں ہے اور نہ ترجمان القرآن کا وہ پرچہ ہے جس میں اس ترجمے کی پہلی قسط چھپی تھی لیکن میں نے اس کی تنقید رسالہ البیان امرتسر مورخہ ماہ مارچ ۱۹۴۶ء میں جو شائع کرائی تھی وہ حسن اتفاق سے یہاں میرے پاس موجود ہے میں

اسی پرچہ البیان سے مختصراً نقل کرتا ہوں۔۔
مولوی صدر الدین صاحب اصلاحی حضرت شاہ صاحب کی عربی عبارت کا ترجمہ یوں لکھتے ہیں:۔
دوسری مثال بخاری و مسلم کی اس روایت میں موجود ہے کہ عمر بن الخطاب (رضی اللہ عنہ) کا خیال تھا کہ اگر جنبی کو غسل کے لئے پانی نہ ملے تو وہ تیمم سے پاکی حاصل نہیں کرسکتا۔ حضرت عمار بن یاسر (رضی اللہ عنہ) نے ان کے سامنے اپنا واقعہ بیان کیا کہ میں ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہم سفر تھا۔ مجھ کو غسل کی حاجت ہوگئی۔ لیکن پانی نہ پا سکا اس لئے تیمم کی خاطر دھول میں لوٹ پوٹ لیا۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی اس کارروائی کا تذکرہ کیا تو آپؐ نے فرمایا کہ تم کو صرف اتنا کرلینا کافی تھا (یہ کہتے ہوئے) آپؐ نے اپنے دونوں ہاتھ زمین پر مارے اور ان کو اپنے منھ اور ہاتھوں پر مل لیا۔ حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) نے حضرت عمارؓ کے اس بیان کو قبول نہیں کیا۔ اور کسی پوشیدہ ضعف کی بنا پر جو ان کو اس روایت میں نظر آیا ان کے نزدیک یہ روایت حجت نہیں ٹھہری۔ اگرچہ آگے چل کر دوسرے طبقے میں یہ حدیث بہت طریقوں سے مشہور ہوگئی اور اس کے ضعیف ہونے کا گمان ماند پڑگیا۔ اس لئے لوگ اسی پر عمل پیرا ہوگئے۔
مجھ کو اس وقت نہ تو نفس حدیث پر اور نہ اس کے مختلف طرق پر بحث کرنا ہے نہ اس کے راویوں پر تنقید کرنا ہے ۔ صرف یہ دکھانا ہے کہ امام بخاری و امام مسلم اور پھر شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کیا ان بزرگوں نے قرآن مبین میں تیمم کی آیتیں نہیں دیکھی تھیں؟ کہ اس روایت کو صحیح سمجھ کر اپنی کتاب میں درج کر لیا اور حضرت شاہ صاحب

بھی اس کو صحیح سمجھتے ہوئے اپنے بیان وجوہ اختلاف کے ثبوت میں پیش کر رہے ہیں؟

یہ واقعہ اگر صحیح تسلیم کرلیا جائے تو یقیناً وفات نبویؐ کے بعد ہی کا واقعہ کہا جاسکتا ہے بلکہ بعض روایتوں سے تو اس کا پتا صاف طور سے مل رہا ہے کہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت کے مبارک زمانے کا واقعہ بتایا گیا ہے۔ کیونکہ یا امیرالمومنین کہہ کے آپؐ کو مخاطب کیا گیا ہے۔

کیا کوئی شخص اس کا وہم بھی کرسکتا ہے کہ حضرت عمر و حضرت عمار رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے کبھی سورۃ نساء و سورۃ مائدہ پڑھی ہی نہ تھی؟ یا بے سمجھے بوجھے ناخواندہ عوام کی طرح فقط الفاظ زبان سے ادا کرتے تھے اور ان کے معانی پر کبھی غور و تدبر کرتے ہی نہ تھے؟ جب تیمم کا حکم صریح دو دو جگہ قرآن میں موجود ہے تو پھر پانی نہ ملنے کی صورت میں ترک نماز کو جائز سمجھنا اور تیمم کی اجازت نہ دینا کیا کتاب اللہ کی صریح مخالفت نہیں ہے؟ کیا ممکن ہے کہ حضرت عمارؓ اپنا واقعہ تو تیمم کے ثبوت میں پیش کریں اور قرآن مبین کی آیتیں پیش نہ کریں؟ اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ قرآن کے صریح حکم کے بعد بھی تیمم کی اجازت نہ دیں؟

اور یہ حدیث جس طرح پیش کی گئی ہے یقیناً قابل رد ہے۔ اسلئے کہ حضرت عمارؓ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو طریقہ تیمم کا بتایا وہ محض اپنی طرف سے بغیر کسی وحی کے بتایا؟ یا قرآنی آیتیں جو سورۃ نساء و سورۃ مائدہ میں تیمم کے لئے اتری ہیں ان کے ماتحت بتایا؟ اپنی طرف سے بغیر کسی وحی کے یعنی اس حکم کے اترنے سے پہلے سورۃ مائدہ و سورۃ نساء کے نزول کے قبل اگر بتایا تھا تو یہ منصب نبوت ورسالت کے خلاف

ہے۔ آپ کو حکم تھا اتبع ما اوحی الیک من ربک ۶/۱۰۷ جو وحی تمہارے رب کی طرف سے تم پر اتری ہے تم اسی کا اتباع کرو۔ چونکہ اس وقت تک اس کا کوئی حکم نہیں آیا تھا کہ پانی نہ ملے اور غسل کی حاجت یا وضو کی ضرورت ہو تو کیا کیا جائے؟ اور ایسا سوال سامنے آگیا تھا تو آپ اپنے دستور کے مطابق جواب دینے میں وحی کا انتظار فرماتے کبھی اپنے جی سے کوئی بات نہ بتاتے۔ اور اگر تیمم کی آیتوں کے اترنے کے بعد کا واقعہ ہے تو آپ صرف تیمم کرکے نہ بتا دیتے بلکہ پہلے تیمم کی آیتیں پڑھ کر سنا دیتے کیونکہ آپ کو حکم تھا بلغ ما انزل الیک من ربک تمہارے رب کی طرف سے جو کچھ تم پر اترا ہے اس کو لوگوں تک پہنچا دو پہلے حکم کتاب سنا دینا لازم تھا اس کے بعد عملاً اس کی تعلیم آپ پر فرض تھی بغیر آیت پڑھے ہوئے صرف تیمم کرکے بتا دینا ہرگز کافی نہیں ہوسکتا۔ اس منصب رسالت پر الزام عائد ہوتا ہے۔ غرض قرآن مجید کی روشنی میں اگر یہ روایتیں دیکھی جائیں تو ان کا کذب وبہتان ہونا صاف معلوم ہوجائے۔ مگر جذبۂ روایت پرستی نے ذہنوں کو قرآن مجید کی طرف سے غافل کردیا تو پھر وہ کسی حدیث کو قرآن کی روشنی میں کیوں دیکھنے لگے؟

مثال نمبر ۳ تہذیب التہذیم جلد ۷، صفحہ نمبر ۲۶۵ میں عکرمۃ البربری مولیٰ ابن عباس رضی اللہ عنہما کے ترجمے میں لکھتے ہیں:۔

قال داود بن ابی ھند عن عکرمۃ قراء ابن عباس ھذہ الایۃ "لم تعظون قوما ن اللہ مھلکھم او معذبھم عذاباً شدیداً۔" قال ابن عباس لم ادریحا القوم او ھلکوا قال فما زلت ابین الہ حتی عرف انھم قد نجوا نکسانی حلۃ داؤد بن ابی ہند عکرمہ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ آیت پڑھی اہ

لم تعظون سے شدیداً تک۔ (جس کا ترجمہ یہ ہے کہ تم لوگ کیوں نصیحت کرتے ہو ایسی قوم کو جس کو اللہ ہلاک کرنے والا ہے یا سخت عذاب دینے والا ہے) تو ابن عباسؓ نے (یہ آیت پڑھ کر) فرمایا کہ مجھے بالکل معلوم نہیں کہ اس قوم نے نجات پائی یا ہلاک ہوگئی تو عکرمہ نے کہا کہ میں انکے سامنے برابر بیان کرتا رہا، آخر وہ جان گئے کہ ان لوگوں نے نجات پائی تو ابن عباسؓ نے (خوش ہوکر) مجھ کو ایک حلہ (خلعت) پہنایا۔

داؤد بن ابی ہند حضرت انس رضی اللہ عنہ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم) سے حدیثیں روایت کرتے ہیں اور پھر اکابر تابعین کے شاگرد تھے۔ شعبہ اور سفیان ثوری وغیرہما اکابر محدثین کے استاد تھے۔ اور بقول سفیان ثوری اپنے زمانے کے مفتی بھی تھے۔ پھر حافظ ابن حجر جیسے بحر العلوم اس روایت کو صحیح سمجھ کر بغیر کسی تنقید کے اپنی کتاب میں درج کرتے ہیں۔ اور اس آیت کو اس کے سیاق و سباق اس کے ماقبل و مابعد سے ملا کر نہیں دیکھتے کہ واقعی حضرت ابن عباسؓ قرآن سے کیا اس قدر بے خبر تھے؟ اور عکرمہ بھی تو حضرت ابن عباسؓ کے ہی فیض یافتہ تھے وہ بھی قرآن سے کتنے؟ بے خبر نہیں ہوسکتے۔

یہ آیت سورۃ اعراف کے اکیسویں رکوع میں ہے جن بنی اسرائیلی کو حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانے میں سنیچر کے دن مچھلی کے شکار سے منع کیا گیا تھا انھیں کا تذکرہ تھا۔ اس وقت بنی اسرائیل تین جماعتوں میں تقسیم ہوگئے تھے۔ ایک تو وہ لوگ تھے جو احکام تورات کے پابند تھے اور حضرت داؤد کے ہر طرح مطیع و فرمانبردار تھے۔ یہ لوگ سنیچر کو مچھلی کے شکار کی ممانعت سن کر حکم مان گئے تھے اور سنیچر کے دن مچھلی

کا شکار نہیں کرتے تھے دوسرے وہ سرکش لوگ تھے جو نافرمان تھے اور حیلے بہانے سے سینیچر کے دن بھی مچھلی کا شکار کر لیا کرتے تھے مگر پہلی جماعت جو ایمان والوں کی تھی ان میں سے کچھ لوگ تو ان نافرمانوں اور سرکشوں سے بالکل قطع تعلق رکھتے تھے اور ترک موالات کئے ہوئے تھے اور کچھ لوگ ایسے تھے جو باوجود اس کے کہ خود سچے ایماندار تھے مگر ان سرکشوں سے آمد و رفت کے تعلقات رکھتے تھے۔ اور اس آمد و رفت سے ان کی غرض یہ تھی کہ ان لوگوں کو سمجھاتے رہیں اور اللہ کے عذاب سے ڈراتے رہیں شاید مان جائیں، اور سرکشی و نافرمانی سے باز آجائیں تو وہ ترک موالات کر لینے والے اپنے ان ایماندار بھائیوں کو سمجھاتے تھے کہ ان سرکشوں اور نافرمانوں کو تم کیوں نصیحت کرتے ہو؟ اللہ تعالیٰ تو ان کو ہلاک و برباد کرنے والا ہے یا کسی سخت عذاب میں مبتلا کرنے والا ہے۔ پھر ان لوگوں کو نصیحت کرنے کا کیا فائدہ؟ تو ان لوگوں نے کہا کہ تمہارے رب کے حضور میں عذر پیش کرنے کے لئے اور اس امید پر کہ شاید یہ لوگ اللہ سے ڈریں۔

تو اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ واقعہ جو علرمہ غریب کی طرف منسوب کیا گیا ہے یا واقعی عکرمہ ہی نے بیان کیا ہے صحیح ہے تو حضرت ابن عباسؓ نے ان میں سے کس جماعت کے بارے میں اپنی لاعلمی کا اظہار کیا کہ معلوم نہیں وہ لوگ ہلاک ہوگئے یا انھوں نے نجات پائی ظاہر ہے کہ جو لوگ سچے مومن تھے اور ان نافرمانوں سے ترک موالات بھی کئے ہوئے تھے۔ ان کے بارے مین تو ان کو یہ تذبذب ہو نہیں سکتا تھا۔ ان کی نجات میں کس کو شبہ ہو سکتا ہے؟ باقی رہ گئیں دو جماعتیں، پہلی ان سچے ایمانداروں کی جماعت جنھوں نے ان کافروں سرکشوں کے

ساتھ تعلقات آمد و رفت بغرض وعظ و نصیحت باقی رکھے اور دوسری وہ قوم جو کافروں سرکشوں کی قوم تھی۔ اگر مراد وہ نصیحت کرنے والی جماعت ہے کہ چونکہ وہ ان کافروں کے ساتھ تعلقات آمد و رفت رکھتی تھی اس لئے کہیں یہ بھی باوجود سچے مومن ہونے کے صرف تعلقات آمد و رفت کی وجہ سے ان کافروں کے ساتھ کہیں عذاب میں مبتلا نہ ہوگئی ہو تو اس آیت کے بعد فرمایا جاتا ہے کہ انجینا الذین ینھون عن السوء (۷ / ۱٦۵) جو لوگ (ان کافروں کو وعظ و نصیحت کرکے) برائی سے روکتے تھے ان کو ہم نے نجات دیدی بچا لیا۔ کیا حضرت ابن عباسؓ نے یہ جملہ کبھی نہیں پڑھا تھا؟ اور اگر ان کافروں سرکشوں کے متعلق ان کو تذبذب تھا۔ جیساکہ داؤد بن ابی ہند کی روایت کے الفاظ سے ظاہر ہے کہ لم تعظون قوما ن الله مھلکھم الآیۃ پڑھ کر یہ کہنا کہ لم ادرنجا القوم او ھلکوا اس سے پتا بھی ملتا ہے کہ یہاں القوم پر الف لام عہد کا ہے اور وہی قوم مراد ہے جس کا ذکر اس آیت میں ہے۔ یعنی وہی قوم جس کو اللہ ہلاک کرنے والا یا عذاب شدید میں مبتلا کرنے والا تھا۔ تو اگر کافروں کی قوم مراد ہے تو دوسری ہی آیت میں نصیحت کرنے والوں کی نجات کا ذکر فرما کر ارشاد کیا گیا ہے و اخذنا الذین ظلموا بعذاب بئیس بما کانو یفسقون ○ تو پھر ان لوگوں کو جنھوں نے (اپنی جانوں پر)
۱٦۵ / ۷
ظلم کیلئے ایک خوفناک عذاب میں ان کی بدکاری کی وجہ سے ہم نے گرفتار کر لیا تو کوئی بتائے کہ حضرت ابن عباسؓ کو کس قوم کے بارے میں شبہ تھا کہ اللہ جانے وہ قوم ہلاک ہوئی یا اس نے نجات پائی؟

کیا کوئی سمجھدار آدمی اس کا وہم بھی کرسکتا ہے کہ اس آیت میں عکرمہ

والی روایت کے مطابق حضرت عبداللہ بن عباسؓ جیسے جلیل القدر حبرالامۃ کو ایسا مہمل شبہ ہوسکتا ہے جو آجکل کے کسی جاہل مولوی کو بھی نہیں ہوسکتا اگر وہ کسی کا اردو ترجمہ بھی ایک بار دیکھ لے۔ مگر ایسی خلاف عقل روایتیں بھی ہمارے محدثین کی کتابوں میں موجود ہیں اور وہ ان کو صحیح سمجھتے رہے۔ ورنہ ضرور اس کے خلاف عقل و مخالف قرآن ہونے پر کچھ روشنی ڈالتے۔

صحابہ اور احادیث | بعض صحابہؓ نے عہد نبویؐ میں حدیثوں کا لکھنا شروع کر دیا تھا اور وہ جو کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنتے تھے یا جو آپؐ کو کرتے ہوئے دیکھتے تھے اس کو لکھ لکھ کر جمع کرنے لگے تھے تو یہ آیتیں اتریں یاایھا الناس قد جاء تکم موعظۃ من ربکم و شفاء لمافی الصدور و ھدی و رحمۃ للمومنین - قل بفضل اللہ و برحمۃ فبذالک فلیفرحوا ھو خیر مما یجمعون ۝ ۱۰/۵۷ اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے موعظت اور سینوں کے اندر (چھپی ہوئی) جو بیماریاں ہوں ان کے لئے سامان شفا اور ایمان والوں کے لئے ہدایت و رحمت (کا ذخیرہ یعنی قرآن مبین) آچکا۔ کہدو (اے رسولؐ!) کہ یہ اللہ کے فضل اور اس کی رحمت سے (ہوا) تو ان (ایمان والوں) کو لازم ہے کہ اسی (قرآن مبین) کی خوشی منائیں وہ (یعنی قرآن مبین) اس سے بہتر ہے جو وہ (بطور خود) جمع کر رہے ہیں۔ (سورۃ یونس ۶/ ۱۱)

اسی آیت[1] کے نزول کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ

---

[1] شان نزول کی روایتیں جو کتابوں میں مذکور ہیں اس آیت کی یا دوسری آیتوں کی ان میں نوے فیصدی منافقین عجم ہی کی ساختہ و پرداختہ ہیں جن کا منشاء ہی یہی ہے کہ بقیہ ص ۳۲۳ پر

کو حدیثیں جمع کرنے سے منع فرما دیا اور کہا کہ لا نکتبوا عنی سوا القرآن و من کتب عنی شیئا فلیمحه (او کماقال) یعنی مجھ سے سن کر قرآن کے سوا اور کوئی بات نہ لکھو اور جس نے کچھ بھی لکھ رکھا ہو وہ اس کو محو کر دے مٹا دے۔ (رواہ مسلم وغیرہ) حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے پانچ سو حدیثیں جمع کی تھیں جن کو جلا دیا حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے لوگوں سے جمع شدہ حدیثوں کو لیکر جلا دیا اور لوگوں سے کہدیا کہ حسبنا کتاب اللہ۔[۱]

ترمذی جلد دوم ۱۱۴ میں حارث اعور سے مروی ہے کہ انھوں نے کہا کہ میں ایک بار مسجد میں پہنچا (غالباً یہ مسجد کوفہ تھی) تو وہاں لوگ حدیثوں کی روایت یا اس کے متعلق غور و خوض میں مصروف تھے۔ تو میں علی رضی اللہ عنہ کے پاس حاضر ہوا اور میں نے ان سے کہا کہ اے امیر المومنین کیا آپ لوگوں کو نہیں دیکھتے کہ حدیثوں میں مصروف ہیں۔ تو انھوں نے فرمایا کہ کیا لوگوں نے یہ کام شروع کر دیا؟ میں نے کہا کہ ہاں۔ تو انھوں نے فرمایا کہ میں نے بتحقیق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ یاد رکھو کہ عنقریب ایک فتنہ برپا ہوگا۔ تو میں نے عرض کیا کہ اس فتنے سے نکلنے کی کونسی راہ ہوگی؟ تو رسول اللہ صلی اللہ

آیت قرآنیہ کو اس کے سباق و سیاق اور مقتضا کے خلاف استعمال کرنے کا ایک ذریعہ پیدا ہو جائے۔ میں نے جو اس آیت اور اس حدیث کا باہمی تعلق پیدا کر کے دکھایا ہے وہ روایت کے بالکل مطابق ہے کیونکہ رسول اللہ صلعم اپنے جی سے کوئی دینی امر ونہی نہیں بیان فرماتے تھے۔ منع کتابت حدیث کا حکم یقیناً اسی آیت کے ماتحت تھا۔ (تمنا)

حاشیہ من ہذا: مزید حوالوں اور تفصیلات کے لیئے مولانا مناظر احسن گیلانی کی کتاب "تدوین حدیث" ملاحظہ ہو جسے مجلس علمی ڈاور کراچی نے شائع کیا ہے (طاہر)

علیہ وسلم نے فرمایا کہ کتاب اللہ - اس میں تمہارے ماقبل والوں کی خبریں ہیں اور تمہارے بعد ہونے والی اطلاعیں ہیں اور تمہارے درمیان جو جھگڑے ہوں ان کے فیصلے ہیں۔ وہ ایک قول فیصل ہے، کوئی لایعنی بات نہیں - جس نے اس کو کسی ظالم جابر کے ڈر سے چھوڑ دیا اللہ اس کو ہلاک و برباد کر دے گا اور جس نے اس کے سوا کسی اور ذریعے سے ہدایت ڈھونڈھی اللہ اس کو گمراہی میں چھوڑ دے گا - اور وہ (یعنی کتاب اللہ) اللہ کی مضبوط رسی ہے وہی الذکر الحکیم (حکمت والی نصیحت ہے) اور وہی سیدھی راہ ہے، اس کی وجہ سے خواہشیں بہک نہیں سکتیں اور زبانیں ملتبس نہیں ہوسکتیں علما اس سے کبھی سیر نہیں ہو سکتے اور نہ بار بار پڑھنے سے وہ پرانی ہوسکتی ہے۔ اور نہ اس کے عجائبات کبھی ختم ہو سکتے ہیں - یہی کتاب ہے کہ " جن " کی قوم والے اس کو سن کر رکے نہ رہ سکے یہاں تک کہ (اپنی قوم سے جاکر سبھوں نے) کہا کہ " ہم لوگوں نے ایک عجیب کلام سنا ہے جو رشدو ہدایت کی طرف رہنمائی کرتا ہے اس لئے ہم لوگ اس پر ایمان لے آئے" (سورۃ جن کا آغاز) جس نے اس (کتاب اللہ) کے مطابق کہا، اس نے سچ کہا اور جس نے اس کے مطابق عمل کیا اس نے ثواب پایا اور جس نے اس کے مطابق فیصلہ کیا، انصاف کیا اور جس نے اس کی طرف دوسروں کو بلایا اس نے سیدھی راہ کی طرف رستہ پایا۔ اے اعور (حارث اعور کو مخاطب کرکے حضرت علیؓ نے فرمایا) اسی (کتاب) کو (مضبوط) پکڑے رہو۔

غرض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ممانعت اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے اس طریق عمل کی وجہ سے عام صحابہ رضی اللہ عنہم

میں کسی نے بھی جمع احادیث کا کبھی کوئی ارادہ نہیں کیا اور نہ کسی کا جمع کیا ہوا کوئی مجموعہ احادیث ان کی وفات کے بعد کسی کو ملا۔

بعض صحابہ کے نام سے جمع احادیث کی روایتیں جہاں ہزاروں جھوٹی حدیثیں گھڑ گھڑ کر ان منافقین نے صحابہ رضی اللہ عنہم کے واسطے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کیں، وہاں کچھ روایات اس مضمون کی بھی بنائیں کہ فلاں صحابی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیثیں لکھ لکھ کر جمع کرنے کی اجازت دے دی تھی اور فلاں فلاں نے کچھ حدیثوں کے ذخیرے جمع کئے تھے جن میں سے ایک کی کتاب کا نام صادقہ تھا۔

میں نے اپنی کتاب "جمع قرآن" میں اور بعض دوسرے مواقع پر اس موضوع پر سیر حاصل بحث کی ہے، اس لئے یہاں اس کے متعلق صرف اتنا ہی کہدینا کافی ہے کہ یہ بھی روایتیں ہی ہیں جو اپنے فعل جمع احادیث کو صحیح ثابت کرنے کے لئے بنالی گئیں ورنہ وہ سب مجموعے ان جامعین کی وفات کے بعد ان کے ورثاء کو کیوں نہیں ملے؟ اور دوسروں نے ان مجموعوں کی نقلیں کیوں نہیں حاصل کیں۔ امام مالک کی مؤطا کی تو ان کے وقت میں سینکڑوں نقلیں ہو جاتیں اور صحابہؓ کے جمع کئے ہوئے مجموعۂ احادیث اور کتاب صادقہ کی ایک نقل بھی کوئی محفوظ نہ رکھ سکے؟ حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کے مبارک ہاتھوں کے لکھے ہوئے قرآن مجید کے محترم نسخے اس چودہویں صدی کے اواخر تک دنیا میں محفوظ وموجود ہیں، اور وہ مجموعۂ احادیث جس کا نام صادقہ تھا یا اور دوسرے مجموعے جن کو صحابہؓ کا جمع کردہ کہا جاتا ہے وہ دوسری تیسری صدی والوں کو بھی نہ ملے؟ نہ ان کی نقل کسی نے محفوظ رکھی؟ آخر ان

مجموعہائے احادیث کی طرف سے دوسرے صحابہؓ اور اکابر و اصاغر تابعین نے اتنی بے اعتنائی کیوں برتی؟

حقیقت یہ ہے کہ یہ سب من گھڑت افسانے ہیں در اصل کسی صحابی نے حدیثوں کا کوئی مجموعہ مرتب نہیں کیا تھا۔ اگر دو چار حدیثیں بھی کوئی صحابی کسی ورق پر لکھ رکھتے تو وہ ورق تبرک کے طور سے ضرور محفوظ رکھا جاتا۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ممانعت اور قرآنی آیت کی تنبیہ کے بعد ممکن نہ تھا کہ کوئی صحابی بھی جمع احادیث کا کبھی ارادہ کرتا اس لئے یہ ساری روایتیں "مصادرہ علی المطلوب" ہیں۔ جمع روایات کی سند میں اپنی ہی من گھڑت روایتوں کو پیش کرنا وہ بھی ایسی روایتیں جو عقلاً و درایتاً جھوٹی معلوم ہوں کسی صاحب عقل و انصاف کے نزدیک معتبر نہیں ہو سکتیں۔

اگلا مرحلہ | تو جب جمع احادیث کی ممانعت کے باوجود حدیثیں جمع کرنے کی کوئی معقول سند ان کو نہ ملی تو ان لوگوں نے دوسری صدی میں یہ مشہور کرنا شروع کیا کہ قرآن مجید بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک میں جمع نہیں ہوا تھا۔ حضرت عمرؓ کے مشورے سے حضرت صدیقؓ اکبر نے حضرت زید بن ثابتؓ سے اپنے زمانہ خلافت میں جمع کرایا۔ رضی اللہ عنہم اجمعین۔

حدیثوں میں چونکہ زیادہ تر آحاد ہی ہیں، یعنی صرف کسی ایک ہی صحابیؓ کی طرف منسوب کی گئی ہیں اس لئے مخالفین جمع احادیث کہا کرتے تھے کہ خبر آحاد سے یقین نہیں حاصل ہو سکتا۔ اور جب ان حدیثوں سے یقین نہیں پیدا ہو سکتا تو پھر ان سے احکام بھی جو معلوم ہوں گے وہ قطعی نہ ہوں گے تو اس کے لئے ایک صورت تو یہ نکالی گئی کہ ایک

حدیث کو گھڑنے کے بعد مختلف طرق سے متعدد لوگ روایت کریں تاکہ وہ حدیث خبر مشہور کہی جاسکے، اور آحاد ہونے کے الزام سے بچ جائے۔ اور اس کا ایک زبردست اہتمام کیا کہ اس ایک حدیث کو متعدد آدمی مختلف جگہ جاجا کے لوگوں سے روایت کریں اور ہوسکے تو چند صحابہؓ کی طرف اس ایک قول کو منسوب کریں۔

اور دوسرا ایک الزامی جواب بھی نکال لیا کہ سورۃ توبہ کے آخر کی دو آیتوں کے متعلق یہ روایت کرنا شروع کیا کہ جب حضرت زید بن ثابتؓ حسب مشورہ حضرت فاروق اعظمؓ بحکم حضرت صدیق اکبرؓ قرآن جمع کرنے لگے۔ (رضی اللہ عنہم اجمعین) تو سورۃ توبہ کے آخر کی دو آیتیں ان کو کسی کے پاس بھی نہ ملیں۔ صرف ابو خزیمہ یا خزیمہؓ کے پاس ملیں جو لکھ لی گئیں۔ یعنی اگر آحاد حدیثوں کو تم قابل اعتبار نہیں سمجھتے تو قرآن کی دو آیتیں بھی تو آحاد ہی ہیں پھر ان پر ایمان کس طرح رکھتے ہو؟ پھر ایک روایت سورۃ احزاب کی بھی دو آیتوں کے متعلق اسی طرح کی بنا لی جس کی پوری بحث "جمع قرآن" میں چھپ چکی ہے۔ اور اعادہ کی ضرورت نہیں۔

تدوین حدیث کا کاروبار پہلی صدی گذرنے کے دو چار برس بعد یعنی دوسری صدی کی ابتداء ہی سے شروع ہوگیا تھا اور اس وقت صحابہؓ میں سے حضرت عامر بن واثلہ ابو الطفیل اللیثیؓ کے سوا کوئی صحابی بھی زندہ نہ تھا بلکہ شاید یہ بھی اس وقت زندہ نہ ہوں حضرت ابو الطفیلؓ ۳ ھ میں جس سال جنگ احد ہوئی تھی پیدا ہوئے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت آٹھ برس سے زیادہ کے نہ تھے۔ ان کی وفات پہلی صدی ختم ہونے کے بعد ہوئی کسی نے ۱۰۲ کسی نے ۱۰۷ اور کسی نے ۱۱۰ لکھا ہے۔ اس لئے قرینہ ہے کہ انھوں نے سو سے کچھ زیادہ عمر

پائی غرض روایت سازی کا فتنہ جس زمانے میں عروج پر تھا اس وقت بعض صحابہؓ اور اکثر تابعین موجود تھے جو اس فتنے سے گھبرا رہے تھے اور لوگوں کو جمع احادیث سے روکتے تھے۔ اگر یہ حضرات جمع احادیث کو دین کے لئے مفید اور ضروری سمجھتے تو یہ کام خود کرتے اور خود اگر کرتے تو یقیناً غیر عرب جامعین سے بہتر طریقے سے اس کام کو انجام دیتے مگر وہ لوگ جمع احادیث کو منشائے قرآنی اور حکم نبویؐ کے خلاف سمجھتے تھے اس لئے اس کی طرف متوجہ نہ ہوئے اور یقیناً جب خود اپنے لئے اس کام کو جائز نہیں سمجھتے تھے تو پھر دوسروں کو بھی ضرور جمع احادیث سے منع کرتے ہوں گے۔ امر بالمعروف ونہی عن المنکر سے وہ کبھی غفلت نہیں برت سکتے تھے۔ مگر ان وضاعین وکذابین نے ان اکابر تابعین پر ظلم یہ کیا کہ ان کی وفات کے بعد انھیں کی طرف اپنی بعض روایتوں کو منسوب کرنے لگے۔

قرآن سے عناد کی وجہ مختصر یہ کہ مانعین جمع احادیث چونکہ صرف قرآن مجید ہی کو حجت قطعی سمجھتے تھے اور لوگوں کو حسبنا کتاب اللہ کہہ کر جمع احادیث سے روکتے تھے اس لئے ان لوگوں کے دلوں میں قرآن مجید ہی سے عناد سا پیدا ہوگیا ملحدین و منافقین کا تو در اصل ایمان ہی قرآن پر نہ

لہ حضرت عامر بن واثلہ حضرت علی رضی اللہ عنہا کے ساتھ کوفے میں تھے۔ مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد کوفہ چھوڑ کر مکہ معظمہ چلے آئے وہیں رہے اور وہیں وفات پائی۔ شیعوں نے انہیں شیعہ مشہور کیا ہے اور کہتے ہیں کہ یہ برابر کوفے ہی میں رہے اور کوفے ہی میں وفات پائی۔ مگر نہ یہ شیعہ تھے اور نہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بعد ان کے لیے کوفے میں وابستگی کی کوئی بات باقی رہی تھی۔

تھا اس لئے ان کے دلوں میں اگر قرآن مجید سے عناد ہوا تو کیا وہ تو شروع ہی سے قرآن و رسولؑ اور صحابہؓ بلکہ سارے مسلمان سب کے درحقیقت معاند تھے مگر ان کی تیار کردہ جو راویان و جامعین احادیث کی ایک فوج گویا تیار ہوگئی تھی ان لوگوں کے دلوں میں خواہ واقعی عناد نہ ہو مگر عناد کی سی کیفیت ضرور پیدا ہوگئی ۔ چنانچہ آپ عبید بن السباق الثقفی کو دیکھیئے کہ اس نے جمع قرآن بعہد صدیقؓ کی روایت کس طرح گھڑی اور پھر اس کے علاوہ بھی جمع قرآن ہی کے متعلق اس سے زیادہ گمراہ کن جھوٹی بات روایت کی جس کو عبدالکریم و برعاقولی نے اپنی کتاب میں درج کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وفات پاگئے اور قرآن کسی چیز پر بھی ہیں لکھا ہوا نہ تھا۔ یعنی وہ ہڈی۔ کھال چھال پتھر اور ٹھیکری والی بات بھی ہنیں۔

عثمان بن ابی شیبہ لوگوں کا عناد بڑھتے بڑھتے یہاں تک پہنچ گیا کہ بعض شوخ چشم و گستاخ راویان حدیث قرآن مجید کے ساتھ گستاخیاں کرنے اور مذاق اڑانے لگے۔ چنانچہ عثمان ابی شیبہ الکوفی جو بہت بڑا محدث کہا جاتا ہے اور بخاری، مسلم، ابو داؤد، نسائی اور ابن ماجہ یہ سب ان سے روایت کرتے ہیں۔ بخاری میں اس سے ۵۳ حدیثیں اور مسلم میں ۱۳۵ حدیثیں اس سے مروی ہیں۔ امام بخاری کے شیخ محمد بن عبداللہ بن نمیر سے کسی نے اس کے متعلق پوچھا تو وہ کہنے لگے کہ سبحان اللہ! ایسے شخص کے متعلق بھی سوال کیا جاسکتا ہے؟ ابو حاتم الرازی، یحییٰ بن معین وغیرہما اس کو ثقہ اور صدوق (بہت سچا) لکھتے ہیں۔ مگر قرآن مجید کے ساتھ اس کا کیا برتاؤ تھا؟ وہ بھی سن لیجئے ۔ یہی ائمہ حدیث خود لکھتے

ہیں کہ یہ سورۃ یوسف میں جو ہے جعل السقایه فی رحل اخیه[1] - یہ حضرت اس میں "السقایہ" کی جگہ "السفینہ" پڑھتے تھے - کوئی ٹوکتا تھا تو کہدیتے تھے کہ میں اور میرا بھائی (یعنی ابو بکر بن ابی شیبہ الکوفی) عاصم کی قرأت ہم لوگ نہیں پڑھتے - اور الم ترکیف فعل ربک باصحاب الفیل[2] پڑھتے تھے تو الم تر کو حروف مقطعات بنا کر یعنی الف، لام، میم، تا، را، کہہ کر پڑھتے تھے - اور کمال یہ ہے کہ سورۃ حدید میں جو فضرب بسور[3] له باب ہے، اس کو بسنور له باب پڑھتے تھے - کوئی ٹوکتا تھا تو کہتے تھے کہ حمزہ کی قرأت میرے نزدیک بدعت ہے -

اور اس سے بھی زیادہ کمال یہ ہے کہ سورۃ بقرہ میں جو ہے و اتبعوا ماتتلوا الشیطین علیٰ ملک سلیمان - اس میں بائے موحدہ کو کسرہ دے کر پڑھتے تھے - معاذ الله من تلک الخبائث - یعنی ماضی کے صیغے کو امر کا صیغہ بنا کر پڑھتے تھے - کوئی بتائے کہ یہ قرآن مجید سے کھلا ہوا عناد نہیں ہے تو کیا ہے ؟ فاعتبروا یاُولی الا بصار!

اور یہ ساری باتیں جامعین احادیث خوب جانتے تھے جبھی تو اپنی کتب رجال میں ان کو درج کیا ہے - مگر ان کی روایات بڑے وثوق کے ساتھ اپنی کتابوں میں درج کرتے رہے - اتنا بھی خیال نہ کیا کہ جو شخص قرآن مجید کتاب اللہ کے ساتھ اس طرح کی گستاخیاں بالقصد کر رہا ہو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بہتان باندھنے سے کب باز رہے گا؟

اسی عناد کا نتیجہ ہے جو ایسی ایسی روایتیں محدثین کی کتابوں میں آپ دیکھتے ہیں جن سے قرآن کی محفوظیت کو مشتبہ و مشکوک کرنے کی کوششوں کا صاف پتا چلتا ہے چنانچہ ابن ابی داؤد و ابن رشتہ وغیرہما کی

[1] ۱۲ / ۷۰ [2] ۱ / ۱۰۵ [3] ۵۷ / ۱۳ [4] ۲ / ۱۰۲ [5] ۲ / ۵۹

کتاب المصاحف میں خاص طور سے ایسی روایتوں کو جمع کر دیا گیا ہے ۔
اگرچہ ان روایتوں کی اکثریت صحاح ستہ میں نہیں ہے ۔ مگر جس قدر
صحاح ستہ میں ہے وہی کیا کم ہے ۔ اگر صحاح والوں کا مضمون کچھ گنجلک
رہ گیا کہ اس کی تاویل کی جا سکے تو شارحین نے ان روایتوں کے ابہام کو
دور کر کے اس مفہوم کو متعین کر دیا جس سے شک و شبہ پیدا ہو جیسا کہ
بخاری جلد دوم کتاب البیوع کے باب اول کی آخری حدیث عبداللہ بن
محمد سے امام بخاری روایت کرتے ہیں اور وہ سفیان بن عیینہ سے وہ عمرو
بن دینار سے اور وہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے کہ انھوں نے
فرمایا کہ عکاظ ، مجنہ اور ذوالمجاز زمانہ جاہلیت کے (مشہور) بازار تھے ۔ تو
جب اسلام (کا زمانہ) پہنچا تو لوگ (حج کے موقع پر) ان (کی شرکت) میں
گناہ سمجھنے لگے ۔ تو (یہ آیت) اتری " لیس علیکم جناح ان تبتغوا فضلا
من ربکم[1] (فی مواسم الحج) " حج کے موسم میں ۔ فقرا ھا ابن
عباس تو اس کو ابن عباسؓ نے پڑھا ۔ حدیث کے معنی ظاہر ہیں کہ لوگ
ان بازاروں کی شرکت کو حج کے موقعہ پر حاجیوں کے لئے گناہ سمجھنے لگے
تو حج ہی کے زمانے میں یہ آیت اتری ۔ تو ابن عباسؓ نے ان لوگوں کے
سامنے یہ آیت پڑھی ۔ نفس روایت میں کوئی الجھاؤ نہیں ہے مگر شارحین
بخاری ابن حجر وغیرہ نے اس حدیث کے مفہوم کو اس طرح واضح طور
سے لکھا ہے کہ آیت " فی مواسم الحج " کے فقرے کے ساتھ اتری
تھی اور ابن عباسؓ کی قرأت بھی تھی وہ اس آیت کو یونہی پڑھتے تھے ۔
یعنی لیس علیکم جناح ان تبتغوا فضلا من ربکم[2] فی مواسم
الحج، اسی طرح وہ پڑھتے تھے ۔ اگر ابن حجر وغیرہ کی یہ شرح صحیح ہے تو

[1] ۱۹۸ / ۲ [2] ۱۹۸ / ۲

پھر بخاری کے دامن صحت سے یہ ایک دھبہ جو دھویا جا سکتا تھا وہ بھی اور پختہ ہو کر رہ گیا۔

ایک سوال امام بخاری، امام مسلم اور دوسرے ائمہ حدیث رحمہم اللہ تو اکابر دین میں ہیں، اور ان بزرگوں کے ایمان و اسلام میں کسی طرح کا بھی شک و شبہ نہیں کیا جاسکتا پھر ان بزرگوں نے اس قسم کی رکاکتوں اور ان حدیثوں کے گمراہ کن مضامین کی طرف کیوں توجہ نہیں فرمائی؟ اور ایسی گھٹیا روایتوں کو اپنی کتابوں میں کیوں درج کر لیا؟

تو اس کے متعدد جوابات ہیں جو ذیل میں درج ہیں۔

(۱) روایت پرستی کا طوفان اس زمانے میں اس طرح امڈا ہوا تھا کہ عقل ودرایت کے خلاف جو باتیں بھی عنعنے کے ساتھ یعنی عن فلاں عن فلاں کرکے بیان کر دی گئیں اور سلسلہ روایت میں ایسے راویوں کے نام بیان کر دیئے گئے جو محدثین کے نزدیک ثقہ اور حجت تھے تو پھر عام محدثین عقل و درایت کو بالکل بالائے طاق رکھ کر اس روایت کو قبول کر لیتے اور اپنی کتاب میں درج کر لیتے تھے۔ اور دلیل یہ دیتے تھے کہ جب ایک بات سند کے ذریعے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہوگئی تو اب اس میں چوں وچرا کرنے کی گنجائش کہاں رہی؟ حالانکہ ایک مسلم کے لئے جس طرح چشم دید یا قطعی تاریخی واقعے کے خلاف کوئی بات عقل و درایت کے خلاف ہو سکتی ہے اسی طرح اس مسلم کے لئے وہ بات بھی ضرور بلکہ بدرجہ اولیٰ عقل و درایت کے خلاف ہوگی جو قرآن مبین کے خلاف ہو بلکہ جو بات قطعی و یقینی تاریخ کے خلاف ہو وہ تو مسلم وغیر مسلم سب کے لئے عقل و درایت کے خلاف ہے ایسی روایت تو کوئی غیر

مسلم بھی قبول نہیں کر سکتا۔ مگر آپ دیکھئے کہ بخاری ہی میں یہ روایت موجود ہے کہ قال اللیث عن یحییٰ عن سعید بن المسیب وقعت الفتنہ الاولی یعنی مقتل عثمان فلم تبق من اصحاب بدر احد ثم وقعت الفتنہ الثانیۃ یعنی الحرۃ فلم تبق من اصحاب الحدیبیۃ احدا الخ لیث نے یحییٰ (بن سعید) سے انھوں نے سعید بن المسیب سے سن کے کہا کہ سعید بن المسیب نے بیان کیا کہ پہلا فتنہ شہادت حضرت عثمان (رضی اللہ عنہ) کا واقع ہوا تھا تو اس فتنے نے بدری صحابیوں میں سے کسی کو بھی باقی نہ چھوڑا اور دوسرا فتنہ یعنی واقعہ حرّہ (فتنہ ۶۳ ھ) جب ہوا تو اس نے حدیبیہ والوں میں سے کسی کو بھی باقی نہ چھوڑا۔ الخ۔

اس روایت سے یہ صاف معلوم ہو رہا ہے کہ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد اسی فتنے کے سلسلے میں جو کچھ بدری صحابی تھے سب کے سب شہید ہوگئے کوئی بھی باقی نہ بچا۔ حالانکہ حضرت علیؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ اور متعدد بدری صحابیؓ اس واقعہ ہائلہ کے برسوں بعد تک زندہ رہے اور حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے تو سب کے بعد ۵۴ یا ۵۵ یا ۵۸ ھ میں وفات پائی ہے۔

اسی طرح واقعہ حرہ جو ۶۳ ھ میں واقع ہوا تھا اس کے بعد جبکہ یہ فتنہ بالکل فرو ہوچکا تھا اور اس کا کچھ بھی اثر باقی نہ تھا حضرت براء بن عازبؓ نے ۷۲ میں اور حضرت زید بن ارقمؓ نے ۶۸ ھ میں وفات پائی تھی اور یہ دونوں صلح حدیبیہ میں شریک تھے۔ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ بھی صلح حدیبیہ میں شریک تھے ان کی وفات واقعہ حرہ کے ٹھیک دس برس کے بعد یعنی ۷۳ میں واقعہ ہوئی تھی۔ اسی طرح شرکائے صلح حدیبیہ دو ایک اور بھی تھوڑی تلاش سے مل جائیں گے جو واقعہ حرہ کے برسوں

بعد تک زندہ رہے غرض یہ روایت باوجودیکہ تاریخ صحیح و مشہور کے بالکل خلاف تھی، صرف روایت پرستی کے جذبے کے ماتحت لے لی گئی اور داخل کتاب کر لی گئی۔

(۲) دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ یہ لوگ ہر حدیث کو حجت و سند ہی سمجھ کر نہیں لکھتے تھے، بلکہ ان بزرگوں نے کتنے راویوں کے متعلق خود اپنی کتابوں میں لکھدیا کہ یکتب حدیثه و لا یحتج به یعنی اس کی حدیث لکھ لی جائے گی مگر اس کی سند نہیں لی جائیگی، اس کو حجت نہیں سمجھا جائے گا۔ اس لئے ایسی مشتبہ حدیثوں کے راویوں کو دیکھنا چاہیئے کہ اس کے راوی کون کون ہیں اور ان کے متعلق اس جامع حدیث نے اپنی کتاب رجال میں کیا لکھا ہے؟

بعض راویوں کے متعلق وہ لکھتے ہیں کہ یکتب حدیثه للا عتبار یعنی اس کی حدیث عبرت حاصل کرنے کے لئے لکھ لی جائے ممکن ہے کہ ایسی حدیثیں انھوں نے اسی لئے اپنی کتابوں میں لکھ لی ہوں تاکہ لوگ ایسی حدیثوں کو دیکھ کر عبرت حاصل کریں کہ راویان حدیث میں ایسے لوگ بھی تھے جو اس قسم کی ملحدانہ و منافقانہ حدیثیں روایت کیا کرتے تھے اور ایسی حدیثوں کے ذریعے قرآن مجید کو مشتبہ و مشکوک کرنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔

(۳) محدثین اپنی کتابیں بعض خوشخط لکھنے والوں کو بھی دے دیا کرتے تھے کہ وہ ان کے مسودے کو صاف کر دیں، اور پھر جلد بندوں کو بھی دیتے تھے کہ وہ ان کی جلد درست کر دیں۔ مگر منافقین و ملحدین کی ایک جماعت تھی جس نے کتابت اور جلد سازی کا پیشہ ہی اختیار کر رکھا تھا اور

جو محدث ان کو اپنی کتاب خوشخط لکھنے کیلئے یا جلد باندھنے کے لئے دیتا تھا یہ اس کی کتاب میں گھٹاؤ بڑھاؤ اور رد و بدل کچھ اس طرح کر دیتے تھے کہ ان کے اصل مسودے ہی میں اور پھر صاف شدہ میں بھی کہ الزام کا موقع باقی نہ رہے عموماً محدثین ابواب میں لکھنے کے وقت کچھ خالی سادی جگہ آخر میں چھوڑ دیتے تھے کہ اس باب کے مضمون کے مطابق پھر کوئی حدیث ملے گی تو لکھدیں گے۔ ایسی سادہ چھوٹی ہوئی جگہوں میں یہ لوگ مناسب اضافے اپنی طرف سے کر کے اس سادہ خالی جگہ کو بھر دیتے تھے

محدثین کے تلامذہ میں داخل ہو ہو کر کتنے ملاحدہ ان کے ساتھ رہ کر ان کے مسودات میں اس طرح تحریفیں کرتے رہتے تھے اور استاد کی وفات کے بعد تو اس کے مسودات پر قابو حاصل کر کے بڑے اطمینان سے ان میں حسب دلخواہ ترمیم و تنسیخ کر کے پھر اس کی خوب خوب اشاعت کرتے تھے اگر کہیں کسی دوسرے ساتھی نے ان کو ٹوکا کہ تمہارے یہاں اس طرح ہے مگر ہمیں تو شیخ نے یوں بتایا تھا یا تمہاری اس حدیث کو جو تم بیان کر رہے ہو ہم نے شیخ سے کبھی نہیں سنا۔ تو اس کا جواب وہ یوں دیتے تھے کہ تم ہی نے سننے یا لکھنے میں غلطی کی ہوگی اور اپنی حدیث کی تصدیق اپنے کسی دوسرے شریک سازش سے اس کے سامنے کرا کے اس کے صحیح لکھے ہوئے کو بھی محرف کرا دیتے تھے۔

(۴) امام بخاری کی کتاب تو بادنیٰ تامل معلوم ہو جاتی ہے کہ یہ ایک محض

ف۱ راقم طاہر عرض کرتا ہے کہ یہ بات صرف علامہ تمنا ہی نہیں کہتے بلکہ امام ابوالولید باجی اور شاہ ولی اللہ بھی یہی فرماتے ہیں کہ مولانا عبدالرشید نعمانی جو جامع اسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی میں تخصص کے مقالات کے ممتحن اور نگراں ہیں اور اس اعتبار سے وہاں کے

مسودہ تھی جس کے ابواب تک کو وہ مندرجہ ابواب حدیثوں کے مطابق نہ کر سکے۔ عنوان باب کچھ ہے اور حدیثیں کچھ ہیں۔ بعض جگہ صرف

سب سے اہم شیخ ہیں۔ اپنی کتاب "امام ابن ماجہ اور علم حدیث" شائع کردہ میر محمد آرام باغ کراچی کے ص ۲۱۲ پر لکھتے ہیں کہ امام بخاری کی کتاب "الجامع الصحیح" اگرچہ ۱۶ سال کی مدت میں تمام ہو گئی مگر نظر ثانی اور اضافہ کا سلسلہ اخیر دم تک برابر جاری رہا۔ یہی وجہ ہے کہ فربری کے نسخہ میں جنہوں نے اس کو امام بخاری سے بعد میں سنا ہے حماد بن شاکر کے نسخہ سے دو سو اور ابراہیم بن معقل کے نسخہ سے تین سو حدیثیں زیادہ مروی ہیں۔

(تدریب الراوی، ص ۳۰)

صحیح بخاری کے موجودہ نسخہ میں جو حدیث اور ترجمۃ الباب میں بہت سے مقامات پر بے ربطی اور سوء ترتیب نظر آتی ہے اور جس کی شکایت شاہ ولی اللہ نے اپنے مکتوبات (ص ۱۷۱) میں بایں الفاظ کی ہے کہ "در عقد تراجم سوء ترتیب و تقریر او بمیان می آید......

واہل علم را مطمح نظر مطالب علیہ می باشد نہ تراجم و ترتیب شعر

شیشہ صاف از نباشد گو سفال درو باش   رندے آشام را با این تکلفہا چہ کار

اس کی اصل وجہ بھی یہی ہے کہ بعض مقامات پر امام ممدوحؒ نے اضافہ کرنا چاہا تھا۔ مگر اس کا موقع نہ مل سکا چنانچہ کہیں باب قائم کر لیا تھا مگر اس کے تحت حدیث درج کرنے کی نوبت نہ آئی، کہیں حدیث لکھ لی تھی لیکن باب قائم نہ کر سکے تھے، بہرحال کتاب کے بہت سے مقامات اسی طرح تشنۂ تکمیل ہی تھے کہ امام بخاری نے اس دارِ فانی سے عالم جاودانی کو رحلت فرمائی۔ بعد کو ناسخین نے اپنی صوابدید کے مطابق جن ابواب میں چاہا ان حدیثوں کو نقل کر دیا۔ چنانچہ حافظ ابوالولید باجی، اپنی کتاب اسماء رجال البخاری کے مقدمہ میں لکھتے ہیں کہ

"ہم سے حافظ ابوذر ہروی نے بیان کیا کہ ہمیں ابو اسحٰق مستملی نے بتایا کہ میں نے صحیح بخاری کو اس کے اصل نسخہ سے جو فربری کے پاس موجود تھا نقل کیا تو میں نے دیکھا کہ

عنوان باندھ کر رہ گئے ہیں اور اس باب میں کوئی حدیث ان کو نہ ملی۔ بعض جگہ صرف باب لکھ کر رہ گئے نہ کوئی عنوان ہے نہ کوئی حدیث ہی اس باب میں مندرج ہے۔

اسی طرح صحیح مسلم کو بھی دیکھئے کہ مؤلف نے نہ کہیں کوئی باب لکھا تھا نہ باب کا عنوان قائم کیا تھا۔ صرف حدیثیں لکھتے چلے گئے تھے۔

کاش اگر امام مالک اور امام بخاری و امام مسلم جیسے اہم حضرات کی تصنیفات ان کی اصل شکل میں محفوظ رکھی جاتیں اور ان کے شاگرد اپنی صوابدید کے مطابق ان میں کمی بیشی اور رد و بدل نہ کرتے تو آج ان

اس میں بعض چیزیں تو ناتمام ہیں اور بعض چیزوں کی تبییض ہو چکی ہے چنانچہ بعض تراجم ابواب ایسے تھے کہ ان کے بعد کچھ درج نہ تھا اور بعض حدیثیں ایسی تھیں کہ ان پر ابواب نہ تھے۔ پھر ہم نے ان میں سے بعض کو بعض کے ساتھ ملا دیا"

باجی کہتے ہیں کہ اس بیان کی صحت کا پتہ اس بات سے بھی چلتا ہے کہ ابواسحٰق مستملی، ابو محمد سرخسی ابو الہیثم کشمیہنی اور ابو زید مروزی نے جو صحیح بخاری کی روایتیں کی ہیں ان سب کی روایتوں میں باہم تقدیم و تاخیر کا اختلاف ہے حالانکہ اصل نسخہ جس سے سب نے نقل کیا ایک ہی ہے، یہ اختلاف اس لیئے ہوا کہ ہر ایک نے جو کچھ کتاب کے حاشیہ پر یا اس کے ساتھ کسی پرچہ پر کچھ لکھا ہوا پایا اس کو اپنے اندازے سے کہ یہ عبارت فلانی جگہ کی ہونی چاہیئے اسی جگہ نقل کر دیا، چنانچہ یہ چیز اس سے ظاہر ہوتی ہے کہ آپ دیکھ رہے ہیں کہ دو اور دو سے زائد ترجمۃ الباب یکجا لکھے ہوئے ہیں مگر ان میں حدیثیں نہیں ہیں۔ باجی کا بیان ہے کہ یہ چیز میں نے یہاں اس لیے ذکر کی کہ ہمارے اہل وطن ایسے معنی کے دھن میں لگے رہتے ہیں کہ جن میں ترجمۃ الباب اور حدیث میں باہمی ربط قائم ہو سکے اور وہ اس سلسلہ میں بیجا تاویلات کی بلا وجہ تکلیف اٹھاتے ہیں"

(مقدمہ فتح الباری، ج ۱ ص ۶ طبع میریہ مصر)

ائمہ کا نقطۂ نظر، اور ان کے شاگردوں کا نقطۂ نظر گڈ مڈ نہ ہوتا اور ہم بعد والوں کو ان بزرگوں کے خیالات معلوم کرنے میں دشواری نہ ہوتی بعد والوں نے اور خاص طور سے شارح مسلم امام نووی نے اپنی طرف سے باب قائم کرکے اس کے عنوانات قائم کئے امام مسلم کے حالات لکھتے ہوئے تمام علماء اس بات کو تسلیم کرتے ہیں۔

غرض یہ سمجھنا کہ ان بزرگوں نے جان بوجھ کے قصداً ایسی گمراہ کن روایتیں اپنی کتابوں میں اس لئے درج کیں کہ لوگ قرآن مجید کے متعلق شک و شبہ میں پڑیں، در حقیقت ان بزرگوں ہی پر نہیں بلکہ انصاف و صداقت پر ظلم ہے۔ سب سے پہلے تو یہی امکان ہے کہ ان بزرگوں نے اپنی کتابوں میں ایسی گمراہ کن روایتوں کو داخل ہی نہیں کیا۔ نہ ان کو اس قسم کی روایتوں کی کچھ خبر تھی۔ ان کے بعض مفسد شاگردوں نے یا کاتبوں نے یا وراقوں نے اس قسم کی حدیثیں گھڑ گھڑ کر ان کی کتابوں میں داخل کر دیں۔ اور اسی کا زیادہ قرینہ ہے۔ میرا ایک مستقل رسالہ ہے جو عربی میں ہے جس کا نام "البراغیث من الوراقین و کتاب الا حادیث" جس میں تقریباً ڈیڑھ سو کاتبوں اور وراقوں کا حال درج ہے۔ اللہ تعالیٰ نے توفیق دی تو انشاء اللہ اس کا ترجمہ کر ڈالوں گا تاکہ اردو داں حضرات بھی ان لوگوں سے واقف ہوجائیں۔

دانستہ و نا دانستہ عناد | متقدمین یعنی وہ منافقین جو فتح ایران کے جوش انتقام میں ایک زبردست سازش کے ماتحت قرآن مجید کے ساتھ معاندانہ برتاؤ کر رہے تھے اور ہر ممکن کوشش سے عامۃ المسلمین میں قرآن مجید کی طرف سے بے توجہی و غفلت پیدا کرکے ان سے قرآن کو

معطل کرا دینے کا تہیہ کر چکے تھے وہ تو کچھ دنوں کے بعد دنیا سے رخصت ہو کر وہاں پہنچ گئے جہاں ان کو پہنچنا چاہیے تھا۔ مگر ان کے جانشینوں کی جماعت تیار ہو گئی تھی جو ان کے مشن کو چلاتے میں ان کی زندگی تک ان کا ہاتھ بٹا رہی تھی۔ اور ان کے بعد ان کے مشن کو اسی سرگرمی کے ساتھ چلاتی رہی اور یہ سلسلہ جانشینوں کا صدیوں تک جاری رہا۔ یہ لوگ تو دانستہ قرآن، رسولؐ، ازواج مطہرات رسولؐ اور خلفائے راشدینؓ و عامہ صحابہؓ کے خلاف افتراء و بہتان میں مصروف تھے اور منہمک رہے۔ اور اکثر افتراء و بہتان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی طرف منسوب کرتے تھے یا امہات المومنینؓ یا خلفائے راشدینؓ یا عام صحابہؓ کی طرف۔

مگر ایک جماعت ہر زمانے میں ان سادہ لوحوں کی بھی رہی جو ان منافقین کے ریاکارانہ زہد و ورع اور پابندی صوم و صلوٰۃ سے متاثر ہو کر ان کی ہر روایت کے ساتھ حسن ظن رکھتے اور اپنی روایت پرستی کے سبب سے ان معاندانہ روایتوں سے متاثر ہو کر رہے آپ جامعین احادیث میں سے بعض کو تو صاف محسوس کر لیں گے کہ ان کے دل میں قرآن مجید سے ضرور عناد تھا، جیسے ابن ابی داؤد اور ابن رشتہ وغیرہ جن لوگوں کی کتاب المصاحف مشہور ہے۔ یہ لوگ بظاہر قرآن کی خدمت کر گئے کہ جتنی روایتیں قرآن کے متعلق ملیں سب کو ایک جگہ مجتمع کر گئے مگر در اصل انھوں نے منافقین ملحدین کی من گھڑت روایتوں کا انبار لگا کر شک و شبہ کا ایک اتنا بڑا پہاڑ نادانستہ قائم کر دیا کہ جو شخص ان کی کتاب کو دیکھے اور تھوڑا بھی صداقت کا حسن ظن ان کی طرف سے رکھتا ہو تو اس کا شیشہ ایمان اس پہاڑ سے ٹکرا کر چور چور ہو کر رہے۔ جبھی تو

ابن ابی داؤد کے والد ماجد جامع سنن ابی داؤد نے کہا تھا کہ میرا بیٹا بڑا جھوٹا ہے اور بعض دوسرے محدثین نے کہا کہ ابن ابی داؤد کے متعلق کسی دوسرے سے مت پوچھو ان کے باپ ہی کی شہادت ان کے متعلق کافی ہے۔

اس قسم کے لوگوں کے علاوہ دوسرے محدثین کی تحریروں میں عناد کا رنگ تو نہیں معلوم ہوتا۔ مگر ان معاندین کے ساتھ ان کو حسن ظن اس حد تک تھا کہ ان کی معاندانہ روایات ان کو معاندانہ معلوم ہی نہیں ہوتی تھیں اور عناد ان کو عناد نظر ہی نہیں آتا تھا۔ حبک الشیئ یعمیٰ و یصم انسان کو کسی کی محبت اس کے متعلق اندھا بہرا بنا دیتی ہے۔ نہ وہ اس کے عیب کو دیکھتا ہے، نہ کسی دوسرے سے سنتا ہے۔ اس لئے اگر واقعی ان بزرگوں نے اپنی کتابوں میں خود اس قسم کی حدیثوں کو داخل کیا ہے، صحیح سمجھ کر تو یقیناً وہ جمع احادیث کے جوش میں ان منافقین و ملحدین کو چونکہ بظاہر عابد و زاہد و متقی پاتے تھے اور ان سے سینکڑوں ایسی حدیثیں وہ لے چکے تھے جن میں کسی طرح کے شک و شبہ کی گنجائش ان کے نزدیک نہ تھی۔ ان کی صداقت کا سکہ ان کے دلوں پر جم چکا تھا اس لئے وہ ان معاندین کو معاند تو کسی طرح سمجھ ہی نہیں سکتے تھے ان کی معاندانہ حدیثوں میں بھی عناد کا جو نمایاں رنگ جھلک رہا تھا ان کو مطلقاً نظر نہ آیا اور صرف ایک روایت ایک حدیث سمجھ کر اس کو بھی اپنی کتاب میں درج کر گئے۔

جلال الدین سیوطی نے اتقان میں جو اس قسم کی معاندانہ روایتوں کو بھی داخل کر لیا ہے وہ اسی زاویۂ فکر نتیجہ ہے شاید کوئی یہ کہے کہ انھوں نے ایک مؤرخ اور ایک محدث کی حیثیت سے مخالف و موافق ہر طرح

کی روایتیں جمع کردیں، یہ فرض ناظرین کا ہے کہ ان روایتوں میں قوی و ضعیف، صحیح و غلط اور خطاء و صواب کی تمیز خود کرلیں تو یہ صحیح نہیں۔ کیونکہ وہ ایک مسلم تھے ایک عالم دین تھے، وہ ان سب کتابوں کو لوجہ اللہ لکھ رہے تھے اور اس تصنیف و تالیف کو دین کی خدمت سمجھتے تھے، ان کا فرض تھا کہ ہر ایسی روایت کو جس سے قرآن پاک کا دامن محفوظیت، لوث اشتباہ و شکوک سے ملوث ہوتا نظر آتا، یا تو اس کو لکھتے ہی نہیں اور لکھا تھا تو ایسی سب موضوعات کو موضوع و بہتان قرار دیکر صاف لکھدیتے کہ یہ روایت منافقین کی من گھڑت ہیں اور گنجائش پاتے تو ان کے راویوں کی تنقید بھی کرکے دکھا دیتے۔ مگر وہ ایسا کس طرح کرتے، وہ تو انھیں راویوں سے سینکڑوں احکام کی حدیثیں لے چکے تھے، اگر ان راویوں کو مجروح بتاتے تو پھر وہ احکام والی حدیثیں کب قابل اعتبار رہتیں اور پھر جب وہ لوگ ان کے نزدیک قابل اعتبار تھے تو صرف احکام کی حدیثیں ان سے لیتے اور قرآن کے متعلق جو کچھ وہ روایت کر رہے تھے اس کو کس طرح رد کرتے؟ خصوصاً جب ان کے نزدیک ان روایات سے قرآن مجید کے دامن محفوظیت پر کوئی دھبا آہی نہیں رہا تھا۔

بے اعتنائی کی انتہائی صورت اگر محدثین اتنا ہی کرتے کہ جن راویوں کو ثقہ و حجت و سند سمجھتے تھے، صرف انھیں راویوں سے جس طرح احکام کی حدیثیں لیتے تھے مجروحین سے احکام کی حدیثیں لینے میں احتیاط برتتے تھے اسی طرح قرآن مجید کے متعلق بھی جس قسم کی بھی روایات ملتیں ان کو بھی انھیں ثقہ و حجت و سند راویوں ہی سے قبول کرتے اور مجروحین سے کبھی قبول نہ کرتے تب بھی قرآن کے متعلق افتراء و بہتان

کا اسقدر انبار نہ لگتا۔ اور وہ ثقہ و حجت رواہ ایسی بے تکی روایات پھیلانے میں کبھی حصہ دار نہ بنتے۔

مگر محدثین کی اکثریت نے قرآن مجید کی اہمیت مطلقاً محسوس نہ کی اور قرآن کے متعلق وضعی تفسیری روایتیں، اختلاف قرأت کی روایتیں، اور شان نزول کے اقوال ایسے ایسے وضاعین و کذابین سے نہایت اطمینان کے ساتھ لئے جن سے احکام کی حدیثیں لینے میں ہمیشہ احتیاط کرتے رہے اور جن کے وضاع و کذاب ہونے کا خود اپنی کتب رجال میں اعتراف کرتے رہے۔

ابن حجر تہذیب التہذیب جلد ۲ صفحہ ۱۲۴ ترجمہ جوبر بن سعید میں لکھتے ہیں کہ قال ابو قدامه السرخسی قال یحیی القطان تساهلوا عن اخذالتفسیر عن قوم لا یوثقو نهم فی الحدیث ثم ذکر الضحاک و جویبراو محمد بن السائب و قال هؤلاء لایحمل حدیثهم و یکتب التفسیر عنهم۔ یعنی ابو قدامہ سرخسیؒ نے کہا کہ یحییٰ بن سعید القطان نے فرمایا کہ لوگوں نے بے اعتنائی برتی ایسی قوم سے تفسیر قبول کرنے میں جن لوگوں کو وہ حدیثوں میں قابل وثوق نہیں سمجھتے، پھر ذکر کیا ضحاک بن مزاحم، جویبر بن سعید اور محمد بن السائب الکلبی کا اور کہا کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کی حدیثیں برداشت نہیں کی جاتیں، مگر ان سے تفسیریں لکھی جاتی ہیں۔

یہ تو خود محدثین کا اعتراف میں نے نقل کیا مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ تفسیری روایتوں میں بس صرف یہی تین شخص مجروح ہیں ان کے سوا اور راویان تفسیر ایسے نہیں ہیں، جی نہیں۔ راویان تفسیر میں سے بطور مشتے نمونہ از خروارے، یحییٰ بن سعید القطانؒ نے یہ تین نام پیش کئے

ہیں۔ تین آدمیوں کو "قوم" نہیں کہتے۔ وہ ایسے راویان تفسیر کی ایک قوم فرما گئے ہیں اور مثال کے طور سے تین مشہور راویان تفسیر کے نام بتا دیئے۔ ورنہ اسماعیل بن عبدالرحمن السدی، مقاتل بن سلیمان بھی اسی تفسیری دنگل کے برابر کے جوڑ والے پہلوان ہیں، فرق اتنا ہے کہ جویبر بن سعید، محمد بن السائب الکلبی اور اسمعیل بن عبدالرحمن السدی یہ تینوں کوفی ہیں اور ضحاک بن مزاحم اور مقاتل بن سلیمان یہ دونوں خراسانی ہیں۔ اور آپ کو معلوم ہے کہ عجمی منافقین کی سازش کا پہلا مرکز خراسان ہی برسوں تک بلکہ صدیوں تک رہا اور دوسرا سب سے بڑا مرکز کوفہ صدیوں تک رہا جو سرزمین فارس و نینوا کے سنگم پر واقع ہے۔ جب کہ ہم عرض کر چکے ہیں کہ منافقین نے جب یہ دیکھا کہ نہ ہم قرآن کو مسلمانوں سے چھین سکتے ہیں نہ اس کتاب کو برباد و ضائع کر سکتے ہیں تو اس کی کوشش کی کہ مسلمانوں کو قرآن سے دور کر دیں یعنی ایسا ہو جائے کہ مسلمان خود ہی قرآن کو چھوڑ بیٹھیں۔ تو اس کیلئے انھوں نے باہمی صلاح مشورے سے روایات وضع کرنے کے ساتھ ساتھ مندرجہ ذیل محاذ قائم کئے۔

دوسرا محاذ، محاذ کتابت | یہ مشہور کرنا شروع کیا کہ اہل عرب بالکل امی یعنی جاہل تھے لکھنا پڑھنا مطلقاً جانتے ہی نہ تھے۔ سارے عرب میں آغاز اسلام کے وقت صرف سترہ آدمی لکھنا جانتے تھے عرب میں لکھنے پڑھنے کا سامان بھی نہ تھا۔ کاغذ کا تو وجود ہی نہ تھا۔ ہڈی، پتھر، ٹھیکری، کھال چھال وغیرہ پر لوگ لکھ لیتے تھے۔

لکھنے والے جو چند تھے بھی وہ قواعد فن کتاب و انشاء و املا و رسم خط

وغیرہ سے واقف نہ تھے یعنی سکھوں کی طرح رسم الخط کی پابندی کئے بغیر کچھ لکھ لیتے تھے۔ وغیر ذلک۔

یہ سلب باتیں اس لئے مشہور کی گئیں تاکہ یہ ثابت کیا جاسکے کہ سامان کے نہ ہونے کی وجہ سے اور لکھنے والوں کی کمی کے سبب سے پورا قرآن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں کتابی صورت میں جمع نہ ہوسکا۔

اس کے علاوہ سب سے بڑا ظلم یہ کیا گیا کہ کاتبین وحی جن کی تعریف قرآن میں آئی ہے جن کو قرآن میں کِرَامٍ بَرَرَةٍ فرمایا گیا ہے یعنی وہ پبلک میں بھی محترم و بزرگ تھے اور اللہ کے نزدیک بھی نیک کردار تھے۔ ان کے متعلق یہ مشہور کیا کہ کاتب وحی منافق تھے جو بعد کو مرتد ہوگئے، آپ ان سے لکھواتے تھے علیم حکیم اور وہ لکھ دیتے تھے سمیع علیم وغیرہ۔ تاکہ لوگوں کے دلوں میں یہ شبہ رہ جائے کہ قرآن مجید واقعی صحیح لکھا گیا یا نہیں۔ جس طرح آپ نے بتایا اسی طرح لکھا گیا یا اس میں کچھ رد و بدل کر دیا گیا۔ اور اس کاتب وحی کے مرتد ہونے کی اور پھر مسلمان ہوجانے کی ایک من گھڑت داستان بنا کر مشہور کی گئی اور اس طرح دوسرے کاتبین وحی کی بھی اہمیت گھٹانے کی کوشش کی گئی۔

سب سے بڑا سبب عہد نبویؐ میں قرآن کے جمع نہ ہو سکنے کا یہ بیان کیا جاتا ہے کہ چونکہ نزول وحی کا سلسلہ وفات کے وقت تک جاری تھا اور معلوم نہ تھا کہ کب کونسی آیت اتر آئیگی اور اس کو کس سورۃ میں کس آیت کے بعد اور کس آیت کے قبل لکھنے کا حکم ہوگا اس لئے عہد نبویؐ میں پورا قرآن کیسے مرتب ہوسکتا کہ کوئی سورۃ بھی مرتب نہیں سمجھی جاسکتی تھی۔ اسی لئے عہد نبویؐ میں جب جتنی آیتیں اتریں اتنی آیتیں

کسی ہڈی یا تختی یا پتھر یا ٹھیکری وغیرہ پر لکھ لی گئیں اور ان کی کوئی باضابطہ ترتیب قائم نہیں کی گئی۔

ان سب شیطانی وسوسوں کا نہایت مدلل جواب میں نے اپنی کتاب جمع قرآن میں لکھ دیا ہے جن کے دیکھ لینے کے بعد کسی قسم کا کوئی شبہ باقی نہیں رہ سکتا۔

تیسرا محاذ، محاذ جمع | اس پر میری پوری کتاب جمع قرآن موجود ہے جو طبع ہو چکی ہے۔

چوتھا محاذ ترتیب نزول قرآن اس سلسلے میں سب سے بڑا فتنہ یہ پیدا کیا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ترتیب نزول کے مطابق قرآن جمع کیا تھا اور عبداللہ بن مسعودؓ کا جمع کیا ہوا قرآن ایک خاص ترتیب سے تھا جو موجودہ ترتیب سے بہتر تھا۔ اگر وہ ابن مسعودؓ والا نسخہ موجود تھا تو مشہور مفسر مجاہدؒ کو قرآن کی بہت سی آیتوں کے متعلق حضرت ابن عباسؓ سے کچھ پوچھنے کی ضرورت کیوں پڑتی تھی قرآن کی ترتیب نزول پر مبنی حضرت ابن مسعودؓ اور حضرت علیؓ والے مصحف کی عبارت خود اپنا مطلب واضح کر دیتی۔

انھیں شرارتوں میں سے ایک شرارت یہ بھی ہے کہ موجودہ مرتب قرآن متواتر کا نام مصحف عثمانی رکھا گیا کہ اس کی آیتوں اور سورتوں کی ترتیب حضرت عثمانؓ نے قائم کی ۔ یعنی رسول اللہ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے تقریباً بیس برس کے بعد۔ یہ سب انہی منافقوں کی شیطانی تلبیسات ہیں جن کی کوئی حقیقت نہیں نہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ترتیب نزول کے مطابق کوئی قرآن بطور خود مرتب کیا تھا، نہ

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا کوئی مصحف موجودہ مصحف متواتر سے مختلف تھا۔ نہ حضرت عثمانؓ نے کسی مصحف کی بھی ترتیب آیات و سُوَر قائم کی تمام سورتیں اپنی آیتوں کے ساتھ مرتب عہد نبوی ہی سے چلی آ رہی تھیں ہر سورۃ کا نام خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رکھا تھا۔ آپ برابر بڑی بڑی سورتیں اور چھوٹی چھوٹی بھی نمازوں میں پڑھا کرتے۔ کبھی دو دو سورتیں ایک ایک رکعت میں پڑھتے تھے اور صحابہؓ کی اکثریت کے پاس کتابی صورت میں پورا قرآن مرتب موجود تھا۔ نزول وحی قرآنی کا سلسلہ آپؐ کی وفات سے بہت پہلے ختم ہوچکا تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی وفات کا وقت معلوم نہ ہو یہ ممکن ہے مگر اللہ تعالیٰ کو تو معلوم تھا۔ آپؐ کو کتاب اللہ کی تبلیغ و تعلیم و تبیین کے لئے اللہ تعالیٰ نے مبعوث کیا تھا، جب تک پورا قرآن اتر نہ لے اور وہ کتابی صورت میں مرتب و مدون نہ ہو جائے اس وقت تک اس کو **ذٰلک الکتب** کس طرح کہا جاسکتا تھا۔ آپؐ کس چیز کی تبلیغ و تعلیم و تبیین فرماتے ۔ اور جب تک آپؐ اپنے فرائض رسالت و نبوت سے سبکدوش نہ ہو لیں اللہ تعالیٰ آپؐ کو وفات کیوں دینے لگا؟ خصوصاً جب آپؐ کے بعد کوئی دوسرا نبی و رسول اس کو بھیجنا نہیں ہے۔ اسی لئے تو صحابہؓ آپؐ سے پوچھتے تھے کہ قرآن کتنے دنوں میں ختم کریں؟ اگر پورا قرآن مرتب ہی نہ تھا تو ختم قرآن کی مدت کے متعلق سوال ہی بے معنی تھا۔

آپؐ صحابہؓ کو منع فرماتے تھے کہ قرآن ساتھ لیکر سفر میں نہ نکلو کہیں دشمنوں کے ہاتھ نہ لگ جائے اگر قرآن کتابی صورت میں مرتب و مدون صحابہؓ کے پاس نہ تھا تو کس چیز کے سفر میں ساتھ لیجانے سے منع کیا گیا تھا؟

آپؐ صحابہؓ کو کتاب دیکھ کر تلاوت کرنے کی ترغیب دیا کرتے تھے اور بزبانی پڑھنے سے کتاب دیکھکر پڑھنے کا دونا ثواب بتاتے تھے۔ اگر لوگوں کے پاس کتابی شکل میں قرآن نہ تھا تو کتاب دیکھ کر تلاوت کی ترغیب کس طرح دی جاتی تھی۔

آپؐ نے فرمایا تھا کہ اگر کوئی مصحف ترکے میں چھوڑ جائے تو اس کے ورثا جب اس کے بعد اس مصحف میں پڑھیں گے تو اس مردے کو بھی اس تلاوت کا ثواب ملے گا جس نے وہ مصحف ترکے میں چھوڑا تھا اگر وہ مصحف کتاب کی شکل میں نہ ہوگا تو ترکے میں کونسی چیز چھوڑی جائے گی؟

آپؐ کے زمانہ میں کچھ لوگ مصحف لکھنے کا پیشہ اختیار کئے ہوئے تھے، جو لوگوں کے لئے مصاحف لکھا کرتے تھے اور لوگ اجرت دے کر ان سے مصاحف لکھواتے تھے جس کی آپؐ نے اجازت دے دی تھی۔ اگر اس زمانے میں لکھنے پڑھنے کا رواج نہ تھا یا لکھنے پڑھنے کا سامان نہ تھا اور پورا قرآن مرتب ورقوں میں نہ تھا تو لوگ ان پیشہ ور کاتبوں سے کونسی چیز لکھواتے تھے؟

شیعہ عقیدے کے مطابق حضرت علیؓ کا ترتیب نزول کے مطابق جمع کیا ہوا قرآن تو اس لئے دنیا سے ناپید ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس کو چھپا دیا اور اپنے ورثہ میں سے صرف اپنے بعد ہونے والے امام کو چھپا کر بطور امانت دیا کہ دیکھو کسی کو دکھانا نہیں اور نہ کبھی اس کے مطابق پڑھنا اور اپنے بعد ہونے والے امام کو تم بھی اسی طرح بطور امانت راز داری کے ساتھ محفوظ طور سے دیدینا اور اس کے سلسلہ کو برابر بارہویں امام تک قائم رکھنا کہ جب وہ غار سر من رائے میں چھپ جائیں تو اس مصحف کو بھی ساتھ لے جائیں۔ جب قیامت کے قریب ظاہر ہوں

تو اس وقت اس قرآن کی اشاعت کریں شیعوں کے عقیدے کے مطابق تو یہ وجہ ہے کہ دنیا میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا جمع کردہ قرآن کہیں نظر نہیں آتا۔ مگر عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ والا اور حضرت ابی بن کعبؓ والا قرآن دنیا سے کیوں غائب ہوگیا؟ بقول راویان کوفہ جب حضرت عثمانؓ نے اپنا ترتیب دیا ہوا قرآن تمام ملکوں میں بھیج کر ہر جگہ حکم بھیجدیا کہ اس کے خلاف جتنے نسخے قرآن کے ہوں وہ ضائع کر دیئے جائیں تو اس وقت سب لوگوں نے تو اپنے اپنے مصحفوں کو حضرت عثمانؓ کے بھیجے ہوئے مصحف کے مطابق کر لیا اور جو مصحف کسی کے پاس ایسا تھا جو حضرت عثمانؓ کے مصحف سے زیادہ مختلف تھا اس کو اس نے ضائع کر دیا مگر عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اپنے شاگردان کوفہ کو حکم دیا کہ خبردار دیکھو تم لوگ اپنے مصاحف کو مصحف عثمانی کے مطابق کرکے خراب نہ کرو ان کے شاگردان کوفہ کے پاس تو وہی مصاحف تھے جو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے مصحف کے مطابق تھے تو جب عبداللہ بن مسعودؓ جیسے استاد کا حکم تھا اور اسی بناء پر عبداللہ بن مسعودؓ نے نہ خود اپنا مصحف بدلا نہ اپنے شاگردوں کو بدلنے دیا جب تو کوفے میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے مصحف کی سینکڑوں نقلیں نہیں تو بیسیوں تو ضرور ہونی چاہئیں مگر کیا ہے آج ہی نہیں ایک ہزار برس سے کہیں کوئی نسخہ عبداللہ بن مسعودؓ کے نسخے کے مطابق نہیں ملا اور نہیں ملتا۔ اتقان میں یا فہرست ابن ندیم شیعی میں صرف ایک فہرست منافقین کی بنائی ہوئی پیش کر دینے سے یہ ثابت نہیں ہوسکتا کہ واقعی اس ترتیب سُوَر کے مطابق کوئی مصحف دنیا میں کبھی تھا۔ اسی طرح مختلف ترتیبیں سورتوں کی قائم کی جاسکتی ہیں اور آج بھی جس کا جی چاہے قائم کرے۔ مگر کوئی ہے جو اس ترتیب متواتر کے خلاف کوئی دوسرا نسخہ دوسری ترتیب سے

لکھا ہوا کہیں دکھائے جو قدیم نسخہ ہو اور یہ معلوم ہو کہ کس کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے؟ کتاب کے شروع میں " قرآن کے بعض نسخے" والے عنوان کے تحت ہم نے خواجہ حسن نظامی کے پیش کردہ ترتیب نزول والے نسخہ پر تبصرہ کیا ہے اسے بھی دیکھ لیا جائے۔

پانچواں محاذ حفظ | اس سے بھی انکار کیا جاتا ہے کہ پورے قرآن کے حفاظ موجود تھے اس لئے کہ پورا قرآن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت تک مرتب و مدون ہی نہیں ہوا تھا۔ تو سب سے پہلا سوال تو یہی ہوتا ہے کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پورے قرآن کے حافظ تھے یا نہیں؟ فبھت الذی کفر ۲/ ۲۵۸

کہا جاتا ہے کہ قرآن کے کچھ حصے کسی کو، کچھ حصے کسی کو یاد تھے جنگ یمامہ میں بعہد صدیقی جو ستر حفاظ شہید ہوئے تھے وہ سب ایسی ہی تھے ان میں سے کسی کو پورا قرآن یاد نہ تھا بلکہ ان کو کتنی ایسی آیتیں یاد تھیں جو دوسروں کو یاد نہ تھیں اور نہ کسی کے پاس لکھی ہوئی تھیں۔ ان کی شہادت جو ہوئی تو وہ آیتیں بھی جو صرف انھیں کو یاد تھیں انھیں کے ساتھ دنیا سے چلی گئیں۔ اللہ جانے ان میں کون کون احکام تھے جو ہمیشہ کے لئے کھو گئے اور دین مکمل کئے جانے کے بعد بھی ناقص ہی رہا۔ معاذ اللہ من ذٰلک۔

راویان احادیث کا حافظہ تو اتنا قوی ہو جائے کہ کئی کئی لاکھ حدیثیں معہ اسناد وہ یاد کرلیں اور یاد رکھیں مگر صحابہؓ کا حافظہ اتنا کمزور تھا کہ وہ پورے سات ہزار بھی نہیں چھ ہزار چھ سو چھیاسٹھ آیتیں جو ایک سو چودہ سورتوں کی شکل میں مرتب ہیں ان کو یاد کرلیں اور یاد رکھ سکیں۔

محدثین کو حدیثیں یاد کرنے کی جتنی فکر تھی اس سے کہیں زیادہ صحابہ

رضی اللہ عنہم کو قرآن مجید کے ساتھ شغف تھا اور وہ قرآن یاد رکھنے کی ضرورت ان سے کہیں زیادہ محسوس کرتے تھے ان کے پاس تو ان کا سرمایہ ایمان صرف قرآن ہی تھا۔ ہم جس چیز کو سنت رسول کہتے ہیں وہ تو اسی پر چل رہے تھے وہ سنت نبوی کی چلتی پھرتی تصویریں تھے ان کو حدیثوں کے یاد رکھنے کی کیا ضرورت تھی اگر وہ حدیثوں کی کوئی اہمیت سمجھتے تو ضرور حدیثوں کو بھی کتابی صورت میں مدون کر جاتے ان کو تو جمع احادیث میں کوئی دشواری بھی پیش نہ آتی۔ نہ راویوں کی جانچ پڑتال کی ضرورت تھی۔ صحابی اگر پوچھتے تو کسی دوسرے صحابی ہی سے، صحابی اگر روایت کرتے تو دوسرے صحابی ہی سے، بڑی آسانی کے ساتھ نہایت صحیح صحیح حدیثیں جمع ہو جاتیں مگر انھوں نے اس کی ضرورت ہی نہیں محسوس کی خلفائے راشدین جمع احادیث کو دین میں ایک فتنہ سمجھ کر اس سے باز رہے اور دوسرے جمع کرنے والوں کو اس سے منع کیا اور اپنے سامنے کہیں کوئی مجموعہ حدیث جمع نہ ہونے دیا۔ یہی وجہ ہے کہ کسی صحابی کا مرتب کردہ کوئی مجموعہ و احادیث مؤطا و بخاری کی طرح موجود و مشہور نہیں ہے۔ اگر کسی صحابی کا واقعی کوئی مرتب کردہ مجموعہ ہوتا تو اس کے سامنے مؤطا و بخاری و مسلم وغیرہ کی کیا اہمیت ہوتی یقیناً مسلمان اسے سر آنکھوں پر رکھتے اور جس طرح آج تک دور عثمانی و علوی کے مصاحف ملتے ہیں اسی طرح دور صحابہؓ کے جمع کردہ مجموعہ احادیث کے نسخے بھی ضرور ملتے۔

چھٹا محاذ قرأت | میری اس تحریر کا موضوع ہی محاذ قرأت ہے کہ بہت بڑا اور نہایت سخت فتنہ انگیز محاذ ہے۔ مگر قبل اس کے کہ میں اس اصل محاذ پر کچھ لکھوں مناسب ہے کم سے کم دوسرے محاذوں کا ذکر ہی

کردوں تاکہ لوگوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ قرآن کے خلاف کتنے محاذ قائم کئے گئے۔

ساتواں محاذ ناسخ و منسوخ | یعنی اس کا پروپیگنڈا کہ قرآن کی بعض آیتیں منسوخ ہیں۔ ایک جماعت نے یہ کہا کہ قرآن کو قرآن ہی منسوخ کر سکتا ہے یعنی ایک آیت دوسری کسی آیت ہی سے منسوخ ہو سکتی ہے۔ دوسرے نے کہا کہ متواتر حدیثیں بھی قرآن کی کسی آیت کو منسوخ کر سکتی ہیں۔ تیسری جماعت نے کہا کہ مشہور حدیثوں سے بھی قرآن کی کوئی آیت منسوخ ہو سکتی ہے۔ اس اختلاف باہمی کی ایک پوشیدہ غرض یہ تھی کہ علما کے درمیان یہ بحث چھڑ جائے کہ قرآن صرف قرآن ہی سے منسوخ ہو سکتا ہے یا حدیث سے بھی منسوخ ہو سکتا ہے تاکہ یہ سمجھا جائے کہ قرآن کی بعض آیتوں کا منسوخ ہونا تو فریقین کے نزدیک مسلم ہے اس لئے اس کو تو ماننا ہی پڑے گا۔ باقی رہا یہ کہ ناسخ بھی قرآن کی کوئی آیت ہی ہو یا حدیث بھی ناسخ آیت ہو سکتی ہے بس صرف اسی میں اختلاف ہے اب اگر کوئی شخص سرے سے نسخ ہی کا انکار کر دے تو یہ کہنے کا موقع ملے کہ یہ شخص تو اجماع امت کا مخالف ہے۔

اور پھر ماننسخ من ایة او ننسھا[۱] والی آیت اور اذا بدلنا ایة مکان ایة[۲] والی آیت کا غلط مفہوم بیان کر کر کے قرآن کی بعض آیتوں کو زبردستی منسوخ ثابت کرنے کی سعی نامشکور کی جاتی رہی اور آج تک کی جارہی ہے۔

اس موضوع پر میرے متعدد مضامین ہیں جو مختلف رسالوں میں

القرآن [۱] ۲ / ۱۰۶ [۲] ۱۶ / ۱۰۱

چھپ چکے ہیں۔ ایک صاحب سے تحریری مناظرہ بھی اس موضوع پر ہوا تھا۔ آخر وہ بحث میرے چار سوالوں پر ختم ہو گئی اور وہ صاحب اور ان کے اعوان و انصار سب میدان چھوڑ کر بھاگ گئے۔ وہ چار سوالات حسب ذیل ہیں۔

(الف) قرآن مجید میں کتنی آیتیں قائلین نسخ کے نزدیک بالاتفاق منسوخ ہیں ان کی صحیح تعداد بتایئے۔
(ب) ان متفق علیہ آیات منسوخہ میں سے کم سے کم پانچ آیتیں معین کرکے پیش کیجئے۔
(ج) آیات منسوخہ پر عمل کرنا جائز ہے یا ناجائز؟ اپنی اور اگلے قائلین نسخ کی رائے بتایئے۔
(د) قرآن کی وہ کون کون آیتیں ہیں جن پر عمل کرنا ناجائز ہو، ایسی دو تین آیتیں پیش کیجئے۔ اس کے بعد جب کوئی مجھ سے آیات قرآنی کے نسخ پر کچھ بولتا ہے، میں یہی چاروں سوال اس کے سامنے پیش کر دیتا ہوں، اور پھر ان کو چپ ہی ہو جانا پڑتا ہے۔

آٹھواں محاذ لغت | قرآن مجید کے بعض الفاظ غریبہ کے معنی بیان کرنے میں اہل لغت نے بھی کچھ کم ظلم نہیں کیا ہے۔ بعض الفاظ کے تو ایسے معانی لکھدیئے ہیں جو قرآن میں مراد لئے ہی نہیں جاسکتے، اور کچھ معنی ایسے بھی لکھدیئے کہ وہ مراد ہوسکتے ہیں مگر ایک طرح کی رکاکت باقی ہی رہ جاتی ہے یا غلط معنی لکھدیئے جس کی وجہ سے آیت کا مفہوم ہی غلط ہو جاتا ہے۔

جس کی اصل وجہ یہ ہے کہ لغت کی کتابیں بہت بعد میں مدون ہوئی ہیں پہلے روایات و تفسیر کی کتابیں لکھی گئیں جن میں زیادہ تر انھیں

منافقین کے اقوال منافقانہ تھے انھوں نے بعض الفاظ غریبہ کے معانی بھی غلط لکھے۔ مثلاً

پہلی مثال۔ کلالہ کا مطلب مثلاً کلالہ کے اللہ جانے کہاں کہاں سے دس معنی بتائے ہیں۔ قرآن میں کلالہ کا لفظ دو جگہ وراثت کے سلسلے میں سورۃ نساء میں آیا ہے ان دس معنی میں سے زیادہ تو ایسے ہی ہیں جو قرآن کی کسی آیت کے موقع پر بھی چسپاں نہیں ہوسکتے۔ بعض معنی بتاویل صحیح ہوسکتے ہیں، مفسرین غلط روایات کی بناء پر اس کے معنی من لا ولد له ولا والد لکھ گئے ہیں یعنی جس میت کے نہ والدین ہوں نہ اولاد وہی کلالہ ہے۔ بس اسی کو تمام اہل لغت نے بھی لکھدیا۔ حالانکہ قرآن مبین نے خود کلالہ کی تعریف بیان کر دی ہے کہ ان امر ھلک لیس له ولد وله اخت۔ یعنی قرآن یہ بتاتا ہے کہ جس لاولد میت کے وارث بھائی یا بہن یا دونوں ہوں تو وہ میت کلالہ ہے یعنی مورث ہونے کی حیثیت سے کلالہ ہے تو پھر وہ بھائی بہن وارث ہونے کی حیثیت سے کلالہ ہیں اور ان کی وراثت بھی کلالہ کہی جاسکتی ہے۔ اس قرآنی تعریف کا جس طرح مفسرین و محدثین و فقہا کہیں ذکر نہیں کرتے اسی طرح اہل لغت بھی کہیں ذکر نہیں کرتے۔

دوسری مثال تلاوت کا مفہوم اسی طرح تلاوۃ کا لفظ جب کتاب یا مصحف کے لئے آئے گا جیسے یتلوا صحفا مطہرۃ تو اس سے مراد کتاب دیکھ کر پڑھنا ہی ہوگا۔ اسی لئے مفسرین کو اس آیت کی تفسیر میں دشواری محسوس ہوئی اور انھوں نے اس کو مجاز قرار دے کر لکھا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ زبانی اس طرح پڑھتے تھے جیسے کوئی کتاب دیکھ کر

پڑھتا ہو۔ وغیر ذلک۔ دیکھئے تفسیر کبیر امام رازی وغیرہ ۔ اگر تلاوت کے معنی کتاب دیکھکر پڑھنا نہ ہوتا تو مفسرین کو اس قسم کی تاویلوں کی ضرورت نہ پڑتی۔ چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تادم وفات نا خواندہ انہیں منافقین کے پروپیگنڈے کے زیر اثر تسلیم کر لیا گیا ہے تو جب آپ کو ان پڑھ مان لیا ہے اور پھر قرآن میں یتلو اصحفا موجود ہے جس کے معنی کتاب دیکھ کر پڑھنے کے ہیں تو وہ لوگ تاویل پر مجبور ہوئے حالانکہ قرآن ہی سے ثابت ہے کہ نزول قرآن کی بدولت آپؐ کو پڑھنے کی صلاحیت منجانب اللہ پیدا ہوگئی تھی بغیر اس کے کہ آپؐ کسی انسان سے تعلیم حاصل کریں ۔ میں نے یہ بحث پورے دلائل کے ساتھ اپنی کتاب جمع قرآن میں پیش کر دی ہے۔ اس پر میرا ایک علیحدہ مقالہ بھی موجود ہے جو شائع ہو چکا ہے۔ [یہ مقالہ اس کتاب اعجاز القرآن میں بھی ہم نے محاذ تفسیر کے تحت پیش کردیا ہے ۔ (طاہر)]

اُمّی کے معنی | آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق جو یہ مشہور کیا گیا کہ آپؐ تادم وفات ان پڑھ ہی رہے اس میں ان منافقین کا ایک درپردہ مقصد یہ تھا کہ یہ ثابت کیا جائے کہ آپؐ قرآنی آیات جو کاتبین وحی سے لکھواتے تھے تو آپؐ کو ذاتی طور سے اس کا علم الیقین نہ تھا کہ جو کچھ آپؐ نے لکھوایا وہی لکھا گیا یا اس میں کسی قسم کا رد و بدل ہوگیا۔ کاتبین وحی کے متعلق یہ مشہور کیا گیا کہ بعض کاتبین وحی نعوذ باللہ منافق تھے آپؐ ان سے لکھواتے تھے کچھ اور وہ لکھدیتے تھے کچھ اور ۔ اور خود آپؐ کے متعلق یہ مشہور کیا گیا کہ آپؐ پڑھنا نہیں جانتے تھے ۔ دونوں کے پیش نظر رکھنے سے ایک خالی الذہن انسان اس نتیجے پر پہنچ سکتا ہے

کہ آپ نے جو لکھوانا چاہا ممکن ہے کہ نہ لکھا گیا ہو اور قرآن میں کاتبین کی بے اعتمادی کی وجہ سے رد و بدل واقع ہوگیا ہو۔

حالانکہ قرآن مجید میں صاف طور سے موجود ہے کہ و ما کنت تتلوا من قبلہ من کتب و لا تخطہ بیمینک اذا لارتاب المبطلون ۴۸/۲۹ اور تم اس (قرآن کے نزول) سے پہلے کسی کتاب کو پڑھ نہیں سکتے تھے اور نہ تم اپنے داہنے ہاتھ سے لکھ سکتے ہو۔ (اگر تم پہلے سے لکھنا پڑھنا جانتے) تو یہ باطل پرست لوگ (تمہارے متعلق) شک و شبہے میں رہتے (عنکبوت) یہ آیت صاف بتا رہی ہے کہ پڑھنے کی عدم صلاحیت نزول قرآن سے پہلے تک تھی۔ ورنہ من قبلہ کا لفظ نہ ہوتا۔ اور جب عدم صلاحیت کے ذکر میں من قبلہ کی قید لگا دی گئی تو اسی سے ثابت ہوگیا کہ من بعدہ یعنی نزول قرآن کے بعد صلاحیت پیدا ہوگئی۔ یہ تو قرآنی دلیل ہے اور امام بخاری وغیرہ کی حدیث میں جو پہلے پہل نزول وحی کی کیفیت بیان کی گئی ہے حضرت جبرئیل علیہ السلام کے بار بار معانقے والی، اس سے بھی اس کا ثبوت واضح طور سے ملتا ہے کہ جب تک کوئی کتاب کوئی تحریر پیش کر کے اس کے پڑھنے کے لئے نہ کہا جائے ایک ان پڑھ آدمی یہ کبھی نہیں کہہ سکتا کہ ما انا بقاری میں پڑھنے والا یعنی پڑھنے کی صلاحیت رکھنے والا نہیں ہوں۔

غرض تلاوہ کا لفظ جب اس طرح آئے کہ اس کا مفعول "کتاب" یا "مصحف" یا "صحف" کا لفظ آئے تو اس سے مراد حرفوں کو پہچان کر کتاب دیکھ کر پڑھنا ہی ہوگا۔ بلکہ قراء کے لفظ کا بھی یہی حال ہے - **یقرؤ** الکتب کے معنی یہی ہوں گے کہ کتاب دیکھ کر حروف پہچان کر پڑھتا ہے۔ البتہ آیات کا لفظ اگر مفعول ہو تو وہ عام ہے زبانی پڑھنے کے لئے

بھی بولا جاتا ہے اور کتاب دیکھ کر پڑھنے کے لئے بھی۔ چاہے قراء کا لفظ اس کیلئے آئے یا تلاوہ کا لفظ۔

تیسری مثال، اِدّٰرَکَ کا مطلب | اسی طرح اِدّٰرَکَ کا لفظ ہے کہ قرآن مجید میں یہ لفظ دو جگہ آیا ہے۔ ایک تو سورۃ اعراف آیت ۳۸ میں حتی اذا ادّٰرکوا فیھا الایۃ[1] اور دوم سورۃ نمل آیت ۴۴ میں بل اِدّٰرک علمھم فی الا خرۃ۔ اہل لغت اس لفظ کے جو معنی لکھتے ہیں اس سے کوئی ایسا ایک مفہوم نہیں نکلتا جو دونوں جگہ انشراح قلب کے ساتھ قبول کر لیا جاسکے۔ چونکہ یہ کتاب صرف اختلاف قرأت کے موضوع پر ہے اور ان محاذات کا ذکر ضمناً کر رہا ہوں اس لئے ضمنی بحثوں کو طول دینا نہیں چاہتا اشارات سے کام نکالنا چاہتا ہوں۔ اہل علم کے لئے یہ بحثیں ہیں اور وہ خود بہت کچھ جانتے یں اور لغت کی کتابیں دیکھ سکتے ہیں تو پھر میں کتب لغت کی عبارتیں نقل کرکے ایک ضمنی بحث کو طول کیوں دوں۔ مختصر یہ ہے کہ اِدّٰارکَ کا ترجمہ کرتا ہوں جھک جانا، جھکا جانا، جھوک دیا جانا۔ ان دونوں آیتوں میں اس لفظ کا یہ ترجمہ نہایت صحیح و مناسب معلوم ہوتا ہے۔ حتی اذا اِدّٰرکوا فیھا یہاں تک کہ جب سارے اہل دوزخ، دوزخ میں جھکا گئے، جھونک دیئے گئے، یعنی ان میں کوئی بھی دوزخ سے باہر نہ رہا۔"

اور بل اِدّٰرَکَ علمھم فی الا خرۃ کا ترجمہ ہوا" بلکہ ان کا علم جھکا گیا، جھونک دیا گیا آخرت کے بارے میں۔ یعنی ان کی ساری معلومات اور تمام ذرائع علم سب کے سب آخرت کے د بافت حال میں جھونک دیئے گئے، صرف کر دیئے گئے۔ کوئی بھی ایسا ذریعہ علم نہ رہا جو اس کوشش

[1] ۷ / ۳۸

میں صرف نہ کیا گیا ہو۔ بل ھم فی شک منھا[له] (باوجود سارے معلومات و ذرائع علم جھونک دینے کے، کیا وہ آخرت کے متعلق کچھ علم حاصل کر سکے؟ کچھ بھی نہیں) بلکہ وہ اس کے متعلق (ابھی تک) شک ہی میں پڑے ہوئے ہیں (کہ واقعی آخرت کی بھی کوئی حقیقت ہے یا نہیں؟) بل ھم منھا عمون[له] (شک ہی میں مبتلا نہیں ہیں) بلکہ وہ آخرت کے متعلق بالکل اندھے ہیں یعنی جس طرح آنکھیں بذات خود بغیر کسی خارجی روشنی کے کچھ نہیں دیکھ سکتیں۔ جہاں اندھیرا ہو وہاں ہر شخص اندھا ہی ہے۔ آنکھوں کی بینائی خارجی روشنی کی محتاج ہے اسی طرح عقل بھی وہاں اندھی ہے جہاں اس کو حواس خمسہ میں سے کسی کی روشنی نہ ملے آخرت کے متعلق انسانی حواس خمسہ کسی طرح کی روشنی بہم نہیں پہنچا سکتے تو پھر انسانی عقل کا آخرت کے متعلق اندھی ہونا لازمی ہے اس لئے کس قدر صحیح فرمایا گیا کہ بل ھم منھا عمون[له] بلکہ وہ آخرت کے بارے میں بالکل اندھے ہیں۔

اہل لغت اِدّٰارَکَ کا مادہ "درک" قرار دیتے ہیں۔ درک کے معنی ہیں تہ تک، آخری حد تک پہنچنا۔ کھوج کھوج کر کسی چیز کا ایک ایک فرد پکڑ پکڑ کر کسی چیز میں جھونک دیا گیا تو اس کو اِدّٰرَکَ سے تعبیر کیا گیا کہ تلاش اور دھر پکڑیں آخری حد تک سرگرمی دکھائی گئی ۔ مگر ضرک کو بھی اس کا مادہ کہا جاسکتا ہے ۔ یعنی باب افتعال پر ضرک جب آیا تو ضرک کا "ضاد" اور افتعال کی "تا" دونوں "دال" ہو کر مدغم ہوگئے اور اضتراک سے ادراک بن گیا جس کا ماضی ادرک ہوا۔ اس کے بعد اس کو باب اِفّاعَلَ

[له] ۶۶/۲۷ [له] ۶۶/۲۷

یَفاعلُ پر لایا گیا تو اِدّارکَ یدارکُ ہوگیا جیسے ثقل کو باب افتعال پر لایا گیا تھا تو اثتقل ہوا تھا۔ تائے ثناۃ کو بھی ثائے مثلثہ سے بدل کر دونوں میں ادغام کر دیا گیا تو اثّقل ہوگیا۔ اس کے بعد باب اِفّاعل پر لایا گیا تو اِثّاقلَ یَثّاقلُ ہوگیا۔ یہ صورت بھی قرین قیاس ہے۔ خصوصاً معنوی حیثیت سے کیونکہ ضرک کے معنی ہیں صارَ ضَریکاً وہ ضریک ہوگیا اور ضریک کے معنی اندھے اور احمق، فقیر بد حال، بعض اعضاء سے محروم وغیرہ کے ہیں۔ اس لئے ادارک کے معنی ہوئے اندھا ہوگیا۔ احمق ہوگیا۔ فقیر بد حال ہوگیا اور بعض اعضا سے محروم ہوگیا۔ یہاں ادارک علمھم فرمایا گیا ہے جس کے معنی ہوئے کہ ان کا علم اندھا ہوگیا۔ احمق بن گیا۔ جو یہاں نہایت مناسب حال ہے۔ اس طرح کی تبدیل حروف عربی کلمات میں بہت ہوئی ہے یہاں یہ کوئی نئی اپج نہیں ہے۔ مزمل اور مدثر کی لغوی نوعیت کو دیکھ لیجئے جس کی تصریح خود مفسرین و اہل لغت نے لکھدی ہے۔ یہاں درک ہی اس کا مادہ چونکہ تسلیم کیا گیا اس لئے دوسری طرف ذہن نہیں گیا۔ درک ہی کو مادہ قرار دیں جب بھی صورت ترکیب وہی ہے کہ اس کو باب افتعال پر لاکر تائے افتعال کو دال سے بدل کر دونوں دال میں ادغام کر دینے کے بعد ادراک بنا جس کا ماضی ادرک ہوا۔ اس کے بعد اس کو باب افاعل پر لائے تو ادارک یدارک کی نوعیت قائم ہوئی۔ میری اس بیان کردہ تبدیل و تغیر حرف پر اعتراض نہیں کیا جاسکتا۔ وہ تو بہر حال ہے فرق جو کچھ ہے وہ اس کا کہ اہل لغات اس کا مادہ درک بتاتے ہیں اور میں کہتا ہوں کہ اس کا مادہ ضرک بھی ہوسکتا ہے جو معنوی حیثیت یہاں انسب ہے۔ و اللہ الم۔

البتہ سورۃ اعراف میں جو ادارکو ہے اس کا مادہ درک ہی ہے۔ اسی قسم

کی ایک اور مثال آل اور اہل بیت کے الفاظ ہیں جن کی بیحد تحریف معنوی کی گئی ہے ان پر کچھ گفتگو ہم محاذ تفسیر میں آیہ تطہیر کے تحت کریں گے۔

نواں محاذ صرف و نحو صرف و نحو دو علوم ہیں صرف کا تعلق کلمات مفردہ کے اشتقاق و اوزان وغیرہ سے ہے جیسا کہ ابھی ادرک کے متعلق اس سے پہلے میں نے بحث کی کہ یہ درک سے مشتق ہوسکتا ہے اسی طرح ضرک سے بھی مشتق ہوسکتا ہے یہ بحث علم صرف کی تھی مگر لغوی تحقیق کے سلسلے میں یہ بحث محاذ لغت میں کی گئی۔

محاذ صرف و نحو کے ذریعے اختلاف قرأت کا خوب خوب کام لیا گیا ہے۔ صرفی و نحوی بحثوں کو گویا اختلاف قرأت کے لئے علت مادی بنا کر ان سے کام لیا گیا۔ مثلاً یحسبون اور یحسب جہاں جہاں قرآن مجید میں ہے بفتح سین ہے اس باب کا مضارع بکسر سین بھی آتا ہے اس لئے ایک قرأت ان لفظوں کی بکسر سین بھی قرار دیدی گئی ۔ کَذِبُوا کی ایک قرأت کُذِّبُوا وغیرہ بہت بنائی گئی ہے جس کا مقصد قرآن مجید میں لفظی اختلافات ثابت کرنا ہے اور کہیں کچھ معنوی فرق بھی۔

اوزان کے متعلق بھی مثالیں ملتی ہیں مثلاً اسم آلہ مِفعلٌ کے وزن پر بھی آتا ہے اور مِفعَالٌ کے وزن پر بھی ۔ مفعل کی جمع مفاعل آتی ہے اور مفعال کی جمع مفاعیل یعنی مفعال کا الف جمع بنانے کے وقت یائے تحتانی سے بدل جاتا ہے چونکہ جمع کا عین مکسور ہے کسرہ کے بعد الف

لہ علم صرف کی تعریف تو مولانا نے بیان فرمادی کہ اسکا تعلق مفرد کلمات کے اشتقاق اور اوزان سے ہوتا ہے جبکہ علم نحو کا تعلق حرکات وسکنات کے تغیر و تبدل سے ہوتا ہے۔

ساکن جب آئے گا تو اس کو یائے معروف سے بدل دینا ضروری ہے۔
الف تو ہمیشہ ساکن ہی رہتا ہے مگر میں نے عوام کے سمجھنے کے لئے ساکن
کی قید لگا دی۔ الف متحرک تو دراصل ہمزہ ہے الف ہنیں۔

پہلی مثال | غرض اس قاعدے کے مطابق مثقال کی جمع مثاقیل اور
مضراب کی جمع مضاریب ہی آئیگی۔ کبھی مثاقل اور مضارب ہنیں آسکتی
تو پھر مفتاح کی جمع جب آئیگی تو مفاتیح ہی آئے گی۔ مفاتح ہنیں آسکتی مگر
سورۃ نور کے آٹھویں رکوع آیت ۶۱ میں جو او ما ملکتم مفاتحه [۲۴][۱۱] آیا ہے۔
یہاں مفاتح کو مفتاح کی جمع قرار دے کر اس کے معنی کنجیاں لیتے ہیں۔
مفسرین نے چونکہ اس کو خلاف حقیقت مفتاح کی جمع لکھدیا تھا اس لئے
اہل لغت جو مفسرین سے متاخر ہیں انھوں نے بھی اس کو مان لیا اور
مفتاح کی جمع مفاتیح کے ساتھ مفاتح بھی لکھدی مگر اس کے سوا کوئی
دوسری مثال ایسی ہنیں پیش کی جاسکتی کہ مفعال کے وزن پر کوئی لفظ
آیا ہو اور اس کی جمع مفاعل کے وزن پر آگئی ہو۔ مفسرین کا مقصد
صرف اپنی مزعومہ تفسیر کو صحیح ثابت کرنا تھا۔ اہل لغت نے ان کی
تائید کرکے ان کا ہاتھ مضبوط کردیا۔ مگر عوام علمائے مقلدین ان کی
بات مان لیں یہ اور بات ہے۔ اہل تحقیق ضرور ان سے یہ پوچھتے رہیں
گے کہ وہ کوئی دوسرا لفظ ایسا دکھائیں جو مفعال کے وزن پر ہو اور اس
کی جمع مفاعل کے وزن پر آئی ہو۔ یا کم سے کم اس مافیھا النزاع آیت کے
سوا کسی اور جگہ مفاتح کا لفظ دکھائیں۔ جہاں صرف کنجیوں ہی کے معنی لئے
جاسکتے ہوں۔ یہاں تو کنجیوں کے معنی زبردستی لئے جا رہے ہیں۔ ہر جگہ
زبردستی ہنیں چل سکتی اور جب کوئی دوسرا لفظ مفعال کے وزن والا ایسا
ہنیں مل سکتا جس کی جمع مفاعل کے وزن پر آئی ہو اور نہ کسی جگہ مفاتح

کا لفظ اس طرح دکھایا جاسکتا ہے جہاں اس سے صرف کنجیاں ہی مراد ہوں تو یقیناً سورۃ نور کی مذکورہ آیت میں بھی مفاتح مفتح ہی کی جمع ہے مفتاح کی جمع کہنا ہرگز صحیح نہیں۔ اور اہل لغت کی خلاف قاعدہ بات جو محض مفسرین کی تقلید میں لکھی گئی ہے کبھی ماننے کے قابل نہیں۔ الفاظ کی تحقیق یا قاعدے کی رو سے کی جائے گی یا محاورے سے خلاف قاعدہ و خلاف محاورہ کسی کی بھی بات میزان تحقیق میں کوئی وزن نہیں رکھتی۔

دوسری مثال | نحوی ترکیبوں کو تو نہ پوچھئے۔ کوفیوں اور بصریوں کے کتنے من گھڑت قواعد ہیں جن کے ماتحت قرآنی آیات میں طرح طرح کی معنوی تحریفوں کی کوشش کی گئی ہے مثلاً سورۃ یوسف میں ہے و همت به و هم بها لو لا ان راٰی برهان ربه [۱۲/۲۴] یعنی زلیخا حضرت یوسفؑ کی طرف مائل ہوگئیں اور یوسفؑ بھی ان کی طرف مائل ہو جاتے اگر وہ اپنے رب کی دلیل دیکھے ہوئے نہ ہوتے جس سے یہ ثابت ہو رہا ہے کہ حضرت زلیخا کی طرف حضرت یوسفؑ مائل نہیں ہوئے۔ مگر وہاں تو کوشش اس کی تھی کہ انبیاء علیہم السلام کے دامن تقویٰ کو بھی اتباع ہوا و ہوس سے آلودہ ثابت کریں اس لئے علامت وقف کی جگہ بدل دی اور یوں بنایا و همت به و همه بها لو لا ان رای برهان ربه [له] یعنی زلیخا یوسفؑ کی طرف مائل ہوگئیں اور یوسفؑ زلیخا کی طرف مائل ہوگئے (مگر) یوسفؑ اگر اپنے رب کی دلیل دیکھے ہوئے نہ ہوتے تو ضرور فعل بد میں

[له] پہلی عبارت کی نوعیت جو همت بہٖ پر وقف کرنے سے سجع کی خوبصورتی کی شکل میں پیدا ہو رہی ہے یعنی بہٖ کا قافیہ ربہٖ ہو رہا ہے۔ اس خوبصورتی کو بھی اس گمراہ کن اور بھونڈے وقف سے ان لوگوں نے ضائع کر دیا۔ (تمنا) ۲۴/۱۲ ۵۷

مبتلا ہو جاتے یعنی لو لا ان رای برھان ربہ جو صرف شرط ہے اس کی جزا محذوف مانی جائے یہ اس لئے کہ ان کے نزدیک لولا کی جزا پہلے نہیں آئی۔ معلوم نہیں یہ وحی ان نحویوں پر کس کی طرف سے ہوئی کہ لولا کی جزا مقدم نہیں آسکتی قرآن ہی میں اس کی بیسیوں مثالیں ملتی ہیں۔ مثلاً مایعبو بکم ربی لو لا دعاؤ کم[1] - کہ جزائے مقدم مایعبو بکم ربی یہاں موجود ہے (آخر سورۃ الفرقان) تعجب ہے کہ یہاں بھی مایعبو بکم ربی کے بعد علامت وقف بنا کر لولا کی جزاء بعد کو محذوف ماننے کی ترکیب کیوں نہیں نکالی گئی؟

تیسری مثال:۔ اسی طرح سورۃ اعراف - میں ہے و ما کنا لنھتدی لو لا ان ھدنا اللہ یہاں بھی چاہیئے تھا کہ و ما کنا لنھتدی کے بعد علامت وقف بنا دیتے اور لو لا ان ھدنا اللہ[2] کے لئے کوئی جزائے محذوف ٹھہرا لیتے اور بھی متعدد مثالیں مل سکتی ہیں مگر یہ دو مثالیں کافی ہیں جن سے صاف طور سے ثابت ہو رہا ہے کہ لولا کی جزا نہایت اطمینان کے ساتھ مقدم آتی ہے اور جہاں اس کی جزاء مقدم آتی ہے وہاں ایک طرح کا مفہوم حصر پیدا ہو جاتا ہے غور کرنے سے اس کا پتہ مل سکتا ہے۔

افسانہ زیدؓ و زینبؓ ایک اور مثال دیکھئے کہ سورۃ احزاب کے پانچویں رکوع میں فرمایا گیا ہے و اذ تقول للذی انعم اللّٰہ علیہ و انعمت علیہ امسک علیک زوجک و اتق اللّٰہ و تخفی فی نفسک ما اللّٰہ مبدیہ و تخشی النّاس و اللّٰہ احقّ ان تخشٰہ[3] جب تم کہہ رہے تھے اس شخص سے جس کو اللہ نے نعمت دی اور تم نے نعمت

[1] ۲۵ / ۷۷
[2] ۷ / ۴۳
[3] ۳۳ / ۳۰

دی کہ اپنی بیوی کو تم اپنے پاس روکے رکھو اور اللہ سے ڈرو ۔ اور تم ایسی بات کو اپنے جی میں چھپائے ہو جس کو اللہ ظاہر کر دینے والا ہے اور تم لوگوں سے ڈرتے ہو حالانکہ اللہ اس کا زیادہ حقدار ہے کہ تم اس سے ڈرو ۔ (سورۃ احزاب آیت ۳۷)

حضرت زینبؓ بنت جحش رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی حضرت امیمہؓ بنت عبدالمطلب کی صاحبزادی تھیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو حضرت زیدؓ بن حارثہ سے بیاہ دیا تھا۔ حضرت زیدؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام تھے اور پھر آپؐ نے ان کو اپنا متبنیٰ بھی بنا لیا تھا اس لئے لوگ ان کو زید بن محمدؐ کہنے لگے تھے۔ مگر جب قرآن میں حکم آیا کہ **ادعو ھم لآباء ھم ھو اقسط عنداللہ** - تم متبناؤں کو ان کے باپ ہی کی طرف منسوب کرکے پکارا کرو کہ یہی زیادہ انصاف کی بات ہے اللہ کے نزدیک۔ (سورۃ احزاب ۵) تو اس حکم کے بعد سے لوگ ان کو زیدؓ بن حارثہ ہی کہنے لگے۔ یعنی ان کو ان کے باپ ہی کی طرف منسوب کرکے پکارنے لگے۔ مگر یہ واقعہ اس کے بعد کا ہے۔ یعنی جس واقعے کو ہم بیان کر رہے ہیں ۔ تفصیل آگے آتی ہے۔

غرض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک غلام آزاد کرہ کو اپنا متبنیٰ بنا لیا اور اس نعمت تقرب و عزت بخشی سے ان کو رسولؐ نے سرفراز کیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے ایسی صورت نکالدی کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچ گئے اور آپؐ ہی کی خدمت میں برابر رہے اور ان مومنین میں سے ہوئے جو **السابقون الاولون**[9] کے معزز لقب سے ممتاز ہوئے ۔ پھر قریش کے معزز خاندان میں رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھیری بہن سے بیاہے گئے۔ غرض اللہ و رسولؐ کے ان پر خاص خاص احسانات تھے مگر حضرت زیدؓ نے اپنے نکاح کے کچھ دنوں کے بعد حضرت زینبؓ کو طلاق دے دینے کا ارادہ کر لیا۔

ممکن ہے انھوں نے خود اپنے اس ارادے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر دی ہو، یا کسی اور سے اس کی خبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مل گئی ہو کہ زیدؓ، حضرت زینبؓ کو طلاق دینے کا ارادہ رکھتے ہیں تو آپ نے خود ان کو بلا کر ان سے پوچھا ہو۔ بہر حال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زیدؓ کو سمجھایا اور ان سے چار باتیں ارشاد فرمائیں امسک علیک زوجک [۳۳/۳۷] اپنی بیوی کو اپنے پاس روکے رکھو۔ و اتق اللّٰہ اور اللہ سے ڈرو۔ و تخفی فی نفسک ما اللّٰہ مبدیہ اور تم ایسی بات کو اپنے جی میں چھپا رہے ہو جس کو اللہ ظاہر کر دے گا۔ و تخشی النّاس و اللّٰہ احقّ ان تخشٰہ [۳۳/۳۷] اور تم لوگوں سے ڈرتے ہو حالانکہ اللہ زیادہ حقدار ہے اس کا کہ تم اس سے ڈرو۔

مگر غلامی کی وجہ سے انسان میں جو جذبۂ مرعوبیت پیدا ہو جاتا ہے ان میں بھی پیدا ہوگیا تھا چنانچہ حضرت زینبؓ جب ان کے پاس بیاہ کر آئیں تو خود یہ کہتے ہیں کہ عظمت فی صدری حتی ما استطیع ان انظر الیھا ان کی عظمت اس قدر میرے سینے میں محسوس ہوتی تھی کہ میں ان کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھ نہیں سکتا تھا (رواۃ مسلم) یعنی جب تک حضرت زینبؓ ان کے پاس رہیں ہاتھ لگانا تو بڑی بات تھی وہ ان کی طرف نظر بھر کر دیکھ نہیں سکتے تھے اس قدر ان سے مرعوب تھے اور ان کی ہیبت ان پر طاری تھی مگر اپنی اس کمزوری کو کسی پر ظاہر کرنا نہیں چاہتے تھے۔ اور ایک ایسی شخصیت کا اپنے ساتھ دن رات رکھنا جس کی

اس قدر ہیبت ان پر طاری رہتی ہو، اس کو بھی وہ گوارا نہیں کر سکتے تھے اس لئے بہتر یہی سمجھے کہ ان کو طلاق دے کر آزاد کر دیں اور خود بھی اس مرعوبیت کی مصیبت سے نجات حاصل کر لیں۔ اس طرح اپنی کمزوری کا راز بھی چھپا رہے گا یہ سمجھتے تھے کہ اگر ہم اس بات کو ظاہر کر دیں گے تو لوگ ہم پر ہنسیں گے اور ذلیل و حقیر سمجھیں گے۔ اور اگر طلاق نہ دیں گے تو پھر یہ راز چھپا نہ رہے گا۔ کبھی نہ کبھی ظاہر ہو کر رہے گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی بات کو سمجھ کر ان سے فرمایا تھا کہ اپنی بیوی کو اپنے سے علیحدہ نہ کرو اپنے پاس روکے رکھو اور اللہ سے ڈرو ۔ یعنی بلاوجہ اللہ کی اس دی ہوئی نعمت کو اپنے سے الگ کرنا ناشکری ہے بلاوجہ طلاق دینا بھی بری بات ہے ان دو باتوں کے بعد یہ بھی فرما دیا کہ تم جس بات کو اپنے جی میں چھپائے ہوئے ہو وہ چھپی نہیں رہنے کی۔ اللہ اس کو ظاہر کر دے گا۔ چنانچہ اللہ نے خود انہیں کی زبان سے بعد کو کہلوا دیا اور ان کی وہ کمزوری ظاہر ہو کر رہی۔ آخر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چوتھی بات یہ کہی کہ تم لوگوں سے کیا ڈرتے ہو، اللہ سے ڈرو ۔ وہ اس کا زیادہ حق رکھتا ہے کہ اس سے ڈرا جائے پہلے بھی اتق اللہ کہکر اللہ سے ڈرایا تھا پھر یہ بتا دیا کہ انسانوں کا ڈر ہی کیا ہے ؟ ڈر تو اللہ ہی کا ہونا چاہیئے غرض یہ چار باتیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زیدؓ سے کہی تھیں مفسرین نے کوفہ و بصرہ کی نحوی کج بحثوں کا سہارا پکڑ کے منافقین کی جھوٹی روایت کو نادانستہ صحیح ثابت کرنے کے لئے ان چاروں قولوں کا بٹوارہ کر دیا۔ یعنی لکھتے ہیں کہ پہلے دو قول تو بیشک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید کو کہے لیکن بعد کے دو قول اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمائے تھے یعنی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زیدؓ کو زبان سے تو کہہ رہے تھے امسک علیک زوجک اپنی بیوی کو اپنے پاس روکے رکھو مگر ان کے جی میں یہ تھا کہ زید حضرت زینبؓ کو طلاق دے دیں تو ان کی طلاق کے بعد ہم ان سے نکاح کر لیں۔ معاذ اللہ من ذلک۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو طلاق دینے کے لئے نہیں کہتے تھے کہ آپؐ ان کو متبنیٰ بنا چکے تھے اور اس وقت تک متبنیٰ کی حیثیت عرب کے رواج کے مطابق بالکل بیٹے ہی جیسی ہوتی تھی جس طرح بیٹے کی منکوحہ سے اس کی طلاق کے بعد بھی باپ نکاح نہیں کر سکتا۔ اسی طرح متبنیٰ کی منکوحہ سے بھی نکاح کا رواج نہ تھا تو آپؐ ان سے نکاح دستور کے مطابق کر بھی نہیں سکتے تھے اور خلاف دستور کر لیتے تو پبلک میں بڑی بد نامی ہوتی۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا کہ تم چھپاتے ہو ایسی بات کو جس کو اللہ ظاہر کر دینے والا ہے اور تم لوگوں سے ڈرتے ہو حالانکہ اللہ زیادہ حقدار ہے اس بات کا کہ اس سے تم ڈرو۔ (معاذ اللہ من تلک الہفوات)۔

سبائیوں نے اس سلسلے میں طرح طرح کی روایتیں گھڑی ہیں جن کا ذکر کرنا بھی ہم گناہ سمجھتے ہیں اس لئے ایسی ناگفتہ بہ روایتوں کے ذکر سے ناظرین ہمیں معذور سمجھیں مختصر یہ ہے کہ مفسرین کو ان چاروں باتوں کی تقسیم کا موقع نحوی موشگافیوں کی بدولت ملا نحو کا ایک مشہور مسئلہ یہ ہے کہ جملہ خبریہ وجملہ انشائیہ کے درمیان عطف جائز نہیں ہے۔ یہ اصولاً بالکل صحیح ہے ہم بھی اس کو تسلیم کرتے ہیں مگر یہاں عطف جملہ بر جملہ ہے کہاں؟ یہاں تو عطف مقولہ بر مقولہ ہے۔ یہاں اس کا ذکر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چار قول حضرت زیدؓ سے کہے تھے۔

ان چاروں اقوال کو گن دیا گیا۔ وہ اقوال چاہے سب کے سب جملہ خبریہ ہوں یا سب جملہ انشائیہ ۔ یا بعض خبریہ ہوں اور بعض انشائیہ اس لئے ان چاروں جملوں کی حیثیت یہاں کلمات مفردہ کی ہے ۔ ان کے مقولے ہونے میں ان کو جملوں کی حیثیت ہی میں رکھا۔ اس لئے پہلے دونوں مقولے اگر جملہ خبریہ اور دوسرا جملہ انشائیہ ہے تو ہوا کرے مقولہ ہونے کی حیثیت سے سب برابر ہیں۔ ان کے درمیان عطف بخوبی جائز ہے۔ جس طرح سورہ یوسفؑ کے آٹھویں رکوع میں ہے و قال یبنی لا تد خلوا من باب و احد و اد خلوا من ابو اب متفرقه و ما اغنی عنکم من الله من شئی اس آیت میں لا تدخلوا من باب و احد پہلا جملہ انشائیہ ہے پھر و اد خلوا من ابو اب متفرقه دوسرا جملہ انشائیہ ہے دونوں معطوف علیہ و معطوف ہیں پھر و ما اغنی عنکم من اللّٰہ شئی جملہ خبریہ ہے جس کا عطف پہلے دونوں جملہ انشائیہ پر کیا گیا ہے اور یہ جائز ہے اس لئے کہ تینوں جملے قال کے تحت میں ہیں یعنی تینوں جملے اس قال کے مقولے ہیں اور ایک مقولے کا عطف دوسرے مقولے پر ہے نہ کہ ایک جملے کا عطف دوسرے جملے پر۔ اس طرح کی مثالیں متعدد مل سکتی ہیں اگر تھوڑی جستجو کی جائے۔

مگر مفسرین کو یہ خیال کرنا تھا کہ ان روایات مکذوبہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دامن اخلاق حسنہ پر کس قسم کا بد نما دھبہ لگ رہا ہے، پھر قرآن مجید میں تحریف ہو رہی ہے مگر ان باتوں کا کچھ خیال نہ کیا صرف روایت پرستی کے جذبے کے ماتحت آیات قرآنیہ کی معنوی تحریف تک کر گئے۔

غور کیجئے حضرت زینبؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی پھوپھی

کی صاحبزادی تھیں جن کو آپؐ نے بچپن سے دیکھا تھا اس لئے یہ روایت کہ حضرت زیدؓ سے نکاح کے بعد ایک بار آپؐ کی نظر ان پر پڑ گئی تو آپؐ نے یہ خیال فرمایا کہ اگر زیدؓ ان کو طلاق دے دیں تو میں ان سے نکاح کر لوں گا کس قدر خلاف عقل ہے جس عورت کو آپؐ نے سینکڑوں بار دیکھا ہوگا اس کے بچپن سے جوانی تک بلکہ حضرت زید سے نکاح کے بعد تک، اس لئے کہ اس وقت تک عورتوں کے لئے پردے کا حکم نہیں آیا[1] تھا اور وہ تو اپنے ہی خاندان کی ایک لڑکی تھیں۔ اگر آپؐ کی خود خواہش ہوتی تو حضرت زیدؓ سے ان کا نکاح ہی کیوں کر دیتے؟

دوسری بات یہ کہ اس وقت تک متبنیٰ کی بیوی کی بالکل وہی حیثیت تھی جو حیثیت بیٹے کی بیوی کی ہو سکتی ہے۔ آپؐ نے بالا علان اپنی نبوت سے پہلے ہی ان کو متبنیٰ بنا لیا تھا اور سب لوگوں کو اس سے مطلع کر دیا تھا اس لئے آپؐ کا یہ ارادہ ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ اگر زیدؓ ان کو طلاق دے دیں تو میں ان سے نکاح کر لوں جس سے نکاح حسب دستور خاندان حرام ہو۔ اور ابھی تک آپؐ کے نزدیک بھی حرام ہی ہو اس سے نکاح کی خواہش آپؐ کو کبھی پیدا نہیں ہو سکتی تھی۔

یہ حکم کہ متبنیٰ بیٹا نہیں ہو جاتا اس کو اس کے باپ ہی کی طرف منسوب کرکے پکارا کرو، یہ اس واقعے کے بعد نازل ہوا ہے یہاں تو حضرت زیدؓ حضرت زینبؓ کو طلاق دینے کا ارادہ رکھتے ہیں یہ اس وقت کا

---

[1] پردہ کا حکم عام عورتوں سے پہلے امہات المومنین رضی اللہ عنہن کے لیے آیا تھا اور یہ حکم غزوۂ حنین کے بعد آیا اور غزوۂ حنین ۸ھ کے شوال میں ہوا تھا اور حضرت زینبؓ، حضرت زیدؓ سے طلاق پانے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجیت میں آئی ہیں ۵ھ میں حکم حجاب سے تین برس قبل (زمنا)

ذکر ہے جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو طلاق دینے سے منع فرما رہے تھے اس کے بعد جب وہ طلاق دے چکے تو اللہ تعالیٰ نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت زینبؓ کا نکاح کر دیا جیسا کہ سورۃ احزاب میں یہیں پر ہے فزو جنا کرما یعنی ہم نے تمہیں زینبؓ سے بیاہ دیا۔ اور اسی کے بعد فرمایا گیا کہ لکیلا یکون علی المو منین حرج فی ازو اج ادعیا ئھم اذا اقضوا امنھن و طراً۔[۱] ہم نے (اے رسولؐ) تم سے اس (زینبؓ) کو بیاہ دیا تاکہ اپنے منہ بولے متبناؤں کی بیویوں کے متعلق جب کہ وہ ان کو طلاق دے دیں تو مسلمانوں کو کوئی مضائقہ محسوس نہ ہو۔

اور اسی سورۃ احزاب کے شروع میں ہے وما جعل ادعیاء کم ابناء کم ذلکم تو لکم بانو اھکم[۲] اللہ نے تمہارے منہ بولوں کو تمہارا بیٹا نہیں بنا دیا ہے۔ یہ تمہاری باتیں جو اپنے منہ سے تم بول گئے ہو۔ اس کے بعد یہ بھی فرما دیا کہ ادعو ھم لابائھم ہو اقسط عند اللہ[۳] ان کو ان کے باپ ہی کی طرف منسوب کرکے پکارا کرو۔ یہی زیادہ انصاف کی بات ہے اللہ کے نزدیک۔ یہ اگرچہ ابتدائے سورۃ احزاب میں ہے مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ حضرت زیدؓ نے جو حضرت زینبؓ کو طلاق دی تھی اس سے پہلے یہ سورہ اتری تھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت زینبؓ کا نکاح ۵ ھ کے اوائل کا واقعہ ہے اور جنگ احزاب ماہ شوال ۵ ھ میں ہوئی تھی اور سورۃ احزاب کا نزول جنگ احزاب کے بعد ہوا ہے۔

مختصر یہ کہ من گھڑت روایتوں کو محض سہل نگاری کے جذبے کے

۱۔ ۳۳/۳۷ ۔ ۲۔ ۳۳/۴ ۔ ۳۔ ۳۳/۵

ماتحت مفسرین نے لکھ لیا اور اس کو مطلق خیال نہ کیا کہ ان روایتوں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق حسنہ پر کس حد تک حرف آرہا ہے بعضوں نے بعض رکیک ترین روایتوں کو چھوڑ دیا، یا کچھ تاویلیں کرکے الزام کو ہلکا کیا مگر یہ نہ سمجھے کہ ہمارا کسی حد تک بھی ان روایتوں کو قبول کر لینا منافقین کے منشاء کی تکمیل کے لئے کافی ہے ۔ اور جن روایتوں کو ہم نے چھوڑ دیا ہے کتنے محدثین نے ان کو بھی اپنی کتابوں میں لکھ لیا ہے ۔ اس لئے ہم نے جو کچھ لکھ دیا اس کے دیکھنے کے بعد وہ روایتیں بھی جن کو ہم نے چھوڑ دیا ہے جن کی نظروں سے گذریں گی، کیا وہ ان سب کو ملا کر جب دیکھیں گے تو گھبرا نہ جائیں گے؟ اور مخالفین کے لئے سامان طعن و تشنیع ہم مہیا نہیں کر رہے ہیں؟

دسواں محاذ فصاحت و بلاغت: مفسرین نے اختلاف قرأت کا بہت ذکر کیا ہے اور جتنے لفظی اختلافات منافقین نے قرآنی آیتوں میں پیدا کئے ہیں ان میں سے اکثروں کا ذکر مفسرین نے کیا ہے اور اس طرح ان منافقین کے مذموم مقاصد کی تکمیل نادانستہ ہی سہی مفسرین کے ذریعہ ہوتی رہی ہے اور کیوں نہ ہوتی؟ اگلے مفسرین میں بھی تو بعض لوگ اس جماعت کے تیار کردہ تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ راویان راویات تفسیر میں ایک بڑی جماعت انہیں لوگوں کی تھی جن میں سے بعض اکابر کے مختصر حالات محاذ تفسیر میں انشاء اللہ ذکر کئے جائیں گے۔

ان اختلاف قرأت کا ذکر بعض فقہی مسائل کے سلسلے میں تو آتا ہی ہے صرفی و نحوی بحثوں کے ضمن میں بھی ان کا ذکر آجاتا ہے مگر سب سے زیادہ مغالطہ آمیز ووسوسہ انگیز وہ اختلاف قرأت ہے جو فصاحت و

بلاغت کے ماتحت ہوا یعنی قرأت متواترہ کے سوا جو دوسری قرأتیں منافقین و ملاحدہ کی ساختہ و پرداختہ ہیں، ان میں سے کسی قرأت کے متعلق کسی ماہر فن بلاغت نے لکھدیا ہو کہ یہ قرأت متواترہ سے ابلغ ہے مثلاً فالله خير حفظاً و هو ارحم الرحمين (۱۲/۶۴) کی ایک قرأت حفظاً کی بھی بنائی گئی ہے جس کا ذکر تقریباً اکثر مفسرین نے کیا ہے علامہ ابوالفتح عثمان بن جنیؒ متوفی ۳۹۳ ھ نے اپنی امالی میں حفظاً ہی کی قرأت کو یہاں ابلغ قرار دیا ہے، اور اس کا قیاس زَیدٌ عَدلٌ پر کیا ہے۔

علامہ ابن جنی کی کوئی تفسیر تو متعارف نہیں ہے مگر وہ فن بلاغت کے امام ضرور سمجھے جاتے ہیں، اس لئے ان کا لکھدینا سند سمجھا جاسکتا ہے جو لوگ اختلاف قرأت پر ایمان رکھتے ہیں ان کو کیا ہے، کوئی قرأت شاذہ بھی قرأت متواترہ سے زیادہ بلیغ ہوئی وہ کہدیں گے کہ كل من عند الله سب تو اللہ ہی کی طرف سے ہے۔ اگر ایک قرأت میں دوسری قرأت سے زیادہ بلاغت ہوئی تو کیا حرج ہے مگر جو صرف قرأت متواترہ ہی کو منزل من اللہ سمجھتا ہے اور دوسری سب قرأتوں کو منافقین کا افتراء و بہتان یقین کرتا ہے وہ کس طرح کسی دوسری قرأت کو قرأت متواترہ سے زیادہ بلیغ مان سکتا ہے؟

بات یہ ہے کہ علامہ ابن جنی بہت بڑے ادیب تھے، فن بلاغت کے امام تھے مگر منطق نہیں جانتے تھے، اس لئے قیاس مع الفارق[۱] ہے

---

[۱] ایک چیز کو انسان دوسری چیز پر قیاس کرتا ہے پہلی چیز کو مقیس دوسری چیز کو مقیس علیہ کہتے ہیں۔ دونوں میں مشابہت کا ہونا بہت ضروری ہے جب تک دونوں کے درمیان صحیح مشابہت نہ ہو قیاس صحیح نہیں ہوسکتا جس بات میں مشابہت ہو، اس میں دونوں کے درمیان کوئی ایسا فرق بھی نہ ہو جس کی وجہ سے قیاس غلط ہو جائے، اگر دونوں میں فرق ہو تو اسی کو "قیاس مع الفارق" کہتے ہیں جو صحیح نہیں ہوتا۔

مغالطے میں پڑگئے۔ اول تو یہی کوئی ضروری ہنیں ہے کہ جہاں مبالغے کا مفہوم پیدا کیا جائے وہاں بلاغت بھی پیدا ہو جائے ۔ مبالغہ اور بلاغت کا مادہ ایک ضرور ہے مگر دونوں کے مفہوموں میں کوئی مناسبت باہمی ہنیں ۔ بلیغ تو وہ کلام ہے جو مقتضائے حال کے مطابق ہو فصاحت کے ساتھ ہوسکتا ہے کہ بے ضرورت دبے محل مبالغہ کلام کو غیر بلیغ بنا دے۔ اس لئے زیدٌ عدل " میں مبالغہ کا مفہوم تو ضرور ظاہر ہوتا ہے مگر بلاغت کا مفہوم بھی ہو یہ کوئی ضروری ہنیں۔ اگر ایسے موقع پر کہا گیا ہے جو بالکل حسب حال مقتضائے محل کے مطابق پڑا تو ضرور یہ بلیغ ہے اور ابلغ بھی ہوسکتا ہے ورنہ اگر مقتضائے حال کے خلاف کہنے والے نے کہا ہے تو بھی جملہ کچھ بھی بلیغ ہنیں ابلغ کیا ہوگا۔

اصل یہ ہے کہ عدل مصدر کا صیغہ ہے اور مصادر کا " حمل بالمواطاۃ" کسی ذات پر جائز ہنیں۔ یعنی کوئی صیغہ مصدر اپنے معنی مصدری میں ہرگز ہنیں ہے بلکہ معنی و وصفی کو متضمن ہوکر کسی صیغہ صفت ہی کے

لہ علم منطق کی اصطلاح میں کسی لفظ کو خبر قرار دیکر اس کی نسبت کسی مبتدا کی طرف کرنے کو "حمل" کہتے ہیں۔ اسی لیے خبر کو "محمول" اور "مبتدا" کو "موضوع" کہتے ہیں۔ 'حمل' کی دو قسمیں ہیں ۱۔ "حمل بالمواطاۃ" یعنی کسی لفظ کی نسبت جس طرح وہ ہے بعینہ اسی طرح کسی موضوع کیطرف کی جائے اور وہ محمول کسی مصدر کا مشتق نہ ہو۔ جیسے "انسان" کی نسبت "زیدؔ" کی طرف کیجائے اور کہیں کہ "زیدؔ انسان ہے"۔ ۲۔ "حمل بالاشتقاق" یعنی اسی لفظ کی نسبت کسی موضوع کی طرف بعینہ نہ ہو سکے جب تک اس کا کوئی صیغہ مشتق نہ بنالیں جیسے "عقل" کی نسبت "زید" کی طرف نہیں ہو سکتی جب تک "عقل" کو اسم فاعل نہ بنالیں تو "عاقل" کی نسبت زید کی طرف کریں گے کہ "زید عاقل" یا کوئی دوسرا لفظ "عقل" پر بڑھا کر کہیں کہ "زید صاحبُ عقلٍ" یا "عقل" کو "صاحب عقل" اور "یا ذو عقل" بھی "عاقل" ہی کے معنی میں ہیں، اس لیئے "عقل" کے مشتق ہی ٹھہرے۔

معنی میں آیا ہوگا یا حاصل مصدر یا اسم صریح کے معنی میں ہوگا۔

"میر زاہد ملا جلال" کے شروع ہی میں للمصدر ستۃ معان کی بحث مشہور ہے (یعنی مصدر کے چھ معنی ہیں) ان چھ معنوں میں سے اسم فاعل ہی کے معنی یہاں چسپاں ہوسکتے ہیں۔ یعنی "زیدٌ عدلٌ" کو زیدٌ عادل کے معنی میں سمجھا جائے۔ مگر یہ مجاز "فی الطرف" ہے جس میں کوئی خاص شان بلاغت نہیں کیونکہ معنی فاعلی کے لئے اسم فاعلی کا صیغہ تو موجود ہی ہے۔ جب وہی معنی لینا ہیں تو پھر مصدر کو اسم فاعل کے معنی میں مستعار لینے کی کیا ضرورت ہے۔ باقی پانچ معنیوں میں سے معنی مصدری معروف و مجہول، اسم مفعول اور حاصل مصدر مجہول کے چار معنی بھی یہاں کوئی معنوی مناسبت نہیں رکھتے اس لئے ان میں سے بھی یہاں کوئی معنی مراد نہیں لئے جاسکتے۔ رہ گیا حاصل مصدر معروف تو مجازاً یہاں اس کے معنی ضرور لئے جاسکتے ہیں اور اس کو "مجاز فی النسبۃ" کہتے ہیں تو اگر عَدلٌ کو بمعنی حاصل مصدر ایک اسم صریح قرار دے کر زید کی طرف منسوب کیا گیا تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ زید ہمہ تن سراپا عدل ہے مجسم عدل ہے۔ اسی اعتبار سے اس میں مبالغے کا مفہوم پیدا ہوا اور اگر مقتضائے حال کے مطابق کہا گیا ہے تو یہ ابلغ بھی ہے۔

صحیح اصول یہ ہے کہ مسندالیہ کی نوعیت کے مطابق حمل کی نوعیت ہوگی۔ مسند الیہ خود اگر کوئی مفہوم مصدری ہے تو اس کی طرف کسی دوسرے مفہوم مصدری کی اسناد بخوبی کی جاسکتی ہے۔ جیسے ان الشّرک لظلم عظیم[۱۴۸] "شرک" ایک مصدر ہے جو معنی مصدری ہی میں آیا ہے اور "ظلم" بھی مصدری ہے اور اس کے معنی مصدری ہی کا حمل "شرک" پر کیا گیا ہے۔

اور مسندالیہ اگر مفہوم مصدری کے سوا کوئی دوسرا مفہوم یا کوئی دوسری چیز ہو اور محمول مصدر کا صیغہ صفت اس مصدر سے معنی مصدری کے سوا باقی پانچ معنوں میں سے کوئی معنی جو مناسب مقام نظر آئیں لئے جائیں گے۔ جیسے هذا تاویل رو یائی- تاویل مصدر ہے مگر یہاں حاصل مصدر مجہول کے معنی میں آیا ہے۔ یعنی هذا ماأول به رو یای اور انه لقول فصل میں قول مصدر ہے لیکن اسم مفعول یعنی مقول کے معنی میں آیا ہے۔ اور فصل بھی مصدر ہی ہے مگر اسم فاعل یعنی فاصل (بین الحق و الباطل) کے معنی میں آیا ہے۔

اور جب مسندالیہ کوئی شخص کوئی ذات ہو اور کسی مصدر کا حمل اس پر بالمواطاۃ ہوا ہو تو وہ اسم فاعل یا اسم مفعول کے معنی میں مجاز فی السرف کی رو سے ہوگا۔ یا کسی ایسے معنی میں ہوگا جو معنی فاعل و مفعولی سے قریب ہو، اور مفہوم وصفی کو متضمن ہو۔ جیسے فرمایا گیا ہے و انه لعلم للساعة [۴۳/۶۱] وہ قیامت کی ایک علامت ہے۔ علم مصدر ہے مگر یہاں اسم آلہ کے مفہوم میں آیا ہے یعنی جس طرح عالم کو اسم آلہ کہتے ہیں کہ مایعلم به الصانع کے معنی میں ہے اسی طرح یہاں علم بمعنی علامت ہے مایعلم به الشئی کے معنی میں۔ (یہ معنی میرزاہد والے چھ معنوں کے علاوہ ہیں ساتویں معنی۔ مگر وہ چھ قیاسی معانی ہیں اور یہ سماعی اسی لئے اس کا ذکر میر زاہد نے نہیں کیا۔) مگر درحقیقت یہاں علم بمعنی حاصل مصدر مجہول ہے اسی لئے ماتعلم به الساعة کے معنی میں ہے جس کو بمعنی اسم آلہ کہا گیا۔ اس لئے یہ بھی ان چھ معنوں میں داخل ہے۔

غرض مصدر کا حمل کسی ذات پر بالمواطاہ ہو تو وہ مجازاً ہی ہوگا۔ معنی مصدری میں نہیں ہوسکتا۔ اگر کسی صیغہ صفت کے معنی میں ہو تو مجاز فی الطرف ہے اور اگر حاصل مصدر کے معنی میں ہو تو چونکہ حاصل مصدر کی حیثیت ایک اسم صریح کی سی ہوتی ہے اسی لئے وہ مجاز فی النسبۃ کہا جائے گا جس کو مجاز فی الاسناد، مجاز عقلی اور مجاز حکمی بھی کہتے ہیں اور مجاز فی الاسناد مجاز فی الطرف سے ابلغ ہے۔ اگرچہ یہاں بھی مفہوم کسی صیغہ صفت ہی کا پیدا ہوتا ہے کیونکہ جب تک محمول میں وصفی حیثیت نہ ہو اس وقت تک اس کا حمل کسی ذات پر نہیں ہوسکتا۔

اتنی تفصیل کے بعد "زیدٌ عدلٌ" پر غور کیجئے کیونکہ اللّٰہ خیر حفظا[۹۲/۱۲] کو اسی پر قیاس کیا گیا ہے اور اسی قیاس مع الفارق پر علامہ ابن جنی کی غلط فہمی کی بنیاد ہے تو اس مہم کو سر کرنے کے لئے ذیل کے نمبروں پر نگاہ غور ڈالئے۔

(۱) مصدر کا حمل بالمواطاۃ کسی ذات کسی شخص پر جائز نہیں۔

(۲) اگر کسی مصدر کا حمل بالمواطاۃ کسی ذات پر کیا گیا ہو تو وہ مصدر کسی صیغۂ صفت ہی کے مفہوم میں یا اسم صریح کے معنی میں ہوگا۔

(۳) "زیدٌ عدلٌ" میں "عدلٌ" مصدر ہے اور یہاں مفہوم فاعلی کے سوا کسی اور مفہوم میں نہیں سمجھا جاسکتا۔ چاہے وہ مفہوم فاعلی جس طرح بھی ادا ہو۔

(۴) اگر "زیدٌ عدلٌ" میں "عدل" اسم فاعل یعنی عادل ہی کے معنی میں ہے تو پھر "عادل" کے متعارف لفظ کو چھوڑ کر جو معنی فاعلی ہی کے لئے وضع کیا گیا ہے، خواہ مخواہ صیغہ مصدر کو مستعار لینے کا کیا فائدہ؟ خصوصاً جب اپنی خاص چیز سے کچھ زیادہ خوبی شئی مستعار میں نہ ہو۔

کہن جامۂ خویش پیراستن به از جامۂ عاریت خواستن

ان چار نمبروں پر غور کر لینے کے بعد یہ ماننا پڑے گا کہ "عادلٌ" کے لفظ سے عدول کر کے "عدل" کا لفظ "عادل" ہی کے معنی میں نہیں لایا گیا ہے بلکہ یہاں "عدل" بمعنی حاصل مصدر معروف بطور اسم صریح آیا ہے اور "زیدٌ عدلٌ" سے مراد یہ ہے کہ زید مجسم عدل ہے "ہمہ تن عدل ہے، سراپا عدل ہے اور اسی حیثیت سے اس میں مبالغہ بھی پیدا ہوا اور یہ ابلغ بھی ہے۔

اب اللہ خیر حفظاً پر غور فرمایئے ۔ لیکن "زیدٌ عدلٌ" کی مذکورہ بالا بحث کو پیش نظر رکھ کر۔ سب سے پہلی بات تو یہی ہے کہ عدل کا حمل ہے زید پر اور یہاں اللہ پر حفظ کا حمل ہی نہیں ہے اس لئے "زید عدل" پر اللہ خیر حفظا کا قیاس ہی صحیح نہیں یہاں خیر کا حمل ہے جس میں خود وصفی مفہوم اس لئے اضافہ مفہوم افضلیت موجود ہے، اگرچہ یہ شر کے مقابلے میں ایک اسم صریح ہے اس لئے یہاں اس کا حمل بالمواطاہ صحیح ہے۔ حافظا یا حفظا یہاں اس کی تمیز ہے اور تمیز مصدر بمعنی مصدری، معروف و مجہول و بمعنی حاصل مصدر معروف و مجہول و بمعنی اسم فاعل و اسم مفعول سب آسکتے ہیں اور بذات خود اسم فاعل و اسم مفعول وغیرہ بھی تمیز بن کر آسکتے ہیں یہاں خیر کے لفظ سے مبالغے کا مفہوم پیدا ہی ہو رہا ہے اس کے لئے مصدر کو تمیز بنانے کی ضرورت ہی نہیں اور نہ وہ چار وجوہ یہاں پائے جاتے ہیں جو عدل کے حمل میں پائے جاتے تھے ۔ غرض جن وجوہ کی بنا پر "زید عدل" میں باعتبار زیدٌ عادل" کے ابلغیت آئی ہے ان میں سے کوئی وجہ بھی اللہ خیر حفظا میں نہیں پائی جاتی ۔ اس لئے اللہ خیر حفظا

کا قیاس "زید عدل" پر کسی طرح بھی صحیح نہیں ہو سکتا۔

تمیز کی بحث: | تمیز مصدر سے بھی آسکتا ہے، حاصل مصدر بھی، اسم فاعل بھی، اسم مفعول بھی اور اسم صریح بھی۔ اور اپنے اپنے موقع پر ہر چیز ابلغ ہو سکتی ہے اگر تمیز کا حمل غیر ذوی العقول بلکہ غیر ذی روح پر ہو تو تمیز مصدر یا حاصل مصدر بخوبی آسکتی ہے اور یہی زیادہ مناسب ہے جیسے "احسن تفسیرا" اور "احسن تاویلا" وغیرہ۔ اور اگر تمیز کا حمل ذوی العقول پر ہو تو حاصل مصدر یا اسم صریح یا کوئی صیغۂ صفت زیادہ مناسب ہے جیسے احسن عملا اور احسن املا کہ یہاں عمل و امل بمعنی حاصل مصدر ہیں "کام" اور "امید" کے معنی میں اور بطور اسم صریح آئے ہیں اسی طرح اصدق قیلا اور احسن قولا میں قیل و قول مصدری معنی میں نہیں ہیں بلکہ بمعنی سخن و کلام ہیں۔

یہاں کون ابلغ ہے؟ | یہ تو معلوم ہوگیا کہ اللہ خیر حفظا کا قیاس "زیدٌ عدلٌ" پر کسی طرح بھی صحیح نہیں اور یہ بھی معلوم ہوگیا کہ تمیز مصدر بھی آسکتی ہے اور اسم فاعل وغیرہ بھی تو جب حفظا بھی صحیح و فصیح ہے اور حافظا بھی تو یہاں مقتضائے حال کے مطابق کون سی ترکیب ہے؟ یہاں تو معنی حقیقی مراد ہیں۔ یہاں تو اسناد مجازی نہیں ہے کہ مجاز فی الطرف اور مجاز فی النسبۃ کا فرق پیدا کرکے حاصل مصدر کے حمل کو فاعل کے حمل سے ابلغ کہا جائے۔ یہاں تو ممیز و تمیز کی ترکیب ہے، حمل ہی سرے سے نہیں ہے۔

لہ یہاں اسم مفعول کے معنی بھی لیئے جا سکتے ہیں خیراً مولا۔ یعنی مایومل بہ (تمنا)

کلام بلیغ کی تعریف تو یہی ہے کہ مقتضائے حال کے مطابق ہو ۔ مناسب مقام و محل ہو تو دیکھئے کہ یہ محل حافظا کا ہے یا حفظا کا؟ مقتضائے حال معلوم کرنے کے لئے سیاق و سباق دیکھنے کی ضرورت ہے یہ قول حضرت یعقوب علیہ السلام کا نقل کیا گیا ہے ۔ تو دیکھئے کہ حضرت یعقوبؑ نے حافظا کہا ہوگا یا حفظا؟ سیاق کلام کیا کہتا ہے؟

حضرت یعقوبؑ کے پاس ان کے بیٹے حضرت یوسفؑ کے پاس سے آتے ہیں اور اپنے چھوٹے بھائی کو اپنے ساتھ لیجانے کی اجازت باپ سے مانگتے ہیں اور چھوٹے بھائی کی حفاظت کا وعدہ کرتے ہیں کہتے ہیں و اناله لحفظون ۔ ہم لوگ اس کے حافظ و نگہبان رہیں گے ۔ اسی کے جواب میں حضرت یعقوبؑ نے ان بیٹوں سے کہا کہ کیا ہم اس کے متعلق بھی تم پر بھروسا کریں جس طرح اس کے بھائی کے متعلق تم پر بروسا کیا تھا؟ (کیا تم اس کے حافظ ہوگے) فالله خیر حفظاً و هو ارحم الراحمین پس اللہ بہتر حافظ و نگہبان ہے اور وہ سب مہربانوں سے زیادہ مہربان ہے اس سیاق عبارت کو دیکھئے ان لوگوں نے انا له لحافظون کہا تھا۔ اس کے جواب میں سیاق عبارت کا تقاضا یہی ہے کہ یہاں خیر حافظاً ہی ہو ۔ اسی لئے دو قرائتیں اور بھی گھڑی گئی تھیں خیر حافظ کی مگر اس کی رکاکت واضح تھی اسی لئے یہ چلی نہیں ۔ تو خیر الحافظین کی قرأت بنائی گئی خیر الراحمین اور خیر الغافرین کے وزن پر مگر یہاں اس کا بھی محل نہیں اس لئے کہ اگر خیر الحافظین کہتے تو ان لوگوں کے حافظ ہونے کا انکار ثابت نہ ہوتا بلکہ ان کے حافظ ہوتے ہوئے اللہ کے بہتر حافظ ہونے کا بیان ہوتا اور یہاں تو پہلے ان پر الزام دیا ہے اور ان کو پہلے تجربے کی بنا پر ناقابل اعتماد قرار دیا ہے اس لئے یہ مقام یہ کہنے کا ہے کہ صرف اللہ

بہتر حافظ ہے۔ حافظین، جو حفاظت کا وعدہ کر رہے تھے ان کے حافظ ہونے سے انکار بھی مقصود ہے اور یہ بات خیر حافظاً ہی سے نکل سکتی ہے تو جو بات سیاق و سباق عبارت کے خلاف ہو وہ تو بلیغ بھی نہیں ہو سکتی ابلغ کیا ہوگی۔ بلیغ و ابلغ وہی قول ہوسکتا ہے جو نظم عبارت کے مطابق ہو ۔ جو سیاق و سباق کے لحاظ سے موزوں تر ہو اور مقتضائے حال کے موافق ہو اور وہ یہاں خیر حافظاً ہی ہے ۔

مصدر سے صدور فعل کا امکان ہی ثابت ہوگا۔ حفظ بمعنی حافظیت سے اتنا ہی ثابت ہوگا کہ حفاظت کرنے میں یا حافظ ہونے کی حیثیت سے وہی بہتر ہے یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ جس پر اس مصدر کا حمل ہو اس سے صدور فعل ہو بھی جائے ۔ مجھ کو یاد آتا ہے کہ میر زاہد ملا جلال میں اس مضمون کو بھی واضح کیا ہے کہ فاعل کے لئے صدور فعل زمانہ ماضی میں معنی حقیقی کے اعتبار سے ضروری ہے ۔ اگر صرف آئندہ صدور فعل کی امید پر کسی کو فاعل قرار دیا جائے تو یہ مجازاً ہوگا حقیقتاً نہ ہوگا۔ اور ظاہر ہے کہ معنی حقیقی میں جو قوت ہے وہ معنی مجازی کو کہاں نصیب ؟ اسی لئے خیر حفظا میں حفاظت بالفعل کا مفہوم ضروری نہیں۔ حفاظت بالقوہ کے اعتبار سے بھی خیر حفظا کہا جاسکتا ہے ۔ مگر فاعل میں چونکہ معنی حقیقی کے اعتبار سے صدور فعل بزمانہ ماضی ضروری ہے اس لئے خیر حافظا سے معنیٰ مراد ہوں گے کہ "فی کل زمان" یعنی ہر زمانے میں۔ زمانے ماضی میں صدور حفظ کو " حافظ " کے معنی حقیقی کے اعتبار سے ضروری ہی ہے۔ زمانۂ مستقبل کے لئے کہا ہی جا رہا ہے ۔ درمیان میں زمانۂ حال کیوں مستثنی رہے گا؟ غرض بہر حال خیر حافظا ہی کی قرأت دوسری تمام قرآتوں سے ابلغ ہے۔

شاید کوئی یہ کہے کہ حفظاً کی قرأت رسم خط کے مطابق ہے اور حافظاً کی قرأت رسم خط کے مطابق نہیں کیونکہ حائے حطی کے بعد الف لکھا ہوا نہیں ہے تو پھر خواہ مخواہ حائے حطی کو کھڑا زبر دے کر حافظا کیوں پڑھا جائے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ایسا وہی کہے گا جو نہ قرآن کی رسم خط سے واقف ہے نہ سیاق و سباق کو دیکھتا ہے۔ میں یہ بتا چکا ہوں کہ یہ جواب ہے وانا له لحفظون ۹/۱۵ کا وہاں بھی حائے حطی کے بعد الف نہیں ہے بلکہ حائے حطی کو کھڑا زبر ہی دے کر حافظون ہر شخص پڑھتا ہے کسی نے بھی وہاں حفظون نہیں پڑھا ہے۔ تو جس طرح کھڑے زبر ہی کے ذریعے بغیر الف کے حفظون کو حافظون پڑھا ہے اسی طرح یہاں بھی کھڑے زبر ہی کے ذریعے بغیر الف کے حفظا کو حافظا پڑھنا ہوگا۔ تاکہ سوال و جواب یکساں رہے۔ آخر الرحمین کی رائے مہملہ کو تو یہیں پر کھڑے زبر ہی کے ذریعے راحمین پڑھتے ہیں ۔ یہ تو قرآن کی عام رسم خط ہے۔ بسم اللہ میں بھی الرحمن میں رب العلمین کے العلمین میں کھڑا زبر ہی الف کا کام دے رہا ہے۔

البتہ یہ سوال پیدا ہوگا کہ تو پھر خلاف سیاق و سباق یہ قرأت کیوں بنائی گئی؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن مجید کی صحیح و متواتر قرأت کے سوا دوسری قرأتوں کے گھڑنے کی غرض تو یہ تھی کہ یہ دکھایا جائے کہ قرآن میں اختلافات بہت ہیں اور یہ جو فرمایا گیا ہے کہ ولو کان من عند غیر الله لوجدوا فیه اختلافا کثیرا - اگر یہ قرآن (اللہ کی طرف سے اترا ہوا نہ ہوتا) کسی غیر اللہ کی طرف سے ہوتا تو لوگ اس میں بہت اختلاف پاتے (۴/۸۲) اس دعوے کو غلط ثابت کر دکھایا جائے ۔ چنانچہ معنوی اختلافات کثیرہ کے لئے مختلف و متضاد تفسیری روایتیں بنا ڈالیں

کہ ایک ایک آیت دس دس متبائن و متضاد معانی پیدا کرے اور لفظی اختلافات دکھانے کے لئے اختلاف قرأت کا ایک انبار لگا دیا۔

دوسری غرض یہ بھی تھی کہ معلوم ہو کہ لوگوں کو قرآن یاد نہ تھا۔ بغیر زیر زبر اور بلا لفظوں کے مصاحف کو دیکھ کر جس نے جیسا سمجھا ویسا پڑھا اور پھر جب حرکات وغیرہ سے الفاظ بدل گئے تو کچھ نہ کچھ معانی کا فرق بھی ضرور نکل آئے گا اور بعض جگہ افترائی مفہوم بھی نکالے جاسکیں گے جیساکہ یہاں حفظا کی قرأت گھڑ کر ایک نہایت خبیث مفہوم پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے وہ یہ کہ جب یہ معلوم ہوگیا کہ حفظا یہاں اسم فاعل کے معنی میں آسکتا ہے اگر مصدر معروف یا حاصل مصدر معروف کے معنی میں بھی لیا گیا جب بھی کہا جائے کہ اس وقت بھی وہی فاعل ہی کا مفہوم رہا کیونکہ مصدر معروف و حاصل مصدر معروف کی نسبت فاعل ہی کی طرف ہوتی ہے یا یہاں حفظا اسم مفعول کے معنی میں آسکتا ہے۔ اگر مصدر مجہول یا حاصل مصدر مجہول کے معنی میں لیا گیا ۔ جب بھی اسم مفعول ہی کا مفہوم رہے گا ۔ کیونکہ مصدر مجہول و حاصل مصدر مجہول کی نسبت در اصل مفعول ہی کی طرف ہوا کرتی ہے۔ غرض دو ہی صورتیں ہیں، یہاں حفظا کو حافظاً کے معنی میں لیجئے یا محفوظاً کے معنی میں تو اب دیکھنا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ حافظ ہونے کی حیثیت سے زیادہ بہتر ہے یا محفوظ ہونے کی حیثیت سے ؟ اللہ تعالیٰ کا محفوظ ہونا تو سب کے نزدیک ہر طرح مسلم ہے کہ اللہ تعالیٰ کو کوئی فنا نہیں کرسکتا ، قتل نہیں کرسکتا اس کو موت نہیں آسکتی، وہ بیمار نہیں پڑسکتا ، اور اس کو کسی طرح کا کوئی صدمہ کوئی رنج والم ، کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ اس لئے اس کا ہر طرح محفوظ ہونا مسلم ہے ۔ تو اگر خیر حفظاً کے معنی خیر محفوظاً لیجئے تو بالکل صحیح

ہے ، اس میں کسی کو کسی شک و شبہ کی مطلق گنجائش نہیں ، مگر خیر حفظا کے معنی اگر خیر حافظا لیجئے تو دیکھنا یہ ہے کہ یہ واقعے کے کہاں تک مطابق ہے ۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ سے وعدہ کیا کہ **و اللہ یعصمک من الناس** - اللہ تجھ کو لوگوں (کے حملوں سے) محفوظ رکھے گا (۵/۶۷) باوجود اس وعدے کے جنگ احد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کافی زخمی ہوکر گر گئے ۔ یہاں تک کہ آپؐ کی وفات کی افواہ پھیل گئی ۔ بس صرف اتنی حفاظت کی گئی کہ آپؐ کی جان بچ گئی، شہید نہ ہوئے ۔ تو یہ پوری حفاظت نہ ہوئی ، بہتر حفاظت کیا کہی جاسکتی ہے ۔ بہتر حافظ کی تو بہتر حفاظت ہونی چاہیئے تھی۔

اسی طرح قرآن مجید کی حفاظت کا وعدہ کیا گیا مگر قرآن کی کتنی آیتیں ایسی تھیں جو بعض شہدائے جنگ یمامہ ہی کو یاد تھیں نہ کسی دوسرے کو یاد تھیں نہ کسی کے پاس لکھی ہوئی تھیں، وہ شہید ہوگئے تو ان کے ساتھ وہ آیتیں بھی شہید ہوگئیں ۔ جو اب کسی طرح بھی نہیں مل سکتیں۔ بعض آیتیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے کچھ پہلے اتری تھیں جو پتوں پر لکھ لی گئیں جن کو بکری کھا گئی۔ پھر اللہ جانے کتنی آیتیں الٹ پلٹ ہوگئیں، کتنے الفاظ کم و بیش ہوگئے، کتنی حرکتیں بدل گئیں۔ تو جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کی گئی تھی اسی طرح قرآن کی بھی حفاظت کی گئی۔ بس اسی قدر کہ قرآن کا ایک بڑا حصہ محفوظ ہے جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کچھ زخموں سے، دندان مبارک کی شہادت سے اور چوٹ کی تکلیف سے محفوظ نہ رہے ، اسی طرح قرآن بھی بعض حصوں کے ضائع ہو جانے سے محفوظ نہ رہا۔ وعدہ حفاظت جس طرح ایک حد تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ پورا اترا اسی

طرح قرآن کے ساتھ بھی ایک حد تک پورا اترا مگر اس سے اللہ تعالیٰ کو بذات خود کوئی نقصان نہیں پہنچا کیونکہ وہ خیر فی المحفوظیۃ اور خیر محفوظاً ہے۔ اگر خیر فی الحافظیۃ اور خیر حافظا ہوتا تو وہ ضرور اپنے رسولؐ کی پوری حفاظت کرتا اور بہتر حفاظت کرتا کہ وہ ذرا بھی زخمی نہ ہوسکتے ان کو کسی طرح کا صدمہ نہ پہنچ سکتا اسی طرح قرآن کی بھی پوری حفاظت کرتا کہ اس کا کوئی حرف بھی ضائع نہ ہوسکتا اور اس میں کسی طرح کی کمی بیشی یا رد و بدل نہ ہوسکتا۔

جنگ احد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زخمی ہونے کی حقیقت:۔

یہ مقصد تھا خیر حفظا کی قرأت گھڑنے کا، جس کی تہ میں در حقیقت وعدہ حفاظت قرآن کو کمزور کرنے کا مقصد خبیث پنہاں تھا اسی کی پیش بندی کے لئے یہ قصہ تصنیف کر لیا گیا تھا کہ جنگ احد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کافی مجروح ہوگئے تھے یہاں تک کہ آپؐ کے دو دندان مبارک بھی شہید ہوگئے تھے اور سر مبارک میں خود کی کڑی دھنس گئی تھی اور اس من گھڑت واقعے کو اتنی رنگ آمیزیوں کے ساتھ احادیث و تواریخ و سیر کی کتابوں میں لوگ درج کرتے رہے کہ یہ ایک یقینی و قطعی واقعہ سمجھا جانے لگا۔ حالانکہ خیال کرنا تھا کہ اگر واقعی آپؐ بنفس نفیس اس قدر زخمی ہوئے ہوتے تو یقیناً آپؐ کی تسلی و تشفی کے لئے قرآن مبین میں کچھ آیتیں اتری ہوتیں اور آپؐ کے زخمی ہونے کا ذکر قرآن مبین میں ضرور ہوتا۔

در حقیقت جنگ احدؔ میں آپؑ کے مجروح ہونے کا واقعہ دو مقصد کے

لہ جنگ احد میں فتح کے بعد مجاہدین سامان مشرکین کے بٹورنے میں مصروف ہو گئے اور اپنے آلات حرب کنارے رکھ کر دشمنوں کی طرف سے بالکل مطمئن اور غافل ہو گئے اور گھاٹی پر جو کچھ محافظ مقرر کئے گئے تھے وہ یہ دیکھ کر اب تو جنگ ختم ہو گئی اور پوری فتح حاصل ہو گئی اب یہاں رکے رہنے کی کیا ضرورت ہے۔ اگرچہ بعض اہل فہم محافظین نے کہا کہ جب رسول اللہ صلعم نے ہم لوگوں کو یہاں متعین کر دیا ہے تو بلا اجازت یہاں سے ہٹنا نہیں چاہئے مگر اکثریت ناتجربہ کاروں کی تھی اس لیئے ان لوگوں نے یہی رائے قائم کی کہ حکم حالت جنگ کے لیئے تھا جنگ تو ختم ہو گئی اب یہاں رُکے رہنے کی کوئی ضرورت نہیں غرض یہ رائے قائم کرکے تنے چند کے سوا باقی سارے محافظ گھاٹی چھوڑ کر میدانِ جنگ میں اُتر آئے اور آلات حرب رکھ کر وہ سب بھی مشرکین کا سامان لوٹنے لگے کہ اچانک مشرکین کی فوج کا وہ حصہ جو اس گھاٹی کی طرف تھا اور ان محافظین کیوجہ سے آگے نہیں آسکتا تھا آگے بڑھا اور جو تنے چند محافظین وہاں رہ گئے تھے ان سبھوں کو قتل و شہید کرکے میدان جنگ تک پہنچ گیا اور غافل مسلمانوں پر اچانک ٹوٹ پڑا مسلمان اس وقت نہتے بغیر آلات حرب کے تھے کوئی آلات حرب کی طرف دوڑا کوئی مارا گیا۔ کوئی ادھر کوئی اُدھر۔ غرض عالم انتشار و اضطراب میں سبکے سب پڑ گئے لوگوں میں بھاگ دوڑ ہے۔ تحاشا ایسی تھی کہ لوگوں کے دھکے سے آپ گر گئے اور کچھ دوسرے لوگ بھی آپ پر گرے کچھ مقتولین بھی اور کچھ زخمی بھی یہاں تک کہ آپ ان لاشوں میں چھپ گئے۔ مشرکین آپ کی تلاش میں تھے جب آپ کو میدان میں نہیں پایا تو سمجھے کہ وہ بھی قتل ہی ہو گئے اور انہیں لاشوں کے انبار میں کہیں ہوں گے یہ سمجھ کر بعض مشرکین نے شور مچا دیا کہ آپ مارے گئے عبداللہ بن قمۂ حارثی نے اپنی نام آوری کے لیے لوگوں سے کہہ دیا کہ میں نے ان کو مار ڈالا۔ اس شور کو مسلمانوں نے سنا تو مسلمانوں کو بڑا قلق اور صدمہ ہوا گویا ان پر غم و الم کا ایک پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ مشرکین یہ سمجھے کہ جو اصل باعث جنگ تھے وہ تو مارے ہی گئے اب جنگ کی کیا ضرورت ہے اس لیئے وہ رک گئے مسلمان تو بے سروسامان تھے ہی یہ غم و الم میں چور

ماتحت گھڑا گیا اور مشہور کیا گیا۔ ایک تو وعدہ الہٰی کو جھوٹا یا کم سے کم کمزور ثابت کرنے کے لئے۔ دوسرے اس لئے کہ قرآن مجید کے وعدہ حفاظت کو

سوچ میں پڑ گئے۔ غرض اس طرح جنگ رک گئی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لاشوں کو کسی طرح اپنے جسم مبارک سے سرکا کر اس انبار کے نیچے سے نکلے تو آپ نے آواز دی، مسلمانوں نے جو آپ کی آواز سنی تو سب کے سب دوڑے اور آپ سے لپٹ گئے اور اس شمع ہدایت پر پروانہ وار فدا ہونے لگے۔ جنگ رک ہی چکی تھی مشرکین کے بھی کافی لوگ مارے جا چکے تھے ان میں بھی اب کمر کھول دینے کے بعد پھر لڑنے کی طاقت نہیں رہی تھی، بلکہ ان میں سے اکثر میدان سے ہٹ کر مکہ کی راہ لے چکے تھے مسلمان تو فتح کے بعد یہ صورت حال دیکھ کر ہی دم بخود تھے۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو زندہ صحیح وسلامت پا کر اس تکلیف کا سارہ صدمہ بھول گئے اگر آپؐ حکم دیتے تو پھر سب کے سب اسی وقت کفّار کا پیچھا کرتے مگر آپؐ نے بھی اس وقت مصلحت یہی دیکھی کہ اب پھر جنگ جاری نہ رکھی جائے۔

غرض اس سے زیادہ کوئی بات نہ تھی، اسی پر آنحضرت صلعم کے زخمی ہو جانے دندان مبارک کے شہید ہو جانے خود کی کڑی کے سر میں دھنس جانے اور آپ کے لہولہان ہو جانے کا اضافہ منافقین عجم کی طرف سے ہوا ہے اور اس سلسلے میں متعدد ایسی ایسی روایتیں بنائی گئیں جن سے آپؐ کے زخمی ہو جانے کا واقعہ صحیح سمجھا جائے۔ اور محدثین و مفسرین و مورخین نے ان سب مکذوبہ روایتوں کو اپنی کتابوں میں درج کر لیا۔ ان بزرگوں نے راویوں پر اعتماد کیا اور یہ خیال نہ کیا کہ ان روایتوں کو وعدۂ حفاظت نبوی جو اللہ تعالےٰ نے کیا ہے اس کی تکذیب کے لیئے منافقین نے گھڑا ہے اور اس وعدے کی تکذیب کے پردے میں وعدہ حفاظتِ قرآن مجید کی توہین و تکذیب بھی مقصود ہے۔ بلکہ اصل مقصود یہی ہے اسی مقصد کے لیئے آپ کے زخمی ہو جانے کا قصہ بنایا گیا۔

واللہ المستعان علی ما یصفون!

بھی اسی پر قیاس کر کے کمزور و مشکوک ثابت کیا جاسکے اور قرآن کے بعض حصوں کے ضائع ہو جانے کی جو روایتیں یہ لوگ بیان کریں اور اس وقت کوئی قرآن کی حفاظت کے متعلق وعدہ الہیٰ پیش کرے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کا وعدہ اور اس کے باوجود آپؐ کے سخت زخمی ہونے کا واقعہ اور آپؐ کے بعض حصہ بدن یعنی دندان مبارک کے توڑ دیئے جانے کا حال بیان کر کے یہ کہا جاسکے کہ جیسا وعدہ حفاظت اللہ نے اپنے رسولؐ کے ساتھ کیا تھا اور جس طرح اس وعدے کو پورا کیا ویسا ہی وعدہ اپنی کتاب کی حفاظت کا بھی کیا اور اسی طرح اس وعدے کو بھی پورا کیا۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس حفظا کی قرأت کے پردے میں اللہ تعالیٰ، اللہ کے رسولؐ، اللہ کی کتاب، سب کی مخالفت کا پورا سامان پوشیدہ رکھا گیا ہے اور ان تمام مخالفتوں پر گہرا پردہ ڈالنے کے لئے اس حفظا کی قرأت کے ساتھ خیر حافظ اور خیر الحافظین کی قرأت بھی لکھدی گئی مگر یہ دونوں رسم خط کے مخالف بھی ہیں اور بلاغت میں کمزور اس لئے ہیں کہ ممیز و تمیز کی ترکیب میں ابہام کے بعد جو توضیح آتی ہے وہ ایک طرح سے مفید حصر ہو جاتی ہے، اور یہ بت ترکیب اضافی میں نہیں ہے اور یہاں ضرورت تھی مفہوم حصر کی۔ کیونکہ حصر میں دوسروں کا انکار ہوتا ہے تو گویا حضرت یعقوبؑ نے فاللہ خیر حافظا کہہ کر بیٹوں کے دعویٰ انا لہ لحفظون کا درپردہ انکار بھی کر دیا۔ غرض جو بلاغت فاللہ خیر حافظا میں ہے وہ اس کے سوا کسی دوسری ترکیب میں اس جگہ آ ہی نہیں سکتی۔ علامہ جنی نے معلوم نہیں کس سطحی نظر سے دیکھا کہ ان کو حفظا ہی کی قرأت میں ابلغیت نظر آئی۔

افسوس ہے کہ یہ بحث بہت طویل ہو گئی اور عام ناظرین کو ممکن ہے کہ الجھن سی محسوس ہو مگر میں نے اس کی ضرورت محسوس کی اس لئے اس قدر لکھ گیا ناظرین معاف فرمائیں۔

اعجاز القرآن

حصہ سوم

محاذِ تفسیر

محاذ تفسیر

یہ ایک بہت اہم محاذ ہے جو قرآن مجید کے
خلاف قائم کیا گیا اس محاذ کے ماتحت بھی متعدد ضمنی محاذ ہیں مثلاً "محاذ شان نزول" "محاذ وقف و وصل" "محاذ تقدم و تاخر نزول" "محاذ اسرائیلیات" وغیرہ میں نے اپنے دوسرے مضامین میں محاذ شان نزول اور محاذ وقف و وصل کو محاذ تفسیر سے الگ مستقل طور سے لکھا ہے مگر اس وقت چونکہ محاذ قرأت کے سوا دوسرے محاذوں کا ذکر محض تعارفی طور سے ضمناً کر رہا ہوں اور کسی دوسرے محاذ پر مفصل گفتگو اس وقت مقصود نہیں ہے اس لئے بنظر اختصار "محاذ شان نزول کو بھی محاذ تفسیری کے ساتھ بیان کر رہا ہوں۔ اور محاذ وقف و وصل کی ایک مثال سورہ یوسف کی آیت و ھمت بہ و ھم بھالو لا ان رای برھان ربہ کی کسی دوسرے محاذ کے ضمن میں گذر چکی ہے۔ (القرآن ۱۲: ۲۴)

مثال نمبر ۱ آیہ تطہیر: منافقین کی ایک جماعت نے جو ایک محاذ تفسیر کا بھی قرآن مجید کے خلاف قائم کیا اس کا مقصد یہ تھا کہ قرآن مجید کی آیات کا جو صحیح مفہوم ہے اس کے خلاف مفہوم پیدا کرکے لوگوں کے سامنے پیش کیا جائے مگر یہ کام بہت مشکل تھا کیونکہ ایک فصیح و بلیغ عبارت کا مفہوم قائل کے منشاء کے خلاف بیان کرنا جس کو سننے والے اور پڑھنے والے قبول کر لیں کھیل نہیں ہے۔ آخر ان مقامات کو دوسرے لوگ بھی تو پڑھتے ہیں، وہ لوگ بھی تو عربی زبان سے پوری طرح واقف ہیں وہ ایک آیت کی عبارۃ النص کے خلاف کوئی مفہوم کیوں ماننے لگے ؟ تو اس

کے لئے شان نزول کی روایتیں گھڑیں۔ یعنی پہلے ایک ایسا واقعہ تصنیف کیا جس پر کسی آیت کو چسپاں کیا جاسکے۔ پھر اس آیت کو اسی واقعے سے متعلق کر کے یہ مشہور کیا کہ یہ آیت فلاں واقعے کے وقت اتری تھی اور اس کے مفہوم کا تعلق اسی واقعے سے ہے۔ مثلاً سورۃ احزاب کے چوتھے رکوع کی چھٹی آیت : و قرن فی بیو تکن و لا تبرجن تبرج الجاھلیۃ الا ولی و اقمن الصلوٰۃ و اتین الزکوٰۃ و اطعن اللہ و رسو لہ انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس اھل البیت و یطھر کم تطھیرا (اور اپنے گھروں کے اندر رہا کرو ،اور جاہلیت کے زمانے کی طرح اپنا نکھار نہ دکھاؤ۔ اور نماز قائم رکھو اور زکوۃ ادا کیا کرو، اور اللہ کی اور اللہ کے رسولؑ کی فرمانبرداری کرتی رہو۔(یہ جو تمہیں خصوصیت کے ساتھ کہا جا رہا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ) اے رسولؐ کی گھر والیو! اللہ چاہتا ہے کہ تم سے ناپاکی کو دور ہٹا دے اور اچھی طرح تمہیں پاک کر دے ۔)

۳۳ : ۳۳

اس رکوع کا شروع ہی اس جملے سے ہے کہ یا یھا النبی قل لا زو اجک (اے نبیؐ تم اپنی بیبیوں سے کہدو۔) اس کے بعد آخر رکوع تک ہر آیت یا نساء النبی کہہ کر شروع ہوئی ہے یعنی اس آیہ تطہیر کے بعد بھی ایک آیت اور ہے جس کی مخاطب وہی نساء النبی ہیں۔ مگر اسی رکوع کے درمیان کی ایک آیت جو یانساء النبی ہی کے ساتھ شروع ہوئی ہے جس کو ہم نے معہ ترجمہ ابھی اوپر نقل کیا ۔ اس آیت کے آخری ٹکڑے کو یعنی انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس اھل البیت و یطھر کم تطھیرا کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ ٹکڑا ازاوج مطہرات کو نہیں کہا گیا ہے اس کی مخاطب وہ نہیں ہیں بلکہ حضرت علیؓ حضرت فاطمہؓ اور حضرت

حسنؓ اور حضرت حسین رضی اللہ عنہم ہیں۔ جن کا پورے قرآن میں کہیں کوئی ذکر نہیں ۔ خلاف سیاق و سباق، خلاف عبارۃ النص قرآن سے بالکل باہر ایک نئی بات جو یہاں ٹھونسی گئی ہے اس کی دلیل پوچھئے تو کہیں گے کہ اس چھٹی آیت کا یہ آخری ٹکڑا اپنی ایک الگ شان نزول رکھتا ہے اور یہ آدھی آیت حضرت علیؓ اور ان کی بیوی اور بچوں کی شان میں اتری ہے اور اس کے لئے ایک واقعہ گھڑا گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حجرے میں حضرت علیؓ آئے اور حضرت فاطمہؓ ، حسنؓ و حسینؓ سب یکجا ہوئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک چادر بچھائی اور اس چادر پر ان چاروں کو بٹھایا پھر اس چادر کے چاروں کونوں کو اٹھا کر اپنی ایک مٹھی میں لیکر آسمان کی طرف کہا کہ **اللھم ھولاء اھل بیتی** اور پڑھا کہ **انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس اھل البیت ویطھرکم تطھیرا**۔ اور اسی طرح متعدد طرق سے متعدد و مختلف عنوان سے یہ واقعہ روایت کیا گیا ہے اور کئی صحابیوں پر ان کی روایت کا بہتان باندھا گیا ہے میں نے ان سب روایتوں کی کھلی تنقید کی ہے جو ایک رسالے کی صورت میں ہے اس کا نام میں نے **تطھیر ایہ التطھیر من ھفوات الرواۃ فی التفسیر**۔ رکھا ہے افسوس ہے کہ اس کا مسودہ بھی قلمی ہی پڑا ہوا ہے مختصر یہ ہے کہ اس واقعہ مکذوبہ کی روایت کا کوئی سلسلہ ایسا نہیں ہے جس میں ایک یا دو شیعہ راوی نہ ہوں اور کوفیوں ہی کی تو یہ روایت گھڑی ہوئی ہے اس لئے تقریباً ہر سلسلہ روایت میں کوفیوں کا ہونا تو ضروری ہے ۔ راویوں کے تشیع سے قطع نظر بھی کیجئے تو آخر عقل و درایت بھی کوئی چیز ہے یا نہیں؟ اگر یہ واقعہ صحیح تسلیم کر لیا جائے تو اس سے یہ کہاں معلوم ہوا کہ ان چاروں

حضرات کی شان میں یہ آیت اتری؟ یہ واقعہ تو صاف بتا رہا ہے کہ یہ آیت پہلے ہی اتر چکی تھی مگر اتری تھی ازواج نبیؐ کی شان میں۔

اور اگر یہ بتانا مقصود تھا کہ سورۃ احزاب کے چوتھے رکوع کی چھٹی آیت کا آخری ٹکڑا ان چاروں کی شان میں نازل ہوا ہے تو آپؐ کا فرض تھا کہ مسجد میں صحابہؓ کو بلا کر مجمع میں صحابہؓ کو مخاطب کرکے یوں فرماتے کہ یا ایھا الناس ھو لاء اھلبیتی- اے لوگو، یہ لوگ میری اہل بیت ہیں اور اس وقت یہ آیت پڑھتے نہ کہ حجرے میں اللہ تعالیٰ ہی کو مخاطب کرکے کہا جائے کہ اللھم ھو لاء اھل بیتی! یہ تو بالکل لایعنی سی بات ہوئی۔ قرآن کا یہ بھی ایک اعجاز ہی ہے کہ اس طرح کی تقریباً جتنی جھوٹی جھوٹی روایتیں شان نزول وغیرہ کی بنائی گئی ہیں ان سبھوں میں اللہ تعالیٰ نے انھیں وضاعین و کذابین سے ایسی ترکیبیں ان روایتوں میں رکھوادی ہیں جن سے ان روایتوں کا کذب روز روشن کی طرح واضح ہو جاتا ہے۔ مگر تعریف کیجئے روایت پرستی کے جذبات کی کہ شیعوں کو تو نہ پوچھئے اہل سنت محدثین بھی روایت پرستی کے جذبے کے ماتحت ایسی واضح مخالف قرآن و خلاف عقل و درایت روایتوں کو بھی صحیح سمجھتے ہیں۔ یہ لوگ بھی "اہل بیت رسول" سے حضرت علی و فاطمہ و حسن و حسین رضی اللہ عنہم ہی کو مراد لیں گے۔ کبھی امہات المومنینؓ کو اہل بیت رسول نہیں کہیں گے۔ حالانکہ قرآن نے امہات المومنینؓ ہی کو اہل بیت رسول قرار دیا ہے۔

جاہل لوگوں کو یہ لوگ دھوکا دیا کرتے ہیں یہ کہہ کر کہ اگر چھٹی آیت کے اس ٹکڑے کی بھی مخاطبت امہات المومنینؓ کی طرف ہوتی تو عنکم اور یطھر کم میں کم ضمیر جمع حاضر کی مذکر نہ آتی، مؤنث

آتی۔ مگر جو لوگ ادب عربی سے باخبر ہیں وہ جانتے ہیں کہ اھل کا لفظ اگر عورت کے لئے بھی مستعمل ہوتا ہے تو اس کی طرف ضمیر جمع مذکر ہی کی پھرتی ہے چاہے وہ صرف اہل ہی کا لفظ ہو یا اہل بیت مرکب اضافی کی صورت میں ہو۔ چنانچہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام حضرت شعیبؑ کے پاس سے اپنی بیوی کو لیکر چلے اور راستے میں آگ کی ضرورت محسوس ہوئی تو انھوں نے اپنی بیوی سے کہا کہ ٹھہرو میں نے آگ دیکھی ہے الخ تو اس کو یوں فرمایا گیا ہے قال لاھلہ امکثوا انی انست نارا (۲۸، ۲۹) دیکھئے حضرت موسیٰؑ کی ایک ہی بیوی تھیں مگر جب ان کو اہل کے لفظ سے تعبیر کیا گیا؟ تو امکثوا جمع مذکر کا صیغہ ان کے لئے لایا گیا۔ حضرت موسیٰؑ ہی کی پرورش کے لئے جو ایک دودھ پلانے والی عورت کی فرعون اور اس کی بیوی کو تلاش تھی تو ان کی بہن نے فرعون اور اس کی بیوی سے کہا کہ ھل ادلکم علیٰ اھلبیت یکفلونہ (۲۸/۱۲) کیا ہم تمہیں پتہ بتائیں ایک گھر والی (عورت) کا جو اس بچے کی کفالت کرے؟ چنانچہ حضرت موسیٰؑ کی والدہ بلائی گئیں اور حضرت موسیٰؑ اپنی ماں کی گود میں واپس آگئے جس کو دوسری جگہ فرمایا گیا ہے فرجعنٰک الی امک کے تقرّ عینھا و لا تحزن (۲۰) پھر ہم نے تجھے تیری ماں کی طرف واپس کر دیا تاکہ اس کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں اور وہ غمگین نہ رہے، حضرت موسیٰؑ اپنے گھر واپس نہیں آئے تھے۔ رہتے تھے فرعون ہی کے گھر میں۔ مگر اپنی ماں ہی کی گود میں پرورش پا رہے تھے۔ اس لئے صرف اپنی ماں ہی کو ملے تھے ان کو اہل بیت کہا گیا جس کا مفہوم یہ ہے کہ ایک شریف عورت اچھے گھر والی۔ بیت میں تنوین عظمت ظاہر کرنے کے لئے۔ مگر اس کی طرف ضمیر جمع مذکر کی پھری اور یکفلونہ فرمایا گیا۔ اسی طرح جس وقت حضرت ابرہیم

علیہ السلام کے پاس فرشتے آکر فرزند کی بشارت دے رہے تھے ۔ حضرت ابراہیمؑ کی بیوی حضرت سارہؑ سامنے کھڑی تھیں اولاد کی بشارت سن کر تعجب سے کہنے لگیں کہ کیا میں بچہ جنوں گی حالانکہ میں بوڑھی ہوں اور یہ میرا شوہر بھی بوڑھا ہے تو فرشتوں نے ان سے کہا کہ **اتعجبین من امراللّٰہ رحمۃ اللّٰہ و برکاتہ علیکم اھل البیت** ۷۳/۱۱ کیا تم اللہ کے کام پر تعجب کرتی ہو، اللہ کی رحمت اور اس کی برکتیں ہیں تم پر اے اہل بیت ابراہیمؑ ۔ یہاں البیت پر الف لام عوض مضاف الیہ آیا ہے اور عہد خارجی کا فائدہ دے رہا ہے عہد کے اعتبار سے معنی ہوں گے" اس گھر، یہ گھر" اور عوض مضاف الیہ ہونے کی حیثیت سے معنی ہوں گے " اہل بیت ابراہیمؑ " دیکھئے حضرت ابراہیمؑ کی ایک بیوی کو پہلے تو واحد مؤنث کے صیغے سے مخاطب کرکے تعجبین کہا گیا مگر جب اہلبیت کہکر مخاطب فرمایا گیا تو وہی جمع مذکر کی ضمیر لائی گئی اور ان کی ابھی تک کوئی اولاد بھی پیدا نہیں ہوئی تھی ۔

اشعار عرب میں بھی اس کی مثالیں بہت ملیں گی ۔ عمرو بن العارض کا ایک قصیدہ ہے ۔ پورے قصیدے میں مخاطب محبوب کی طرف حسب دستور شعرائے عرب واحد مؤنث ہی کی ضمیر پھری ہے ۔ مگر اہل کے لفظ کے ساتھ اپنے محبوب کو مخاطب کرتے ہیں تو اس کی طرف جمع مذکر ہی کی ضمیر پھیرتے ہیں ۔ چنانچہ کہتے ہیں ۔

یا اھل ودی انتم املی ومن   نا دلکم یا اھل ودی قد کُفِی

اے میری محبت والی تو میری امید گاہ ہے اور جس نے تجھے پکارا اے میری محبت والی تو پھر اس کیلئے کافی ہوگیا ۔

بلکہ عورتوں کی طرف یوں بھی جمع مذکر کی ضمیر پھیری جاسکتی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مخنث صحابی کے متعلق اپنی بعض ازواجؓ سے فرمایا تھا کہ لایدخلن علیکم ھذا۔ اس حدیث کے بعض دوسرے جملے بھی ادبی حیثیت سے معرکہ الآرا ہیں جن کے معنوں تک شارحین حدیث بھی نہ پہنچ سکے چونکہ وہ شعری ذوق سے محروم تھے طوالت کے خوف سے اس بحث کو یہاں نہیں چھیڑتا ہوں اور پھر موضوع سے بھی وہ بحث بالکل خارج ہے[1]

اور پھر بعض روایتوں میں یہ موجود ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر روز یا اکثر علی الصباح اپنی ازواج کے حجروں کے پاس جاجا کر بآواز بلند فرماتے تھے کہ السلام علیکم یا اہل البیت[2] باوجودیکہ امہات المومنینؓ کے حجروں میں وہی ہوتی تھیں اور کوئی نہیں ہوتا تھا مگر ضمیر جمع مذکر ہی کی استعمال کی جاتی تھی اور ازواج کو اہلبیت ہی کہہ کر مخاطب کیا جاتا تھا۔

مثال نمبر ۲ : آیۃ ولایت : اسی طرح آیہ کریمہ انما ولیکم اللہ و رسولہ الذین امنوا الذین یقیمون الصلوٰۃ ویؤتون الزکوٰۃ وھم رکعون (مائدہ : ۵۵) (اے مسلمانو!) تمہارے دوست تو

---

[1] اس حدیث میں ایک عورت کے حسن کی تعریف یوں ان مخنث صحابی نے بیان کی تھی کہ تُقبِلُ بِاَربَعٍ وَتُدبِرُ بِثَمَانٍ یعنی چار چیزوں کے ساتھ سامنے آتی ہے اور آٹھ چیزوں کے ساتھ پیٹھ پھیرتی ہے۔ شارحینِ حدیث اس بلیغ عبارت کے معنی نہ سمجھ سکے نہ علمائے اہلِ حدیث میں سے آج تک کوئی سمجھ سکا۔ (تمنا)

[2] اس طرح نمازِ صبح کے لیے ہوشیار فرماتے تھے (تمنا)

صرف اللہ اللہ کے رسولؐ اور وہ مومنین ہیں جو نماز کو قائم رکھتے ہیں اور زکوۃ ادا کرتے رہتے ہیں اور جھکے رہنے والے ہیں۔) اس آیت کی شان نزول تصنیف کی گئی کہ ایک بار حضرت علیؓ نماز پڑھ رہے تھے کہ ایک سائل آیا اور (باوجود اس کے کہ وہ دیکھ رہا تھا کہ یہ نماز پڑھ رہے ہیں) ان سے کچھ مانگا۔ حضرت علیؓ نے بحالت رکوع اپنی انگلی سے انگوٹھی نکال کر گرادی اور وہ سائل لے کر چلا گیا تو یہ واقعہ گھڑ لینے کے بعد مشہور کیا گیا کہ الذین یقیمون الصلوٰۃ و یوتون الزکوۃ و ھم رکعون سے حضرت علیؓ مراد ہیں کہ انھوں نے حالت نماز میں زکوۃ ادا کی ۔ حالانکہ یقیمون اور یوتون اور ھم اور راکعون یہ سب جمع کے صیغے ہیں۔ ان کلمات سے کبھی کوئی شخص واحد نہیں سمجھا جاسکتا ہے ۔ اس کے علاوہ اگر حضرت علیؓ کے بحالت رکوع انگوٹھی خیرات کرنے کا واقعہ صحیح تسلیم بھی کر لیا جائے تو یہ ایک بار کا واقعہ تھا جس کے ہو جانے کے بعد یہ آیت اتری تو صیغہ ماضی لانا تھا اور یہاں زمانہ حال سے تا زندگی زمانہ مستقبل مراد ہے ، کیونکہ ایسے مواقع میں مضارع کے صیغے بمفہوم استمرار کے لئے آتے ہیں ۔ یقیمون الصلوۃ کے معنی ہیں نماز قائم رکھتے ہیں یعنی برابر نماز پڑھا کرتے ہیں۔ یؤتون الزکوۃ کے معنی ہیں زکوۃ دیا کرتے ہیں۔ کیا حضرت علیؓ جب جب نماز پڑھتے تھے تو ہر مرتبہ بحالت رکوع زکوۃ دیا کرتے تھے؟ ۔ یا وہ ہر وقت حالت نماز میں رہتے تھے پھر زکوۃ ایک صدقہ معین کا نام ہے جس کی مقدار صاحب مال کی مالی حیثیت کے مطابق حساب سے معلوم ہوتی ہے حضرت علیؓ رسول اکرم کی حیات طیبہ میں اتنے مالدار نہ تھے کہ ان پر زکوۃ فرض ہو۔ ایک انگوٹھی خیرات کرنے کو کبھی ادائے زکوۃ نہیں کہا جاسکتا ۔ زکوۃ ایک صدقہ مفروضہ کا نام ہے اس

لئے زکوۃ کو صدقہ کہہ سکتے ہیں کیونکہ ہر زکوۃ صدقہ ہے مگر صدقہ کو زکوۃ نہیں کہہ سکتے کیونکہ صدقے کی صرف ایک قسم زکوۃ ہے ۔ زکوۃ کے علاوہ صدقے کی بہت سی قسمیں ہیں جن کو زکوۃ نہیں کہہ سکتے۔ اور اس شان نزول کے راویوں کو دیکھئے تو کوئی طریق روایت ایسا نہیں ملے گا جس میں کوئی نہ کوئی شیعہ نہ ہو اور تقریباً ساری روایتیں کوفے کی ٹکسال کی گھڑی ہوئی ہیں ان روایتوں کی بھی میں نے تنقید کی ہے جو ایک مختصر سے رسالے کی صورت میں بشکل مسودہ میرے پاس موجود ہے حالانکہ آیت کا مفہوم بالکل صاف اور واضح ہے راکعون یہاں اپنے لغوی معنی میں خاضعون کے مفہوم میں یعنی یہ لوگ جن کو زکوۃ دیتے ہیں تو تواضع و انکسار کے ساتھ تاکہ لینے والا یہ نہ سمجھے کہ ہمیں حقیر سمجھ رہے ہیں اس آیت سے پہلے جو آیت ہے اس میں مومنین کی شان بتائی گئی ہے کہ ان کو اذلّۃ علی المومنین اعزّۃ علی الکافرین[1] ہونا چاہیئے یعنی ایمان والوں کے سامنے جھکے ہوئے منکسر اور کافروں کے مقابل غالب و باوقار اسی اذلہ کے مفہوم کو یہاں راکعون سے ادا کیا گیا ہے۔

اس آیت کا سلسلہ تو اوپر سے ہے شروع رکوع میں فرمایا گیا ہے یا ایّھا الذین اٰمنوا لا تتخذو الیھود و النصاریٰ اولیآء الایہ[2]) اے ایمان والو یہود و نصاریٰ کو تم اپنا دوست نہ بناؤ ۔ تو پھر کس کو دوست بناؤ ؟ اس کو بتایا گیا کہ انّما ولیکم اللّٰہ و رسولہ و الّذین امنوا[3] (الایۃ) یعنی تمہاری دوستی کے لئے تو اللہ ہے ، اللہ کے رسول ہیں اور جتنے مومنین ہیں سب ہیں۔ تم غیروں سے دوستی کیوں قائم کرتے ہو؟

اور اس طرح کی شان نزول وغیرہ کی روایتیں اور عام تفسیری

القرآن [1] ۵ / ۵۴ [2] ۵ / ۵۱ [3] ۵ / ۵۵

روایتیں جو باہم متضاد و مختلف ہونے کے علاوہ اکثر تو ایسی ہی ہیں جو آیات قرآنی کے سیاق و سباق کے بالکل خلاف ہیں ۔ اگر دیکھنا ہوں تو تفسیر ابو جعفر محمد بن جریر الطبری کو دیکھ جائیے ۔ کیونکہ متقدم مفسرین کا ذکر بھی کتابوں میں ہے مگر سب سے پرانی جو تفسیر مسلمانوں کے ہاتھوں میں صدیوں سے چلی آرہی ہے جس کی خوشہ چینی دوسرے سب مفسرین کر رہے ہیں وہ بھی ابن جریر طبری کی تفسیر ہے ۔ [ابن جریر سے متعلق متصل گفتگو ایک مستقل کتاب کی شکل میں ہم عنقریب شائع کرنے والے ہیں ۔ (طاہر مکی)]

تیسری مثال

نبی امی کا مفہوم

ھو الّذی بعث فی الامین رسولا مّنھم یتلوا علیھم اٰیٰتہ ویزکیھم ویعلمھم الکتاب والحکمۃ (جمعۃ : ۲)

وہ (اللہ تعالیٰ ہی) ہے جس نے اُمّیوں میں انہیں میں سے ایک رسول مبعوث فرمایا تاکہ وہ ان کے سامنے اس کی آیتیں پڑھ کر سنایا کرے اور ان کو پاک نفس بنائے اور (اللہ تعالیٰ کی) کتاب وحکمت کی تعلیم کرتا رہے ۔

واذ یرفع ابراھیم القواعد من البیت واسماعیل ربّنا تقبّل منّا انّک انت السمیع العلیم ٥ (۲ : ۱۲۷)

(وہ بھی کیا وقت تھا) جب ابراہیمؑ اس گھر (کعبہ مکرمہ) کی دیواریں اٹھا رہے تھے اور اسماعیلؑ (بھی ان کے ساتھ دونوں دعائیں کرتے جاتے تھے کہ) اے ہمارے رب ہم دونوں سے (اس خدمت کو) قبول

فرمالے۔ تو (دعاؤں کا) سننے والا (دل کی نیتوں کا) جاننے والا ہے۔

رّبنا و اجعلنا مسلمین لک و من ذرّیتنا اُمّۃ مسلمۃ لّک و ارنا مناسکنا و تب علینا انک انت التّواب الرّحیم ۲/ ۱۲۸

اور ہم دونوں کو اپنا فرمانبردار بنائے رکھ اور ہم دونوں کی نسل سے ایک بڑی امت اپنی فرماں بردار تیار کردے اور ہمیں بتا دے عبادت کے (وہ) طریقے (جو ہمارے لئے مناسب ہوں) اور ہم لوگوں کی کوتاہیوں اور لغزشوں سے درگزر فرما تو بڑا درگزر کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

رّبنا و بعث فیھم رسولا منھم یتلوا علیھم آیٰتک و یعلّمھم الکتاب و الحکمۃ و یزکیھم انّک انت العزیز الحکیم ٥ ۲/ ۱۲۹

اے ہم دونوں کے رب! اور ان (ہم دونوں کی نسل والی امت کے) لوگوں میں ایک رسول انہیں میں سے مبعوث فرما جو ان کو تیری آیتیں پڑھ کر سنایا کرے اور ان کو (تیری) کتاب اور حکمت کی تعلیم کرے اور ان کو پاک نفس بنائے۔ تو ہی عزت و حکمت کا مالک ہے۔

سورۃ بقرۃ کی تین آیتیں مسلسل ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۲۹ میں نے ترجمے کے ساتھ پیش کردی ہیں اور یہ مقالہ شروع کیا ہے سورۃ جمعہ کی دوسری آیت سے۔ سورۃ بقرۃ کی ان تینوں آیتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان میں سے آخری یعنی ۲: ۱۲۹ کو سورۃ جمعہ کی آیت سے ملا کر دیکھئے۔

بنی اسرائیل اپنی کتابوں کی پیشن گوئیوں کی وجہ سے آخری نبی کے منتظر ضرور تھے ان کے عوام برابر غیر بنی اسرائیل مشرکین کو اور ان کے موحدین مشرکین بنی اسرائیل کو آخری نبی کی آمد کی پیشن گوئیاں سنا سنا کر ڈرایا کرتے تھے کہ وقت آگیا ہے آخری نبی کے آنے کا۔۔۔۔ انہیں

آنے دو تم کو تمہارے مشرکانہ اعمال اور بداعمالیوں کی سزا مل جائے گی مگر وہ سمجھتے تھے کہ وہ آخری نبی بھی بنی اسرائیل ہی میں سے مبعوث ہوں گے ۔ مگر آئے بنی اسماعیل میں یہ بات عامہ بنی اسرائیل کو سخت ناگوار ہوئی تو انکار وکفر پر آمادہ ہوگئے ۔

وکانوا من قبل یستفتحون علی الّذین کفروا فلما جاء هم مّا عرفوا کفروا به (۲ : ۸۹)

وہ بنی (اسرائیل بعثت نبویؐ سے) پہلے آخری نبی کے مبعوث کئے جانے کی اور (ان کے ذریعے) کافروں پر فتح حاصل ہونے کی دعائیں کرتے رہتے تھے ۔ مگر جس کو وہ (اچھی طرح) پہچانتے تھے جب وقت آگیا تو اب اس کو ماننے سے انکار کرنے لگے ۔

اور ان کا یہ انکار کسی برہان ودلیل کی بناء پر یا شک وشبہہ کی بناء پر نہ تھا بلکہ ارشاد ہے کہ :

بغیاً ان ینزل الله من فضله علی من یشاء من عباده - (۲ : ۹۰)

(یعنی بنی اسرائیل نے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول برحق تسلیم کرنے سے انکار کیا وہ محض) ضد کی بناء پر کہ (اللہ تعالیٰ ان کی توقع کے مطابق آخری نبی کو کیوں مبعوث کیا؟ ان کے نزدیک یہ ٹھیک نہیں ہوا کہ) اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے (خود) جس پر چاہے اپنا فضل (اپنی کتاب) نازل فرمائے ۔

غرض بنی اسرائیل کا انکار وکفر محض **حسداً من عند انفسهم من بعد ما تبین لهم الحق** (۲ : ۱۰۹) تھا ۔

یعنی صرف نفسانی جذبہ حسد کے سبب سے تھا باوجود اس کے کہ حق بات ان پر واضح ہو چکی تھی مگر وہ اس حسد سے کہ یہ آخری نبی بنی اسماعیل میں کیوں آئے۔

بنی اسرائیل کی ضد اور ہٹ دھرمی کے باوجود محض اتمام حجت کے لئے اللہ تعالیٰ نے تعمیر کعبہ مکرمہ کے وقت جو دعا حضرت ابراہیم و حضرت اسماعیل نبینا و علیہما السلام کرتے جاتے تھے۔ اس کا ذکر فرماکر یہ فرما دیا کہ آخری نبی حضرت ابراہیم و حضرت اسماعیل علیہما السلام کی مشترکہ دعاؤں کی وجہ سے بنی اسماعیل میں مبعوث ہوئے۔

تو اب حضرت ابراہیم و حضرت اسماعیل نبینا علیہم السلام کی مشترکہ دعا والی آیت ۱۲۹ کو اور سورۃ جمعہ کی دوسری آیت ملا کر دیکھئے حضرت ابراہیم و حضرت اسماعیل علیہما السلام کی دعا تھی اپنی اولاد یعنی بنی اسماعیل ہی کے لئے کہ انہیں میں سے ایک نبی ان میں مبعوث فرمایا جائے ۔ وہ دعا قبول فرمائی گئی ۔ جس کا ذکر بعث فی الامین رسولاً منھم فرمایا گیا اور بنی اسماعیل کو الامین فرمایا گیا۔ کیوں بنی اسماعیل کو الامین فرمایا گیا؟ اس کی وجہ بھی آپ کلام اللہ ہی سے پوچھئے ۔ حضرت ابراہیم علیٰ نبینا علیہ السلام نے یہ دعا فرمائی تھی:

ربنا انی اسکنت من ذریتی بواد غیر ذی زرع عند بیتک المحرم ربنا لیقیموا الصلوٰۃ (۱۴ : ۳۷)

اے ہمارے رب میں نے اپنی اولاد (میں) سے بعض کو ایک ناقابل کاشت وادی میں تیرے محترم گھر کے پاس بسایا ہے ۔ اے ہمارے رب (اس سے میری کوئی اور غرض نہیں بجز اس کے) تاکہ یہ لوگ نماز (کے نظام) کو قائم رکھیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے وادی غیر ذی زرع مکہ معظمہ ہی کو فرمایا تھا جس کے قلب میں بیت اللہ کعبہ مکرمہ ہے اور مکہ مکرمہ کا مشہور و معروف لقب ام القریٰ ہے ۔ قرآن مجید میں تو مکہ کا لفظ بھی کہیں مذکور نہیں ۔ (البتہ بکہ کا لفظ ہے ۔ بعض (غیر معتبر تفسیری) روایتوں میں آگیا ہے کہ مکہ معظمہ کا ایک نام بکہ بھی ہے ۔ تو مفسرین کے لئے ایک روایت میں کسی بات کا ہونا کافی تھا اور اہل لغت تو مفسرین کے بعد پیدا ہوئے ۔ جو کچھ مفسرین نے لکھا ہے ۔ اہل لغت نے بھی لکھ دیا ۔ بکہ دراصل مکہ معظمہ کے ایک صحرا کا نام تھا جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مکہ معظمہ میں تشریف آوری کے قبل سے مشہور تھا جس صحرا میں ان کو بیت اللہ کا پتہ بتاکر اس کو نئے سرے سے تعمیر کا حکم ہوا تھا ۔ پہلے اس صحرا میں باہر کے آئے ہوئے تجارتی قافلے برابر ٹھہرا کرتے تھے ۔ بَکّہ کے لغوی معنیٰ خود اہل لغت لکھتے ہیں "جائے ازدحام) بنائے مکہ مکرمہ سے پہلے اس صحرا میں ہر وقت دو تین تجارتی قافلے آکر ٹھہرتے ۔ اس وقت وہاں ہر وقت لوگوں کا ہجوم رہتا تھا۔ اور مکہ کے معنیٰ مغز کے ہیں ۔گویا یہ بلد اس پوری زمین کا مغز ہے غرض مکہ پورے شہر کا نام ہے اور بکہ اس صحرا کا نام تھا جس میں کعبہ کی تعمیر ہوئی ۔ حرم شریف کا پورا احاطہ بَکّہ ہے ۔

غرض قرآن مجید میں مکہ مکرمہ کو اُمّ الْقُریٰ ہی کے نام سے ذکر کیا گیا ہے ۔

اُمّی کا لفظ اس مرکب اضافی کے مضاف میں یائے نسبت لگا کر بنایا گیا ہے ۔ منسوب الیہ مرکب ہو تو طوالت سے بچنے کے لئے اس کے ایک جز میں یائے نسبت لگانا معمول یہ ہے کہ جیسے عبیداللہ المہدی بانی حکومت

فاطمیہ کی اولاد اور اس کے متبعین کو عبیدی کہتے تھے۔ تاریخ کی کتابوں میں عبیدیین کا حال آپ کو ملتا ہے ۔ یہاں بھی مصناف میں ہی یائے نسبت لگی ہے ۔ اسی طرح عبدالدار سے عبدالداری ہے ۔

مختصر یہ کہ چونکہ ام القریٰ سارے بنی اسماعیل کا آبائی وطن تھا اس لئے سارے بنی اسماعیل فخر کے ساتھ اپنے کو امی کہتے تھے چاہے بعد کو ان کی چند پشت اوپر کے اسلاف مکہ مکرمہ سے منتقل ہوکر بہت دور کسی اور جگہ کیوں نہ سکونت پذیر ہوگئے ہوں۔ مگر وہ اپنی نسبت مکہ مکرمہ سے باقی رکھنے کیلئے اور اپنے بنی اسماعیل ہونے کے ثبوت کیلئے امی ہی اپنے کو کہتے تھے اور کہتے رہے۔

ام القریٰ کا لفظ ایک تو سورۃ انعام کی آیت کریمہ ۹۲ میں آیا ہے

وھٰذا کتاب انزلناہ مبارک مصدق الذی بین یدیہ و لتنذر ام القری و من حولھا ط ۶/ ۹۲

اور یہ بڑی عظمت والی کتاب ہے ۔ ہم نے اس کو نازل کیا ہے ۔ برکتوں سے بھری ہے ۔ اس سے آگے جو (کتابیں اتریں) تھیں ان کی تصدیق کرنے والی ہے ۔ (اور یہ اس لئے اتاری گئی ہے) تاکہ تم (اس کے ذریعے) ام القریٰ اور اس کے گرد وپیش کی (بستیوں کے رہنے والوں) کو (شرک اور بداعمالیوں کے برے نتائج سے برابر) ڈراتے رہو۔

دوسری سورۃ الشوریٰ ہے جس کی ساتویں آیت کریمہ یہ ہے:

و کذالک اوحینا الیک قرآناً عربیاً لّتنذر ام القریٰ و من حولھا (الایۃ) ۴۲/ ۷

اسی لئے (اے رسولؐ) ہم نے تمہاری طرف عربی قرآن کی وحی کی ہے تاکہ ام القریٰ اور اس کے گرد وپیش (کی بستیوں کے رہنے والوں) کو (شرک و بداعمالی کے برے نتائج سے) ڈراتے رہو۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کئی سال تک مکہ مکرمہ اور اس کے اطراف وجوانب کی بستیوں کی طرف تھی ۔ اس کے بعد وحی آئی:

قل یٰایھا النّاس انی رسول اللّٰہ اِلَیکُم جمیعاً - (اعراف : ۱۵۸)

(اب اے رسولؐ!) عام اعلان کردو کہ اے عالم انسانیت والو! میں تم سب کی طرف اللہ تعالیٰ کا بھیجا ہوا رسول ہوں۔

مذکورہ بالا آیات کریمات سے یہ ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ قرآن مجید میں مکہ معظمہ کو ام القریٰ فرمایا گیا ہے اور بنی اسماعیل کا چونکہ آبائی وطن حضرت اسماعیل کے وقت سے ام القریٰ رہا اور وہ مکہ مکرمہ اور حوالی مکہ مکرمہ میں بہت بڑی تعداد میں آباد بھی تھے اس لئے بنی اسماعیل کو امیین فرمایا گیا ہے ۔

غیر اہل کتاب ہونا

بنی اسماعیل کے پاس بھی حضرت اسماعیلؑ اور ان کے خلفاء رضی اللہ عنہم کے زمانے میں صرف حضرت ابراہیمؑ کے صحیفے اور حضرت اسماعیلؑ کو جو کتاب دی گئی تھی ایک مدت تک سارے ہدایت نامے موجود تھے۔ صحف ابراہیمؑ کا ذکر تو قرآن مجید میں موجود ہے ۔ (سورہ اعلیٰ کی آخری آیت میں) اور سورۃ بقرۃ کی آیت ۱۳۶ میں ہے

ما انزل علیٰ ابراھیم و اسماعیل و اسحاق و یعقوب و الاسباط ۳ / ۸۴

اس سے صاف ظاہر ہے کہ وحی کتاب یا صحیفے کی صورت میں یا جس شکل میں بھی ہو ان میں سے ہر ایک پر نازل ہوئی تھی۔ اس لئے بنی اسماعیل کو کتاب اللہ سے محروم ہرگز نہیں رکھا گیا تھا۔

مگر بنی اسرائیل میں برابر بعثت انبیاء کا سلسلہ جاری رہا متعدد کتابیں بھی یکے بعد دیگرے اترتی رہیں۔ ضائع شدہ کتاب کسی نبی نے آکر درست کردی۔۔۔

حضرت عیسیٰ علیٰ نبینا علیہ السلام بنی اسرائیل کے خاتم الانبیاء تھے ان کے بعد بنی اسرائیل میں کوئی نبی تو نہیں آیا مگر تورات وزبور یہود ونصاریٰ کی متفق علیہ کتابیں تھیں وار ہیں۔ تحریفین تو اپنے اپنے نقطۂ نگاہ کے اعتبار سے دونوں نے کیں مگر محرف ہی سہی، دونوں کتابیں دونوں کے پاس موجود تو رہیں۔ انجیل سے تعلق صرف نصاریٰ کا تھا اور ہے۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ حضرت موسیٰ و حضرت داؤد علیہم السلام کی کتابیں تو رکھتے اور اپنے نبی کی کتاب نہ رکھتے۔ تحریف تو حسب عادت اس میں بھی بہت کیں۔ مگر محرف ہی سہی انجیل کو بھی سینے سے لگائے رہے۔ مگر بنی اسماعیل میں حضرت اسماعیلؑ کے بعد حضرت خاتم النبین صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کوئی نبی نہ آیا۔ اس لئے ان کے پاس نہ صحف ابراہیم رہے نہ حضرت اسماعیلؑ پر اتری ہوئی کتاب رہی۔ بنی اسماعیل صدیوں تک کتاب اللہ سے بالکل محروم ہوئے۔ اور بت پرستی میں انہماک کی وجہ سے ملت ابراہیمی کی کوئی بات ان میں باقی نہ رہی۔ حضرت ابراہیم وحضرت اسماعیل علیہما السلام کا احترام تو دلوں میں تھا

مگر دینی مسلک کے اعتبار سے بنی اسماعیل کو دور کا بھی کوئی لگاؤ ان بزرگواروں سے باقی نہ رہا تھا۔

مدینہ طیبہ ہجرت کے بعد یہودیوں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اور آپ کے صحابہؓ کو نیا سابقہ پیش آیا۔ امیین کی طرف تو آپ کی پہلی بعثت ہوئی تھی۔ تیرہ برس مسلسل انہیں میں تبلیغ کرتے رہے۔ انہیں میں سے مومنین کی ایک معقول جماعت تیار ہوگئی جن میں سے بہت بڑی جماعت ہجرت کر کے مدینہ طیبہ آگئی تھی۔ مگر خود بھی مدینے میں پہلے سے بنی اسماعیل امیین کی بہت بڑی جماعت آباد تھی۔ مدینہ طیبہ کے دو مشہور قبیلے اوس وخزرج امیین ہی میں سے تھے یعنی بنی اسماعیل ہی تھے۔ اعراب جو مدینہ طیبہ کے گرد و پیش کی بستیوں میں رہتے تھے وہ سب امیین ہی تھے۔ مدینہ طیبہ کے انصاری صحابہ سب امیین ہی تھے مگر امیین سے کوئی نیا سابقہ نہ تھا۔ نیا سابقہ مدینہ طیبہ میں یہودیوں سے پیش آیا۔ اس لئے مدینہ طیبہ میں جو پہلی سورۃ اتری یعنی سورۃ بقرۃ تو اس میں پہلے تین جماعتوں کا ذکر فرمایا گیا۔ مکہ معظمہ میں صرف دو جماعتیں تھیں مؤمنین تھے یا کفار۔ مگر مدینہ طیبہ میں ایک بڑی بھاری تعداد مہاجرین کی آگئی۔ پھر انصار مہاجرین کی یکجائی سے مومنین کی تعداد بڑھ گئی۔ اس لئے مدینہ طیبہ کے بدنصیب کفار مؤمنین کی مدینہ طیبہ میں امان اور گہما گہمی دیکھ کر مرعوب ہوگئے اور اپنی بدطینتی کے باعث اسلام قبول کرنے پر بھی دل سے آمادہ نہ ہوئے تو انہوں نے منافقت اختیار کرلی۔ اور بظاہر مسلم بنے مگر دل میں اپنی کفر چھپائے رکھا۔ مسلمانوں سے مسلمان بن کر ملتے تھے اور کفار سے کافر بن کر اس لئے مدینے میں تین جماعتوں سے قرآن مجید کو سابقہ پیش آیا۔ مومنین و کافرین کے علاوہ

منافقین کی نئی جماعت سے بھی - اس لئے سورۃ البقرۃ کی ابتدائی تمہیدی
آیات کریمات میں پہلے مؤمنین کا ذکر فرمانے کے بعد کفار کا ذکر فرمایا گیا
اس کے بعد منافقین کا ملاد یہ سب امیین ہی میں سے تھے۔ اس کے بعد
یاایھا الناس کے پر عظمت انداز مخاطبت سے پورے عالم انسانیت کو
مخاطب فرماکر توحید کی تبلیغ فرمائی گئی اور شرک جیسے ظلم عظیم سے باز
رہنے کی تاکید فرمائی گئی - اس کے بعد حضرت آدم علیٰ نبینا وعلیہ السلام
کے واقعات بیان فرمائے گئے - چونکہ بنی اسرائیل کی کتابوں میں یہ
سارے واقعات مذکور ہیں۔ وہ زبان سے تصدیق نہ کریں مگر ان کے
قلوب تو ضرور ان باتوں کی تصدیق کریں گے - اس کے بعد بنی اسرائیل
کو خاص طور پر پکار پکار کر مخاطب کیا گیا اور ان کو سمجھایا گیا۔ ان کی گذشتہ
نافرمانیاں اور سرگوشیاں جو انہوں نے اپنے رسول کے ساتھ کی تھیں ان
کو یاد دلائی گئیں۔ مگر مدینہ طیبہ میں ہجرت نبویؐ سے پہلے یہود اپنا اقتدار
قائم کئے ہوئے تھے۔ امیین یعنی بنی اسماعیل مدینہ واطراف مدینہ میں
بہت تھے مگر قبائل میں بٹے ہوئے آپس میں لڑتے جھگڑتے رہتے تھے۔
امیین کے دو بڑے قبیلے اوس اور خزرج ایک دوسرے کے دشمن تھے
اور یہود ان کو آپس میں لڑاتے رہتے تھے۔ اکثر یہود کا خیال یہ تھا کہ امیین
بنی اسماعیل کو باہم لڑاتے رہنا ان کو باہمی مسلسل خونریزی کے ذریعے
کمزور بنائے رکھنا بلکہ ان کے ساتھ خیانت کرنا، ان پر ظلم کرنا ہمارے
لئے جائز ہے - اس کے متعلق اللہ ہم سے کسی قسم کی باز پرس نہیں
کرے گا۔ ان کا قول قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے:-

و من اھل الکتاب من ان تامنہ بقنطار یؤدہ الیک و منھم
من ان تامنہ تالوا لیس علینا فی الامیین سبیل - و یقولون

علی اللہ الکذب وھم یعلمون ۝ (۳: ۷۵)

اہل کتاب میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں کہ اگر ان کے پاس مال کا ایک ڈھیر بھی امانت رکھدو تو وہ (تمہارے مطالبے کے وقت) اس کو تمہیں دیدیں گے۔ اور بعضے ان میں سے ایسے ہیں جن کے پاس تم ایک دینار بھی امانت رکھو تو وہ تمہیں واپس دینے کے لئے تیار نہ ہوں گے مگر یہ کہ تم ان پر (قوت کے ساتھ) مسلط ہوجاؤ۔ یہ بدمعاملگی (ان میں) اس لئے ہے کہ امیوں (بنی اسماعیل) کے بارے میں ہم پر کوئی مواخذہ عائد نہیں ہوگا۔ (یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کو امیوں کے ساتھ بد دیانتی اور ظلم کرنے کی اجازت دیدی ہے) بلکہ وہ جانتے بوجھتے اللہ تعالیٰ پر جھوٹا بہتان باندھتے ہیں۔

بد سے بدتر اور ظالم سے ظالم قوم میں بھی کچھ نیک فطرت افراد ضرور ہوتے ہیں مگر عموماً اچھے لوگ تھوڑے ہی ہوتے ہیں۔ خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

و قلیل من عبادی الشکور۔ (سبا: ۱۳)

میرے بندوں میں شکر گزار تھوڑے ہی سے ہیں۔

اس لئے دو طرح کے اہل کتاب کی جو اخلاقی حالت بیان فرمائی گئی ہے تو یہ بھی ممکن ہے کہ اہل کتاب سے یہاں صرف یہود ہی مراد ہوں۔ مگر یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہاں اہل الکتاب لفظ عام رکھا گیا ہے جن میں یہود ونصاریٰ دونوں داخل ہیں۔ حسن معاملہ والوں کا جو پہلے ذکر ہے ان سے نصاریٰ مراد ہوں، اور بدمعاملہ جن کا ذکر بعد کو ہے ان سے یہود مراد

ہوں۔ سورۃ مائدۃ کی آیت کریمہ نمبر ۸۲ جو چھٹے پارے کی آخری آیت ہے پڑھیئے

لتجدنّ اشد النّاس عداوۃ للّذین اٰمنوا الیھود والذین اشرکوا ولتجدن اقربھم مودۃً للذین آمنوا الذین قالوا انّا نصریٰ ذٰلک بان منھم قسیسین وَرھْبَانا وانھم لایستکبرون ○ -- (مائدہ : ۸۲)

" مومنین کا سب سے سخت ترین دشمن تم یہودیوں کو پاؤگے اور مشرکین اور (بت پرستوں) کو اور مؤمنین سے محبت میں قریب تر (یہود ومشرکین کے مقابل) تم ان لوگوں کو پاؤگے جو اپنے کو نصاریٰ کہتے ہیں اسلئے کہ ان میں (ان کے) علمائے دین ہیں اور درویش لوگ ہیں، اور یہ لوگ اپنے کو (سب سے) بڑا نہیں سمجھتے "
اس آیت کریمہ کی روشنی میں حسن معاملہ والے امانت دار اہل کتاب نصاریٰ ہی نظر آتے ہیں اور بدمعاملہ خائن اہل کتاب یہود (واللہ اعلم)
مدینہ طیبہ میں اس وقت یا بنی اسماعیل تھے یا بنی اسرائیل بلکہ درحقیقت پورے حجاز ہی میں بنی اسماعیل یا بنی اسرائیل آباد تھے۔ اس لئے یہ کہنا کہ بنی اسرائیل غیر بنی اسرائیل کو امیین کہتے تھے اور یہ کہنا کہ بنی اسرائیل بنی اسماعیل کو امی کہتے تھے دونوں یکساں تھے۔ دونوں کا ایک ہی مفہوم ہے یعنی عرب کے اہل کتاب بنی اسماعیل کو امیین کہتے تھے اور بنی اسماعیل خود بھی اپنے کو فخر کے ساتھ امیین سمجھتے اور کہتے تھے۔

اور دیکھئے سوۃ آل عمران کی بیسویں آیت میں پڑھیئے

و قل للذين اوتوا الكتب والامیین ء أسلمتم ۞ فان اسلموا فقد اهتدو ۔ (الایۃ ۔ آل عمران : ۲۰)

اور (اے رسولؐ !) تم اہل کتاب سے اور امیین سے پوچھو کہ کیا تم نے اسلام قبول کر لیا ؟ تو اگر انہوں نے اسلام قبول کر لیا تو وہ ہدایت پا گئے الخ

چونکہ اس زمانے میں یہی بنی اسرائیل ۔ بعض اہل کتاب اور امیین بنی اسماعیل یہی دو قومیں مدینہ طیبہ اور اس کے گرد و پیش کی بستیوں میں تھیں اس لیے بنی اسرائیل کو الذین اوتوا الکتاب کے لفظ سے ذکر فرمایا گیا ۔ اور بنی اسماعیل کو الامیین کے لفظ سے ۔ پورے حجاز میں دو قومیں آباد تھیں ۔ اس وقت حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے مبعوث الیہم تبلیغی مخاطب بھی دو برابر کی قومیں تھیں ۔ اہل کتاب یعنی بنی اسرائیل اور امیین یعنی بنی اسماعیل ، اسی لئے ان دونوں کو اس آیت کریمہ میں مخاطب کرنے کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوا ۔ کوئی اور تیسری قوم ان دونوں کے سوا حجاز میں آباد نہ تھی ۔ کچھ افراد اگر باہر آکر تجارت وغیرہ کے ذریعے یا تو اسی قسم کے لوگ انفرادی حیثیت سے حجاز کی کسی بستی میں بلکہ مدینہ طیبہ و مکہ معظمہ میں بھی علیحدہ یا کسی قبیلے کے بعض افراد کے ساتھ سکونت پذیر ہوں تو ضمناً وہ بھی اس مخاطبت کے مخاطب سمجھے جائیں گے ۔ مگر ضمناً ہی مخاطب ہو سکتے ہیں ۔ ان لوگوں کی اپنی کوئی جداگانہ مستقل قومی حیثیت نہیں سمجھی جا سکتی کہ وہاں وہ بھی اہل کتاب اور امیین کی طرح کسی اور قومی نام سے مخاطب ہوتے ۔

لا یعلمون الکتاب

سورۃ بقرۃ کے نویں رکوع میں اہل کتاب یعنی مدینۂ طیبہ کے یہودیوں کی سنگدلی ، بے ایمانی اور ہٹ دھرمی کا ذکر کرتے ہوئے مؤمنین سے فرمایا گیا ہے کہ :

افتطمعون ان یومنوا لکم - (الایة - ۲ : ۷۵)

کیا تم ان سے امید رکھتے ہو کہ یہ تمہاری بات مان لیں گے ؟

یہ ایسے ہٹ دھرم ہیں کہ اپنی کتاب میں بھی وہ باتیں جو ان سے کہی گئی ہیں - ان میں سے جو باتیں ان کی مرضی کے خلاف پڑتی ہیں یہ خشیئت الٰہی سے محروم ان میں بھی رد وبدل کردیا کرتے ہیں۔ جس کتاب پر ایمان ہے اس مین بھی تحریف کرتے رہتے ہیں۔

اسی سلسلہ کلام میں بطور جملہ معترضہ کے امیین کا بھی ذکر فرما دیا گیا ہے - چونکہ مدینۂ طیبہ میں یہودیوں کے ساتھ یہ بھی انکار وکفر ومخالفت میں یہودیوں کے ہمنوا وشریک کار تھے مگر بحث ومناظرہ کا تعلق ان سے کیا ہوتا۔ ان کے پاس زبانی کٹ حجتی کے سوا تھا ہی کیا ؟ یہودیوں سے البتہ بحثیں ہوتی تھیں اور توارت کی باتیں پیش کرکے ان کو قائل کیا جاتا تھا۔ اس لئے یہود مدینہ کی ہٹ دھرمیوں کے سلسلہ ذکر میں فرمایا گیا ہے -

و منهم امیون لا یعلمون الکتاب الا امانی و ان هم الا یظنون ٥ - (۲ : ۷۸)

یعنی ان منکرین مخالفین کے زمرے میں امیون بھی ہیں - مگر وہ

کسی آسمانی کتاب کو تو جانتے بھی نہیں بجز(وہی) ہوا وہوس کے ۔
وہ بس صرف بے بنیاد باتوں پر چلتے ہیں ۔

چونکہ مدینہ طیبہ میں امیین کی بھی ایک بہت بڑی جماعت موجود تھی اور حوالی مدینہ میں انہی کی اکثریت تھی اس لئے ان کو نظرانداز کس طرح کیا جاسکتا تھا ۔ ان کا ذکر بالکل نہ کرنا باوجود ان کے قابل ذکر نہ ہونے کے مناسب نہ تھا ۔ بدیں وجہ اثنائے ذکر یہود میں مختصر لفظوں میں امیون کا ذکر کرکے ان کے قابل ذکر نہ ہونے کی وجہ بھی بیان فرمائی کہ نہ ان کے پاس کوئی کتاب ہے نہ دوسری قوموں کی کتابوں کا علم رکھتے ہیں نہ ان کو سند سمجھ کر ان کتابوں کی باتوں پر یقین رکھتے ہیں ۔ صرف وہی امیدوں اٹکل پچو کچھ اوہام وظنون ہی پر ان کے دین کا دار ومدار ہے جن کو عقلی دلائل سے بھی کوئی مناسبت نہیں رتو ان اوہام پرستوں کے متعلق کیا باتیں کی جائیں۔ اور ان کی کوئی سی بات اس قابل ہے کہ اس کی تردید ضروری سمجھی جائے ۔ اس لئے مختصر مگر بلیغ جملے میں امیون کا ذکر فرماکر پھر یہود ہی کے حالات بیان فرمائے گئے ۔ اس آیت کریمہ سے امیین کی دینی حیثیت واضح فرمادی گئی کہ ظنون واوہام کے سوا ان کا دینی سرمایہ کچھ نہ تھا ۔ پورے قرآن مجید میں ازروئے نحو، باعراب رفع امیون کا لفظ اسی آیت کریمہ میں آیا ہے ۔ اس کے سوا تین جگہ باعراب جرا امیین کا لفظ آیا ہے ۔ سورۃ اعراف کی آیت کریمہ ۱۵۷ ۔ ۱۵۸ دونوں میں یکے بعد دیگرے اور پھر سورۃ جمعہ کی دوسری آیت کریمہ میں بتوفیقہ تعالیٰ وتبارک ان چاروں آیتوں پر اور لفظ امیین کی معنوی اور قوم امیین کی نسبی ووطنی حیثیت اور وجہ تسمیہ اور پھر ان کی دینی بے بضاعتی سب پر بحث ہوچکی ۔ فالحمد للہ ۔

اَلنَّبِیُّ الْاُمِّیّ

قرآن مجید میں دو جگہ یہ عظمت مآب مرکب توصیفی آیا ہے - ایک ہی سورۃ میں ایک ہی سلسلہ کلام میں ایک ہی جگہ پے درپے دو آیتوں میں یعنی سورۃ اعراف کی آات کریمہ ۱۵۷ میں اور آیت کریمہ ۱۵۸ میں وہ دونوں آیت کریمہ بنی اسرائیل اور حضرت موسیٰ علیٰ نبینا وعلیہ السلام کے بعض اہم واقعات سے متعلق ہیں اس لئے پوری دونوں آیتوں کا لکھنا بھی کافی نہ ہوگا۔ کم سے کم آیت کریمہ ۱۵۵ سے ۱۵۸ تک لکھ کر ترجمہ ہی نہیں بلکہ وپری تفسیر لکھنی ہوگی اور جن واقعات کا ان آیتوں میں ذکر ہے ان کو وضاحت سے سمجھنا ہوگا۔ جس سے خلط بحث بھی ہوگا۔ اس وقت تو مجھ کو صرف یہ دکھانا ہے کہ قرآن مجید میں جو دو جگہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو النبی الامی فرمایا گیا ہے - وہاں ان آیتوں میں النبی الامی کے معنیٰ کیا ہیں؟ اس لئے سورۃ اعراف کی ان دونوں آیتوں میں سے پہلی آیت بقدر ضرورت ہی عبارت پیش کرتا ہوں۔ دونوں آیتوں میں سے پہلی آیت ۱۵۷ کا پہلا جملہ ہے -

الذین یتبعون الرسول النبی الامی الذی یعبدونہ مکتوباً عندھم فی التوراۃ و الانجیل: (اعراف: ۱۵۷)

وہ لوگ جو پیروی کریں گے امی (قوم کے) رسول نبیؑ کی جن (کی نشاندہی) کو وہ تورات اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔

اور پوری آیت ۱۵۸ اس طرح ہے -

قل یٰایھا الناس انی رسول اللّٰہ الیکم جمیعاًۨ الّذِیْ لہ ملک

السّماوات و الارض لا اله الّا هو یحیٖ و یمیت فآمنوا باللّٰه ورسوله النّبیّ الاُمّیّ الّذِی یؤمِنُ باللّٰه و کلمٰاتهٖ و اتّبعُوهُ لعلّکم تهتدون ○ - (اعراف : ۱۵۸)

(اے رسول !) اعلان کرو کہ اے سارے جن وانس ! میں تم سب کی طرف اللہ تعالیٰ کا (بھیجا ہوا) رسول ہوں (وہ اللہ) ساری بلندیوں اور ہر پستی میں جس کی بادشاہی و حکومت ہے جس کے سوا کوئی معبود (برحق) نہیں جو زندگی بخشتا ہے اور موت دیتا ہے تو ایمان لاؤ (اس) اللہ پر اور اس کے رسول امی (قوم کے) نبیؑ پر جو (خود بھی) اللہ تعالیٰ پر ، اور اس کے کلمات پر ایمان رکھتا ہے اور اس (نبی امی) کی پیروی کرتے رہو تاکہ تم منزل مقصود تک پہنچنے کی راہ پا جاؤ۔

ان دونوں آیتوں میں حضور کو النبی الامی فرمایا گیا ہے اور سورۃ جمعہ کی دوسری آیت کریمہ میں آپ ہی کے بارے میں فرمایا گیا ہے ۔

بعث فی الامیین رسولاً منهم -

(اللہ تعالیٰ نے) امی قوم کے لوگوں میں انہیں سے ایک رسول مبعوث فرمایا ۔

اور حضرت ابراہیم و حضرت اسماعیل علیہما السلام نے دعا فرمائی تھی ام القریٰ میں بیت اللہ کی تعمیر کرتے ہوئے کہ ہم دونوں کی نسل میں انہیں میں سے ایک رسول مبعوث فرما اور اسی ام القریٰ میں اپنی نسل کو بسانے کا بھی ذکر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعا ہی میں کیا تھا ۔ اور یہ ساری دعائیں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی نسل کے لئے فرمائی

تھیں جو حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ذریعے ام القریٰ میں اور اس کے حوالی میں پھیلی۔

حضرت ابراہیم و حضرت اسماعیل علیہما السلام کی مشترکہ دعا جو قبول فرمائی گئی اس کا ذکر اس طرح جمیں فرمایا گیا کہ: ھو الذی بعث فی ذریۃ ابراھیم و اسماعیل رسولاً منھم کہ اس میں طوالت بیان الگ ہوتی اور پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اولاد کی سکونت کا ذکر فرمایا تھا۔ وہ سکونت مذکور نہ ہوتی وار فی الامیین فرما دیتے ہیں۔ ام القریٰ کی سکونت کا ذکر بھی ہوگیا۔ اور حضرت ابراہیم و حضرت اسماعیل علیہما السلام ہی کی نسل وہاں بسائی گئی۔ دعا بھی اسی نسل ابراہیمی و اسماعیلی ہی کے لئے کی تھی اس لئے امیین کہنے سے نسل ابراہیم و اسماعیل ہونا ثابت ہورہا ہے اور ان کی سکونت ام القریٰ بھی اس سے ثابت ہورہی ہے۔ انہیں امیین میں سے یہ نبی امی مبعوث ہوئے۔ تو اس صفت امیت سے النبی کا اتصاف اور ان کا --- ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ کی اولاد ہوتا۔ بنی اسماعیل میں سے ہونا ثابت کررہا ہے اور ام القریٰ کا ساکن ہوتا بھی ثابت کررہا ہے۔ اور یہ دونوں باتیں باعث شرف اہل عرب کے نزدیک اس وقت ضرور تھیں۔

حجاز کے علاوہ عرب کے دوسرے شہروں میں غیر بنی اسماعیل اور غیر بنی اسرائیل قبائل بھی تھے۔ وہ بنی اسماعیل کا بہت احترام کرتے تھے۔ بنی اسرائیل کے سوا عرب کے سارے قبائل بنی اسماعیل امیین کا احترام کرتے تھے۔ ان کی خاندانی عظمت اور خادم و مجاور بیت اللہ ہونے کی وجہ سے عام طور پر سارے غیر اسرائیلی قبائل عرب بنی اسماعیل کو قابل احترام مانتے تھے۔ للبدل اللامیین کے آخر یہ رہنے والے تھے ام

القریٰ کے ساکن تھے۔ اس لئے ہر طرح کے حملہ آوروں سے محفوظ تھے یہاں تک کہ ان کے تجارتی قافلے بھی ڈاکوؤں کے حملے سے محفوظ رہتے تھے۔ ڈاکو بھی ان امیین کا احترام کرتے تھے۔ اس لئے الرسول النبی کے لفظوں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت وجلالت منصبی کا اظہار فرمایا گیا اور الامی کے لفظ سے آپ کی خاندانی شرافت اور مولد ومسکن کی عظمت بھی بتا دی گئی ۔ اتنی واضح بات مذکورہ بالا آیات کے ہوتے ہوئے ہمارے اسلاف صرف ایک جھوٹی اور خلاف عقل روایت پر یقین کرلینے کی وجہ سے سمجھ نہ سکے۔

ان پڑھ ہونا معجزہ نہیں ہے

قرآن مجید میں صاف طور پر بیان فرمایا گیا ہے کہ

وما کنت تتلوا من قبلہ من کتاب ولا تخطّہٗ بیمینک اذاً لّارتاب المبطلون - (عنکبوت: ۴۸)

(اے رسول) اس (منصب) سے پہلے تم کوئی کتاب پڑھ سکتے تھے نہ اپنے ہاتھ سے کچھ لکھ سکتے تھے۔ (اگر تم لکھے پڑھے ہوتے) تو اس وقت باطل پرست لوگ (طرح طرح کے) شبہات پیدا کرتے ۔

حضورؐ کے لئے لکھے پڑھے نہ ہونے کا صرف ایک فائدہ بیان فرمایا گیا ہے اگر حضورؐ کے لئے ان پڑھ ہونا معجزہ ہوتا تو فرمایا جاتا: **ومن ایات نبوتک انک ما کنت تتلوا من قبلہ من کتاب** - الخ اور نہ ہی یہ کوئی معجزہ ہوسکتا ہے ۔ البتہ جو شخص چالیس برس تک پوری قوم کا جانا بوجھا ان پڑھ ہو وہ دفعتاً لکھی ہوئی کتاب ہر پڑھنے والے سے بہتر طریقے سے پڑھنے لگے اور اپنے ہاتھ سے بہترین خطاطی کے نمونے دکھانے لگے تو

یہ البتہ معجزہ ہوگا۔

نبوت کے بعد ۲۳ برس تک آپؐ کو موقع ملا، اتنی وسیع مدت میں آپؐ کے لئے پڑھنا لکھنا، سیکھ لینا کیا دشوار تھا؟ اہل سیر کے لکھنے کے مطابق نبوت کے بعد ۲۳ برس کا وسیع وقت ملنے کے باوجود بھی تادم وفات آپؐ کا ان پڑھ رہنا معجزہ ہرگز نہیں ہوسکتا۔ نعوذ باللہ اس کو لکھنے پڑھنے کی اہمیت نہ سمجھنا اور لکھنے پڑھنے کی طرف سے بے پرواہی ضرور کہا جائے گا۔ متنبیؔ نے خوب کہا ہے۔

ولم اوفی عیوب الناس شیئاً
کنقص القادرین علی التمام

یعنی انسانوں کے عیبوں میں سے (بدترین) اس جیسا عیب میں نہیں سمجھتا کہ اپنی تکمیل کی قدرت رکھنے کے باوجود لوگ اپنے نقص پر قانع رہیں۔

غرض منافقین نے ان پڑھ ہونے کو معجزہ قرار دے کر اس کا خوب ڈھنڈھورا پیٹا اور طرح طرح سے اس کو مشہور کیا اور لفظ امی کے معنیٰ ہی ان پڑھ قرار دے کر اس کو خوب مشہور کیا اور بعد کو ایک حدیث بھی گھڑلی۔

اُمَّۃٌ اُمِّیَّۃٌ

صرف اسود بن قیس النخعی الکوفی سعید بن عمرو بن سعید سے روایت کرتا ہے کہ انہوں نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے سنا کہ انہوں نے حدیث بیان فرمائی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حضور نے فرمایا کہ:

انا امة امیۃ لانکتب و لا نحسب الشھر ھکذا و ھکذا ھکذا و عقد الایام فی الثالثۃ - و الشھر ھکذا و ھکذا و ھکذا

یعنی تمام ثلاثین:

ترجمہ: ہم لوگ امت امیہ (امی قوم) ہیں نہ حساب کرتے ہیں (نہ لکھنا جانتے ہیں نہ گنتی جانتے ہیں) مہینہ اس طرح ہے اور اس طرح ہے (اپنی دسوں انگلیوں سے کف ہلا ہلا کر بتایا) مگر تیسری بار میں انگوٹھے کو دبا لیا تھا (یعنی ۲۹ کی گنتی بتائی) پھر (اسی طرح دونوں ہتھیلیوں کی انگلیوں سے کف دست تین بار ہلا ہلا کر بتایا کہ) اور مہینہ اس طرح ہے اور اس طرح ہے اور اس طرح ہے (اب کی بار انگوٹھا نہیں دبایا) تیس پورا کیا۔

یہ حدیث مختلف طریق سے مروی ہے مگر اسود بن قیس ہی سے۔ صحیح بخاری میں بھی یہ حدیث اسود بن قیس ہی سے مروی ہے۔ یہ اسود بن قیس دراصل اسود بن یزید بن قیس النخعی الکوفی ہے۔ نہایت مفتری تھا۔ کوفے کے بلوائی قاتلین حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ کا سرغنہ تھا۔ حضرت معاویہؓ کی زندگی تک چھپا رہا۔ ان کی وفات کے بعد راوی احادیث بن کر نمودار ہوا۔ اس کے شاگردوں نے مشہور کیا کہ اس نے حضرت ابوبکر و حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنھم کے ساتھ حج کئے تھے حضرت صدیق اکبرؓ کے ساتھ اس کا حج کرنا تو ناممکن ہے۔ کیونکہ اس کی موت بقول ابی اسحاق السبیعی الکوفی ۷۵ ھ میں ۶۳ برس کی عمر میں ہوئی تھی۔ اس حساب سے اس کی پیدائش ۱۲ ھ کی ٹھہرتی ہے۔ قاتلین حضرت عثمانؓ کے ساتھ کوفے سے بیس برس کی عمر

میں جوانی دوانی کا جوش لئے ہوئے آیا تھا اور بلوائیوں کے سرغنوں میں سے ایک سرغنہ تھا۔

اس سے روایت کرنے والے اس کے ہم مسلک تلامذہ نے اس کی طرف متعدد حج کو منسوب کردیا ہے ۔ اس کو بڑا عابد ثابت کرنے کے لئے یہ جھوٹی حدیث جو اس کذاب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کی ہے اسی سے اس کی منافقت اور کذابیت ثابت ہورہی ہے ۔

لیکن یاد رہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جو قول اس افترائی حدیث میں قصداً وعمداً منسوب کیا گیا ہے ، اس میں صرف حضورؐ ہی کے حساب وکتاب سے نابلد ہونے کا ذکر نہیں ہے بلکہ حضورؐ کی پوری قوم کو لکھنے پڑھنے سے ، حساب و کتاب وعدد وشمار جاننے سے بالکل نابلد ثابت کیا گیا ہے ۔ انا امۃ امیۃ کہہ کر اور اسی افترائی حدیث کی بنیاد پر امی کے معنیٰ ان پڑھ مشہور کیا گیا ہے ۔ اس افترائی حدیث کے سوا کوئی دلیل لوگوں کے پاس اس کی نہیں کہ امی اس کو کہتے ہیں جو لکھنا پڑھنا نہ جانتا ہو نہ گنتی جانتا ہو ۔ تو یہ حدیث مکذوب علی الرسول یہ بتاتی ہے کہ حضورؐ تیس اور انتیس کی گنتی تک نہیں جانتے تھے اور لکھنا پڑھنا گنتی اور اعداد کے نام نہ آپ جانتے تھے نہ آپ کی قوم یعنی بنی اسماعیل کی پوری قوم نہ جانتی تھی۔ مگر ایسی قابل قوم کے ان رسول پر جو کتاب اتری ہے اس میں اعداد کے ناموں کی کثرت دیکھئے۔ ان آیات کو بقول اسود بن قیس النخعی (نعوذباللہ تعالیٰ) خود رسول نہیں سمجھتے ہوں گے ۔ دوسروں کو ایسی کتاب

کی تعلیم وہ کیا کر سکتے ہیں جس کو وہ خود نہیں سمجھ سکتے تھے۔

ایک ۔ مذکر قل ھو اللہ احد ۔ (ایک) مؤنث احدی الطائفتین (انفال ۷) دو گروہوں میں سے ایک ۔

دو ۔ مذکر اثنان ذوا عدل منکم (مائدہ ۱۰۶) دو (گواہ) عدل وانصاف والے تم میں سے ۔ دو مؤنث فان کانتا اثنتین (نساء ۱۷۷ ۔ آخری آیت) (اگر بے والد ولد میت کے صرف دو (بہنیں) ہوں ۔

تین ۔ مذکر ثلثۃ قروء (بقرۃ ۲۲۸) (مطلقہ بیویوں کی عدت) تین حیض ۔ مؤنث ، فی ظلمات ثلث (زمر۔ ٦) (بچہ ماں کے پیٹ میں) تین (طرح کی) تاریکیوں میں (رہتا ہے)

چار۔ مذکر اربعۃ من الطیر (بقرۃ ۔ ۲٦۰) چار پرندوں میں سے لو ۔ مؤنث اربع شھادات باللّٰہ (نور ٦ ۔ ۸) چار شہادتیں (قسمیں) اللہ تعالیٰ کی ۔

پانچ ۔ مذکر۔ و یقولون خمسۃ (کہف ۔ ۲۲) اور (بعض لوگ اصحاب کہف کے بارے میں کہتے ہیں) کہ پانچ ہیں۔ سادسھم کلبھم ان میں ان کا چھٹا کتا ۔

چھ ۔ فی ستۃ ایام ۔ چھ دنوں میں (اعراف : ۵۴ ، یونس : ۳)

سات ۔ و یقولون سبعۃ ثامنھم کلبھم ۔ (کہف ۲۲۰) اور (بعضے اصحاب کہف کے متعلق) کہتے ہیں کہ وہ سات ہیں ۔ آٹھواں ان کا کتا ہے ۔

آٹھ ۔ مذکر ثمانیۃ ازواج (انعام : ۱۴۴) آٹھ قسم کے (چار پائے)

مؤنث: ثمانی حجج (قصص ۲۷) آٹھ برس -

نو - مذکر - تسعة رھط (نمل: ۴۸) نو قبیلے (مونث) و اذ دادو تسعاً (کہف: ۲٦) لوگوں نے نو کا اضافہ کردیا-

دس - مذکر- فله عشر امثالھا (انعام: ۱٦۱) تو اس کے لئے دہ گونہ ہے ویسا ہی ہے -- مؤنث تلک عشرة کاملہ - (بقرة: ٦۰) یہ پورے دس ہوئے -

گیارہ: احد عشر کوکباً (یوسف: ۴) گیارہ ستارے -

بارہ - اثنتا عشرة عینا - (بقرة: ۱۲۰) بارہ جھرنے -

ایک سے بارہ تک مسلسل اعداد اکثر کے مذکر و مؤنث دونوں قرآن مجید میں آپ نے دیکھ لئے - ان کے علاوہ انیس کا بھی ذکر ہے -

علیھا تسعة عشر - (مدثر: ۲۹) دوزخ پر انیس فرشتے مقرر ہیں-

اس کے علاوہ: مثنیٰ و ثلاث و ربٰع (نساء: ۳) دو دو، تین تین اور چار چار -

پھر آیات وراثت میں نصف میراث اور ثلث اور ربع اور ثمن (آدھا، دو تھائی، تھائی، چوتھائی اور آٹھویں حصہ کا حساب) تقسیم میراث کے سلسلے میں ایسے بھولے بھالے رسولؐ کس طرح کرسکتے ہوں گے جو تیس اور انتیس کی گنتی تک نہ جانتے ہوں اور پوری قوم تو ضرور اپنے رسولؐ سے زیادہ ہی بھولے پن میں ہوگی- وہ تقسیم میراث کی آیات (مذکورہ بالا آیات) کو کس طرح سمجھی ہوگی؟

جتنے اعداد بیان کئے گئے وہ آحاد کے ہوئے یا پہلا عشرہ اور اس کے کچھ لواحق ان کے علاوہ بڑے بڑے اعداد بھی ہیں انہیں بھی دیکھ لیجئے۔

دس ۔ و لیال عشر ۔ (فجر: ۲) اور دس راتیں گواہ ہیں۔

بیس ۔ ان یکن منکم عشرن ۔ (انفال : ٦۵) اگر تم میں سے بیس (مجاہدین) ہوں۔

تیس : حمله و فصاله ثلٰثون شهراً (احقاف : ۱۵) بچے کے حمل میں رہنے اور پیدائش کے بعد دودھ چھڑائی تک کے وقت کی مدت تیس مہینے بتائی گئی ہے ۔

چالیس ۔ اسی آیت کریمہ سورۃ احقاف میں اس پر ہے : و بلغ اربعین سنة اور پہنچا چالیس برس کی عمر تک ۔

پچاس : الّا خمسین عاما ۔ (عنکبوت : ۱۴) مگر پچاس برس

ساٹھ : ستین مسکیناً ۔ (مجادله : ۴) ساٹھ مسکین ۔

ستر : سبعون ذراعاً ۔ (حاقه : ۳۲) ستر ہاتھ ۔

اسی : ثمانین جلدة ۔ (نور ۔ ۴) اَسی دُرّے ۔

ننانوے : له تسع و تسعون نعجة ا (ص : ۲۳) اس کے ننانوے دنبیاں ۔

ایک سو : مائة عام ۔ (بقرة : ۲۵۹) سو برس ۔

دو سو : یغلبوا مائتین ۔ (انفال : ٦۰) غالب آجائیں گے دو سو پر ۔

تین سو : ثلث مائة سنین ۔ (کہف : ۲۵) تین سو برس ۔

ایک ہزار: ان یکن منکم الف - (انفال: ٦٦) اگر تم میں سے ایک ہزار ہوں -

دو ہزار: یغلبوا الفین - (انفال: ٦٦) تو دو ہزار پر غالب آجائیں گے -

تین ہزار: بثلاثة آلاف - (آل عمران: ۱۲۴) تین ہزار (ملائکہ) سے -

پانچ ہزار: بخمسة آلاف من الملائكة (آل عمران: ۱۲۵) پانچ ہزار فرشتوں سے -

پچاس ہزار: خمسین الف سنة - (معارج: ۴) پچاس ہزار برس -

ایک لاکھ: الیٰ مائة الف - (صافات: ۱۴۷) سو ہزار کی طرف -

واضح رہے کہ اس کے بعد اویزیدون ہے - یہاں او اضراب کے لئے " بلکہ " کے معنیٰ میں ہے -

اللہ لگتی کہیے

جس رسولؐ پر ایسی کتاب اترے جس میں تقریباً ایک سے لے کر ایک لاکھ تک کی گنتی ہو۔ آحاد وعشرات اور ان سے مرکب اعداد مذکور ہوں۔ تقسیم میراث کا جس کو حساب بتایا گیا ہو، زکوٰۃ ومال غنیمت کی تقسیم کا جس کو قانون بتایا گیا ہو کیا وہ ایسا ہوسکتا ہے کہ نہ پڑھنا لکھنا جانے نہ حساب جانے - یہاں تک کہ ایک

سے لے کر دس تک سے زیادہ گنتی بھی نہ جانتا ہو۔ دونوں ہاتھوں میں دس انگلیاں ہیں اسی کے برابر وہ دس تک کسی طرح گن لیتا ہو۔ کیا امی کے یہ معنیٰ نزول قرآن مجید کے وقت اہل عرب خصوصاً اہل حجاز جانتے تھے؟ اور اسی معنیٰ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معاذ اللہ من ذالک بے پڑھا لکھا ان پڑھ جاہل ہی کے معنیٰ میں "النبی الامی" سورۃ اعراف کی آیت کریمہ ۱۵۷- ۱۵۸ دونوں میں فرمایا گیا ہے۔؟

خیال رہے کہ سورۃ اعراف کی ان دونوں آیتوں کے مخاطب بنی اسرائیل ہیں اور بنی اسرائیل میں علما بھی تھے۔ سورۃ شعراء کے مخاطب مشرکین مکہ کے بارے میں فرمایا گیا ہے۔

اولم یکن لھم ایۃ ان یعلمہ علمٰٓؤا بنی اسرائیل ۝ ۱۹۷/۲۶

کیا (یہ بات) ان (مشرکین مکہ وعوام اہل کتاب) کے لئے (اس قرآن مجید کے منزل من اللہ برحق ہونے کی) ایک عظیم علامت نہیں ہے؟ کہ اس (کی باتوں کے برحق ہونے) کو علمائے بنی اسرائیل خوب جانتے ہیں۔

سورۃ اعراف بھی سورۃ الشعراء کی طرح مکی ہی سورۃ ہے۔ مگر سورۃ اعراف میں حضرت موسیٰ علیٰ نبینا علیہ السلام سے متعلق واقعات بڑی تفصیل کے ساتھ ہیں۔ آیت کریمہ ۱۰۳ سے ۱۶۲ تک مسلسل ساٹھ آیات کریمات کے مخاطب بنی اسرائیل یہود ہی ہوسکتے ہیں اس لئے آیات کے متعلق میرا یہ خیال ہے کہ یہ سب مدنی آیتیں ہیں اور یہود مدینہ ان کے مخاطب ہیں۔ خصوصاً اس لئے کہ آیت کریمہ ۱۵۶ میں

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا ختم ہوئی ہے ۔ ۱۵۶/۷

و اکتب لنا فی هذه الدنیا حسنة و فی لا خرة انا هدنآ الیک
پڑھئے ۔ اور ہمارے لئے اس دنیا میں بھلائی مقدر کردی جائے اور آخرت میں بھی ۔ ہم سب نے تجھی سے لو لگا رکھی ہے ۔

حضرت موسیٰ کی اس دعا کا جواب یہ عطا فرمایا گیا ہے کہ : عذابی اصیب بہ من اشاء و رحمتی و سعت کل شئی ۷/۱۵۶ میرا عذاب ، تو جس کو میں (اس کا) مستحق سمجھتا ہوں اسی پر نازل کرتا ہوں ۔ اور میری رحمت تو ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے ۔" حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا کا جواب یہاں پر ختم ہوگیا ۔ اس کے بعد ، یعنی اس لمبی تمہید کے بعد بنی اسرائیل ہی کو رسالت محمدؐیہ پر ایمان لانے کی دعوت دی جاتی ہے ۔ ان کے عوام کو نہیں ۔ علمائے بنی اسرائیل کو ۔

آیت کریمہ ۱۵۶ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی التجاء کے جواب کا آخری جملہ ہے و رحمتی و سعت کل شئی اس کے بعد موجودہ یعنی ہجرت نبویؐ کے وقت جو بنی اسرائیل مدینہ طیبہ وحوالی مدینہ طیبہ موجود تھے ۔ ان کو اتباع دین محمدیؐ کی ترغیب کیلئے " ورحمتی وسعت کل شئی " فرمانے کے بعد فائے استیناف کے ذریعے استدرا کی عطف اس جملے پر کرکے ارشاد ہوا : کہ

فساکتبها للزین یتقون و یؤتون الزکوة و الذین هم بایتنا یؤمنون : " لیکن اب ہم رحمت کو لازم کردیں گے ان لوگوں کے لئے جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں اور زکوۃ دیتے رہتے ہیں ۔ اور ہماری آیتوں پر ایمان رکھتے ہیں ۔" ۷/۱۵۶

تین باتیں فرمائی ہیں :-

۱۔ تقویٰ جسکا پتہ حقوق العباد کی نگہداشت سے ملتا ہے۔

۲۔ ادائے زکوٰۃ مالی قربانی نفس پر بہت شاق ہوتی ہے ۔ اور مالی ایثار کرنے کا حکم دینا بھی ایمانی آزمائش کا اہم ترین ذریعہ ہے ۔

۳۔ آخر میں ایمان کا ذکر فرمایا ۔ اس لئے کہ ہر جماعت میں بعض نیک نفس ہوتے ہیں ۔ فطری نیک نفسی کی وجہ سے حقوق العباد ادا کرتے ہیں۔ مالی قربانی بھی کرتے ہیں۔ لیکن ایمان نہیں رکھتے۔ اس لئے وہ دنیا میں اپنی نیک نفسی کی وجہ سے نیک نام و ہر دل عزیز ضرور رہیں گے اور دنیاوی خوشحالی ان کو ضرور حاصل ہوگی ۔ وما یفعلوا من خیر فلن یکفروہ (آل عمران :۱۱۵) " وہ جو نیکی کریں گے اس کی ناقدری نہیں کی جائے گی۔"

لیکن ارشاد فرمایا گیا ہے ۔

لا خیر فی کثیر مّن نّجوٰھم الامن امر بصدقۃ او معروف او اصلاح بین الناس - و من یفعل ذالک ابتغآء مرضات اللّٰہ فسوف نؤتیہ اجراً عظیماًo - (نساء: ۱۱۴)

" ان کی باہمی مشورت کی مجلسوں میں کوئی بھلائی نہیں ہوتی بجز اس کے کہ کوئی (اس میں) صدقہ وخیرات کی بات پیش کرے یا کسی اور رفاہ عام کی بات پر لوگوں کے درمیان اصلاح ومصلحت کی تدبیر پر غور وبحث ہو (بیشک یہ سب کار خیر ہیں) لیکن انہی کاموں کو جو شخص ابتغائے مرضاۃ اللہ کی نیت سے کرے گا تو وہ (آخرت کے) اجر عظیم کا مستحق ہوگا۔ (ورنہ دنیاوی مفاد کے لئے جو نیکیاں کرے گا اس کو دنیاوی مفاد حاصل ہوجائے گا)۔"

اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا ہے ۔

ومن یّرد ثواب الدّنیا نؤتیہ منھا۔ (آل عمران : ۱۴۵) جو شخص (اپنی نیک عملی کام میں اجر دنیا ہی کا مفاد چاہے گا) ۔ ہم اس کو دنیا سے (جو مناسب سمجھیں گے) دیدیں گے۔
مگر یہ بھی فرمایا ہے ۔

فمن النّاس من یّقول ربّنا اٰتنا فی الدّنیا وما لہ فی الاٰخرۃ من خلاق ۲/۲۰۰

" بعض لوگ دعا کرتے ہیں کہ اے ہمارے رب ہمیں اس دنیا میں (بھلائیاں) عطا فرما، اور (چونکہ وہ آخرت کے لئے کچھ کرتے نہیں اس لئے) آخرت میں اس کے لئے (خوشحالی میں سے) کوئی حصہ نہیں ۔"

غرض ایمان کے بغیر ساری نیکیاں آخرت میں کچھ کام نہیں دے سکتیں ۔ سب وہاں اکارت ہیں ۔ اس لئے یہاں آخر میں ایمان کا ذکر فرمایا گیا ۔ نماز کا ذکر نہیں فرمایا اس لئے کہ نماز ہی تو ایمان کا عملی وظاہری ثبوت ہے ۔ ایمان تو دل کی بات ہے ۔ نماز ہی کی پابندی ایمان کا ثبوت پیش کرتی ہے ۔ اسلئے ایمان کے ذکر کے بعد صلوۃ کے ذکر کی ضرورت نہ تھی عیاں راچہ بیاں ۔ زکوٰۃ چونکہ " زرمی طلبی سخن دریں است " والی چیز ہے اسلئے اس کا ذکر فرمایا گیا ۔
اس کے بعد بتایا کہ وہ مستحق زکوٰۃ ادا کرنے والے آیات اللہ پر ایمان رکھنے والے کون لوگ ہیں؟

الّذین یتّبعون الرّسول النّبیّ الاُمّیّ الّذی یجدونہ مکتوباً

عندھم فی التوٰرۃ و الانجیل - (الایۃ) ۷/۱۵۷
"وہ لوگ ہیں جو اس رسول نبی امی کی پیروی کریں گے جن کا ذکر
وہ اپنے پاس تورات وانجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں -"

یعنی علمائے بنی اسرائیل جو تورات وانجیل کا علم رکھتے ہیں - جس وقت یہ آیت کریمہ اتری تھی اور مدینے کے یہودیوں نے سنی تھی۔ اگر امی کا لفظ واقعی ان پڑا، پڑھنے لکھنے سے عاری، گنتیوں کے نام تک جس کو نہ آتے ہوں، ایسے جاہل ہی کے لئے اہل عرب بولتے تھے تو علمائے بنی اسرائیل ضرور کہتے کہ ہم لوگ اہل علم ہیں - لکھنا پڑھنا اپنی دینی زبان عبرانی وسریانی میں بھی جانتے ہیں اور ہم پشہتا پشت سے عرب کے رہنے والے ہیں، اس لئے عربی زبان میں بھی لکھنا پڑھنا جانتے ہیں۔ ایک ان پڑھ شخص کی جس کو گنتی تک نہ آتی ہو اس کا اتباع کیوں کرنے لگے؟ اگر صحیح بخاری کی یہ حدیث ان میں مدخور نہ ہوتی اور واقعی حضورؐ اس حدیث کے مطابق لانکتب و لا نحسب کے مصداق ہوتے تو یہود خصوصاً علمائے یہود ضرور حضورؐ کے ان پڑھ ہونے کا طعن دیتے رہتے اور قرآن مجید میں اس کا ضرور کچھ جواب اترتا۔ کم سے کم تاریخی راویتوں میں یہودیوں کے اس طعن کا ذکر ہوتا اور جس طرح اہل سیر اس ان پڑھ ہونے کو معجزہ ثابت کررہے ہیں۔ صحابہ یہودیوں کے طعن کا جواب دیتے - اس معجزے کو یہودیوں پر ثابت کرتے اور اس کا ذکر تاریخی روایات میں ہوتا۔

قران مجید میں کہیں بھی اشارۃ، کنایۃ آپ کے نبوت کے بعد بھی ان پڑھ رہنے کا ذکر ہنیں بلکہ پڑھنے کا ذکر ہے - آپ کے ان پڑھ ہونے کا ذکر نبوت و رسالت سے قبل کی قید کے ساتھ ہے۔ جس سے صاف ظاہر

ہے کہ نبوت کے بعد آپ لکھنے پڑھنے لگے تھے۔ اس قرآنی تصریح کے بعد بھی ایک جھوٹی حدیث پر ایمان رکھنا اور قرآنی آیات کی معنوی تحریف کرنا سخت افسوسناک ہے۔

تعلیم رسول:

حسب روایت صحیح بخاری وغیرہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر سب سے پہلے جو قرآن مجید کی آیتیں اتریں وہ سورۃ علق کی ابتدائی پانچ آیتیں تھیں جن میں سے پہلی ہی آیت میں اقراء (پڑھو) کا حکم ہے۔ جس سے صاف ثابت ہو رہا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلے پڑھنے کی صلاحیت عطا کردی گئی۔ اس کے بعد پڑھنے کا حکم ہوا اور ان پانچ میں سے تیسری آیت اور چوتھی آیت پڑھیئے

اقراء و ربک الاکرم ○ الذی علم بالقلم ○ - ۹۶/۳،۴

پڑھو تمہارا رب ساری بزرگیوں کا مالک ہے جس نے قلم کے ذریعے تعلیم فرمائی۔

اس سے ثابت ہورہاہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو قلم کے ذریعے اسی جگہ قرآت کے ساتھ کتابت کی بھی تعلیم فرمائی گئی تھی اور عطائے منصب نبوت کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پڑھنے اور لکھنے دونوں کی تعلیم فرمائی گئی تھی۔ ان پانچوں آیتوں میں سے آخری یعنی پانچویں آیت ہے۔

علم الانسان مالم یعلم ○ - ۹۶/۵

اس انسان (کامل) کو ان (تمام باتوں کی جو منصب نبوت ورسالت وتبلیغ و ارشاد کے لوازمات میں سے ہیں۔ ان سب باتوں کی) جن کو وہ (کسی اور ذریعے سے) نہیں جان سکتے تھے تعلیم دی۔

اور جب اللہ تعالی کی طرف سے تعلیم ہوئی تو یقیناً دوسرے معلموں سے بہتر تعلیم ہوئی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہر قاری سے بہتر قاری اور ہر کاتب سے بہتر کاتب معجزانہ طور سے دفعتاً ہوگئے۔

اسی کی تائید صلح حدیبیہ کے اس مشہور واقعہ سے ہوتی ہے جسے بخاری ومسلم دونوں نے اپنی اپنی کتاب میں درج کیا ہے اور ان کے حوالہ سے مشکوٰۃ کے مؤلف نے بھی نقل کیا ہے۔ جس سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا لکھا پڑھا ہونا صراحتاً ثابت ہوتا ہے۔

ہم اسے مشکوٰۃ ہی سے نقل کرتے ہیں کیوں کہ یہ کتاب درس نظامی کے نصاب میں اور صحاح ستہ کا خلاصہ ہونے کی وجہ سے عوام میں بھی کافی مشہور ہے۔

مشکوٰۃ کے سب سے مستند اردو ترجمہ حضرت شاہ اسحاق دہلوی کے مشہور شاگرد نواب قطب الدین خان نے اپنی کتاب مظاہر حق میں اس حدیث کا ترجمہ ان الفاظ میں کیا ہے:

جب لکھا صلح نامہ، لکھا صحابہؓ نے نام شریف حضرت کا اس طرح "یہ وہ چیز ہے کہ صلح کی اس پر محمدؐ رسول اللہ نے" کہا مشرکین نے نہیں اقرار کرتے ہم ساتھ رسالت تمہارے کے، پس اگر جانتے ہم کہ تم رسول اللہ ہو، نہ منع کرتے ہم یعنی مکہ کے آنے سے، لیکن تم محمد بن عبداللہ ہو یعنی اسی طرح لکھو۔ پس فرمایا حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ میں ہوں رسول اللہ، اور میں ہوں عبداللہ، یعنی دونوں صفتیں لازم ہیں آپس میں، نہیں جدا

ہوتیں، برابر ہے کہ دونوں کا ذکر کی جائیں یا ایک پھر فرمایا علیؓ بن ابی طالب کو کہ مٹا دو لفظ رسول اللہ کو، کہا حضرت علیؓ نے، قسم ہے اللہ کی نہیں مٹاؤں گا میں نام تمہارا کبھی، پس لیا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے صلح نامہ حضرت علیؓ کے ہاتھ سے، حالانکہ نہیں لکھنا جانتے تھے۔ پس لکھا حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ وہ چیز ہے ۔کہ صلح کی اس پر محمد بن عبداللہ نے ۔ نہ داخل ہو مکہ میں ساتھ ہتھیاروں کے مگر اس طرح سے کہ تلواریں ہو غلافوں میں، اور یہ کہ نہ نکلے مکہ کے لوگوں میں سے کوئی حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جانے کا، اور یہ کہ نہ منع کریں اپنے یاروں میں سے کسی کو اگر ارادہ کرے ٹھہرنے کا مکہ میں۔ نقل کی یہ بخاری اور مسلم نے ۔"

اس ترجمہ کے بعد مظاہر حق میں شرح کرتے ہوئے لکھا ہے:

" اور اختلاف واقع ہوا ہے علماء میں بیچ لکھنے آنحضرت کے کہ بعضے تو کہتے ہیں کہ ہرگز نہ لکھا اور نہ لکھ سکتے تھے بسبب اس کے کہ اللہ تعالیٰ نے امی فرمایا ہے اور امی وہی ہوتا ہے کہ نہ پڑھ سکے اور نہ لکھ سکے۔

اور بعضوں نے کہا کہ لکھا حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے، بعد ازاں کہ ثابت ہوئی حجت نبوت پر اور منقطع ہوا شبہ ۔ اور ظاہر اس حدیث کا حجت ان کی ہے اور مفکر اس کی تاویل کرتے ہیں۔"

(مظاہر حق شرح مشکوۃ جلد سوم ص ۴۱۰ مطبوعہ مجیدی کانپور، انڈیا طبع قدیم ۔جہازی سائز)

مشکوۃ کے عربی اڈیشن میں اس حدیث پر درج ذیل حاشیہ ہے:

" امام نووی شرح مسلم میں اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے قاضی عیاض کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ اس حدیث کی بناء پر امام باجی وغیرہ بعض اہل علم اس کے قائل ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے لکھنا سکھا دیا تھا، وہ کہتے ہیں کہ نبوت سے قبل آپؐ کو تلاوت کرنا نہیں آتا تھا مگر اللہ نے سکھا دیا جس کے سب قائل ہیں، تو جب تلاوت سیکھ جانا امیت کے منافی نہیں ہے تو اللہ تعالیٰ ہی کے سکھانے سے نبوت حاصل ہونے کے بعد لکھنا سیکھ لینا امی ہونے کے خلاف کیوں

مخالفین جو یہ استدلال پیش کرتے ہیں کہ آپؐ نبوت سے قبل نہ کتاب تلاوت کرتے تھے، نہ لکھتے تھے، اگر تلاوت اور لکھنا جانتے تو کفار شک میں پڑ جاتے۔ اس استدلال کے متعلق یہ حضرات کہتے ہیں کہ یہ ارشاد ربانی بالکل درست ہے کہ اگر نبوت سے قبل آپؐ لکھنا پڑھنا جانتے تو کفار شک میں پڑ جاتے مگر یہ سیکھ جانا کیوں قابل تعجب ہو کیونکہ بلاشبہ نبوت کے بعد آپؐ کو وحی کے ذریعے ایسے عظیم الشان علوم عطا ہوئے جو امیوں کی دسترس سے باہر ہیں۔ لہذا جب نزول قرآن کے بعد آپؐ کو تلاوت کرنا آگیا اور اسے وما کنت تتلوا من قبلہ من کتاب کے خلاف نہیں سمجھا جاتا تو لکھنا سیکھ لینا* ولا تخطہ کی خلاف ورزی کیوں سمجھا جائے :

مشکوٰۃ (عربی مطبوعہ نور محمد اصح المطابع آرام باغ کراچی ص ۳۵۵، کتاب الجہاد، باب الصلح الفصل الثالث۔ حاشیہ نمبر ایک۔

چوتھی مثال

الایہ وصیت وقانون وراثت

قرآن مبین نے ہر مسلمان پر فرض کیا ہے کہ جب وہ مرنے لگے تو اپنے مال متروکہ کے بارے میں اپنے والدین اور قریب تر رشتہ داروں کیلئے مناسب وصیت کر جائے، آیت یہ ہے۔

کتب علیکم اذا حضر احدکم الموت ان ترک خیرن الوصیة للوالدین والاقربین بالمعروف حقاً علی المتقین ○ فمن بدله بعد ما سمعه فانما اثمه علی الذین یبدلونه ان الله سمیع علیم فمن خاف من موص جنفاً او اثماً فاصلح بینهم فلا اثم علیه ان الله غفور رحیم ○ (بقرة آیت ۱۸۰ تا ۱۸۲)

(اے مسلمانو!) تم پر فرض کیا گیا کہ جب تم میں سے کسی کو موت کا وقت آجائے اور وہ کچھ مال چھوڑنے والا ہو تو اپنے باپ، ماں اور قریب تر رشتہ داروں کے لئے وصیت کرجائے مناسب وصیت۔ یہ متقی لوگوں پر (اللہ تعالیٰ کا قائم کردہ) ایک حق ہے (ان کے پسماندوں کا) تو جو شخص اس وصیت کو سن لینے کے بعد بدل دے تو اس کا گناہ اس بدلنے والے پر ہوگا بے شک اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔ ہاں جو شخص وصیت کرنے والے سے ڈرا (اس کی) بے انصافی یا گناہ کی (وصیت کی) وجہ سے تو اس نے ان پسماندوں کے درمیان صلح کرادی تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہے اور اللہ بخش دینے والا مہربان ہے۔

چونکہ اس قسم کے معاملات میں گواہی کی ضرورت پڑ جاتی ہے اس لئے حکم ہوا کہ وصیت کے وقت دو گواہ بھی ضرور رکھ لو۔ چنانچہ ارشاد

ہوا۔

یایھاالذین امنوا شھادۃ بینکم اذا حضر احدکم الموت حین الوصیۃ اثنان ذوا عدل منکم او اخران من غیرکم ان انتم ضربتم فی الارض فاصبتکم مصیبۃ الموت تحبسونھما من بعد الصلوۃ فیقسمان باللہ ان ارتبتم لا نشتری بہ ثمناً ولو کان ذا قربیٰ ولا نکتم شھادۃ اللہ انا اذا لمن الاثمین ○ فان عثر علی انھما استحقا اثما فاخران یقومان مقامھما من الذین استحق علیھم الاولیٰن فیقسمان باللہ لشھادتنا احق من شھادتھما وما اعتدینا انا اذا لمن الظالمین ○ ذالک ادنیٰ ان یاتوا بالشھادۃ علی وجھھا او یخافوا ان ترد ایمان بعد ایمانھم وتقوا اللہ واسمعوا واللہ لا یھدی القوم الفاسقین ○ (مائدہ ۱۰۶ تا ۱۰۸)

اے ایمان والو! جب تمہاری موت کا وقت آجائے اور تم وصیت کرنے لگو تو تمہارے درمیان گواہی کا اصول یہ رہے کہ تم میں سے دو منصف گواہ ہوں۔ اور اگر تم سفر میں ہو اور سفر میں ہی موت کا وقت آجائے۔ اور اپنی جماعت کے دو گواہ نہ ملیں تو غیر جماعت کے دو انصاف پسند گواہ ہوں۔ ان دونوں گواہوں کو نماز کے بعد تک مسجد میں روکے رکھو۔ پھر اگر تم لوگوں کو (اس وصیت کے متعلق) کچھ شک ہو تو وہ دونوں اللہ کی قسم کھائیں کہ ہم اپنے اس حلفیہ بیان پر کوئی قیمت (دنیاوی) نہیں حاصل کرتے اگرچہ وہ (جس کے حق میں وصیت ہے) قرابت دار ہی ہمارا ہو۔ اور ہم اللہ کی گواہی کو چھپاتے نہیں اگر ہم ایسا کررہے ہیں تو اس وقت بے شک ہم گنہگاروں میں سے ہیں۔ پھر اس کا اگر پتہ مل گیا کہ ان دونوں گواہوں نے (اپنی گواہی کے ذریعے) حق مارا ہے گناہ کر کے تو

دوسرے گواہ ان دونوں کی جگہ کھڑے ہوجائیں ان لوگوں میں سے جن کا حق مارا ہے ان دونوں نے جو اولی تھے (شہادت میں) تو اب یہ دوسرے قسم کھائیں اللہ تعالیٰ کی کہ ہماری گواہی ان دونوں کی گواہی سے زیادہ حق ہے اور ہم نے حد صداقت سے تجاوز نہیں کیا ہے۔ اگر ایسا کیا ہو تو ہم لوگ اس وقت ظالموں میں سے ہیں[۱]

اس میں امید ہے کہ ادا کریں شہادت وہ (جو اولیٰ ہیں شہادت کے لئے) ٹھیک طرح پر یا وہ ڈریں کہ (ان کی) قسم رد نہ کردی جائے ان (وارثوں یا دوسرے گواہوں) کی قسم کے بعد تو ڈرو اللہ سے اور (اس کے احکام گوش دل سے) سنو۔ اور اللہ بدکاروں کو ہدایت نہیں دیتا۔

قرآن مبین میں ناسخ و منسوخ کی بحث فرقہ بند علماء کی یادگار ہے۔ حدیثیں تو ہر فرقے نے اپنے اپنے موافق خود بھی گھڑ ڈالیں اور دوسروں کی گھڑی ہوئی حدیثیں بھی جمع کرلیں اور اپنے خلاف جو حدیثیں پائیں ان پر کچھ جرحیں کرکے ان کو موضوع یا ضعیف کہہ دیا یا ان کی کوئی تاویل پیش کردی۔ مگر آیات قرآنیہ کو کیا کرتے؟ تو اگر اختلاف قرآت سے کام چلا تو متواتر متوارث قرآت کے خلاف کسی صحابی یا تابعی کی طرف منسوب کوئی قرآت پیش کرکے اپنا کام نکالا اور کبھی ناسخ و منسوخ کی بحث

"تحاق" احتقاق، باہم حق کے لئے لڑنا کہ ہر فریق اپنے کو حق پر کہے یا اپنا حق بتائے۔ استحقاق حق مارنا، حق دبا لینا جب "علی" کے صلے کے ساتھ آئے اور متعدی ہو تو اس معنیٰ میں آتا ہے۔ الاولیان استحق کا فاعل ہے جو لوگ آخران کی صفت اس کو قرار دیتے ہیں وہ نحوی قواعد کو نظرانداز کرجاتے ہیں، نکرہ کی صفت معرفہ لانا پھر استحق کا فاعل ڈھونڈھتے پھرنا اور جب نہ ملے تو اثم کو اس کا فاعل بنانا، رکاکت پر رکاکت کا ارتکاب ہے۔ اختلاف قرآت والوں کو تو نہ پوچھئے ان کا ذکر ہی بیکار ہے۔ اصل یہ ہے کہ جن کو میت نے مرنے کے وقت اپنی وصیت کا گواہ بنایا وہی گواہی کیلئے اولیٰ سمجھے جاسکتے ہیں ان کو اپنی قسم کا وقار خود رکھنا چاہئیے۔ میت نے انہیں کو شہادت کیلئے منتخب کیا یا وہی وہاں پر تھے اس لئے ان پر اعتماد کیا تو وہی اولی بالشہادۃ ہیں مگر ان کے خلاف وارثوں کے پاس اگر دلائل ہیں تو یہ کیوں ایسی قسمیں کھائیں جو ان کی قسم وارثوں کی قسم سے رد کردی جائے۔

چھوڑ کر۔ مگر اس وقت میرا یہ موضوع بحث نہیں ہے اسلئے میں اس بحث سے قطع نظر کرتے ہوئے لکھتا ہوں کہ آیات وراثت سورۃ نساء میں ہیں اور یہ سورۃ جب کہ کہا جاتا ہے کہ سورۃ بقرۃ کے بعد نازل ہوئی ہے مگر سورۃ مائدہ تو بالکل آخری سورتوں میں ہے ۔ سورۃ مائدہ کے بعد تو صرف سورۃ توبہ اور اس کے بعد آخری سورۃ نصر نازل ہوئی ہے ۔ اس لئے سورۃ نساء سے تو سورۃ مائدہ کو منسوخ نہیں کیا جاسکتا اور نہ کسی روایت میں ہے کہ سورۃ مائدہ کی یہ آیت جو شہادت وصیت کے متعلق آئی ہے اس کا نزول سورۃ نساء کی آیت وراثت کے بعد ہوا۔

اس کے علاوہ ناسخ ومنسوخ کا اصول تو یہ ہے کہ دونوں کا اجتماع محال ہو اس لئے مجبوراً ایک کو ناسخ دوسرے کو منسوخ قرار دیتے ہیں ۔ مگر یہاں آیت حکم وصیت اور آیت قانون وراثت میں کسی طرح کا تضاد نہیں کہ دونوں کے احکام پر عمل عقلاً محال ہو۔

اول تو یہ آیت وصیت کی رو سے وصیت کا حکم مرنے والے کو ہے اور تقسیم وراثت کا حکم ورثہ یا حاکم شرع کو ۔ دو حکم دو شخصوں کو الگ الگ ہوں تو کوئی وجہ نہیں کہ ایک حکم کی وجہ سے دوسرا حکم منسوخ ہوجائے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ آیات وراثت میں جس کا حصہ بھی بیان کیا ہے من بعد وصیۃ کی قید کے ساتھ بیان کیا ہے جس سے صاف ظاہر ہے کہ آیات قانون وراثت وصیت کے حکم کو مدنظر رکھتے ہوئے اسکا لحاظ رکھتے

قرآن میں ہر جگہ وصیت کو دین پر مقدم کیا ہے ۔حالانکہ دین وصیت سے پہلے اجب الادا ہے ۔صرف اسلئے کہ وصیت ہر مسلم پر فرض ہے اور دین ہر مسلم ادا کرہی کے مرتا ہے ورنہ دین کے بارے میں بھی وصیت کرجاتا ہے ۔ اتفاقاً ہی ایسا ہوتا ہے کہ کوئی دین چھوڑ کر مر گیا اور اس کے متعلق ورثہ کو وصیت بھی نہ کرگیا۔ اسلئے من بعد وصیۃ کے بعد او دین فرمایا گیا۔

ہوئے نازل کی گئی ہیں ۔ تو جو حکم پہلے حکم کو باقی رکھ رہا ہے فقہاء کس طرح اس حکم کو اس پہلے حکم کا منسوخ کرنے والا قرار دیتے ہیں ۔ یہ ایک عجیب بات ہے لے دے کر سب سے بڑا سہارا ان لوگوں کی ایک حدیث ملی ، لا وصیۃ لوارث - اور چونکہ ان کی یہ عادت ہے کہ آیت قرآنی سے زیادہ حدیثوں کو اہمیت دیں اس لئے کتنوں نے تو صرف اسی حدیث سے حکم وصیت والی آیت کو منسوخ کہہ دیا۔ جو ذرا سا ہچکچائے تو انہوں نے آیات وراثت سے آیت وصیت کو منسوخ کہہ کر گویا اس اعتراض سے اپنا بچاؤ کرلیا کہ یہ قرآن کو روایت کے ذریعے منسوخ کررہے ہیں۔

اگر یہ حدیث نہ ہوتی؟ اگر یہ حدیث ٫ لا وصیۃ لوارث ٫ کی ان فقہا ومحدثین کے پاس نہ ہوتی تو کیا یہ لوگ آیت حکم وصیت کو قانونی وراثت کی آیتوں سے باوجود حصے کے تصریح کے بعد من بعد وصیۃ کی قید موجود ہونے کے منسوخ سمجھ سکتے تھے؟ حاشا وکلا کبھی نہیں۔

کیا یہ حدیث واقعی متواتر ہے؟ متواتر کی تعریف یہ کی جاتی ہے کہ صحابہؓ وتابعین واتباع تابعین کے تینوں دوروں میں جس حدیث کے راوی اتنے زیادہ ہوں کہ یہ گمان نہ کیا جاوے کہ اتنی بڑی جماعت نے ایک جھوٹی حدیث کی نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کرنے پر اتفاق کرلیا ہوگا۔ یہ تعریف ہرچند منافقین جو تابعین واتباع تابعین ہی کے زمرے میں تھے ۔ ان کی دروغ بافیوں اور ان کی ایک باضابطہ مکمل سازش سے بے خبر اگر اپنے کو رکھا جائے تو ضرور نہایت صحیح اور مناسب معلوم ہوگی ورنہ اگر ان تابعین واتباع تابعین کے سامنے یہ تعریف متواتر حدیث کی بیان کی جاتی تو وہ اگرچہ زبان سے تو کچھ

نہ کہتے بلکہ اس کی صحیح وتصدیق بڑے زوروں پر کرتے۔ مگر دل ہی دل میں یہ ضرور کہتے کہ تم یہ کیا کہتے ہو کہ اتنی بڑی جماعت کا ایک جھوٹی حدیث کی نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کرنے پر متفق ہونا عقلاً محال ہوگا حالانکہ بارہا کردیم وشد۔

طرق روایت پر بحث ۔ بہرحال اب اس حدیث کے طرق روایت پر نگاہ ڈالئیے ۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ حدیث امام مالکؒ کی موطاء اور صحیح مسلم میں بالکل نہیں ۔ صحیح بخاری نے باب تو ضرور باندھا ہے باب لاوصیۃ لوارث۔ مگر اسی باب کے تحت میں اس مضمون کی ایک حدیث بھی ان کو نہ مل سکی۔ البتہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی ایک ذاتی رائے کو انہوں نے نقل کیا ہے جس میں لاوصیۃ لوارث کا لفظ بھی نہیں نہ پوری طرح یہ مفہوم اس سے نکل سکتا ہے عنقریب آپ اس کی تصریح ملاحظہ فرمائینگے ۔

غرض اسی حدیث سے مؤطاء ، بخاری ومسلم تینوں قدیم اور معتبر کتابیں جو علمائے حدیث میں تمام دوسری کتب حدیث سے زیادہ معتبر ہیں بالکل خالی ہیں۔ جس کے یہ معنیٰ ہیں کہ ان لوگوں کے زمانہ جمع وتدوین احادیث تک یہ حدیث گھڑی ہی نہیں گئی تھی یا کم سے کم اس وقت تک ایسے راویوں کی زبانوں تک نہیں پہنچی تھی جن کو یہ امام مالک وامام بخاری وامام مسلم سند وحجت سمجھتے تھے۔

سنن ابو داؤد میں دو باب اس سلسلے میں ہیں پہلا باب فی نسخ الوصیۃ للوالدین والاقربین[۱۸۶/۲] یعنی والدین واقربین کے لئے وصیت کے حکم کا منسوخ ہونا۔ اس باب میں کوئی حدیث رسول نہیں بلکہ حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے ۔ اور وہ یہ ہے ۔

حدثنا احمد بن محمد المروزی حدثنی علی ابن حسین بن و اقد عن ابیه عن یزید النحوی عن عکرمة عن ابن عباس ا ان ترک خیرا ن الوصیة للوالدین و الاقربین - فکانت الوصیه کذالک حتیٰ نسختها آیته المیراث -

ابو داؤد سے احمد بن محمد المروزی نے ان سے علی حسین بن واقد نے، ان سے ان کے باپ نے، ان سے یزید نحوی نے ان سے عکرمہ بربری نے ان سے حضرت ابن عباسؓ نے یہ آیت " ان ترک خیرن الوصیة للوالدین و الاقربین " پڑھ کر بیان فرمایا کہ تھی وصیت اسی طرح ۔یہاں تک کہ اس کو آیت میراث نے منسوخ کر دیا۔

بخاری کی روایت بخاری کی روایت کا ذکر اوپر آچکا ہے وہ بھی حضرت ابن عباسؓ ہی کا قول کہا گیا ہے اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ اس جگہ اس پر بھی بحث کر دی جائے وہ روایت یہ ہے -

باب لاوصیة لوارث- حدثنا محمد بن یوسف عن ورقاء عن ابن ابی نجیح عن عطاء عن ابن عباس اقال کان المال للولد و کانت الوصیة للوالدین فنسخ الله من ذالک ما احب فجعل للذکر مثل حظ الانثیین فجعل للابوین لکل واحد منهما السدس وجعل للمراا الثمن و الربع و للزوج الشطر و الربع

یہ باب ہے اس بارے میں کہ وارث کیلئے وصیت نہیں - ا بخاری سے محمد بن یوسف نے ان سے ورقاء نے ان سے ابن ابی نجیح نے ان سے عطاء نے ان سے حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ مال پہلے بیٹے کیلئے تھا اور وصیت والدین کے لئے ۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس میں سے جو مناسب سمجھا

اس کو منسوخ کیا تو اولاد میں سے مرد کے لئے، دو عورت کا حصہ رکھا اور باقی میں سے ہر ایک کیلئے چھٹا حصہ اور بیوی کے لئے آٹھواں اور چوتھائی اور شوہر کے لئے نصف اور چوتھائی۔

تنقید حدیث کا ایک نہایت اہم طریقہ

جو حدیث درایت قرآنیہ کے خلاف معلوم ہورہی ہو مگر متعدد طرق سے اس کی روایت اس طرح نظر آتی ہو کہ اس پر متواتر یا بہت زیادہ مشہور ہونے کا گمان کیا جاسکے اور اس کی کثرت طرق کو دیکھ کر اس حدیث کو باطل یا موضوع کہنے کی ہمت نہ پڑتی ہو۔ تو اس حدیث کے تمام طرق کو اور اس کے راویوں کو پوری تحقیق کے ساتھ دیانت و باز پرس آخرت کو ملحوظ رکھتے ہوئے دیکھنا چاہئیے کہ اس کے راوی کون کون ہیں اور کہاں کہاں کے رہنے والے ہیں۔

حضرت امیرالمؤمنین اعظم صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی وفات کے بعد جب عہد فاروقیؓ میں ایران فتح ہوا تو اسی وقت سے منافقین ایران نے خراسان کو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جدوجہد جاری رکھنے کیلئے مرکز بنالیا۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت کے بعد عہد عثمانیؓ میں دوسرا مرکز ان منافقین کا کوفہ بنا۔ یہی دو اصل مرکز منافقین کے رہے۔ مگر ان کے علاوہ بصرہ، قرسط، مصر، نصیبین، موصل، اور عراق کے پاس چھوٹے بڑے گاؤں یمن اور شام کے اکثر شہر مثلاً حمص، دمشق، قیساریہ، فلسطین، انطاکیہ، بصبیصہ، طرسوس اور قنسرین وغیرہ میں چھوٹے چھوٹے مراکز ان کے رہے لیکن حدیثوں کے گھڑنے کی اصل ٹکسال خراسان اور کوفہ ہی رہے۔ وقتی طور پر ان چھوٹے

چھوٹے مراکز میں بھی ٹکسال قائم کرلی جاتی تھی۔ مگر چونکہ اس فن کے ماہرین زیادہ تر خراسان اور کوفہ ہی میں مجتمع تھے۔ اس لئے حدیثیں عموماً انہیں دونوں جگہوں میں سے کسی جگہ گھڑی جاتی تھیں اور دوسرے مراکز سے ان کی اشاعت کا انتظام کیا جاتا تھا۔ کچھ دنوں تک خراسان کی طرح نیشاپور بھی ان وضاعین وکذابین کا مرکز رہا ہے۔ مگر آخر میں سب سے بڑا مرکز اور سب سے بڑی ٹکسال کوفہ ہی بن گیا۔ اسی لئے جتنے وضاعین وکذابین کوفے میں ہوئے اور کہیں نہیں ہوئے اور شام کا پورا علاقہ ان منافقین کی زبردست اشاعت گاہ رہا تو ایسی حدیثوں کے رواۃ آپ کو یقیناً انہی جگہوں کے رہنے والے یا یہاں سے تعلق رکھنے والے ہی ملیں گے اور آپ کو تھوڑی چھان بین سے پتہ مل جائے گا کہ یہ تمام طرق انہی جگہوں میں سے کسی ایک یا دو تین جگہوں سے پھیلے ہیں۔

حضرت ابن عباسؓ کا قول وہ قول جس کو امام بخاری کی کتاب میں دیکھتے ہیں گھڑا تو گیا خراسان میں مگر اس کے گھڑنے والے اپنے فن کے ماہر نہ تھے اس لئے اس میں بعض رکاکتیں رہ گئیں۔ جن کو بعد والوں نے محسوس کیا تو پھر ایک نئی روایت گھڑ ڈالی اور وہ بھی خراسان میں ہی گھڑی گئی جن کو سنن ابو داؤد میں آپ دیکھتے ہیں اس میں سے وہ رکاکتیں نکال دی گئیں۔ بخاری کی روایت میں جو رکاکتیں ہیں ان کو میں عنقریب بتادوں گا۔ جب متن حدیث پر بحث ہوگی۔ ابو داؤد کی روایت تو اول سے آخر تک مروزیوں یعنی "مرو[۱]" کے رہنے والوں سے چلی ہے احمد بن محمد المروزی دو ہیں۔ احمد بن محمد بن ابراہیم المروزی متوفی ۲۸۳ھ اور احمد بن محمد بن موسیٰ المروزی متوفی ۲۲۵ھ مگر کسی کے تذکرے میں یہ

نمبر ا۔ "مرو" خراسان کا ایک مشہور شہر تھا جہاں وضاعین وکذابین کا ایک جمگھٹا رہتا تھا۔

مذکور نہیں کہ ان سے ابوداؤد صاحب سنن نے بھی روایت کی ہے اور نہ دو میں سے کسی کے ذکر میں یہ مذکور ہے کہ یہ علی بن حسین بن واقد المروزی سے روایت کرتے ہیں۔ اس لئے معلوم نہیں کہ کون احمد بن محمد المروزی ہیں ۔ بہرحال ہیں وہ مروزی ہی جو بھی ہوں۔

علی بن حسین بن واقد المروزی کو تو کتب رجال والے ضعیف الحدیث خود تسلیم کررہے ہیں اور مرجیہ بھی، لکھتے ہیں ۔ ہتذیب التہذیب میں ابن حجر نے اور میزان الاعتدال میں امام ذہبی نے ، دونوں ہی نے لکھا ہے کہ امام ابو حاتم نے ان کو ضعیف الحدیث کہا ہے اور امام اسحاق بن راہویہ ان کے بارے میں ہنایت برا خیال رکھتے تھے اور ابن حبان نے امام بخاری سے نقل کیا ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ ہم رات دن ان کے سامنے سے گزرتے تھے مگر ایک حرف بھی ان سے ہنیں لکھا۔ یعنی امام بخاری ان کو اس قابل ہنیں سمجھتے تھے کہ ان کی حدیث لکھی جائے ۔ یہ ۱۳۵ ھ میں پیدا ہوئے اور ۲۱۱ ھ میں دنیا سے رخصت ہوئے ۔ اور ان کے والد بزرگوار حسین بن واقد المروزی متوفی ۱۵۹ ھ (بقول صحیح) کی حدیثوں سے امام احمد بن حنبلؒ ہنایت سختی کے ساتھ انکار فرماتے ہیں اور یزید بن ابی سعید النحوی بھی مروزی ہی تھے قریش خاندان کے آزاد کردہ غلام تھے ۔ ۱۳۱ ھ میں ابو مسلم خراسانی نے انہیں قتل کرادیا تھا۔

غرض یہ کہ ابو داؤدؒ کی اس روایت کا سلسلہ صرف خراسانیوں سے چلا

امام ابو داؤد جن کی کتاب سنن ابی داؤد مشہور ہے اور صحاح ستہ میں شمار کی جاتی ہے ان کا پورا نام "سلیمان بن لاشعث" ہے - ۲۰۲ھ میں ان کی ولادت ہوئی اور ۲۷۵ھ میں وفات - ان کے ترجمے میں ان کے شیوخ کے نام بھی ائمہ رجال نے لکھے ہیں مگر کوئی بھی ان کے شیوخ میں احمد بن محمد المروزی کا نام نہیں لکھتا ہے عجب کیا ہے کہ یہ حدیث ایک سلسلہ اسناد قائم کرکے ان کی کتاب میں داخل کردی گئی ہے - ورنہ کیا معنیٰ کہ احمد بن محمد المروزی کا نام نہ ابوداؤد کے شیوخ میں مذکور ہے نہ علی بن حسین بن واقد کے تلامذہ میں اور نہ احمد بن محمد المروزی نام کے جو دو شخص کتب رجال میں ملتے ہیں ان کے شیوخ میں علی بن حسین بن واقد کا نام آتا ہے نہ ان کے تلامذہ میں ابوداؤد کا ذکر ہے ؟

ہے "مرو" خراسان ہی کا ایک مشہور قصبہ تھا۔

امام بخاری کی روایت | اب بخاری کی روایت پر نظر ڈالئے ۔ امام بخاری حضرت ابن عباسؓ کا قول روایت کرتے ہیں ۔ محمد بن یوسف بن واقدی عثمان الصنبی سے ۔ یہ بھی ایک غلام آزاد کردہ ہی تھے ۔ "فاریاب" جو بلاد ترک میں سے ایک شہر تھا ۔ دراصل وہیں کے رہنے والے تھے۔ مگر قیساریہ جو ساحل بحر شام پر آباد تھا وہیں رہتے تھے۔ لیکن ایک مدت تک کوفہ میں بھی رہے اور سفیان ثوری وغیرہ کی خدمت میں حاضر باش رہے ۔ سفیان ثوری سے ایسی ایسی روایتیں کرتے تھے جو ان کے سوا کوئی دوسرا روایت نہیں کرتا تھا اس لئے لوگ ان کی روایتوں کے متعلق ذرا مشتبہ سے رہتے تھے ۔ امام یحییٰ بن معین نے ان کی بعض حدیثوں کو باطل بھی کہا ہے ۔ ۱۲۰ھ میں پیدا ہوئے اور ۲۱۳ھ میں وفات پائی مگر چونکہ امام بخاری نے ان سے ۲۶ حدیثیں روایت کی ہیں اس لئے ائمہ رجال نے ان سے توثیق کی ہے ۔

ورقاء بن عمر بن کلیب الیشکری ۔ یہ کون تھے امام احمد بن حنبلؒ نے فرمایا کہ یہ خراسانی ہیں مگر کوفہ میں آکر رہ گئے ۔ تفسیر میں مشہور تھے مگر امام احمدؒ نے فرمایا کہ یہ تفسیر میں تصحیف بہت کیا کرتے تھے۔ معاذ بن معاذ نے یحییٰ القطان سے پوچھا کہ تم نے منصور کی حدیث سنی ہے ؟ انہوں نے کہا کہ ہاں پوچھا کہ کس سے ؟ کہا کہ ورقاء سے ۔ انہوں نے کہا تو وہ کچھ بھی نہیں ہے ۔ وکیع تفسیر بیان کرنے لگے تو ابراہیم الحربی نے لوگوں سے کہا کہ ان کی تفسیر سنو۔ ان کی تفسیر میں کلبی اور ورقاء کی تفسیری روایتیں نہیں ہوتیں۔ کلبی مشہور کذاب و مفتری تھا۔ اس کے

برابر ورقاء کا ذکر بالکل اسی نوعیت میں بتا رہا ہے کہ دونوں ہی تفسیری روایتوں کے راوی ہیں اور ایک ہی معیار کے ہیں یعنی دونوں کذاب ہیں۔ ورقاء کی ولادت یا وفات کا سال ابن حجر وغیرہ نہیں لکھتے مگر یہ لکھا ہے کہ ابو المنذر اسماعیل بن عمران کی وفات کے وقت آئے تھے اور ابوالمنذر کی وفات ۲۰۰ھ کے بعد ان کے ترجمے میں لکھی ہے۔ اس لئے ورقاء کی وفات ۲۰۰ھ میں یا اس سے کچھ پہلے ہوئی ہوگی۔

تو اب صاف پتا مل گیا کہ ابو داؤد اور بخاری دونوں کی روایتوں کا اصل منبع اور ٹکسال خراسان ہی ہے پہلی راویت یعنی بخاری والی پورے حزم واحتیاط سے نہ بن سکی اس لئے اس میں کسی قدر رکاکت رہ گئی ۔ جس کو متن حدیث کی تنقید ہی میں ابھی بیان کرتا ہوں۔ اس لئے جب حلقہ وضاعین نے اس کمزوری کو محسوس کیا تو جھٹ دوسری روایت وضع کر ڈالی اور وہ رکاکت نکال دی۔ بخاری والی روایت ورقاء کے ذریعے خراسان سے کوفہ پہنچی تھی اور پھر کوفے سے بذریعہ محمد بن یوسف قیساریہ ساحل شام تک پہنچی اور پھر امام بخاری کو مل گئی ۔ یا ان کی کتاب میں داخل کردی گئی ایسی رکیک حدیث، محض ابن عباسؓ کا ایک قول ایسے کمزور ذرائع سے امام بخاری خود اپنی کتاب میں داخل کرلیتے اور اسی کے لئے ایسے الفاظ میں باب باندھتے جو قرآن کی نص صریح کے خلاف ہو اور اس کے لئے کوئی قوی یا ضعیف ہی حدیث نبویؐ بھی ان کو نہ مل رہی ہو، ہرگز امام بخاری سے اس کی توقع نہیں کی جاسکتی ۔ اس لئے یقیناً یہ باب ہی معہ حدیث بخاری میں داخل کردیا گیا ہے۔

رکاکت معنوی | امام بخاری کی روایت اور اس کا ترجمہ پڑھتے جائیے۔ حضرت ابن عباسؓ کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ فرماتے تھے کہ " مال پہلے

ولد (بیٹے) کے لئے ہوا کرتا تھا اور وصیت والدین کے لئے " غور کیجئے کہ اس سے پہلے کتب علیک اذا حضر احدکم الموت ان ترک خیرن الوصیۃ للوالدین و الاقربین کے حکم وصیت کی تعمیل کا رواج عہد نبوی میں جو ہوا، وہ مراد ہوسکتا ہے؟ اس آیت میں تو وراثت ولد کا کہیں ذکر ہی نہیں ہے۔ ابن عباسؓ کے قول میں صرف ولد کا ذکر ہے جس میں بیٹی کو بھی داخل سمجھا جاسکتا ہے اور صرف بیٹا بھی مراد لیا جاسکتا ہے۔ قرآن کی اس آیت میں صرف والدین ہی کے لئے وصیت نہیں ہے بلکہ اقربین کے لئے بھی وصیت کا حکم ہے اور الاقربین میں اولاد بدرجۂ اولیٰ داخل ہیں۔ ابن عباسؓ کے اس قول میں صرف والدین ہی کے لئے وصیت کا دستور بیان کیا گیا ہے۔ اگر واقعی یہ قول ابن عباسؓ کا ہے تو اس سے زمانہ جاہلیت کے رواج کا بیان سمجھا جاسکتا ہے کہ زمانہ جاہلیت میں بیٹی کے لئے وراثت نہ تھی نہ وصیت۔ وراثت صرف بیٹے کا حق تھا اور مرنے والا والدین کے لئے کچھ وصیت کر جاتا تھا۔ ممکن ہے کہ ابن عباسؓ نے زمانہ جاہلیت کے رواج کا ذکر کرکے فرمایا ہو کہ " وراثت بیٹے کا حق تھا اور وصیت والدین کے لئے کی جاتی تھی تو اللہ تعالیٰ نے اس میں سے جو مناسب سمجھا اس کو منسوخ کردیا اس کے بعد بخاری ابن عباسؓ کا قول یوں لکھتے ہیں " تو اولاد میں سے ایک مرد کے لئے دو عورت کا حصہ رکھا اور باپ ماں ہر ایک کے لئے ایک چھٹا حصہ اور بیوی کے لئے آٹھواں اور چوتھائی اور شوہر کے لئے نصف اور چوتھائی۔"

مگر پھر حضرت ابن عباسؓ یہاں بھولے بیوی اور شوہر کے لئے تو دونوں حالتوں میں اولاد ہو جب کیا ملے اور اولاد نہ ہو جب کیا ملے، تصریح کے ساتھ بیان کیا مگر والدین کے متعلق صرف ایک ہی صورت میں یعنی

میت کے اولاد ہو تو کیا ملے اس کو بیان کیا وار اگر میت لا ولد ہو تو ماں باپ کو کتنا کتنا ملے، اس کا ذکر بھول گئے اور اگر میت کے بھائی بہن بھی ہوں جب ماں باپ کو کتنا کتنا ملے، اس کی بھی تصریح نہ کی ۔ جب کہ بیوی اور شوہر کے حصوں میں جو جو فرق اولاد کے ہونے یا نہ ہونے اور بھائی بہن کے ہونے یا نہ ہونے کے سبب پیدا ہوتے ہیں ۔ ان کو بھی تو ضرور مذکور ہونا تھا، ورنہ جس طرح ابو داؤد والی روایت میں تصریح حصص کو چھوڑ دیا ہے اس روایت میں بھی تصریح حصص نہ ہوتی ۔ غرض بیان رواج سابق اور حصوں کی تصریح کر کے اس روایت کے متن کو رکاکتوں سے بھر دیا ہے ۔ جو ہر گز ہر گز حضرت ابن عباسؓ کا قول نہیں ہوسکتا ۔ اس لئے یقیناً صحیح بخاری میں داخل کردی گئی ہے ، امام بخاری نے کبھی نہیں لکھی ہوگی ۔

مختصر یہ کہ حضرت ابن عباسؓ کی طرف سے منسوب یہ دونوں قول خراسانیوں کے من گھڑت ہیں اس میں کوئی شک نہیں ۔

اصل حدیث

اب لا وصیۃ لوارث والی حدیث کے طرق روایت کو ملاحظہ فرمائیے ۔ یہ حدیث تین صحابیوں سے روایت کی گئی ہے ۔ عمرو بن خارجہؓ، ابو امامۃ الباہلیؓ اور انس بن مالکؓ

سلسلہ اسناد | ۱۔ قتادہ ۔ شہر بن حوشب الشامی ۔ عبدالرحمٰن بن غنم ۔ عمرو بن خارجہ ۔

۲۔ ہشام بن عمار ۔ اسماعیل بن عیاش شرجیل بن مسلم طولانی ۔ ابو امامہ الباہلیؓ ۔

۲۔ ہشام بن عمار۔ محمد بن شعیب بن شابور۔ عبدالرحمٰن بن یزید بن جابر۔ سعید بن ابی سعید۔ انس بن مالکؓ۔

پہلی روایت کو ابن ماجہ ابو بکر بن شیبہ سے وہ یزید بن ہارون سے وہ کید بن ابی عروبہ اور وہ قتادہ سے روایت کرتے ہیں اور ترمذی ونسائی قتیبہ بن سعید سے وہ ابو عوانہ سے وہ قتادہ سے اور نسائی اسماعیل بن مسعود سے بھی اور وہ شعبہ سے وہ قتادہ سے۔ مگر ان تمام روایتوں میں قتادہ، شہر بن حوشب سے وہ عبدالرحمان بن غنم سے وہ عمرو بن خارجہ سے روایت کرتے ہیں لیکن نسائی کی ایک آخری روایت میں جس کو نسائی عتبہ بن عبداللہ المروزی سے وہ عبداللہ بن المبارک سے وہ اسماعیل بن ابی خالد سے اور وہ قتادہ سے روایت کرتے ہیں۔ اس میں قتادہ بلاواسطہ کسی کے عمرو بن خارجہ سے روایت کر رہے ہیں۔ جو یقیناً خلاف عقل ہے۔ اس میں شہر بن حوشب اور عبدالرحمن بن غنم کے دو واسطے چھوٹے ہوئے ہیں۔ قتادہ غریب نے عمرو بن الخارجہ صحابی کی صورت بھی نہ دیکھی ہوگی۔

تو یہ روایت دراصل شہر بن حوشب سے ہے جو شامی ہیں اور بیت المال کے خازن تھے۔ روپے کی ایک تھیلی چرالی تھی، جس پر اس وقت کے ایک شاعر نے ان کی شان میں کچھ اشعار کہے تھے، جس کا ایک شعر یہ ہے۔

لقد باع شهر دينه بخريطه فمن يامن القراء بعدک یاشهر

یعنی "شہر" نے اپنا دین ایک تھیلی پر بیچ ڈالا، تو پھر تیرے بعد اے شہر قاریوں پر کون بھروسہ کرے گا۔

شہر نے ۱۱۲ھ میں وفات پائی۔ ائمہ رجال اس سے انکار کرتے ہیں کہ انہوں نے کوئی حدیث عبدالرحمٰن بن غنم سے سنی ہو۔ شعبہ اور محدثین کی ایک جماعت نے شہر بن حوشب کو ضعیف اور متروک الحدیث قرار دیا ہے اور

ابن حزم نے ساقط عن الاعتبار لکھا ہے۔ عیاذ بن منصور کا بیان ہے کہ میرے ساتھ یہ حج کو گئے تھے تو راہ میں میرا عیبہ (سوٹ کیس) چرا لیا۔ یہ شہر صاحب اسماء بنت یزید بن السکن کے غلام آزاد کردہ تھے۔ غرض انہیں کی روایت سے یہ حضرت عمرو بن خارجہ کی طرف منسوب حدیث ابن ماجہ نسائی اور ترمذی میں ہے۔ ان کے سوا کوئی اس حدیث کو روایت نہیں کرتا۔

ابو امامہ والی حدیث یہ حدیث صرف اسماعیل بن عیاش الحمصی سے ابن ماجہ، ابو داؤد اور ترمذی روایت کرتے ہیں۔ ابن ماجہ ہشام بن عمار سے وہ اسماعیل بن عیاش سے اور ابو داؤد عبدالوہاب بن نجدہ سے۔ وہ اسماعیل بن عیاش سے اور ترمذی ہناد اور علی بن حجر سے اور یہ دونوں اسماعیل بن عیاش سے۔ اور اسماعیل بن عیاش شرجیل بن مسلم الخوادی سے وہ حضرت ابو امامۃ الباہلی سے جیسا کہ ہم نے اوپر لکھا۔ اسماعیل بن عیاش شامی ہیں۔ حمص کے رہنے والے ہیں صحیح مسلم کے مقدمہ میں امام مسلم لکھتے ہیں کہ بقیہ بن الولید جو روایت مشہور و معروف لوگوں سے کریں۔ اس کو لکھ لینا چاہئے اور جو روایت غیر معروف مجہول لوگوں سے کریں، نہیں لکھنا چاہئے۔ مگر اسماعیل بن عیاش چاہے مشہور و معروف لوگوں سے روایت کریں چاہے مجہول لوگوں سے، ان کی کسی قسم کی بھی حدیث ہرگز نہیں لکھنا چاہئیے۔ اور عقیلی نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ یہ شخص ایسا ہے کہ کچھ سمجھتا ہی نہیں کہ اس کے دماغ سے کیا نکل رہا ہے۔ ابن خزیمہ نے کہا کہ اس کی حدیثوں سے احتجاج کرنا ہی نہیں چاہئیے اور عبداللہ بن المبارک کا قول ہے کہ ان کی حدیث کی روایت جائز نہیں۔ فسوی نے بھی ان کا ذکر ان لوگوں میں کیا ہے، جن کی روایتوں کی طرف سے منہ پھیر لینا چاہئیے۔ ۱۸۱ھ میں وفات پائی۔ بس اسی اسماعیل بن عیاش سے حضرت ابو امامۃ الباہلی کی طرف منسوب روایت کا دارومدار ہے۔

حضرت انسؓ والی حدیث | یہ روایت ابو داؤد و ترمذی میں نہیں ہے، صرف ابن ماجہ میں ہے۔ ابن ماجہ ہشام بن عمار سے بذریعہ اسماعیل بن عیاش ابو امامۃ الباہلی والی حدیث بھی روایت کرتے ہیں اور پھر ہشام بن عمار ہی سے بذریعہ محمد بن شعیب بن شابور اور وہ عبدالرحمن بن یزید بن جابر سے وہ سعید بن ابی سعید سے وہ حضرت انس بن مالکؓ سے روایت کرتے ہیں۔

ہشام بن عمار بن الدمشقی۔ یہ ایسی چار سو حدیثیں روایت کرتے تھے جن کی کوئی اصل نہ تھی۔ بعض لوگ ان کو ادھر ادھر سے حدیثیں لالا کر دیتے تھے اور یہ ان کو روایت کیا کرتے تھے۔ بعض محدثین نے ہشام بن عمار سے کہا کہ تم اسلام میں ضرور کوئی فتنہ پیدا کرو گے تو ہشام نے کہا کہ میری حدیثیں مروج ہو چکیں۔ مجھ کو اس کی پرواہ نہیں کہ ان کی غلطیاں کس کے سر پڑیں گی۔ امام احمد بن حنبلؒ فرماتے تھے کہ جس نے ہشام بن عمار کے پیچھے نماز پڑھی ہو، اس کو چاہئیے کہ اپنی نماز دوبارہ پڑھ لے۔ ہشام ۱۵۳ھ میں پیدا ہوئے، اور ۲۴۵ھ میں دمشق ہی میں دنیا سے سدھارے۔

اور محمد بن شعیب بن شابور بھی دمشقی ہی تھے۔ بنی امیہ کے آزاد کردہ غلاموں میں سے مرجیہ تھے۔ ۱۹۸ھ میں وفات پائی۔

اور عبدالرحمن بن یزید بن جابر الوزدی۔ یہ بھی شامی ہیں ۱۵۴ھ میں بقول اصح وفات پائی۔ ضعیف الحدیث تھے۔ اہل کوفہ سے منکر حدیثیں بہت روایت کیں۔

باقی رہ گئے سعید بن ابی سعید۔ ان کے متعلق بعض محدثین کا خیال ہے کہ یہ مقبری ہیں، جو مدینہ طیبہ کے ایک مقبرہ کے مجاور تھے، جن کے باپ

قبیلہ بنی لیث کی ایک عورت کے مکاتب غلام تھے۔ ۱۲۳ھ میں جنہوں نے وفات پائی اور وفات سے چار سال پہلے مخبوط الحواس ہو گئے تھے۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ حدیث سعید بن ابی سعید المقبری سے مروی ہی نہیں ہے اس حدیث کے سلسلہ روایت میں چاہے وہ کسی صحابی سے روایت کی گئی ہو ایک بھی حجازی راوی نہیں ہے۔ بجز خراسانیوں، شامیوں اور عراقیوں کے۔ جس کی دلیل واضح یہ ہے کہ یہ حدیث جو ابن ماجہ میں مروی ہے تو سعید بن ابی سعید کے نام کے ساتھ مقبری کا لفظ نہیں ہے۔ اور یہی حدیث سنن دار قطنی میں بھی انہیں اسناد سے مروی ہے دو طرق سے (پہلا طریق) دار قطنی روایت کرتے ہیں۔ عبداللہ بن محمد بن عبدالعزیز سے وہ داؤد بن رشید سے، وہ عمرو بن عبدالواحد سے، وہ عبدالرحمن بن یزید ابن جابر سے وہ سعید بن ابی سعید سے وہ حضرت انس بن مالکؓ سے اس میں بھی سعید بن ابی سعید کے نام کے ساتھ مقبری کا لفظ نہیں ہے۔ (دوسرا طریق) دار قطنی روایت کرتے ہیں ابو بکر نیشاپوری سے وہ عباس بن الولید بن یزید سے وہ اپنے والد (ولید بن یزید) سے وہ عبدالرحمن بن یزید بن جابر سے۔ انہوں نے کہا کہ مجھ سے حدیث بیان کی سعید بن ابی سعید ایک ساحلی شیخ نے انہوں نے کہا کہ مجھ سے حدیث بیان کی ایک شخص[1] نے اہل مدینہ میں سے۔ اس کے بعد حدیث مذکور ہے۔

اس روایت میں واضح کر دیا گیا ہے کہ سعید بن ابی سعید کے متعلق کہ "شیخ بالساحل" اور ساحل شام کے رہنے والے سعید بن ابی سعید مشہور راوی ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ یہ ساحل شام والے سعید بن ابی سعید الزبیدی

---

[1] یعنی حضرت انس بن مالک۔ نام کیوں چھپایا؟ یا کیوں بھول گئے؟ اس کو نہ پوچھے، یہ بھی ایک شان ہے جھوٹی حدیثیں روایت کرنے والوں کی۔

پر کذب کا الزام ہے اور ان کی روایتیں معتبر نہیں ہیں۔ جھوٹی حدیثیں بہت گھڑا کرتے تھے۔ لے دے کے طبرانی کی روایت بعض محدثین پیش کرتے ہیں جس میں سعید بن ابی سعید کے بعد "المقبری" کا لفظ صراحتاً موجود ہے۔ مگر یہ خیال نہیں کرتے کہ طبرانی نے اس حدیث کو "مسند الشامیین" میں نقل کیا ہے اور یہ اس کی کھلی ہوئی دلیل ہے کہ سعید بن ابی سعید ساحل شام ہی والے ہیں نہ کہ "مقبری" مدینے والے۔ اگر یہ مقبری مدینہ والے ہوتے تو طبرانی اسی حدیث کو مسند اہل المدینہ میں درج کرتے نہ کہ مسند الشامیین میں۔ صحابہؓ سے جو شخص روایت کر رہا ہو اس کی سکونت کا ایسے موقعہ پر اعتبار کیا جاتا ہے۔ ورنہ تابعی کے بعد تو تبع تابعی یا تبع تابعی مختلف سکونت کے ہو سکتے ہیں۔ اس لئے مسند الشامیین میں صرف شامی تابعی کا اعتبار کیا جائے گا نہ کہ تابعی کے بعد والوں کا۔ یقیناً کسی کاتب نے طبرانی کے نسخے میں یہ تصحیف اپنی طرف سے کر دی ہے۔ طبرانی نے جب اس حدیث کو مسند الشامیین میں درج کیا ہے تو یقیناً ان کی مراد وہی سعید بن ابی سعید ساحل شام والے ہیں۔

خلاصہ تنقید رجال | تو صاف معلوم ہو گیا کہ حضرت انس بن مالکؓ کی طرف منسوب حدیث اسی ساحل شام والے سعید بن سعید کذاب کی من گھڑت ہے اور حضرت عمرو بن خارجہ کی طرف منسوب حدیث شہر بن حوشب شامی مشہور چور غیر معتبر کی شکم زاد ہے اور حضرت امامۃ الباہلی کی طرف منسوب حدیث اسماعیل بن عیاش الحمصی الشامی کی گھڑی ہوئی ہے اور ان سب حدیثوں کی ٹکسال چاہے خراسان ہو یا کوفہ مگر اشاعت گاہ شام ہی رہی۔

تنقید متن حدیث | حضرت ابو امامۃ والی حدیث مختصر ہے۔ حدثنا شرجیل بن مسلم الخولانی سمعت ابا امامۃ الباہلی یقول سمعت

رسول الله صلی الله علیه و سلم یقول نی خطبته عام حجة الو داع ان الله قد اعطیٰ کل ذی حق حقه فلا و صیه لو ارث - یعنی شرجیل بن مسلم الخوالانی نے کہا کہ میں نے ابو امامۃ الباہلی سے سنا کہ وہ کہتے تھے میں نے سنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہ آپ حجۃ الوداع کے سال اپنے خطبے میں فرما رہے تھے کہ بے شک اللہ نے ہر حق والے کو اس کا حق دے دیا ہے - تو کسی وارث کے لئے وصیت نہیں رہی - بظاہر یہ حدیث بہت صاف گھڑی گئی ہے مگر پھر بھی کمزوریاں موجود ہیں -

" حجۃ الوداع " کا خطبہ نہیں کہا بلکہ حجۃ الوداع کے سال اپنے خطبے میں فرمایا " جس سے پورے سال کے تمام خطبے مراد ہیں - ورنہ حجۃ الوداع میں تو تقریباً ایک لاکھ صحابہؓ تھے - پھر بصیغۂ واحد متکلم حضرت ابوامامہ ہی نے کیوں سنا؟ اگرچہ کوئی خطبہ بھی ہو سننے والے متعدد ہی ہوں گے - اس لئے یہ صیغہ واحد متکلم کسی حال میں بھی صحیح نہیں ہو سکتا اور عرب ایسے جاہل نہ تھے کہ واحد متکلم اور جمع متکلم کا محل استعمال نہ جانتے ہوں - یہ عجمی راویوں سے ہو سکتا ہے - حضرت عمرو بن خارجہ کے متعلق کہا گیا ہے کہ انہوں نے فرمایا - ان النبی صلی الله علیه و سلم خطبهم و هو علی راحلته و ان راحلته لتقصع لجرتها و ان لعابها لیسیل بین کتفی قال ان الله قسم لکل و ارث نصیبه من المیراث فلا یجوز لو ارث و صیة الو لد للفراش و للعاهر الحجر و من ادعی الیٰ غیر ابیه او تو لیٰ غیر مو الیه فعلیه لعنة الله و الملئکة و الناس اجمعین لا یقبل منه صرف و لا عدل - او قال عدل و لا صرف (ابن ماجه)

یعنی عمرو بن خارجہ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو خطبہ دے رہے تھے اور آپ اپنی سواری (اونٹنی) پر تھے اور وہ اونٹنی جگالی کئے جا رہی تھی

اور اس کا لعاب میرے دونوں مونڈھوں کے درمیان بہ رہا تھا۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بے شک اللہ نے تقسیم کر دیا ہر وارث کے لئے اس کا حصہ میراث میں سے تو نہیں جائز ہے کسی وارث کے لئے وصیت۔ اور لڑکا فراش (منکوحہ بیوی) کے لئے ہے۔ زناکار کے لئے پتھر ہے اور جو شخص اپنے باپ کے سوا کسی اور کی اولاد ہونے کا دعویٰ کرے یا اپنے مولا کے سوا کسی اور کا مولا بنے تو اس پر اللہ کی، فرشتوں کی اور تمام انسانوں کی لعنت ہے نہیں قبول کی جائے گی اس سے توبہ اور نہ فدیہ۔ راوی اپنا شبہ ظاہر کرتا ہے کہ آپؐ نے پہلے صرف فرمایا۔ یا پہلے عدل۔ یہ بھی ایک طریقہ ہے روایت کو سچی ثابت کرنے کا کہ ایک آدھ لفظ میں شبہ ظاہر کر دیا۔ کہ یوں کہا یا یوں کہا۔ تاکہ معلوم ہو کہ کتنا دیانتدار راوی ہے کہ جہاں اس کو شبہ ہوا۔ اس شبہ کو بھی اس نے ظاہر کر دیا۔ باقی الفاظ تو ضرور وہی ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے نکلے۔ راوی کو اور کسی لفظ میں کوئی شبہ نہ ہوا۔ پھر اونٹنی کی کیفیت یہ بیان کرنا کہ وہ جگالی کئے جا رہی تھی اور اس کے منہ سے لعاب جاری تھا اور راوی سننے میں اس قدر مستغرق تھا کہ لعاب اس کے دونوں مونڈھوں کے درمیان بہہ رہا تھا۔ مگر یہ اس کی مطلق پرواہ نہیں کر رہا تھا۔ راوی نے اپنی بے خبری کو بھی ظاہر نہیں کیا ہے جس سے ظاہر ہے کہ راوی محسوس کر رہا تھا کہ اس پر لعاب گر رہا ہے مگر خطبہ سننے کے خیال سے اس نے کپڑے خراب ہونے کی بالکل پرواہ نہیں کی اور اس سے قرب بھی ظاہر ہو گیا کہ وہ کس قدر قریب سے سن رہا تھا۔ حدیثیں گھڑنے والے نفسیات کے بڑے ماہر ہوتے ہیں اس لئے خوب غور و خوض کر کے حدیث کے لئے الفاظ باہمی مشورے سے چنتے تھے۔ اور عنوان بیان بہت مناسب اختیار کرتے تھے۔

مگر ترمذی کی روایت میں الفاظ کا فرق اور مضمون کا اختصار ہے - اس میں ہے -

ان النبی صلی اللہ علیہ و سلم خطب علی ناقتہ و انا تحت جرابھا و ھی تقصع بجرتھا و ان لعابھا لیسیل بین کتفی فسمعتہ یقول ان اللہ عز و جل اعطیٰ کل ذی حق حقہ فلا و صیۃ لو ارث و الو لد للفراش و للعاھر الحجر - اور نسائی میں اور بھی اختصار ہے یہ لکھتے ہیں کہ ابن خارجہ نے کہا کہ انہ شھد رسو ل اللہ صلی اللہ علیہ و سلم یخطب الناس علی راحلتہ و انھا لتقصع لجرتھا و ان لعابھا لیسیل فقال رسو ل اللہ صلی اللہ علیہ و سلم فی خطبۃ ان اللہ قد قسم لکل انسان قسمتہ من المیراث فلا یجو ز لو ارث و صیۃ -

مگر نسائی میں دو طریق اور بھی ہیں اور نہایت مختصر ہیں ایک میں ہے کہ عمرو بن خارجہ نے کہ خطب رسو ل اللہ صلی اللہ علیہ و سلم فقال ان اللہ اعطے کل ذی حق حقہ و لا و صیۃ لو ارث - اور آخری طریق ہے کہ قال رسو ل اللہ صلی اللہ علیہ و سلم ان اللہ عز اسمہ قد اعطے کل ذی حق حقہ و لا و صیۃ لو ارث یعنی اس میں اللہ تعالیٰ کے نام کے بعد " عز اسمہ " کا اضافہ ہے ورنہ یہ دونوں آخری طریق ایک ہی ہیں لیکن پہلے طریق میں صرف لعاب کے بہنے کا ذکر ہے مگر ان کے مونڈھے پر لعاب کے گرنے کا ذکر نہیں ہے مگر ان تمام طویل و مختصر روایتوں کے راوی وہی قتادہ وہی شہر بن حوشب وہی عبدالرحمان بن غنم وہی عمرو بن خارجہ ہیں -

مگر صرف " صرف و لا عدل " میں جو ابن ماجہ والی روایت میں راوی صاحب کو شبہ ہوا ہے تو اس کو ظاہر کر دیا مگر ان روایتوں میں جو کہیں ان اللہ قسم لکل و ارث نصیبہ من المیراث ہے - کہیں قسم لکل انسان قسمۃ من

المیراث ہے۔ کہیں ان اللہ اعطے کل ذی حق حقہ ہے کہیں ان اللہ عز وجل اعطے ہے۔ مگر اختلافات کو بلا اظہار اشتباہ قتادہ صاحب نے کسی سے کچھ، کسی سے کچھ بیان کردیا ہے۔ اصل یہ ہے کہ اگرچہ حدیث گھڑی ہوئی تو شہر بن حوشب ہی کی ہے مگر ان سے روایت کررہے ہیں قتادہ جو مشہور مدلس ہیں اور ہر طرح کی رطب و یابس حدیث روایت کرنے کے خوگر ہیں اور فرقہ قدریہ کے بڑے امام تھے اپنے مسلک کی لوگوں کو دعوت دیا کرتے تھے۔ مرسل حدیثیں بہت روایت کیا کرتے تھے۔ محدثین ان کی مراسلت کو بمنزلہ الریح سمجھتے تھے۔

حضرت انسؓ والی روایت جو صرف ابن ماجہ میں ہے یا دار قطنی میں یا طبرانی کی سند الشامیین میں ابن ماجہ اور طبرانی کے اسناد بالکل ایک ہی ہیں۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ ابن ماجہ بلاواسطہ ہشام بن عماد سے روایت کرتے ہیں اور طبرانی بواسطہ احمد بن انس بن مالک جو ایک مجہول الحال راوی ہیں البتہ دار قطنی کے ابتدائی تین راوی اوروں سے مختلف ہیں۔ یعنی دار قطنی روایت کرتے ہیں عبداللہ بن محمد بن عبدالعزیز سے۔ وہ داؤد بن رشید سے، وہ عمرو بن عبدالواحد سے اور وہ عبدالرحمن بن یزید بن جابر سے وہ سعید بن ابی سعید سے وہ حضرت انس سے۔ اور دوسرے طریق میں دار قطنی روایت کرتے ہیں۔ ابو بکر نیشاپوری سے وہ عباس بن ولید بن یزید سے وہ اپنے باپ ولید بن یزید سے وہ عبدالرحمن بن یزید بن جابر سے وہ سعید بن ابی سعید شیخ ساحلی سے وہ اہل مدینہ میں سے ایک شخص سے یعنی انس بن مالکؓ سے۔ ابن ماجہ کی حدیث یوں ہے کہ عن انس بن مالک قال انی لتحت ناقة رسول الله صلی الله علیه و سلم لیسیل علیی لعابها فسمعته یقول ان الله قد اعطی کل ذی حق حقه الالا وصیة لو ارث اور دار قطنی کی روایت یوں

ہے - عن انس بن مالک قال انی لتحت ناقة رسول الله صلی الله علیه و سلم لیسیل علی لعابها فسمعته یقول ان الله عز و جل قد اعطے کل ذی حق حقه فلا وصیة لوارث و الولد للفراش و للعاهر الحجر - لا یدعین رجل الے غیر ابیه و لا ینتمی الے غیر مو الیه فمن فعل ذالک فعلیه لعنة الله متتابعة و لا منفق المرآة من بیت زوجها الا باذنه - فقال رجل و لا الطعام ؟ یارسول الله: قال ذالک افضل امو النا ثم قال الا ان العاریة مؤداة و الذین مقضی و الزعیم غارم -

دار قطنی کا دوسرا طریق بھی اسی طرح ہے اور طبرانی کا طریق بھی اسی طرح ہے اب ترجمہ سنئیے - حضرت انسؓ فرماتے ہیں - میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی کے نیچے تھا اور اس کا لعاب مجھ پر بہہ رہا تھا تو میں نے آپؐ کو سنا کہ آپؐ فرمارہے تھے کہ بے شک اللہ عزوجل نے دیدیا ہر حق والے کو اس کا حق تو وصیت نہیں ہے کسی وارث کے لئے اور لڑکا فراش (منکوحہ) کے لئے ہے اور زناکار کیلئے پتھر ہے - ہر گز نہ پکارا جائے کوئی شخص اپنے باپ کے سوا کسی اور کی طرف منسوب کر کے اور نہ منسوب ہو کوئی اپنے موالی کے سوا کسی اور کی طرف جس نے ایسا کیا تو اس پر اللہ کی پے در پے لعنت ہے نہ خیرات کرے کوئی عورت اپنے شوہر کے گھر سے اس کی اجازت کے بغیر - تو کہا ایک شخص نے اور کھانا بھی نہیں ؟ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! آپؐ نے فرمایا یہ افضل ہے ہم لوگوں کے اموال سے - پھر فرمایا عاریت ادا کی جانے والی چیز اور قرض ادا کیا جانے والا ہے اور کفالت کرنے والا ضامن ہوتا ہے -

یہ ترجمہ دار قطنی کی حدیث کا پیش کیا گیا چونکہ آخر کے مضامین اس میں فاضل ہیں جو ابن ماجہ کی روایت میں نہیں ہیں اور دار قطنی کے دوسرے طریق میں نحوہٗ لکھا ہے یعنی اسی طرح طبرانی کی روایت کا بھی حاشیہ دار قطنی

میں نحوۂ کر کے لکھا ہے اس لئے ترجمہ اسی کا پیش کیا۔

اونٹنی کا لعاب بہر حال حضرت انسؓ کی طرف منسوب روایت جہاں بھی ہے مختصر یا طول سب میں اونٹنی کے نیچے ان کا ہونا اور اونٹنی کے لعاب کا ان پر بہنا مذکور ہے ۔ پھر حضرت عمرو بن خارجہ والی روایت بھی ابن ماجہ نسائی اور ترمذی میں ہیں جو مذکور ہوئیں جن میں اونٹنی کے نیچے عمرو بن خارجہؓ کا ہونا اوران کے دونوں مونڈھوں کے درمیان اونٹنی کے لعاب کے بہتے رہنے کا ذکر ہے اب کوئی بتائے کہ حضرت انس بن مالکؓ اونٹنی کے نیچے کہاں پر تھے اور حضرت عمرو بن خارجہ کہاں پر تھے کہ دونوں پر اونٹنی اپنا لعاب گرا رہی تھی ۔

پھر جن مضامین کا ذکر انس بن مالک کی طرف منسوب حدیث میں ہے ان میں سے آخری مضامین کا ذکر اور کسی روایت میں نہیں ہے ۔ اور " حجۃ الوداع " والے سال کا ذکر تو صرف حضرت ابو امامۃ الباہلی کی طرف منسوب حدیث میں ہے وہ بھی ابن ماجہ اور ترمذی کی روایت میں ۔ ابو داؤد کی روایت میں اس کا ذکر نہیں ۔

محدثین کا طریقۂ تطابق محدثین بڑی آسانی سے یہ کہہ دیں گے کہ ایک بار حجۃ الوداع کے سال بھی کسی خطبے میں آپؐ نے فرمایا تھا جس کو ابو امامۃ الباہلی نے سنا تھا اور اسکی روایت کی اور ایک دوسرے موقع پر انس بن مالک آنحضرتؐ کی اونٹنی کے نیچے کھڑے تھے ۔ ان پر اونٹنی کا لعاب گر رہا تھا ۔ اور تیسرے موقع پر عمرو بن خارجہ اونٹنی کے پاس اس طرح کھڑے تھے کہ اونٹنی کا لعاب ان کے مونڈھوں کے درمیان گر رہا تھا اور ایسے اتفاقات امکان سے باہر نہیں ہیں ۔ باقی جو مختصر مختصر روایتیں ہیں ممکن ہے کہ راوی نے کبھی مفصل بیان کیا ۔ کبھی تفصیل کا موقع نہیں پایا یا ضرورت نہیں سمجھی اسلئے اختصار سے کام لیا ۔ یا یہ بھی دوسرے مختلف مواقع کے واقعات ہوں اور

آپ نے اس مضمون کو بار بار بیان فرمایا ہو کہ جب اللہ تعالیٰ نے ورثہ کے حصے خود مقرر کر دیئے تو اب وارث کیلئے وصیت جائز ہنیں رہی ۔ وغیر ذالک فی التاویلات ۔

مگر یہ محدثین اس کو کیا کریں گے اور اس کا کیا جواب دیں گے کہ یہ روایتیں جو صرف تین صحابیوں کی طرف منسوب ہیں ۔ ابو امامۃ الباہلی، عمرو بن خارجہ اور انس بن مالکؓ جن میں سے ایک بھی اکابر مہاجرین والنصار میں سے ہنیں ہیں ۔ انس بن مالکؓ خادم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگرچہ بہت مشہور صحابی ہیں مگر ہجرت کے وقت آٹھ دس برس کے تھے ۔ جیسا کہ استیعاب میں مذکور ہے ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت اسی حساب سے اٹھارہ بیس برس کے ہوں گے ۔ بصرہ سے دو میل پر مقام طف میں مکان بنایا تھا وہیں رہے وہیں ۹۸ھ میں وفات پائی ۔ بصرہ میں یہ آخری شخص تھے جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تھا ۔ بلکہ ان کے بعد صرف حضرت ابو الطفیل ہی کی وفات ہے جو آخری صحابیؓ روئے زمین پر رہ گئے تھے ۔ اور ابو امامۃ الباہلی مصر میں رہتے تھے پھر حمص شام کے علاقے میں آکر رہ گئے اور یہیں وفات پائی ۔ شام میں یہ سب سے آخری صحابی تھے ۔ ان کے بعد کوئی صحابی شام میں نہ رہا ۔ صرف شامیوں ہی نے ان کی حدیثیں روایت کی ہیں ۔ اور بہت روایت کی ہیں ۸۱ھ یا ۸۶ھ میں وفات پائی اور عمرو بن خارجہ بن المشفق الاسدی یہ بھی شام ہی کے ساکن تھے ان سے بس یہی ایک روایت "لا وصیۃ لوارث" والی ہے جس کو ان سے عبدالرحمن بن غنم اور ان سے شہر بن حوشب اور ان سے قتادہ روایت کرتے ہیں ۔ اس کے سوا ان سے کوئی اور حدیث کہیں مروی ہنیں ۔ نہ ابن غنم کے سوا کوئی اور ان سے کچھ روایت کرتا ہے عبدالرحمن بن غنم شامی ہی ہیں ۔

اصل حقیقت یہی ہے جیسا کہ میں نے اوپر لکھا کہ حضرت ابن عباسؓ والے قول کو تو ورقاء اور علی بن حسین بن واقد نے خراسان میں گھڑا تھا یا ایک کو ورقاء نے کوفہ میں اور دوسرے قول کو ابن واقد نے "مرو" میں گھڑا۔ اور لا وصیۃ لوارث والی حدیث کو سعید بن ابی سعید ساحلی شام والے کذاب نے حضرت انسؓ کی طرف۔ اور شہر بن حوشب چور بدمعاش نے حضرت عمرو بن خارجہ کی طرف اور اسماعیل بن عیاش الحمصی والشامی کذاب نے حضرت ابو امامۃ الباہلی کی طرف منسوب کرکے شام کے علاقوں میں اور خراسان وعراق ومصر میں اس کی اشاعت کی۔ ایسے جلیل القدر صحابہؓ کا نام نہ لیا کہ کوئی یہ کہہ سکے کہ آخر تمہیں شامیوں نے ان سے یہ حدیث کیوں سنی؟ اس لئے ان ہی صحابہؓ کی طرف منسوب کیا جو شام ہی میں رہے اور شام ہی میں وفات پائی یا عراق میں جیسے حضرت انسؓ۔ مگر یہ کوئی نہیں پوچھتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس خطبے کو انہیں تین صحابیوںؓ نے کیوں سنا؟ اکابر صحابہؓ اس سے کیوں بے خبر رہے؟ اگر کہا جائے کہ وہ لوگ بے خبر نہ تھے، سب باخبر تھے، تو پھر آخر اس کی روایت اکابر صحابہؓ اور تابعین حجاز کیوں نہیں کرتے؟

یہی وہ حدیث ہے جس کو متواتر اور ناسخ قرآن تک کہا جاتا ہے۔ مگر کیا اگلے محدثین اس حدیث کی تنقید اس طرح نہیں کرسکتے؟ ضرور کرسکتے تھے مگر تنقید تو وہ کرے جس کو کوئی شبہ ہو۔ روایت پرستی سے وہ اتنے مغلوب تھے کہ چاہے کیسی ہی حدیث قرآن مبین کی کیسی ہی صریح آیت قرآنی کے خلاف کیوں نہ مل جائے اگر ان کے کسی مرغوب مسئلے کی اس سے تائید ہورہی ہے تو پھر بلا چون وچرا اس کو مان لینگے۔ یہ عادت کچھ ایسی پڑی رہی کہ تنقید حدیث کے اصول خود بنانے کے باوجود انہوں نے کبھی صحیح معنوں میں تنقید حدیث کی ہی نہیں۔ موضوعات کی کتابوں کو اٹھا کر دیکھئے کتنی صحیح حدیثوں کو موضوع

قرار دیدیا اور صحاح کے اندر کتنی موضوع حدیثیں بھر لیں یہ اس لئے کہ ان کا معیار صحیح وغلط ہی انوکھا ہے ۔ وہ مطابقت قرآن و عدم مطابقت قرآن کو ایک اہم معیار ضرور لکھتے ہیں مگر کبھی اس معیار پر کسی حدیث کو پرکھتے نہیں ۔ اور اگر کبھی کسی آیت کی بنا پر بظاہر کسی حدیث کو رد بھی کیا تو غلط بنیاد پر۔ درحقیقت اس آیت کی مخالفت کی وجہ سے نہیں بلکہ مزعومہ کسی رائے یا عقیدہ یا کسی مسئلے کی مخالفت کی بناء پر اور بظاہر کسی آیت کو ایک ٹٹی بنالیا ہے جیسے فکثر لکم الاحادیث بعدی فماروی لکم حدیث عنی فاعرضوہ علی کتاب الله فماوافقه فاقبلوہ وماخالفه فردوہ ۔" یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے بعد حدیثوں کی بڑی کثرت ہوگی، تو جو حدیث تمہارے سامنے مجھ سے روایت کی جائے اس کو کتاب اللہ کے سامنے پیش کرو جو اس کے موافق ہو اس کو قبول کرو جو اس کے خلاف ہو اس کو رد کردو۔"

توضیح وتلویح میں علامہ تفتازانی اس حدیث پر بہت خفا ہوئے ہیں اور لکھ دیا کہ اس کو زندیقوں نے گھڑا ہے کیونکہ یہ قرآن مجید کے خلاف ہے ۔ قرآن مجید میں ہے ما اٰتکم الرسول فخذوہ وما نھٰکم عنه فانتھوا ۷/۵۹ ۔ یعنی جو کچھ تمہیں رسولؑ نے دیا اس کو لے لو اور جس سے باز رکھا اس سے باز رہو۔ حالانکہ اگر واقعی اس آیت کے تحت میں حدیث بھی آسکتی ہے تو یہ حدیث تکثر لکم الخ والی تو یہی بتارہی ہے کہ کسی حدیث کے سننے کے بعد پہلے یہ دیکھ لو کہ وہ ما اٰتکم الرسول ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو ضرور اس کو قبول کرلو ورنہ وہ تو ما اٰتاکم الرسول ہے ہی نہیں ۔ اس لئے ما نھاکم عنه میں داخل ہے ۔ اس سے باز ہی رہنا فرض ہے ۔ غرض قرآن سے استدلال بھی کرتے ہیں تو غلط طریقے سے

نسال الله تعالی ان یجعلنا ممن یطیعه و یطیع رسو له و یتبع رضو انه و یجتنب سخطه انما نحن به و له و صلی الله علی سیدنا محمد و صحبه و بارک و سلم و آخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمین

کرتا ہے ہر خبر پہ تمنا یقین کیوں؟ نادان! نوید دوست فریب عدو نہ ہو

پانچویں مثال: ایلاء کی وضعی داستانیں
(یعنی سورہ تحریم کے شان نزول کی روایات)

سورہ بقر میں ہے۔

لایؤ اخذ کم الله باللغو فی ایما نکم و لکن یو اخذ کم بما کسبت قلو بکم - و الله غفو ر حلیم - (۲/۲۲۵)

اللہ تمہاری بیہودہ قسموں پر مواخذہ نہیں کرتا بلکہ ان قسموں پر گرفت کرتا ہے جو تم دل کے ارادے سے کھاؤ۔ وہ غفور و حلیم ہے۔

یہاں ایک اصولی بات بیان ہوئی ہے۔ اس کے بعد ایک متعین حکم ہے اور وہ یہ ہے

للذین یؤ لون من نِسَآءِ ھم تربص اربعه اشھر - فان فاء و فان الله غفو ر رحیم (۲/۲۲۶)

جو لوگ اپنی بیویوں کے پاس نہ جانے کی قسم کھالیں تو انہیں چار ماہ تک انتظار کرنا چاہیئے اگر وہ اس عرصہ میں باہمی تعلقات کی طرف رجوع کر لیں (تو اچھا ہے) اللہ غفور رحیم ہے۔

اگلی آیت میں ہے کہ اگر وہ تعلقات کی طرف رجوع نہ کریں اور طلاق کا فیصلہ کر لیں تو پھر..... (جیسا طلاق کا حکم ہے ویسا کریں) ۔

اس سے ظاہر ہے کہ قسم یا تو لغو ہوتی ہے یا بالارادہ ۔ بالارادہ قسم توڑنے پر کفارہ دینا پڑتا ہے جس کی بابت (۵/۸۹) میں حکم دیا گیا ہے ۔ بلا ارادہ یعنی یونہی بیہودہ قسم پر قانونی گرفت نہیں ہوتی لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ جس کا جی چاہے یونہی بیہودہ قسمیں کھاتا رہے۔ جس عمل کو خدا نے لغو قرار دیا ہے ، اس کا ارتکاب سہواً یا اتفاقیہ ہو جائے تو اور بات ہے لیکن اس کے متعلق یہ سمجھ کر کہ اس پر قانونی مواخذہ نہیں اس کا مرتکب ہوتے رہنا ، مومن کے شایان شان نہیں۔ اس لئے کہ لغو کی مذمت خود قرآن میں آئی ہے اور مومنین کا شیوہ یہ بتایا ہے کہ ھم عن اللغو معرضون ۲۳/۳) وہ لغو باتوں سے اعراض برتتے ہیں۔ اور اگر اتفاقیہ ایسا ہو کہ انہیں کسی لغو بات کے پاس سے گذرنا پڑے تو مروا کراماً (۲۵/۷۲) وہ اپنا دامن بچاتے ہوئے نہایت شریفانہ انداز سے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ اس سے واضح ہے کہ مومن لغو کے پاس بھی نہیں بھٹکتا۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ اگر بیوی کے پاس نہ جانے کی قسم (جسے اصطلاح میں ایلاء کہتے ہیں، بالارادہ کھائی گئی ہے اور بعد میں اسے توڑنا پڑا ہے تو ان سے ایک جرم کا ارتکاب عمل میں آتا ہے جس کا جرمانہ دینا پڑتا ہے۔ اور اگر وہ قسم یونہی بلا ارادہ (لغو) ہے تو وہ کوئی شریفانہ فعل نہیں ۔ اس سے مومن احتراز کرتا ہے۔

لیکن آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ سورہ بقرہ کی آیت ایلاء (۲/۲۲۶) کی تفسیر میں ہماری کتب احادیث کی بعض روایات بتاتی ہیں کہ

نبی اکرمؐ نے اپنی ازواج مطہرات کے پاس نہ جانے کی قسم کھائی تھی اور اس طرح آپؐ ایک مہینہ بھر تک ان سے علیحدہ رہے تھے ۔ آپ غور کیجئے کہ اس سے علاوہ اس کے کہ حضورؐ کے متعلق یہ ثابت کیا جاتا ہے کہ آپؐ نے لغو یا بالارادہ قسم کھائی تھی ۔ آپؐ کی گھر کی زندگی کے متعلق کس قسم کا نقشہ سامنے آتا ہے ۔ یعنی حضورؐ کے گھر کا ماحول ایسا تھا جس میں حضورؐ (اپنی ایک آدھ بیوی سے نہیں بلکہ) تمام ازواج مطہراتؓ سے ناراض ہو کر مہینہ بھر تک علیحدہ رہے اور اس تمام عرصہ میں نہ آپؐ نے معاملہ کو سدھارنے کی کوشش کی ۔ اور نہ ہی آپؐ کی ازواجؓ نے حضورؐ کو منانے کے لئے کوئی اقدام کیا یہ بیان روایات کا ہے قرآن کریم نے کہیں یہ نہیں کہا کہ حضورؐ نے ایلاء کیا تھا ، حالانکہ قرآن (بالخصوص سورہ احزاب) میں حضورؐ کی اندرون خانہ زندگی کے چھوٹے چھوٹے واقعات تک مذکور ہیں ۔ لہذا جب ہم درایت (عقل و فکر اور دانش و بصیرت) کی رو سے معاملہ کا جائزہ لیں گے تو یہ بات کسی تحقیق کی محتاج نہیں رہے گی کہ یہ روایات وضعی ہیں اور حضورؐ یا امہات المومنینؓ کے خلاف ، وساوس پیدا کرنے (اور غیر مسلموں کے لئے حضورؐ کی سیرت طیبہ کے خلاف مواد بہم پہنچانے) کی خطرناک سازش کے طور پر وضع کی گئی تھیں ۔ اس لئے ایلاء النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق جتنی روایتیں ہیں وہ سب بہتان اور افتراء ہیں ۔ ہم صرف صحیح بخاری کی روایتیں پیش کرکے ان کی تنقید کرکے دکھاتے ہیں باقی کتابوں میں بھی جو کچھ ہے جو اکثر انہی اسناد سے مروی ہے ، اگر متن روایت یا اسناد میں کہیں کہیں دوسری کتابوں میں کچھ فرق ہے تو وہ چنداں قابل توجہ نہیں ۔ بخاری کی روایات کی حقیقت جب واضح ہو جائیگی تو اس سے پست تر کتابوں کی

روایات کا بھی اندازہ ہو جائے گا اگرچہ بعد والوں نے بخاری کی بعض روایات کی خامیوں کو محسوس کرکے ان خامیوں کو دور کرنے کی کوشش کی ہے وہ بھی باادنیٰ تامل معلوم ہو سکتا ہے۔

پہلی روایت: بخاری کی پہلی روایت جلد اول صفحہ ۵۵ (مطبوعہ مطبع احمدی) پر درج ہے - یہ اس باب کی دوسری روایت ہے اگرچہ اس روایت کو باب سے کوئی تعلق نہیں۔ بہر حال پوری روایت معہ اسناد نقل کرنا باعث طوالت ہے اس روایت میں ایک تو اس کا ذکر ہے کہ آپ گھوڑے سے گر گئے تھے اور آپؐ کی پنڈلی کچھ مجروح ہوگئی تھی - اس وجہ سے آپؐ بیٹھ کر نماز پڑھتے تھے - اور آپؐ نے بیویوں سے ملنے کی ایک ماہ کے لئے قسم کھالی تھی اس لئے آپؐ ایک بلند جگہ کوٹھے پر ترک تعلق کرکے مقیم تھے۔ صحابہؓ عیادت کے لئے جاتے تھے - نماز کا وقت ہوگیا تو آپؐ نے نماز پڑھی صحابہؓ نے کھڑے ہو کر اقتدا کی۔ آپؐ نے فرمایا کہ امام اس لئے ہے کہ اس کی اقتدا کی جائے - تو جب امام بیٹھ کر نماز پڑھے تو تم لوگ بھی بیٹھ کر نماز پڑھو۔ اور کھڑے ہو کر پڑھے تو تم لوگ بھی کھڑے ہو کر پڑھو - اور ۲۹ دنوں کے بعد آپؐ اس کوٹھے سے اتر آئے۔ صحابہؓ نے پوچھا کہ آپؐ نے ایک مہینہ کی قسم کھائی تھی۔ تو آپؐ نے فرمایا کہ یہ مہینہ ۲۹ دن کا ہے۔

یہ روایت امام بخاری کو محمد بن عبدالرحیم آل عمر کے آزاد کردہ فارسی الاصل غلام سے ملی۔ جن کو محدثین ثقہ اور مامون لکھتے ہیں۔ مگر فارسی الاصل آزاد کردہ غلام تھے - اس کو یاد رکھئے۔ ۱۸۵ھ میں پیدا ہوئے ۲۵۵ھ میں وفات پائی۔

محمد بن عبدالرحیم روایت کرتے ہیں یزید بن ہارون سے یہ بھی ایک غلام آزاد کردہ تھے ۔ آخر میں بصارت جاتی رہی تھی یحییٰ ابن معین مشہور امام رجال کا قول ابن حجر تہذیب التہذیب میں نقل کرتے ہیں کہ یزید اصحاب حدیث میں سے نہ تھے ۔ وہ تمیز نہیں رکھتے تھے ۔ اور اس کی پرواہ نہیں کرتے تھے کہ کس سے روایت کر رہے ہیں ۔ مگر امام بخاری کے شیخ الشیوخ تھے اس لئے عام طور سے لوگ ان کو ثقہ ہی لکھتے ہیں ۔ آخر عمر میں روایت حدیث ترک کر دی تھی ۔ ۱۱۷ھ یا ۱۱۸ھ میں پیدا ہوئے تھے اور ۲۰۶ھ میں وفات پائی ۔ بخاری الاصل تھے واسط میں رہے ۔ ان کی وفات کے وقت محمد بن عبدالرحیم ۱۹ برس کے تھے ۔ آخر عمر میں انہوں نے روایت حدیث ترک کر دی تھی تو ان کی روایت حدیث کے زمانے میں محمد بن عبدالرحیم چودہ پندرہ برس کے ہوں گے ۔ عبدالرحیم کو بغدادی لکھا ہے ۔ معلوم نہیں یہ کب تک غلام رہے اور کب آزاد ہوئے انہوں نے کب موقع پایا کہ یزید بن ہارون سے واسط جاکر حدیث سنتے ۔ مگر دونوں موالی ہی میں سے تھے ۔ یعنی آزاد کردہ غلام ہی تھے ۔

یزید بن ہارون اس کہانی کو حمید الطویل سے روایت کرتے ہیں اور وہ حضرت انسؓ سے ۔ امام شعبہ کہتے تھے کہ حضرت انسؓ سے حمید طویل نے صرف پانچ حدیثیں سنی تھیں ۔ مگر بخاری ہی میں اس سے کہیں زیادہ حدیثیں یہ حضرت انسؓ سے بلاواسطہ روایت کرتے ہیں ۔ آخر یہ خود بھی ایک غلام آزاد کردہ ہی تھے بنی خزاعہ کے ۔ اور مدلس بھی تھے ۔ اور اکثر حدیثوں کو تدلیس کرکے حضرت انسؓ ہی کی طرف منسوب کر دیا کرتے تھے ۔ ابن حجر لکھتے ہیں رُبَّمَا دَلَّسَ عَنْ اَنَسٍ ۔ امام ذہبی میزان الاعتدال کتاب الضعفاء میں لکھتے ہیں کہ عقیلی اور ابن عدی نے ان کو ضعفاء میں

شمار کیا ہے۔

مختصر یہ ہے کہ بخاری اور حضرت انس کے درمیان تین راوی ہیں اور تینوں غلام آزاد کردہ ۔ اور میرا دعویٰ بھی ہے کہ اس قسم کی ساری روایتیں عجمی غلاموں کی سازش کا نتیجہ ہیں۔

دوسری روایت | اس روایت میں بھی عام طور سے کل امہات المومنینؓ سے ایلاء کرنے کا ذکر ہے ۔ اب دوسری روایت ملاحظہ کریں اسی جلد کے صفحہ ۲۵۶ میں حمید طویل سے یہ حدیث مروی ہے جس کو امام عبدالعزیز عبداللہ الاویسی سے روایت کرتے ہیں امام بخاری کے شیخ ہیں اس لئے ائمہ رجال ان کو ثقہ لکھتے ہیں مگر امام ابو داؤد نے ان کو ضعیف قرار دیا ہے ۔ اور یہ روایت کرتے ہیں سلیمان بن بلال سے جو بربری غلام آزاد کردہ تھے۔ عثمان بن ابی شیبہ نے ان کے متعلق کہا کہ لا باس بہ و لیس ممن یعتمہ علی حدیثہ - ان میں کوئی مضائقہ نہیں ہے مگر یہ ان لوگوں میں نہیں ہیں جن کی حدیث پر اعتبار کیا جائے۔ اور یہی سلیمان بن بلال جو ایک آزاد کردہ غلام تھے حمید طویل سے اس حدیث کی روایت کرتے ہیں اور ان کے آزاد کردہ غلام ہونے کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں۔

تیسری روایت | پھر اسی صفحے میں اسے پہلے حضرت ام سلمہؓ ام المومنین کی طرف منسوب کرکے ایک روایت بیان کی گئی ہے جس کو امام بخاری ابو عاصم ضحاک بن مخلد سے روایت کرتے ہیں جو بنی شیبان کے غلام آزاد کردہ تھے۔ ۲۱۴ھ کے آخر میں وفات پائی۔ بصری تھے۔ امام بخاری ان کی وفات کے وقت انیس برس کے تھے کیونکہ امام کی پیدائش ۱۹۶ھ کی ہے۔

مگر اصل راوی اس حدیث کے درحقیقت ابن جریج ہیں جو بنی امیہ کے غلام آزاد کردہ تھے۔ رومی الاصل تھے ۔ ان کو ائمہ رجال نے حاطب اللیل لکھا ہے ۔ یعنی ہر رطب و یابس کو لکھ لیا کرتے تھے۔ زہری کی حدیثوں میں ان کو لیس بشیئ لکھا ہے اور ریح کے مشابہ ان حدیثوں کو بتایا ہے ۔ منکر حدیثیں روایت کیا کرتے تھے ۔ اور بہت سخت مدلس تھے امام دار قطنی کہتے تھے کہ ابن جریج کی تدلیس سے بچو یہ کسی مجروح ہی راوی کی حدیث میں تدلیس کرتے تھے یعنی اس مجروح راوی کے نام کی جگہ کسی ثقہ راوی کا نام رکھدیا کرتے تھے اور امام شافعیؒ نے فرمایا ہے کہ ابن جریج نے ستر عورتوں سے متعہ کیا تھا۔ پھر آخر یہ بھی موالی ہی میں سے تھے اور جن سے ابن جریج اس حدیث کو روایت کر رہے ہیں یعنی یحییٰ بن عبداللہ بن محمد العسیفی وہ انہیں کی طرح موالی میں سے تھے حضرت عثمانؓ کے آزاد کردہ غلام تھے۔

چوتھی روایت | صفحہ ۲۲۴ سے صفحہ ۲۲۵ تک ایک لمبی چوڑی روایت ہے جس کو ابن شہاب زہری بیان کرتے ہیں عبید اللہ بن عبداللہ بن ابی ثور سے جو نوفل کے آزاد کردہ غلام تھے ۔ اور وہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم سے مگر یہ عجیب بات ہے کہ ابن حجر تہذیب التہذیب صفحہ ۷ تا ۲۱ میں ان کے ترجمے میں لکھتے ہیں **ذکر الخطیب فی المکمل انه لم یرو عن غیر ابن عباس و لم یرو عنه غیر الزهری** یعنی علامہ خطیب بغدادی نے اپنی کتاب "المکمل" میں ذکر کیا ہے کہ عبید اللہ بن عبداللہ ابن عباس کے سوا اور کسی سے روایت نہیں کرتے۔ اور ان عبید اللہ بن عبداللہ بن ابی الثور سے زہری کے سوا کوئی دوسرا روایت نہیں کرتا۔ آخر

یہ کیوں؟ یہ ابن ابی الثور مدنی تھے۔ قریش کے آزاد کردہ غلام تھے۔ اس لئے قریشی کہے جاتے تھے۔ حضرت ابن عباسؓ کے سوا اور کوئی اس قابل ان کے نزدیک نہ تھا جس سے یہ حدیثیں سنتے اور روایت کرتے؟ اور پھر زہری کے سوا ان کو کوئی دوسرا نہ ملا جس سے روایت کرتے اور وہ ان سے حدیثیں لے کر زہری کی طرح روایت کرتا! بات یہ ہے کہ زہری حاطب اللیل تھے ۔ ہر کس و ناکس سے حدیثیں پوچھ پوچھ کر لیا کرتے تھے۔ اور پھر یہ تو درحقیقت خود بھی موالی ہی میں سے بنی زہرہ کے آزاد کردہ غلام تھے۔ یہ خود نہ سہی ان کے والد یا دادا ہی سہی۔ مگر نسب نامے کی ایک کتاب تیار کر رکھی تھی اور اپنے کو بنی زہرہ ہی سے کہا کرتے تھے۔ لوگوں نے ان کو جھٹلانے میں کوئی فائدہ محسوس نہ کیا اس لئے ان کے بیان کو تسلیم کر لیا۔ مگر میں نے جو ان کے نسب نامے پر ترجمہ اہل شہاب زہری" میں اعتراضات کئے ہیں ان میں سے کسی کا بھی کوئی جواب کسی سے نہ ہو سکا۔

اور پھر یہ تو ان سازشیوں کے مقرر کئے ہوئے ایجنٹ ہی تھے۔ اور سازش میں موالی ہی پیش پیش تھے۔ غلاموں ہی کی ان میں اکثریت تھی۔ بعض سیدھے سادھے مسلمان بھی ان کے دام فریب میں آگئے ہوں گے مگر آپ دیکھیں گے تو ایلاء النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ساری حدیثیں موالی ہی سے مروی ہیں۔ جن میں سے متعدد تو ابن جریج ہی سے مروی ہیں۔ یہ روایت جلد دوم میں صفحہ ۷۸۰ سے صفحہ ۷۸۱ تک اپنی طوالت کے ساتھ موجود ہے۔ یہاں زہری سے عقیل بن خالد روایت کرتے ہیں جو حضرت عثمانؓ کے غلام آزاد کردہ تھے۔ ایلہ کے ساکن زہری کے ہم وطن تھے۔ اور دوسری جگہ صفحہ ۷۸۰ میں زہری سے شعیب بن ابی حمزہ

روایت کر رہے ہیں - یہ بھی بنی امیہ کے آزاد کردہ غلام تھے - اور زہری کے خاص کاتب تھے - اسی لئے زہری کی حدیثوں میں دوسروں سے زیادہ قابل وثوق سمجھے جاتے ہیں - بہر حال تھے یہ بھی ایک آزاد کردہ غلام - اب اس روایت کا مکمل ترجمہ ملاحظہ ہو -

(ترجمہ) (امام بخاری فرماتے ہیں کہ) ہم سے حدیث بیان کی یحییٰ بن بکیر نے - ان سے لیث بن سعد نے ان سے عقیل نے ان سے ابن شہاب زہری نے کہ مجھکو خبر دی عبید اللہ بن عبداللہ بن ابی ثور نے عبداللہ بن عباسؓ سے (سن کر) کہ انہوں نے فرمایا کہ مجھکو بڑی حرص تھی اس بات کی کہ حضرت عمرؓ سے ان دو عورتوں کے بارے میں پوچھوں کہ وہ دو عورتیں کون تھیں جن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے ان تتوبا الی اللہ فقد صغت قلوبکما (۶۶/۴) تو میں نے ان کے ساتھ حج کیا - تو وہ راستے سے کترائے (استنجا وغیرہ کے لئے) تو میں بھی ان کے لئے پانی کا ظرف لیکر کترایا - وہ فارغ ہوکر واپس آئے تو میں نے ان کے ہاتھوں پر اسی ظرف سے پانی ڈالا تو انہوں نے وضو کیا - پھر میں نے کہا کہ اے امیر المومنینؓ ازواج رسولؐ میں سے وہ کون دو عورتیں ہیں جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے ان تتوبا تو انہوں نے فرمایا کہ سخت تعجب ہے اے ابن عباسؓ! (یعنی تمہاری اس ناواقفیت پر) وہ عائشہؓ اور حفصہؓ ہیں - پھر حضرت عمرؓ متوجہ ہوکر حدیث بیان کرنے لگے - اور فرمایا میں تھا اور میرا ایک پڑوسی تھا بنی امیہ بن زید میں سے اور اس کا محلہ عوالی مدینہ میں واقع تھا -

دونوں باری باری نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے حضور میں حاضری دیا

کرتے تھے۔ ایک دن وہ حاضر رہتا تھا اور ایک دن میں۔ جو باہر سے آتا حاضر باش سے اس دن کی اتری ہوئی آیتیں اور باتیں جو حضورؐ فرماتے تھے یا جو کوئی واقعہ ہوتا تھا پوچھ لیا کرتا تھا۔ ہم دونوں کا یہی معمول تھا۔ اور ہم قریش کے لوگ ہمیشہ عورتوں

پر چھائے رہا کرتے تھے۔ مگر انصار کے پاس آئے تو ہم نے دیکھا کہ ان کی عورتیں ان پر چھائی رہا کرتی ہیں تو ہماری عورتوں نے بھی انصاری عورتوں کے دیکھا دیکھی وہی عادت اختیار کر لی۔ ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ میں اپنی بیوی پر گرجا تو اس نے بھی اسی طرح جواب دیا۔ جو مجھ کو ناگوار گذرا بیوی نے کہا کہ میرا جواب تم کو ناگوار کیوں ہوا ؟ قسم اللہ کی نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی بیویاں بھی آپؐ کو اسی طرح جواب (برابر کا) دیا کرتی ہیں ، اور کوئی ان میں سے (جس سے کچھ ان بن ہوئی وہ) دن دن بھر آپؐ سے بول چال چھوڑ دیتی ہے رات تک اس (خبر) نے مجھکو پریشان کر دیا میں نے کہا کہ (ان میں سے) جس نے ایسا کیا ہے وہ سخت خسارے میں ہے اس کے بعد میں نے اپنے کپڑے پہنے اور سب سے پہلے اپنی بیٹی حفصہؓ کے پاس پہنچا۔ اور اس سے کہا کہ اے حفصہ ! کیا تم میں سے کوئی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے خفگی کرکے ان کو (اپنے سے) خفا کر دیتی ہے ؟ تو حفصہؓ نے کہا کہ ہاں۔ تو میں نے کہا کہ وہ گھاٹے اور بد نصیبی میں ہے ۔ کیا وہ اس سے ہنیں ڈرتی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خفا کرکے وہ اللہ کی خفگی میں پڑ جائیگی ۔ اور پھر وہ ہلاک ہی ہوکر رہیگی ۔ دیکھو ۔ تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے (منہ لگ کے) نہ بولنا اور نہ ان کی باتوں کا الٹ کر جواب دینا ذرہ برابر بھی، اور نہ ان سے بول چال ترک کرنا، اور تم کو جس چیز کی ضرورت ہو مجھ سے مانگ

لینا، اور اس برتے پر نہ رہنا کہ تمہاری پڑوسن جو ہے وہ تم سے زیادہ حسین ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبوبہ ہے ان کی مراد (حضرت) عائشہؓ سے تھی۔

اور ہم لوگ (ان دنوں) باہم تذکرہ کرتے تھے (افواہی خبروں کو سن سن کر) کہ (شاہ یمن) غسان مدینے پر حملے کی تیاری کر رہا ہے۔ تو وہ انصاری بارگاہ نبویؐ میں اپنی باری کے دن گئے۔ اور رات کو واپس آئے تو میرا دروازہ کھٹکھٹایا زور زور سے پیٹا۔ اور (میرا نام لے کر) کہا کہ وہ سوئے ہیں؟ تو میں پریشان ہوا۔ پھر (باہر) نکلا۔ انہوں نے کہا کہ ایک بڑا حادثہ پیش آگیا۔ میں نے کہا کہ وہ کیا؟ کیا غسان آگیا؟ انہوں نے کہا کہ نہیں بلکہ اس سے بھی بھاری بات ہوگئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیویوں کو طلاق دے دی (حضرت عمرؓ نے) کہا کہ بڑے گھاٹے میں رہی حفصہؓ اور نامراد رہی (آدمی کو اوروں سے زیادہ اپنی اولاد کی فکر ہوتی ہے اس لئے اس افواہ کی رو سے اگرچہ طلاق تو تمام ازواج کو دی گئی تھی مگر حضرت عمرؓ کو اپنی بیٹی کی فکر زیادہ ہوئی) میں سمجھتا تھا کہ ایسا ہو کر رہے گا۔ تو میں نے اپنے کپڑے درست کئے اور صبح کی نماز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ پڑھی۔ اس کے بعد آپؐ اپنے جھروکے پر چلے گئے اور تنہائی اختیار کرلی۔ تو میں حفصہ کے پاس چلا گیا وہ رونے لگی۔ میں نے کہا کیوں روتی ہو؟ کیا میں اس دن سے تمہیں ڈراتا نہ تھا؟ کیا تم لوگوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے طلاق دے دی؟ انہوں نے کہا میں نہیں جانتی۔ وہ اسی جھروکے میں ہیں۔ تو میں حفصہؓ کے یہاں سے چلا آیا اور میں (مسجد نبویؐ میں) ممبر کے پاس پہنچا تو دیکھا کہ ممبر کے گرد ایک جماعت ہے (مغموم) ان میں سے بعض رو رہے تھے تو میں کچھ دیر ان کے

پاس بیٹھا۔ تو جو پریشانی مجھ کو تھی وہ مجھ پر غالب آئی تو جس جھروکے میں آنحضرتؐ تھے میں اس کے پاس پہنچا اور آپؐ کے ایک حبشی غلام سے کہا کہ عمرؓ کے لئے اجازت حاصل کرو۔ تو وہ جھروکے میں گیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے باتیں کیں۔ پھر نکلا ۔ اور کہا کہ میں نے تمہارا ذکر کیا مگر آپؐ چپ رہے تو میں وہاں سے چلا آیا اور ان لوگوں کے پاس جو ممبر کے پاس بیٹھے تھے بیٹھ گیا اور پھر میری پریشانی مجھ پر غالب ہوئی ۔ پھر میں جھروکے کے پاس آیا اور غلام سے کہا ۔ پھر اس نے واپس آکر پہلی ہی طرح خبر سنائی ۔ پھر میں ممبر کے پاس والوں میں آکر بیٹھ گیا (کچھ دیر کے بعد) پھر پریشانی زیادہ محسوس کی تو پھر اٹھا اور غلام سے جاکر اجازت کے لئے کہا۔ پھر اس نے وہی پہلا سا جواب، آکر دیا ۔ تو جب میں واپس پھرنے لگا تو غلام نے مجھ کو پکارا اور کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حاضری کی اجازت تمہیں دیدی ۔ تو میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے حاضر ہوا۔ تو میں نے آپؐ کو بنی ہوئی چٹائی پر لیٹا ہوا پایا۔ آپؐ کے جسم (مبارک) اور اس چٹائی کے درمیان کوئی بچھونا نہ تھا۔ آپؐ کے پہلو پر چٹائی کی بناوٹ کے نشان پڑگئے تھے اور چھوہارے کی چھال بھرا چمڑے کا ایک تکیہ لگائے ہوئے تھے ۔ میں نے سلام کیا۔ پھر کہا کھڑے ہی کھڑے کہ کیا حضورؐ نے اپنی بیویوں کو طلاق دے دی ؟ تو آپؐ نے اپنی نظر میری طرف اٹھائی اور فرمایا نہیں۔ پھر کھڑے ہی کھڑے میں نے عرض کیا کچھ کھل کر باتیں کیجئے یا رسول اللہ! آپؐ دیکھیں ہم لوگ خاندان قریش سے ہیں ۔ عورتوں پر چھائے رہا کرتے تھے اور ایسی قوم میں آپڑے جن پر ان کی عورتیں چھائی رہتی ہیں ۔ تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم مسکرائے ۔ پھر میں نے کہا کہ دیکھئے میں حفصہ کے پاس

گیا تو میں نے اس سے کہا کہ تم اس برتے پر نہ پھولی رہو کہ تمہاری پڑوسن وہ ہے جو تم سے زیادہ حسین ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی محبوبہ ہے ان کی مراد عائشہؓ ہیں۔ تو پھر (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) دوبارہ مسکرائے۔ تو آپؐ کو مسکراتا دیکھ کر میں بیٹھ گیا۔ پھر میں نے آپؐ کے اس گھر کی طرف نظر دوڑائی تو قسم اللہ کی ایسی کوئی چیز نہیں پائی جس کی طرف نظر دوبارہ پھر جائے (یعنی اس کو پھر دیکھنے کو جی چاہے) اللہ کی قسم میں نے تین کچی کھالوں کے سوا کچھ نہ پایا۔ تو میں نے عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ سے دعا فرمایئے کہ آپؐ کی امت کو وسعت رزق عطا فرمائے۔ فارس اور روم کو اتنی وسعت ملی ہے اور دنیا (کا سامان ہر طرح کا) انہیں دیا گیا ہے۔ باوجودیکہ وہ اللہ کی عبادت نہیں کرتے۔ اور آپؐ تکیہ لگائے تھے۔ فرمانے لگے کیا اے (عمرؓ) ابن الخطاب! تم کسی شک میں (مبتلا ہوگئے) ہو؟۔ یہ لوگ ایسی قوم ہیں جن کے لئے (دنیا کی نیکیوں کی جزا اسی دنیا میں) جلد دے دی گئی ہے اس دنیاوی زندگی میں تو میں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے لئے مغفرت طلب فرمایئے۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی بات کی وجہ سے کنارہ کشی اختیار فرمائی جب کہ حفصہؓ نے اس کو عائشہؓ پر ظاہر کر دیا۔ اور آپؐ نے فرمایا تھا کہ میں ان سب کے پاس ایک مہینہ تک نہ جاؤں گا اپنے سخت غصے کی وجہ سے جو مجھے ان پر تھا۔ جبکہ اللہ نے آپ پر عتاب کیا تھا! تو جب انتیس دن گذر گئے۔ تو آپؐ (حضرت) عائشہؓ کے پاس تشریف لائے۔ اور انہی سے شروع فرمایا (حضرت) عائشہؓ نے عرض کیا کہ آپؐ نے قسم کھائی تھی کہ آپ ہم لوگوں کے پاس ایک مہینے تک نہیں آئیں گے۔ اور ہم لوگوں نے انتیس ہی راتیں گذاری ہیں۔ ہم اس کو برابر گن

رہے ہیں تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ مہینہ انتیس کا ہے۔ اور وہ مہینہ (واقعی) انتیس کا تھا اور عائشہؓ نے کہا کہ تخییر کی آیت اتری تو پہلے پہل مجھی سے شروع فرمایا۔ فرمایا کہ میں تم کو ایک بات کی نصیحت کرنے آیا ہوں تم جلدی (جواب دینے میں) نہ کرو تو تم پر کوئی الزام نہیں ہے یہاں تک کہ تم اپنے والدین سے بھی اس کو پوچھ لو انہوں نے عرض کیا کہ یہ معلوم ہے کہ میرے والدین آپؐ سے علیحدگی کا کبھی مشورہ نہ دیں گے پھر کہا (آپؐ نے) کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ "اے نبیؐ! اپنی بیبیوں سے کہہ دو قل لازواجک سے عظیما تک (۲۸:۳۳-۲۹) تو (حضرت) عائشہؓ نے کہا کہ کیا اس کے لئے میں اپنے والدین سے پوچھونگی؟ میں اللہ و رسول اور دارالآخرۃ ہی کی طالب ہوں۔ پھر آپؐ نے (اسی طرح) اختیار دیا اپنی ہر بیوی کو اور سب نے ویسا ہی جواب دیا جیسا حضرت عائشہؓ نے دیا تھا۔"

تنقید متن روایت | اس طویل و عریض فسانے کو دیکھئے۔ اس کے الفاظ پر غور کیجئے اور اس حدیث کے بنانے والے کی ذہنیت کے ساتھ ساتھ اس کی ذہانت اور پیش بندیوں کی داد دیجئے مگر میں نے اکثر حدیثوں کی تنقید میں اس کو لکھدیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جہاں قرآن کی حفاظت کا ذمہ خود لیا ہے نحن نزلنا الذکر و انا لہ لحافظون (۹/۱۵) فرما کر وہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی یہ وعدہ فرمایا ہے کہ و اللہ یعصمک من الناس (۵:۶۷) یحفظک نہیں فرمایا ہے بلکہ یعصمک فرمایا ہے حفاظت اور عصمت کے مفہوم کے فرق کو سمجھنا چاہیئے۔ حفاظت مادی ہوتی ہے جسم کی، زندگی کی، مال کی، اسباب کی حفاظت کو عموماً عصمت نہیں کہہ سکتے۔ عصمت کا

تعلق مادی و غیر مادی سب چیزوں سےؑ ہے اسی لئے عصمت کا تعلق اخلاق سے بھی ہوتا ہے فرشتے معصوم ہیں ۔ شیر خوار بچے معصوم ہیں یعنی ان سے کوئی اخلاقی خرابی سرزد نہیں ہو سکتی ۔ یہ گناہوں سے بچے ہوئے ہیں ۔ اگرچہ عصمت بمعنی حفاظت بھی بہت مستعمل ہے مگر حفاظت بمعنی عصمت یعنی روحانی و اخلاقی حفاظت شاذ و نادر ہی مستعمل ہے اس لئے عصمت کا لفظ عام ہے جسمانی و اخلاقی ہر طرح کی حفاظت کے مفہوم کو شامل ہے جیسے پسر نوحؑ نے کہا تھا پہاڑ کے متعلق کہ **یعصمنی من الما** جس پر حضرت نوحؑ نے فرمایا **لا عاصم الیوم من امر اللہ الا من رحم**[۱۱/۴۳] یہاں عاصم بمعنی معصوم آیا ہے کیونکہ الا من رحم کا استثنا معصومین میں سے ہے یعنی عاصم یہاں محفوظ کے معنی میں ہے ۔ غرض عصمت تو واللہ یعصمک من الناس میں جہاں آپؑ سے آپؑ کی جسمانی و جانی حفاظت کا وعدہ فرمایا گیا ہے وہاں آپؑ کی اخلاقی حفاظت کا وعدہ بھی اس میں داخل ہے کسی طرح کی بد اخلاقی کوئی ایسی بات جو شان نبوت کے خلاف ہو آپؑ سے کبھی سرزد نہیں ہو سکتی اور نہ کوئی آپؑ کی طرف کسی بد اخلاقی کو منسوب کر کے آپؑ کی بدنامی مشہور کر سکتا ہے ۔ جس طرح قرآن مجید پر طرح طرح کے متعدد محاذ قائم کر کر کے لوگ صدیوں تک کرتے رہے اور آجتک دشمن تو دشمن ہیں دوست بھی نادان دوست بن کر کر رہے ہیں اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بھی ایسی ایسی باتیں جو پست اخلاقی بلکہ بد اخلاقی کی کہی جا سکتی ہیں منافقین نے حدیثیں گھڑ گھڑ کر روایت کیں اور ہمارے سہل انگار محدثین نے ان کو اپنی کتابوں میں درج کر دیا ۔ یا ان کی کتابوں میں انہی منافقین نے داخل کر کر کے ان کتابوں کی نقلیں کر کر کے شائع کیں اور ان کی

موضوعات آج تک ان کی کتابوں میں انہیں جامعین احادیث کی طرف منسوب ہوکر ہمارے علماء کے نزدیک قرآن مجید کے ساتھ مثلہٗ معہٗ بنی ہوئی ہیں۔

مگر جس طرح قرآن مجید کے متعلق جتنی روایتیں اختلاف قرأت کی یا جھوٹی شان نزول کی یا جھوٹی تفسیر کی مروی ہیں ان میں یا تو راوی ہی کا وضاع و کذاب ہونا ان روایات کو جھٹلانے کے لئے کافی ہوگا یا متن روایات میں کوئی نہ کوئی ایسی بات ضرور ہوگی جو اس حدیث کے موضوع ہونے کی واضح دلیل ہوگی۔ اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جتنی جھوٹی حدیثیں منسوب ہیں خصوصاً ایسی جو قرآن مجید کی کسی آیت کے خلاف ہوں یا ایسی حدیث ہو جس سے آپؐ کے اخلاق پر حرف آتا ہو۔ شان نبوت کے خلاف ہو۔ یا تو اس حدیث کا راوی وضاع و کذاب ہوگا یا جھوٹے اسناد ثقہ راویوں کے ساتھ جوڑ کر کسی منافق نے کسی محدث کی کتاب میں داخل کر دی ہے تو متن حدیث میں ضرور کوئی نہ کوئی ایسی واضح بات اس حدیث میں ہوگی جس سے اس حدیث کا کذب و افتراء واضح ہو جائے گا۔ اس حدیث کے راوی تو ------- ابن شہاب زہری ہی ہیں دوسرے طرق کا ذکر آگے آتا ہے۔

مگر متن روایت کی کمزوریوں کو بھی ملاحظہ فرمایئے اور اس داستان کے وضاع نے کہاں کہاں ڈنڈی ماری ہے۔ اس پر غور کیجئے۔ نمبر وار لکھتا ہوں۔

(۱) اس وضاع نے حضرت فاروقؓ اعظم کے متعلق یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ بارگاہ نبوتؐ میں روزانہ کے حاضر باش نہ تھے۔ ایک دن درمیان دے کر حاضر رہتے تھے۔ اس لئے صحبت نبویؐ سے

اس قدر مستفیض نہیں ہوئے جس قدر کہ روزانہ کے حاضر باش لوگ مستفیض ہوتے تھے چنانچہ اسی من گھڑت روایت کا سہارا لے کر ایک دوسرے منافق نے یہ روایت گھڑی ہے کہ ایک آیت کو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کسی دوسرے طریقے سے پڑھتے تھے حضرت عمرؓ نے ٹوکا تو انہوں نے ڈانٹ کر کہا کہ تم تو اپنے بازار کے سودا سلف میں رہا کرتے تھے اور ہم ہر دم کے حاضر باش تھے یہ آیت ہمارے سامنے یوں ہی اتری تھی۔ تو حضرت عمرؓ چپ ہو رہے ۔ دیکھئے " اتقان " یا میری کتاب " جمع قرآن " عجب کیا ہے کہ یہ روایت اور وہ دونوں ایک ہی شخص کی من گھڑت ہوں۔

(۲) حضرت عمرؓ نے اپنے اس پڑوسی کا اس قدر پتا بتایا کہ وہ انصاری تھا بنی امیہ بن زید کے قبیلے کا تھا۔ حوالی مدینہ میں اس کا مکان تھا۔ مگر اس کا نام نہیں بتایا۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ تو تقریباً ہر انصاری صحابی سے واقف تھے صرف نام بتا دینا کافی تھا ۔ ان تین تین باتوں کے ذریعے تعارف ناقص کرانے کا فائدہ کیا تھا جب کہ ان تین باتوں کے جاننے کے بعد بھی حضرت ابن عباسؓ ہرگز نہ سمجھ سکے ہونگے کہ وہ کون شخص تھا ۔ مگر روایت ساز کسی کا نام لینے سے ڈرا کہ شاید ان صحابی کی کوئی اولاد موجود ہو بیٹا یا پوتا اور وہ اس کے بیان کو جھٹلا دے۔ اس لئے کہ یہ روایتیں تو پہلی صدی کے اواخر میں گھڑی گئیں یا اوائل ہی میں۔ اس لئے اس وقت کتنے صحابی کے بیٹے اور پوتے زندہ موجود ہونگے اس لئے اس کتاب نے حضرت عمرؓ کے اس پڑوسی کا نام نہیں بتایا۔

(۳) اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس غلام کا نام نہیں بتایا ۔ غلام کا لفظ عربی میں اس معنی میں مستعمل نہیں تھا اور نہ ہے

جس میں عام طور سے فارسی دانوں میں مستعمل ہے - عربی میں غلام کے معنی چھوکرا - لڑکا، بوائے کے ہیں - "اسود" کا لفظ حبشی کے معنی میں بھی آتا ہے - اور "اسود" لوگوں کا نام بھی اہل عرب میں تھا بلکہ خاندان قریش میں بھی بعض کا نام اسود تھا - اس لئے "اسود" کے لفظ سے حبشی بھی سمجھ سکتے ہیں اور اس لڑکے کا نام "اسود" بھی سمجھ سکتے ہیں - جب شخصیت معین نہ ہو تو یہاں بھی وہی سہولت حاصل کر لی گئی - اگر اس لڑکے کا نام واضح طور سے بتا دیا جاتا تو وہ جب اس وقت لڑکے تھے تو پہلی صدی کے اواخر بلکہ دوسری صدی کے اوائل میں ان کی بلا واسطہ اولاد زندہ ہو سکتی ہے اور اولاد در اولاد تو یقیناً یہاں بھی جھٹلائے جانے کے ڈر سے اس غلام کا نام نہیں بتایا -

(۴) حضرت عمرؓ جھروکے پر اجازت پا کر پہنچے تو انہوں نے سلام کیا اور گفتگو شروع کر دی - رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام کا جواب دیا یا نہیں اس کا ذکر ہی نہیں - یہ بالقصد حدیث بنانے والے نے چھوڑ دیا یا سہواً دونوں کا امکان ہے - قصداً چھوڑا ہو تو یہ مقصود ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نہایت رنج اور نہایت غصہ ثابت کیا جائے کہ ان کے سلام کا جواب تک نہ دیا -

اور یہ بھی ثابت ہو کہ حضرت عمرؓ کو بارگاہ نبوتؐ میں کوئی تقرب خاص حاصل نہ تھا اس لئے ان کے سلام کا جواب دینے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی -

اور پھر یہ پہلو بھی ہے کہ راوی نے اس کے ذکر کی ضرورت نہ سمجھی کہ حضورؐ نے ان کے سلام کا جواب دیا اس لئے کہ سلام کا جواب دینا ضروری ہے تو یقیناً دیا ہی ہوگا اس کے کہنے کی کیا ضرورت ہے - اس لئے

جواب سلام کا ذکر راوی نے قصداً چھوڑ دیا۔ حالانکہ راوی حدیث کا یہ حق نہیں کہ بعض بات کو بیان کرے اور بعض کو نہ بیان کرے کہ سننے والا اندازے سے خود ہی سمجھ لے گا۔ اگر کہا جائے کہ راوی کا قصور نہیں ہے۔ حضرت عمرؓ ہی نے جواب سلام کا ذکر نہیں کیا یہ سمجھ کر کہ ابن عباسؓ ضرور سمجھ لیں گے کہ جواب سلام ضرور دیا ہوگا۔ تو اس کا بھی قرینہ نہیں کیونکہ حضرت عمرؓ بقول راوی جس تفصیل سے بیان کر رہے ہیں جس میں بے سود اپنے پڑوسی کا نہیں مگر اس کے قبیلے کا نام اور اس کے گھر کا پتا بھی بتا رہے ہیں جس سے سننے والے کو کوئی فائدہ نہ ہو تو یہ ایک واقعہ جو ہوا تھا اس کو درمیان سے کیوں چھوڑ دیں گے۔ خصوصاً جب حضورؐ کے نہایت غیظ و غضب کی حالت کا ذکر کیا جا رہا ہے اور بمشکل حضرت عمرؓ کو حاضری کی اجازت ملی ہے ایسے وقت میں صرف حضرت عمرؓ کے سلام کا ذکر اور آنحضرتؐ کے جواب سلام کا مطلق ذکر نہیں یہ ظاہر کر سکتا ہے کہ غیظ و غضب کی وجہ سے آپؐ نے جواب نہ دیا ہو۔

یہ بھی کہنا صحیح نہیں ہے کہ جب قرآن میں حکم صریح سلام کے جواب دینے کا موجود ہے تو یہ کیسے گمان کیا جا سکتا ہے کہ آنحضرتؐ نے حضرت عمرؓ کو جواب سلام نہ دیا ہوگا اس لئے کہ قرآن مجید میں زن و شو کے درمیان نشوز ہو تو باہمی اصلاح کا طریقہ بتا دیا ہے فابعثوا حکما من اھلہ و حکما من اھلھا[۳۵/۴] ایک مہینے کے لئے قسم کھا کر بیوی سے علیحدگی اختیار کرنے کا طریقہ قرآن میں نہیں بتایا گیا ہے جب نعوذ باللہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ایک حکم الہیٰ کے خلاف عمل کر سکتے تھے تو دوسرے حکم کو بھی ٹال سکتے تھے۔

(۵) حضرت حفصہؓ کو پہلے پہل حضرت عمرؓ نے سمجھاتے ہوئے جو فرمایا تھا کہ "لا یغرنک ان کانتا جارتک ھی او ضا منک و احب الیٰ رسول صلی اللہ علیہ وسلم" اس کے بعد "یرید عائشہ راوی کی طرف سے اضافہ ہی ہوسکتا ہے حضرت عمرؓ کا قول نہیں ہوسکتا۔ اگر حضرت عمرؓ خود فرماتے تو ارید عائشہؓ فرماتے ۔ اور ان کو اس کے کہنے کی ضرورت نہ تھی ۔ اس لئے کہ اتنے ہی جملے سے حضرت حفصہؓ سمجھ سکتی تھیں۔ شرح کی ضرورت نہ تھی۔ راوی کو حضرت عمرؓ کے قول میں اضافے کا کیا حق تھا چاہے وہ راوی بقول وضاع حضرت ابن عباسؓ ہی کیوں نہ ہوں۔

پھر جب حضرت عمرؓ نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس کو دہرایا ہے کہ میں حفصہؓ کے پاس گیا تھا اور حفصہؓ سے اس طرح کہا وہاں بھی اتنی عبارت دہرانے کے بعد پھر "یرید عائشہؓ" کا لفظ بھی دہرایا گیا ہے ۔ اور پھر یہاں بھی یہ فقرہ راوی کی طرف سے اضافہ ہی کہا جاسکتا ہے ۔ حضرت عمرؓ اگر یہاں بھی کہتے تو یرید کبھی نہ کہتے۔ ارید کہتے ۔ مگر اس کے بھی کہنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ حضرت حفصہؓ و حضرت عائشہؓ کو مطعون کرنے کا جذبہ ان منافقین کے ناپاک دلوں میں تھا اسی جذبے نے ان کو مجبور کیا کہ وہ بے ضرورت بھی حضرت عائشہؓ کا نام روایت میں ٹھونس دیں۔

پھر دونوں جگہ اس کا بھی اظہار مقصود ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت عائشہؓ دوسری بیبیوں سے زیادہ محبوب تھیں صرف اپنے حسن جمال کے باعث۔ حسن و جمال کے سوا یا کنواری ہونے کے سوا یا کمسن ہونے کے سوا اور کوئی وجہ ان کے محبوب ہونے کی نہ تھی ۔ نعوذ باللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان راویان حدیث کے نزدیک (معاذ اللہ) محض حسن پرست تھے حضرت عائشہؓ کو کوئی اور خصوصیت

دوسری ازواج کے مقابلے میں ان کے نزدیک حاصل نہ تھی۔ حضرت عائشہؓ کی خصوصیتوں کی تفصیل ہم اپنے مضمون میں جو حضرت عائشہؓ کے تذکرے میں ہے کر چکے ہیں رسالہ خاتون پاکستان کراچی بابت ماہ ۶۲ء میں جو میرا مضمون حضرت عائشہؓ کے متعلق چھپا ہے اس میں بھی بتفصیل مذکور ہے یہاں پر اس کے اعادے کی ضرورت نہیں۔

(۶) حضرت عمرؓ فرماتے ہیں فجلست حین رایتہ تبسم جب میں نے دیکھا کہ آپؐ نے تبسم فرمایا دوسری بار بھی تو میں جو کھڑے کھڑے بات کر رہا تھا بیٹھ گیا۔ یعنی بلا اجازت بیٹھ گئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لڑکے کو بھیج کر جب حضرت عمرؓ کو بلوایا جبکہ وہ اجازت سے مایوس ہوکر واپس جا رہے تھے۔ تو اب جب حضرت عمرؓ آئے تھے تو اخلاق نبویؐ کا تقاضا بھی ہو سکتا ہے کہ آپؐ لیٹے نہ رہیں اٹھ کر بیٹھ جائیں اور ان کو بھی بیٹھنے کے لئے کہیں۔ نہ یہ کہ آپؐ خود لیٹے رہیں جس طرح لیٹے تھے اور وہ کھڑے کھڑے باتیں کریں اور پھر بلا اجازت خود سے بیٹھ جائیں؟ یہ اخلاق نبویؐ سے بالکل بعید ہے کہ وہ اپنے خسر کے ساتھ ایسا طرز عمل اختیار کریں درحقیقت روایت وضع کرنے والے نے یہ اس لئے بیان کیا ہے کہ یہ معلوم ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر میں حضرت عمرؓ کی کوئی وقعت نہ تھی۔ اسی لئے وہ آئے سامنے کھڑے کھڑے کچھ عرض کرتے رہے۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی چٹائی پر لیٹے ان کو دیکھتے رہے اور ان کی باتیں سنتے رہے ان کو بیٹھنے تک کو نہ کہا۔

اور حضرت عمرؓ کی بے تمیزی ثابت کی کہ بلا اجازت بیٹھ گئے۔ یہ بھی مذکور نہیں کہ اس چٹائی پر یا زمین پر۔

(۷) خاتمہ داستان میں حضرت عمرؓ کا قول بتایا گیا ہے فاعتزل النبی صلی اللہ علیہ و سلم من اجل ذالک الحدیث حین افستاہ حفصہ الی عائشہ ا - اللہ ہی جانے کہ اس جملے کا کیا مطلب ہے من اجل ذلک الحدیث سے کونسی "حدیث" مراد ہے؟ کیا یہی، جس کو ابن شہاب اپنے شیوخ کے ذریعے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کر رہے ہیں؟

(۸) اس بے معنی جملے سے ثابت ہو رہا ہے کہ قصور حضرت حفصہؓ کا تھا۔ حضرت عائشہؓ کا کیا قصور تھا؟ ہاں اگر روایت میں یہ بھی ہوتا کہ حضرت عائشہؓ کو یہ خبر مل گئی تھی کہ حفصہؓ سے کوئی راز کی بات کہی گئی ہے اور وہ باصرار حضرت حفصہؓ سے پوچھتیں اور وہ ان کے اصرار سے مجبور ہو کر کہہ دیتیں تو البتہ دونوں مجرم ہوتیں۔ یا یہی مذکور ہوتا کہ حضرت حفصہؓ نے حضرت عائشہؓ سے صرف اتنا ہی کہا تھا کہ مجھ سے ایک راز کی بات کہی گئی ہے اس کے بعد حضرت عائشہؓ نے اصرار کر کے ان سے کہکر معلوم کر لیا جب دونوں مجرم ٹھہرتیں۔ اس روایت میں بلکہ کسی روایت میں بھی اس کی تصریح نہیں ہے تو دونوں مجرم کیونکر ٹھہر سکتی ہیں۔

(۹) بالفرض حضرت حفصہؓ اور حضرت عائشہؓ سے قصور ہوا تھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صرف انہیں دونوں سے ایک ماہ علیحدگی کی قسم کھاتے ان دونوں کے سوا باقی بیبیوں نے کیا قصور کیا تھا جو آپؐ نے قصور وار اور بے قصور سب کے ساتھ بالکل یکساں برتاؤ کیا؟ یہ تو صریحاً ظلم ہے جس کو اس حدیث کے گھڑنے والے نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کیا ہے۔

(۱۰) مذکورہ بالا عبارت کے بعد یہ عبارت ہے و کان تد قال ما انا ید

اخل علیهن شهرا من شدلا موجد ته علیهن حین عاتبه الله یعنی " رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا تھا کہ ان لوگوں کے پاس میں نہیں جانے کا ایک مہینے تک غایت غصے کے باعث جو آپکو ان سب پر ہوا جیسا کہ اللہ نے آپ پر عتاب کیا" اس افشائے راز کا ذکر سورہ احزاب ہی میں ہے اور کسی جگہ تو ہے نہیں اس میں جو کچھ عتاب کی جھلک ہے وہ ان دو بیبیوں سے متعلق ہے جنہوں نے راز رسول کے متعلق تظاہر یا مظاہرہ کیا تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر عتاب کا اشارہ تو در کنار کہیں وہم بھی نہیں کیا جاسکتا ہے بلکہ آپؐ کے ساتھ ہمدردی کی گئی ہے آپکی حمایت کی گئی ہے آپؐ پر عتابؐ کہاں کیا گیا ہے جو کہا جائے کہ چونکہ آپؐ پر اللہ نے عتاب کیا ان دو بیبیوں کیوجہ سے تو آپؐ نے ان دو ہی پر نہیں بلکہ ان سب بیبیوں پر عتاب فرمایا یہ عجیب بات اس داستان میں ہے۔

(۱۱) خاتمہ حدیث میں جو مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سورہ احزاب کے رکوع کی ابتدائی آیتیں جن کو آیات تخییر کہتے ہیں یا یھا النبی قل لازو اجک سے عظیماہ تک (۳۳ : ۲۸ تا ۲۹) سب سے پہلے اپنے جھروکے سے ۲۹ دن پر جواتر کے آئے تو حضرت عائشہؓ کے پاس پہنچے تھے اور اس کے بعد یہ تخییر کی آیتیں اتریں تو اس کے لئے بھی سب سے پہلے حضرت عائشہؓ ہی کے پاس آپؐ پہنچے اور ان سے فرمایا کہ میں تم کو کچھ نصیحت کی باتیں کہنے کے لئے آیا ہوں تم جلدی نہ کرو اور سوچ سمجھ کر بلکہ اپنے والدین سے پوچھ کر ان کے مشورے کے بعد اس کا جواب دو۔ اس کے بعد عبارت ہے قالت قد علم ان ابوی لم یکونا یامرنی بفراقک۔ اس عبارت میں عجیب دشواری ہے علم کی ضمیر غائب بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ

وسلم کی طرف پھرتی ہے اور "بفراقک" کی ضمیر مخاطب کے مخاطب بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں۔ ایک ہی جملے میں آپ کو غائب بھی قرار دیا ہے اور حاضر بھی ۔ یا تو وہاں علمت کہئے تو یہاں بفراقک صحیح ہوگا اور اگر وہاں قد علم ہی رکھنا ہے تو یہاں بفراقہ کہیے۔ جیسا کہ بخاری کے دوسرے راویوں نے بخاری کی اس غلطی کو صحیح کرنے کے لئے بفراقہ اسکے بنانے کی کوشش کی ہے اور مطبوعہ نسخوں کے حاشیے پر بفراقہ بھی عموماً لکھدیتے ہیں۔ لیکن اصل کتاب جو دنیا میں شائع ہے یہاں تک کہ حافظ ابن حجر کے سامنے بھی فتح الباری لکھنے کے وقت جو نسخہ تھا ہر ایک میں وہاں قد علم اور یہاں بفراقک ہی ہے مگر ابن حجر وغیرہ شارحین بالکل بے انصاف ہیں شرح میں ان غلطیوں کو چھواتک نہیں ہے۔

اس کے علاوہ ابھی تو آپ نے آیہ تخییر پڑھی ہی نہیں ہے فقط اتنا ہی کہا ہے کہ ایک بات تم سے کہنے کے لئے آیا ہوں اس کا جواب تم اپنے والدین سے پوچھ کے دو ۔ ابھی حضرت عائشہؓ نے کیسے سمجھ لیا کہ مفارقت کے لئے کہا جائیگا جو فرمارہی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو جانتے ہی تھے کہ میرے والدین مفارقت کی کبھی رائے نہ دیں گے وہ آیہ تخییر سننے کے بعد انہوں نے کہا ہوگا پہلے کیسے کہیں گی۔

(۱۲) حضرت عائشہؓ کی والدہ ماجدہ حضرت ام رومانؓ کی وفات ۴ھ میں ہے اور آیہ تخییر کا نزول بقول محدثین ۶ھ میں اس لئے آیہ تخییر کے نزول کے وقت حضرت ام رومانؓ زندہ ہی نہیں تھیں اس لئے والدین سے پوچھنے کے لئے آپ اس وقت کبھی نہیں فرماتیں یقیناً صرف والد سے پوچھنے کے لئے فرماتیں یا اپنے اولیاء سے پوچھنے کے لئے فرماتیں ۔ یا سوتیلی ماں سے ممکن ہے کہ ابو یک سے باپ اور سوتیلی ماں مراد لے لئے جائیں مگر اسی

جھوٹی حدیث سے لوگوں نے حضرت ام رومانؓ کی وفات کے سنہ میں خواہ مخواہ اختلاف پیدا کر دیا ہے فاعتبروا یا اولی الابصار۔

پانچویں روایت | اس طویل و عریض روایت کے بعد ایک مختصر روایت اسی صفحہ ۳۳۵ میں ایلاہی کے متعلق ہے جس کو امام بخاری محمد بن سلام اور وہ مروان بن معاویہ الفرازی الکوفی سے وہ حمید الطویل سے اور وہ حضرت انسؓ سے روایت کرتے ہیں۔ محمد بن سلام بخارا کے رہنے والے امام بخاری کے ہم وطن تھے مگر یہ بھی ایک آزاد غلام تھے۔ غالباً اہل بخارا ہی میں سے کسی کے غلام تھے۔ ماوراء النہر کے محدث تھے۔ انہوں نے خود بعض لوگوں سے کہا تھا کہ بادشاہ جن نے مجھ کو سلام کہلا بھیجا اور کہا کہ جس مجلس میں تم حدیث کا درس دیتے ہو اس میں جتنے آدمی شریک ہوتے ہیں ان سے زیادہ ہماری قوم کے یعنی جن شرکت کرتے ہیں۔ امام مالکؒ ان کے متعلق فرماتے تھے کہ میں ان کے پاس گیا تو دیکھا کہ لوگ ان کے پاس پڑھ رہے ہیں تو میں نے ان سے کچھ بھی نہیں سنا۔ یعنی امام مالک سے کوئی حدیث نہیں لی۔ محدثین نے ان کی توثیق کی ہے۔ ان کو چھوڑیئے اور جن سے یہ روایت کر رہے ہیں انکو دیکھئے۔

مروان بن معاویہ الفرازی الکوفی۔ ان کا کوفی ہونا اور محمد بن سلام کا آزاد کردہ غلام ہونا ہی اس راویت کی حیثیت کی طرف غمازی کر رہا ہے۔ مگر صرف کوفی ہونا ہی نہیں۔ فرازی صاحب کے فضائل و مناقب اور بھی سن لیجئے۔ ابن حجر تہذیب التہذیب ج ۱۰۔ صفحہ ۹۸ میں لکھتے ہیں کہ یہ مجہول راویوں سے بہت روایت کرتے تھے۔ اور بڑے سخت مدلس تھے۔ یحییٰ بن معین فرماتے تھے کہ اس سے زیادہ حیلہ باز مدلس میں نے نہیں

دیکھا امام ابو داؤد فرماتے تھے کہ یہ ناموں کو الٹ دیا کرتے تھے۔ ہر کس و ناکس سے روایت کرتے تھے۔

اور جلد اول صفحہ ۱۶ ترجمہ ابراہیم بن محمد بن ابی یحییٰ الا سلمی جو اسلمیوں کا غلام آزاد کردہ ایک رافضی تھا اور مدینے میں رہتا تھا اس کے ترجمے میں لکھتے ہیں کہ مروان بن معاویہ جن عبدالوہاب سے روایت کرتے ہیں وہ بھی ابراہیم بن محمد بن ابی یحییٰ ہیں۔ اسی طرح ابن جریج بھی ان سے روایت کرتے ہیں تو ابراہیم بن محمد نہیں لکھتے بلکہ ابو ذئب کہہ کر روایت کرتے ہیں۔ تو اللہ جانے اس حدیث کو بھی جو حمید الطویل سے روایت کر رہے ہیں وہ واقعی حمید الطویل ہی ہیں یا کوئی اور شخص جس کا نام بول کر روایت کر رہے ہیں۔ ایسے شخص کا کیا اعتبار۔

چھٹی روایت | پھر وہی لمبی روایت حضرت ابن عباس والی صفحہ ۲۹، میں بھی مروی ہے مگر اس میں ابن شہاب نہیں ہیں۔ ابن شہاب سے جو روایت مروی ہے اس کو ابن شہاب کے دو شاگرد عقیل اور شعیب روایت کرتے ہیں۔ دونوں کی روایتیں الگ الگ اسناد سے بخاری میں ہیں۔ مگر دونوں کی عبارت ایک ہی ہے ۔ چونکہ دونوں نے ابن شہاب سے سن کر لکھ لیا تھا۔ ان میں سے ایک تو ابن شہاب کے کاتب ہی تھے پھر وہ دونوں ابن شہاب کے ہم وطن بھی تھے بخلاف اس روایت کے کہ اس کا متن اس روایت سے مختلف ہے۔ اس کی متن نقل ترجمہ کے بعد زیر بحث آئے گی۔ پہلے اس کے راویوں کو معلوم کر لیجئے۔ امام بخاری سے عبدالعزیز بن عبداللہ روایت کرتے ہیں۔ ان سے سلیمان بن بلال ان سے یحییٰ ان سے عبید بن حنین اور وہ حضرت ابن عباسؓ سے سنتے ہیں۔
عبدالعزیز بن عبداللہ قریشی الاویسی کہے جاتے ہیں۔ امام ابو داؤد نے

ان کو ضعیف قرار دیا ہے ۔ اور ان کی جرح کوئی معمولی جرح نہیں ہوسکتی۔ اور سلیمان بن بلال قریشیوں کے آزاد کردہ غلام تھے ۱۷۹ھ میں وفات پائی ۔ ان کے متعلق عثمان بن ابی شیبہ مشہور محدث نے کہا کہ لیس ممن یعتمد علے حدیثه یہ ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جن کی حدیث پر اعتماد کیا جاسکے ان کے بعد یحییٰ کا نام آتا ہے نہ اس نام کے ساتھ ولدیت ظاہر کی گئی ہے۔ نہ کوئی نسبت ۔ آخر کیوں ۔ اس نام سے پہلے دو نام ہیں۔ عبدالعزیز بن عبداللہ ولدیت کے ساتھ پھر سلیمان ابن بلال ولدیت کے ساتھ ۔ ان کے بعد صرف یحییٰ ۔ پھر اس نام کے بعد عبید بن حنین ولدیت کے ساتھ نام آیا ہے۔ محشی صاحب نے حاشیہ پر بین السطور لکھ دیا ہے ابن سعید الانصاری ۔ اور حاشیے کے دوسرے کالم پر جس پر اسماء الرجال مسطور ہے اس میں بھی ابن سعید انصاری لکھ دیا ہے۔ مگر خود امام بخاری نے چار ناموں میں سے تین ناموں کے ساتھ تو ولدیت کا اظہار ضروری سمجھا بیچ میں ایک نام کو لنڈورا کیوں چھوڑ دیا! آخر اس کی کچھ تو وجہ ہونی چاہیئے ۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ سلیمان بن بلال چونکہ صرف یحییٰ بن سعید الانصاری ہی سے روایت بیان کرتے تھے کسی اور یحییٰ سے نہیں روایت کرتے تھے اس لئے صرف یحییٰ لکھ دینا کافی سمجھ لیا جائے۔ کہ اہل علم اس سے واقف ہیں کہ سلیمان بن بلال صرف یحییٰ بن سعید الانصاری ہی سے روایت کرتے ہیں اس لئے کسی دوسرے یحییٰ کی طرف اہل علم کا ذہن نہیں جاسکتا۔ سلیمان بن بلال کے تعلقات چار چار یحییٰ سے تھے۔ دو ان کے شیخ تھے اور دو ان کے شاگرد ۔ یحییٰ بن سعید الا نصاری اور یحییٰ بن عمارہ ان کے شیخ ۔ اور یحییٰ بن حسان التنیسی اور یحییٰ بن یحیے النیشا پوری ان کے شاگرد تھے بعض شیوخ اپنے بعض شاگردوں سے بھی حدیث روایات کرتے تھے ۔ اس لئے

صرف عن یحییٰ لکھ دینے سے اگر تلامذہ میں کا کوئی یحییٰ نہ سمجھا جائے تو وہ دونوں شیخ یحییٰ بن سعید الانصاری اور یحییٰ بن عمارہ کے متعلق تو بہر حال تذبذب باقی رہے گا کہ ان ہی میں سے کون یحییٰ مراد ہیں اگر کہے کہ سلیمان بن بلال کے شیوخ نے اور عبید بن حنین کے تلامذہ میں ہم ڈھونڈینگے کہ کون یحییٰ وہاں مذکور ہیں تو بے شک یحییٰ بن عمارہ کو ان فہرستوں میں نہیں پائیں گے۔ یحییٰ بن سعید الانصاری ہی کو پائیں گے مگر پھر بھی تذبذب سے نجات نہیں مل سکتی۔ اس لئے کہ یحییٰ بن سعید الانصاری بھی ایک ہی نہیں ہیں۔ ایک اور بھی ہیں جن کو تمیز کے لئے یحییٰ بن سعید العطار الانصاری کہتے ہیں جو منکر الحدیث تھے۔ اس لئے عبید بن حنین کے تلامذہ میں نہ سہی سلیمان بن بلال کے شیوخ میں تو یحییٰ ہی سعید العطار الانصاری ہو سکتے ہیں۔

یحییٰ بن سعید الانصاری العطار کا سال ولادت یا وفات کوئی لکھتا نہیں ہے مگر ان کے شیوخ، اور تلامذہ کے سنین وفات سے اس کا اندازہ مل سکتا ہے کہ یحییٰ بن سعید الانصاری اند یحییٰ بن سعید الطار اور یحییٰ بن سعید القطان یہ تینوں ہمعصر تھے۔ آپس میں چھوٹے بڑے تو ضرور ہونگے مگر ایک ہی زمانے کے ضرور تھے۔ اور سلیمان بن بلال کے سال وفات ۱۷۹ھ سے اس کا پتا ملتا ہے کہ یہ ان تینوں سے روایت کر سکتے تھے۔ مگر اگر یہ یحییٰ درحقیت ابن سعید ہوتے تو اس سلسلہ اسناد میں جس طرح عبدالعزیز کو امام بخاری نے بن عبداللہ لکھا ہے اور سلیمان کو ابن بلال لکھا، اور یحییٰ کے بعد عبید کو ابن حنین لکھا ہے اسی طرح یحییٰ کو بھی ابن سعید ضرور لکھ دیتے۔ یحییٰ کو بغیر اظہار ولدیت کے لکھنے سے ظاہر ہے کہ یہ یحییٰ کوئی غیر ابن سعید تھے اور بہت مجروح تھے غیر ثقہ تھے اس لئے امام بخاری نے اپنی عادت کے مطابق ان کے نام کو ولایت و نسبت کے

بغیر لکھ دیا جیساکہ وہ مجروح و غیر ثقہ راویوں کے نام کے ساتھ اکثر کرتے
رہے ہیں احادیث نزول مسیح بن مریمؑ کی تنقید میں اسحٰق کو جو اسی طرح
امام بخاری نے معرا بغیر اظہار ولدیت و نسبت سلسلہ اسناد میں رکھا ہے
میں نے مفصل بحث کی ہے اور اس کو ثابت کیا ہے کہ سلسلہ اسناد میں
اس طرح کی تدلیس امام بخاری اکثر کیا کرتے تھے۔ اور شارحین جو اپنی
طرف سے ولدیت و نسبت جوڑ کر کسی کو ثقہ اور معتمد علیہ شخصیت بنا
دیتے ہیں وہ اس کی بنیاد محض شارحین کے حسن عقیدت پر ہوتی ہے جو
ان کو امام بخاری کے ساتھ ہوتی ہے ۔ واقفیت و حقیقت پر نہیں ہوتی۔

کتب رجال کی بعض تصریحات | انہی وجوہات کی بنا پر شارحین کی وہی
عقیدت کو حقیقت سمجھ کر حجت و سند نہیں سمجھا جاسکتا ائمہ رجال میں
متقدمین نے جو جرح وتعدیل راویان احادیث و تواریخ و تفاسیر پر کی ہے
وہ ضرور قابل اعتبار ہے اور اس میں تعدیل پر جرح بہر حال مقدم ہے ۔
تعدیل محض حسن ظن پر اور ظاہر حال پر

ہر کرا جامعہ پارسا بینی ‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌ پارسا دان و نیک مرد انگار

کے اصول پر بہت ہوا کی ہے۔ مگر ائمہ جرح و تعدیل نے کسی راوی پر
جرح محض بدگمانی پر نہیں کی ہے جرح کرنے میں وہ بہت احتیاط سے کام
لیتے تھے۔ جب تک کسی کا کذب ان پر کسی واضح و قطعی دلیل سے ثابت
نہیں ہو جاتا تھا اس وقت تک کسی راوی کو محض بدگمانی کے ماتحت
کذاب و ضاع وغیرہ وغیرہ نہیں کہہ دیتے تھے۔ اور نہ غیر ثقہ یا لایحتج بہ
وغیرہ کسی کے متعلق اٹکل پچو طور سے لکھ دیتے تھے ۔ اس لئے جرح بہر
حال تعدیل پر مقدم ہے ۔ مگر متاخرین ائمہ رجال مثلاً ابن ابی حاتم ،
ذہبی اور ابن حجر وغیرہم مصنفین کتب رجال نے جب رجال کی کتابیں

تصنیف کیں اور ہر راوی کے نام کے بعد وہ اس کی بھی تصریح لکھنے لگے کہ اس راوی کے کون کون شیوخ تھے اور کون کون تلامذہ تو اس میں ان کو ائمہ حدیث کی کتابوں ہی سے مدد لینی پڑی۔ اور جامعین احادیث کی ہر حدیث کے اسناد ہی سے اس کا پتا لگانا پڑا۔ مگر جہاں جامعین احادیث کے سلسلہ اسناد میں کوئی نام ولدیت و نسبت سے خالی صرف نام ہی نظر آیا اور اس نام کے کئی راوی ایک دوسرے کے ہمعصر ان کو نظر آئے اور ان میں سے بعضے ثقہ بعضے غیر ثقہ، تو اگر وہ ایسا لنڈورا نام صحاح ستہ خصوصاً بخاری و مسلم کی حدیث کے سلسلہ اسناد میں ان کو نظر آیا تو اپنے حسن عقیدت کے ماتحت اس نام میں ولدیت و نسبت اپنی طرف سے جوڑ کر اس کو ثقہ ہی شخص قرار دیدیتے ہیں۔ چنانچہ عبید بن حنین کے تلامذہ اور سلیمان بن بلال کے شیوخ میں بخاری کی اسی حدیث کے سلسلہ اسناد میں صرف یحییٰ دیکھ کر وہاں تلامذہ کی فہرست میں اور یہاں شیوخ کی فہرست میں بن سعید کا لفظ بڑھا دیا۔ بلکہ عبید بن حنین کے تلامذہ کی فہرست میں الانصاری کا لفظ بھی جوڑ دیا۔ اس لئے کہ عبید بن حنین بہت متقدم تھے ان کا سال وفات ۱۰۵ھ تھا۔ اور یحییٰ بن سعید القطان کا سال وفات ۱۹۸ھ اس لئے قطان ان سے روایت نہیں کر سکتے تھے اور انصاری کا سال وفات ۱۴۴ھ یا ۱۴۶ھ ہے۔ اگر یحییٰ بن سعید الانصاری نے ستر بہتر یا اس سے کچھ کم بھی عمر پائی ہو تو عبید بن حنین سے یہ روایت کر سکتے ہیں اس لئے عبید بن حنین کے تلامذہ کی فہرست میں یحییٰ بن سعید لکھ کر الانصاری کا لفظ بھی چھوڑ دیا تو یہ اضافہ مصنفین کتب رجال متاخرین یعنی ابن حجر وغیرہ کی طرف سے ہے۔ اس لئے یہ وہی اضافہ سند و حجت نہیں۔

میں یہ نہیں کہتا کہ اس طرح کی تدلیس راویوں کے ناموں میں امام بخاری نے خود کی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ان کے شیخ ہی نے کی ہو یا شیخ کے شیخ نے ۔ یعنی جو شخص اس بے ولدیت و نسبت والے نام سے اس قصے کو روایت کر رہا ہے وہی اس تدلیس کا ذمہ دار ہو۔ مگر ایسا بھی ہو تو میں سمجھتا ہوں کہ امام بخاری اس تدلیس کے الزام سے بچ نہیں سکتے۔ ان کو اپنے شیخ سے اس نام کی تصریح پوچھ لینی تھی۔ اور سلسلہ اسناد میں لنڈورا نام نہیں رکھنا چاہیئے تھا اگر ان کے شیخ نے سلسلہ اسناد میں لنڈورا ہی نام رکھ کر روایت بیان کی تھی تو دریافت کر لینے کے بعد اس نام کے بعد (یعنی ابن سعید الانصاری) ضرور اپنی طرف سے بڑھا کر روایت کرتے۔ تاکہ تدلیس میں وہ بھی شریک نہ ثابت ہو۔

مگر حقیقت تو یہ ہے کہ امام بخاری کی شان اس قسم کی تدلیسات سے بہت بلند تھی۔ وہ کبھی کسی تدلیس کے مرتکب نہیں ہوئے۔ اس قسم کی جتنی روایات بخاری میں مروی ہیں جن میں کسی قسم کی بھی تدلیس اسناد یا متن حدیث میں ہے وہ ساری روایات امام بخاری کے بعد ان کی کتاب میں ان کے بعض منافق قسم کے تلامذہ کی داخل کردہ ہیں۔ اسی وجہ سے آپ صحیح بخاری جس کو علماء کے عقیدے کے مطابق ہم اصح الکتب بعد کتاب اللہ کہتے ہیں اس میں کتنی حدیثیں ایسی پاتے ہیں جن میں صریح و واضح کذب بیانی کی گئی ہے جس کا جھوٹ آفتاب نیمروز سے بھی زیادہ روشن ہے۔ وطی فی الدبر کے جواز کی حدیث بھی آپ بخاری میں پاتے ہیں۔ اور پھر قرآن مجید کی واضح تصریحات کے خلاف بھی آپ بہت سی روایات دیکھتے ہیں۔ ان ساری موضوعات کے ذمہ داران کے وہ تلامذہ ہیں جن کے ہاتھوں میں امام بخاری کے بعد ان کی

کتاب پڑی ورنہ امام بخاری ایسی گمراہ کن موضوعات کو جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر حملے کیئے گئے ہوں آپؐ کے خلق عظیم کو مجروح کیا گیا ہو ، قرآن مجید کو غیر محفوظ بتایا گیا ہو واقعات صریحہ کے خلاف سفید جھوٹ بیان کیا گیا ہو ، ہرگز ہرگز اپنی کتاب میں ہنیں لکھ سکتے تھے ۔ رحمۃ اللہ علیہ

لیکن:- چونکہ کتاب صحیح بخاری انہی کی طرف منسوب ہے ۔ ان کے وہ تلامذہ کون کون تھے جنہوں نے ان کی کتاب میں ایسی گمراہ کن حدیثیں داخل کیں ان کے نام معلوم ہنیں اس لئے برائے نام ہی سہی مگر الزام دیتے وقت امام بخاری ہی کا نام نامی آجاتا ہے جس سے میں معذور ہوں ۔ اللہ تعالیٰ میری نیت کو جانتا ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ کی توہین و تحقیر یا تکذیب میرا مقصود ہنیں ۔ اور نہ وہ میرے نزدیک مورد الزام ہیں ۔ بلکہ ان کی طرف منسوب کتاب میرے نزدیک مورد الزام ہے ۔ لیکن قلم سے اگر امام بخاری ہی پر ایراد الزام کے کلمات نکل جائیں تو میں امام رحمہ اللہ کی روح پاک اور علمائے ناظرین سے معافی کا خواستگار ہوں ۔ ناظرین ان الزامات کو امام بخاری پر ہنیں ان کی کتاب پر سمجھیں ۔ جس کے ذمہ دار ان کے تلامذہ اور ان کی کتابوں کے رواۃ ہیں امام بخاری ہنیں ۔

آمدم برسر مطلب | تو اب یہ معلوم کرنا ہے کہ پھر واقعی یہ یحییٰ بے ولدیت و نسبت والے درحقیقت کون ہیں؟ غیب کا علم تو اللہ تعالیٰ ہی کو ہے ۔ اس لئے حقیقت حال تو وہی جانتا ہے ظاہر قرائن کیا بتاتے ہیں میں اس کو عرض کرتا ہوں ۔ سلیمان بن بلال متوفی ۱۷۷ھ قریش کے آزاد کردہ

غلام تھے۔ اسمٰعیل بن ابی اویس جو امام مالکؒ کے بھانجے تھے ان کے خاص شاگرد تھے۔ اسی لئے اپنی کتاب میں ابن ابی اویس نے ان کی بہت سی روایات بھرتی کرلی تھیں ابن حجر سلیمان بن بلال کے ترجے میں ہتذیب التہذیب جلد ۴ صفحہ ۱۷۶ میں لکھتے ہیں و قال الله علی ماظننت ان عند سلیمان بن بلال من الحدیث ماعنده حتی نظرت فی کتاب ابن ابی اویس ناذا هوتد تبحر حدیث المدینین اس سے صاف ظاہر ہے کہ سلیمان بن بلال کی روایت سے مدینین کی بہت سی روایات اسمٰعیل بن اویس کی کتاب میں مروی منقول تھیں چونکہ اسمٰعیل بن ابی اویس سلیمان بن بلال کے خاص شاگرد اور گویا ان کی حدیثوں کے جامع تھے۔ مگر اسمٰعیل بن ابی اویس کا ترجمہ ہتذیب التہذیب جلد اول صفحہ ۲۱۰ سے ۳۱۲ تک دیکھ جایئے کوئی ان کو ضعیف کوئی منکر الحدیث کوئی متروک الحدیث کوئی وضاع کوئی کذاب ہی لکھ رہاہے۔ مگر امام بخاری کے یہ شیخ بھی ہیں اور امام مسلم کے بھی۔ اس لئے ابن حجر ان کی رو داد لکھنے کے بعد لکھتے ہیں و فعل هذا کان من اسمعیل فی شبیته ثم انصلح۔ یعنی ہم امید کرتے ہیں کہ یہ ساری حالتیں ان کی جوانی کے زمانے کی ہوں گی اس کے بعد وہ اصلاح پذیر ہوگئے ہوں گے۔ و اما الشیخان خلا یظن بمہا انهما اخرجا عنه الا الصحیح من حدیثه الذی شارک فیه الثقات۔ باقی رہے امام بخاری و امام مسلم۔ تو ان دونوں کے متعلق یہ گمان نہیں کیا جاسکتا ہے کہ ان دونوں نےان کی روایات سےصحیح کے سوا کچھ اور لیا ہو بس وہی حدیثیں ان کی لیں جن میں دوسرے ثقہ لوگ بھی ان کے شریک روایت ہیں۔" اس دعوے کی تصدیق تو ابن اویس کی جو حدیثیں بخاری و مسلم میں ہیں ان

کی چھان بین ہی سے ہوسکتی ہے جو کچھ مشکل نہیں ہے ۔ مگر یہ میرا موضوع بحث نہیں ہے اس لئے صرف اتنا ہی لکھ دینا اس وقت کافی ہے کہ یہ علامہ ابن حجر کا حسن ظن ہے، جو محض حسن عقیدت پر مبنی ہے ۔ واقعہ ایسا نہیں ہے ایسی حدیثیں بھی ابن ابی اویس سے ان دونوں کتابوں میں ضرور مروی ہیں جن کی کوئی متابعت ان کتابوں میں مذکور نہیں۔

سلیمان بن بلال کے بارے میں عثمان بن ابی شیبہ کا قول میں لکھ چکا ہوں کہ **لیس ممن یعتمد علی حدیثه** یعنی یہ ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جن کی حدیثوں پر اعتماد کیا جائے ۔ اگر یہ پوری داستان کسی منافق کی گھڑی ہوئی امام بخاری کی کتاب میں داخل کردہ نہیں ہے واقعی سلیمان بن بلال ہی کی روایت کردہ ہے تو انہوں نے خود اپنے شیخ یحییٰ کا نام بغیر ولدیت و نسبت ظاہر کئے روایت کی ہے اگرچہ عقل اس کو قبول نہیں کرتی۔ کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو سلیمان سے روایت کرنے والے عبدالعزیز بن عبداللہ ضرور سلیمان سے پوچھتے کہ یہ کون یحییٰ " ہیں اور خود روایت کرتے تو" یعنی " کہہ کر شخصیت کو واضح کر دیتے البتہ اگر خود عبدالعزیز بن عبداللہ ہی کو مورد الزام قرار دیجئے اور یہ سمجھئے کہ امام بخاری نے ان سے یحییٰ کی بابت پوچھا تو ہوگا مگر عبدالعزیز نے کہہ دیا ہوگا کہ یہی بات سلیمان نے نہیں بتائی کہ یہ کون یحییٰ ہیں اس لئے امام بخاری نے بھی مبہم چھوڑ دیا ورنہ اگر عبدالعزیز امام بخاری کو بتا دیتے تو امام بخاری خود اسکو " یعنی " کہکر کھول دیتے۔

بہر حال یہ یحییٰ بن عبید اللہ بن عبداللہ موہب التیمی المدنی ہیں۔ جن کو تقریباً سارے ائمہ رجال نے مطعون کیا ہے یحییٰ القطان نے ان

سے حدیثیں لی تھیں مگر واپس کر دیں اور پھر ان کو ترک کر دیا۔ دار قطنی نے، ابن عیینہ نے اور ابو حاتم نے ضعیف کہا۔ ابن معین نے لا یکتب حدیثہ لیس بشیئ کہا امام احمدؒ نے منکر الحدیث لیس بثقة فرمایا۔ ابو بکر ابی شیبہ نے کان غیر ثقة فی الحدیث کہا۔ نسائی نے ضعیف لایکتب حدیث کہا۔ ابو عبداللہ حاکم نے کہا کہ ابو ہریرہؓ سے ایک نسخہ (کتاب) ہی کی روایت کرتے تھے۔ جن میں زیادہ تر وہ منکر حدیثیں تھیں۔ اور آخر میں کہا کہ حدیثیں یہ گھڑا کرتے تھے۔ اور اپنے والد عبید اللہ بن عبداللہ ہی سے عموماً روایت کرتے تھے۔ اور عبید اللہ بن عبداللہ ابن موہب ایک مجہول الحال شخص نے ان کو امام شافعیؒ اور امام احمدؒ نے مجہول لا نعرفہ" کہا ہے۔ اس لئے سلیمان بن بلال نے "یحییٰ" کے نام کو تو ولدیت و نسبت سے معریٰ رکھا اور عن عبیداللہ" کے عوض صرف" عن عبید" رکھ کر سوچا کہ سلسلہ اسناد میں دو دو نام مسلسل ولدیت و نسبت سے معریٰ مناسب نہیں اس لئے سوچا کہ کسی ایسے" عبید" کو یہاں رکھنا چاہیئے جو بہت زیادہ متعارف نہ ہو۔ اور اس سے روایت حدیث کرنے والے جو زندہ ہوں وہ اپنے ہی طبقے کے میرے ہی جیسے آزاد کردہ غلام ہوں یا اپنے ہم خیال ہوں اس لئے" عبیداللہ" کو" عبید بن حنین" بنا دیا کہ وہ خود بھی ایک غلام آزاد کردہ تھے ان سے روایت کرنے والے مسلم بھی ابوالنضر عمر بن عبداللہ التیمی کے غلام تھے اور عقبہ بن مسلم بھی بن تمیم کے غلام تھے اور ابو انر ناد، عبداللہ بن ذکر ان جو تھے وہ رملہ کے غلام تھے۔ اور مروان بن عثمان انہیں جیسے تھے۔ ابن حجر نے ان کے ترجمے میں ایک منکر حدیث کا بھی ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ امام نسائی نے ان کے متعلق فرمایا" مروان بن عثمان نے یہ احسان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے

متعلق جو کچھ وہ بولے سچ بولے۔" یعنی اللہ تعالیٰ پر کوئی جھوٹ بات نہیں لگائی اس سے صاف ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مقدس ان سے نہیں بچی۔ جھوٹی حدیثیں ان کی طرف ضرور منسوب کیں ورنہ امام نسائی اس طرح نہ فرماتے اب لے دے کر ان سے روایت کرنے والے صرف یہی یحییٰ صاحب رہ جاتے ہیں جن کا حال آپ کو معلوم ہوگیا۔ مگر اپنے حسن عقیدت کی وجہ سے جو امام بخاری کے ساتھ ابن حجر رکھتے تھے بخاری کی حدیث میں ان سے روایت کرنے والے یحییٰ کا نام دیکھ کر تہذیب التہذیب میں ان کے تلامذہ کی فہرست میں یحییٰ کے بعد " بن سعید الانصاری " بھی لکھ دیں تو اس کو میں کیا کروں۔

مختصر یہ ہے کہ پہلی کہانی کے راوی ابن شہاب زہری تھے تو اس کہانی کے راوی ان سے بھی زیادہ ناقابل اعتماد، یحییٰ بن عبیداللہ ہیں۔ اور عبدالعزیز بن عبداللہ الاویسی کے بعد سب آزاد کردہ غلام ہی ہیں۔ یہ حال راویوں کا ہے۔ پہلی روایت کی متن کی تشریح آپ دیکھ چکے اب دوسری روایت کی متن کا بھی جائزہ لے لیجئے۔ فرماتے ہیں۔

عبید بن حنین سے مروی ہے کہ انہوں نے ابن عباس سے سنا روایت بیان کرتے ہوئے کہ وہ سال بھر تک اس کا ارادہ ہی کرتے رہے کہ حضرت عمرؓ بن الخطاب سے ایک آیت کے بارے میں پوچھیں۔ مگر ان کی ہیبت سے انہیں ان سے پوچھنے کی ہمت نہ پڑی۔ یہاں تک کہ وہ حج کے لئے (مدینے سے) باہر نکلے تو میں بھی ان کے ساتھ نکلا تو واپسی کے وقت ہم لوگ راستے میں تھے کہ حضرت عمرؓ پیلو کے درختوں کی جھاڑی کی طرف مڑے رفع حاجت کے لئے۔ تو میں ان کے انتظار میں ٹھہرا رہا۔ یہاں تک کہ وہ فارغ ہوئے تو میں ان کے ساتھ چلا پھر میں نے کہا کہ اے امیر

المومنینؓ وہ دونوں عورتیں کون تھیں جنہوں نے باہم تعاون کیا تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں آپؐ کی بیویوں میں سے ۔ تو انہوں نے فرمایا کہ وہ دونوں حفصہؓ اور عائشہؓ تھیں ۔ (ابن عباسؓ نے) کہا کہ قسم ہے اللہ کی میں آپؐ سے سال بھر سے یہ پوچھنا چاہتا تھا۔ مگر آپ کی ہیبت سے پوچھتا نہ تھا۔ تو انہوں نے فرمایا ایسا نہ کرو جس بات کے متعلق تم کو گمان ہو کہ مجھے اس کا علم ہے ، اس کو مجھ سے پوچھ لیا کرو۔ اگر مجھ کو اس کا علم ہوگا تو میں تم کو اس سے مطلع کردوں گا۔

پھر حضرت عمرؓ نے فرمایا ۔ قسم ہے اللہ کی ہم لوگ زمانہ جاہلیت میں عورتوں کی کوئی اہمیت نہیں سمجھتے تھے۔ یہاں تک کہ ان کے متعلق وہ آیتیں اتریں جو اتریں اور ان کے لئے حصہ مقرر کیا گیا جو مقرر ہوا۔ پھر ایک بار میں ایک بات کے متعلق غور و فکر کر رہا تھا کہ میری بیوی نے کہا کہ اگر آپ اس اس طرح یہ کام کرتے (تو بہتر تھا) تو میں نے اس سے کہا کہ تجھ کو اس سے کیا سروکار؟ تو اس کو کیا جانے ۔ جس بات کو میں سوچ رہا ہوں تجھ کو اس میں دخل دینے کا کیا حق ہے ۔ اس نے کہا کہ تعجب ہے کہ اے ابن الخطابؓ تم نہیں چاہتے کہ تمہاری بات کا جواب برابری سے دیا جائے حالانکہ تمہاری بیٹی (حفصہؓ) برابری سے جواب دیتی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ۔ اس حد تک کہ آپ اس دن بھر غضب ناک رہتے ہیں۔ تو عمرؓ فوراً اٹھے اور اپنی چادر لی اور حفصہؓ کے پاس پہنچے ۔ اور کہا کہ اے میری بیٹی کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو برابر کا جواب دیتی ہے ؟ اس حد تک کہ وہ دن بھر غضب ناک رہتے ہیں۔ تو حضرت حفصہؓ نے کہا کہ قسم ہے اللہ کی ہم لوگ ان کو برابر کا جواب دیتے ہیں۔ تو میں نے کہا کہ جان لو کہ میں اللہ کی عقوبت سے تم کو ڈراتا ہوں اور

رسول اللہ کے غضب سے ۔ اے بیٹی تم کو دھوکا نہ دے وہ جس کے
حسن نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جذبہ محبت کو اپنا گرویدہ بنا
لیا ہے جو اس سے ہے۔ (یعنی جو محبت آپؐ کو ان سے ہے) وہ اس سے
مراد لیتے ہیں عائشہؓ کو پھر حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ میں (حضرت حفصہؓ کے
پاس سے) پھر چلا ۔ اور حضرت ام سلمہؓ کے پاس پہنچا ۔ اس قرابت کی
وجہ سے جو میرے اور ان کے درمیان تھی ۔ تو میں نے ان سے باتیں
کیں ۔ ام سلمہ نے کہا تعجب ہے تم سے اے ابن الخطابؓ تم ہر چیز میں
دخل دیا کرتے تھے ، یہاں تک کہ اب چاہتے ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم اور ان کی بیویوں کے معاملات میں بھی مداخلت کرو! تو انہوں
نے ایسا مجھ کو آڑے ہاتھوں لیا کہ جو غصہ میں محسوس کر رہا تھا وہ باقی نہ
رہا۔ (ٹھنڈا ہوگیا) پھر میں وہاں سے چلا آیا۔ اور میرا ایک ساتھی انصاری
تھا، جب میں غائب ہوتا تھا تو وہ میرے پاس (میری غیر حاضری کے
وقت کی) خبر لے آتا تھا۔ اور جب وہ غائب ہوتا تھا تو میں اس کے پاس
خبر پہنچاتا تھا۔ اور ہم لوگ ڈر رہے تھے ایک بادشاہ سے جو غسان کے
بادشاہوں میں سے تھا۔ اس کا چرچا تھا کہ وہ ہم لوگوں پر حملہ آور ہونے
والا ہے اس لئے ہم لوگوں کے سینے اس (خوف) سے بھرے ہوئے تھے۔
تو اچانک میرا وہ انصاری ساتھی دروازہ پیٹنے لگا اور کہا کہ کھولو کھولو۔ تو
میں نے پوچھا کہ کیا غسانی آگیا؟ تو کہا کہ بلکہ اس سے بھی سخت تر بات ہے
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیویوں سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔
تو میں نے کہا کہ خواری ہوی حفصہؓ اور عائشہؓ کی۔ تو میں نے اپنے کپڑے
لئے کہ نکلوں ۔ جب وہاں پہنچا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت
اپنے ایک جھروکہ میں تھے۔ جس پر لکڑی کی سیڑھی سے چڑھا جاتا تھا۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک حبشی غلام اس سیڑھی کے سرے پر موجود تھا تو میں نے اس سے کہا کہ (جاکر) عرض کرو کہ یہ عمر بن الخطاب ہے تو مجھ کو اجازت دی۔ تو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس بات کو دہرایا۔ تو جب میں ام سلمہؓ کی بات تک پہنچا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسکرائے۔ اور آپؐ (اس وقت) ایک چٹائی پر تھے اس چٹائی اور آپؐ کے (جسم پاک کے) درمیان کوئی چیز (از قسم فرش) نہ تھی۔ اور آپؐ کے سر مبارک کے نیچے خرمے کی چھال سے بھرا چمڑے کا ایک تکیہ تھا۔ اور آپؐ کے دونوں پاؤں کے پاس سلم (ایک درخت) کے پتوں کے تراشے پڑے ہوئے تھے۔ اور آپؐ کے سر کے سامنے کچھ کھالیں لٹکی ہوئی تھیں۔ تو میں نے دیکھا کہ چٹائی کے نشان آپؐ کے پہلو پر پڑے ہوئے تھے تو میں رو دیا۔ آپؐ نے فرمایا کہ رونے کیوں لگے ؟ تو میں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ کسریٰ اور قیصران (نعمتوں) میں ہیں جن میں وہ ہیں۔ اور آپؐ تو اللہ کے رسولؐ ہیں ۔ تو آپؐ نے فرمایا کہ کیا تم کو یہ پسند نہیں ہے کہ ان کے لئے دنیا رہے، اور ہم لوگوں کے لئے آخرت؟"

اب اس روایت کو پہلی روایت سے ملا کر دیکھئے۔ کیا دونوں روایتیں حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہو سکتی ہیں ؟ حضرت عمرؓ کا گھر سے صبح کو سویرے چلنا اور مسجد میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھنا اور نماز کے بعد آپ کا اپنے جھروکے میں چلا جانا اور حضرت عمرؓ کا حضرت حفصہؓ کے پاس آنا اور ان کا رونے لگنا۔ حضرت عمرؓ کا رونے کی وجہ پوچھ کر الزام دینا کہ اسی دن کے لے ہم تم کو منع کرتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منہ لگ کے نہ بولا کرو۔ پھر حضرت عمرؓ کا پوچھنا کہ کیا آنحضرت نے تم لوگوں کو طلاق دے دی ہے ۔ ؟ حضرت

حفصہؓ کا کہنا کہ نہیں جانتی - آپؐ اسی جھروکے میں ہیں۔ وہاں سے حضرت عمرؓ کا مسجد میں ممبر کے پاس آنا اور صحابہؓ کی ایک جماعت کو وہاں مغموم اور بعضوں کو روتا ہوا پانا۔ پھر وہاں سے گھبرا کر جھروکے کے پاس آنا حبشی لڑکے کو آنحضرتؐ کے پاس طلب کرنے کے لئے بھیجنا - اور اس کا آکر کہنا کہ آپؐ خموش رہے ہیں اجازت نہیں دی حضرت عمرؓ کا ناکام پھر مسجد میں واپس آنا کچھ دیر کے بعد پھر جھروکے کے پاس آنا اور پھر اس حبشی لڑکے سے اجازت کے لئے کہنا پھر اجازت نہ ملنا اور پھر مسجد میں واپس آنا اور پھر کچھ دیر کے بعد گھبرا کر جھروکے کے پاس جانا اور پھر اس لڑکے کو اجازت کے لئے بھیجنا۔ غرض تیسری بار بھی پہلے اجازت کا نہ ملنا اور ان کا واپس جانا مگر پھر غلام کا پکارنا اور اجازت کی خبر سنانا۔ اور حضرت عمرؓ کا صرف کھڑے کھڑے ہی باتیں کرنا ان کا سلام کرنا اور آپؐ سے پوچھنا کہ کیا آپؐ نے اپنی بیویوں کو طلاق دیدی ہے آپ کا انکار فرمانا پھر ان کا اللہ اکبر کہنا صفحہ ۳۳۵[لے] میں اللہ اکبر کہنے کا ذکر نہیں ہے۔ جو عقیل سے ابن شہاب نے بیان کیا ہے مگر صفحہ ۷۸۱[لے] میں ابن شہاب سے جو روایت ہے اس میں اس کا ذکر ہے کہ جب طلاق سے آنحضرتؐ نے انکار فرمایا تو حضرت عمرؓ نے اللہ اکبر کہا - پھر ان کی دو باتوں پر دو بار آپؐ کا تبسم فرمانا۔ پہلی بار جب حضرت عمرؓ نے کہا تھا کہ ہم لوگ قریشی ہیں عورتوں پر چھائے رہتے تھے مگر ایسی قوم میں آپڑے جن پر ان کی عورتیں چھائی رہتی ہیں تو آپؐ نے اس پر تبسم فرمایا تھا اور دوسری بار حضرت عمرؓ کے اس دہرانے پر کہ میں نے حفصہؓ سے کہا کہ لایغرنک ...... الخ اس پر آپؐ مسکرائے حضرت ام سلمہؓ کی گفتگو کا کوئی ذکر آنحضرتؐ کے سامنے اس روایت میں ہے ہی نہیں۔ اس پر آپؐ کے

لے - بخاری کے اس نسخہ کا ذکر ہو رہا ہے جو مولانا کے پیش نظر تھا اور نور محمد اصح المطابع کراچی نے چھاپا ہے۔

تبسم کا کیا ذکر ہوگا اور یہاں ان باتوں پر تبسم کا کوئی ذکر نہیں۔ پھر وہاں دوسرے تبسم پر حضرت عمرؓ کے بیٹھ جانے کا بھی ذکر ہے۔ غرض دونوں روایتوں کو آپ ملا کر دیکھئے کافی تفاوت پائیں گے۔ یہ نہیں معلوم ہوگا کہ دونوں روایتیں حضرت عمرؓ ہی کی بیان کردہ ہیں۔ یا دونوں روایتیں حضرت عبداللہ بن عباسؓ ہی کی بیان کردہ ہیں۔ حضرت عمرؓ کے تو دو بار کہنے کا گمان بھی نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ دونوں حدیثوں سے ظاہر ہے کہ حضرت عمرؓ سے پہلی بار حضرت ابن عباسؓ نے ان دونوں ام المومنینؓ کے بارے میں دریافت کیا۔ روایت میں "پہلی بار" کا لفظ اگرچہ نہیں ہے مگر روایت کے الفاظ آغاز روایت کے جملے صاف بتا رہے ہیں حضرت ابن عباسؓ نے ایک ہی بار حج کے موقع پر حضرت عمرؓ سے پوچھا۔ اگر دوبارہ پوچھتے تو وہ دوسری بار ضرور کہتے کہ تم تو اس کو پہلے پوچھ چکے ہو بار بار کیوں پوچھتے ہو۔ تو اب الزام حضرت عباسؓ پر آتا ہے کہ انہوں نے کسی سے کچھ اور طرح بیان کیا اور کسی سے کچھ اور طرح۔ یہ ممکن ہے کہ حضرت ابن عباسؓ کسی سے پورا واقعہ بیان کریں اور اور کسی سے ماحصل بیان کر دیں تفصیل نہ بیان کریں۔ مگر جب دو شخصوں سے مختلف وقتوں میں ایک ہی واقعہ بالتفصیل بیان کریں گے تو یقیناً اس واقع کی تفصیلات میں تفاوت نہ ہونا چاہئے۔ خصوصاً اہم تفاوت۔ جن تفاوتوں کا میں نے ذکر کیا وہ ایسے غیر اہم نہیں ہیں کہ ان کے ذکر میں چھوٹ جانے یا ان میں رد و بدل ہو جانے کا امکان سمجھا جائے اور اگر تفاوتوں پر بھی ان دونوں روایات کو واقعی حضرت ابن عباسؓ ہی کی بیان کردہ روایات مان لیا جائے تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ حضرت ابن عباسؓ کو حدیثیں پوری طرح یاد نہیں رہتی تھیں اور وہ واقعات کو اچھی

طرح ذہن میں محفوظ نہیں رکھتے تھے جب ایسے واقعات جو خود انہیں کی ذات سے تعلق رکھتے تھے وہ پوری طرح ان کے ذہن میں مستحضر نہیں رہتے تھے تو دوسروں سے متعلق باتوں کو وہ کب پوری طرح یاد رکھ سکتے ہونگے۔ اور سابق حدیث پر جو اعتراضات میں نے کئے ہیں وہ سب بھی تقریباً اس پر وارد ہو رہے اعادے کی ضرورت نہیں۔

اصل یہ ہے کہ ایلاء النبی صلی اللہ علیہ وسلم کا بہتان عجمیوں نے باندھا تھا عجمیوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عداوت تھی چونکہ دین اسلام انہی کے ذریعے دنیا میں آیا۔ وہ اگر دین اسلام کی تبلیغ نہ کرتے تو پھر مسلمانوں میں جہاد کا ولولہ ہی کیوں پیدا ہوتا۔ اور ان عجمیوں کو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے سخت عداوت تھی کہ فاتح عجم وہی تھے۔ انہیں نے تخت کسریٰ کو الٹ دیا۔ اور قاتلین حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہہ بھی عجمی مفسدین تھے ۔ ان سے خون عثمانؓ کا قصاص لینے کے لئے حضرت عائشہؓ ہی لوگوں کے اصرار سے مکے سے بصرے آئی تھیں اور جنگ جمل کا واقعہ پیش آیا ۔ اس لئے ان عجمی راویوں کو حضرت عائشہؓ سے بھی عداوت تھی ۔ اور حضرت حفصہؓ تو حضرت عمر فاروقؓ کی بیٹی ہی تھیں۔ حضرت عمرؓ کی وجہ سے ان کے ساتھ بھی عداوت پیدا ہوئی۔ حضرت ابو بکرؓ سے ان کو کوئی خاص وجہ عداوت کی نہ تھی۔ اس لئے کسی روایت میں بھی حضرت ابو بکرؓ کا نام نہیں لیا۔ مگر حضرت ابو بکرؓ کا اس سلسلے میں مطلقاً کچھ بھی ذکر نہ آنا یہی ان سب روایات کے وضعی و مکذوب ہونے کی کھلی ہوئی دلیل ہے ۔ جس کو ہر منصف مزاج مفکر سمجھ سکتا ہے بشرطیکہ روایت پرستی کا بھوت اس کے

سر پر سوار نہ ہو۔

(سورہ تحریم و ایلاء النبیؐ کے متعلق کچھ مزید گزارشات ہم افسانۂ افک کے بعد پیش کر رہے ہیں۔)

چھٹی مثال:۔

افسانۂ افک

منافقین و دشمنان قرآن نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، آپؐ کی ازواج مطہراتؓ اور صحابہؓ و صحابیاتؓ کی سیرت کو مجروح کرنے کے لئے جہاں اور بہت سی مذموم کوششیں کی ہیں انہیں میں ایک افسانۂ افک بھی ہے جسے امہات المومنینؓ کے حوالے سے آیات افک کی تفسیر میں شامل کر دیا گیا ہے۔ حالاں کہ آیات افک میں کسی بھی زوجۂ مطہرہ کا نام نہیں لیا گیا۔ نہ عام مفسرین کے بیان کردہ شان نزول کے مطابق ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کا ان آیات میں نام لیا گیا ہے۔ نہ شیعوں کے بیان کردہ شان نزول کے مطابق حضرت ماریہ قبطیہؓ کا یہاں کوئی تذکرہ ہے .... اسی طرح دوسروں کے بیان کردہ قصوں کے مطابق نہ یہاں حضرت ام سلمہؓ کا ذکر ہے نہ حضرت ام ایمنؓ کا۔ نہ حضرت فاطمہؓ کا تذکرہ ہے نہ حضرت علیؓ پر لگائے گئے زنا کے الزام کا ذکر ہے۔ جب قرآن مجید نے کسی کا نام نہیں لیا تو ان حضرات میں سے کسی کو بھی، ان کی صفائی اور برأت کے نام پر، ان آیات کا مصداق قرار دینا اور اپنی بیان کردہ اس شان نزول کو ان بزرگوں کی تعریف و منقبت قرار دینا، ہمارے نزدیک تو ملح (تعریف کے پردے میں برائی) سے کم نہیں۔ ایسا انداز سچے مداح تو جانتے بوجھتے کبھی اختیار نہیں کرتے، غلط فہمی میں یہ

کمزوری ان سے سرزد ہو جائے تو دوسری بات ہے ورنہ توجہ دلانے کے بعد بھی اپنی اس روش پر جمے رہنا مخلصوں کا شیوہ نہیں ہاں چالاک دشمن ہمیشہ بجو یلح کرنے کی کوششوں میں لگا رہتا ہے کہ یہی تو اسکا مقصد ہے۔

حضرت علامہ تمنا نے یہاں عام مفسرین کی بیان کردہ شان نزول کی روایت پر تنقید کی ہے جس کی تائید میں ہم نے حکیم نیاز احمد صاحب فاضل دیو بند۔ مولانا خالد مسعود اصلاحی اور مولانا شبیر احمد ازہر میرٹھی کی تحقیقات بھی پیش کر دی ہیں۔ اس کے بعد آیات افک کے مصداق کے طور پر پیش کی جانے والی باقی پانچ روایات (حضرت ماریہ قبطیہؓ، حضرت ام سلمہؓ، حضرت ام ایمنؓ، حضرت فاطمہؓ اور حضرت علیؓ کے متعلق) پر ہم نے مختصر تبصرہ کر دیا ہے تاکہ قارئین کرام کے سامنے تمام پہلو منقح ہو جائیں۔ اس کے بعد سورہ تحریم اور ایلاء النبیؐ کے متعلق بھی چند گزارشات پیش کر کے سورۃ کا مربوط مفہوم بیان کر دیا ہے تاکہ علامہ تمنا کے مضمون "ایلاء النبی" پڑھنے کے بعد اگر کچھ حضرات کو تشنگی محسوس ہو تو ان کی بھی تشفی ہو جائے۔

طاہر۔

افک کی تفسیری روایت

اس واقعہ مکذوبہ کے متعلق جتنی روایتیں خصوصاً آپ کو صحاح میں ملیں گی وہ سب کی سب ابن شہاب زہری ہی سے ملیں گی اور ابن شہاب زہری کا حال میں پوری تفصیل کے ساتھ ایک مضمون میں لکھ چکا ہوں وہ منافقین و کذابین کے نادانستہ ہی سہی مگر مستقل ایجنٹ بنے ہوئے تھے۔ اکثر گمراہ کن اور خبیث حدیثیں آپ کو انہیں سے مروی ملیں گی یہ روایت کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعثت سے پہلے اپنے ایک صاحبزادے کا نام "عبدالعزیٰ" رکھا تھا (**نعوذ باللہ من ذلک**) انہیں سے مروی ہے پہلی مرتبہ جمع قرآن بعہد صدیقی۔ اور ان سے نقل مصاحف بعہد عثمانی کی روایت صحاح[1] میں انہیں سے ہے۔ پھر انہیں سے یہ بھی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وفات پا گئے اور

---

[1] یعنی وہ روایت جس میں بتایا جاتا ہے کہ آنحضرت صلعم کے زمانہ میں تو قرآن مجید جمع ہی نہیں ہوا تھا۔ پہلی مرتبہ حضرت صدیق اکبرؓ نے اپنے زمانہ میں جمع کیا اور جمع صدیقی کی نقل مصاحف حضرت عثمانؓ نے اپنے زمانہ میں کرائی، یہ روایت غلط ہے ورنہ عہد صدیقی و فاروقی و عثمانی میں عہد نبوی میں جمع شدہ قرآن کریم کی نقلیں کرانے سے انکار نہیں بلکہ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف حضرت عمر فاروق اعظمؓ کے عہد خلافت ہی میں قرآن کریم کے لاکھوں نسخے نقل کئے گئے جبکہ علامہ ابن حزم نے لکھا ہے اور جسے مولانا مناظر احسن گیلانی نے بھی اپنے رسالہ "تدوین قرآن" میں نقل کیا ہے۔ اسی طرح صدیق اکبرؓ اور عثمان غنیؓ کے عہد خلافت میں بھی لاتعداد قرآنی نسخے لکھے گئے یہ تمام حضرات خصوصاً اور باقی صحابۂ کرام عموماً اپنے اپنے زمانہ میں پوری جدوجہد کے ساتھ مصاحف قرآنی کی نشر و اشاعت کرتے رہے یہی وجہ ہے کہ عہدِ عثمانی کے بہت سے قرآنی نسخے اپنی اصل شکل میں دنیا کے بہت سے کتب خانوں میں آج تک موجود ہیں۔

قرآن کسی چیز پر بھی لکھا ہوا نہ تھا۔ یعنی وہ ہڈی کھال چھال پتھر وغیرہ پر بھی نہیں۔ سورہ نجم کی تلاوت کے وقت شیطان کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز میں آواز ملا کر تلک الغرانیق العلے و ان شفا عتھن لترجیٰ پکار دینے کی روایت میں بھی ابن شہاب زہری پیش پیش ہیں۔ اور انزل القرآن علے سبعہ احرف کی روایتیں بھی صحاح میں زیادہ تر زہری صاحب سے ہی ہیں۔ اور جن گمراہ کن روایتوں میں کچھ دوسرے ان کے شریک ہو جاتے ہیں وہ عموماً کوفے یا بصرے کے انہیں جیسے لوگ ہوتے ہیں اور الا ماشاء اللہ۔ یا محمد بن اسحٰق جیسے جن کو امام مالکؒ نے دجال من الدجاجلہ فرما دیا تھا۔

غرض روایت کی حیثیت سے تو حضرت عائشہؓ کے متعلق افک کا واقعہ ناقابل اعتبار لوگوں سے مروی ہے ہی روایت کے اعتبار سے بھی روایت پرستی سے الگ ہو کر اور اجماع مورخین و اہل سیرو مفسرین و محدثین جو انہیں مکذوبہ روایات کی بنیاد پر روایت پرستی کے ماتحت ایک ہزار برس سے چلا آ رہا ہے اس سے مرعوب ہوئے بغیر محض دیانت و انصاف سے اگر سر سری نظر سے بھی دیکھئے تو یہ واقعہ صاف طور سے منافقین کا گھڑا ہوا معلوم ہونے لگے گا۔ اس افتراء کی حقیقت کی پہلے روایت کی عبارت میں جو کذب بانی کی علامتیں خود موجود ہیں ان سے سمجھئے۔ دوسرے نفس واقعہ پر غور کیجئے۔

صحاح کی روایت | صحاح میں جو روایت ابن شہاب زہری ہی سے مروی ہے میں اسی کو پیش کرتا ہوں پڑھئے اور دیانۃً غور کیجئے۔

سب سے پہلی بات تو یہی سوچنے کی ہے کہ صحیح بخاری کتاب المغازی جلد دوم صفحہ ۵۹۳ میں پہلے باب غزوۃ بنی مصطلق من خزاعہ

وھی غزوۃ المریسیع ہے اور اس کے متعلق لکھا ہے قال ابن اسحق و ذالک سنہ ست و قال موسیٰ بن عقبہ سنہ اربع - و قال نعمان بن راشد عن الزھری کان حدیث الا فک فی غزوہ المریسیع - یعنی غزوہ بنی مصطلق جس کو غزوہ مریسیع بھی کہتے ہیں جو بنی خزاعہ سے ہوا تھا امام بخاری لکھتے ہیں کہ بقول ابن اسحٰق ۶ ھ میں واقع ہوا تھا، اور بقول موسیٰ بن عقبہ ۴ ھ میں مگر شارحین بخاری لکھتے ہیں کہ اصح الکتب بعد کتاب اللہ میں امام بخاری سے سبقت قلم کی وجہ سے چوک ہوگئی ہے موسیٰ بن عقبہ کی کتاب میں ۴ ھ نہیں بلکہ ۵ ھ مرقوم ہے مگر اس کو امام بخاری کی چوک کس طرح کہا جاسکتا ہے - اس لئے کہ خود ابن حجر فتح الباری میں لکھتے ہیں اسی حدیث افک کی شرح میں اسی موقع پر کہ امام بخاری نے کتاب الجہاد میں بھی لکھا ہے کہ عن ابن عمر انہ غزامع النبی صلے اللہ علیہ وسلم بنی مصطلق فی شعبان ۴ ھ اربع و لم یؤذن لہ فی القتال لا نہ اذن لہ فی الخندق- اس سے صاف ظاہر ہے کہ امام بخاری کی وہ سبقت قلم یا چوک نہیں ہے بلکہ ان کے نزدیک غزوہ بنی مصطلق ۴ ھ ہی میں ہوا تھا - اور امام بخاری کے پاس موسیٰ بن عقبہ کی کتاب المغازی جو تھی اس میں بھی ۴ ھ میں لکھا ہوا تھا- اسی لئے امام بخاری نے اس کے حوالے کا ذکر کر دیا- بعد والوں کو واقعات کی کڑیاں جوڑنے میں دشواری محسوس ہوئی تو موسیٰ بن عقبہ کی کتاب میں ۴ کو ۵ ھ بنا دیا - اور ابن اسحٰق جو موسیٰ بن عقبہ سے متاخر ہیں انہوں نے ۶ لکھدیا مگر تعجب ہے کہ غزوہ خندق کو بھی امام بخاری ماہ شوال ۴ ہی میں لکھتے ہیں- اگرچہ ابن حجر یہاں کچھ توجیہات بیان کرکے صحیح تاریخ غزوہ خندق کی ۵ کے شوال میں لکھتے ہیں-

غرض غزوہ خندق جس کو غزوہ احزاب بھی کہتے ہیں اور غزوہ بنی

مصطلق کے درمیان صرف ایک ہی مہینے یعنی رمضان کا فاصلہ رہتا ہے اگر شعبان کے کچھ دن اور شوال کے بھی کچھ دن ملا لیجئے تو تقریباً ڈیڑھ ماہ کا فاصلہ سمجھئے ڈیڑھ ماہ قبل حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اذن قتال کے قابل نہ تھے اور ڈیڑھ ماہ بعد اذن قتال کے قابل تھے؟ آخر کون سی وجہ ہوئی کہ ان کو غزوہ بنی مصطلق میں اذن قتال ہنیں دیا گیا؟

بہر حال سورہ احزاب کے مضامین بتا رہے ہیں کہ اس سورۃ کا نزول غزوہ احزاب کے بعد ہوا ہے۔ یعنی ۵ ھ کے اواخر یا ۶ ھ کے اوائل میں اسی لئے واقدی نے حکم حجاب کے نزول کے متعلق ذیقعدہ ۵ ھ لکھا ہے جس کو نقل کرتے ہوئے فتح الباری جلد ۶ صفحہ ۵۹ میں حدیث افک کی شرح کے سلسلے میں ابن حجر نے لکھا ہے۔ کما قال و اقدی ان حکم الحجاب کان و قع فی ذیقعدہ ۵ ھ خمس فمر دو ر۔ اس لئے کہ حدیث افک سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ واقعہ افک کا وقوع ۴ یا ۵ ھ کے شوال میں ہوا تھا اور اس سے پہلے حکم حجاب نازل ہو چکا تھا۔ غریب واقدی نے تو واقعہ افک کا خیال کر کے حکم حجاب کے نزول کی تاریخ متعین ہنیں کی تھی۔ اس نے تو بس اتنا ہی دیکھا کہ سورہ احزاب میں حکم حجاب کی آیت ہے اور سورہ احزاب کا نزول غزوہ احزاب کے بعد ہے۔ اس لئے یہ دیکھکر کہ غزوہ احزاب شعبان ۵ ھ میں ہوا تھا۔ تو اس کے بعد دو ماہ درمیان دے کر ذیقعدہ ۵ ھ میں حکم حجاب کے نزول کی تاریخ مقرر کر دینی چاہیئے۔ دوسرے لوگوں نے حدیث افک میں حکم حجاب کا ذکر دیکھ کر اور یہ دیکھ کر کہ واقعہ افک کے متعلق کہا جاتا ہے کہ غزوہ بنی مصطلق کے بعد واپسی میں ہوا۔ اور غزوہ بنی مصطلق ہوا ہے شوال ۵ یا ۴ میں حکم حجاب کو اوپر کھینچ کر لے جانا چاہیئے۔ اس لئے آیت حکم حجاب کے نزول کی تاریخ ان لوگوں نے ۳ ھ لکھدی۔ انتہٰی بلفظہ ۱۰۔ ۲۔ ۴

قول بھی اور دوسروں کا قول بھی۔

لیکن یہ بھی تعجب خیزی میں کم نہیں کہ امام بخاری خود لکھتے ہیں باب غزوہ بنی المصطلق میں کہ نعمان بنی راشد نے ابن شہاب زہری سے روایت کرتے ہوئے کہا کہ حدیث افک کا وقوع مریسیع یعنی غزوہ بنی مصطلق کے موقع پر ہوا تھا۔

غزوہ انمار | مگر وہ حدیث افک کا ذکر اس باب میں نہیں کرتے ہیں۔ بلکہ غزوہ بنی مصطلق سے متعلق حدیثیں نقل کرکے ایک دوسرے غزوہ یعنی غزوہ انمار کا نیا باب قائم کرتے ہیں ۔ اور اس باب میں صرف ایک حدیث نقل کرکے پھر ایک نیا باب قائم کرتے ہوئے حدیث افک کا ذکر کرتے ہیں جس سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ واقعہ افک کی نسبت امام بخاری کے نزدیک غزوہ بنی مصطلق کی طرف نہیں بلکہ غزوہ انمار کی طرف صحیح ہے۔ ورنہ باب غزوہ بنی مصطلق کے بعد باب غزوہ انمار لکھنے کے بعد باب حدیث الافک لکھنے کے کیا معنی بے شک روایتوں میں جیسا مذکور ہے واقعہ افک بنی مصطلق کے غزوے کے وقت کا واقعہ نہیں ہے ۔ بلکہ واپسی کے وقت اثنائے راہ کا واقعہ بتایا جاتا ہے ۔ اور غزوہ انمار کو تو وہ غزوہ بنی مصطلق اور واقعہ افک کے درمیان کا واقعہ نہیں بتایا جاسکتا ہے۔ اور حافظ ابن حجر نے باب غزوہ بنی مصطلق اور باب حدیث الافک کے درمیان سے " باب غزوہ انمار" کو بطور جملہ معترضہ دیکھ کر اپنی شرح میں اس کو درمیان سے نکال ہی پھینکا۔ اور شرح میں اس کا مطلقاً کچھ ذکر ہی نہ کیا تاکہ کم سے کم شرح پڑھنے والا تو باب غزوہ بنی مصطلق کے بعد بلا فصل و بلا جملہ معترضہ فوراً باب حدیث الافک ہی پڑھے۔

غزوہ بنی مصطلق کے متعلق امام بخاری نے ابن اسحاق کا قول لکھا

ہے کہ ۶ ھ میں ہوا تھا ۔ اور موسیٰ بن عقبہ کا قول نقل کیا ہے کہ ۴ ھ میں اب ابن اسحاق متوفی ۱۵۱ ھ اور موسیٰ بن عقبہ متوفی ۱۴۱ ھ میں سے کون زیادہ قابل اعتبار ہے اس کو معلوم کر لینا مناسب ہے ۔ ابن اسحاق کو امام مالک نے دجال من الدجاجلہ فرمایا تھا سلیمان التیمی یحییٰ بن سعید القطان اور وھیب بن خالد تین تین ائمہ حدیث و رجال نے ان کو کذاب کہا ۔ ائمہ احادیث ورجال کی اکثریت نے ان کو " لیس بحجہ " فرمایا ۔ یہ مدنی تھے مگر شروع ہی سے مدینے سے باہر نکل گئے تھے کوفہ ، جزیرہ ، میں رکے اور بغداد کی ہوائیں کھاتے رہے اور آخیر میں بغداد میں جو پہونچے تو بغداد ہی کے ہو رہے اور وہیں وفات پائی ۔ یہ اہل مدینہ سے شاذ و نادر ہی کچھ روایت کرتے ہیں زیادہ تر باہر کے لوگوں سے روایت کیا کرتے ہیں اہل مدینہ بھی ان سے روایت نہیں کرتے لے دے کر ابراہیم بن سعد ہی کا نام ایک مدنی کی حیثیت سے اس سلسلے میں ان کے لئے پیش کیا جاتا ہے پھر مدلس بھی تھے ۔

بخلاف موسیٰ بن عقبہ کے کہ وہ مدینے میں اعلم الناس بالمغازی کہے جاتے تھے اور ائمہ احادیث و رجال سب ان کو ثقہ اور حجت لکھتے ہیں ۔ اور اکھڑ قسم کے سخت آدمی تھے ۔ ابن شہاب زہری سے روایت کرتے تھے مگر ان کو ڈانٹ بھی دیا کرتے تھے کتاب المعتصر من المختصر ۔ کتاب الحج ب صفحہ ۱۲۵ میں منقول ہے کہ کان الزھری یخلط کلامه بالحدیث فقال موسیٰ بن عقبه افصل کلام رسول الله صلی الله علیه وسلم من کلامک یعنی زہری کا دستور تھا کہ اپنی بات بھی حدیث میں ملا دیا کرتے تھے ۔ تو موسیٰ بن عقبہ نے ان سے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کو اپنے کلام سے علیحدہ رکھو ۔ اگرچہ دونوں ہی موالی یں سے یعنی آزاد کردہ غلاموں میں سے تھے ۔ اور موسیٰ

بن عقبہ بھی مدینہ چھوڑ کے عراق میں آ لبے تھے۔ مگر ان دونوں جامعین مغازی میں موازنہ کیجئے تو موسےٰ بن عقبہ کا پلہ و ثاقت اور حجیت میں محمد بن اسحٰق سے بہت زیادہ بھاری رہتا ہے ۔ لیکن ع ۔ قبول خاطر لطف سخن خدا داداست۔ ابن اسحٰق کا طوطی بولتا رہا اور ابن جریر طبری کی وجہ سے آج تک ابن اسحٰق کا نام زیادہ تر لوگوں کی زبانوں پر رہتا ہے۔

نفس روایت | اب میں نفس روایت نقل کرکے اس کا ترجمہ پیش کرتا ہوں اور پھر اس پر بحث کرونگا۔ وما توفیقی الله بالله العلی العظیم - حد ثنا عبدالعزیز بن عبدالله - حد ثنا ابراہیم بن سعد عن صالح عن ابن شهاب قال حد ثنا عروة بن الذبیرو سعید بن المسیب وعلقمة بن وقاص و عبید الله بن عبد الله بن عتبه بن مسعود عن عائشه زوج النبی صلی الله علیه وسلم حمنین قال لها اهل الا فک سا قالوا و کلهم حدثوا طانعة من حدیثها و بعضهم کان ادعی لحدیثها من بعض و اثبت له اقتصا صا- و قد وعیت عن کل رجل منهم الحدیث الذی عن عائشہؓ و بعض حدیثهمه یصدق بعضا و ان کان بعضهم ادحی له من بعض -

ابن شہاب عروۃ بن الزبیر، سعید بن المسیب وعلقمہ بن وقاص اور عبید اللہ بن عبداللہ بن عتبہ بن مسعود سے روایت کرتے ہیں مگر یہ چاروں پوری حدیث میں متفق اللفظ نہیں ہیں بلکہ ان میں سے ہر ایک نے اس حدیث کا ایک حصہ بیان کیا۔ اور ان میں سے بعض کو بعض سے زیادہ ان کا وہ بیان کردہ حصہ یاد تھا اور وہ دوسرے زیادہ درست طریقے سے بیان کرتے تھے ۔ ابن شہاب کہتے ہیں کہ میں نے ان میں سے ہر ایک سے اس حدیث کو محفوظ کر لیا جس کو اس نے حضرت عائشہؓ

سے روایت کیا ۔ اور ان میں سے ہر ایک کا بیان کردہ حصہ حدیث دوسرے کے بیان کردہ حصے کی تصدیق کرتا تھا۔ اور دوسرے سے زیادہ محفوظ تھا ۔ غرض پوری حدیث جو ابن شہاب سے مروی ہے اس طرح پوری حدیث کسی نے بھی ان سے روایت نہیں کی بلکہ مذکورہ بالا چاروں راویوں نے اس حدیث کے بعض بعض حصے جو ان کو یاد تھے یا جتنا بھی ان سے بقول ان کے حضرت عائشہؓ نے فرمایا تھا اسی قدر انہوں نے ابن شہاب سے کہہ ۔ ابن شہاب نے سب کے بیان کردہ حصص حدیث کو اپنے طور پر واقعے کی ترتیب قائم کرکے پورے واقعے کا ایک ڈھانچہ قائم کرکے ایک مکمل حدیث تالیف کی اور اس کو وہ روایت کرنے لگے۔ اس لئے یہ پوری حدیث خود ابن شہاب کی تالیف کردہ ہے۔

اوپر مذکور ہوچکا ہے کہ ابن شہاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث میں اپنا کلام بھی ملا دیا کرتے تھے جس پر موسیٰ بن عقبہ نے ان کو ڈانٹا تھا کہ تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سے اپنا کلام علیحدہ کرکے بیان کرو ۔ اس حدیث میں جس کے کچھ حصے کسی سے ، کچھ کسی سے انہوں نے سنا اور بطور خود ان منتشر ٹکڑوں کو ایک افسانے کی شکل میں مرتب کرکے حضرت عائشہؓ کی طرف منسوب کرکے اس کو روایت کرتے رہے اللہ جانے اس افسانے کی کڑیوں کو ملانے کے لئے اور ان میں افسانوی رنگ بھرنے میں کہاں تک ان کے اپنے کلام کا حصہ ہے اور کہاں تک ان کے ان چاروں شیوخ میں سے کس کس کا حصہ ہے اور کہاں تک کی نسبت حضرت عائشہؓ کی طرف صحیح کہی جاسکتی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

اور عروۃ بن الزبیر سے سماع زہری ثابت بھی نہیں ہے ۔ اگرچہ محدثین نے اجماع کر لیا ہے کہ ضرور سنا ہوگا۔ مگر یہاں تو عروۃ ہی نہیں

تین اور سے بھی ابن شہاب روایت کر رہے ہیں اس لئے عروۃ سے سماع کا ثابت نہ ہونا اس روایت کے ضعف کی دلیل نہیں۔ اس روایت کے ضعف ہی کی نہیں بلکہ موضوع و مکذوب ہونے کی شہادت خود اسی روایت کے الفاظ اور اس کے مضامین سے مل رہی ہے۔ جو آگے بیان ہوگی۔

قالوا قالت عائشه کان رسول الله صلی الله علیه و سلم اذا آراد سفرا اقوع بین ازواجه فایهن خرج سهما خرج بها رسول الله صلی الله علیه و سلم معه قالت عائشه فاقرع بیتا فی غزوه غزاها فخرج فیها سهمی فخرجت مع رسول الله صلی الله علیه و سلم بعدما انزل الحجاب فکنت احمل فی هودجی و انزل فیه فسرنا حتی اذا نرغ رسول الله صلی الله علیه و سلم من غزوة تلکه و تفل و بونا من المدینه قافلین آدن لیاء بالرحیل فمشیت حتی جاوزت الجیش فلما قضیت شانی اقبلت الی رحلی فلمست صدری فاذا عقد لی من جزع ظفار تدا نقطع فرجعت فالتمست عقدی فجسنی ابتفاده قالت و اقبل الرحط الذین کانوا یرحلونی فاحتملوا هودجی فرحلوه علی بعیری الذی کنت ارکب علیه وهم یحسبون انی فیه و کان النساء اذ ذاک خفا فالم یهبلن و لم یغشهن اللحم انما یا کلن العلقه من الطعام فلم بستنکر القوم خفه الهودج حسین رفعوه و حملوه و کنت جاریه حدیثه السن فبعثوا الجمل فساروا و وجدت عقدی بعد ما استمر الجیش و جئت منازلهم

ولیس بہا منھم داع ولا مجیب فتیممت منزلی الذی
کنت بہ و ظننت انہم سیفقدونی فیرجعون الی فیلنا
انا جالسہ فی منزلی غلبتنی عینی فنمت و کان صفوان
ابن المعطل السلمی ثم الذکرانی من و راء الجیش
فاصبح عند منزلی فرائی سوا دانسان نائم فعرفنی حین
رآنی و کان رآنی قبل الحجاب فا ستیقظت باستر جاعہ
حین عرفنی فخمرت وجھی بجلبابی و و اللہ ماتکلمنا
بکلمہ ولا سمعت منہ کلمہ غیر استر جاعہ و ھوی
حتی اناخ راحلہ فوطی علی یدھا فقمت الیہا فرکبتہا
فانطلق یقود بی الراحلہ حتی اتینا الجیش موغوین
فی نحر الظھیرہ و ھم نزول قالت افھلک من ھلک
وکان الذی تولی کبر الا فک عبداللہ بن ابی بن
سلول -

اب اس روایت کا ترجمہ مرزا حیرت مرحوم کا لکھا ہوا نور محمد صاحب مالک کارخانہ تجارت کتب آرام باغ کراچی کا شائع کردہ ملاحظہ فرمائیے۔
ابن شہاب اپنے ان چاروں شیوخ عروہ بن الزبیر سعید بن المسیب عقبہ بن وقاص اور عبید اللہ بن عبداللہ بن عتبہ بن مسعود کے بارے میں کہتے ہیں۔

روایت کا ترجمہ | " ان چاروں نے کہا، حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں،
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب سفر کا ارادہ فرماتے تھے تو اپنی بیبیوں میں قرعہ ڈالتے تھے جس کا نام قرعہ میں نکلتا تھا اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں ایک لڑائی

میں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرعہ ڈالا اس میں میرا نام نکل آیا۔ میں آپؐ کے ساتھ نکلی۔ اور یہ موقع آیت پردہ کے اترنے کے بعد کا ہے مجھے ہودج میں بٹھا کر اتارتے چڑھاتے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لڑائی سے فارغ ہوئے اور واپس آئے اور ہم مدینہ کے قریب تھے رات کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چلنے کا حکم دیا۔ جب چلنے کی خبر ہوئی میں پاخانہ پیشاب کے واسطے روانہ ہوئی اور لشکر سے دور نکل گئی۔ جب میں فارغ ہوئی اپنی سواری کے پاس آئی میں نے اپنے سینے پر ہاتھ ڈالا تو کیا دیکھتی ہوں کہ میرا ہار جو خرف یمنی کا تھا ٹوٹ گیا۔ (اور گر پڑا) میں واپس گئی اور اپنا ہار ڈھونڈنے لگی۔ اس کے ڈھونڈنے میں مجھے دیر ہوگئی، جو لوگ مجھے سوار کراتے تھے انہوں نے ہودج اٹھا کر اونٹ پر رکھدیا۔ اور ان کا یہ خیال تھا کہ میں ہودج میں بیٹھی ہوں۔ اس وقت کی عورتیں ہلکی پھلکی ہوتی تھیں اور ان پر گوشت بہت کم ہوتا تھا۔ کیونکہ کھانا بہت کم کھاتی تھیں۔ اسی واسطے انہوں نے ہودج اٹھاتے وقت ہلکا نہ جانا اور اسے اونٹ پر رکھدیا۔ اس وقت میں بہت کم سن تھی۔ وہ سب اونٹ کو لے کر چل دیئے میں نے اپنا ہار لشکر روانہ ہونے کے بعد پایا میں لشکر کی جگہ پر آئی تو وہاں کوئی جواب و سوال کرنے والا نہ تھا میں اپنی جگہ پر اس خیال سے بیٹھ گئی کہ جب سب کو میرا گم ہونا معلوم ہوگا تو مجھے ڈھونڈنے ضرور آئیں گے۔ اسی طرح میں اپنی جگہ پر بیٹھی تھی مجھے نیند آنے لگی اور میں سو گئی۔ صفوان بن معطل سلمی جو بعد کو زکوانی مشہور ہوگیا تھا، لشکر کے پیچھے رہتا تھا (تاکہ گری پڑی چیز کو اٹھاتا لائے) وہ صبح کو میرے قریب پہنچا، اور سوتے آدمی کا سایہ دیکھا مجھے دیکھتے ہی پہچان لیا۔ کیونکہ اس نے پردے سے پہلے مجھے دیکھا تھا۔ اس نے انا للہ و انا الیہ راجعون پڑھا۔ میں اس کے پڑھنے سے بیدار ہوگئی اور اپنی

چادر سے اپنا منہ چھپا لیا بخدا ہم نے کوئی بات نہ کی اور میں نے اس سے بجز استرجاع کے کوئی اور بات نہ سنی۔ صفوان نے اتر کر اپنی سواری کو بیٹھا کر اس کے ہاتھ پاؤں باندھ دیئے۔ میں اٹھ کر اس پر سوار ہوگئی صفوان اونٹ کو کھینچتا چلا۔ اور ہم شدت کی گرمی میں بوقت دوپہر لشکر میں پہنچے۔ وہ سب ٹھہرے ہوئے تھے۔ ان میں سے جسے ہلاک ہونا تھا (تہمت لگا کر) ہلاک ہوا اور جو شخص بڑا مرتکب اس بہتان کا ہے وہ عبداللہ بن ابی بن سلول ہے"

مرزا صاحب مرحوم کے ترجمے میں بعض خامیاں ہیں جو اہل علم سے پوشیدہ نہیں رہ سکتیں۔ اور چونکہ وہ کچھ ایسی اہم نہیں جن سے روایت کے نفس مفہوم پر کوئی اثر پڑے اس لئے ان خامیوں کی نشاندہی اور ان کی تصحیح میں کیوں وقت ضائع کیا جائے عام لوگوں کو حدیث کے نفس مفہوم سے مطلب ہے جو اس ترجمے سے بخوبی سمجھا جاسکتا ہے۔ نا مناسب طرز بیان سے صرف نظر کر کے نفس مضمون کو پیش نظر رکھنا چاہیئے۔ مزید تشفی کے لئے غیر عربی دان حضرات کے سامنے علامہ سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ نے جو "سیرت عائشہؓ" میں اس روایت کا خلاصہ مفہوم لکھدیا ہے اس کو نقل کر دیتا ہوں تاکہ ہر شخص روایت کے صحیح مفہوم کو پوری طرح سمجھ لے، علامہ ممدوح "سیرت عائشہؓ" از صفحہ ۷۳ تا صفحہ ۷۶ میں تحریر فرماتے ہیں۔

علامہ سلیمان ندوی کی تشریح | نجد کے قریب مریسیع بنی مصطلق کا ایک چشمہ تھا۔ شعبان ۵ ھ میں مسلمان اسی چشمے کے پاس ان سے معرکہ آرا ہوئے۔ چونکہ یہ معلوم تھا کہ یہاں کوئی خونریز جنگ نہیں ہوگی۔ اس لئے منافقوں کی ایک بہت بڑی تعداد فوج میں شریک ہوگئی تھی۔ ابن

سعد کی روایت ہے و خرج معه بشر کثیر من المنافقین لمه یخر جوا فی غزوه قط مثلها- اس سفر میں منافقین کی بہت بڑی تعداد شریک تھی جو کسی اور غزوے میں ہنیں ہوئی- اوپر گذر چکا ہے - کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی سفر میں جاتے تھے تو ازواج مطہرات میں سے جن کے نام پر قرعہ پڑتا وہ معیت کے شرف سے ممتاز ہوتیں اسی طریقے سے اس سفر میں حضرت عائشہؓ ہمرکابی میں تھیں- چلتے وقت اپنی بہن اسماءؓ سے ایک ہار عاریہ پہننے کو مانگ لیا تھا-[۵۱] وہ ان کے گلے میں تھا- ہار کی لڑیاں اتنی کمزور تھیں کہ ٹوٹ ٹوٹ جاتی تھیں اس وقت حضرت عائشہؓ کی عمر چودہ برس[۵۲] کی تھی- یہ عورت[۵۳] کا وہ زمانہ ہے جس میں اس کے نزدیک معمولی ساز یور بھی گراں قیمت سامان ہے- جس کے شوق میں ہر زحمت گوارا کی جا سکتی ہے سفر میں حضرت عائشہؓ اپنے محمل پر سوار ہوتیں، ساربان محمل اٹھا کر اونٹ پر رکھدیتے تھے- اور چل کھڑے ہوتے تھے - اس وقت کم سنی اور اچھی غذا نہ ملنے کے باعث اسقدر دبلی پتلی اور ہلکی پھلکی تھیں کہ محمل اٹھانے میں ساربانوں کو مطلق محسوس ہنیں ہوتا تھا کہ اس میں کوئی سوار بھی ہے یا ہنیں-

---

۵۱ شاید کسی تقریب کی شرکت کے لیے شادی بیاہ میں جا رہی تھیں کہ اپنے پاس نہیں ہے تو بہن ہی سے منگنی کا زیور لیکر جانے کا خیال پیدا ہوا۔

۵۲ ۵ھ میں حضرت عائشہؓ کی عمر ۱۴ برس اسی حساب سے قرار دی گئی ہے کہ حضرت عائشہؓ کی ولادت ۵ بعثت ہوئی تھی اور ان کا نکاح چھ برس کی عمر میں ہوا تھا جو یقیناً غلط ہے۔ غزوہ مریسیع اگر ۵ھ میں ہوا تھا تو اس وقت حضرت عائشہؓ کی عمر اکیس[۲۱] بائیس[۲۲] برس تھی۔

۵۳ عام عورتوں پر ان کو قیاس کرنا جن کے متعلق فرمایا گیا "لستن کاحد من النساء" کس قدر خلاف تہذیب بلکہ گستاخی ہے۔ (القرآن ۳۳ : ۳۲)

ایک جگہ رات کو قافلے نے پڑاؤ کیا پچھلے پہر وہ پھر روانگی کو تیار تھا کہ حضرت عائشہؓ قضائے حاجت کے لئے قافلے سے ذرا دور نکل کر باہر آڑ میں چلی گئیں فارغ ہو کر جب لوٹیں تو اتفاق سے گلے پر ہاتھ پڑگیا۔ دیکھا تو ہار نہ تھا۔ ایک تو کم سنی اور پھر مانگے کی چیز گھبرا کر وہیں ڈھونڈنے لگیں سفر کی ناتجربہ کاری کی بنا پر ان کو یقین تھا کہ قافلہ کی روانگی سے پہلے ہی ہار ڈھونڈ کر واپس آجاؤں گی۔ اس بنا پر نہ کسی کو واقعے کی اطلاع، اور نہ آدمیوں کو اپنے انتظار کا حکم دے کر گئیں۔ سار بان حسب دستور محمل کو اونٹ پر رکھ کر قافلہ کے ساتھ روانہ ہو گئے۔ تھوڑی دیر کی تلاش میں ہار مل گیا۔ ادھر قافلہ چل چکا تھا پڑاؤ پر آئیں تو یہاں سناٹا تھا۔ مجبوراً چادر اوڑھ کر پڑ رہیں کہ جب لوگ محمل میں نہ پائیں گے تو خود لینے آئیں گے۔ صفوان بن معطل ایک صحابی تھے، جو ساتھ (ریر گارڈ) یعنی چھوٹے چھاٹے سپاہیوں، اور فوج کی گری پڑی چیزوں کے انتظام کے لئے پیچھے پیچھے رہتے تھے۔ صبح کو جب وہ پڑاؤ پر آئے تو دور سے سوار نظر آیا۔ حکم حجاب سے پہلے جو اسی سال نازل ہو چکا تھا۔ انہوں نے حضرت عائشہؓ کو دیکھا تھا۔ دیکھتے ہی پہچان لیا۔ پاس آکر انا للہ و انا الیہ راجعون پڑھا آواز سن کر حضرت عائشہؓ سونے سے چونک پڑیں۔ صفوان نے اپنا اونٹ بٹھایا اور ان کو سوار کرکے اگلی منزل کا راستہ لیا۔ قافلہ نے دوپہر کے وقت پڑاؤ کیا ہی تھا کہ محمل سامنے[1] سے نظر آیا۔ صفوان کے ہاتھ میں اونٹ کی مہار تھی اور حضرت عائشہؓ محمل میں سوار تھیں۔ یہ نہایت معمولی واقعہ تھا اور اکثر سفر میں پیش آتا ہے۔ آج ریل کے زمانے میں

---

[1] معلوم نہیں صفوان کے اونٹ پر محمل کہاں سے آگیا تھا ان کے اونٹ پر تو خالی کھلا ہوا کجاوا ہو گا۔

بھی اس قسم کے واقعات کثرت سے پیش آتے ہیں۔

میں بارہا لکھ چکا ہوں کہ جھوٹی حدیثیں چاہے وہ جسقدر کثرت طرق سے روایت کی گئی ہوں، دنوں تک ان کا چرچا کیا گیا ہو یہاں تک کہ محدثین و مجتہدین و فقہاء و مؤرخین سب نے مل کر متفقہ طور سے ان کے متواتر ہونے کا بھی خوب زور زور سے نقارہ بجایا ہو۔ مگر یہ ناممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے کذب و افتراء کے راز کو فاش کرنے کا بھی ان کے ساتھ کوئی نہ کوئی واضح و روشن سامان نہ کر دیا ہو۔ یا تو وہ حدیثیں نص قرآنی کی صراحتاً مخالف ہونگی اور کوئی نہ کوئی آیت قرآنی ان حدیثوں کی ببانگ دھل تکذیب کر رہی ہوگی۔ یا ان کے ہر طریق روایت میں کوئی نہ کوئی وضاع و کذاب ضرور ہوگا یا نفس حدیث ہی کی عبارت میں ایسی ایسی واضح کمزوریاں ہونگی جن کی وجہ سے وہ حدیث خود اپنے مکذوب و مفتریٰ ہونے کی بآواز بلند شہادت دیگی۔

وضع روایت کا زمانہ اس روایت افک کا بہتان جنگ جمل کے بعد قاتلین حضرت ذوالنورین رضی اللہ عنہ اور ان کے ہم مذہبوں نے کوفہ و بصرہ وغیرہ مقامات میں پہلی ہی صدی کے نصف اول ہی کے بعد سے یعنی ۵۰ یا ۶۰ھ ہی سے باندھنا اور مشہور کرنا شروع کیا تھا اور اس کے لئے اپنی ٹکسالوں میں حدیثیں بنا بنا کر مشہور کرنے لگے۔ ابن شہاب زہری تو وضاعین حدیث کے دانستہ یا نادانستہ مستقل ایجنٹ کی حیثیت میں تھے ہی ان کے ذریعے اپنی من گھڑت بہتانی حدیثوں کو جامعین احادیث تک پہنچانا شروع کر دیا۔ اور یہ افترائی بہتانی حدیثیں پہلی ہی صدی میں جامعین احادیث اور ابن جریر و ابن اسحاق جیسے کذاب

مؤرخین کے اپنی کتابوں میں درج کر دینے کے باعث چاہے اس وقت کے عامۃ المسلمین میں یہ روایتیں مشہور ہوگئی ہوں یا نہ ہوگئی ہوں ۔ مگر کتابوں میں داخل ہوگئیں اور بعد والوں کے لئے ذریعۂ علم بھی کتابیں رہ گئیں ۔ مفسرین میں پہلے مفسر وہی ابن جریر طبری شیعی تھے جو مؤرخ بھی تھے اس لئے انہوں نے اپنی تاریخ کی طرح اپنی تفسیر میں بھی ان افترائی حدیثوں کو بھرا تو پھر بعد والے مفسرین کس طرح ان روایتوں کو نہ لکھتے۔

چالاک اور ہوشیار وضاعین نے روایتیں ایسی ایسی بنائیں جن سے یہ ثابت ہوا کہ واقعہ محض اتفاقی اور بالکل معمولی سا تھا عہد نبویؐ کے منافقین نے اس میں رنگ آمیزی کرکے حضرت ام المومنین صدیقہؓ کو بدنام کرنے کی کوشش کی تھی کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت صدیقہؓ کی برأت کی آیت اتر گئی اور تمام مسلمانوں کو اطمینان ہوگیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی مطمئن ہوگئے اور حضرت عائشہؓ صدیقہؓ کے لئے یہ موجب فخر ومباہات ہوا کہ ان کی برأت اللہ تعالیٰ کی طرف سے اتری۔ لیکن اگر یہ واقعہ درحقیقت سچا تھا تو اس وقت کے منافقین جو نہ آنحضرتؐ کو رسول اللہ سمجھتے تھے نہ قرآنی آیات کو منزل من اللہ مانتے تھے وہ کس طرح ان آیات سے مطمئن ہوسکتے تھے یا آج غیر مسلمین یا بعض ملحد قسم کے جو اپنے کو مسلمان کہنے والے ہیں ، جو قرآن مجید کو وحی منزل من اللہ نہیں مانتے بلکہ نعوذ باللہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصنیف سمجھتے ہیں وہ ان آیات سے جن سے حضرت صدیقہؓ کی برأت بتائی جاتی ہے کس طرح مطمئن ہوسکتے ہیں؟ ان کا منشا یہ تھا کہ دشمنوں اور غیر مسلموں کے لئے ایک موقع حرف گیری کا ہمیشہ کے لئے رہ جائے

ان خبیث النفس منافقین کے منشاء کو بیچارے روایت پرست جامعین احادیث کس طرح سمجھ سکتے تھے جبکہ وہ ان کے ریاکارانہ زہد و ورع کے دام میں گرفتار تھے اور ان کو ثقہ و حجت سمجھتے تھے۔

تو اب اس روایت افک کے مستقل افک (جھوٹ) ہونے کی کھلی شہادت ایک نہیں دس دس شہادتیں جو خود اسی روایت کی نفس عبارت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے اس کے گھڑنے والوں ہی سے رکھوا دیں ہیں ان کو ملاحظہ فرمایئے اور قدرت الٰہیہ و اعجاز بنویہؐ و کرامت حضرت صدیقہؓ پر ایمان رکھتے ہیں تو اپنے ایمان کو قوی سے قوی تر بنایئے۔ اور جن کے پاس ایمان کی دولت نہ ہو وہ اگر انصاف و دیانت کسی حد تک بھی رکھتے ہیں تو ان کو ان واضح شہادتوں کے بعد تو ضرور ایمان لے آنا چاہیئے۔

شہادات عشرہ

(۱) حضرت عائشہؓ کی پوری زندگی کا یہ اہم ترین واقعہ بتایا جاتا ہے اور واقعہ بھی اتنا اہم کہ حضرت عائشہؓ کے پورے خاندان میں بلکہ قریش کے پورے قبیلے میں کبھی کسی کے ساتھ نہ ہوا ہوگا۔ پھر اہل بیت نبویؐ میں سے آپؐ کی محبوب ترین اہل بیت کے ساتھ کا واقعہ۔ اور جن کے ساتھ اس واقعہ کا ہونا بیان کیا جاتا ہے کہ اس کی روایت خود انہیں کی زبانی کی جا رہی ہے اور وہ اپنا افسوس ناک واقعہ خود بیان فرما رہی ہیں ایک شخص سے نہیں بلکہ چار چار شخصوں سے مگر ان کو یاد نہیں ہے کہ وہ واقعہ کس غزوے میں ان کے ساتھ ہوا تھا۔ کسی کے ساتھ کوئی اہم واقعہ ہو جاتا ہے تو اس کو اس واقع کے وقوع کا دن تاریخ مہینہ سال

سب یاد رہتا ہے۔ مگر حضرت عائشہؓ کو یہ بھی یاد نہ تھا کہ وہ کون سا غزوہ تھا جس میں یہ واقعہ ان کے ساتھ ہوا تھا چار راویوں میں سے کسی سے بھی انہوں نے اس غزوے کا نام نہیں بیان کیا کسقدر خلاف توقع بات ہے۔ کہ وہ فرماتی ہیں فی غزوہ غذاھا" ایک غزوے میں جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نکلے تھے" ہر راوی یہ بیان کرتا ہے۔ اگر یہ واقعہ سچا ہوتا اور واقعی حضرت عائشہؓ اس واقع کو کسی سے بھی بیان فرماتیں تو ضرور اس غزوے کا نام لیتیں۔ کبھی اس غزوے کا نام نہ بھولتیں۔ بلکہ وہ غزوہ ان کو زندگی بھر یاد رہتا۔ وضاعین کذابین نے اس حدیث کے بنانے کے وقت غزوے کا ذکر کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ اس وقت ان کے ذہن نے کام نہ کیا کہ کس غزوے کا نام لیا جائے اس لئے مبہم چھوڑ دیا کہ بعد کو سوچ سمجھ کر کسی غزوے کا نام بتا دیا جائے گا۔ سردست نفس حدیث میں غزوے کو مبہم ہی چھوڑ دیا جائے۔ مگر اس نفسیاتی نکتے کی طرف ان کی توجہ نہیں گئی جس سے ان کے جھوٹ کا پول کھل گیا۔

(۲) حضرت عائشہؓ اس محمل پر مدینے ہی سے گئی ہونگی جو خود ایک وزنی چیز ہوتا ہے پھر اس میں بقول راوی ایک کمسن (مگر جوان) عورت بھی تھیں وہ ہزار ہلکی پھلکی ہوں مگر کم سے کم پندرہ بیس سیر تو ان کا وزن ضرور ہوگا۔ محمل کوئی صندوقچہ یا سوٹ کیس کے برابر نہیں ہوتا کہ من بھر وزن کا بھی ہو تو ایک مضبوط آدمی تنہا اٹھا کر اونٹ پر رکھدے یقیناً ساربان کسی مددگار کے ساتھ ہی حضرت عائشہؓ کے محمل کو اونٹ پر رکھتا اور اتارتا ہوگا۔ بلکہ یہ بھی ناممکن اور خلاف دستور ہے کہ سوار سمیت محمل اٹھا کر اونٹ پر رکھا جاتا ہو۔ یقیناً پہلے محمل رکھا جاتا ہے اس کے

بعد سوار محمل میں سوار ہوکر بیٹھتا ہے۔ سوار سمیت اگر محمل اٹھا کر رکھا جائے تو سوار کو بیٹھنے میں دشواری ضرور محسوس ہوگی اور ہلنے جلنے کی وجہ سے سر میں شانے میں چوٹ آنے کا خطرہ ہوسکتا ہے ۔ یقیناً دستور کے مطابق مدینے سے چلنے کے وقت بھی اور پھر جاتے ہوئے ہر پڑاؤ پر پہلے اونٹ پر محمل رکھا جاتا ہوگا اس کے بعد حضرت عائشہؓ محمل میں بیٹھتی ہونگی اور جب اونٹ بیٹھتا ہوگا تو محمل سے نکل کر زمین پر اترتی ہوں گی تب محمل اونٹ سے اتارا جاتا ہوگا محض پیش بندی کے لئے روایت میں خلاف دستور یہ درج کیا گیا ہے کہ وہ محمل میں بیٹھ جاتی تھیں تب محمل اونٹ پر رکھا جاتا تھا ۔ اس موقع پر جس کا ذکر روایت میں ہے سار بان اور اس کے مدد گار نے کیسے سمجھ لیا کہ حضرت عائشہؓ محمل میں پہلے سے موجود ہیں؟ کیا وہ رات کو رات بھر محمل ہی میں بیٹھی رہتی تھیں؟ کیا محمل میں پاؤں پھیلا کر سونے کی جگہ بھی ہوتی ہے ؟ کیا وہ پڑاؤ کے وقت محمل سے اتر کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خیمے میں نہیں چلی جاتی تھیں؟ اگر وہ رفع حاجت کے لئے پڑاؤ سے کچھ دور گئی تھیں تو محمل سے اتر کر ؟ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خیمے سے؟ کیا وہ پڑاؤ کے وقت تنہا کسی ایسی جگہ ساری فوج سے الگ اور آنحضرتؐ کے خیمے سے بھی الگ محمل میں بیٹھی رہی تھیں کہ اس میں سے نکل کر ان کو باہر جاتے ہوئے کسی نے بھی نہیں دیکھا کہ ان کی واپسی کا خیال رکھتا؟ ۔ آخر پڑاؤ تو غالباً مغرب کے وقت کیا گیا ہوگا مغرب کی نماز پھر عشاء کی نماز میں حضرت عائشہؓ عورتوں کی جماعت کے ساتھ مجاہدین کے پیچھے ضرور رہی ہونگی۔ رات کا کھانا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ یا دوسری عورتوں کے ساتھ کھایا ہوگا جو شریک سفر تھیں تو وہ خیمہ نبویؐ چھوڑ کر یا

عورتوں کے خیمے کو چھوڑ کر رات بھر محمل ہی میں کیوں رہیں کہ سار بان اور اس کے معاون کو اس کا یقین رہا کہ وہ محمل میں موجود ہیں؟

خالی محمل بھی اس سار بان اور اس کے مدد گار نے ضرور اٹھایا ہوگا۔ اور اس کے وزن کا ضرور اس کو اندازہ ہوگا۔ اور اگر اس پر دس پندرہ سیر کے وزن کا بھی اضافہ ہو جائے تو ایسا نہیں ہے کہ دس پندرہ سیر کے وزن کے اضافے کو وہ محسوس نہ کر سکے۔ اگر وہ بفرض محال ہر بار حضرت عائشہؓ کے محمل میں موجود رہنے ہی کی حالت میں اس سفر میں محمل کو اٹھاتا رہا ہو اور اتارتا رہا ہو تو ناممکن ہے کہ وہ پندرہ یا بیس ہی سیر کے وزن کی کمی بیشی کا فرق محسوس نہ کرے۔ حضرت عائشہؓ کا وزن محض سیر ڈیڑھ سیر نہ تھا کہ بالکل محسوس نہ ہو۔

پھر اگر سوار سمیت سار بان محمل اٹھائے گا تو پہلے سوار کو مطلع کر دے گا کہ اب محمل کو اٹھا رہا ہوں ذرا سنبھل کر بیٹھ جایئے۔ جب سوار اپنی ہوشیاری کا اظہار کر دے گا تب سار بان محمل اٹھائے گا۔ سوار کو غافل رکھ کر کبھی نہیں اٹھائے گا اس لئے ساربان نے ضرور آواز دی ہوگی کہ اب محمل اٹھا کر اونٹ پر رکھ رہے ہیں سنبھل کر بیٹھئے۔ مگر جب کسی قسم کی آہٹ نہ پائی ہوگی تو ضرور اس کو چوکنا ہونا چاہیئے۔ اور اب تو محمل کے وزن کی طرف بھی اس کے ذہن کو منتقل ہونا ضروری تھا۔

(۳) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مجاہدین کا قافلہ جب کبھی باہر نکلتا تھا تو ان کے ساتھ عورتوں کی بھی جماعت ہوتی تھی۔ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی اپنی زوجہ مطہرہؓ کو ساتھ نہیں لے جاتے تھے۔ عورتوں کے لے جانے کی غرض مجروحین کی خدمت وغیرہ تھی۔ اسلامی مساوات کا تقاضا یہی تھا کہ جب صحابہ کی بیویاں مجاہدانہ شریک قافلہ

مجاہدین ہیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی بیوی بھی ضرور شریک سفر رہیں۔ یہ ناممکن ہے کہ جہاں پڑاؤ ہو وہاں حضرت عائشہؓ نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہیں نہ ان عورتوں کے ساتھ بلکہ تنہا رات بھر محمل میں بیٹھی رہیں۔ یہ ممکن ہے کہ بخیال مساوات سب عورتوں کی جماعت کے ساتھ حضرت عائشہؓ بھی ہوں۔ تو اگر وہ رفع ضرورت کے لئے قافلے سے دور اثنائے راہ میں آخر شب کو تنہا کسی جھاڑی وغیرہ کی طرف جارہی تھیں تو بقول راوی وہ اس وقت بہت کمسن تھیں خود اگر لحاظ سے کسی عورت کو ساتھ چلنے کے لئے نہ کہہ سکتی تھیں تو ان صحابیات کو تو اہل بیت نبویؐ کی عظمت کا خیال کرکے ان کے ساتھ ہو لینا تھا۔ ایک نہیں بلکہ کئی ساتھ ہو جاتیں۔ کوئی وجہ ہی نہیں ہے کہ وہ تنہا چلی جاتیں۔

(۴) ہر سفر میں قافلے کے ساتھ خیمے رہتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خیمہ الگ ہوتا تھا آپؐ کے ساتھ جو اہل بیت ہوتی تھیں یقیناً رات کے وقت آپؐ کے ساتھ آپؐ ہی کے خیمے میں رہتی تھیں۔ آپؐ سے الگ رہنے کی کوئی وجہ نہیں۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ بخیال مساوات عورتوں کی جماعت کے ساتھ رہتی ہوں۔ تو اگر عورتوں کے ساتھ رہتی ہوں جب بھی ان کا تنہا قافلے سے دور آخر شبکو جانا بعید از عقل ہے جس کا ذکر اوپر ہوا۔ اور اگر آنحضرتؐ ہی کے ساتھ آپؐ ہی کے خیمے میں رہتی ہوں تو آپؐ کی اجازت کے بغیر قافلے سے دور آخر شب میں تنہا ان کا جانا غیر ممکن ہے یقیناً حضرت عائشہؓ کو اگر ضرورت محسوس ہوئی ہوگی تو آپؐ سے باہر جانے کی اجازت طلب کی ہوگی۔ اس وقت بقول راوی ان کے حدیث السن کمسن ہونے کا خیال کرکے آپؐ کسی صحابیہ کو ضرور ساتھ

جانے کے لئے فرماتے ورنہ آپؐ خود ساتھ جاتے۔ تنہا ہر شب کو اثنائے
راہ میں قافلے سے دور جھاڑی کی طرف جانے کی اجازت کبھی نہ دیتے۔
خصوصاً جب اسی حدیث کے سلسلے میں یہ بھی، روایت چند سطروں کے
بعد موجود ہے کہ وہ اپنے گھر پر مدینے کی آبادی میں شب کے وقت رفع
حاجت کے لئے میدان کی طرف چلیں تو ام مسطحؓ حضرت عائشہؓ کے ساتھ
ہولیں یہ کیسے ممکن تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو تنہا اثنائے
رات میں دیر شب کو جانے دیتے۔

(۵) یہ قافلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم والذین معہ رضی اللہ عنہم کا تھا
اس لئے یہ ناممکن ہے کہ مغرب کے وقت پڑاؤ ہوا ہو تو نماز مغرب میں
آنحضرتؐ نے حضرت عائشہؓ کی تلاش نہ کی ہو اسی طرح عشاء کی نماز
میں۔ اور پھر صبح کی نماز میں۔ پڑاؤ کے وقت حضرت عائشہؓ محمل سے اتر
کر نماز مغرب میں شریک ہوئی ہونگی اس کے بعد پھر محمل ہی میں جاکر
کبھی نہ کبھی بیٹھ رہی ہونگی۔ یا آنحضرتؐ کے ساتھ آپؐ کے خیمے میں
ہونگی۔ یا عورتوں کی جماعت کے ساتھ عورتوں کے خیمے میں۔ اور پھر
کھانا انہوں نے شب کے وقت آنحضرتؐ ہی کے ساتھ کھایا ہوگا یا عورتوں
کے ساتھ پھر عشاء کی نماز میں محمل سے باہر ہی رہی ہوں گی اس کے بعد
آرام کرنے کے لئے بھی آنحضرتؐ کے خیمے میں چلی آئی ہونگی یا عورتوں
کے خیمے میں۔ محمل سونے کی جگہ نہیں ساربان نے ان کو پڑاؤ کے بعد
فوراً ہی اتر کر آنحضرتؐ کے خیمے کی طرف یا عورتوں کے خیمے کی طرف
جاتے ہوئے ضرور دیکھا ہوگا۔ اس لئے جس وقت اس نے اونٹ کو بٹھایا
ہوگا اسی وقت اس کے سامنے ہی وہ چادر اوڑھے حجاب کے ساتھ محمل
سے اتری ہونگی۔ اور ساربان نے خالی محمل کسی جگہ رکھدیا ہوگا۔ جہاں

اس نے خالی محمل رکھا تھا وہیں سے محمل اٹھایا ہوگا۔ کیسے اس کو یہ وہم بھی ہوسکتا تھا کہ اس میں حضرت عائشہؓ موجود ہیں ۔ اور جب وہم کا امکان بھی نہیں ہے تو گمان غالب و یقین کا کیا ذکر ہے کہ وہ یہ سمجھ کر محمل اونٹ پر رکھ دے گا کہ حضرت عائشہؓ اس میں سوار ہیں۔ محمل سے باہر نکلتے ہوئے تو ساربان نے دیکھ لیا تھا مگر محمل میں سوار ہوتے ہوئے بلکہ اس طرف آتے ہوئے بھی نہیں دیکھا تھا پھر کس طرح یقین کر لیا کہ وہ محمل میں ہیں؟

(٦) اس روایت کا گھڑنے والا چونکہ اپنے زعم میں بڑا چالاک تھا اس لئے جس طرح اس نے غزوہ کا نام بتلاکر متعین نہ کیا اسی طرح یہ بھی نہیں بتایا کہ شب ماہ تھی یا اندھیری رات۔ حضرت عائشہؓ اندھیری رات میں باوجود حدیث السن ہونے کے اثنائے راہ میں قافلے سے دور تنہائی کے مقام پر جانے میں ذرا نہیں ڈریں۔ سخت تعجب ہے ۔ پھر ہار خرف یمنی کا جب تھا تو اس کے دانے ضرور بکھر گئے ہونگے۔ اندھیری رات میں ایک جگہ جاکر رفع حاجت کرنا اور پھر واپس آنا اور ہار نہ پاکر پھر اسی جگہ پہنچ جانا جہاں رفع حاجت کے لئے گئیں تھیں۔ ہار کہاں پر ٹوٹا تھا اس کا علم نہ تھا ۔ جاتے وقت اثنائے راہ میں یا واپسی کے وقت اثنائے راہ میں یا وہیں پر جہاں رفع حاجت کیا تھا؟ اس کی کیا خبر ہوسکتی ہے اس لئے کہاں کہاں تلاش کیا اگر روایت میں یہ ہوتا کہ علی الصباح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فجر کی نماز مختصر طور سے پڑھ کر چلنے کا حکم دیا تو کہا جاسکتا تھا کہ نماز اور پھر حضرت عائشہؓ کے بعد نماز رفع حاجت کے لئے جانے اور فراغت کے بعد آنے اور ہار نہ پاکر پھر واپس جانے تک ایک حد تک روشنی ہوچکی تھی۔ یہاں صاف طور سے روایت میں ہے اذن لیلہ

بالرحیل رات ہی کے وقت کوچ کرنے کا حکم دیا۔ فجر کی نماز آگے کہیں جاکر پڑھی ہوگی۔ یہ بھی راوی ہنیں لکھتا ہے کہ شب ماہ تھی چاندنی کی روشنی کی وجہ سے حضرت عائشہؓ کو جانے آنے اور پھر اسی جگہ پہونچتے میں اور نجاست سے بچتے ہوئے ہار کو اور اس کے بکھرے ہوئے دانوں کے چننے میں کوئی دشواری نہ ہوئی۔ ورنہ اندھیری رات میں تو زمین پر ہار اور دانوں کو ٹٹول ٹٹول کر اسی جگہ تلاش کرنے میں جہاں رفع حاجت کیا ہے۔ ہاتھ کے آلودہ ہو جانے کا بہت زیادہ خطرہ ہے۔

علامہ ندوی مرحوم تحریر فرماتے ہیں کہ "ہار کی لڑیاں اتنی کمزور تھیں کہ ٹوٹ ٹوٹ جاتی تھیں" (سیرت عائشہ ۷۴) علامہ مرحوم نے یہ فقرہ کس لئے تحریر فرمایا ہے اس کو میں بعد میں بیان کرونگا۔ مگر سوال یہ ہے کہ ہار حضرت عائشہؓ کا نہ تھا۔ ان کی بڑی بہن حضرت اسماءؓ کا تھا۔ اس کے بار بار ٹوٹنے کا تجربہ صرف حضرت عائشہؓ کو تھا یا حضرت اسماءؓ کو بھی تھا۔ جب اس کا دھاگا اس قدر کمزور تھا تو اول تو اس کے دانوں کی حفاظت کے خیال سے حضرت اسماءؓ کو اس میں کون سی دشواری تھی کہ وہ اس ہار کے دانوں کو دوسرے مضبوط دھاگے میں ہنیں گوندھ لیتیں۔ باوجود اس کے کہ اس کا دھاگہ بار بار ٹوٹ جاتا تھا اور اگر وہ دھاگا بدلنے کے خیال میں تھیں ضرور مگر آج کل میں یہ کام ٹلتا رہا اور حضرت عائشہؓ نے دھاگا بدلنے سے پہلے ہی مستعار مانگ لیا۔ اگر ایسا تھا تو حضرت اسماءؓ ضرور ان کو مطلع کر دیتیں کہ اس کا دھاگا بہت کمزور ہے بار بار ٹوٹ جاتا ہے۔ اگر راہ میں کہیں ٹوٹا خصوصاً شب کے وقت تو پھر اس کے دانے بکھر جائیں گے اور ممکن ہے تلاش کے وقت بعض دانے گم ہوجائیں تو ممکن ہے حضرت عائشہؓ نہ لیتیں یا لے کر خود گوندھ لیتیں۔ دھاگہ ساتھ

رکھ لیتیں اثنائے راہ میں محمل میں بیٹھی بیٹھی ہار گوندھ لیتیں ورنہ ہار کا برابر خیال رکھتیں۔

پھر حضرت عائشہؓ ایک جہاد میں جا رہی تھیں ۔ مجروحین کی خدمت کے لئے ۔ کسی تقریب میں شادی بیاہ میں یا دعوت و ضیافت میں نہیں جا رہی تھیں کہ اپنے پاس زیور نہیں ہے تو مانگے کا زیور پہن کر اپنا شوق مناتیں یا دوسری عورتوں میں اپنا بھرم رکھتیں۔ وہ مجروحین کی خدمت کے لئے جا رہی تھیں ۔ جس کے لئے ان کو ہلکی پھلکی رہنا چاہیئے تھا تاکہ باطمینان دوڑ دھوپ اور جدو جہد کر سکیں ایسی حالت میں تو اپنے بدن پر دن رات پہننے کا زیور بھی کوئی ہو تو اس کو اتار کر جانا چاہیئے نہ کہ اپنے پاس نہ ہو تو دوسرے سے مستعار لے کر جایا جائے؟ اور پھر چلنے کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ضرور حضرت عائشہؓ کے گلے میں ہار دیکھ کر پوچھا ہوگا کہ یہ ہار کس کا ہے؟ معلوم کرنے کے بعد آپؐ ضرر ہار کو دو خیال سے واپس کرا دیتے ایک تو وہی جو اوپر مذکور ہوا۔ مجروحین کی خدمت کے وقت ہلکی پھلکی رہنا چاہیئے ۔ ہار جیسی چیز خود اپنے ہی کسی ہاتھ سے الجھ سکتا ہے کسی مضطرب مجروح کو سنبھالنے میں اس کے ہاتھ سے الجھ سکتا ہے اس لئے ہار پہن کر جانا ہرگز مناسب نہیں دوسری وجہ یہ کہ مانگے کا زیور پہن کر محض نمائش کے لئے کہیں جانا اولوالعزمی اور عزت نفس کے خلاف ہے۔

(۷) اس روایت کے گھڑنے والے نے افک کی کہانی حضرت عائشہؓ کی ذات اقدس کے نام پر گھڑ کر ہی صحیح ثابت کرنے کی کوشش نہیں کی ہے بلکہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی اپنے اہل بیت کی طرف سے بے پرواہی و بے اعتنائی و غفلت برتنے کا الزام درحقیقت عائد کیا ہے کہ

جس شب کو اثنائے راہ میں پڑاؤ کرنے کا واقعہ بیان کیا ہے اس میں پڑاؤ کے وقت سے کوچ کے وقت بلکہ دوسرے دن دوسرے پڑاؤ کے وقت تک جو ظہر کا وقت بتایا ہے اتنی طویل مدت آپؐ نے حضرت عائشہؓ کے متعلق کبھی کچھ نہ پوچھا۔ نہ پڑاؤ کے وقت آپؐ نے پوچھا نہ نماز مغرب میں نہ نماز عشاء میں نہ کھانے کے وقت نہ ان کے آرام و آسائش کے متعلق نہ کوچ کے وقت نہ کوچ کے بعد آگے چل کر جہاں صبح کی نماز پڑھی وہاں نہ نماز سے پہلے نہ نماز کے بعد۔ یہاں تک کہ پھر نماز صبح کے بعد بھی جب قافلہ چلا تو اس وقت بھی حضرت عائشہؓ کو بالکل بھولے رہے جیسے آنحضرتؐ کو حضرت عائشہؓ کا اپنے ساتھ لانا مطلقاً یاد ہی نہ رہا۔ ظہر کو جو دوسری جگہ پڑاؤ کیا تو وہاں بھی آپؐ نے حضرت عائشہؓ کو یاد نہ فرمایا۔ کم سے کم نمازوں کے وقت تو ضرور حضرت عائشہؓ کو دریافت فرماتے۔ آپؐ کو حکم تھا **و امر اھلک بالصلٰوۃ و اصطبر علیھا**۔ ۲۰/ ۱۳۲

ظاہر ہے کہ جب آپؐ اپنی ایک زوجہ مطہرہؓ کو اپنے ساتھ لائے تھے۔ خصوصاً ایسی بیوی کو جو بقول راوی بالکل کمسن اور ناتجربہ کار بھی تھیں تو ان کے متعلق تو پوری خبرگیری کی ضرورت تھی جس کے آپؐ اخلاقاً ہی نہیں بلکہ شرعاً بھی ذمہ دار تھے۔ مگر راوی کے نزدیک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نعوذ باللہ اس موقع اپنی اخلاقی و شرعی ذمہ داری کا حق مطلقاً نہیں ادا کیا۔ **اللھم عذب لمنافقین عذابا شدیدا**۔

(۸) اس روایت کا گھڑنے والا چونکہ خود منافق بے دین بے نمازی ہے۔ اس لئے اس نے اس جھوٹی روایت کے گھڑنے میں پڑاؤ ڈالنے کا ذکر کیا ہے مگر کہیں بھی نماز کا ذکر نہیں ہے۔ رات کو پڑاؤ کیا ہوگا تو مغرب کے وقت مغرب پڑھنے کے لئے یا مغرب کہیں پڑھ کر پھر چلے ہوں تو

عشاء کے وقت پڑاؤ کیا ہوگا۔ اور پہلے عشاء کی نماز پڑھی ہوگی، رات رہتے کوچ کا حکم دیا ہوگا تو پھر نماز صبح کے لئے کچھ آگے پہونچ کر قیام کیا ہوگا۔ دوسرے پڑاؤ کا ذکر کیا ہے جب صفوان بن معطل حضرت عائشہؓ کو اپنے اونٹ پر بٹھائے اونٹ کی مہار تھامے اس پڑاؤ پر پہنچے ہیں دوپہر کے وقت تو عند الظهيره کا لفظ آیا ہے ظہیرہ دوپہر کو کہتے ہیں۔ اس سے ظہر مراد نہیں لی جاتی مگر قافلہ وہاں پہلے سے اترا ہوا تھا جیسا کہ روایت میں مذکور ہے ۔ وھم نزول یعنی قافلے والے اترے ہوئے تھے مگر اس وقت بھی کسی نے حتیٰ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی حضرت عائشہؓ کا کچھ کھوج نہ کیا۔

(۹) جب حضرت عائشہؓ بقول راوی ہار ڈھونڈ کر پڑاؤ پر آئیں تو یہاں سناٹا تھا اور یقیناً اس وقت تاریکی ہی ہوگی کچھ حصہ شب باقی ہوگا یا غلس کا وقت ہوگا بقول راوی وہ حدیث السن بہت کمسن تھیں اور بقول علامہ ندوی مرحوم ۱۴ برس کی کمسن اور ناتجربہ کار تھیں اس لئے اندھیری رات میں یا غلس کے وقت چٹیل میدان میں تنہا اپنے کو پاکر تو ان کو غش کھا کر گر جانا چاہیئے تھا ورنہ سخت اختلاج و اضطراب میں مبتلا ہو جانا تھا ۔ ان کا دل دھڑکنے لگتا گھبرا گھبرا کر رونے لگتیں ۔ اللہ تعالیٰ سے فریاد کرنے لگتیں دعائیں کرنے لگتیں ۔ مگر نہیں کچھ نہیں۔ راوی کہتا ہے کہ وہ یہ سمجھ کر اطمینان سے بیٹھ رہیں کہ لوگ جب مجھ کو نہ پائیں گے تو خود ڈھونڈنے کے لئے آئیں گے ۔ اور اطمینان بھی ایسا کامل اطمینان کہ کچھ دیر کے بعد ان کو نیند آنے لگی ۔ اور وہ چادر تان کر اطمینان سے سو رہیں کیا کوئی عقل اس کو تسلیم کر سکتی ہے ؟ ۱۴ نہیں چالیس برس کی عورت بھی اگر اس طرح قافلے سے اثنائے راہ میں رات کے وقت چٹیل میدان

میں چھوٹ کر رہ جائے تو ضرور وہ چور ڈاکو سے بھی ڈرے گی اور درندے گزندے جانوروں سے بھی ڈرے گی ۔ اور خوفناک منظر جس کو اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا اور ایسی ہیبتناک تنہائی جس کا کبھی اس کو سابقہ نہیں پڑا تھا تو ضرور وہ سخت گھبرائے گی اور ضرور خوفزدہ ہوگی اور کبھی اس کو نیند نہیں آسکتی۔ چہ جائیکہ بقول راوی کمسن نا تجربہ کار عورت۔

(۱۰) اس روایت کے گھڑنے والے خبیث نے اس کا بھی خیال نہ کیا کہ حضرت عائشہؓ رسولؐ کی بیوی تھیں نماز کی ضرور سخت پابند ہونگی۔ اوپر اگر ان کی نماز کا ذکر نہ کیا تھا تو کہا جاسکتا ہے کہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھی ہوگی جس طرح سب نے پڑھی تھی واقعہ سے نماز کا کوئی خاص تعلق نہ تھا ویسے پڑاؤ پر پڑاؤ والوں نے یا خود رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے جماعت کے ساتھ جو نمازیں پڑھی تھیں ان کا ذکر اس روایت میں نہیں ہے تو اس کے معنیٰ نہیں ہیں کہ روایت میں نماز کا ذکر چھوڑ دیا گیا مگر الزام نماز کا ذکر چھوڑنے کا نہیں ہے بلکہ نمازوں کے وقت حضرت عائشہؓ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یاد نہیں فرمایا اس پر اظہار تعجب ہے ۔ البتہ جب حضرت عائشہؓ ہار ڈھونڈ کر آئیں تو اب تو ضرور غلس کا وقت ہوگا اب جو یہاں آکر سناٹا دیکھ کر وہ کچھ دیر تک گھبراتی رہی ہونگی اس کے بعد بیٹھ کر کچھ سوچتی رہی ہونگی راوی یہ بھی نہیں کہتا ہے کہ وہ زبان سے یا دل ہی دل میں اللہ تعالیٰ سے دعائیں کرنے لگیں۔ بلکہ فجر کی نماز تک نہیں پڑھی اور چادر تان کر سو رہیں۔

شاید یہ کہا جائے کہ اس وقت تک نماز فجر کا وقت نہیں ہوا تھا اس لئے غلب نوم کے باعث سو رہیں۔ تو کم سے کم جب صفوان بن معطل کے استرجاع (انا پڑھنا) کو سن کر اٹھیں تو اب تو فجر کی قضامن نام عن

صلوہ فرمان نبویؐ کے مطابق ان کو اس وقت سب سے پہلے تیمم کرکے فجر کی نماز پڑھ لینی تھی۔ اس کے بعد صفوان کے اونٹ پر سوار ہوتیں۔
تلک عشرہ کاملہ ، یہ دس شواہد جو اسی روایت کے الفاظ اور متن کے اندر موجود ہیں اتمام حجت کے لئے کافی ہیں اس کے بعد آپ روایت پرستی سے الگ ہوکر صرف انصاف و دیانت کی رو سے اللہ لگتی بات سوچئے کہ کیا روایت افک خود سراپا افک نہیں ہے؟ اور اس روایت کا گھڑنے والا کیا منافق نہیں ہے۔

ابھی اس روایت کے کذب و افترا ہونے کے دلائل ختم نہیں ہوئے ہیں دلائل تو بہت ہیں مگر طوالت سے بچنے کے لئے ایک اور روایت لکھ کر اس کو ختم کرتا ہوں۔

بخاری کی دوسری روایت | ہمارے نزدیک یہی دوسری روایت صحیح ہے اور اسی صحیح روایت میں مزید نمک مرچ لگا کر منافقین نے داستان افک کی بنیاد رکھی ہے ، یہ روایت بھی صحیح بخاری ہی کی ہے اور باب التیمم کی پہلی حدیث ہے اس کے راوی ابن شہاب زہری نہیں بلکہ امام مالکؒ ہیں امام بخاری لکھتے ہیں

" حضرت عائشہؓ زوجہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کہتی ہیں کہ ہم کسی سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ تھے یہاں تک کہ جب ہم بیداء میں یا ذات الجیش میں پہنچے تو میرا ہار ٹوٹ کر گر گیا۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے ڈھونڈنے کے لئے قیام کر دیا۔ اور لوگ بھی آپؐ کے ہمراہ ٹھہر گئے اور اس مقام میں کہیں پانی نہ تھا لہذا لوگ حضرت ابوبکرؓ صدیق کے پاس گئے اور کہا کہ آپ نہیں دیکھتے کہ عائشہؓ نے کیا کیا؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور سب لوگوں کو ٹھہرا لیا اور

ان کے ہمراہ پانی نہیں ہے۔ حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ ابو بکرؓ نے مجھ پر غصہ کیا اور جو کچھ اللہ نے چاہا کہ کہیں وہ انہوں نے کہا اور اپنے ہاتھ سے میرے کولھے میں ٹہوکا دیا۔ تو مجھے چونکہ میرے زانو پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سر تھا اس کے سوا کسی بات نے مجھ کو حرکت کرنے سے نہ روکا پھر صبح کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اٹھے بے پانی کے مقام پر تو اللہ بزرگ وغالب نے تیمم کی آیت نازل فرمائی تو اسد بن حضیرؓ نے کہا کہ اے آل ابو بکرؓ! یہ تمہاری کوئی پہلی برکت نہیں ہے (یعنی تم لوگوں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے امت محمدیہؐ کو اس سے پہلے اور بھی برکتیں دی ہیں) حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ جس اونٹ پر میں تھی جب اس کو اٹھایا گیا تو اس کے نیچے ہار مل گیا۔

اس روایت میں راوی سب کے سب ثقہ اور حجت ہیں حضرت عائشہؓ اپنا ایک واقعہ بیان فرماتی ہیں۔ جس سے مقصود اپنا واقعہ بیان کرنا نہیں ہے بلکہ حکم تیمم کب ہوا اور کیوں ہوا اس کا بیان کرنا مقصود تھا اسی لئے اس سفر کا تو ذکر نہ فرمایا کہ وہ کون سا سفر تھا۔ مگر جس مقام کا واقعہ تھا اس مقام کا ذکر فرمایا۔ مگر شک کے ساتھ بیداء یا ذات الجیش "بیداء" اس بلند مقام کا نام ہے جو ذوالحلیفہ کے آگے تھا اور مکے کی راہ میں پڑتا تھا۔ اور "ذات الجیش" ذوالحلیفہ کے اس پار واقع ہے مدینے سے قریب اور اس کے متعلق محدثین کے متعدد اور مختلف اقوال ہیں مگر اکثر محدثین نے اس سفر کو غزوہ بنی المصطلق یعنی غزوہ مریسیع ہی قرار دیا ہے علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم نے بھی سیرت عائشہؓ صفحہ ۴۴ و ۴۵ میں اس واقعے کو واقعہ افک کے ساتھ غزوہ بنی مصطلق ہی کا واقعہ لکھا ہے زیادہ تر محدثین یہی لکھتے ہیں کہ یہ واقعہ غزوہ بنی المصطلق ہی کا ہے

بعضوں نے اختلاف کیا ہے مثلاً نووِیِ وغیرہ مگر امام نووی کے وجود اختلاف کا لوگوں نے جواب بھی دیا ہے میرے نزدیک اس حدیث تیمم میں جس کو میں صحیح سمجھتا ہوں سفر کی تعیین ہنیں ہے اسی لئے کہ حالات سفر بیان کرنا مقصود ہنیں تھا۔ آیت تیمم کے نزول کا واقعہ بیان کرنا مقصود تھا۔ اور جس مقام پر یہ آیت اتری تھی اس مقام کا ذکر فرمایا دو مقاموں کا ذکر اس لے کیا گیا کہ دونوں قریب ہی قریب تھے ایک تھوڑی بلندی پر واقع تھا اور دوسرا اس کے نیچے تھوڑے فاصلے پر رات کا وقت تھا اور صبح کو نماز کے بعد کوچ کی تیاری تھی حضرت عائشہؓ یہ عورت ذات تھیں صحیح طور سے مقام کا نام معلوم نہ ہوسکا۔ پھر اس مقام پر اقامت کی وجہ جو ہار کے ٹوٹ کر گر جانا تھا اس کا بھی ذکر کر دیا۔ اس روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہار مانگے کا نہ تھا بلکہ حضرت عائشہؓ ہی کا تھا حضرت عائشہؓ کی فطری اولوالعزمی و منصبی خودداری کے خلاف تھا کہ وہ مانگے کا زیور پہن کر کہیں جاتیں۔ بلکہ وہ کوئی رکھاؤ زیور کی طرح بھی نہ تھا جس کو کبھی کبھار نمائش کے موقع پر عورتیں پہن کر نکلتی ہیں۔ بلکہ دن رات وہ ہار ان کی گردن میں رہتا تھا اس لئے سفر میں بھی اسی طرح گردن میں پڑا رہا۔ بخوبی ممکن ہے کہ یہ ہار حضرت صدیق اکبرؓ نے ان کو جہیز میں دیا ہو۔ افک والی مکذوبہ روایت جو صحیح بخاری میں ہے اس میں تو اس کا ذکر ہنیں ہے کہ وہ ہار اپنی بہن حضرت اسماءؓ سے مانگ کر پہن کر آئی تھیں۔ یہ صحاح سے باہر کی روایتیں ہیں جن میں بڑی تفصیل ہے بعض میں ساربان کا نام بھی مرصبہ بتایا ہے جو غزوہ مریسیع میں شریک تھے اور حضرت عائشہؓ کے اونٹ کے ساربان وہی تھے۔ بعضوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت نے فرمایا کہ فحبت فاتبعتهم حتى اعييت

نقمنه علی بعض الطریق فمربی صفوان ۔ یعنی میں جب ہار ڈھونڈھ کر آئی تو قافلہ کو نہ پاکر ان کا پیچھا کیا یہاں تک کہ تھک گئی تو راستے کے بعض حصے پر کھڑی ہوگئی تو میرے پاس صفوان بن معطل گذرے ۔ یعنی جو کمزوری صحاح کی روایتوں میں تھی اس کو بعد والوں نے محسوس کرکے بعض کمزوریوں کو نکالنے کی کوشش کی۔ اسی طرح ہار کے متعلق بھی بعضوں نے یہ بڑھا دیا کہ اپنی بہن اسماءؓ سے مانگ کر لائی تھیں جس سے ان کی دوں ہمتی اور زیبائش و آرائش کی ہوس ثابت ہو۔ اور پھر اک روایت یہ بھی ہے کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ کان فی عنقی عقد من جزع ظفار[1] کانت امی ادخلتنی به علی رسول الله صلی الله علیه و سلم ۔ میری گردن میں ایک ہار تھا جزع ظفار کا میری ماں نے جس کو پہنا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مجھ کو رخصت کیا تھا۔ یعنی ان کی رخصتی کے وقت ان کو جہیز میں یہ ہار ان کی والدہ ماجدہ حضرت ام رومانؓ نے دیا تھا۔ (فتح الباری جلد ۱۹ صفحہ ۲۶۶) جس سے معلوم ہوگیا کہ کسی نے تو اس ہار کو ان کا اپنا جہیز والا ہار قرار دیا اور جس کو ان پر دنایت اور دوں ہمتی و حرص و ہواؑ الزام بھی رکھنا تھا اس نے اس ہار کو مانگے کا ہار قرار دیا۔

اور صفوان بن المعطل کے متعلق بخاری میں تو اسی حدیث کے سلسلے میں آگے بھی ابن شہاب زہری صرف عروہ بن الزبیرؓ سے روایت کرتے ہیں جن سے ان کا سماع حدیث ثابت نہیں مگر بقول ابن حجر

---

[1] ظفار ایک بستی کا نام تھا یمن کے اس علاقے میں جو ہند کی طرف رخ رکھتا ہے اور جزع سیاہ و سفید پتھروں کو کہتے ہیں سنگ سلیمانی کے دانے جیسے

محدثین نے اس پر اجماع کر لیا ہے کہ ابن شہاب نے ضرور ان سے حدیثیں سنی ہیں انہیں عروہ سے وہ ایک لمبی داستان نقل کرتے ہیں۔ اس میں یہ مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صفوان کے متعلق فرمایا کہ "ولقد ذکرو ا رجلا ما علمت علیه الا خیراً" تہمت باندھنے والوں نے ایسے شخص کا نام لیا ہے جس کے متعلق میں بھلائی کے سوا کچھ نہیں جانتا۔[۵۲] مگر جلد ۱۹ صفحہ ۲۶۷ فتح الباری میں سنن ابی داؤد و بزاز و ابن سعد و صحیح ابن حبان و مستدرک حاکم کے پانچ حوالوں سے سلیمان الاعمش الکوفی مشہور شیعہ محدث کی روایت سے نقل کیا ہے اعمش ابو صالح سے روایت کرتے ہیں اور وہ حضرت ابو سعید حذریؓ سے کہ صفوان بن المعطل کی بیوی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور نالش کی کہ یا رسول اللہ میرا شوہر مجھ کو مارتا ہے جب میں نماز پڑھتی ہوں ۔ اور جب میں روزہ رکھتی ہوں تو میرا روزہ توڑ دیتا ہے ۔ اور فجر کی نماز جب تک آفتاب طلوع نہ ہو جائے کبھی نہیں پڑھتا۔ اور یہ نالش ایسے وقت میں کی گئی کہ صفوان وہاں پر موجود تھے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صفوان سے پوچھا۔ تو صفوان نے کہا کہ اس کا یہ کہنا کہ جب میں نماز پڑھتی ہوں تو یہ مجھ کو مارتا ہے تو یہ دو دو سورۃ پڑھا کرتی ہے حالانکہ میں نے اس کو منع کر دیا ہے کہ نماز میں دو دو سورۃ نہ پڑھا کرے ۔ اور اس کا یہ کہنا کہ جب میں روزہ رکھتی ہوں تو یہ میرا روزہ توڑ دیتا ہے تو میں ایک جوان مرد ہوں صبر نہیں کر سکتا۔ اور اس کا یہ کہنا کہ جب تک آفتاب طلوع نہ ہو جائے میں نماز پڑھتا ہی نہیں تو میں ایسے خاندان سے ہوں جو اس بات میں مشہور ہے ہم لوگ طلوع

---

۵۲ فتح الباری ص۱۶ ص۴۹

آفتاب سے پہلے کبھی اٹھتے ہی نہیں۔ اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد ابن حجر لکھتے ہیں کہ ابن بزاز نے کہا کہ هذا الحديث كلامه منكر و لعل الا عمش اخذه من غير ثقه فدلسه فصار ظاہر سنده الصحه و ليس للحديث عندي اصل - یعنی " اس حدیث کا مفہوم منکر ناقابل قبول ہے غالباً اعمش نے کسی غیر ثقہ شخص سے اس حدیث کو لیا اور نام کو بدل دیا تو اس کی سند صحیح بن گئی میرے نزدیک اس حدیث کی کوئی اصلیت نہیں ہے " اتنا لکھ کر پھر ابن حجر نے اس راویت کی صحت پر زور دیا ہے اور ابو داؤد کا حوالہ دے کر لکھا ہے کہ اس حدیث کو اعمش ہی سے راویت نہیں کرتے ہیں بلکہ بقول ابو داؤد حماد بن مسلم سے اور وہ ابوالمتوکل سے بھی اس کو روایت کرتے ہیں اور چونکہ ابو داؤد کا شمار صحاح ستہ میں ہے اس لے ابو داؤد کی اس روایت پر بھی تنقیدی نظر ڈال لینی مناسب ہے۔ صحاح سے باہر کی حدیثوں کی وہ اہمیت نہیں کہ خواہ مخواہ ان کی تنقید میں وقت ضائع کیا جائے بزاز وغیرہ کے پاس یہ حدیث اعمش کے ذریعے پہنچی ہے اور اعمش مشہور شیعے تھے محسن بن زایدہ اور عبداللہ بن المبارک نے فرمایا ہے افسد حديث اهل الكوفه ابو اسحٰق و اعمشكم هذا اہل کوفہ کی حدیثوں کو ابو اسحٰق نے اور تمہارے اعمش نے برباد کیا۔ دیکھئے میزان الاعتدال جلد اول ۴۲۳ اور صفحہ ۳۴۵ غرض یہ مفسدین حدیث میں سے تھے۔ تو پھر مدلس ہونا تو ان کے لئے معمولی سی بات ہے ۔ مگر ابو داؤد میں اعمش کا نام نہیں ہے ابو داؤد اس کو روایت کرتے ہیں عثمان بن ابی شعبہ سے اور وہ جریر بن عبدالحمید سے اور وہ ابو صالح سے اور وہ ابو سعید خدریؓ سے تو عثمان بن ابی شیبہ الکوفی قرآن مجید میں تحریف کیا کرتے تھے۔ الم تركيف فعل

ربک باصحب الفیل کو پڑھتے الم تر۔ یعنی حروف مقطعات بنا کر سورہ یوسف میں جو ہے وجعل السقایة فی رحل اخیه - اس کو پڑھتے تھے وجعل السفینه - اور فضرب بسور له باب پڑھتے تھے فضرب بسنور لهٗ ناب اور کوئی ٹوکتا تھا تو کہتے تھے کہ میں نافع کی قرأت سے قرآن نہیں پڑھتا میں بھی یہی کہتا ہوں کہ وہ نافع کی قرأت سے قرآن نہیں پڑھتے تھے مضر کی قرأت سے پڑھتے تھے جو ان کے ایمان بالقرآن کے حق میں سخت مضر تھا ، یعنی ابلیس کی قرأت سے پڑھتے تھے۔ امام ذہبی نے میزان الاعتدال میں لکھا ہے کہ لعل تاب " شاید اس نے توبہ کرلی ہو -" اللہ کرے ایسا ہی ہو ۔ مگر بلا ثبوت محض حسن ظن پر توثقہ و حجت نہیں سمجھا جاسکتا۔ جس شخص کا یہ برتاؤ کتاب اللہ کے ساتھ ہوا اس کا برتاؤ حدیث رسولؐ اللہ کے ساتھ کیسا ہوگا خود اپنے اسلامی ضمیر سے پوچھئے۔ ان کے بعد جریر بن عبدالحمید کا نام آتا ہے۔ یہ بھی کوفی ہی ہیں رے کے قاضی ہوئے تو رازی بن گئے۔ بعض صحابہ کی بدگوئی کرتے تھے ۔ مدلس تھے اور تدلیس کہتے ہی ہیں متن حدیث میں یا راویوں کے نام میں بالقصد جانتے بوجھتے رد و بدل کر دینے کو۔ اسی لئے محدثین تدلیس کو کذب کہتے ہیں۔ جو مدلس ہوگا وہ ضرور کاذب ہوگا۔

ان کے بعد ابو صالح کا نام آتا ہے ان کا اصل نام باذام یا باذان تھا۔ یہ ام ہانی بنت ابو طالب یعنی حضرت علیؓ کی بہن کے آزاد کردہ غلام تھے عبدالرحمٰن بن مہدی ان سے روایات نہیں کرتے تھے۔ ابو حاتم نے ان کو لایحتج بہ لکھا ہے ابن حجر تہذیب التہذیب میں لکھتے ہیں لم اعلم احد امن المتقد مین برضیه میں نہیں جانتا کہ متقدمین میں سے کسی نے بھی ان کو پسند کیا ہو ۔ امام شعبی ان کا کان پکڑ کر چھوڑتے تھے اور کہتے

تھے کہ قرآن کی تفسیر روایت کرتا ہے اور قرآن یاد ہنیں رکھتا ہے ۔ کلبی کا قول ہے کہ مجھ سے خود اس نے اس کا اعتراف کیا ہے کہ میں نے جتنی حدیثیں تم سے بیان کی ہیں وہ سب جھوٹی ہیں۔ اگرچہ کلبی خود بھی مشہور کذاب تھا۔ جوزقانی نے اس کو متروک الحدیث قرار دیا ہے ازدی نے اس کو کذاب کہا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے تفسیری حدیثیں روایت کرتا تھا حالانکہ اس نے کبھی ایک حرف بھی ہنیں سنا اکثر محدثین نے اس کو ضعیف اور لیس بالقوی وغیرہ کہا ہے۔ اس لئے اگر اس سلسلے میں اعمش کا نام نہ ہوا تو کیا ہے کئی اعمش اس میں موجود ہیں۔ اور وہ اعمش بھی تو ابو صالح ہی سے روایت کرتے ہیں۔

باقی رہا ابو داؤد کا یہ لکھنا کہ اس کو حماد بن سلمہ نے بھی فلاں بن فلاں کرکے روایت کیا ہے تو ابو داؤد نے اس کو اللہ جانے کہاں سے نقل کیا ہے ۔ خود وہ حدثنا وغیرہ کہہ کر اس سلسلے سے روایت ہنیں کر رہے ہیں۔ پھر ابوالمتوکل البصری نے کس سے سنا اس کا ذکر ہنیں ہے ابو المتوکل کی وفات ۱۰۸ھ میں یا ۱۰۲ھ میں ہے ۔ اس لئے کس سے سنا یہ مذکور ہنیں۔

غرض راویوں کے اعتبار سے یہ حدیث ہرگز قابل استناد ہنیں ہے۔ بزاز نے بہت صحیح لکھا ہے کہ اس کی کوئی اصلیت ہنیں ہے درحقیقت یہ حدیث کوفے کی ٹکسال میں اس لئے گھڑی گئی ہے کہ حضرت صفوان بن المعطل کی دینی و اخلاقی حالت اور خواہش نفسانی پر قابو نہ رکھنے کا ذکر کیا جائے کہ باوجود اس کے کہ ان کی بیوی روزہ دار ہوتی تھیں مگر یہ اپنی خواہش نفس کے آگے ان کے روزے اور انکی روزہ داری کا مطلق احترام ہنیں کرتے تھے جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں ان کے متعلق بھلائی کے سوا کچھ نہیں جانتا
ان کے متعلق تین تین برائیاں بیان کی گئیں جن برائیوں کا علم رسول
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہوا ان کی بیوی کی شکایت سے اور پھر خود ان
کے اعتراف سے۔ پھر بھی آپؐ نے کہا کہ بھلائی کے سوا کچھ نہیں جانتا۔
اس منافقانہ ذہنیت کی حدیث کی تہہ تک بزاز پہونچ گئے تھے اس لئے
اس حدیث کی اصلیت سے انکار کیا دوسرے لوگ روایت پرستی کے
جذبے سے اسقدر مغلوب تھے جو اس روایت کی خباثت معنوی و باطنی کو
نہ سمجھ سکے۔

غرض اللہ تعالیٰ روایت پرستی کا برا کرے کہ کیسے کیسے ائمہ محدثین و
مجتہدین و مفسرین محض اپنے حسن ظن اور نیک نیتی کی وجہ سے
منافقین کے دام تزویر میں آگئے اور ان کے ریائی زہد و ورع کو دیکھ کر انکی
ایسی ایسی حدیثوں کو قبول کر لیا جن میں نفاق اور کذب وافتراء کا رنگ
کافی حد تک نظر آرہا تھا۔

حقیقت یہی ہے کہ حضرت عائشہؓ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے متعلق
"افک" کا واقعہ محض کوفی و بصری و مصری باغیان اسلام ۔ منافقین ۔
قاتلین حضرت ذوالنورین رضی اللہ عنہ اور ان کے ہمنواؤں کا گھڑ ہوا ہے
اور اس کے متعلق زیادہ روایتیں کوفے ہی کی ٹکسال میں گھڑی گئیں جن
کے گھڑنے اور پھیلانے کا آغاز تقریباً ۵۰ ہجری کم و بیش سے شروع ہوا ۔
اور ان روایتوں کو محدثین و مفسرین و مؤرخین نے اپنی کتابوں میں درج
کرکے اس مکذوب و مفتریٰ اور من گھڑت داستان کو متواتر حدیث کا
درجہ دے دیا۔

(علامہ صاحب نے افسانہ افک سے متعلق روایت کے صرف اتنے

حصے سے بحث کی ہے جس کا تعلق ہار گم ہو جانے اور حضرت عائشہؓ کے قافلہ میں دیر سے پہنچنے سے ہے۔ روایت کے باقی حصہ سے انہوں نے بحث نہیں کی۔ غالباً اس لئے کہ جب اس واقعہ کی بنیاد ہی جھوٹی قرار پا گئی تو اس پر اٹھائی ہوئی عمارت کے جھوٹا ثابت کرنے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔ لیکن جب تک روایت کا باقی حصہ سامنے نہ لایا جائے، اس سازش کی گہرائی سمجھ میں نہیں آسکتی۔ اس لئے ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ روایت کے باقی ماندہ حصے کا ترجمہ بھی درج کر دیا جائے لیکن اس سے پہلے چند الفاظ تمہیداً ضروری ہیں۔

سورہ نور میں ہے کہ جو لوگ پاکدامن عورتوں پر ناحق تہمت لگائیں تو ان کی سزا اسی کوڑے ہے اور اس کے بعد ان کی شہادت قبول نہیں کی جائے گی۔ الزام کو صحیح ثابت کرنے کے لئے ضروری ہے کہ وہ چار گواہ پیش کرے۔ اس کے بعد قرآن نے یہ بتایا ہے کہ اگر کہیں ایسا واقعہ ہو جائے کہ کسی پاکدامن عورت کے خلاف تہمت لگائی جائے تو اس باب میں مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ میں اس قسم کا کوئی واقعہ ہوا تھا۔ اور یہ ہدایات اس واقعہ کو سامنے لاکر دی گئی ہیں قرآن کریم میں یہ کہیں نہیں لکھا کہ مدینہ کے اس واقعہ میں تہمت کس کے خلاف لگی تھی۔ ظاہر ہے کہ اگر اس قسم کا واقعہ (معاذ اللہ) حضورؐ کی ازواج مطہراتؓ میں سے کسی سے متعلق ہوتا تو قرآن اس کا بیان تصریحاً کرتا۔ جیسا کہ اس نے ازواج نبیؐ سے متعلق کئی ایک باتوں کا ذکر تصریحاً کیا ہے۔

قرآن نے یہ کہا ہے کہ اگر اس قسم کی تہمت کی بات مشہور ہو جائے تو مسلمانوں کا پہلا رد عمل یہ ہونا چاہیئے کہ کہیں ھذا افک مبین - ھذا

بھتان عظیم (۱۲ و ۲۴/۱۶) قرآن نے یہ اصول بیان فرمایا ہے کہ جب تک ملزم کے خلاف جرم ثابت نہ ہو جائے اس کے متعلق حسن ظن سے کام لینا چاہیئے۔ پھر ذمہ دار ارباب معاشرہ اس معاملہ کی تحقیق کرکے کسی نتیجہ پر پہنچیں قرآن میں صرف اتنی بات مذکور ہے ۔ لیکن دیکھیئے کہ روایات نے اس میں کیا کیا رنگ بھرے ہیں۔ حضرت عائشہؓ کے قافلہ تک پہنچنے کا ذکر روایت میں آچکا ہے ۔ اس کے بعد بخاری میں لکھا ہے کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا:۔

" قافلہ میں سے بعض لوگوں نے مجھ پر اور صفوان پر تہمت لگائی اور ہلاکی کا سامان کیا اور جس نے پہلے پہل اس تہمت کی بنیاد ڈالی تھی وہ عبداللہ بن ابی بن سلول تھا۔ میں جب مدینہ میں آئی تو بیمار ہوگئی اور ایک مہینہ تک ایسی ہی رہی اور لوگ اس (بہتان) کی شہرت کرتے تھے۔ لیکن مجھے کچھ خیال نہ تھا فقط افسوس یہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پہلا سا لطف و کرم اپنے پر نہ دیکھتی تھی ۔ بیماری کی حالت میں آپؐ آتے اور پوچھتے اور فوراً چلے جاتے میرے پاس نہ بیٹھتے اس سے یہ خیال ہوا کہ آپؐ ناراض ہیں جب مجھے کچھ افاقہ ہوا تو رات کو اپنے ساتھ ام مسطح کو لے کر مناصع میں (جو ایک جنگل مدینہ سے باہر ہے) رفع حاجت کو گئی (اس زمانہ میں پہلے غرباوں کی طرح پاخانہ جنگل ہی میں کرتے تھے اور مکان کے قریب پائخانہ بنانے کو برا سمجھتے تھے) وہاں سے آئی آتے میں ام مسطح کی چادر ان کے پیروں میں الجھ گئی ۔ اس وقت انہوں نے یہ کہا ہلاک ہو مسطح میں نے کہا تو نے برا کہا یہ تو ایسا شخص ہے جو بدر میں موجود تھا اس نے کہا اے بھولی بھالی تو نے سنا ہنیں اس نے کیا کہا ہے میں نے پوچھا کیا؟ اس نے کہا اس نے تیرے اوپر تہمت لگائی ہے اس کے سننے سے میرا مرض اور بڑھ گیا جب میں گھر آئی تو

میرے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آئے اور حال دریافت کیا میں نے عرض کیا اگر اجازت ہو تو اپنے ماں باپ کے گھر چلی جاؤں یہ اس خیال سے کہ دیکھوں انہیں بھی اس تہمت کی خبر ہے[1] یا نہیں آپؐ نے اجازت دے دی اور میں اپنے ماں باپ کے گھر آگئی اور ماں سے کہا اے اماں دیکھو لوگ کیا کہتے ہیں انہوں نے کہا اس کی کچھ فکر مت کر واللہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اگر کسی کی بیوی خوبصورت ہو اور وہ اس سے محبت کرے تو اس کی اور بی بیاں ایسی ایسی باتیں لگایا کرتی ہیں ۔ میں نے کہا واہ سبحان اللہ لوگوں نے تو کچھ یہ افواہ اڑا رکھی ہے اور آپ خفیف سی بات خیال کرتی ہیں ۔ اور میں اس رات برابر روتی رہی ۔ ایک دم کو آنسو نہ رکا اور نہ نیند آئی ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے علیؓ اور اسامہؓ بن زید کو بلوایا اس وقت تک کوئی میرے بارے میں وحی نہیں اتری تھی اور ان سے میرے علیحدہ کرنے کے بارے میں مشورہ کیا اسامہ نے بوجہ اس کے کہ وہ اہل بیت سے محبت رکھتے تھے ان کو پاک و نیک سمجھتے تھے یہ کہا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عائشہؓ بڑی نیک ہیں۔ ہم نے تو سوائے اچھی بات کے ان میں کوئی بری بات نہیں دیکھی ۔ لیکن علیؓ نے کہا کہ یارسول اللہ اس قدر آپؐ کیوں رنج کرتے ہیں آپؐ کے لئے اللہ نے تنگی نہیں کی اور بہت سی نیک بی بیاں ہیں اور اگر آپؐ بریرہ باندی سے پوچھیں گے تو وہی ٹھیک بتادے گی پھر آپؐ نے بریرہ کو بلایا اور فرمایا اے بریرہ تونے (عائشہؓ کی) کوئی بات ایسی دیکھی ہے جس سے تجھے کچھ شبہ ہوا ہو ۔ اس نے کہا قسم ہے اس ذات کی جس نے آپؐ کو حق پر بھیجا ہے میں نے کوئی بات نہیں دیکھی جو اس کو

---

[1] اس سے آگے چند روایات کے بعد ایک روایت میں ہے کہ نبی اکرمؐ اور حضرت ابوبکر صدیقؓ دونوں کو اس تہمت کا علم تھا۔

چھپاؤں بجز اس کے کہ وہ (عائشہؓ) کم عمر سیدھی سادھی ہیں۔ (ایسا ہوتا ہے) کہ آٹا گوندھ کر ویسے ہی چھوڑ کر سو جاتی ہیں بکری آکر کھالیتی ہے اس روز آنحضرتؐ منبر پر کھڑے ہوئے اور کہا کوئی ایسا ہے جو اس شخص (عبداللہ بن ابی) سے (جس نے تہمت لگائی اور میرے اہل کو تکلیف اور رنج دیا) میرا بدلہ لے۔ واللہ میں عائشہؓ کی بھلائی کے سوا کوئی برائی نہیں جانتا۔ اور تہمت لگانے والوں نے ایسے شخص (یعنی صفوان) کی بابت کہا ہے جس کی برائی دیکھی ہی نہیں گئی اور جب کبھی میرے گھر جاتا تو میرے ساتھ جاتا۔ اس وقت سعد بن معاذ انصاری کھڑے ہوئے تھے انھوں نے عرض کیا یا رسول اللہ اس شخص سے میں بدلہ لوں گا اگر وہ قبیلہ اوس میں کا ہے تو اس کی گردن ماروں گا اور اگر ہمارے ہی قبیلہ خزرج کا ہے تو جو آپؐ فرمائیں گے وہی کروں گا۔ حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ اس وقت سعد بن عبادہ جو قبیلہ خزرج کا سردار تھا کھڑا ہوگیا۔ اور یہ شخص اس سے پہلے بڑا صالح اور نیک تھا لیکن اس وقت اس کو خزرج کے قبیلہ کی حمیت نے ستایا اور سعد بن معاذ سے کہا کہ تونے جھوٹ بولا قسم ہے تو ہرگز نہیں مار سکتا پھر اسید بن حضیر جو سعد کا چچا زاد بھائی تھا اٹھا اور سعد بن عبادہ سے کہاکہ تونے جھوٹ بولا ہم اس شخص کو ضرور ماریں گے تو منافق ہے جو منافقوں کی طرف سے لڑتا ہے اور ان میں سخت تکرار ہونے لگی قریب تھاکہ جنگ و جدال ہو جائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر تھے اور ان کو چپ کرا رہے تھے آخر کار یہ خاموش ہوگئے عائشہؓ کہتی ہیں کہ میں اس روز بھی روتی رہی اور رات کو نیند تک نہ آئی میں دو رات اور ایک دن برابر روتی رہی صبح کو میرے پاس میرے باپ آئے اور خیال کیا کہ روتے روتے کہیں اس کا دل نہ پھٹ جائے۔

یہ میرے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک انصار کی عورت نے آنے کی
اجازت چاہی میں نے بلا لیا وہ بھی میرے پاس آکر رونے لگی اتنے میں
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آئے اور آکر بیٹھ گئے اور جب سے تہمت
لگائی گئی تھی میرے پاس کبھی نہیں بیٹھے تھے اور مہینہ بھر گزر چکا تھا مگر
میرے بارے میں کوئی وحی نازل نہیں ہوئی تھی۔ آپ نے بیٹھکر فرمایا
اشہد ان لا الا اللہ اور فرمایا اے عائشہؓ تیری وجہ سے مجھے ایسا ایسا (یعنی
بہت) رنج ہوا اگر تو بَری ہے تو اللہ تیری برأت (میں کچھ نہ کچھ ضرور)
اتارے گا اور اگر تجھ سے قصور ہوگیا ہے تو استغفار کر اور توبہ کر کیونکہ
بندہ جب اپنے قصور پر معترف ہوکر توبہ کرتا ہے تو اللہ اس پر مہربانی
کرتا ہے جب آپؐ یہ کہہ چکے تو (غصہ سے) میرے آنسو خشک ہوگئے حتیٰ
کہ ایک بھی نہ رہا۔ پھر میں نے والد سے کہا کہ رسول اللہ کو اس کا جواب
دو انہوں نے کہا واللہ میں نہیں جانتا کہ آپؐ سے کیا کہوں (میری کیا مجال
اور نہ مجھے ٹھیک معلوم ہے) پھر میں نے والدہ سے کہا انھوں نے بھی
یہی کہدیا اس وقت میں نے کہا (اور میں کم عمر تھی قرآن شریف اچھی
طرح سے یاد نہ تھا) کہ میں جان چکی ہوں کہ تمہارے دلوں میں (جو کچھ
لوگوں سے سنا ہے) بیٹھ چکا ہے اور اس کو تم نے سچا جان لیا ہے اب اگر
میں اپنے آپ کو اس سے بری کہوں تو تم یقین نہ کرو گے۔اور اگر اقرار
کروں اور اللہ جانتا ہے میں بَری ہوں تب تم سچا سمجھ لوگے اور اس کا
یقین کرلو گے واللہ تمہارے لئے اور کوئی مثال معلوم نہیں ہوتی بجز
یوسف کے باپؑ کی مثال کے کہ انھوں نے کہا تھا (فصبر جمیل و اللہ

لہ حضرت عائشہؓ رضی اللہ عنہا کو اتنا غصہ رنج و افسوس تھا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کا
نام بھی یاد نہ آیا اور جلدی میں یوسف کا باپ کہہ کر بات پوری کی

المستعان علیٰ ما تصفون[۸۲]) پھر میں اپنے بستر پر جا لیٹی اور اس وقت میں خیال کر رہی تھی کہ میں (اس تہمت سے بَری ہوں اور اللہ میری بَریت کو ضرور ظاہر) کرے گا لیکن گمان بھی نہ تھا کہ اللہ میرے بارے میں وحی نازل کرے گا بھلا میں اس قابل کہاں لیکن یہ خیال تھا اور امید کرتی تھی کہ رسولؐ اللہ کو اللہ خواب میں میری برئیت دکھا دے گا واللہ ابھی آپؐ اٹھے بھی نہ تھے اور جو وہاں موجود تھے ان میں سے بھی کوئی نہیں گیا تھا کہ آپؐ پر وحی نازل ہونے لگی اور جو اضطرابی حالت و کیفیت وحی کے وقت ہوتی تھی ہوئی اور پسینہ ٹپ ٹپ ٹپکنے لگا جب وحی اتر چکی تو آپؐ ہنسے اور سب سے پہلے یہ کہا کہ اے عائشہؓ اللہ نے تجھے بری (ظاہر) کر دیا۔ مجھ سے میری اماں نے کہا کہ حضرتؐ کے پاس جا اور سلام کر (اور ان کا شکریہ بجا لا) میں نے کہا میں نہیں جاتی اور سوائے اللہ کے کسی کی تعریف و شکر نہیں کرتی اللہ نے سورہ نور کی دس آیتیں اتاریں۔ اس آیت (ان الذین جاء و ا بالا فک(۱۱/۲۴) سے لے کر ولو لا فضل اللہ علیکم و رحمۃ و ان اللہ رؤف رحیم (۲۴ : ۲۰) تک۔

آپ اس افسوس ناک اور نہایت کرب انگیز روایت پر غور کیجئے اور سوچئے کہ اس سے خود نبی اکرمؐ کے متعلق دشمنان اسلام کس نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں۔ غور طلب امور یہ ہیں کہ

(۱) قرآن کریم نے عام مسلمانوں سے تاکید کی ہے کہ اگر وہ اس قسم کی بات سنیں تو ان کا پہلا رد عمل یہ ہونا چاہئے کہ یہ ایک کھلا ہوا جھوٹ

---

۸۲ ترجمہ۔ اچھا صبر ہی بہتر ہے اور جو تم بیان کرتے ہو اس کے بارے میں اللہ ہی سے مدد مطلوب ہے یہ جملہ حضرت یعقوبؑ نے اس وقت فرمایا جبکہ ان کے بیٹے حضرت یوسفؑ (اپنے چھوٹے بھائی) کی قمیض پر خون لگا کر لائے اور کہا کہ یوسفؑ کو تو بھیڑیا کھا گیا۔

ہے یہ بہت بڑا بہتان ہے ۔ لیکن اس روایت کی رو سے خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیوی کے خلاف تہمت لگتی ہے اور رسول اللہؐ کا رد عمل یہ ہے کہ آپؐ (اگر اسے یقینی طور پر سچ نہیں سمجھتے تو کم از کم) شک میں ضرور پڑ جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ اس بیمار بیوی کو اس کے میکے بھیج دیتے ہیں۔ جہاں اس کی حالت، اس صدمے کی وجہ سے، غیر سے غیر ہوتی چلی جاتی ہے۔

(۲) حضورؐ، نہ صرف یہ کہ اس پاکدامن بیوی کو صفائی کا موقع نہیں دیتے اسے اس کی اطلاع تک بھی نہیں کرتے۔ حتیٰ کہ وہ اسے محض اتفاقاً کسی عورت کی زبان سے سنتی ہیں۔

(۳) رسول اللہؐ اس کی تحقیق کے لئے کوئی قدم نہیں اٹھاتے۔ قرآن نے کہا تھا کہ الزام لگانے والوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ چار گواہ پیش کریں۔ آپؐ اس کا تقاضا بھی نہیں کرتے۔ اگر آپؐ پوچھتے بھی ہیں تو اپنی بیوی کے متعلق دوسروں سے پوچھتے ہیں۔

(۴) آپؐ کرتے بھی ہیں تو اتنا کہ منبر پر کھڑے ہو کر کہتے ہیں کہ اس شخص سے میرا بدلہ کون لیگا جس نے میرے اہل پر تہمت لگا کر اسے تکلیف پہنچائی ۔ اس کے بعد جب بات بڑھ جاتی ہے تو لوگوں کو خاموش کر دیتے ہیں حالانکہ قرآن نے یہ کہا تھا کہ اگر تہمت لگانے والا الزام ثابت نہ کر سکے۔ تو اسے سزا دی جائے ۔

(۵) ذرا اس نازک پہلو پر بھی غور کیجئے کہ اگر کسی شخص کی بیوی کے خلاف اس قسم کا الزام لگے اور وہ اس بات کو دل میں رکھ لے ۔ بیوی کو میکے بھیجدے اور اس کے بیمار ہونے کے باوجود اس کے پاس تک نہ بیٹھے تو اس بیوی کے کیرکٹر کے متعلق کیا رائے قائم کی جائے گی۔ ایک

طرف اس کا خاوند یہ کچھ کرے۔ اور دوسری طرف اس کے ماں باپ بھی یہ سب کچھ سن کر خاموش بیٹھے رہیں اور بیٹی کو اس صدمے سے اندر ہی اندر گھلنے دیں۔

(۶) رسول اللہؐ کا عمل امت کے لئے اسوۂ حسنہ ہے۔ اس روایت کی رو سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ کیا اس کے مطابق ہمیں بھی یہ کرنا چاہیئے کہ اگر کوئی شخص کسی کی بیوی پر تہمت لگائے تو وہ اس بات کو دل میں بٹھالے۔ کوئی تحقیق نہ کرے۔ بیوی کو اس کے میکے بھیجدے مہینہ بھر تک اس کی بات نہ پوچھے۔ خاموش انتظار کرتا رہے تا آنکہ اللہ اس پاکدامن کی برئیت ثابت کردے۔ اگر اللہ کی طرف سے ایسی شہادت نہ آئے تو پھر بیوی کو اسی حالت میں چھوڑ دیا جائے تاکہ وہ گھل گھل کر مر جائے۔

یہ ہے افک سے متعلق روایت۔ اور یہ ہیں اس روایت کے عواقب ہمارا روایت پرست طبقہ اس بات کو فخر سے بیان کرتا ہے کہ حضرت عائشہؓ کی پاکدامنی کی شہادت خود اللہ نے دی۔ لیکن نہیں سوچتا کہ اس باب میں خود رسول اللہؐ کی طرف جن باتوں کو منسوب کیا گیا ہے اس سے حضورؐ کی (معاذ اللہ) کیا پوزیشن سامنے آتی ہے۔ اور یہ روایات ہماری ان کتابوں میں درج ہیں جنہیں آسمان کے نیچے معتبر ترین کتابیں مانا جاتا ہے اور جن کے متعلق عقیدہ یہ بنا لیا گیا ہے کہ اگر ان کی صداقت میں شبہ کیا جائے تو یہ انکار حدیث ہے جس سے مسلمان، دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔

روایت افک مولفہ حکیم نیاز احمد فاضل دیو بند پر مولانا خالد مسعود اصلاحی کا تبصرہ

حکیم نیاز احمد صاحب کی کتاب تحقیق عمر عائشہؓ الصدیقہ، پر تبصرہ کیا جا چکا ہے ۔ اب حکیم صاحب کی دوسری کتاب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ ہی سے منسوب واقعہ افک کی تحقیق میں منظر عام پر آئی ہے ۔ سوا چار سو صفحات کی اس کتاب میں ان تمام روایات کو زیر بحث لایا گیا ہے جن میں واقعہ افک کی طرف کوئی اشارہ تک بھی ہے فاضل مصنف کے نزدیک اس سلسہ کی اصل روایت وہ ہے جو صحیح بخاری کی کتاب التفسیر میں سورہ نور کے تحت بیان ہوئی ہے ۔ اس روایت میں غزوہ بنی المصطلق سے واپسی پر حضرت عائشہؓ کا قافلہ سے پیچھے رہ جانا، صفوان بن معطلؓ کے ہمراہ سفر کر کے قافلہ کو پہنچنا، منافقین کا اس واقعہ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دلآزاری کا ذریعہ بنانا، حضرت عائشہؓ کا بیمار ہونا اور ایک ماہ بعد منافقین کے پروپیگنڈے پر مطلع ہو کر والدین کے گھر چلے آنا، رسول اللہؐ کا معاملہ کی تحقیق کے لئے حضرت علیؓ، اسامہؓ اور لونڈی

ہ حکیم نیاز احمد صاحب فاضل دیو بند نے یہ کتاب اپنے دو ساتھیوں مولانا الیف اللہ عثمانی فاضل دیو بند اور مولانا عظمت اللہ فاضل دیو بند کے ساتھ مل کر مرتب کی ہے اور ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کی عمر بوقت نکاح و رخصتی کے متعلق جتنی بھی روایات ملتی ہیں ان کی اصول حدیث کی روشنی میں زبردست چھان پھٹک کی ہے، نہایت مفصل اور نہایت عالمانہ کتاب ہے۔ اسی عنوان پر علامہ حبیب الرحمن صدیقی کاندھلوی نے بھی ایک مختصر رسالہ وزنی دلائل کے ساتھ تحریر فرمایا ہے، جسے الرحمن پبلشنگ ٹرسٹ کراچی نے شائع کیا۔ (طاہر)

بریرہؓ سے استفسار کرنا، آپؐ کی تقریر پر اوس اور خزرج میں جھگڑے کی نوبت آنا، حضرت عائشہؓ کی برءت پر مشتمل آیات کا نازل ہونا، حضرت ابو بکرؓ کا اپنے عزیز مسطحؓ کی کفالت سے ہاتھ کھینچ لینا کہ انہوں نے افک کے پروپیگنڈے میں حصہ لیا اور قرآن مجید میں اس پر زجر آنا بیان ہوا ہے۔ صحیح بخاری (اور صحیح مسلم میں بھی) یہ روایت ابن شہاب زہری کے واسطہ سے آئی ہے جنہوں نے اس کو عروہ بن الزبیر، سعید بن المسیب، علقمہ بن وقاص اور عبید اللہ بن عبداللہ سے روایت کیا ہے۔

فاضل مصنف نے روایت پر اس کی سند اور نفس مضمون دونوں کے لحاظ سے مفصل بحث کی ہے۔ ان کے نزدیک زہری کا عروہ بن الزبیر سے سماع ثابت نہیں سعید کے بارے میں روایات میں اضطراب ہے کہ یہ ابن المسیب ہیں یا ابن جبیر، عروہ اور علقمہ کی الگ روایت جو کتابوں میں نقل ہوئی ہے وہ انتہائی ضعیف سند سے ہے اور وہ ان تفصیلات سے بھی خالی ہے جو روایت زیر بحث میں ہیں اس میں روایت کا صرف آخری حصہ آیا ہے۔ سعید اور عبیداللہ کی کوئی الگ روایت اس موضوع پر نقل نہیں ہوئی۔ ان مشاہدات سے فاضل مصنف اس نتیجہ تک پہنچے ہیں کہ زہری نے بعض متفرق معلومات کو یک جا کر کے ان حضرات کی طرف نسبت کر کے بیان کر دیا ہے اور اس واقعہ کی حقیقتاً کوئی روایت ان کے سامنے نہ تھی۔ لہذا اس روایت کو زہری کا ایک طبع زاد افسانہ قرار دینا چاہیئے جو انہوں نے غالباً دوسری صدی ہجری کے پہلے ربع میں اس وقت تصنیف کیا اور اپنے شاگردوں میں پھیلایا جب واقعہ کے اصل شاہد یعنی صحابہ کرامؓ دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس سے قبل کے روایات کے مجموعوں میں یہ روایت موجود نہیں

موطا امام مالک موطا امام محمد، جامع معمر، مسند ابو داؤد طیالسی، کتاب الام وغیرہ میں یہ روایت بیان نہیں ہوئی حتیٰ کہ واقدی اور ابن سعد نے بھی اس کو قابل اعتناء نہیں سمجھا۔ صحاح کی ترتیب و تدوین چونکہ بہت بعد میں ہوئی اس لئے ان میں یہ روایت جگہ پاگئی۔

فاضل مصنف کے نزدیک زہری ایک ذوالوجہین شخصیت ہیں۔ ان کے والد زندگی بھر علویوں کی طرف سے بنی امیہ کے خلاف برسر پیکار رہے۔ علویوں کے ساتھ ان کی عقیدت زہری کو بھی ورثے میں ملی۔ شیعہ محققین کے نزدیک زہری شیعہ تھے۔ روایات میں ان کی سب سے زیادہ مستند سند اہل سنت کے نزدیک بھی الزھری عن علی بن حسین عن ابیہ عن جدہ ہے۔ دوسری طرف فکر معاش نے ان کو بنی امیہ سے وابستہ کر رکھا تھا۔ اپنی سیاست اور موقع پرستی کی بنا پر یہ دونوں گروہوں سے تعلقات رکھنے میں کامیاب رہے۔ تاہم علویوں سے اپنی وابستگی کے تقاضے سے حضرات شیخینؓ اور حضرت عائشہ صدیقہؓ کو بد نام کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے اسماء الرجال کی کتابوں میں زہری کو مدلس، مرسل اور مدرج لکھا گیا ہے اور فاضل مصنف کے نزدیک روایت افک کے گھڑنے میں بھی انہوں نے تدلیس، تلفیق، ارسال اور ادراج سب کمزوریاں ظاہر کی ہیں جن کی بناء پر ان کی یہ روایت قابل قبول نہیں ہے۔

روایت افک کو درایت کے اصول پر جانچا جائے تو فاضل مصنف کی رائے میں یہ بہت سی منکرات پر مشتمل نظر آتی ہے۔ اس میں شان رسولؐ اللہ کا استخفاف ہے، امہات المومنینؓ اور صحابہ کرامؓ کی توہین ہے اور روایت خلاف واقعہ متضاد امور پر مشتمل ہے۔ چونکہ روایت ایک

تاریخی واقعہ کو بیان کرتی ہے اور اس سے کوئی احکام برآمد ہنیں ہوتے اس لئے فاضل مصنف کے نزدیک اس پر حجیت حدیث اور تلقی بالقبول کے حوالے سے بحث کی راہ مسدود ہنیں ہوتی جبکہ یہ معلوم ہے کہ ائمہ نقد حدیث نے تاریخی روایات کی مناسب چھان بین ہنیں کی اور اپنی تمام تر محنت احکام کی احادیث پر صرف کی ہے ۔ فاضل مصنف کے اہم اعتراضات متن پر حسب ذیل ہیں:

ا۔ روایت میں زہری ایک بات کرتے ہیں اور اس پر وارد ہو سکنے والے کسی متوقع اعتراض کا جواب بھی دیتے جاتے ہیں۔ یہ انداز صرف اس روایت میں ہوسکتا ہے جو بعد میں گھڑی گئی ہو۔

ب۔ روایت میں سعد بن معاذ کا حوالہ بھی ہے اور آیت حجاب کے نزول کا بھی اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ غزوہ بنی المصطلق شعبان ۶ ھ میں پیش آیا ہوگا۔ جب کہ حقیقتاً یہ غزوہ شعبان ۵ ھ میں غزوہ احزاب سے پہلے پیش آیا تھا، اسی لئے اس میں منافقین بکثرت شریک ہوئے اور انہوں نے انصار اور مہاجرین میں جھگڑا پیدا کرکے متوقع جنگ احزاب کے لئے زمین ہموار کرنے کی کوشش کی تھی ، نیز بنو مصطلق کی غزوہ احزاب میں شرکت کسی طرح ثابت ہنیں ہے اور نہ منافقین ہی کے اندر اس غزوہ کے بعد کوئی دم خم رہ گیا تھا کہ وہ وہ حرکتیں کرتے جو بیان ہوئی ہیں ۔ پس آیت حجاب کا حوالہ خود ساختہ ہے ۔ لہذا اس سے متعلق واقعات اور ہودج کی سواری کے متعلق بیانات خلاف حقیقت ہیں۔

ج۔ صفوانؓ، واقدی کے بیان کے مطابق پہلی مرتبہ غزوہ احزاب میں شریک ہوئے اور ۹ ھ میں یا بقول دیگر ۵۴ ھ میں شہید ہوئے ۔ اس صورت میں یہ غزوہ بنی المصطلق میں شامل ہی نہ تھے ۔ مزید برآں اگر یہ

واقعہ افک کا کوئی کردار تھے تو انہیں قرآن کے ذریعے اپنی برءت نازل ہونے پر اسی طرح فخر کرنا چاہیئے تھا جیسا فخر حضرت عائشہؓ کا راویات میں دکھایا گیا ہے ، لیکن کسی روایت میں ان کا کوئی بیان نہیں اسی طرح قافلوں کے پیچھے چلنے کی جس ذمہ داری کو ان سے منسوب کیا گیا ہے وہ کسی دوسری مہم سے متعلق ثابت نہیں ۔ معلوم ہوتا ہے راوی نے افسانہ کو مکمل کرنے کی غرض سے یہ منصب تراشا۔ اور اسے صفوانؓ کی طرف منسوب کر دیا۔

د۔ غزوہ بنی المصطلق کا موسم انتہائی سردی کا تھا ۔ روایت کے واقعات اس طرح بیان ہوئے ہیں جیسے یہ واقعہ موسم گرما میں پیش آیا یہ بھی مابعدی ذہن کی اختراع کا نتیجہ ہے۔

ہ ۔ حضرت عائشہؓ کی فراست اور ذکاوت حس کے شواہد روایات میں بکثرت موجود ہیں لیکن روایت افک میں ان کا کردار بالکل مختلف دکھایا گیا ہے جیسے وہ ایک ماہ تک سورت حالات کو بھانپ ہی نہ سکی ہوں۔ یہ رویہ غیر حقیقی ہے اور ان کے معروف کردار سے کوئی مطابقت نہیں رکھتا۔

و۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت عائشہؓ سے ترک کلام اور بے التفاتی، ان کی بیماری میں مزاج پرسی نہ کرنا، پھر ارادہ طلاق کر لینا محض اس بنا پر کہ دشمنوں نے ایک افواہ اڑادی ، نعوذ باللہ آنحضرتؑ کی سادہ لوحی پر دلالت کرتا ہے۔ گویا آپؐ بھی اس پروپیگنڈے کا شکار ہوگئے جس کا کوئی ثبوت فراہم نہیں ہوا تھا۔ کیا اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ قرآن مجید نے کمزور مسلمانوں کو سورہ نور میں جو سرزنش کی اس کا رخ خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس کی طرف تھا؟ روایت کا یہ

پہلو آنحضرتؐ کے کردار کے منافی ہے۔
ز۔ آنحضرتؐ کا تحقیق و تفتیش کا انداز بھی غیر حقیقی ہے۔ اس طرح کے معاملات میں کیا کوئی شخص بارہ سالہ بچے (حضرت اسامہؓ کی عمر اس وقت بارہ سال تھی) اور لونڈی کی شہادت لیتا ہے؟ حضرت علیؓ کی زبان سے جو کچھ کہلوایا گیا ہے وہ بعد میں پیش آنے والے قصاص عثمانؓ کے متعلق واقعات کی روشنی میں کہلوایا گیا ہے۔
ح۔ دوسری امہات المومنینؓ کا کسی طرح سے روایت افک میں ملوث ہونا ثابت نہیں۔ لیکن یہ روایت ام رومانؓ کی زبان سے اسے سوکناپے کا شاخسانہ قرار دیتی ہے جو بالکل خلاف واقعہ ہے۔
ط۔ حمنہؓ کا ذکر روایت میں ہے کہ انہوں نے اپنی بہن ام المومنین حضرت زینبؓ بنت جحش کی طرفداری میں روایت افک میں حصہ لیا جبکہ حقیقت یہ ہے کہ غزوہ بنی المصطلق تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زینبؓ سے نکاح ہی نہ کیا تھا۔ اس لئے حمنہؓ کے لئے کوئی وجہ بہن کی حمیت و حمایت کی موجود نہ تھی۔

زہری کی روایت افک کے علاوہ اس واقعہ سے متعلق دوسری روایات کو بھی فاضل مصنف زیر بحث لائے ہیں اور انہوں نے سند اور متن دونوں کے لحاظ سے بحث کرکے دکھایا ہے کہ یہ روایات زہری کی روایت سے متاثر ہو کر وضع ہوئیں۔ اور امام بخاری نے بھی انہیں متابع میں بیان کر دیا۔ مثلاً مسروق کی روایت جو ام رومانؓ سے ہے وہ مسروق کا ارسال ہے کیونکہ انہوں نے ام رومانؓ کو نہیں دیکھا۔ پھر مسروق جب حضرت عائشہؓ سے متعدد امور میں خود روایت کرتے ہیں تو اس واقعہ کے بارے میں ان سے کیوں روایت نہ لی۔ سند کا تجزیہ یہ بتاتا ہے کہ ۶ھ

سے ۱۳۶ھ تک یہ روایت بصیغۂ راز واحد عن واحد چلی۔ اس کے تمام راوی کوفی ہیں، کوئی مدنی نہیں۔ فاضل مصنف کے نزدیک ایک ایسی روایت کو جو منقطع بھی ہو اور اس میں تدلیس بھی ہو محض اس بناء پر نہیں مانا جاسکتا کہ امام بخاریؒ نے اس کو قبول کر لیا۔

واقعہ افک کے بارے میں تمام روایات پر تنقید کرکے اور ان کے ضعف کو واضح کرنے کے بعد فاضل مصنف اپنا نقطۂ نظریوں بیان کرتے ہیں کہ جنگ احزاب سے قبل منافقین نے ایک طرف غزوہ بنی المصطلق میں مہاجرین اور انصار کے درمیان پھوٹ ڈالنے کی کوشش کی، دوسری طرف افک کا فتنہ اٹھاکر مسلمانوں کی اخلاقی ساکھ کو خراب کرنا چاہا تاکہ مسلمانوں کی جمعیت منتشر ہو جائے اور ان کو عرب کی متحدہ طاقت کے ذریعے شکست دی جا سکے۔ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں سازشوں کو ناکام بنا دیا۔

افک کے بارے میں مسلمانوں کو زبان تک کھولنے سے قرآن مجید میں منع کر دیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس واقعہ کو صحابہ کرامؓ نے ہمیشہ کے لئے بھلا دیا اور اس کی کوئی روایت قرآن مجید کی خلاف ورزی کے ڈر سے نہیں کی۔ اگر زہری یہ روایت وضع نہ کرتے اور شیعہ اس کو ہوا نہ دیتے تو کوئی وجہ نہ تھی کہ اس کا کوئی تذکرہ ہماری کتابوں میں ہوتا۔ جہاں تک قرآن مجید کی آیات کا تعلق ہے ان کا مدعا سمجھنے کے لئے اس واقعہ کی تفصیلات کا ہونا قطعاً ضروری نہیں۔ چونکہ نہ قرآن مجید میں اس بات کا کوئی اشارہ ہے نہ کسی معتبر حدیث میں بیان ہوا کہ یہ واقعہ کیا تھا اور کس کے بارے میں تھا اس لئے حضرت عائشہؓ کی ذات سے اس کو متعلق کرنے کی بھی کوئی معقول وجہ موجود نہیں۔ یہ واقعہ کسی اور صحابی اور

صحابیہ کے بارے میں بھی پیش آسکتا تھا۔ اس کے امہات المومنینؓ سے متعلق نہ ہونے کی ایک دلیل فاضل مصنف کے نزدیک یہ بھی ہے کہ یہ شتم رسول اور طعن فی الرسول کا ایک کیس ہوتا جس کی سزا قتل ہے چونکہ نہ قتل کا کوئی حکم ہوا اور نہ آنحضرتؐ کی طرف سے کسی کو معاف کرنا ثابت ہے اس لئے یہ واقعہ حرم نبیؐ سے متعلق تھا ہی نہیں۔

یہ کتاب لکھ کر فاضل مصنف نے خیر القرون کے واقعات کو جانچنے کے لئے ایک نیا راستہ کھولا ہے۔ اس تحقیق سے یہ سبق بھی ملتا ہے کہ شیعوں کی روایت قبول کرنے کے بارے میں آدمی کو ہمیشہ حد درجہ محتاط ہونا چاہیئے خواہ یہ روایت صحاح میں بھی موجود ہو۔ جامعین حدیث نے ان کی روایات قبول کر کے ان کو وہ ثقاہت دے دی جس کے وہ مستحق نہ تھے۔ (سہ ماہی تدبر نمبر ۱۸ جولائی ۱۹۸۶ء ادارہ تدبر قرآن و حدیث رحمان اسٹریٹ، مسلم کالونی سمن آباد لاہور)

۳۔ روایت افک اور مولانا شبیر احمد ازہر میرٹھی شیخ الحدیث جامعۃ الرشاد

تدبر کی گذشتہ اشاعت (سلسلہ نمبر ۱۸، جولائی ۱۹۸۶ء) میں ہم نے حکیم نیاز احمد صاحب کی تصنیف روایت افک، کا تعارف کراتے ہوئے ان کے ان دلائل کا خلاصہ پیش کیا تھا جن کی بنا پر وہ افک کے واقعہ کی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے نسبت کو غلط مانتے ہیں۔ حال ہی میں جامعۃ الفلاح، بلریاگنج، ضلع اعظم گڑھ (انڈیا) سے ہمیں مولانا شبیر احمد ازہر میرٹھی، شیخ الحدیث جامعۃ الرشاد، اعظم گڑھ کی تفسیر سورہ نور موصول ہوئی ہے جس میں فاضل مصنف نے آیات افک کے ذیل میں روایات افک پر بصیرحاصل بحث کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ یہ داستان

شیعوں نے سیدہ عائشہ صدیقہؓ کو مطعون کرنے کے لئے گھڑی ہے ، حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ سورہ نور کی آیات افک میں منافقین کی پھیلائی ہوئی ان تہمتوں کی طرف اشارہ ہے جو وہ مسلمانوں کی اخلاقی ساکھ کو خراب کرنے کے لئے پھیلایا کرتے تھے۔

فاضل مصنف کے بیشتر دلائل حکیم نیاز احمد صاحب کے دلائل سے ملتے ہیں اس لئے ان کے اعادہ کی ضرورت نہیں ۔ البتہ بعض پہلو قارئین کے لئے افادہ کا باعث ہوں گے اس لئے صرف ان کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

ا۔ فاضل مصنف کی تحقیق میں روایت زہری ، روایت ابو اسامہؓ اور روایت ام رومانؓ تینوں منقطع اور مرسل روایتیں ہیں جن کا آپس میں متعدد پہلوؤں میں اختلاف ہے ۔ زہری کی روایت ، " راوی معلوم مروی مجہول " کے قبیل کی ہے ۔

ب۔ آیات افک کے نزول کے موقع کی تین روایتوں میں الگ الگ تفصیل بیان ہوئی ہے ۔ اس اختلاف کی توجیہہ ممکن نہیں اس لئے تینوں روایتیں قابل رد ہیں۔

ج۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اسامہؓ اور بریرہؓ سے گواہی لینا منسوب کیا گیا ہے جبکہ اس وقت اسامہؓ کے والد حضرت زیدؓ بھی زندہ تھے۔ گواہی کے لئے ایک بچے کے بجائے وہ زیاد موزوں تھے۔ بریرہؓ فتح مکہ کے بعد حضرت عائشہؓ کے پاس آئیں۔ ان کی گواہی تین سال پہلے کے واقعہ میں کیسے لی جاسکتی تھی؟

د ۔ یہ تصور محال ہے کہ حضرت عائشہؓ کا قافلے سے بچھڑ جانا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے علم میں دوپہر کے پڑاؤ تک بھی نہ آسکا۔ حالانکہ معمولاً ام المومنینؓ کا اونٹ سفر میں آپؐ کے اونٹ کے ساتھ ہوتا اور

آپؐ باتیں کرتے ہوئے چلتے ۔ دوران سفر نماز فجر کے لئے قافلہ رکا اس وقت یہ کیوں معلوم نہ ہوسکا کہ ام المومنینؓ پیچھے رہ گئی ہیں۔ نیز جب وہ آملیں تو کسی روایت سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ آپؐ سے کوئی پوچھ گچھ ہوئی یا نہ ہوئی ۔ آخر ایک ماہ بعد اس واقعہ کی جستجو کیوں ہوئی؟

ہ ۔ یہ واقعہ شعبان میں پیش آیا تھا۔ ایک ماہ بعد گویا رمضان میں یہ تحقیقات ہوئی ۔ ہر رمضان میں جبرئیل امینؑ قرآن مجید کا مذاکرہ کرتے ۔ آخر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مہینہ بھر وحی کا انتظار کیوں رہا، آپؐ نے جبریل امینؑ ہی سے کیوں دریافت نہ کر لیا ۔ نیز انتظار کاہے کا تھا۔ تہمت کے احکام تو پہلے سے نازل ہوچکے تھے آپؐ نے ان کے مطابق کیوں عمل نہ فرمایا؟

و ۔ ایسا واقعہ اگر پیش آتا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے انتہائی رنج و الم کا باعث ہوتا ۔ اس رنج و کرب کے زمانہ میں حضرت جویریہؓ سے آپؐ نے شادی کیسے کرلی؟

فاضل مصنف نے زہری کو اس افسانہ کا مصنف قرار نہیں دیا، بلکہ یہ کہا کہ انہوں نے سنی سنائی باتیں روایت کر دیں اور امام بخاریؒ نے یہ تحقیق کیئے بغیر کہ یہ مرسل روایتیں ہیں ان کو اپنی کتاب میں جگہ دے دی ہمارے نزدیک اس معاملے میں حکیم صاحب کی تحقیق کے شواہد زیادہ موجود ہیں۔ فاضل مصنف کے نزدیک روایت میں حمنہؓ بنت جحشؓ اور حسان بن ثابتؓ کو جو واقعہ افک کے پھیلانے کا ذمہ دار قرار دیا گیا ہے تو یہ بھی شیعوں کی خباثت اور ان صحابہؓ سے نفرت کے باعث ہے حضرت حسانؓ نے حضرت علیؓ کے ہاتھ پر بیعت نہیں کی تھی بلکہ مدینہ چھوڑ کر حضرت معاویہؓ کے پاس شام چلے گئے تھے ۔ حمنہؓ حضرت طلحہؓ کی

زوجیت میں تھیں اور شیعہ طلحہؓ کو حضرت علیؓ کا مخالف اور جنگ جمل میں شریک قرار دیتے ہیں اس لئے ان کی زوجہ کو مطعون کرنے کا انہوں نے روایت افک میں ایک بہانہ پیدا کیا ہے۔

میرٹھی صاحب اور حکیم صاحب کی تحقیقات اصل مسئلہ کے بارے میں کلی طور پر متفق ہیں اور ان کا یہ مستفاد بہایت خوش آئند اور صحابہ کرامؓ کے دامن کو شیعوں کے اڑائے ہوئے چھینٹوں سے پاک کرنے والا ہے۔

میرٹھی صاحب کی قرآن مجید کی مکمل تفسیر سورتوں کی شکل میں مکتبہ ازہریہ، رائے دھنہ برانچ کھٹور، ضلع میرٹھ (انڈیا) نے شائع کی ہے۔

(سہ ماہی تدبر شمارہ ۱۹ ۔ نومبر ۱۹۸۶ء)

افک کے متعلق کچھ مزید گذارشات اور تین مثالوں کا اضافہ

از مفتی محمد طاہر مکی

آیہ افک کے شان نزول میں بھی سورہ تحریم کے شان نزول کی طرح ایسی ایسی عجیب و غریب روایات بیان کی گئی ہیں جنھیں دیکھ کر رائی کو پہاڑ بنانے کا محاورہ سامنے آجاتا ہے اور حیرت اس پر ہوتی ہے کہ جن مقدس شخصیات کے قصے اس ضمن میں بیان کئے جاتے ہیں (بلکہ حضرت عائشہؓ و حضرت ام سلمہؓ سے تو آپ بیتیاں بیان کروائی گئی ہیں) ان کو اپنی کتابوں میں درج کرنے والے حضرات نے اتنا غور نہیں کیا کہ اس طرح ان کی پاکی بیان کی جارہی ہے یا یہ ان کی ہجو ملیح (تعریف کے رنگ میں برائی) ہے اس سے پہلے جب ہم یہود و ہنود کے اپنے بزرگوں کے متعلق بیان کردہ قصے پڑھتے تھے جن سے ان کی توہین کا پہلو نکلتا تھا مثلاً حضرت داؤدؑ کا ایک عورت پر عاشق ہو جانے اور اسکے شوہر کو مروادینے کا قصہ یا ہندوؤں کے ہاں کرشن جی کی گوپیوں سے چھیڑ چھاڑ کا قصہ تو حیرت ہوتی تھی کہ یہ لوگ اپنے بزرگوں کی تعریف کے نام پر کیسے کیسے قصے سناتے ہیں لیکن جب اپنے ہاں افک وغیرہ کے نام پر اسی قسم کے قصے پڑھے تو حیرت جاتی رہی اور اندازہ ہوا کہ جو لوگ بھی عقل سے کام نہیں لیتے وہ ایسی ہی حماقتیں کرتے ہیں، چاہے اپنے ہوں چاہے پرائے۔ سچ کہا ہے قرآن کریم نے **ویجعل الرجس علی الذین لا یعقلون** (۱۰ / ۱۰۰) جو لوگ عقل سے کام نہیں لیتے اللہ تعالیٰ انہیں

حماقت کی گندگی میں پھینک دیتا ہے۔

آیہ افک کے شان نزول میں دو قصے عام طور پر مشہور ہیں۔

ایک حضرت عائشہ صدیقہؓ کی آپ بیتی کے نام سے، دوسرا حضرت ماریہ قبطیہؓ کے حوالہ سے (جس طرح سورہ تحریم کے شان نزول میں بھی انہیں دونوں امہات المومنینؓ کا نام استعمال کیا گیا ہے) - ان کے علاوہ حضرت عائشہ صدیقہؓ کی آپ بیتی سے ملتی جلتی ایک آپ بیتی حضرت ام سلمہؓ کی طرف منسوب کر کے بیان کی جاتی ہے ---- اور جس طرح حضرت عائشہؓ صدیقہ و حضرت ماریہ قبطیہؓ کے متعلق الزام تراشی کے قصے بیان کئے جاتے ہیں اسی طرح حضرت ام ایمنؓ - حضرت فاطمہؓ اور حضرت علیؓ کے متعلق بھی الزام تراشی کے قصے کتب روایات میں درج ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ان قصوں میں سے صرف دو امہات المومنین (حضرت عائشہ صدیقہؓ و حضرت ماریہ قبطیہؓ) کے متعلق قصوں کو آیہ افک کا شان نزول قرار دینے میں اسقدر دلچسپی کیوں لی جاتی ہے؟ باقی چار قصوں کے مقابلہ میں ان دو قصوں کو کیا وجہ ترجیح حاصل ہے؟

جہاں تک ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کے نام سے بیان کردہ داستان ہے تو اس کے راوی ابن شہاب زہری ہیں جن کی شیعیت اب واضح ہو چکی ہے۔ اس داستان کی کچھ حقیقت آپ علامہ تمنا کے مضمون میں پڑھ چکے ہیں اور کچھ شیخ الحدیث مولانا شبیر میرٹھی اور حکیم نیاز احمد سے متعلقہ تبصروں میں ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ مزید تفصیل میرٹھی صاحب اور حکیم صاحب کی کتابوں میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔ باقی پانچ قصوں پر

مختصر نقد و نظر کا فریضہ ہم ادا کئے دیتے ہیں۔ اور ہمارے بعد آنے والے انشاء اللہ ان تمام مصنوعی قصوں کی حقیقت مزید طشت از بام کر سکیں گے

افک کا دوسرا افسانہ

قصہ ماریہ قبطیہؓ

جس طرح حضرت عائشہؓ صدیقہ سے متعلق قصے کے روح رواں ابن شہاب زہری شیعہ تھے اسی طرح حضرت ماریہؓ قبطیہ کے قصے میں بھی شیعہ پیش پیش ہیں۔ مشہور شیعہ مفسر مقبول احمد دہلوی جن کی تفسیر کی توصیف میں برصغیر پاک و ہند کے تمام اہم شیعہ مجتہدین و ذاکرین نے تقریظات رقم کی ہیں جو اس تفسیر کی ابتدا میں موجود ہیں، اپنی تفسیر مقبول میں شیعوں کی سب سے قدیم اور مستند تفسیر قمی سے روایت نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

" یہ آیت ام المومنین ماریہؓ قبطیہ کی شان میں اور جو الزام عائشہ نے ان کو لگایا تھا اس کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔" چنانچہ جناب امام محمد باقرؒ سے اسی تفسیر میں یہ روایت ہے کہ جب ابراہیم فرزند جناب رسولؐ خدا کا انتقال ہوگیا اور آنحضرت کو بہت سخت رنج ہوا تو عائشہ نے کہا کہ آپ رنج کس کا کرتے ہیں؟ وہ تو جریح قبطی کا بیٹا تھا۔ پس آنحضرتؐ نے علی مرتضیٰ کو بھیجا اور جریح کے قتل کا حکم دیا۔ علیؑ تلوار لے کر گئے۔ جریح اس وقت ایک ایسے باغ میں تھا جس کے چاروں طرف چہار دیواری تھی اور دروازہ

بند تھا۔ حضرتؑ نے جا کر دروازہ کھٹکھٹایا اور جریح دروازہ کھولنے آیا۔ مگر حضرتؑ کے چہرہ پر غضب کے آثار دیکھ کر اس نے دروازہ نہ کھولا اور پچھلے پاؤں پلٹا۔ حضرتؑ جھپٹ کر دیوار پر چڑھ گئے اور باغ میں اترے اور اس کے پیچھے چلے اور جریح پیٹھ پھیر کر بھاگا اور جب اسے اندیشہ ہوا کہ حضرتؑ نے آلیا تو کھجور کے ایک درخت پر چڑھ گیا، حضرتؑ بھی درخت پر چڑھ گئے مگر جب اس کے قریب گئے تو اس نے اپنے آپ کو درخت سے گرا دیا اور اس کا ستر کھل گیا۔ تو یکایک دیکھتے کیا ہیں کہ نہ اس کے مرد کی علامت ہے اور نہ عورت کی۔ حضرت امیر المومنینؑ جناب رسول اللہؐ کی خدمت میں پلٹ آئے۔۔۔۔ اور عرض کی کہ اُس کی قَسم ہے جس نے آپ کو حق کے ساتھ معبوث کیا کہ جریح میں نہ مرد کی علامت ہے نہ عورت کی۔ آنحضرتؐ نے یہ سن کہ فرمایا خدا کا شکر ہے جس نے ہم اہلبیت سے بدی اور بدنامی کو دور رکھا۔ (ترجمہ و تفسیر مقبول صفحہ ۶۹۹ مطبوعہ افتخار بکڈپو کرشن نگر لاہور)

حضرت ماریہؓ قبطیہ پر الزام تراشی کا یہ قصہ امام مسلم کے ہاں اور مستدرک حاکم میں بھی موجود ہے اور حاکم نے اس روایت میں فقال اھل الافک و الزور کے الفاظ دے کر شیعوں کے اس نقطہ نظر کی تائید کی ہے کہ آیہ افک کا شان نزول حضرت ماریہؓ کا قصہ ہے۔

پہلے آپ امام مسلم کی بیان کردہ روایت ملاحظہ فرمائیں۔

"حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ ایک آدمی پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ام ولد (وہ لونڈی جس سے بچہ پیدا ہو یعنی حضرت ماریہ قبطیہؓ

جن سے ابراہیم بن رسول اللہ پیدا ہوئے تھے) کے ساتھ تہمت لگائی جاتی تھی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؑ سے فرمایا۔ جاؤ اور اس کی گردن مار دو، حضرت علیؑ اس کے پاس گئے تو دیکھا کہ وہ ایک تالاب میں ٹھنڈک حاصل کرنے کے لئے گھسا ہوا تھا۔ حضرت علیؑ نے اس سے کہا کہ باہر نکل! اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے باہر گھسیٹ لیا، دیکھا تو اس کا تو آلہ تناسل ہی نہیں تھا، وہ خصّی تھا۔ حضرت علیؑ قتل کرنے سے باز رہے اور آنحضرتؐ کے پاس آکر عرض کیا کہ وہ تو مقطوع الذکر ہے۔ اسکے تو آلۂ تناسل ہی نہیں ہے"

(صحیح مسلم۔ کتاب التوبہ۔ باب براءۃ حرم النبی صلی اللہ علیہ وسلم عن الریبہ ۲/ ۳۶۸ (لوگوں کی الزام تراشی سے رسول اللہ کی حرم محترم کی برأت کا باب) مطبوعہ نور محمد آرام باغ کراچی ص۳۶۸ ج ۲)

اب مستدرک حاکم کی روایت ملاحظہ ہو:

ترجمہ:۔ ہم سے علی ابن حمشاد نے حدیث بیان کی جو ثقہ راوی ہیں انہوں نے کہا کہ ہم سے احمد بن علی ابار نے حدیث بیان کی۔ انہوں نے کہا کہ ہم سے حسن بن حماد سجادہ نے حدیث بیان کی، انہوں نے کہا کہ مجھ سے یحیٰی ابن سعید اموی نے حدیث بیان کی، انہوں نے کہا کہ ہم سے ابو معاذ سلیمان ابن الارقم انصاری نے حدیث بیان کی، انہوں نے عروہ سے انہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے، بیان کیا کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا "ماریہؓ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو تحفہ میں بھیجی گئی تھیں اور ان کے ساتھ ان کا چچازاد بھائی بھی"۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ حضور اکرم

صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے مقاربت فرمائی تو انہیں حمل رہ گیا۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ اس کے بعد حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم ان سے (حمل کی بناء پر) الگ رہے (تاکہ حمل کو نقصان نہ پہنچے) اور انہیں ان کے چچا زاد بھائی کے پاس بھیج دیا۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ اہل افک اور اہل زور نے کہا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو بیٹے کی ضرورت تھی لہذا انہوں نے دوسرے کے بیٹے پر دعویٰ کر دیا (کہ میرا بیٹا ہے) ابراہیمؑ کی ماں کے دودھ کم تھا۔ آپ نے اس کے لئے دودھ دینے والی بکری خرید دی چنانچہ اسی کا دودھ اسے پلایا جاتا تھا۔ بچہ پر خوب گوشت چڑھ گیا۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ایک دن بچہ کو لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میرے ہاں آئے اور فرمانے لگے۔ کیوں کیسا لگتا ہے تو میں نے کہا "جسے بکری کا گوشت غذا میں دیا جائے گا اس پر گوشت کیوں نہ چڑھے گا" ۔ آپ نے فرمایا کہ مشابہت نہیں دیکھتیں، مجھے وہی رشک سوار ہوا جو عورتوں کو ہوا کرتا ہے۔ میں نے کہہ دیا، مجھے تو کوئی مشابہت نظر نہیں آتی۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی وہ بات پہنچی جو لوگ آپس میں کیا کرتے تھے تو آپؐ نے حضرت علیؓ سے فرمایا "یہ تلوار لو اور جاؤ ماریہؓ کا چچا زاد بھائی جہاں بھی ملے اس کی گردن اڑا دو" حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ حضرت علیؓ گئے تو وہ ایک باغ میں کھجور کے درخت پر چڑھا ہوا پکی کھجوریں توڑ رہا تھا۔ حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ اس نے حضرت علیؓ کو دیکھا اور ان کے ہاتھ میں تلوار دیکھی تو اسے کپکپی طاری ہوگئی اور اس کی لنگوٹی گر پڑی تو یک بارگی

(حضرت علیؓ نے دیکھا) اللہ نے اس کے وہ کچھ پیدا ہی نہیں فرمایا تھا جو مردوں میں ہوتا ہے۔ محض ایک سپاٹ جگہ تھی (یعنی وہ مخنث آدمی تھا)
(مستدرک حاکم مطبوعہ دکن جلد چہارم صفحہ ۳۹)

تبصرہ: امام حاکم کے متعلق تو ماہرین رجال کو اعتراف ہے کہ یہ شیعہ تھے اسلئے ایک شیعہ کی روایت پر زور تنقید صرف کرنے کے بجائے ہم امام مسلم کی روایت پر علامہ ضیاء الدین کرمانی نے جو تنقید اپنی بہترین کتاب "ابدی پیغام کے آخری پیغامبر" میں کی ہے اسے درج کر دیتے ہیں کہ

متفق گردید رائے بو علی بارائے من

امام مسلم کی روایت پر ایک مرتبہ پھر نظر ڈال لیجئے۔ اسکے بعد کرمانی صاحب کا یہ تبصرہ ملاحظہ فرمایئے:

"حضرت ماریہ قبطیہؓ کو مابور نامی ایک شخص کے ساتھ "متہم" کیا جا رہا تھا جو غالباً ان کے رشتے کے بھائی ہوتے تھے اور ایمان لا چکے تھے۔ لوگوں میں اس بات کا چرچا ہوا اور آنحضرتؐ کو بھی اس کا علم ہوا تو آپؐ نے حضرت علیؓ سے فرمایا کہ جاؤ اور اس شخص کی گردن اڑا دو۔ حضرت علیؓ نے انہیں ایک کنویں پر بیٹھا ہوا پایا اور آپؓ نے تہمد پکڑ کر انہیں اپنی طرف کھینچا تو پتہ چلا کہ وہ مخنث ہیں۔ یہ دیکھ کر حضرت علیؓ نے انہیں چھوڑ دیا اور آنحضرتؐ کو اس بات سے مطلع کیا پھر آپؐ نے کچھ نہ کہا!

مسلم شریف کی اس روایت سے عام آدمی کے ذہن میں قدرتی طور پر یہ سوالات پیدا ہوں گے:۔

۱۔ کیا محض ایک افواہ پر اتنا شدید رد عمل مناسب تھا؟

۲۔ کیا آنحضرتؐ نے یہ حکم دینے سے پہلے، حقیقت حال معلوم کرنے کی کوشش فرمائی تاکہ ملزم کو کم از کم اپنی صفائی پیش کرنے کا موقع تو ملتا؟

۳۔ یہ قطعی حکم دینے سے پہلے، کیا ضروری قانونی کارروائی کی گئی؟

۴۔ اس معاملے میں، انصاف کے عام تقاضے پورے کرنے کے بجائے، کیا دو معیاروں سے کام نہیں لیا گیا؟ (یعنی دوسروں کو تو یہ حکم ہے کہ بلا تحقیق کسی پر الزام نہ لگاؤ مگر رسول اکرمؐ نے خود بلا تحقیق ذاتی معاملہ میں جذباتی ہو کر ایک شخص کے قتل کا حکم دیدیا (نعوذ باللہ)

۵۔ کیا آنحضرتؐ کا یہ قطعی حکم بھی کسی "وحی غیر متلو" (وہ وحی جو تلاوت کرنے کے لئے نہ ہو) پر مبنی تھا جو بالآخر غلط ثابت ہوئی؟ (کیوں کہ ہمارے روایت پرست حضرات کا کہنا ہے کہ حضورؐ کی ہر بات وحی سے ہوتی تھی)

٦۔ اگر حضرت علیؓ نے اس حکم کے مطابق عمل کیا ہوتا تو ایک بے گناہ شخص کے بلا وجہ قتل کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی؟ (رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر یا کسی اور پر؟)

۷۔ جب حضرت علیؓ کو ایک حکم، راویوں کے واسطہ سے نہیں، بلکہ براہ راست رسول اکرمؐ سے ملا تھا تو انہوں نے اس معاملے میں اپنی سوجھ بوجھ اور اختیار تمیزی سے کیوں کام لیا؟

۸۔ اگر براہ راست رسول اکرمؐ سے حکم سننے کے بعد بھی حضرت علیؓ نے اپنے فہم کی بنا پر اس حکم پر عمل نہیں کیا تو پھر ہمیں، رسول اکرمؐ سے مروی ان احکامات کی تعمیل میں جو قابل اعتبار یا ناقابل اعتبار راویوں

کے ایک طویل سلسلے سے ہم تک پہنچے ہیں، اپنے اختیار تمیزی سے کام لینے سے کیوں منع کیا جاتا ہے ؟

۹۔ پھر اپنی حرم محترم کے معاملہ میں تمام صحابہؓ میں سے اپنے چھوٹے داماد حضرت علیؓ ہی کو یہ کام کیوں سپرد کیا ؟ کیا اس طرح راوی حدیث آئندہ موقع پر حضرت علیؓ کو رسول اللہؐ کی ایک اور حرم محترم ام المومنین حضرت عائشہؓ کے مقابلہ پر نمایاں کرنے کے لئے ماحول تیار کر رہا ہے ؟

۱۰۔ اس نام نہاد " صحیح حدیث " کی بنیاد پر جو مسلم جیسے پایہ کے محدث نے نقل کی ہے، ہم سے حضرت علیؓ اور آنحضرتؐ دونوں میں سے کس کے " اسوہ " کے اتباع کی توقع کی جانی چاہیئے ؟

ان دس سوالات کے علاوہ، سب سے بڑا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جو شخص اس قسم کے بیانات کو بکسی پس و پیش کے بغیر بلا تکلف قبول کر لیتا ہے، اس پر دوسرے امور میں کس حد تک اعتماد کیا جا سکتا ہے ؟

اب ہمارے محدثین پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ ان میں سے ہر سوال کا معقول جواب دے کر نوجوان نسل کو مطمئن کرنے کی کوشش کریں۔

یہاں قارئین کے سامنے ایک بات کی وضاحت ضروری ہے۔ ایک سیرت نگار کے لئے اس مسئلے پر اتنی تفصیل سے قلم اٹھانا کس حد تک ضروری تھا۔ تو اصل بات یہ ہے کہ بعض نام نہاد " صحیح " احادیث نہ صرف ہمارے دین کی بہت مسخ شدہ تصویر پیش کرتی ہیں بلکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے کردار کو بھی بری طرح داغدار بنا دیتی ہیں۔ "

(ابدی پیغام کے آخری پیغام بر مولفہ سید ضیاء الدین کرمانی باب نمبر ۱۸ صفحہ ۳۱۴)

اس تبصرہ کے بعد اس روایت کی تردید میں اور کچھ لکھنے کی ضرورت ہنیں ہے۔ اسی سے واضح ہو جاتا ہے کہ حضرت ماریہؓ سے متعلق قصہ بھی جعلی اور مصنوعی ہے

افک کا تیسرا افسانہ

حضرت ام سلمہ کی آپ بیتی

اب ہم حضرت ام سلمہؓ کی طرف منسوب آپ بیتی پر نظر ڈالتے ہیں جو حضرت عائشہ صدیقہؓ سے منسوب آپ بیتی سے ملتی جلتی ہے۔

سیرت کی اولین کتاب سیرۃ ابن اسحاق میں یہ داستان بیان کی گئی ہے۔ اسکے بعد سیرت ابن ہشام اور بلا ذری کی الساب الاشراف میں بھی اسے بیان کیا گیا ہے۔

ابن جریر اور ابن ہشام کا بیان ہے کہ ابھی مدینے کی طرف عام ہجرت کی نوبت نہ آئی تھی اور صرف دوسری بیعت عقبہ ہی ذی الحجہ ۱۲ھ بعد بعثت میں ہوئی تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رضاعی بھائی اور آپؐ کی پھوپھی برہ بنت عبدالمطلب کے صاحبزادے حضرت ابو سلمہؓ نے مدینے کی طرف ہجرت کرنے کا فیصلہ کر لیا، کیونکہ ہجرت حبشہ سے مکے واپس آنے کے بعد وہ کفار مکہ اور خود اپنے قبیلے بنی مخزوم کے مظالم سے تنگ آچکے تھے۔ مگر ظالموں نے ان کو بخیریت نکلنے بھی نہ دیا۔

۵۷۱

حضرت ام سلمہ کی داستان مصیبت

ابن ہشام نے محمد بن اسحاق کے حوالہ سے خود ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی اپنی روایت نقل کی ہے کہ: جب میرے شوہر ابو سلمہ مدینے جانے لگے تو میں بھی ان کے ساتھ اپنے بچے سلمہ کو گود میں لیے ہوئے نکلی، اور وہ مجھے اور میرے بچے کو اونٹ پر بٹھا کر اس کی نکیل تھامے ہوئے چل پڑے۔ میرے میکے کے لوگوں (بنی مغیرہ) نے ان کو جاتے دیکھا تو راستہ روک کر کھڑے ہوگئے اور کہنے لگے " تم خود تو ہمارے قابو سے باہر ہوگئے ہو۔ جہاں تمہارا جی چاہے جاؤ۔ مگر اپنی اس لڑکی کو ہم تمہارے ساتھ جگہ جگہ ماری ماری پھرنے کے لیے کیسے چھوڑ دیں ؟ " چنانچہ انہوں نے اونٹ کی نکیل ابو سلمہؓ کے ہاتھ سے چھین لی اور مجھے واپس لے چلے ادھر ابو سلمہؓ کے خاندان والے (بنی عبدالاسد) بگڑ کھڑے ہوئے اور انہوں نے آکر کہا کہ تم نے جب ہمارے آدمی سے اپنی لڑکی کو چھین لیا، تو ہم اپنے لڑکے سلمہ کو اس کے پاس کیوں چھوڑ دیں؟ یہ کہہ کر انہوں نے میرے بچے کو زبردستی مجھ سے چھین لیا اور اس چھینا جھپٹی میں میرے بچے کا ہاتھ اتر گیا۔ (بلاذری کا بیان ہے کہ مرتے دم تک اس بچے کا ہاتھ اترا رہا) اب حال یہ تھا کہ بچہ وہ لے گئے، بنی مغیرہ نے مجھے اپنے یہاں لے جا کر بند کر دیا اور ابو سلمہ بے چارے تن تنہا مدینہ کی طرف روانہ ہوگئے۔ تقریباً ایک سال تک میرا یہ معمول رہا کہ روز نکل کر ابطح میں جا بیٹھتی اور روتی رہتی۔ ایک روز بنی مغیرہ میں سے ایک شخص نے جو میرے چچا زاد رشتہ

داروں میں سے تھا مجھے اس حالت زار میں دیکھ لیا اور اسے مجھ پر رحم آ گیا۔ اسنے جا کر بنی مغیرہ سے کہا" اس مسکین کو کیوں نہیں جانے دیتے ؟ تم نے اسے اس کے شوہر سے بھی جدا کر دیا اور بچے سے بھی" آخر کار انہوں نے مجھ سے کہا اگر تو اپنے شوہر کے پاس جانا چاہتی ہے تو چلی جا۔ بنی عبدالاسد نے میرا بچہ بھی مجھے واپس دے دیا۔

حضرت عائشہ رض کی طرح کی آپ بیتی

میں بچے کو لئے ہوئے اپنے اونٹ پر اکیلی مدینے کی طرف روانہ ہوگئی تنعیم کے قریب پہنچی تو بنی عبدالدار کے عثمان بن طلحہ بن ابی طلحہ راستے میں ملے انہوں نے کہا ابواُمیّہ کی بیٹی کدھر جا رہی ہو ؟ میں نے کہا اپنے شوہر کے پاس مدینے جا رہی ہوں۔ انہوں نے پوچھا تمہارے ساتھ کوئی نہیں ؟ میں نے کہا خدا اور اس بچے کے سوا میرے ساتھ کوئی نہیں۔ وہ بولے خدا کی قسم میں تمہیں تنہا نہیں جانے دوں گا۔ پھر وہ میرے اونٹ کی نکیل تھام کر چلنے لگے۔ واللہ کہ میں نے ان سے زیادہ شریف آدمی نہیں دیکھا۔ جب وہ کسی منزل پر پہنچتے تو میرے اونٹ کو بٹھا کر الگ ہٹ جاتے۔ میں بچے کو لے کر جب اتر جاتی تو وہ اونٹ کو کسی درخت سے باندھ دیتے اور مجھ سے دور کسی درخت کے نیچے جا لیٹتے۔ پھر جب چلنے کا وقت آتا وہ اونٹ کو لا کر بٹھاتے، الگ ہٹ کر کھڑے ہو جاتے، اور مجھ سے کہتے سوار ہو جاؤ۔ میرے سوار ہونے کے بعد وہ اونٹ کی نکیل تھام کر روانہ ہو جاتے۔ مدینے تک سارا راستہ انہوں نے اسی طرح طے کیا اور جب قباء میں بنی عوف کی بستی نظر آئی تو مجھ سے کہا" تمہارے شوہر وہاں ہیں ان

کے پاس چلی جاؤ اللہ تمہیں برکت دے " اس کے بعد جس طرح وہ پیدل آئے تھے اسی طرح مکہ واپس چلے گئے ۔ اس واقعے کو بلاذری نے بھی انساب الاشرف میں بیان کیا ہے

اس آپ بیتی کو پڑھنے والے عقلمند قارئین نے واضح طور پر محسوس کر لیا ہوگا کہ اس کے گھڑنے والے منافقین نے کس طرح حضرت ام سلمہؓ پر الزام تراشی کرنے کی کوشش کی ہے کہ کئی دن اور کئی راتوں کا طویل سفر انہوں نے ایک غیر محرم کے ہمراہ تنہا طے کیا، اور اس طرح بدنامی کے وہ تمام مواقع مہیا کر دیئے جو حضرت عائشہ صدیقہؓ کے نام سے آپ بیتی گھڑنے والے منافقین نے مہیا کئے تھے۔ ہمارے نزدیک اس واقعے کا اصل منبع ابن اسحاق ہیں جس طرح حضرت عائشہ صدیقہؓ والے قصے کا منبع ابن شہاب زہری تھے (تفصیل گذر چکی)

ابن اسحاق کی حقیقت سمجھنے کے لئے حدیث کی پہلی کتاب موطا شریف کے مرتب اور ائمہ اربعہ میں سے ایک امام حضرت امام مالک کا یہ تبصرہ سن لینا کافی ہے کہ ان کے نزدیک یہ شخص دجال من الد جا جلہ (زبردست دھوکے بازوں میں سے ایک) ہے۔ اس تبصرہ کی اہمیت اسلئے اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ ابن اسحاق اگرچہ ایرانی النسل ہے مگر مدینہ ہی میں پیدا ہوا اور وہیں اسکی جوانی گذری، اور حضرت امام مالک بھی مدینہ شریف کے رہنے والے ہیں، لہذا جس قدر وہ اس شخص سے واقف ہو سکتے ہیں، دوسرا نہیں ہو سکتا۔ اسلئے اس شخص کی ایسی روایت قابل اعتماد نہیں ہو سکتی جو ایک صحابیہ کی عصمت کو داغدار کرتی ہو، اور صحابیہ بھی

وہ جو رسول اللہ کے پھوپھی زاد بھائی کی بیوی ہوں اور آئندہ ام المومنین بننے والی ہوں۔

افک کا چوتھا افسانہ

حضرت ام ایمن رضؓ پر الزام

حضرت ام ایمنؓ حبشہ کی رہنے والی تھیں اور رسول اللہ کے والد حضرت عبداللہ کی باندی تھیں۔ ایام رضاعت کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پرورش کے فرائض انہوں نے ہی انجام دیئے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بڑے ہوئے تو آپؐ نے انہیں آزاد کر دیا، اور ان کا نکاح حضرت زید بن حارثؓ سے کر دیا، حضرت اسامہ ان ہی کے لڑکے تھے (یہ ساری تفصیلات صحیح مسلم۔ کتاب الجہاد، باب رو المہاجرین الی الانصار ج ۲ صفحہ ۹۶ مطبوعہ نور محمد آرام باغ کراچی میں موجود ہیں)

حضرت ام ایمن چوں کہ رسول اللہؐ کی دایہ تھیں اور والدہ کے بعد انہوں نے ہی حضورؐ کو پالا پوسا تھا، اسلئے حضور اکرمؐ ان کا نہایت احترام کرتے تھے اور بعض اوقات انہیں امی کہہ کر پکارتے تھے (اصابہ مولفہ علامہ ابن حجر عسقلانی ، ذکر ام ایمن) اسقدر عظیم خاتون کے لئے بھی بعض بد باطن لوگوں نے افک (بہتان) تراشا، اور یہ الزام لگایا کہ حضرت اسامہؓ ان کے شوہر حضرت زیدؓ سے نہیں بلکہ کسی اور سے ہیں۔ صحیح مسلم کتاب الرضاع، باب العمل بالحاق القائف الولد جلد اول صفحہ ۴۷۱ میں ہے کہ ایک دن حضرت زیدؓ اور حضرت اسامہؓ ایک ہی جگہ لیٹے ہوئے تھے، وہاں سے ایک قیافہ شناس کا گذر ہوا، اس نے ان دونوں کے قدموں کو دیکھ کر کہا " یہ قدم ایک دوسرے سے تعلق رکھتے ہیں " کیوں کہ

قیافہ شناس کی یہ بات الزام تراشوں کے لئے ضرب کاری تھی اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ بات سن کر بہت خوش ہوئے اور حضرت عائشہؓ کو بھی اس مسرت انگیز خبر کی اطلاع دی۔

عن ابن شهاب عن عروة عن عائشة انها قالت ان رسول الله صلى الله عليه وسلم دخل على مسرورا تبرق اسارير وجهه فقال الم ترى ان مجززاً نظراً آنفا الى زيد بن حارثه و اسامة بن زيد فقال ان بعض هذه الاقدام لمن بعض

اس قصہ کے پیش نظر یہ نقطہ نگاہ بھی ممکن ہے کہ سورہ نور کی آیات افک میں حضرت ایمنؓ پر اس الزام تراشی کی تردید کی گئی ہے اور رسول اللہؐ کی ان قائم مقام ماں کی پاکیزگی اور طہارت کا اعلان کیا گیا ہے۔ مگر ہمارے نزدیک یہ روایت بھی حضرت عائشہ صدیقہؓ، حضرت ام سلمہؓ اور حضرت ماریہ قبطیہؓ کے متعلق روایات کی طرح ناقابل اعتبار ہے۔

صحابہ کرام میں حضرت اسامہؓ واحد شخصیت ہیں جنھیں حب رسول اللہ (رسول اللہ کے محبوب) ہونے کا مقام حاصل ہے۔ فتح مکہ کے موقعہ پر جب بنو مخزوم کی فاطمہ نامی ایک عورت چوری کی واردات میں پکڑی گئی تو قریش کے لئے یہ معاملہ ناک کٹنے کے مترادف ہوگیا۔ انھوں نے کوشش کی کہ کسی طرح یہ عورت سزا سے بچ جائے صحیح مسلم میں ہے کہ اس موقع پر

فقالوا من يكلم فيها رسول الله صلى الله عليه و سلم و من

يجترى عليه الا اسامة حب رسول الله صلى الله عليه وسلم فكلمه ، اسامه ، فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم اتشفع فى حد من حدود الله ؟
لوگوں نے کہا کہ اس معاملے میں رسول اللہ سے کون بات کرئے گا لوگوں نے جواب دیا کہ اس کی جرأت سوائے رسول اللہ کے محبوب اسامہ کے اور کون کر سکتا ہے ؟ اس معاملے میں رسول اللہ کی خدمت میں عرض کیا تو آپ نے فرمایا کہ کیا تم اللہ کی حدود میں سے ایک حد کے متعلق سفارش کرتے ہو ؟

اس کے بعد رسول اللہ نے قانون کی بالاتری کے متعلق وہ عظیم الشان خطبہ دیا جو خطبات نبوی کے شاہکاروں میں سے ایک ہے۔ آپ نے فرمایا کہ پہلی قومیں اسی لئے تباہ ہوئیں کہ وہ کمزوروں پر تو قانون نافذ کرتی تھیں لیکن طاقتور قانون کی گرفت سے بچے رہتے تھے۔ خدا کی قسم اگر فاطمہ بنت محمد بھی چوری کرتی تو میں اسکا ہاتھ کاٹ دیتا (مسلم جلد دوم صفحہ ۶۴ کتاب الحدود)

رسول اللہ کی یہ محبوب شخصیت، فتنوں کے دوران یعنی جمل وصفین میں حضرت علیؑ یا فریق ثانی میں سے کسی ایک کے ساتھ ہونے کے بجائے، منافقوں کے جال سے بچی رہنے والی غیر جانبدار جماعت صحابہ کے سرخیل حضرات میں سے تھی، اسلئے منافقین ان سے ناراض ہیں۔ یہ روایت بھی انھیں داغدار کرنے کی منافقانہ مہم کا حصہ معلوم ہوتی ہے۔

افک کا پانچواں افسانہ
حضرت فاطمہؓ کا قصہ

شیعوں کے ہاں یہ روایت بہت مشہور ہے کہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ نے حضرت فاطمہؓ پر کوئی افک (بہتان) باندھا تھا جس کی سزا کے طور پر شیعوں کا مہدی حضرت عائشہ صدیقہؓ کو دوبارہ زندہ کر کے ان پر حد جاری کرے گا۔ بصائر الدرجات میں (جس کی اہمیت کا یہ عالم ہے کہ ملا باقر مجلسی اپنی عقائد کی کتاب حق الیقین میں اس کتاب کا بار بار حوالہ دیتے ہیں) یہ روایت اس طرح ہے

لما قام قائمنا رد الیه الحمیراء حتی یجلدها الحد ینتقمه لا بنته محمد (بصائر الدراجات صفحہ ۲۱۳)

جب ہمارے امام مہدی ظاہر ہوں گے تو حمیرا (حضرت عائشہ صدیقہؓ کا لقب) کو زندہ کرکے ان کے سامنے پیش کیا
جائے گا تاکہ امام مہدی ان (حضرت عائشہؓ) پر حد جاری کریں اور فاط
بنت محمدؐ کا بدلہ لیں ۔

یہی قصہ ملا باقر مجلسی نے شیعہ عقائد پر اپنی کتاب حق
ابن بابویہ کی علل الشرائع کے حوالہ سے نقل کیا ہے
" ابن بابویہ در علل الشرائع روایت کردہ است
علیہ السلام کہ چوں قائم ما ظاہر شود، عائشہ
انتقام فاطمہ را از او بکشد " (حق الیق
انتشارات علمیہ ۔ تہران)

ان روایات کا مطلب یہ ہے کہ نعوذ باللہ حضرت فاطمہؓ پر زنا کا یہ الزام کسی اور نے نہیں، ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ نے لگایا تھا، اسی لئے شیعہ مہدی حضرت عائشہؓ پر حد قذف لگائے گا۔ استغفراللہ۔

اسی قسم کی ایک اور احمقانہ روایت ملا باقر مجلسی نے اپنی اسی کتاب حق الیقین میں ابن بابویہ، شیخ طوسی وغیرہ کئی شیعہ علماء کے حوالہ سے نقل کی ہے کہ حضرت علیؓ نے حضرت صدیق اکبرؓ سے ان کے دور خلافت میں کہا

حضرت فرمود، اگر گواہان نزد تو گواہی دہند کہ العیاذ باللہ فاطمہ زنا کردہ است، چہ خواہی کرد، ابوبکر گفت، براو اقامت حد میکنم چنانچہ بر سائر مردم میکنم ۔ حضرت فرمودہ اگر چنیں کنی نزد خدا از جملہ کافران خواہی بود ۔ گفت چرا فرمود از برائے آں کہ رد کردہ شہادت خدارا از برائے او بطہارت و قبول کردہ شہادت مردم را ۔

کہ اگر تمہارے سامنے گواہ یہ گواہی دیں کہ فاطمہؓ العیاذ باللہ نے زنا کیا ہے تو تم کیا کرو گے ابوبکرؓ نے کہا کہ فاطمہ پر حد جاری کروں گا جیسا کہ تمام لوگوں پر کرتا ہوں ۔ علیؓ نے فرمایا کہ اگر ایسا کرو گے تو کافروں میں سے ہو جاؤ گے ۔ ابوبکرؓ نے پوچھا کیوں ؟ علیؓ نے کہا اس لئے کہ تم نے فاطمہ کی طہارت کے متعلق خدا کی شہادت تو قبول نہیں کی اور لوگوں کی ان کے زنا کے متعلق گواہی قبول کر لی ۔

حق الیقین حصہ اول صفحہ ۱۹۳ مطبوعہ تہران)

سمجھ میں نہیں آتا کہ حضرت فاطمہؓ کے متعلق الزام زنا کے ان

قصوں سے یہ لوگ حضرت فاطمہؓ پر سٹہ لگانا چاہتے ہیں یا حضرت عائشہ صدیقہؓ اور حضرت صدیق اکبرؓ کو بدنام کرنا چاہتے ہیں۔ بہر صورت ہمارے نزدیک یہ روایات بھی اسی طرح نظر انداز کر دینے کے قابل ہیں جس طرح حضرت عائشہ صدیقہؓ، حضرت ماریہ قبطیہؓ، حضرت ام سلمہؓ یا حضرت ام ایمنؓ کے نام سے بیان کردہ منافقین اور بد باطنوں کے قصے۔

افک کا چھٹا افسانہ

حضرت علیؓ اور یمن کی لونڈی

یہ قصہ اس روایت کا ایک ٹکڑا ہے جسے شیعہ حضرات بڑے طمطراق سے بیان کرتے ہیں اور جسے قصہ غدیر کے نام سے ان کے ہاں بہت اہمیت حاصل ہے بلکہ ان کے مذہب کا دارومدار ہی اس روایت پر ہے۔ ان کے نزدیک قرآن مجید میں تو کمی بیشی ہوئی ہے مگر یہ روایت اتنی متواتر ہے کہ اس میں کمی بیشی بھی نہیں ہوئی کیوں کہ اگر اس میں تحریف مان لیں تو ان کے مذہب کی بنیاد گر جاتی ہے۔

سنیوں کے ہاں بھی اس روایت کا وہ حصہ جسے ہم پیش کر رہے ہیں، صحیح بخاری، سنن ترمذی، طبرانی اور مسند بزار میں موجود ہے۔ پہلے ہم ترمذی کی روایت پیش کرتے ہیں:

" حضرت عمرانؓ بن حصین سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک لشکر روانہ فرمایا جس کا سربراہ علیؓ بن ابی طالب کو مقرر کیا۔ وہ ایک دستہ کے ساتھ تھے تو انہوں نے ایک لونڈی سے جماع کیا۔ اس پر

صحابہؓ نے ناپسندیدگی اور ناراضگی کا اظہار کیا۔ ان میں سے چار صحابہ نے یہ عہد کیا کہ جب وہ حضورؐ سے ملیں گے تو علیؑ کی اس حرکت کی شکایت کریں گے۔ اور مسلمانوں کی یہ عادت تھی کہ جب وہ سفر سے واپس آتے تو پہلے رسول اکرمؐ سے ملتے، سلام کرتے پھر اپنے گھروں کو جاتے۔ لہذا جب وہ دستہ فوج واپس مدینہ آیا تو نبی اکرمؐ کی خدمت میں سلام کے لئے حاضر ہوا، اور ان چار صحابہ میں سے ایک صحابی نے رسول اللہؐ کی خدمت میں عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول ملاحظہ فرمایئے علی بن ابی طالب نے یہ یہ کیا۔ آنحضرتؐ نے اس کی طرف سے منھ پھیر لیا۔ تو دوسرے صحابی کھڑے ہوئے اور انہوں نے بھی وہی عرض کیا اور آپؐ نے ان کی طرف سے بھی منھ پھیر لیا۔ پھر تیسرے صحابی کھڑے ہوئے انھوں نے بھی وہی درخواست کی اور آپ نے ان سے بھی منھ پھیر لیا۔ پھر چوتھے صحابی کھڑے ہوئے اور یہی بات عرض کی تو آپؐ غضبناک ہوگئے اور فرمایا تم علی کے متعلق کیا چاہتے ہو؟ تم علی کے متعلق کیا چاہتے ہو؟ تم علی کے متعلق کیا چاہتے ہو؟ علی مجھ سے ہے اور میں علی سے ہوں اور وہ میرے بعد ہر مومن کا ولی ہے۔ ترمذی کہتے ہیں کہ یہ روایت حسن غریب ہے۔ جعفر بن ابی سلیمان کے سوا کسی دوسرے راوی نے اسے روایت نہیں کیا (ترمذی جلد دوم مطبوعہ قرآن محل کراچی صفحہ ۲۲۵ باب مناقب علیؑ حاشیہ میں ملا علی قاری کہتے ہیں کہ یہ روایت مسند احمد میں بھی ہے)

اس سے ملتی جلتی روایت وھب بن حمزہؓ کی طبرانی میں ہے (مجمع

الزوائد ج ۹ صفحہ ۱۰۹)

اسی قسم کی ایک روایت حضرت بریدہؓ سے مسند بزار میں ہے (مجمع الزوائد ج ۹ صفحہ ۱۰۹)

حضرت بریدہؓ والی روایت صحیح بخاری میں بھی ہے اسے ہم یہاں نقل کئے دیتے ہیں:

عن عبداللہ بن بریدہ عن ابیہ قال بعث النبیؐ علیاً الی خالد لیقبض الخمس و کنت البغض علیا و قد اغتسل فقلت لخالد الاتری لھذا ؟ فلما قدمنا علی لنبیؐ ذکرت ذلک له ، فقال یا بریدہ اتبغض علیا فقلت نعم قال لاتبغضه فان له فی الخمس اکثر من ذلک (بخاری مطبوعہ نور محمد ، آرام باغ کراچی ج ۲ ص ۶۲۳)

حضرت بریدہؓ کے صاحبزادے عبداللہ اپنے والد بریدہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ و سلم نے حضرت علیؓ کو حضرت خالدؓ بن ولید کی طرف (یمن) بھیجا تاکہ خالدؓ نے جو فتوحات حاصل کی ہیں اس کی مالیت کا خمس (پانچواں حصہ) مرکز (مدینہ) لے کر آئیں ۔ علیؓ یمن آئے تو مال غنیمت کی ایک لونڈی سے جماع کر کے غسل کیا جسکی وجہ سے مجھے ان سے نفرت ہوگئی ۔ میں نے کمانڈر خالدؓ سے کہا تم دیکھتے نہیں اس شخص نے کیا حرکت کی ہے ؟ ----- پس جب ہم رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو یہ ساری تفصیل آپؐ کے سامنے پیش کر دی ، اس پر رسول اللہؐ نے مجھ سے دریافت کیا کہ کیا اس وجہ سے تمھیں علیؓ سے نفرت ہوگئی ہے ؟ میں نے عرض کیا جی ہاں ! تو آپؐ نے فرمایا کہ علیؓ سے نفرت مت کرو ، کیوں کہ خمس میں اسکا حصہ اس سے بھی زیادہ ہے ۔

اس کی شرح میں بخاری کے سب سے مستند شارح علامہ ابن حجر عسقلانی اپنی کتاب فتح الباری میں لکھتے ہیں:

اس روایت میں لونڈی سے حضرت علیؑ کے جماع کا جو تذکرہ ہے اور جس کی وجہ سے حضرت بریدہ کو حضرت علیؑ سے نفرت ہوئی اس میں یہ بڑا اشکال ہے کہ لونڈی کے حیض سے پاک ہوئے بغیر حضرت علیؑ نے کس طرح اس سے جماع کیا؟ علماء نے اس کی بہت سی توجیہات کی ہیں، بعض کے نزدیک ممکن ہے وہ لونڈی نابالغ ہو اسے حیض نہ آتا ہو اس لئے اس پر قبضہ کرتے ہی حضرت علیؑ نے اس سے جماع کر لیا بعض کے نزدیک ممکن ہے وہ اسی دن حیض سے فارغ ہوئی ہو امام خطابی، کے نزدیک اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ ممکن ہے وہ کنواری ہو یا حضرت علیؑ کے اجتہاد کی رو سے اس کے لئے حیض کی ضرورت نہ ہو۔۔۔ رہا یہ اعتراض کہ حضرت علیؑ نے امانت میں خیانت کی کیوں کہ انہیں تو سارا مال مرکز میں رسول اللہؐ کو پہنچانا چاہیے تھا پھر آپؐ جس جس کو جو جو چیز عنایت کرتے تو وہ اس کی ملکیت ہوتی مگر یہاں حضرت علیؑ نے رسول اللہؐ تک پہنچنے سے قبل ہی ایک خوبصورت لونڈی اپنے لئے منتخب کر کے رات کو اسکے ساتھ ہمبستری بھی کر لی اس کا جواب یہ ہے کہ یمن میں حضرت علیؑ اسلامی حکومت کے سربراہ رسول اللہؐ کے قائم مقام تھے اس لئے خمس میں سے ان کا جو حق تھا وہ انہوں نے لونڈی کی صورت میں لے لیا اور اس کے رسول اللہؐ تک پہنچنے کا انتظار کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی

(فتح الباری۔ کتاب المغازی، باب بعث علیؓ و خالدؓ الی الیمن جلد ۸ صفحہ ۶۸)

ان روایات کے ساتھ آپ یہ روایت بھی ملا لیں جس کی رو سے حضرت علیؓ کو جنسی مریض بنا یا گیا ہے بخاری ہی کی روایت ہے اور ہے بھی حضرت علیؓ کی اپنی زبانی کہ:

مجھے بہت زیادہ مذی آیا کرتی تھی اور میں اس کے متعلق رسول اللہؐ سے دریافت کرتے ہوئے شرماتا تھا کیوں کہ آپؐ کی صاحبزادی میرے گھر میں تھیں اسلئے میں نے مقداد سے کہا تم اس کے متعلق رسول اللہؐ سے دریافت کرو انہوں نے دریافت کیا تو آپؐ نے فرمایا کہ ایسے آدمی کیلئے نماز کے وقت شرمگاہ کو دھو کر وضو کر لینا کافی ہے (بخاری و مسلم۔ کتاب الطہارہ۔ باب المذی)

ایک اور روایت بھی ہے کہ رسول اکرمؐ نے حضرت علیؓ سے فرمایا کہ علی! غیر عورتوں پر ایک مرتبہ نگاہ پڑ جانا تو معاف ہے۔ لیکن بار بار دیکھنا جرم ہے (ترمذی مطبوعہ قرآن محل جلد ۲ صفحہ ۱۲۰)

ان روایت کی رو سے حضرت خالد بن ولیدؓ اور بہت سے صحابہ لونڈی کے ساتھ حضرت علیؓ کے اس طرز عمل کو زنا سمجھتے رہے اور ان میں سے چار صحابہ یعنی چار مستند گواہوں نے رسول اکرمؐ کے سامنے بھی یہ شکایت پیش کی بظاہر صورت حال کی خطرناکی اور چار صحابہ کی گواہی کے بعد حضرت علیؓ حد (اسلامی سزا) کے مستحق تھے لیکن رسول اللہؐ نے انکے خلاف فیصلہ کرنے کے بجائے ان کی تائید کی اس سے بعض لوگ یہ

استدلال کرتے ہیں کہ اس کی توجیہ سوائے اس کے اور کچھ نہیں کی جاسکتی کہ اللہ کی طرف سے حضرت علیؓ کی برأت تسلیم کی جائے۔ لہذا آیات افک کا مصداق یہی قصہ ہے جس میں الزام لگانے والوں کو غلط فہمی میں مبتلا قرار دیا گیا اور حضرت علیؓ کی برأت کی گئی۔

ہمارے نزدیک اس نقطہ نظر والوں کا رویہ بھی سابقہ قصوں کو تسلیم کرنے والے حضرات کی طرح غلط ہے کہ پہلے کسی محترم شخصیت کے متعلق الزامات کے قصے تسلیم کئے جائیں اور پھر انکی برأت اللہ کی طرف سے نازل کروائی جائے۔ حق بات یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے کسی شخص (مرد یا عورت) کا نام نہیں لیا تو ہمیں بھی ان آیات کا مطالعہ کرتے ہوئے کسی خاص شخص کا نام نہیں لینا چاہیئے۔ جب کسی کا نام لئے بغیر آیات کا مفہوم واضح ہے اور الٰہی ہدایات پوری طرح سمجھ میں آجاتی ہیں تو پھر ایسی مشکوک روایات کو ان آیات کی تفسیر کے طور پر پیش کرنا جن سے صحابہ اور صحابیات کے کردار پر حرف آتا ہو کسی صاحب ایمان کو زیب نہیں دیتا۔

اصل حقیقت

قرآن کریم کے سیاق و سباق کے پیش نظر ان آیات کا تعلق لعان کے مسئلے سے ہے۔ سورہ نور کی ابتدا زنا کی سزا سے ہوتی ہے۔ اسکے بعد بلا ثبوت زنا کا الزام لگانے والوں پر ۸۰ کوڑے (حد قذف) لگانے کا حکم ہے تاکہ دوسروں کی عزت سے کھیلنا مشغلہ نہ بن جائے۔ اس کے بعد ایک انتہائی نازک صورت حال کا تذکرہ ہے کہ اگر شوہر اپنی بیوی کو زنا کے

فعل میں ملوث پائے اور اس کے پاس دوسرے گواہ نہ ہوں تو وہ نہایت ذہنی کشمکش میں مبتلا ہو سکتا ہے کہ اگر اس بات کی کسی سے شکایت کرتا ہے تو عام اصول کے تحت خود اس کی پیٹھ پر ۸۰ کوڑے پڑ جائیں گے اور اگر یہ بات دل میں دبائے رکھے تو نفسیاتی عذاب میں مبتلا رہتا ہے اس کشمکش کے حل کے لئے اللہ تعالیٰ نے لعان کا قانون ارشاد فرمایا کہ ایسی صورت میں شوہر چار مرتبہ حلف اٹھا کر اس حادثے کی تصدیق کرے اور پانچویں مرتبہ یہ اقرار کرے کہ اگر میں غلط بیانی سے کام لے رہا ہوں تو مجھ پر اللہ کی لعنت۔۔ اسی طرح عورت چار مرتبہ حلفیہ طور پر کہے کہ اس کا شوہر اپنے اس بیان میں جھوٹا ہے۔ اور پانچویں مرتبہ اقرار کرے کہ اگر اس کا شوہر اپنے الزام میں سچا ہو تو مجھ پر اللہ کا عذاب ٹوٹے۔

میاں بیوی کے ان حلفیہ بیانات کے بعد دونوں میں تفریق کرا دی جائے گی کیونکہ ایسی حالت میں دونوں کا میاں بیوی کی حیثیت سے رہنا ناممکن ہے۔ لیکن ساتھ ہی اس عورت پر الزام تراشی کی کسی کو اجازت نہیں ہوگی۔ کیونکہ اس کے خلاف اسلامی اصول شہادت کے تحت گواہیاں دستیاب نہیں ہیں۔ شوہر کو اس پر الزام لگانے کا حق اس کی مخصوص پوزیشن کی وجہ سے دیا گیا تھا لیکن چونکہ عورت نے اس کے الزام کو حلفیہ طور پر مسترد کر دیا۔ اس لئے ان کے میاں بیوی کے تعلقات ختم کر دئے گئے۔۔ اب اس تفریق کے بعد یہ سابقہ شوہر یا کوئی اور شخص اس عورت پر اگر الزام تراشی کرتا ہے تو یہ الگ ہے اور ایسا شخص سزا کا مستحق ہے۔ کیونکہ معصوم نہ تو عورت ہے نہ مرد۔ اسلئے

جہاں یہ ممکن ہے کہ اس عورت نے واقعی یہ حرکت کی ہو اور شوہر (جو واحد گواہ ہے) سچ کہہ رہا ہو۔ وہیں یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اپنی بیوی کو انتقاماً ایک قانونی نقطہ سے فائدہ اٹھا کر بدنام کرنا چاہتا ہو حالانکہ عورت نے کوئی جرم نہیں کیا۔ اس صورت میں قانونی خانہ پری کر کے دونوں کے ازدواجی روابط ختم کرنے کے علاوہ کوئی حل نہیں ہو سکتا۔ مگر تعلقات ختم ہونے کے بعد اس معاملے کو آگے چلانا اور عورت کے خلاف الزام تراشی جاری رکھنے کا کوئی جواز نہیں رہتا اگر کوئی یہ حرکت کرے گا تو اس سے مکمل اسلامی شہادت کا ثبوت لانے کیلئے کہا جائے گا۔ ورنہ اس الزام لگانے والے پر حد قذف (الزام لگانے کی سزا یعنی ۸۰ کوڑے) نافذ کر دی جائے گی کیونکہ وہ بلا ثبوت ایک عورت کی عزت سے کھیل رہا ہے۔ یہ ہے لعان کے حکم کے فوراً بعد آیات افک کے نزول کی وجہ جو عقل کے اور سیاق و سباق کے عین مطابق ہے۔ اور نالائق اور منتقم مزاج شوہروں کو لعان کے بہانے بیویوں کو بدنام کرنے سے روکنے کا بہترین طریقہ ہے ورنہ عام آدمیوں کے لیے دوسروں پر بلا ثبوت الزام لگانے کی سزا تو حکم زنا کے فوراً بعد حد قذف کے عنوان سے پہلے ہی بتائی جا چکی تھی۔ اگر انہی کے لئے آیات افک ہوتیں تو یہ بلا وجہ کی تکرار ہوتی جو قرآن کے شایان شان نہیں۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے آیات افک لعان کے حکم کے بعد نازل فرمائیں تاکہ نالائق شوہروں اور فتنہ پرداز لوگوں کو لعان کی آڑ میں کسی بے گناہ عورت کو بدنام کرنے سے بچایا جائے۔

ہماری ان توضیحات کی روشنی میں ان تمام قرآنی آیات کا تسلسل بھی برقرار رہتا ہے اور تمام مصنوعی روایتی شان نزول بھی نسیاً منسیّا ہو جاتے ہیں۔

رہا یہ کہ کیا ایسے نالائق شوہر ہو بھی سکتے ہیں؟ تو قطع نظر اس کے کہ آج بھی ہر وقت اس کا تجربہ کیا جاسکتا ہے خود روایات میں اس کی مثال ملتی ہے مثلاً علامہ جلال الدین سیوطی اپنی تفسیر در منثور میں بخاری، مسلم اور ابن مردویہ کے حوالے سے سعید بن جبیر کی ابن عباسؓ سے یہ روایت بیان کرتے ہیں کہ:

ایک شخص نے رسول اللہؐ کے پاس آکر اپنی بیوی پر زنا کا الزام لگایا تو آپؐ پر لعان کی آیات نازل ہوئیں آپؐ نے دونوں سے حلفیہ بیانات لئے اور اس کے بعد اس کے شوہر سے کہا کہ جاؤ اب تمہیں اس عورت کے خلاف اور کوئی حق نہیں رہا۔ اس شوہر نے کہا کہ اس عورت سے میرا مال (مہر) تو دلوا دیجئے تو آپؐ نے فرمایا کہ اب تیرا کوئی مال نہیں ہے، اگر تو سچ کہتا ہے تو تو نے اس عورت سے جو ازدواجی تعلقات رکھے تھے وہ اسی کے نتیجے میں تھے۔ اور اگر تو نے جھوٹا الزام لگایا ہے تب تو تیرا حق بالکل ہی نہیں رہا۔ (در منثور۔ طبع قدیم، مجلد ۵ صفحہ ۲۳)

اس روایت سے واضح ہے کہ رسول اللہؐ کے نزدیک شوہروں سے جھوٹے الزامات کا خطرہ ہو سکتا ہے بلکہ روایت کے تیور بتا رہے ہیں کہ رسول اللہؐ کے نزدیک خود اس شوہر نے بھی پیسے کے لالچ میں اور بیوی کو بدنام کرنے کے لئے الزام لگایا تھا۔ مگر اسلامی قانون لعان اور آنحضرتؐ کے

فیصلے کے نتیجے میں اس کی آرزو پوری نہیں ہوئی و للہ الحمد ۔ بہت ممکن ہے کہ اسی شخص کے معاملے میں مزید توضیح کیلئے آیہ لعان کے بعد آیہ افک کا نزول ہوا ہو ۔

افک والے رکوع کے بعد ایک آیت ہے **و لا یاتل اولو الفضل منکم** (۲۴ / ۲۲) یعنی تم میں سے جو لوگ صاحب فضل اور صاحب مقدرت ہیں وہ اس بات کی قسم نہ کھا بیٹھیں کہ اپنے رشتہ دار، مسکین، اور مہاجر فی سبیل اللہ لوگوں کی مدد نہیں کریں گے ۔ انہیں معاف کر دینا چاہیئے اور درگذر کرنا چاہیئے ۔ کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تمہیں معاف کرے ؟ اور اللہ کی صفت یہ ہے کہ وہ غفور اور رحیم ہے " ۔ کہا جاتا ہے کہ صدیق اکبرؓ نے اپنی بیٹی حضرت عائشہ صدیقہؓ پر الزام لگانے والے ایک صاحب کے متعلق جن کی صدیق اکبرؓ مالی معاونت کیا کرتے تھے آئندہ مدد نہ کرنے کی قسم کھا لی تھی اس پر یہ آیت نازل ہوئی ۔ قطع نظر اس کے کہ آیت میں کسی کا نام نہیں لیا گیا اور نہ ہی ناموں کی تفصیل جاننا اس آیت کی فہم کے لئے ضروری ہے، ہم یہ دکھا کر کہ اس آیت کے شان نزول میں بعض دوسری روایات بھی ہیں جن میں صدیق اکبرؓ کا تذکرہ نہیں ہے اس بحث کو ختم کرتے ہیں ۔

تفسیر در منثور میں علامہ جلال الدین سیوطی لکھتے ہیں کہ عبدالرزاق و ابن ابی حاتم اور ابن ابی الدنیا نے باب ذم الغضب میں اور خرائطی نے مکارم اخلاق میں نیز مستدرک حاکم و طبرانی و ابن مردویہ و سنن بیہقی میں ہے کہ حضرت عبداللہ کہتے ہیں کہ مدینہ منورہ میں

جب پہلا شخص چوری کے الزام میں لایا گیا اور اس کا ہاتھ کاٹا گیا تو اس موقع پر رسول اکرمؐ کے چہرہ انور پر سخت اذیت کے اثرات تھے. آنحضرتؐ سے دریافت کیا گیا کہ یا رسول اللہؐ کیا یہ معاملہ آپ کے لئے سخت تکلیف دہ رہا؟ آپؐ نے فرمایا کہ اپنے اس بھائی کے معاملے میں تمہیں شیطان کا مددگار نہیں ہونا چاہیئے تھا، کیونکہ عدالت کے سامنے جب ایسا معاملہ پہنچ جائے تو پھر قانون کا اجراء ضروری ہو جاتا ہے۔ ورنہ عدالت کے سامنے لائے جانے سے قبل بہتر ہے کہ صاحب معاملہ لوگ مجرم کو معاف کر دیں کیونکہ اللہ تعالیٰ معاف کرنے کو پسند کرتا ہے۔ پھر آنحضرتؐ نے مندرجہ بالا آیات تلاوت فرمائی ولیعفوا ولیصفحوا، الا تحبون ان یغفراللہ لکم (۲۴ / ۲۲) (ترجمہ اوپر گذر چکا) [تفسیر در منثور جلد ۵ صفحہ ۳۵]

ساتویں مثال ۔ آیت مباہلہ

قرآن مجید کی آیت مباہلہ سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ توحید کے مخالفین اگر دلائل سے بات کرنے اور دلائل سننے اور سمجھنے کے لئے تیار نہ ہوں تو توحید کی عظمت کا یہ تقاضا ہے کہ مسلمان اس مسئلہ پر ان سے نفسیاتی مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہوجائیں اور انہیں یہ چیلنج دیدیں کہ کامیابی اہل توحید کا مقدر ہے۔ وقت بتادے گا کہ توحید کی بنیاد پر زندگی بسر کرنے والے کامیاب و کامران ہوں گے اور شرک کی بنیاد پر زندگی بسر کرنے والے ناکام و نامراد ہوں گے جیسا کہ دوسری جگہ ارشاد

ہے کہ کہہ دیجئے کہ اے میری قوم تم اپنے نظریہ کی بنیاد پر عمل کرو، میں اپنے نظریہ کی بنیاد پر عمل پیرا ہوں، کون صحیح راہ پر ہے اور کون غلط راہ پر، اس کا فیصلہ نتائج سے ہوجائے گا کیوں کہ ظالم کبھی کامیاب نہیں ہوتے" (۱۳۶/۶)

آیتہ مباہلہ میں اسی قسم کا چیلنج رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسیحیوں کو دیا ہے جو حضرت مسیح کو اللہ کا بندہ اور اسکا رسول ماننے کے بجائے انھیں اللہ کا بیٹا اور اللہ کی صفات کا حامل تین میں سے ایک قرار دے کر انھیں الہ تسلیم کرتے تھے۔ آیہ مباہلہ کے الفاظ یہ ہیں:

فمن حاجک فیہ من بعد ماجائک من العلم فقل تعالوا ندع ابنائنا و ابنائکم و نسائنا و نسائکم و انفسنا و انفسکم ثم نبتھل فنجعل لعنۃ اللہ علی الکاذبین (آل عمران سورت نمبر ۳ آیت نمبر ۶۱) اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ: اے پیغمبرؐ مسیح کی حقیقت کے متعلق وحی الہٰی کا علم آجانے کے بعد بھی اگر کوئی تم سے جھگڑا کرے تو کہہ دو کہ اچھا آؤ ہم اپنے بچوں کو بلائیں، تم اپنے بچوں کو بلاؤ، ہم اپنی عورتوں کو جمع کریں تم اپنی عورتوں کو جمع کرو، ہم خود بھی میدان میں آجائیں، تم بھی میدان میں آجاؤ، پھر ہم مل کر دعا کریں اور جھوٹوں پر لعنت بھیجیں (کہ جو جھوٹا ہو، اللہ اسے ناکام اور ذلیل کرے) (۳/ ۶۱)

ظاہر ہے کہ یہ آیت مباہلہ اپنے مفہوم میں بالکل واضح ہے مگر شیعہ علماء کی منطق نرالی ہے ان کے نزدیک اس آیت سے حضرت علیؓ کی خلافت بلافصل ثابت ہوتی ہے کیونکہ ان کی روایات کی رو سے "ہم خود بھی میدان میں آجائیں" سے مراد رسول اللہؐ نہیں بلکہ حضرت علیؓ ہیں لہذا بقول ان کے اس طرح حضرت علیؓ رسول اللہؐ کے ہمسر ہوئے اور جو

نبیؐ کا ہمسر ہو اسکے برابر کوئی دوسرا نہیں ہوسکتا اسلئے خلیفہ بھی کوئی اور نہیں ہوسکتا اسلئے رسولؐ کے بعد خلافت ہمسر رسولؐ یعنی علیؓ کا حق ہوئی لہذا آیت شیعہ عقیدہ امامت کی بہت بڑی دلیل ہے۔

اس مضحکہ خیز استدلال کے ساتھ ساتھ شیعوں کا کہنا یہ بھی ہے کہ اس آیت میں ابناء نا (ہمارے بیٹوں بچوں) سے مراد صرف حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ ہیں اور نساء نا (ہماری عورتوں) سے مراد صرف حضرت فاطمہؓ ہیں۔ یعنی انفسنا (ہم خود) سے مراد رسول اللہؐ اور سابقون الاولون صحابہ کرامؓ نہیں بلکہ صرف حضرت علیؓ مراد ہیں۔ اسی طرح نساء نا میں جسکا ترجمہ ہے ہماری عورتیں یعنی اکیلی میری نہیں بلکہ تمام اہم صحابہ کی عورتیں۔ یہاں بھی نہ ازواج مطہرات مراد ہیں نہ باقی سابقون الاولون صحابہ کبار کی بیویاں بلکہ صرف حضرت فاطمہؓ مراد ہیں۔ اسی طرح ابناء نا میں (جو جمع کے الفاظ ہیں یعنی ابن کی جمع ابناء اور نا جمع متکلم کی ضمیر یعنی ہمارے بیٹے) صرف دو نواسے حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ مراد ہیں، نہ رسول اللہؐ کے بڑے نواسے حضرت زینبؓ کے صاحبزادے علی زینبی مراد ہیں، نہ اور کسی سابقین صحابہ میں سے کسی کی اولاد مراد ہے۔ ظاہر ہے شیعوں کا یہ زعم صراحۃً قرآن کے خلاف ہے کیوں کہ تینوں جگہ جمع کے صیغے استعمال کئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ خود شیعوں کے امام باقر نے جو روایت بیان کی ہے اس میں تین سے زیادہ صحابہ کرامؓ کا تذکرہ کیا ہے جو جمع کے صیغوں کا کم سے کم مصداق ہیں۔ روایت ملاحظہ ہو:

اخرج ابن عساکر عن جعفر بن محمد عن ابیه قل تعالو اندع ابناء نا الخ قال فجاء بابی بکر و ولدہ و بعمر و ولدہ و بعثمان و ولدہ

و بعلی و و لدہ (تفسیر المنار ج-۳ صفحہ ۳۲۲)
ابن عساکر نے جناب جعفر صادق سے انھوں نے اپنے والد جناب باقر سے اس آیت قل تعالو اندع ابناء نا[۳/۶۱] کے متعلق روایت کیا ہے کہ اس آیت کے نازل ہونے پر رسول اللہؐ نے اپنے ساتھ حضرت ابو بکرؓ اور ان کی اولاد کو، حضرت عمرؓ اور ان کی اولاد کو، حضرت عثمانؓ اور ان کی اولاد کو، اور حضرت علیؓ اور ان کی اولاد کو لیا تھا اور روایات کی بہ نسبت قرآن کے زیادہ قریب ہے باقی روایات بھی جن میں آل علیؓ کے بلائے جانے کا ذکر ہے، در حقیقت حضرت باقر کی اس روایت کے خلاف نہیں ہیں کیوں کہ ان میں دوسرے حضرات کے بلائے جانے کا انکار نہیں ہے کیوں کہ اگر ان روایات میں دوسروں کا ذکر نہ ہونے کا یہ مطلب لیا جائے کہ وہ اس موقعہ پر شریک ہی نہیں تھے تو پھر چوں کہ بعض روایات میں حضرت علیؓ کا بھی ذکر نہیں ہے اسلئے یہ مطلب لینا چاہیئے کہ وہ بھی مباہلہ میں شریک نہیں تھے۔ ہماری اس توضیح کے بعد ان تمام روایات کو صحیح مان لینے میں کوئی حرج نہیں لیکن محتاط اہل علم اور قرآن کو معیار قرار دینے والے محققین نے ان روایات کو ناقابل اعتبار اور شیعہ ٹکسال کی گڑھی ہوئی بتایا ہے۔

عرب دنیا کے مشہور مفسر مفتی محمد عبدہ پہلے تو آیت مباہلہ کے متعلق لکھتے ہیں کہ الظاھرا ن الکلام فی جماعۃ المؤمنین یعنی یہ بات واضح ہے کہ آیت مباہلہ میں افراد کا نہیں بلکہ جماعت مؤمنین کا تذکرہ ہے۔ اسکے بعد ان روایات پر تبصرہ کرتے ہوئے جن میں صرف آل علیؓ کا تذکرہ ہے باقی کا تذکرہ نہیں ہے لکھتے ہیں:

ومصادرهذه الروايات الشيعة ، ومقصدهم منها معروف-
وقد اجتهدوا فی ترویجها ما استطاعوا، حتی راجت علی کثیر
من اهل السنه، ولکن واضعیها لم یحسنوا تطبیقها علی الایه،
فان کلمة نسائنا لایقولها العربی ویرید بنته لاسیما اذا کان له
ازواج ولد لفهم هذا من لغتهم وابعد من ذلک ان یراد بانفسنا
علی علیه الرضوان-

ثم ان وفد نجران الذین قالو ان الایة نزلت فیهم لم یکن
معهم نساء هم واولادهم-

وکل مالفهم من الایة امرالنبی صلی الله علیه وسلم ان
یدعو المحاجین والمجادلین فی عیسی من اهل الکتاب الی
الاجتماع رجالا ونساء او اطفالا ، ویجمع هو المؤمنین رجالا
ونساء او اطفالا ، ویبتهلون الی الله تعالیٰ بان یلعن الکاذب فیما
یقول عن عیسی ، وهذا الطلب یدل علی قوة یقین صاحبه
وثقته بمایقول کمایدل امتناع من دعوا الیٰ ذلک من اهل
الکتاب سواء کانوا نصاری نجران أوغیرهم علی امترائهم فی
حجاجهم-

ان روایات کا اصل منبع شیعہ ہیں جن کا اس قسم کی روایات پھیلانے سے
جو مقصد ہے وہ ڈھکی چھپی بات نہیں۔ مگر انھوں نے ایسی روایات کا
اتنا پروپیگنڈہ کیا کہ یہ اہلسنت میں بھی رائج ہوگئیں اسکے باوجود ان
روایات کے گڑھنے والوں سے کئی کوتاہیاں ایسی ہوئیں جن کی وجہ سے یہ
روایات آیہ مباہلہ پر صحیح طور سے چسپاں نہ ہوسکیں کیوں کہ ان روایات
میں نساء نا (ہم اپنی عورتوں کو) سے حضرت فاطمہؓ مراد لی گئی ہیں، جب

کہ عربی زبان کا کوئی ماہر بھی "اپنی عورتوں" سے بیٹی مراد نہیں لے سکتا خاص طور سے جب کہ اسکی بیویاں موجود ہوں۔ اسی طرح انفسنا (ہم خود) سے مراد حضرت علیؓ کو لینا اس سابقہ بات سے بھی زیادہ احمقانہ ہے۔

پھر یہ بھی سوچئے کہ اس چیلنج کو عملی جامہ پہنانے کا موقعہ ہی کہاں ملا؟ کیوں کہ جس نجرانی وفد کی آمد کو اس آیت کا شان نزول بتایا جاتا ہے ان کے ساتھ ان کے بیوی بچے تھے ہی کہاں جو رسول اللہؐ حضرت فاطمہؓ کو میدان میں لے کر آتے۔

آیہ مباہلہ سے جو بات واضح طور پر سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ مسیحیوں میں سے جو لوگ حضرت مسیح کو اللہ کا بیٹا اور تین خداؤں میں سے ایک سمجھنے پر ڈھٹائی سے جمے ہوئے ہیں ان کو یہ چیلنج دیا جائے کہ وہ اپنے اہم آدمیوں، عورتوں اور بچوں کو لے آئیں اور رسول اللہؐ بھی مؤمن مردوں، عورتوں اور بچوں کو لے آئیں اور دونوں اللہ کے سامنے خشوع و خضوع کے ساتھ یہ دعا کریں کہ دونوں میں سے حضرت عیسیٰ کے معاملہ میں جو حق پر نہ ہو، اس پر اللہ کا غضب نازل ہو۔

یہ چیلنج دراصل چیلنج دینے والے کے اپنے نقطۂ نظر پر اعتماد کا زبردست ثبوت اور چیلنج قبول نہ کرنے والوں کے اپنے نظریہ پر تذبذب کا اور اسکے بے دلیل ہونے کا واضح ثبوت ہے، خواہ وہ نجرانی مسیحی ہوں یا کوئی اور مسیحی۔

(تفسیر المنار جلد ۳ صفحہ ۳۲۲)

اس آیت کی تفسیر میں حضرت مولانا عبدالشکور لکھنوی نے جو لکھا ہے اسکا خلاصہ بھی انہیں کے الفاظ میں ملاحظہ فرمالیں۔ مولانا لکھتے ہیں:

ہماری اپنی تمہید اور مفتی محمد عبدہ کی تفسیر کے بعد حضرت مولانا

عبدالشکور لکھنوی نے اس آیت کی جو تفسیر فرمائی ہے اسکا خلاصہ انھیں کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیے (طاہر) مولانا لکھتے ہیں:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حامداً و مصلیا و مسلماً

اس زمانہ میں جب کہ ہر طرف سے نئے نئے فتنے اٹھ رہے ہیں۔ اور ناواقفوں کی رہزنی کے لئے ہر قسم کی کوششیں ہورہی ہیں۔ ایک نیا شگوفہ یہ کھلا کہ بمبئی کے بعض شیعوں نے صلح و آشتی کا لباس پہن کر سنیوں کو اتحاد و اتفاق کی دعوت دی۔ اور اس کی صورت یہ تجویز کی کہ جو مذہبی تقریبات فریقین میں مشترک ہیں ان کو دونوں فریق ایک جگہ جمع ہوکر ادا کریں۔ منجملہ ان مشترک تقریبات کے ایک عید مباہلہ کو بھی بیان کیا گیا۔ یہ عید شیعوں کے یہاں ذی الحجہ کے مہینہ میں ہوتی ہے۔ کہا گیا کہ واقعہ مباہلہ کا ثبوت سنیوں کی کتابوں میں بھی ہے۔ لہذا اس عید سے سنیوں کو بھی انکار نہ ہونا چاہیئے۔

اس دعوت اتفاق پر بڑے بڑے مضمون لکھے گئے۔ جن میں دکھلایا گیا کہ واقعہ مباہلہ عہد نبوت کا ایک عظیم الشان واقعہ اور معجزات نبوی میں ایک غیر معمولی معجزہ ہے لہذا اس دن کو ضرور عید منانا چاہیئے۔

مقصود یہ تھا کہ اہل سنت جو ہر وقت دعوت صلح پر لبیک کہنے کو تیار رہتے ہیں۔ اگر اس دعوت کو قبول کرلیں تو ہر سال ایک مشترک جلسہ منعقد ہوا کرے اور اس میں واقعہ مباہلہ کے پردہ میں شیعوں کو اپنے مذہب کی تبلیغ کا موقع ملتا رہے۔ حضرت علیؓ کا افضل الصحابہ اور خلیفہ بلا فصل ہونا سنیوں کے کان تک بھی پہنچائیں۔ اور یہ عید ان کی خلافت

بلا فصل کی یادگار میں سنیوں کے یہاں بھی رائج ہو جائے۔
مگر یقیناً خدا کا شکر ہے کہ اہل سنت کی طرف سے اسی وقت جواب دیدیا گیا کہ ہمارے مذہب میں عید مباہلہ بالکل بے اصل چیز ہے، مباہلہ کی نوبت ہی نہیں آئی صرف ارادہ ہی ارادہ تھا۔ یقیناً اگر یہ افسوں چل جاتا تو مجالس محرم سے زیادہ یہ عید مباہلہ مذہب شیعہ کی اشاعت کا ذریعہ بنتی۔
المختصر اس وقت تو یہ فتنہ دب گیا، مگر شیعوں کی کوشش برابر جاری رہی ہے۔ ان کے اگلے علماء بھی آیت مباہلہ سے خلافت بلافصل ثابت کرنے میں بڑے زور لگا چکے ہیں۔ ان کے امام اعظم شیخ حلی نے بھی منہاج الکرامہ میں اس آیت کو بڑے شدومد سے پیش کیا ہے۔ لہذا ضروری ہوا کہ آیت کی صحیح تفسیر اور اصلی واقعہ سے مسلمانوں کو آگاہ کردیا جائے۔ امید ہے کہ اس کے بعد انشاء اللہ تعالیٰ پھر کسی کا فریب کارگر نہ ہوگا۔ وحسبنا اللہ ونعم الوکیل۔

اہل سنت کہتے ہیں

آیۂ مباہلہ سے حضرت علیؓ کی خلافت بلافصل کیا معنیٰ مطلق خلافت بھی ثابت نہیں ہو سکتی۔ نہ ان کا تمام صحابہ سے افضل ہونا ثابت ہوتا ہے جو استدلال مخالفین نے کیا ہے اس میں چند خرابیاں ہیں جن میں سے بعض حسب ذیل ہیں۔

شیعہ تفسیر کی پہلی خرابی: یہ ہے کہ مخالفین کے اس استدلال کی بنیاد آیت قرآنی پر نہ ہوئی۔ بلکہ ایک روایت پر ہوئی اور روایت بھی حد تواتر کو نہیں پہنچی۔ کیونکہ حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ اور حسنینؓ کو ساتھ

لینے کا مضمون روایت ہی میں ہے۔ اور اسی پر استدلال کی بنیاد ہے۔ لہذا شیعوں کا یہ کہنا کہ اس آیت سے خلافت بلافصل ثابت ہوتی ہے بالکل بے اصل رہا۔

ف: کچھ اس آیت کی تخصیص نہیں بلکہ شیعوں نے قرآن کی جس آیت سے بھی استدلال کیا ہے۔ اس کے ساتھ روایت آحاد کا ضمیمہ لگایا گیا ہے بغیر اس ضمیمہ کے لگائے ہوئے ان کا کام ہی نہیں چلتا۔ اور پھر لطف یہ ہے کہ جن روایات آحاد کو آیت کے ساتھ ضمیمہ بناکر استدلال کرتے ہیں اکثر و بیشتر وہ روایات صحیح بھی نہیں ہوتیں۔ دوسری طرف ان کے علماء خود بھی اپنی کتابوں میں لکھتے ہیں کہ اخبار آحاد سے عقائد میں استدلال کرنا جائز نہیں ۔ جب جائز نہیں تو پھر خود ہی اپنے اتنے بڑے عقیدے کی بنیاد آحاد پر کیوں رکھتے ہیں؟ ان ھٰذا الشئی عجیب۔ ۱۱/ ۲۷

شیعہ بجائے اس کے کہ اپنی اس کارروائی پر نادم ہوتے ۔ بڑی ڈھٹائی سے کہتے ہیں کہ قرآن کے ساتھ اگر روایات نہ ملائی جائیں تو تفسیر بالرائے ہوجائے گی۔ اور تفسیر بالرائے فریقین کے یہاں ممنوع ہے۔ مقدمہ تفسیر آیات خلافت میں ہم تفسیر بالرائے کا مطلب بیان کرچکے ہیں۔ اور کئی ایک عبارتیں ائمہ تفسیر و حدیث کی نقل کرچکے ہیں۔ جن سے اچھی طرح واضح ہوگیا ہے کہ قواعد عربیت کی پابندی کے ساتھ بغیر روایت ملائے ہوئے اگر قرآن کی تفسیر کی جائے تو وہ ہرگز تفسیر بالرائے نہیں ہے۔ اس وقت اسی مقصد کی تائید میں ایک عبارت اور نقل کی جاتی ہے۔ علامہ محمد طاہر گجراتی مجمع بحارالانوار میں لکھتے ہیں۔

حدیث من قال فی کتاب اللہ برایۃ فاصاب فقد اخطاء لایجوزان یراد ان لایت کلم احد فی القرآن الابما سمعہ فان الصحابۃ رضی

الله عنهم قد فسروه و اختلفو فيه على وجوه وليس كلما قالوه سمعره منه ولانه لايفيد حينئذ دعاء ه اللهم فقهه فى الدين و علمه التاويل-

یہ حدیث کہ جس نے کتاب اللہ میں اپنی رائے سے کچھ بیان کیا اس نے صحیح بھی کہا تو خطا کی۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہوسکتا کہ کوئی شخص قرآن کے متعلق سوائے روایات کے کچھ نہ بیان کرے۔ اس لئے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے قرآن کی تفسیر بیان کی اور اس کے فہم میں ان میں اختلاف بھی ہوا، کیوں کہ رسول اللہؐ سے سن کر تو انہوں نے ہر تفسیر بیان نہیں کی ۔ نیز اگر ایسا ہوتا کہ سوائے رسول اللہؐ سے روایت کے تفسیر کرنا جرم ہوتا تو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بعض صحابہ کو یہ دعا دینا کہ یااللہ ان کو دین کی سمجھ دے اور تفسیر کا علم دے بیکار ہوجائے گا۔

والثانى ان يتسارع الىٰ التفسير لظاهر العربية من غير استظهار بالسماع فى غرائبه و مبهماته و فيما فيه الحذف و التقديم و ما عداهما فلاوجه للمنع فيه-

اسلئے تفسیر بالروایت کے علاوہ دوسری یہ صورت کہ قرآن کی تفسیر قواعد عرب کے مطابق کرے ۔ اور اس کے غرائب و مبہمات میں اور جن میں حذف یا تقدیم وغیرہ ہے ان میں روایات سے مدد نہ لے تو اس کے ممنوع ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔

شیعہ تفسیر کی دوسری خرابی: یہ ہے کہ حضرت فاطمہ و حسنین رضی اللہ عنہم کا بلانا تو بلا اختلاف صحیح روایات میں مذکور ہے۔ مگر حضرت علیؓ کا

بلانا اکثر صحیح روایات میں نہیں ہے۔ تفسیر طبری جلد سوم صفحہ ۱۹۲ ملاحظہ ہو۔

شیعہ تفسیر کی تیسری خرابی: یہ ہے کہ روایات سے اگر ثابت ہوتا ہے تو زائد از زائد یہ کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان حضرات کو بلایا۔ باقی رہا یہ کہ انفسنا سے مراد حضرت علیؓ ہیں۔ اور فلاں لفظ سے فلاں اور فلاں سے فلاں مراد ہیں تو یہ مضمون کسی روایت میں نہیں۔ ان الفاظ کی مراد جس نے بھی بیان کی ہے۔ اس نے اپنی رائے بیان کی ہے۔ اس کو حدیث کی طرف منسوب کرنا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول کہنا قطعاً کذب و افترا ہے۔

شیعہ تفسیر کی چوتھی خرابی: یہ ہے کہ لفظ انفسنا سے حضرت علیؓ کے مراد ہونے پر مفسرین اہل سنت کا اجماع بیان کرنا بھی خالص بہتان ہے۔ بلکہ تمام محققین مفسرین اس کے خلاف ہیں۔

تفسیر طبری جلد سوم صفحہ ۱۹۲ میں ہے۔

لانسلم ان المراد بانفسنا الامیربل المراد نفسه الشریفة صلی الله علیه و سلم۔

ہم نہیں مانتے کہ انفسنا سے جناب امیر مراد ہیں۔ بلکہ اس سے مراد خود آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نفس مقدس ہے۔

تفسیر جلالین میں لفظوں کی مراد کچھ بیان ہی نہیں کی ۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ ان کے نزدیک ان الفاظ کے وہی معنے مراد ہیں جو لغت میں سمجھے جاتے ہیں۔

تفسیر کشاف میں ہے۔

ندع ابناء نا و ابناء کم ۳/۶۱ ای یدع کل منی و منکم ابناء ہ و نساء ہ

و نفسه الی المباهلة -
ندع ابناء نا وابناء کم کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص ہم میں سے اور تم میں سے اپنے بیٹوں کو اور عورتوں کو اور اپنے نفس کو مباہلہ کی طرف بلائے۔
تفسیر مدارک میں بالکل کشاف کا تتبع ہے۔
تفسیر بیضاوی میں ہے۔
ای یدع کل مناو منکم نفسه و اعزة اهله -
یعنی بلائے ہر شخص ہم میں سے اور تم میں سے اپنے آپ کو اور اپنے خاندان کے عزیز تر لوگوں کو۔
شیعہ تفسیر کی پانچویں خرابی: یہ ہے کہ ان الفاظ کی خاص خاص مراد جس شخص نے بیان کی ہیں اس کے اس خیال کی بنیاد صرف یہ ہے کہ اس نے دیکھا کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت صرف انہیں حضرات کو بلایا۔ لہذا اس نے خیال کیا کہ ان سب الفاظ کا مصداق کسی نہ کسی طرح انہیں حضرات کو بنانا چاہیئے حالانکہ یہ بنیاد ہی غلط ہے ۔ ہاں اگر اہل نجران مباہلہ منظور کرلیتے تو اس وقت دیکھا جاتا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کن کن لوگوں کو اپنے ساتھ لے جاتے ۔ اگر اس وقت بھی سوا ان حضرات کے کسی کو اپنے ہمراہ نہ لے جاتے تو بے شک ان الفاظ کا مصداق انہیں حضرات کو ماننا ضروری ہوتا۔ یقیناً اگر نوبت مباہلہ کی آتی تو آپؐ اپنی ازدواج مطہرات کو ضرور ہمراہ لے جاتے۔ کیونکہ نساء نا سے کوئی اور مراد ہوہی نہیں سکتا۔
تفسیر بحر محیط جلد اول صفحہ ۴۷۹ میں ہے۔
و لو عزم نصاری نجران علی المباهلة وجاء و ا بهالا مرالنبی صلی الله علیه و سلم المسلمین ان یخرجو ا باهالیهم للمباهلة -

اور اگر نجران کے عیسائی مباہلہ کا ارادہ کرتے اور اس کیلئے آتے تو ضرور نبی صلی اللہ علیہ سلم مسلمانوں کو حکم دیتے کہ اپنے اپنے اہل و عیال کو لے کر مباہلہ کے لئے آئیں۔

شیعہ تفسیر کی چھٹی خرابی: یہ ہے کہ انفسنا سے حضرت علیؓ کا مراد ہونا اور نساء نا سے حضرت فاطمہؓ کا اور ابناء نا سے حضرت حسنینؓ کا مراد ہونا لغت عرب اور محاورہ قرآنی کے خلاف ہے۔

لفظ انفس نفس کی جمع ہے۔ نفس ہر شخص کا اس کی ذات کو کہتے ہیں نہ کسی دوسرے کو پھر لفظ جمع سے شخص واحد کو مراد لینا بھی ناجائز ہے الامجازاً۔ محاورہ قرآنی دیکھئے تو قرآن مجید میں کئی جگہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام اہل مکہ اور تمام مسلمانوں کے انفس سے فرمایا ہے۔ سورۃ آل عمران کی آیت ۱۶۴ دیکھئے - **لقد من اللہ علیٰ المؤمنین اذ بعث فیھم رسولا من انفسھم** سورۃ توبہ کی آیت ۱۲۸ میں ہے **لقد جاء کم رسول من انفسکم** - لہذا صرف حضرت علیؓ کو لفظ انفس سے مراد لینا اور سب کو خارج کردینا ان آیات کے خلاف ہوگا۔

لفظ ابناء نا جمع ابن کی ہے۔ لغت عرب میں ابن بیٹے کو کہتے ہیں۔ نواسے کو ابن البنت کہتے ہیں۔ قرآن مجید میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت فرمایا کہ آپ کسی مرد کے باپ نہیں ہیں۔ **ما کان محمد ابا احد من رجالکم** - لہذا کسی مرد کو آپ کا بیٹا کہنا اس آیت کے خلاف ہوگا - احادیث میں بیشک وارد ہوا ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسنؓ و حسینؓ کو بیٹا فرمایا۔ مگر یہ فرمانا بطور مجاز کے محض اظہار محبت کے لئے تھا۔ جیسا کہ ظاہر ہے۔

لفظ نساء جمع ہے۔ اس کے معنے عورتوں کے ہیں۔ جب یہ لفظ کسی

شخص کی طرف مضاف ہوتا ہے تو اس سے اس شخص کی زوجہ مراد ہوتی ہے۔ قرآن مجید میں کئی جگہ یہ لفظ مضاف ہوکر مستعمل ہوا ہے اور وہاں بالاتفاق زوجہ مراد ہے۔ سورہ احزاب میں یا نساء النبی سے بلااختلاف آپ کی ازواج مطہرات مراد ہیں۔ لہذا اس لفظ سے حضرت فاطمہؓ کو مراد لینا کسی طرح صحیح نہیں ہوسکتا۔ کسی زبان میں کسی کی بیٹی کو اس کی عورت کہنا درست نہیں ہے۔

ایک نکتہ: آیہ مباہلہ میں قابل توجہ یہ بات بھی ہے کہ اس آیت میں حق تعالیٰ نے ایک فریق آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے متبعین کو بنایا ہے۔ اور دوسرا فریق نجران کے عیسائیوں کو اور لفظ ابناء اور نساء اور انفس دونوں فریق کے لئے علیحدہ علیحدہ استعمال فرمائے ہیں شیعوں نے اپنی ساری ذہانت و طباعی جو ان الفاظ کے معانی تصنیف کرنے میں صرف کی ہے۔ وہ صرف ایک فریق یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کہ آپ کے ابناء سے حضرات حسنینؓ اور آپ کی نساء سے حضرت فاطمہؓ اور آپؐ کے انفس سے حضرت علیؓ مراد ہیں۔ لیکن دوسرے فریق کے لئے ان الفاظ کے کوئی معنی شیعوں نے بیان نہیں کئے۔ حالانکہ اگر ازروئے لغت یہ معنی صحیح ہیں تو دوسرے فریق کے لئے بھی یہی معنے ہونے چاہئیں۔

کیا شیعوں میں سے کوئی صاحب بتاسکتے ہیں کہ عیسائیوں کے ابناء سے مراد کیا صرف ان کے لیڈر کے نواسے اور عیسائیوں کی نساء سے مراد کیا صرف ان کے لیڈر کی بیٹی اور انفس سے مراد کیا صرف عیسائی وفد کے لیڈر کا چچازاد بھائی ہیں؟ ہرگز نہیں۔ یقیناً عیسائیوں کے لئے یہ الفاظ اپنے

عموم پر قائم رکھے گئے ہیں اور لغوی معنی میں مستعمل ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ دوسرے فریق کے لئے ان الفاظ کے معنی میں اس قدر تکلف سے کام لیا گیا۔

ایک عقلمند شخص کے لئے اس تمام کاروائی کی حقیقت معلوم کرنے کیلئے یہی ایک نکتہ کافی ہے۔

شیعہ تفسیر کی ساتویں خرابی: یہ ہے کہ بفرض محال مان لیا جائے کہ انفسنا سے حضرت علیؓ مراد ہیں تو بھی خلافت بلافصل ثابت نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ حضرت علیؓ کا نفس رسول ہونا حقیقی معنی میں تو ہو ہی نہیں سکتا۔ ورنہ حضرت علیؓ کا نبی ہونا بھی ثابت ہوجائے گا۔ اور اس سے بڑھ کر خرابی یہ ہوگی کہ معاذاللہ حضرت فاطمہؓ کا نکاح آپ کے ساتھ درست نہ ہوگا۔ لامحالہ مجازی طور پر حضرت علیؓ کو نفس رسول کہا جائے گا۔ تو اس صورت میں نہ ان کا معصوم ہونا ثابت ہوگا نہ تمام صحابہ سے افضل ہونا کیونکہ مجاز میں حقیقت کے تمام اوصاف کا موجود ہونا ضروری نہیں اور اگر خواہ مخواہ نفس رسول ہونے سے استحقاق خلافت ثابت ہو تو پھر یہ استحقاق تمام صحابہ بلکہ تمام اہل مکہ کے لئے ماننا پڑے گا کیونکہ قرآن مجید میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان سب کے انفس سے فرمایا گیا ہے جیسا کہ ہم اوپر دو آیتیں پیش کر آئے ہیں۔

آیت مباہلہ کی صحیح تفسیر اور مخالفین کا غلط استدلال اور اس استدلال میں جو خرابیاں تھیں۔ ان کا بیان ہوچکا ہے۔

اس بیان سے اچھی طرح واضح ہوگیا ہے کہ آیت سے بغیر اخبار آحاد کا ضمیمہ لگائے خلافت بلافصل کیا معنی، حضرت علیؓ کی کوئی مخصوص فضلیت بھی ثابت نہیں ہوتی۔ آیت سے تو تمام صحابہؓ کی فضلیت ثابت ہوتی ہے جن میں سے ایک حضرت علیؓ بھی ہیں۔ لہذا جو فضلیت باقی

صحابہ کو حاصل ہے وہی فضیلت حضرت علیؓ کو بھی حاصل ہے۔

آٹھویں مثال۔ آیہ تقیہ

لغوی اعتبار سے وقی کے معنیٰ بچنا ہیں، تقویٰ اسی سے ہے یعنی احکام الہیٰ کی خلاف ورزی سے بچنا۔ مگر شیعوں کے ہاں تقیہ کا مطلب ہے دل میں کچھ ہو اور زبان پر کچھ اور۔ یعنی اگر کسی دشمن کو بیوقوف بنانے کے لئے ظاہری طور پر اس سے محبت کا برتاؤ کیا جائے مگر دل میں اس سے دشمنی رکھی جائے اور اسکی جڑ کھودی جائے اسکا نام تقیہ ہے۔ لطف یہ ہے کہ اپنی تائید میں وہ اس آیت کو پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے کفار سے دوستی کی ممانعت کی ہے لیکن ساتھ ہی یہ کہہ دیا ہے کہ اگر ان سے نقصان کا خطرہ ہو تو ظاہرداری کے طور پر ان سے دوستی کی اجازت ہے یہی تقیہ ہے ۔ شیعوں کے ہاں اسکی اتنی اہمیت ہے کہ ان کے نزدیک جو شخص جتنا بڑا تقیہ باز ہوگا اتنا ہی اللہ کے نزدیک مکرم و محترم ہوگا۔ شیعہ احادیث کی چار معتبر ترین کتابوں میں سے ایک کتاب من لایحضرہ الفقیہ کے مصنف جناب قمی اپنے عقائد کی کتاب اعتقادیہ صدوق میں (جو کراچی یونیورسٹی کے ایم اے (شیعہ اسلامیات) کی کتب مطالعہ میں شامل ہے) قرآنی آیت ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم ۴۹ / ۱۳ کا یہی مطلب بتاتے ہیں۔

شیعہ عقائد کی سب سے قدیم اور سب سے مستند کتاب اصول کافی میں پورا ایک باب تقیہ پر ہے جس میں اسکی اہمیت بتائی گئی ہے۔ اس میں سے ایک حدیث ملاحظہ ہو۔

ان تسعة اعشار الدین فی التقیه و لادین لمن لاتقیة له (اصول کافی مطبوعہ نولکشور لکھنو صفحہ ۴۸۲)

امام جعفر فرماتے ہیں کہ دین کے دس میں سے نو حصہ تقیہ میں ہیں اور جو شخص تقیہ نہیں کرتا اسکا دین سے کوئی تعلق نہیں۔

ایک دوسری حدیث دیکھئے جس میں تقیہ کرنا شیعوں کا خاندانی طریقہ بتایا گیا ہے۔ امام باقر فرماتے ہیں۔

قال ابو جعفر علیه السلام التقیة من دینی و دین آبائی ، ولا ایمان لمن لاتقیة له - (اصول کافی صفحہ ۴۸۴)

تقیہ میرا اور میرے آباء و اجداد کا دین ہے اور جو شخص تقیہ نہ کرے اسکا ایمان ہی نہیں۔

یہ خیال رہے کہ مسلمانوں کے نزدیک مجبوری کی حالت میں جھوٹ بولنا (تقیہ کرنا) ایسا ہی ہے جیسے مجبوری میں خنزیر اور مردار کھانا۔ شیعوں کے علاوہ دنیا میں کوئی مذہب بھی ایسا نہیں ہے جو جھوٹ اور دھوکے بازی کو اتنی اہمیت دے کہ اسے اپنے مذہب کا نو حصہ قرار دے اور اسے اتنا لازم سمجھے کہ جو اس پر عمل نہ کرے وہ بد دین اور بے ایمان سمجھا جائے۔ اس تمہید کے بعد اب آیۂ تقیہ کا صحیح مفہوم ملاحظہ فرمائیے۔ مشہور مفسر مولانا امین احسن اصلاحی اپنی تفسیر تدبر قرآن جلد اول میں لکھتے ہیں۔

لایتخذ المؤمنون الکفرین اولیاء من دون المؤمنین و من یفعل ذلک فلیس من الله فی شیء الا ان تتقوا منهم تقة ○ ویحذر کم الله نفسه ○ والی الله المصیر ○ قل ان تخفوا مافی صدورکم او تبدوه یعلمه الله ○ ویعلم مافی السموت و مافی الارض ○ والله علیٰ کل شیء قدیر ○ یوم تجد کل نفس ماعملت من خیر محضراً . وما عملت من سوء . تودلو ان بینها و بینه امدا بعیدا ○ ویحذرکم الله نفسه . والله رء وف بالعباد

O قل ان كنتم تحبون الله فاتبعونى يحببكم الله و يغفرلكم ذنو بكم O و الله غفور رحيم O قل اطيعوا الله و الرسول . فان تولوا فان الله لايحب الكفرين O (٣ / ٢٨ - ٣٢)

ترجمہ : اہل ایماں مومنوں کے برخلاف کافروں کو اپنا دوست نہ بنائیں اور جو ایسا کریں گے تو اللہ سے ان کو کوئی تعلق نہیں ، مگر یہ کہ تم ان سے بچو جیسا بچنے کا حق ہے ، اللہ تمہیں اپنی ذات سے ڈراتا ہے اور اللہ ہی کی طرف لوٹنا ہے ، کہہ دو کہ جو کچھ تمھارے دلوں میں ہے اس کو چھپاؤ یا ظاہر کرو ، اللہ اس سے باخبر ہے اور وہ اس سب کو جانتا ہے جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے ۔ جس دن ہر جان اپنی کی ہوئی نیکی کو اپنے سامنے موجود پائے گی اور جو برائی کی ہوگی اس کو بھی موجود پائے گی اور وہ آرزو کرے گی کہ کاش اس کے اور اس کے درمیان ایک زمانہ دراز حائل ہوتا اور اللہ اپنی ذات سے تمہیں ہوشیار کرتا ہے ، اللہ اپنے بندوں کے ساتھ بڑا مہربان ہے ۔ ٢٨-٣٠ ۔ سورۃ آل عمران

کہہ دو ، اگر تم اللہ کو دوست رکھتے ہو تو میری پیروی کرو ، اللہ تم کو دوست رکھے گا اور تمہارے گناہوں کو بخشے گا، اللہ بخشنے والا ، رحم کرنے والا ہے ۔ کہہ دو کہ اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی ، اگر یہ اعراض کریں تو یاد رکھیں کہ اللہ کافروں کو دوست نہیں رکھتا ۔ ٣١-٣٢ سورۃ آل عمران

الفاظ کی تحقیق اور جملوں کی وضاحت

لايتخذ المؤمنون الكفرين اولياء من دون المؤمنين و من يفعل ذلك فليس من الله فى شىء الا ان تتقوا منهم تقة . و يحذركم

الله نفسه ، و الی الله المصیر (۳ / ۲۸)

"مؤمنون" کا لفظ اگرچہ بظاہر عام ہے لیکن مراد اس سے خاص طور پر وہ مسلمان ہیں جو ابھی پوری طرح یکسو نہیں ہوئے تھے بلکہ کچھ اپنے ذاتی مصالح کی وجہ سے اور کچھ اسلام کے مستقبل کے بارے میں جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے، غیر مطمئن ہونے کے باعث، یہود کی طرف میلان رکھتے تھے، اور یہود اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جو سازشیں کرتے تھے اس میں وہ ان کو آلہ کار بنا لیتے تھے اور یہ ان کے آلہ کار بن جاتے تھے۔ ان کو مخاطب کرکے فرمایا کہ اب یہود کے ساتھ موالات اور دوستی اجڑے گھر کی دربانی بھی ہے اور یہ حرکت ایمان و اسلام کے دعوے کے منافی بھی ہے۔

"کافرین" سے یہاں مراد اہل کتاب خاص طور پر یہود ہیں جیسا کہ آیت ۲۱ میں ان کے کفر کی تصریح گزر چکی ہے۔

"ولی" کے معنی کارساز، حمایتی، ساتھی، دوست اور مددگار کے ہیں جس کی طرف ضرورت کے وقت رجوع کیا جائے اور جس کا حمیت و حمایت کے جذبے سے ساتھ دیا جائے۔ فرمایا کہ مسلمانوں کے لئے جائز نہیں کہ وہ کافروں کو اپنا ولی بنائیں لیکن اس کے ساتھ من دون المؤمنین کی قید ہے یعنی کافروں کے ساتھ صرف اس قسم کی موالات ناجائز ہے جو مسلمانوں کے بالمقابل یا ان کے مفاد و مصالح کے خلاف ہو۔ اسلام اور مسلمانوں کا حق اور مفاد دوسرے تمام حقوق و مفادات پر مقدم ہے اس لئے مسلمانوں کی کسی جماعت کے لئے یہ بات جائز نہیں ہے کہ وہ اسلام اور مسلمانوں کے مفاد و مصالح کے برخلاف کفار کی کسی جماعت کے ساتھ موالات کا تعلق قائم کرے۔ اس قید نے یہ بات واضح کردی کہ غیر حربی کفار کے ساتھ اس نیکی، عدل اور احسان کی ممانعت

نہیں ہے جس کی اسلام نے تمام بنی نوع انسان کے معاملے میں ہدایت فرمائی ہے۔ مسلمان غیر مسلم قوموں اور حکومتوں کے ساتھ دوستانہ سیاسی و اقتصادی معاہدے بھی کرسکتے ہیں بشرطیکہ وہ " من دون المؤمنین " نہ ہوں۔ اس مسئلے پر تفصیلی بحث ہم آگے موزوں مقام پر کریں گے۔

الا ان تتقوا منهم تقة (مگر یہ کہ ان سے بچو جیسا کہ بچنے کا حق ہے) تقة ، جس طرح اسی سورۃ کی آیت ۱۰۲ اتقوا الله حق تقاته میں مفعول مطلق کے طور پر استعمال ہوا ہے اسی طرح یہاں بھی مفعول مطلق ہے جس سے فعل کی تاکید ظاہر ہورہی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو مسلمان اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کفار سے موالات کا تعلق رکھتے ہیں ان کا اللہ سے کوئی تعلق نہیں۔ اس قسم کے لوگ ، جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا ہے و من یتولهم منکم فانه منهم ۵/۵۱ انہی لوگوں کے اندر شامل ہیں جن سے یہ موالات رکھتے ہیں۔ اللہ اور اعداء اللہ دونوں کے ساتھ بیک وقت دوستی قائم نہیں رکھی جاسکتی۔ اللہ سے دوستی کے لئے ضروری ہے کہ ان لوگوں سے اپنا دامن بچاکے رکھو جو اللہ کے ، اس کے دین کے اور اس کے وفادار بندوں کے دشمن ہیں۔

یہ جملہ گویا لیس من الله فی شیء سے استثنا ہے یعنی اس نفی سے مستثنیٰ صرف وہی ہیں جو ان کفار کی مخالفت اسلام موالات سے اس طرح بچیں جس طرح اس سے بچنے کا حق ہے ۔ اس آیت سے جن لوگوں نے تقیہ کا جواز نکالا ہے انھوں نے لغت ، نظائر قرآن اور سیاق و سباق ہر چیز کو نظر انداز کیا ہے لیکن صحیح تاویل واضح ہو جانے کے بعد اب اس کی تردید کی ضرورت باقی نہیں رہی

ویحذرکم اللہ نفسہ (اور اللہ تمہیں اپنی ذات سے ہوشیار کرتا ہے) میں منافقین کے لئے تنبیہ کا ایک خاص پہلو ہے۔ وہ یہ کہ اللہ کی کریمی سے دھوکے میں پڑکے اس کی ذات کے دوسرے پہلوؤں کو نظر انداز نہ کر جاؤ۔ وہ اکثر شرارتوں سے درگزر کرتا ہے، سازشوں کو نظر انداز کرتا ہے اور ریشہ دوانیوں کا فوراً نوٹس نہیں لیتا تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ یہ جرائم اس کے نزدیک جرائم نہیں یا وہ ان جرائم پر گرفت نہیں کر سکتا بلکہ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ بندوں کو آخری حد تک مہلت دیتا ہے۔ یہ مہلت بہرحال مہلت ہے جو ایک دن ختم ہونی ہے۔ اس کے بعد اس کا عدل ظہور میں آئے گا اور یہ عدل بھی اس کی ذات ہی کا ایک پہلو ہے۔ یہ اگر ابھی ظہور میں نہیں آیا ہے تو اس سے کوئی یہ نہ سمجھ بیٹھے کہ یہ ظہور میں آئے گا ہی نہیں۔ اللہ کے کاموں میں دیر ہے اندھیر نہیں۔

اس موقع پر قرآن مجید کی یہ آیت بھی پیش نظر ہے۔ لاتجد قوماً یؤمنون باللہ والیوم الاخر یوادون من حاد اللہ و رسولہ مجادلہ ۲۲ تم کوئی ایسی قوم نہیں پاسکتے جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتی ہو، پھر وہ ان لوگوں سے دوستی رکھے جو اللہ اور اس کے رسولؐ سے دشمنی رکھتے ہیں۔ (۵۸ : ۲۲)

نویں مثال۔ رسول اللہؐ پر جادو

سورہ فلق اور سورہ ناس کا شان نزول

سورہ تحریم کے شان نزول اور آیہ افک کے شان نزول کی طرح قرآن مجید کی آخری دو سورتوں سورہ فلق اور سورہ ناس کا شان نزول بھی بہت مشہور ہے۔ اور سورہ تحریم و آیہ افک کے شان نزول سے تو صحابہ و صحابیات پر حرف آتا تھا، رسول اکرمؐ پر بالواسطہ چوٹ پڑتی تھی مگر ان آخری سورتوں کے شان نزول میں تو براہ راست رسول اکرمؐ پر حملہ کیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ مدینہ منورہ کے کسی یہودی مرد یا عورت نے آنحضرتؐ پر جادو کیا جس سے آپ کئی ماہ تک متاثر رہے۔

رسول اکرمؐ پر جادو کی یہ روایات یوں تو ہر تفسیر و سیرت کی کتاب میں ملتی ہیں مگر زیادہ افسوس اس پر ہے کہ بخاری و مسلم میں بھی متعدد جگہ ان کا تذکرہ موجود ہے۔ مثلاً بخاری میں کتاب الطب، باب ہل یستخرج السحر جلد ۲ صفحہ ۸۵۸ میں اور کتاب الادب، باب ان اللہ یا مر بالعدل والاحسان ج۔ ۲ ص ۸۹۵۔۸۹۶ میں یہ روایت موجود ہے اور مسلم کی کتاب السلام، باب السحر میں بھی ہے۔ لہذا یہ روایت بخاری و مسلم دونوں کی متفق علیہ ہے اور عام روایت پرستانہ نقطۂ نظر سے تو اب ان روایات پر شک کرنا بھی گناہ ہے۔ لیکن اللہ کا فضل ہے کہ فقہ حنفی کے ایک جلیل القدر امام اور محدث ابوبکر جصاص رازی اپنی کتاب احکام القرآن میں اس روایت پر انتہائی سخت الفاظ میں تنقید کرتے ہوئے اسے جعلی قرار دیتے ہیں۔ وہ سحر کی حقیقت پر بحث کرتے ہوئے سورہ بقرہ کی

آیت و اتبعوا ماتتلوا الشیاطین علی ملک سلیمان کی تفسیر میں لکھتے ہیں۔(البقرہ : ۱۰۲)

و من صدق ھذا افلیس یعرف النبوۃ و لایا من ان تکون معجزات الانبیاء علیھم السلام من ھذا النوع و انھم کانوا سحرۃ و قال اللہ تعالیٰ و لایفلح الساحر حیث الیٰ- و قدا جازوا من فعل الساحر ماھو اطم من ھذا و افظع و ذلک انھم زعموا ان النبی علیہ السلام سحر، و ان السحر عمل فیہ حتی قال فیہ انہ یتخیل لی انی اقول الشئی و افعلہ ولم اقلہ ولم افعلہ ، و ان امرأۃ یھودیۃ سحرتہ فی جف طلعۃ و مشط و مشاقۃ حتی اتاہ جبریل علیہ السلام فاخبرہ انھا سحرتہ فی جف طلعۃ و ھو تحت راعوفۃ البئر فاستخرج وزال عن النبی علیہ السلام ذلک العارض و قد قال اللہ تعالیٰ مکذ بالاکفار فیما ادعوہ من ذلک للنبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال جل من قائل- و قال الظالمون ان تتبعون الارجلا مسحورا-

و مثل ھذہ الاخبار من وضع الملحدین تعلبا بالحشو الطغام و استجراراً لھم الی القول بابطال معجزات الانبیاء علیھم السلام و القدح فیھا و انہ لافرق بین معجزات الانبیاء و فعل السحرۃ و ان جمیعہ من نوع و احد-

و العجب ممن یجمع بین تصدیق الانبیاء علیھم السلام و اثبات معجزاتھم و بین التصدیق بمثل ھذا من فعل السحرۃ مع قولہ تعالیٰ و لا یفلح الساحر حیث الیٰ - فصدق ھؤلاء من کذبہ اللہ و اخبر ببطلان دعواہ و انتحالہ-

لوگ اس قسم کی جادو کی شعبدہ بازیوں کی تصدیق کرنے لگتے ہیں۔

حالانکہ جو ان کی تصدیق کرتا ہے وہ نبوت کے مقام کو سمجھتا ہی نہیں اور اس سے بعید نہیں کہ وہ انبیاء کے معجزات کو بھی اسی نوع سے قرار دے دے اور خود انبیاء کو بھی جادوگر خیال کرے ارشاد الٰہیٰ ہے

و لا یفلح الساحر حیث اتیٰ (۲۰ : ۶۹)

جادوگر کبھی کامیاب نہیں ہوسکتا وہ کہیں بھی آجائے۔

مگر حیرت ہے کہ لوگوں نے جادوگروں کی کارستانیوں کو جائز قرار دے لیا ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ ہولناک اور شرمناک بات کو بھی یعنی یہ کہ ان کا خیال ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی جادو کیا گیا تھا اور آپؐ پر جادو نے اثر بھی کردیا تھا۔ حتیٰ کہ آپؐ نے فرمایا تھا کہ مجھے ایسا خیال ہوتا ہے کہ میں کوئی بات کہہ رہا ہوں اور کررہا ہوں حالانکہ میں نے نہ کہا ہوتا ہے نہ کیا ہوتا ہے۔ اور ایک یہودی عورت (بعض روایات میں عورت کا نام ہے، بعض میں مرد کا نام ہے) نے آپؐ پر کھجور کے چھلکے کے اندر کنگھی اور بالوں میں جادو کردیا تھا۔ حتیٰ کہ آپؐ کے پاس جبریل آئے اور انہوں نے آپ کو اطلاع دی کہ فلاں عورت نے کھجور کے ایک چھلکے میں جادو کردیا ہے اور وہ کنویں کے پتھر کے نیچے دبا ہوا ہے تو آپؐ نے اس کو نکلوایا اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا اثر دور ہوگیا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے کفار کے دعوٰے کو جھٹلاتے ہوئے جو وہ آپؐ کے بارے میں بکتے تھے یہ فرمایا تھا۔

و قال الظلمون ان تتبعون الا رجلاً مسحوراًo (۲۵ : ۸)

اور ظالموں نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ تم تو ایک ایسے ہی آدمی کے پیچھے لگ گئے ہو جس پر جادو کردیا گیا ہے۔

دراصل اس طرح کی حدیثیں ملحدوں کی وضع کردہ ہیں جو رذیلوں اور اوباشوں کی بات کو اہمیت دینے اور بتدریج لوگوں کو اس بات کے لئے

تیار کرنے کے واسطے گھڑی گئی ہیں تاکہ انبیاء کے معجزات کو باطل کیا جائے اور ان میں شبہ ڈالا جائے اور اس کا قائل کیا جائے کہ انبیاء کے معجزات اور جادوگروں کی شعبدہ کاریوں میں کوئی فرق نہیں ہے - اور سب کی سب ایک ہی قسم سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس قسم کی روایات بیان کرنے والوں پر تعجب ہوتا ہے کہ ایک طرف تو وہ انبیاء کی تصدیق بھی کرتے ہیں ، ان کے معجزات کو ثابت بھی کرتے ہیں اور دوسری طرف اسکی تصدیق بھی کرتے ہیں کہ جادوگر بھی یہ کچھ کرسکتا ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ فرما چکا کہ و لا یفلح الساحر حیث اتیٰ جادوگر کہیں بھی آجائے کامیاب نہیں ہوتا۔ اسکا مطلب یہ ہوا کہ جسے اللہ نے جھٹلادیا اور جسکے دعویٰ اور کاریگری کے باطل ہونے کی اللہ نے خبردی لوگ اسے سچا سمجھ رہے ہیں (احکام القرآن مطبوعہ مصر جلد اول صفحہ ۵۵-۵۶)

یہ اللہ کا فضل ہے کہ موجودہ دور کے مفسرین کی اچھی خاصی تعداد اس قسم کی جعلی روایات کی حقیقت سے آگاہ ہے اور انھیں تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں۔ فراہی مکتب فکر کے نامور مفسر مولانا امین احسن اصلاحی اپنی تفسیر تدبر قرآن جلد ہشتم میں جادو کی روایات پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

" یہ سورہ کسی شان نزول کی محتاج تو نہیں ہے لیکن اس کے تحت لوگوں نے ایک واقعہ نقل کیا ہے جس سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر العیاذ باللہ کچھ یہودیوں نے ایک زمانہ میں جادو کردیا تھا جس سے آپؐ بیمار ہوگئے تو آپؐ کو یہ سورہ سکھائی گئی اور آپؐ اس جادو کے اثرات بد سے محفوظ ہوئے۔

اگرچہ یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ اس جادو کا کوئی اثر آپؐ کے فرائض نبوت پر نہیں پڑا لیکن ساتھ ہی نہایت سادہ لوحی سے یہ اعتراف بھی

کر لیا گیا ہے کہ اسکا اثر حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ پڑا کہ آپؐ گھلتے جارہے تھے، کسی کام کے متعلق خیال فرماتے کہ کر لیا ہے لیکن ہنیں کیا ہوتا، ازواج مطہرات کے متعلق خیال فرماتے کہ ان کے پاس گئے ہیں لیکن ہنیں گئے ہوتے۔ بعض اوقات اپنی نظر پر بھی شبہ ہوتا کہ ایک چیز کو دیکھا ہے مگر ہنیں دیکھا ہوتا۔ ان حضرات کے بیان کے مطابق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حالت گھنٹے دو گھنٹے یا دن دو دن ہنیں بلکہ پورے چھ ماہ رہی۔ اب سوال یہ ہے کہ جب پورے چھ ماہ آپؐ پر العیاذ باللہ، تعطل دماغ کی یہ کیفیت طاری رہی تو کیا یہ امکان مستبعد قرار دیا جاسکتا ہے کہ، العیاذ باللہ، آپؐ نے خیال فرمایا ہو کہ نماز پڑھ لی ہے درآنحالیکہ نہ پڑھی ہو یا یہ کہ نازل شدہ وحی کا تبین وحی کو لکھوادی ہے حالانکہ نہ لکھوائی ہو یا یہ کہ جبریل امینؑ کو دیکھا ہے حالانکہ نہ دیکھا ہو ان امکانات کو کس دلیل سے آپ رد کر سکتے ہیں؟ اگر کوئی کہے کہ اس طرح کی کوئی بات روایات میں ہنیں ملتی تو ایک شخص کہہ سکتا ہے کہ روایات میں تمام جزئیات کہاں بیان ہو سکتی ہیں، لیکن ایک ایسے شخص سے جس کی ذہنی حالت آپ کے بیان کے مطابق وہ ہے جو مذکور ہوئی تو اس سے ان باتوں کا صادر ہونا تعجب انگیز ہنیں بلکہ نہ صادر ہونا تعجب انگیز ہے۔

میرے نزدیک اس شان نزول کو رد کرنے کے لئے یہ دلیل کافی ہے کہ یہ اس مسلمہ عقیدے کے بالکل منافی ہے جو قرآن نے انبیاء علیہم السلام سے متعلق ہمیں تعلیم کیا ہے۔ عصمت حضرات انبیاء (علیہم السلام کی ان خصوصیات میں سے ہے جو کسی وقت بھی ان سے منفک ہنیں ہو سکتیں۔ اس عصمت کو اس امر سے کوئی نقصان ہنیں پہنچتا کہ نبی کے دندان مبارک شہید ہو گئے یا وہ زخمی ہو گیا یا وہ قتل کر دیا گیا۔ ان میں سے

کوئی چیز بھی اس کی نبوت میں قادح نہیں ہے کہ اس کو آپ اس امر کی دلیل بنائیں کہ جب نبی ان چیزوں میں مبتلا ہوسکتا ہے تو مسحور بھی ہوسکتا ہے یہاں تک کہ اس کو کردہ اور ناکردہ، دیدہ اور نادیدہ میں کوئی امتیاز ہی باقی نہیں رہ جاتا۔ اللہ تعالیٰ نے اس طرح کے شیطانی تصرفات سے اپنے نبیوں کو محفوظ رکھا ہے اور ان کی یہ محفوظیت دین کے تحفظ کے لئے ناگزیر ہے۔ یہ محفوظیت ہی نبی کے ہر قول و فعل کو سند بناتی ہے۔ پورا قرآن انبیاء کی عصمت پر گواہ ہے اور ہر مسلمان پر واجب ہے کہ وہ ان کی عصمت پر ایمان رکھے۔

شان نزول کے اس واقعے کو اگر روایات کے اصولوں پر جانچا جائے تو اس میں نمایاں ضعف موجود ہے۔ صحاح کی ایک روایت میں رنگ آمیزی کرنے کے لئے تیسرے درجے کی ضعیف و موضوع روایتوں کا سہارا لیا گیا ہے اور اس کو ایک امر واقعہ کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ یہ روایت صحاح میں سے صرف بخاریؒ، مسلمؒ اور ابن ماجہؒ نے لی ہے اور سند کے تیسرے واسطہ تک یہ خبر واحد ہی رہی ہے۔ حتیٰ کہ بخاری کی ایک روایت میں سفیان بن عیینہؒ یہ اقرار کرتے ہیں کہ میں نے اسے ابن جریج سے بالکل پہلی مرتبہ سنا۔ گویا اس واقعہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے سو سال بعد شہرت پائی، اس سے پہلے اس کا علم صرف بعض افراد تک محدود رہا۔ ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ، العیاذ باللہ، اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم چھ ماہ تک مسحور رہے ہوتے تو یہ واقعہ اتنا غیر معمولی تھا کہ صدر اول ہی میں اس کا چرچا ہوجاتا اور یہ روایت ایک متواتر روایت کی حیثیت سے ہم تک پہنچتی۔ (تدبر قرآن جلد ۸ صفحہ ۶۶۵-۶۶۶)

عرب دنیا کی اصلاحی تحریک الاخوان المسلمون کے قائد سید قطب اپنی

تفسیر فی ظلال القرآن جلد ششم میں لکھتے ہیں:

وقد وردت روایات- بعضها صحیح ولکنه غیر متواتر- ان لبید بن الاعصم الیهودی سحر النبی صعلم فی المدینة قیل ایاما وقیل اشهرا حتی کان یخیل الیه انه یاتی النساء وهو لایا تیهن فی روایة وحتی کان یخیل الیه أنه فعل الشئی ولم یفعله فی روایة - وأن السورتیں نزلا رقیة لرسول الله صلی الله علیه وسلم ولکن هذه الروایات تخالف اصل العصمة النبویة فی الفعل والتبلیغ ، ولا تستقیم مع الاعتقاد بان کل فعل من افعاله صلی لله علیه وسلم وکل قول من اقواله ، سنة وشریعة ، کما انها تصطدم نبفی القرآن عن الرسول صلی الله علیه وسلم انه مسحور وتکذیب المشرکین فیما کانو ایدعونه من هذالافک- ومن ثم تستبعد هذه الروایات ، واحادیث الاحاد لایؤخذبها فی امر العقیدة - والمرجع هوالقرآن- والتواتر شرط الاخذ بالاحادیث فی اصول الاعتقاد وهذهالروایات لیست من المتواتر- فضلاً علی ان نزول هایتن السورتیں فی مکة هوالراجح ، ممایوهن اساس الروایات الاخریٰ-

بخاری و مسلم کی کچھ روایات میں جو متواتر نہیں ہیں یہ بات کہی گئی ہے کہ مدینہ میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر بقول بعض کچھ دن کے لئے اور بقول بعض کچھ مہینوں کے لئے لبید بن اعصم یہودی نے جادو کردیا تھا جس کے نتیجہ میں آپؐ سمجھتے تھے کہ ازواج مطہرات کے ہاں ہو آئے ہیں ، حالانکہ ہوکے نہیں آتے تھے، اور بعض روایات کی رو سے آپؐ سمجھتے تھے کہ آپؐ نے فلاں کام کرلیا ہے حالانکہ نہیں کیا ہوتا تھا- کہا جاتا ہے کہ یہ سورتیں اسی جادو کا اثر ختم کرنے کے لئے نازل کی گئی تھیں-

لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ روایات نبیؐ کے افعال و اعمال اور تبلیغ میں عصمت کے تصور کے خلاف ہیں۔ اور اس اعتقاد کے بھی کہ نبیؐ کا ہر قول و فعل سنت و شریعت ہوتا ہے، بالکل برعکس ہیں۔ اسی طرح یہ روایات قرآن کے اس ارشاد کے بھی خلاف ہیں جس میں مشرکین کے الزامات کی تردید کرتے ہوئے نبی کے جادو زدہ ہونے سے انکار کیا گیا ہے۔

بہرحال یہ روایات ناقابل اعتماد ہیں۔ پھر عقائد کے متعلق غیر متواتر احادیث سے استدلال کرنا ہی غلط ہے۔ عقائد کی بنیاد تو صرف قرآن کریم ہے یا متواتر احادیث ہیں۔ جبکہ جادو کی یہ روایات غیر متواتر ہیں۔ پھر ان سب سے قطع نظر راجح روایات کی رو سے سورہ فلق اور سورہ ناس کا نزول مکہ میں ہوا تھا۔ اسلئے مدینہ میں جادو کے واقعہ کو ان کا شان نزول بتانے والی روایات کی بنیاد ہی ختم ہوجاتی ہے۔
(فی ظلال القرآن ۔ سید قطب ۔ شرکۃ دارالعلم ۔ جدہ ۔ سعودی عرب جلد ٦ صفحہ ٤٠٨)

اعجاز القرآن

حصہ چہارم

محاذِ قرأت

(۱) نقطوں اور حرکات کی ایجاد کے نام پر فتنہ پردازی

کئی سال پہلے مودودی صاحب سے کسی نے پوچھا تھا کہ دجال کے متعلق مختلف ومتضاد روایتیں ہیں۔ کسی میں ہے کہ دجال فلاں جگہ سے خروج کرے گا کسی میں کسی دوسری جگہ کا ذکر ہے۔ وغیر ذالک۔ مودودی صاحب نے اس کا جواب دیا کہ اصل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو صرف اس کی خبر دی گئی تھی کہ دجال آئے گا۔ اس لئے دجال کا آنا صحیح ہے۔ اسی لئے ہر روایت میں دجال کا خروج قدر مشترک ہے۔ باقی رہا کہاں سے خروج کرے گا۔ یہ آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بتایا نہیں گیا تھا۔ شروع شروع میں آپ کا خیال تھا کہ شاید فلاں جگہ سے خروج کرے تو آپ نے ایک وقت میں اپنے گمان غالب کی بناء پر اس جگہ کا ذکر فرمایا۔ کچھ دن کے بعد آپ کا خیال بدل گیا اور آپ کا قیاس ایک دوسری جگہ کی طرف گیا تو اب کی بار آپ نے دوسری جگہ کا نام بتادیا۔ اسی طرح خیال بدلتا گیا اور قیاس بھی بدلتا گیا۔ اس کے مطابق آپ نے جگہ کا نام بھی بدل بدل کر بتایا۔ اس لئے صرف مقام خروج میں اختلاف ہوتا گیا۔

میں نے اس کے متعلق اسی زمانے میں رسالہ "البیان" امرتسر میں شائع کرادیا تھا کہ مودودی صاحب نے یہ اچھا کیا۔ محدثین پر الزام دیتے روایان حدیث کے متعلق کچھ کہتے تو سارے روایات پرست بگڑ جاتے۔

اگر سرے سے دجال کے خروج ہی سے انکار کردیتے اور ان اختلافات کی بناء پر ان سب حدیثوں کو موضوع کہہ دیتے تو مقلد و غیر مقلد سب اہل کرم مل کر کفر کا فتویٰ صادر کردیتے۔ اس لئے میرے دوست نے سارا الزام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر رکھ دیا کہ امت کو اختلافات کی کشمکش میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ڈالا ۔ نعوذ باللہ من ذالک ۔ حالانکہ یہ صفت تو کفار و مشرکین کی بیان کی گئی ہے کہ ان یتبعون الا الظن و ان ھم الا یخرصون (۱۰:۶۶)۔ یعنی یہ لوگ صرف گمان ہی کے پیچھے چلتے ہیں اور صرف اٹکل ہی لگایا کرتے ہیں ۔ کوئی رسول کوئی نبی ایسا کب کرسکتا ہے ۔ آپ کو تو حکم تھا لا تقف ما لیس لک به علم (۱۷:۳۶) جس بات کا تم کو علم نہ ہو اس کے پیچھے نہ پڑو۔ جب مقام خروج آپ کو بتایا ہی نہیں گیا تو آپ کو اس کے متعلق کوئی علم ہی نہ تھا کیونکہ آپ کے پاس علم کا ذریعہ صرف وحی تھا۔ تو جب کوئی وحی اس کے متعلق نہیں آئی یہاں تک کہ القاء کے ذریعے، خواب کے ذریعے بھی نہیں بتایا گیا تو آپ کیوں محض اٹکل اور قیاس سے ایک ایسی بات دینی عقیدے کے متعلق بیان کرتے جس کے متعلق آپ کے پاس معلومات حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ نہ تھا؟

ابھی کسی صاحب نے مودودی صاحب کے ترجمان القرآن جلد ۵۲ عدد ۳ (بابت جون ۱۹۵۹ء) کے چند اوراق میرے پاس بھیج کر مجھ سے اس سوال و جواب کے متعلق میری رائے پوچھی ہے جو ان اوراق میں درج ہیں۔ سائل کا نام سوال کے نیچے یا اوپر درج نہیں ۔ مگر جواب ضرور مودودی صاحب کی طرف سے ہے۔ کیونکہ فہرست مضامین میں مجیب کا نام سید ابوالاعلیٰ مودودی دیا ہوا ہے۔ سوال کا خلاصہ یہ ہے:

قرآن مجید میں قرآتوں کا اختلاف

قرآن مجید کے متعلق ایک طرف تو یہ کہا جاتا ہے کہ یہ بعینہٖ اسی صورت میں موجود ہے جس صورت میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر اترا تھا۔ ایک شوشے ایک نقطے کا بھی فرق نہیں ہے۔ دوسری طرف معتبر کتابوں میں نقطوں، اعرابوں، لفظوں اور جملوں تک کی کمی بیشی نظر آتی ہے جو روایت کے ذریعے بیان کی گئی ہے۔ ان روایتوں سے جو اختلاف قرآت کے نام سے مشہور ہیں، الفاظ ہی میں نہیں معانی میں بھی اختلاف پیدا ہو جاتا ہے۔ یقیناً منزل من اللہ تو ایک ہی قرآت ہوگی باقی قرآتیں ضرور غلط ہوں گی۔ سب کو کس طرح صحیح مان لیا جائے۔ وغیر ذالک۔ غرض سائل کے سوال کا یہی ماحصل ہے۔

آخر میں سائل نے یہ بھی ظاہر کیا ہے کہ "منکرین حدیث کی طرف میرا ذرہ برابر بھی میلان نہیں ہے۔"

تمنا عرض کرتا ہے کہ یہ حقیر ناقد بھی منکر حدیث نبوی نہیں ہے۔ جو حدیث محدثین کے متفقہ اصول کے مطابق صحیح ثابت ہو اس حدیث کو میں واجب الاتباع سمجھتا ہوں۔ البتہ جامعین احادیث رحمہ اللہ کی مجلدات میں جتنی حدیثیں مسطور ہیں سب کو قرآن مجید کے ساتھ مثلہٗ معہٗ نہیں مانتا، نہ راویوں کو جبریل سمجھتا ہوں اور نہ مرویات کو آیات منزل من اللہ۔ اور میرے دین میں تقیہ وکتمان جائز نہیں ہے۔ اس لئے میں اپنا عقیدہ کبھی چھپاتا نہیں۔ اور ان المنافقین فی الدرک الاسفل من النار (۴:۱۴۵) پر میرا ایمان ہے۔ اتنا گذارش کر کے تنقید شروع کرتا ہوں۔

مودودی صاحب فرماتے ہیں۔

" یہ بات اپنی جگہ پر بالکل صحیح ہے کہ قرآن مجید آج ٹھیک اسی صورت میں موجود ہے جس میں وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا تھا اور اس میں ذرہ برابر کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔"

اس اعتراف کے بعد ارشاد ہوتا ہے۔

" لیکن یہ بات بھی اس کے ساتھ قطعی صحیح ہے کہ قرآن میں قرآتوں کا اختلاف تھا اور ہے۔ جن لوگوں نے اس مسئلے کا باقاعدہ علمی طریقہ پر مطالعہ نہیں کیا ہے وہ محض سطحی نظر سے دیکھ کر بے تکلف فیصلہ کردیتے ہیں کہ یہ دونوں باتیں باہم متضاد ہیں اور ان میں سے لازماً کوئی ایک ہی بات صحیح ہے۔"

معلوم نہیں کہ " باقاعدہ علمی طریقہ " کون سا ہے جس کا مطالعہ کرنے سے دو متضاد چیزیں باہم متفق بلکہ متحد نظر آتی ہیں۔ وہ " باقاعدہ علمی طریقہ " تو مجھ کو معلوم نہیں۔ باقی رہی سطحی نظر یا گہری نظر تو اس کا فیصلہ میری تنقید کو دیکھ کر اہل علم واہل دیانت وانصاف خود فرمالیں گے کہ مودودی صاحب کا جواب محض سطحی مقلدانہ غیر محققانہ ہے یا میری تنقید؟ کچھ آگے چل کر فرمایا جاتا ہے۔

" حالانکہ فیصلہ صادر کرنے سے پہلے یہ لوگ علم حاصل کرنے کی کوشش کریں تو خود بھی غلط فہمی سے بچ جائیں اور دوسروں کو غلط فہمیوں میں مبتلا کرنے کا وبال بھی اپنے سر نہ لیں۔"

بے شک۔ اس وقت حسب الحکم علم ہی حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اس کے بعد خود فیصلہ نہیں کروں گا بلکہ ایماندار ناظرین پر فیصلہ چھوڑ دونگا۔

ارشاد فرمایا گیا ہے۔ " یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جس رسم الخط میں ابتداءً نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے وحی کی کتابت کرائی تھی؟ اور جس میں حضرت ابوبکرؓ نے پہلا مصحف مرتب کرایا اور حضرت عثمانؓ نے جس کی نقل بعد میں شائع کرائی۔ اس کے اندر نہ صرف یہ کہ اعراب نہ تھے بلکہ نقطے بھی نہ تھے۔ کیونکہ اس وقت تک یہ علامت ایجاد نہیں ہوئی تھیں۔ اس رسم الخط میں پورے قرآن کی عبارت یوں لکھی گئی تھی۔ کاٮ احکم امه ڡصلٮ مں لدں حکىم حٮىر۔ اس طرز تحریر کی عبارتوں کو اہل زبان الکل سے پڑھ لیتے تھے اور بہرحال با معنیٰ بناکر ہی پڑھا کرتے تھے۔ لیکن جہاں مفہوم کے اعتبار سے متشابہ الفاظ آجاتے یا زبان کے قواعد و محاورہ کی رو سے ایک لفظ کے کئی تلفظ یا اعراب ممکن ہوتے وہاں خود اہل زبان کو بکثرت التباسات پیش آجاتے۔ تھے۔ اور یہ تعین کرنا مشکل ہوجاتا تھا کہ لکھنے والے کا اصل منشاء کیا ہے۔ مثلاً ایک فقرہ یوں لکھا گیا ہو کہ رٮںا ٮعد ٮىں اسڡارںا کو ربنا باعد بين اسفارنا بھی پڑھا جاسکتا تھا اور ربنا بعد بين اسفارنا بھی۔" (اسی طرح کی ایک دوسری مثال اور بھی دی ہے اس کے بعد لکھتے ہیں)

" یہ اختلافات تو اس رسم الخط کے پڑھنے میں اہل زبان کے درمیان ہوسکتے تھے لیکن ایک عربی تحریر اگر اسی رسم الخط میں غیر اہل زبان کو پڑھنی پڑ جاتی تو وہ اس میں ایسی سخت غلطیاں کرجاتے جو قائل کے منشاء

کے بالکل برعکس معنیٰ دیتی تھیں۔" (جس کی ایک مثال دی ہے اس کے بعد مودودی صاحب تحریر فرماتے ہیں)

" پھر یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ قرآن میں اعراب لگانے کی ضرورت سب سے پہلے بصرے کے گورنر زیاد نے محسوس کی جو ۴۵ ھ سے ۵۳ ھ تک وہاں کا گورنر رہا تھا۔ اس نے ابو الاسود دوؔلی[۱] سے فرمائش کی کہ وہ اعراب کے لئے علامات تجویز کریں اور انہوں نے یہ تجویز کیا کہ مفتوح حرف کے اوپر مکسور حرف کے نیچے اور مضموم حرف کے بیچ میں ایک ایک نقطہ لگا دیا جائے۔

اس کے بعد عبدالملک بن مروان (۶۵ ھ سے ۸۶ ھ) کے عہد حکومت میں حجاج بن یوسف والی عراق نے دو علماء[۲] کو اس کام پر مامور کیا کہ وہ قرآن کے متشابہ حروف میں تمیز کرنے کی کوئی صورت تجویز کریں۔

---

(۱) ابوالاسود نے اپنی سمجھ اور اپنی واقفیت کے مطابق بغیر کسی معتمد علیہ جماعت کے مشورے اور استصواب کے اعراب لگا دیئے۔ یہ بصرہ کے رہنے والے اور یہاں کے قاضی بھی تھے اور شیعہ تھے۔ ابن حجر نے تہذیب التہذیب جلد ۱۲ صفحہ ۱۰ میں ان کا ذکر کیا ہے مگر یہ نہیں لکھا ہے کہ انہوں نے قرآن مجید پر اعراب لگائے تھے یہ بھی لکھا ہے کہ استیعاب میں ان کا ذکر ہے مگر استیعاب مطبوعہ حیدرآباد دکن میں ان کا کہیں ذکر نہیں۔ ان کا نام " ظالم " تھا جیسا کہ ابن حجر نے لکھا ہے۔

(۲) وہ دو علماء کون تھے کچھ معلوم نہیں۔ اتنا بڑا اہم کام جو پہلے پہل کیا جائے اور ایسے گمناموں کے سپرد کیا گیا جن کو کوئی جانتا بھی نہیں کہ وہ کون تھے ؟ ادھر تنہا ابوالاسود اعراب لگائیں اور ادھر دو گمنام عالم پہلے پہل قرآن پر نقطے لگائیں۔ اپنے زمانے کے اکابر علماء اور مشاہیر ائمہ دین سے کوئی صلاح مشورہ نہ ابوالاسود نے لیا نہ ان دونوں نے لیا۔ دکھلانے کیلئے تو ان روایتوں سے بظاہر (قرآن مجید کی اہمیت اور صحت ثابت کی گئی مگر بباطن غور کرنے والے کو قرآن مجید کی صحت کی طرف سے پوری طرح مشتبہ ہوجانے کا سامان کردیا۔ واقعی ان تاریخی حقیقتوں کے گھڑنے والے اپنے فن کے بڑے ماہر تھے۔

چنانچہ انہوں نے پہلی مرتبہ عربی زبان کے حروف میں بعض کو منقوط بعض کو غیر منقوط کرکے اور منقوط کے اوپر یا نیچے ایک سے لے کر تین تک نقطے لگاکر فرق پیدا کیا اور ابو الاسود کے طریقے کو بدل کر اعراب کے لئے نقطوں کے بجائے زیر، زبر، پیش کی وہ حرکات تجویز کیں جو آج مستعمل ہیں۔"

مودودی صاحب نے "باقاعدہ علمی طریقے" پر یہ "عالمانہ تحقیقی" جواب دیا ہے اور اس کے بعد ہی ان دو تاریخی حقیقتوں کو نگاہ میں رکھ کر دیکھنے کی فرمائش کی ہے مگر مودودی صاحب یا ان ہی قسم کے اگلے مصنفین کے صرف اپنی کتابوں میں لکھ دینے سے تو کوئی خلاف عقل بات "تاریخی حقیقت" نہیں بن سکتی جو بات سراسر بے حقیقت ہو وہ "تاریخی حقیقت" کس طرح بن سکتی ہے۔ جو چیز آنکھوں میں کھٹکنے لگے وہ نگاہوں میں کس طرح رکھ لی جائے؟ مودودی صاحب کو اور ان "تاریخی حقیقتوں" کے اپنی کتابوں میں درج کرنیوالوں کو کچھ تو سوچنا تھا کہ "یہ حقیقتیں" واقعی کچھ حقیقت رکھتی بھی ہیں یا نہیں؟ کیا روایت پرستی اس طرح عقل کو اندھا کردیتی ہے کہ بدیہی سے بدیہی بات بھی روایت پرستوں کو سوجھتی نہیں ہے؟ ہر صاحب عقل و ایمان سے میری التجاء ہے کہ اللہ کی رضا کے لئے ذرا غور کیجئے۔ ب - ت - ث - ج - خ - د - ذ - ر - ز - س - ش - ص - ض - ط - ظ - ع - غ - ف - ق - ن - ی - عربی زبان کے ۲۸ حروف تہجی میں سے یہ بائیس حروف تہجی ایسے ہیں جن میں امتیاز نقطوں ہی کے ہونے نہ ہونے یا اوپر نیچے ہونے یا کم و بیش ہونے کی وجہ سے ممکن ہے واضع حروف نے جس دن ان حرفوں کو وضع کیا تھا

اگر اسی دن، اسی وقت نقطے بھی ایجاد نہیں کئے تھے اور نقطوں ہی کے ذریعے ان میں امتیاز نہیں رکھا تھا تو اس نے یہ بائس ہمشکل حروف وضع ہی کیوں کئے تھے؟ کیا وہ مختلف نقوش ایجاد نہیں کرسکتا تھا؟ "با" کو دیکھئے کہ اس کو با، تا، ثا، نا اور یا صرف نقطوں ہی کے فرق سے پانچ طریقے سے پڑھ سکتے ہیں۔ "حا" کو جا، حا، خا، تین طریقے سے۔ باقی چودہ حروف کو دو دو طریقے سے۔ اگر نقطوں کا فرق واضع نے وضع کے وقت ہی نہیں رکھا تھا تو یقیناً وہ واضع ہی دیوانہ تھا۔ فقط واضع ہی نہیں بلکہ ساری قوم ہی دیوانی تھی کہ کبھی کسی نے زبان کی اس تحریری گمراہ کن خامی کی طرف توجہ نہ کی۔ اور اپنی رسم خط کی اس بدترین خرابی کو دور کرنے کی ضرورت کسی شخص نے کبھی محسوس نہ کی۔ خدا جانے شعرائے جاہلیت جو اپنے قصائد سو سو اور ڈیڑھ ڈیڑھ سو شعروں کے لکھ لکھ کر خانہ کعبہ میں لٹکا دیا کرتے تھے ان کے پڑھنے والے ان کو کس طرح پڑھتے تھے؟ امراء القیس کا شہرہ آفاق قصیدہ جو سبعہ معلقہ کا پہلا معلقہ ہے، اس کا یہ شعر

وقد اغتدی والطیرفی وکناتھا
بمنجرد قید الا وابدھیکل

میں صبح کرتا ہوں ایسی ساعت میں کہ پرندے اپنے گھونسلوں میں ہوتے ہیں۔ اپنے اونچے گھوڑے کے ساتھ جو وحشی جانوروں کو گھیر کر قید میں رکھ لیتا ہے۔

کیا کسی نے اس کو وقد اغتذی بھی پڑھا تھا؟ یعنی میں اس وقت غذا کرتا ہوں جب پرندے اپنے گھونسلوں میں ہوتے ہیں اپنے گھوڑے کے

ساتھ الخ۔ یعنی خود بھی اسی وقت کھاتا ہوں اور اپنے گھوڑے کو بھی اسی وقت کھلاتا ہوں۔

تسلت عمایات الرجال عن الصبا
ولیس فؤادی عن هواک بمنسل

لوگوں کے شوق ومحبت کی گراہیاں سرد پڑ گئیں
اور میرا دل تیری محبت سے کنارہ کش ہونے والا نہیں

کیا اس کو کسی نے کبھی یوں بھی پڑھا تھا۔

یسلت غمایات الرجال عن الصبا
ولیس فوادی عن هواک بمنسل

میں نے لوگوں کو ان کی بیخودیوں پر جو غایت شوق میں پیدا ہوئیں ملامت کی
حالانکہ خود میرا دل تیری محبت سے کنارہ کش ہونے والا نہیں

تجاوزت احراساً علی
ومعشرا علی حراصاً لو یسرون مقتلی

میں اس کے نگہبانوں اور اس کے لوگوں سے کتراکر نکل گیا
ایسے نگہبان اور ایسے لوگ جو میری تاک میں لگے رہتے تھے کہ کسی طرح
چھپ کر مجھ کو قتل کرسکیں

کیا اس کو کسی نے یوں پڑھا تھا۔

تحاورت احراساً علی و معشراً

میں نے اس کے نگہبانوں اور اس کے لوگوں سے (دوبدو) باتیں کیں (دلیری کے ساتھ)

جب کہ اس مفہوم میں اصل شعر کے مفہوم سے زیادہ بہادری کا اظہار ہے باوجود اس کے کسی نے کبھی تجاوزت کو تحاورت نہیں پڑھا۔

غور فرمائیے کیا کبھی کسی نے اس قسم کی روایت کی ہے کہ معلقات سبعہ میں نقاط واعراب نہ ہونے کی وجہ سے کوئی کسی طرح پڑھتا تھا۔ کوئی کسی اور طرح؟ تمام عربی، لٹریچر چھان مارئے۔ کبھی کسی نے سبعہ معلقات یا دوسرے قدیم اشعار کے لئے اس قسم کی بات نہیں کی۔ پھر آخر کیا بات ہے کہ یہ باتیں صرف قرآن مجید ہی کے لئے کہی جاتی ہیں۔ کیا یہ سارے اختلافات قرآت قرآن ہی کے لئے تھے؟ معلقات شعرائے جاہلیت کو کبھی ان سے سابقہ نہیں پڑا۔ کیوں پڑتا؟ نہ اس وقت کوفہ تھا، نہ کوفے کے مفسدین ملاحدہ تھے۔ نہ کسی کو خواہ مخواہ ان میں اس طرح کے اختلافات پیدا کرنے کی اس وقت ضرورت تھی ۔ قرآن مجید میں تو قصداً یہ اختلافات پیدا کئے گئے ہیں اور اسی غرض سے یہ مشہور کیا گیا ہے کہ عربی رسم الخط میں نقطے نہ تھے۔ سو برس کے بعد نقطے لگائے گئے اور اعراب بھی نہ تھے۔

خیر زمانہ جاہلیت کی باتیں جانے دیجئیے۔ جب وحی آنا شروع ہوئی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم نے قرآن مجید کی آیتیں اور سورتیں لکھوانا شروع کر دیں تو آپ کو تو اس کا خیال ہوتا کہ بے نقطوں کی تحریر اتنے باہم متشابہ حروف والی رسم خط میں کس طرح صحیح طور سے پڑھی جائے گی؟ کاتبین وحی سے آپ فرماتے کہ نقطے دے کر لکھا کرو۔ کیونکہ واضع حروف نے ضرور حروف پر نقطے لگائے تھے اور اگر واضع حروف پاگل تھا اور عہد

جاہلیت کے سب لکھے پڑھے دیوانے تھے کہ ایسی گمراہ کن رسم خط کو گلے لگائے ہوئے تھے تو آپ خود نقطے لگانے کی ترکیب بتادیتے۔ فراست نبویہ عبدالملک وحجاج کی عقل سے تو یقیناً کہیں بڑھی ہوئی تھی اور اگر یہ کہا جائے کہ چونکہ آپ خود لکھے پڑھے نہ تھے اس لئے آپ کو اس کا احساس ہی نہ ہوا کہ حروف پر نقطے نہ ہونے سے کیا خرابی واقع ہوگی تو کم سے کم کاتبین وحی تو متعدد تھے۔ خلفائے راشدینؓ جیسے برگزیدہ اور دور اندیش لوگ وحی لکھتے تھے، وہ لوگ یا ان میں سے کوئی تو محسوس کرتا کہ جس رسم خط میں اس قدر تشابہ حروف ہیں ان کے پڑھنے میں آئندہ لوگوں کو کس قدر دشواری ہوگی؟ اگر ان لوگوں نے بھی محسوس نہیں کیا تھا تو اللہ تعالیٰ نے اس قرآن کو بلسان عربی مبین اتارا تھا۔ اور ابانۃ (مبین ہونا) دو ہی طرح کسی قول کی ممکن ہے۔ زبان سے[1] یا قلم سے ۔ مگر زبان سے ابانت پائیدار نہیں رہ سکتی۔ آواز ہوا میں غائب ہوجاتی ہے۔ کتاب ہی پائیدار ابانت کا ذریعہ ہے اور عربی رسم الخط کا حال اللہ تعالیٰ عالم الغیب والشہادۃ کو معلوم ہی تھا کہ اس میں اٹھائیس حروف ہیں جن میں بائیس حروف ایسے ہیں جنہیں ایک پاگل واضع حروف نے باہم متشابہ وضع کیا

---

(۱) مبین کا مفہوم اصل تو یہی ہے کہ آیات قرآنی کے الفاظ ، اس کے جملے، اسکی عبارتیں اپنے مفہوم کو واضح طور سے ظاہر کرتی ہیں مگر وہ الفاظ وہ جملے اور وہ عبارتیں اس کے لئے مبین ہوتے ہیں جس کے پاس پہنچتی ہیں نہ کہ خود اپنے لئے ۔ تو دوسروں تک دو ہی ذریعے سے پہنچ سکتے ہیں ۔ زبان کے ذریعہ قولاً یا قلم کے ذریعے کتابتاً، قولاً ناپائیدار ذریعہ ہے اور کتابتاً پائیدار ذریعہ ہے۔ اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نازل شدہ آیات وسورۃ کی صرف زبانی تعلیم نہیں فرماتے تھے بلکہ لکھوادیا کرتے تھے اور صحابہؓ اس کی نقلیں اپنے پاس بھی رکھ لیا کرتے تھے۔ آگے اس کی بحث کی گئی ہے ۔ (تمنا)

ہے اور کوئی ایسی علامت نہیں رکھی ہے جس کے ذریعہ ایک دوسرے سے تمیز کیا جاسکے۔ ایسی گمراہ کن رسم خط میں جو عبارت لکھی جائے گی بذات خود وہ ہزار مبین ہو مگر پڑھنے والے کے لئے اس کی بینیت کی نوعیت اس ہرے بھرے انواع واقسام کے پھولوں اور پھلوں والے باغ کی طرح ہوگی جو کسی ایسے پردہ ظلمات میں واقع ہو جہاں کسی کو کچھ نظر نہیں آتا۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت جبریل علیہ السلام کے ذریعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مطلع کر دیا ہوتا کہ تمہاری زبان کی رسم خط سخت گمراہ کن ہے۔ اس کے فلاں فلاں حروف پر اس طرح نقطے دلواکر متشابہ حروف میں باہم امتیاز پیدا کرنے کے لئے اپنے کاتبوں سے کہو۔ جس دشواری کو آغاز نزول قرآن کے بعد سے کم و بیش سو برس تک نہ عام صحابہ نے نہ کاتبین وحی نے نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ حضرت جبریل علیہ السلام نے نہ خود اللہ تعالیٰ نے محسوس فرمایا۔ اس کو سو برس کے بعد محسوس کیا تو اس شخص نے جو صرف اموی ہونے کی وجہ سے باوجود خلیفہ اور امیرالمومنین ہونے کے بعض طبقوں میں بدنام ہے اور اس نے بھی یہ کام اس شخص سے لیا جس پر روایت پرست حلقوں میں آج تک سب وشتم کو کارثواب سمجھا جاتا ہے بلکہ جس پر کتنے لوگوں نے کفر کا فتویٰ تک دے دیا تھا۔ یعنی حجاج بن یوسف الثقفی جس کے متعلق ابن حجر تہذیب التہذیب جلد ۲ صفحہ ۲۱۱ میں لکھتے ہیں۔ قال زاذان کان مفلسا

ترجمہ :-

حجاج کے متعلق زاذان نے کہا کہ دینی حیثیت سے یہ شخص مفلس تھا طاؤس نے کہا کہ جو اس کو مومن کہتا ہے مجھ کو اس پر تعجب ہوتا ہے اور ایک جماعت نے اس کو کافر قرار دیا تھا جن

من دینه وقال طاؤس عجبت لمن یسمیه مؤمنا وکفره جماعة منهم سعید بن جبیر والنخعی ومجاهد وعاصم بن ابی النجود والشعبی وغیرهم ..... وقال القاسم بن مخیمره کان الحجاج ینقبض عری الاسلام عروة عروة) عبدالملک نے جو سو برس کے

میں سعید بن جبیر نخعی ، مجاہد ، عاصم بن ابی النجود اور شعبی وغیرہم تھے۔ قاسم بن مخیمرہ نے کہا کہ حجاج نے تو اسلام کی دھجیاں اڑا کر رکھ دی تھیں " حقیقت یہ ہے کہ کوفہ اور بصرہ حضرت فاروق اعظمؓ کے وقت ہی سے مفسدوں کا مرکز تھے۔ خصوصاً کوفہ - یہ موقعہ اس کی تفصیل کا نہیں ہے۔ بڑے ہٹ دھرم ، بڑے شورہ پشت لوگ یہاں تھے جو تابعین وتبع تابعین کا لبادہ اوڑھے رہتے تھے۔ تنگ آکر خلیفہ وقت نے وہاں کے مفسدین کی سرکوبی کے لئے حجاج کو بھیج دیا۔ حجاج نے وہاں ہر مشتبہ شخص کو سزائیں دینا شروع کیں کسی کو قتل کیا کسی کو کوڑے مارے کسی کو قید کردیا۔ اس لئے کوفی اور بصری دونوں ان سے خفا رہے - بصریوں نے اشعث کی سرکردگی میں اس پر خروج بھی کیا تھا مگر شکست کھائی۔ باغیوں میں قاریوں کی خاص جماعت تھی۔ سعید بن جبیر بھی انہی باغیوں میں تھے اگر چہ یہ کوفی تھے۔ اشعث کی شکست کے آثار دیکھ کر بھاگ نکلے اور مکہ معظمہ پہنچ گئے۔ وہاں چھپے رہے۔ کچھ مدت کے بعد وہاں کے والی خالد بن عبداللہ القسری نے ان کو پالیا اور گرفتار کرکے حجاج کے پاس بھیج دیا۔ حجاج نے پوچھا تمہیں بغاوت پر کس چیز نے آمادہ کیا تھا۔ انہوں نے کہا کہ میں بیعت کرچکا تھا (یعنی اشعث کے ہاتھ پر) حجاج نے کہا کہ امیرالمؤمنین کی بیعت وفاداری کی زیادہ مستحق تھی یا باغیوں کی جمعیت ؟ اس کے بعد قتل کا حکم دیا۔ غرض کوفیوں ہی نے بصرے میں بغاورت کی سازش کی تھی اور بصرے والوں کو خروج پر آمادہ کیا تھا اس لئے سعید بن جبیر جو بنی اسد کے غلام آزاد کردہ تھے اور متعدد کوفی بصریوں کے ساتھ اس بغاوت میں شریک ہوئے۔ کوفے میں بنی اسد کا ایک محلہ تھا جس میں ننانوے فی صد شیعہ تھے اور زاذان ابو عبداللہ کندیوں کے آزاد کردہ غلام تھے اور کوفی تھے۔ طاؤس بحیر بن ریسان کے غلام تھے جو ہمدانیوں کی غلامی میں آکے آزاد ہوئے۔ آزادی سے قبل کوفے میں تھے۔ آزاد ہوکر بصرہ چلے آئے تھے ابراہیم نخعی بھی کوفی ہی تھے۔ مجاہد بن جبیر سائب بن ابی السائب کے غلام آزاد کردہ تھے مکہ معظمہ میں عطر فروشی کرتے تھے۔ اور کوفیوں کے مستقل ایجنٹ تھے۔ ان کے یاران طریقت نوے فیصد کوفی ہی تھے۔ ان کا ذکر قاریوں کے سلسلہ میں آئے گا۔ عاصم بن ابی النجود کوفی تھے اور قاریوں کے استاد اختلاف قرآت کے بڑے بڑے کارخانے کھول رکھے تھے۔ عامر بن شراحیل الکوفی ان کا لقب شعبی مشہور ہے۔ کوفہ کے بڑے مشہور محدث تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف فرائض کے بہت

بعد قرآنی رسم خط کی اصلاح کا کام سپرد بھی کیا تو ایک کافر کو ۔ اسلام کی اتنی بڑی خدمت اس کے ہاتھ سے انجام پائی جس نے بقول قاسم بن مخیمرہ اسلام کی دھجیاں اڑا کر رکھ دی تھیں

رہ گئے سب یونہیں شیوخ حرم
کام کا ایک رند ہی نکلا

ایک تعجب خیز تاریخی حقیقت مودودی صاحب نے دو تاریخی حقیقتیں " بیان فرمائی ہیں ایک کا تعلق اعراب یعنی زبر، زیر، پیش کی ایجاد سے ہے اور دوسری " حقیقت " کا تعلق نقطوں کے " پہلے پہل " اختراع سے ۔ مودودی صاحب کے بیان کے مطابق پہلے زیاد کو اعراب کی ضرورت محسوس ہوئی تھی ۴۵ ھ سے ۵۳ ھ تک کے درمیان اس آٹھ سال کے اندر زیاد نے ابوالاسود دولی سے قرآن مجید کے حروف پر اعراب لگوائے۔ مگر اس وقت بھی نہ زیاد کو نقطوں کے لگانے کی ضرورت محسوس ہوئی نہ ابوالاسود کو ۔ حالانکہ ہر موٹی سے موٹی عقل والا بھی اس کو سمجھ سکتا ہے کہ ایسی متشابہ حروف والی رسم الخط کے لئے اعراب سے زیادہ نقطے ضروری ہیں ۔ آپ اردو ہی رسم الخط کو دیکھئے ۔ بغیر زیر، زبر

سے مسائل بنا بنا کر منسوب کرکے روایت کیا کرتے تھے۔ حالانکہ ان سے کچھ سنا بھی نہ تھا ۔ بہت سے صحابہؓ سے روایت کرتے تھے مگر ان میں سے کتنے ایسے تھے جن سے کبھی کچھ نہیں سنا تھا لیکن محدثین کے نقطہ نظر سے بہت بڑے عالم اور اپنے وقت کے عبداللہ بن عباس تھے۔ بہرحال رحمہ اللہ تعالیٰ ۔ لیکن یہ معلوم ہوگیا کہ حجاج پر کفر کا فتویٰ دینے والے سب کے سب کوفی تھے یا کوفیوں سے تعلقات رکھنے والے اور ان میں بہت بڑی اکثریت غلاموں کی تھی اس وقت حجاج کی صفائی میرا مقصود نہیں ہے ، صرف صورتحال میں نے پیش کردی ہے۔ تاکہ اہل انصاف کو غور کرنے کا موقع ملے ۔ (تمنا)

پیش کے ہر شخص لکھتا اور پڑھتا ہے۔ کوئی بھی کسی قسم کی دشواری محسوس نہیں کرتا۔ لیکن فقط ایک صفحہ بغیر نقطوں کے لکھ دیا جائے تو پڑھنے والے کو ضرور دشواری محسوس ہوگی اور ہوسکتا ہے کہ مودودی صاحب ہی کی عبارت سے نقطے حذف کر کے لکھیئے تو ان کی " تاریخی حقیقتوں " کو کوئی، " تارنجی حقیقتیں " پڑھ دے اور " مشرکین " کو " مسٹر کین " سمجھ لے، اور " بعض " کو " بغض " اور " بیٹھے " کو " پیٹھے " بتادے تو کیا یہ ناممکن ہے ؟

اس لئے مجھ کو یقین ہے کہ ان " تاریخی حقیقتوں " پر تاریخ روایت کا رنگ چڑھانے والے بھی کچھ اسی قسم کا دماغ رکھنے والے تھے جیسا دماغ عربی حروف تہجی وضع کرنے والے کا تھا جس نے اٹھائیس حروف تو وضع کئے مگر ان میں سے بائیس حرف کو اس طرح وضع کیا کہ ان میں سے ایک کو دوسرے کے مشابہ ہی نہیں بلکہ بالکل عین رکھا۔ پتا نہیں ملتا کہ " ح " لکھنے کے بعد وہ اس کو کیا کہتا ہوگا؟ جیم یا حے یا خے؟ غرض واضع حروف نے متشابہ حروف میں جس طرح مابہ الامتیاز کوئی علامت ہر حرف کے ساتھ رکھنے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کی اور نہ عہد جاہلیت نہ عہد اسلام کے کسی شخص نے ۶۵ ھ سے پہلے اس کو محسوس کیا۔ اسی طرح زیاد اور ابوالاسود دؤلی بھی بازار سے آٹا دال تو لائے نہیں کھانا پکانے کے لئے پہلے ہی لگے چولہا پھونکنے۔ نقطوں کے بغیر تو حروف کی شناخت ہی ممکن نہیں۔

<u>عذر گناہ</u> درحقیقت حروف کی تخلیق تو نقطے لگانے کے بعد ہی مکمل ہوتی ہے۔ اعراب تو عارضی چیز ہے۔ ان روایتوں کے بنانے والے اگر کچھ بھی

عقل سے کام لیتے تو نقطوں کے وضع کرنے کا سہرا زیاد اور ابوالاسود کے
سر باندھتے اور اعراب کی پگڑی عبدالملک اور حجاج کے سر پر رکھتے۔ مگر
میں نے اپنے متعدد مضامین میں یہ لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ وضاعین وکذابین
کی عقلوں پر وضع روایات کے وقت کچھ ایسا پردہ سفاہت ڈال دیتا ہے کہ
کچھ نہ کچھ بات ان کی مرویات یا اسناد روایت میں ایسی رہ جاتی ہے جس
کی گرفت ایک نقاد بادنیٰ تامل کرلیتا ہے۔ بشرطیکہ روایت پرستی اس پر
مسلط نہ ہو۔ ورنہ بڑے بڑے ائمہ فن رجال اور اساتذہ تنقید روایات
جن کی تصنیفوں سے آج ہم فائدہ اٹھا رہے ہیں ایسی ایسی خلاف عقل
ومخالف قرآن مرویات پر ایمان رکھتے ہیں کہ تعجب ہوتا ہے ۔ مخالفت
روایت ومعاندت آیت ان کو معلوم بھی ہوتی ہے تو بعید از قیاس اس
کی تاویل کرکے اپنے دل کو وہ زبردستی مطمئن کرلیتے ہیں اور دوسروں پر
بھی زور دیتے ہیں کہ بس اس تاویل کو مان لو اور روایت کو صحیح تسلیم
کرلو۔ چاہے تمہارا دل مطمئن ہو یا نہ ہو۔ اور " عذر گناہ بدتر از گناہ " کی
مثل کو بالکل بھول جاتے ہیں۔ گناہ تو وضاعین وکذابین کرگئے۔ عذر گناہ یہ
روایت پرست کرتے رہتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ عربی رسم الخط کے واضع نے جب اٹھائیس
حرفوں میں سے بائیس حروف اس قدر باہم متشابہ رکھے تھے کہ بغیر نقطہ
لگائے لکھنے والا نہ یہ دعویٰ کرسکتا تھا کہ میں نے فلاں حرف لکھا اور نہ
پڑھنے والا یہ یقین کرسکتا تھا کہ یہ فلاں حرف لکھا گیا ہے مثلاً ب، ح، د،
ر، س، ص، ا، ع۔ یہ آٹھ شکلیں مفرد ہوں یا مرکب کسی حالت میں بھی
متعین نہیں ہوسکتی تھیں کہ یہ کون کون سے حرف ہیں۔ صرف اس لئے

کہ ہر شکل ایک سے زیادہ حرفوں کے نام سے موسوم ہے۔ نقطوں سے قطع نظر کرنے کے بعد کوئی بتائے۔ کم از کم (ب) ہی کو بتادے کہ یہ کون سا حرف ہے اور بحالت ترکیب "با" کی شکل کو بتائے اور ما کو بھی۔ آخر پڑھنے والا کیا پڑھے گا۔ اور لکھنے والا بھی ضرور سمجھ سکتا ہے کہ پڑھنے والا حرف کا نام متعین نہیں کر سکے گا پھر عربی رسم الخط کا واضع کس طرح ان متشابہ حرفوں کو بغیر نقطوں کے وضع کر سکتا تھا؟

یہ عقلی دلیل تو اتنی قوی ہے کہ واضع نے عربی حروف تہجی پر ضرور نقطے لگائے ہوں گے اور جو صورتیں نقطوں کی اس وقت ان حروف پر ہیں یہ واضع حروف کی وضع کردہ ہیں۔ ہرگز ہرگز کسی نے بعد کو وضع نہیں کیا۔ جو یہ مانتا ہے کہ کئی سو برس کے بعد نقطے لگائے گئے وہ ضرور عقل سے معذور ہے اور ان روایتوں پر ایمان رکھنے والے اس شخص کی طرح ہیں جس کے پاس مخبر نے آکر خبر دی تھی کہ تمہاری بی بی بیوہ ہو گئی ہیں اور وہ یہ سن کر زار وقطار رونے لگا۔ بعد کو لوگوں نے سمجھایا کہ تم تو زندہ ہو تو تمہاری بیوی بیوہ کس طرح ہو جائے گی۔ یہ خبر غلط ہے تو اس نے کہا کہ بات تو ٹھیک ہے مگر جس نے خبر دی تھی وہ نہایت معتبر اور سچا آدمی ہے۔ اس کو ہم جھوٹا نہیں سمجھ سکتے۔ اس لئے ضرور بیوہ ہو گئی۔ یہ کہہ کر پھر منہ پیٹنے لگا۔

اس کے بعد کسی دلیل نقلی کی ضرورت نہیں رہتی۔ مگر ما لایدرک کلہ لایترک کلہ لیجئے کچھ نقلی دلیلیں بھی حاضر ہیں۔ ابن جنی[1] نے بھی

---

[1] ابوالفتح عثمان بن جنی النحوی الموصلی المتوفی [illegible] - (مراۃ الجنان) تمنا۔

اپنے امالی (ص ۲۲) میں اس کا دعویٰ کیا ہے کہ عربی حروف پر نقطے ابتدائے روز وضع سے چلے آرہے ہیں اور یہ روایت کہ زمانہ اسلام میں نقطے لگائے گئے جھوٹی روایت ہے۔ انہوں نے جاہلیت کے دو شعر بھی ثبوت میں دیئے ہیں۔

رمتنی بسهم نقّطت منه جفنتی
واذ نقطت عينٌ تذرفُ كالغين

محبوبہ نے مجھ کو ایک تیر مارا جس سے میرے پپوٹے پر نقطے جیسا زخم پہنچ گیا
اور جب کسی آنکھ پر نقطہ جیسا زخم لگا تو وہ ضرور ابر کی طرح آنسو بہانے لگے گی۔

نقطہ ، عین، غین کے الفاظ سے جو استعارہ اس شعر میں ہے اس کو ملاحظہ فرمائیے۔ یہ اس زمانے کا شعر ہے جس زمانے میں بقول راویان " حقائق تاریخی " حروف تہجی پر نقطے کا وجود ہی نہ تھا نہ کوئی حرفوں کے لئے نقطوں کو جانتا تھا۔

دوسرا شعر بھی ہے۔

اهی النجوم تعرضت فی سقفها
ام اعجمو الوحاً بغير حروف

کیا یہ آسمان کی چھت پر ستارے چھٹکے ہوئے ہیں
یا حروف کے بغیر کسی نے صفحہ ورق پر خالی بہت سے نقطے لگا دیئے ہیں

اعجام حروف پر نقطے لگانے کو بھی کہتے ہیں اور اعراب لگانے کو بھی۔ اسی لئے نقطہ دار حروف کو معجمہ کہتے ہیں۔

ابن ندیم[1] اپنی شہرہ آفاق کتاب الفہرست کے صفحہ ۶، ۷ میں لکھتے ہیں قال ابن

---

[1] ابوالفرج محمد بن اسحاق الندیم مصنف کتاب " الفہرست " المتوفی ۳۸۵ ھ مگر یہ غالی شیعہ تھے۔ تمنا

عباس اول من كتب العربية ثلاثة رجال من بولان وهی قبیلة سكنو الانبار وانهم اجتمعوا ووضعوا حروفا مقطعة وموصولة وهم مرامرين مرة واسلم بن سدرة و عامر بن جدرة و يقال مروة و جدلة- فامامرامر فوضع الصبور و اما اسلم نفصل ووصل و اما عامر فوضع الاعجام - یعنی حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ سب سے پہلے جس نے عربی رسم خط میں لکھا وہ تین مرد تھے قبیلہ بولان کے جو انبار کے رہنے والے تھے۔ وہ سب یکجا ہوئے اور الگ الگ اور جڑے ہوئے حروف وضع کرنے لگے اور وہ تینوں مرامر مرہ کے بیٹے، اسلم سدرہ کے بیٹے، اور عامر جدرہ کے بیٹے تھے، اور بعضوں نے مرہ کے عوض مروہ اور جدرہ کی جگہ جدلہ بھی کہا ہے۔ تو مرامر نے حروف کی صورتیں مقرر کیں، اور اسلم نے اس کی جوڑ پیوند اور الگ رہنے کی ہیئات قائم کیں اور عامر نے ان پر نقطے لگائے۔

صفحہ ۹ پر حمیری حروف تہجی کی تصویر بھی دی ہے اس میں بھی نقطے موجود ہیں۔ جہاں نقطے نہیں ہیں کوئی دوسری علامت ایسی موجود ہے جو ایک دوسرے ہمشکل حرف سے ممتاز کردے۔ اس مختصر سے مضمون میں اس سے زیادہ گنجائش نہیں جس قدر لکھ گیا ہوں ایک دیانتدار عاقل کے لئے اسی قدر بہت کافی ہے۔ ع

"درخانہ اگر کس است حرفے بس است۔"

ورنہ روایت پرستی کی ہٹ دھرمی جن کا شیوہ ہے ان کے سامنے تو جتنی بھی دلیلیں پیش کیجئے وہ کبھی ماننے کے نہیں۔

اب مودودی صاحب کروٹ بدلتے ہیں مگر آہستہ آہستہ، سنئے ارشاد

فرماتے ہیں۔

"اگر قرآن کی اشاعت کا دارومدار صرف تحریر پر ہوتا تو جس رسم الخط میں امت کو یہ کتاب ملی تھی اس کو پڑھنے میں تلفظ اور اعراب ہی کے نہیں، متشابہ حروف کے بھی کتنے بے شمار اختلافات ہوگئے ہوتے[1]۔ محض زبان اور قواعد کی بناء پر خود اہل زبان بھی اگر نقطے اور اعراب لگانے بیٹھتے تو قرآن کی ایک ایک سطر میں بیسیوں اختلافات کی گنجائش نکل سکتی تھی اور کسی ذریعے سے یہ فیصلہ نہ کیا جاسکتا تھا کہ اصل عبارت جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی تھی وہ کیا تھی[2]؟ اس کا اندازہ آپ خود اس طرح کرسکتے ہیں کہ اردو زبان کی کوئی عبارت بے نقط لکھ کر دس بیس زبان داں اصحاب کے سامنے رکھ دیں۔ آپ دیکھیں گے کہ ان میں سے کسی کی قرآت بھی کسی

---

(۱) ہوگئے ہوتے کی ایک ہی کہی- کیا اس وقت اختلافات قرآت کا شمار کسی نے کیا ہے اتحاف فضلاء البشر فی القرآت اربعة عشر اور النشر فی الاقرآت العشر کو پڑھ جائیے اور اختلاف قرآت کو اگر گن سکتے ہوں تو گن کر دکھائیے- اور یہ تو وہ اختلافات ہیں جن کو قاریوں نے اصح یا صحیح قرار دے کر قبول کیا ہے ان سے دس گنا اختلافات تو رد کردیئے گئے- وہ بھی تو آخر روایات ہی کے ذریعہ پیش کئے گئے تھے مگر رد کرنا بھی ضروری تھا سب کو قبول کرلیتے تو ہر شخص کو ضرور شبہ ہوتا - اس لئے دس لاکھ اختلافات بنائے گئے اور ایک لاکھ رکھ کر نو لاکھ رد کردیئے تو اس سے ہر خاص وعام میں ایک اعتماد پیدا ہوگیا- ورنہ قابل رد تو دراصل سب تھے-

(۲) اس کا علاج تو آسان تھا جس طرح انزل القرآن علی سبعة احرف کی حدیث بنائی گئی اسی طرح انزل القرآن علی احرف کثیرة لا تحصیٰ کی بھی ایک حدیث گھڑلی جاتی بلکہ اس کی جگہ یہی حدیث رہتی - پھر جس کا جس طرح جی چاہتا اور جو مطلب چاہتا نکالتا-

دوسرے کے مطابق نہ ہوگی۔ اس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ قرآن میں نقطے اور اعراب لگانے کا کام محض لغت اور قواعد زبان کی مہارت کے بل بوتے پر نہیں کیا جاسکتا تھا کیونکہ اس طرح ایک مصحف نہیں بے شمار مصحف[1] تیار ہوجاتے جن میں الفاظ اور اعرابوں کے ان گنت اختلافات ہوتے اور کسی نسخے کے متعلق بھی یہ دعویٰ نہ کیا جاسکتا کہ ٹھیک اسی تنزیل کے مطابق ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی تھی۔"

اب مودودی صاحب گریز کرکے راہ پر آتے ہیں دیکھئے فرماتے ہیں۔

"اب وہ کیا چیز ہے جس کی بدولت آج دنیا بھر میں ہم قرآن کا ایک ہی متفق علیہ متن پارہے ہیں اور جس کی بدولت قرآتوں کے اختلافات امکانی وسعتوں تک پھیلنے کی بجائے صرف چند[2]

---

(۱) اس کی کوشش تو بہت کی گئی سات قاریوں کے سات اسکول قائم کیے گئے۔ مصحف ابی بن کعبؓ اور مصحف عبداللہ بن مسعودؓ اور مصحف علی بن ابی طالبؓ کے نام سے مصاحف مشہور کرکے ترتیب سور میں الٹ پلٹ تو کی ہی گئی۔ آیات کے الفاظ میں کمی و بیشی اور الفاظ کے نقاط واعراب میں بھی فرق قائم کیا گیا۔ مگر ان کے پاس نحن نزلنا الذکر وانا له لحافظون ۔ کا کوئی علاج نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے خود ساختہ سارے اختلافات کو ان کی تصنیف کردہ کتابوں اور روایات کے دفاتر تک ہی رہنے دیا۔ کسی ایک اختلاف کو بھی قرآن مجید میں داخل نہ ہونے دیا۔ اس نے خود فرمایا ہے ان الذین یلحدون فی ایاتنا لا یخفون علینا ۔ جو لوگ ہماری آیتوں میں ٹیڑھ کی لیں گے وہ ہم سے کچھ چھپے نہیں رہیں گے۔ (حم سجدہ آیت ۴)

(۲) "چند" آپ کہہ رہے ہیں؟ کم سے کم دس ہزار اختلافات آج قرآت کی بڑی بڑی کتابوں

متواتر یا مشہور اختلافات تک محدود رہ گئے۔ یہ اسی نعمت کا صدقہ ہے جس کی قدر گھٹانے اور جس پر سے اعتماد اٹھانے کے لئے منکرین حدیث ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں۔ یعنی روایت۔"

مودودی صاحب راہ پر آتے آتے پھر بھٹک گئے اور اپنی اسی روایت پرستی والی دلدل میں پھنس گئے۔ کوئی بتائے کہ روایت والی نعمت جو ان روایت پرستوں کو ملی ہے۔ اس کے صدقے میں ان کو اس موقع پر کیا ملا؟ اس کا ذکر چھیڑ دیا۔ انہی روایتوں کی بناء پر تو اختلافات قرآت کا ایک دریائے ناپیدا کنار موجیں مار رہا ہے۔ اگر یہ سبعۃ احراف والی حدیث موضوع نہ ہوتی اور اس کی بنیاد پر اختلاف قرآت کی روایتوں کی اینٹیں نہ چنی جاتیں تو یہ اختلاف فی القرآن کی سر بفلک عمارتیں (النشر فی القراءات العشر اور اتحاف فضلاء البشر فی القرآت اربعة عشر) جیسی ضخیم ضخیم کتابوں کے ذریعہ کہاں سے کھڑی ہوتیں اور آج ایک سائل متحیر کو مودودی صاحب سے اختلاف قرآت کے متعلق اپنی تشفی چاہنے کی کیا ضرورت پڑتی؟ یہ واقعہ ہے کہ اگر روایتیں نہ ہوتیں تو مودودی صاحب اور ہمارے علمائے کرام کو اختلافات کثیرہ فی القرآن کی نعمت عظمیٰ کہاں سے ملتی؟ یہ نعمت عظمیٰ تو انہی روایتوں کے صدقے میں

میں موجود ہیں جن کو قاریوں نے قبول کرلیا ہے۔ قرآت مردودہ سے قطع نظر کرکے اور متواتر تو قرآن مجید سے باہر ایک قرآت بھی نہیں۔ متواتر تو یہی ہے جس کو ساری دنیا پڑھ رہی ہے اس کے علاوہ ایک لفظ کے متعلق کوئی دوسری قرآت متواتر نہیں دکھائی جا سکتی۔ ھاتوا برھانکم ان کنتم صادقین۔ اگر تم لوگ سچے ہو تو اپنی دلیلیں پیش کرو۔

ملی ہے۔

قراء سبعہ کا تھوڑا سا حال اس مضمون میں انشاء اللہ بیان کروں گا تاکہ " قیاس کن زگلستان من بہار مرا " کے مطابق قرآتوں کے جو سات اسکول مشہور ہیں اور جن کی قرآتوں کو محض جھوٹ متواتر مشہور کر رکھا گیا ہے عام مسلمانوں کو ان کا حال معلوم ہوجائے اور اس کا پتہ بھی مل جائے کہ ان کی روایات اختلافات قرآت واقعی مسلمانوں کے لئے نعمت ہیں۔ یا نقمت، اور یہ حقیقت بھی واضح ہوجائے کہ خود ائمہ رجال کے نزدیک ان کا کیا درجہ ہے۔ اسی نعمت عظمیٰ کا ذکر کرکے مودودی صاحب مزید ارشاد فرماتے ہیں۔

" اوپر جن دو تاریخی حقیقتوں کا ذکر کیا گیا ہے (جن کی حقیقت ناظرین کو معلوم ہوچکی ہے ۔ تمنا) ان کے علاوہ ایک تیسری اہم ترین تاریخی حقیقت بھی ہے اور وہ یہ کہ قرآن کی اشاعت ابتداً تحریر کی صورت، میں ہنیں بلکہ زبانی تلقین کی صورت میں ہوئی تھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کی عبارت کو کاتبان وحی سے لکھوا کر محفوظ تو ضرور کرادیا تھا لیکن عوام میں اس کے پھیلنے کا اصل ذریعہ یہ تھا کہ لوگ براہ راست حضور کی زبان سے سن کر قرآن یاد کرتے تھے۔ اور پھر حضور سے سیکھنے والے آگے دوسروں کو سکھاتے اور حفظ کراتے تھے۔ اس طرح قرآن کا صحیح تلفظ اور صحیح اعراب جو تنزیل کے مطابق تھا ہزارہا آدمیوں کو حضور سے معلوم ہوا اور پھر لاکھوں آدمیوں کو حضور

صلی اللہ علیہ وسلم کے شاگردوں کی زبانی تعلیم سے حاصل
ہوا۔ صحابہ کرامؓ میں ایک معتد بہ گروہ ایسے اصحاب کا تھا
جنہوں نے پورا قرآن لفظ بلفظ حضور سے سنا تھا اور یاد کیا تھا
ہزارہا اصحاب ایسے تھے جو قرآن کے مختلف اجزاء حضور سے
سن کر یاد کر چکے تھے۔ اور ایک بہت بڑی تعداد ان صحابیوںؓ
کی تھی جنہوں نے حضور کی حیات طیبہ میں تو آپ سے صرف
بعض اجزائے قرآن کی تعلیم حاصل کی تھی ۔ مگر آپ کے بعد
پورے قرآن کی قرآت لفظ بلفظ ان اصحاب سے سیکھی جو
حضور سے اس کو سیکھ چکے تھے۔ یہی اصحاب وہ اصل ذریعہ تھے
جن کی طرف بعد کی نسل نے قرآن کی صحیح قرآت
(READING) معلوم کرنے کے لئے رجوع کی۔ اس قرآت کا
حصول محض لکھے مصحف سے ممکن نہ تھا۔ یہ چیز صرف اسی
طرح حاصل ہو سکتی تھی کہ مصحف مکتوب کو ان جیتے جاگتے
مصاحف سے پڑھ کر اس کی اصل عبارت تک رسائی حاصل
کی جائے ۔"

مودودی صاحب اس نعمت عظمیٰ کا ذکر فرما کر جو راویان روایات اختلافات قرآت سے انہیں ملی ہے جب فریضہ تحدیث نعمت سے سبکدوش ہو چکے تو پھر ان دو تاریخی حقیقتوں کو انہوں نے یاد دلایا ہے جن کو نگاہ میں رکھ کر دیکھنے کا وہ پہلے حکم دے چکے ہیں اور جن پر ہم تبصرہ کر چکے ہیں یعنی:

(۱) ۶۵ھ تک قرآن کے حروف بلکہ پورے اہل عرب ہی عام حروف عربی کے لئے اعراب کے نام سے آشنا نہ تھے۔ ابوالاسود دولی نے زیاد کے حکم

سے پہلے پہل نقطوں کی شکل میں حروف کے اوپر نیچے اور بیچ میں ایک ایک نقطہ رکھ کر زیر زبر اور پیش سے مسلم اہل عرب کو ۴۵ھ سے ۵۳ھ کے اندر کسی دن آشنا کیا۔

(۲) اہل عرب حروف کے لئے نقطے بھی ہونے چاہئیں اس کو کبھی محسوس نہ کرسکے تھے بلکہ (ابتدائی) اسلامی عہد میں بھی صحابہ، رسول، جبریل یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے بھی نقطوں کی ضرورت عربی حروف تہجی کیلئے محسوس نہیں کی تھی۔ پہلی مرتبہ عبدالملک کے حکم سے حجاج نے دوگمنام عالموں کے ذریعہ یہ بے ضرورت ایجاد کرکے دنیائے عرب کو اس کی ضرورت سے آشنا کردیا۔ بس اسی وقت سے عربی حروف کے لئے نقطوں کی ضرورت دنیا کو محسوس ہونے لگی۔ لیکن اس سے پہلے یہ بالکل بے ضرورت ہی تھے۔ ورنہ اگلوں میں سے کسی کو تو اس کی فکر ہوتی۔ مگر ان دونوں حقیقتوں کی حقیقت آپ پر پوری طرح روشن ہوچکی ہے۔

اس کے بعد تیسری حقیقت کی طرف مودودی صاحب نے سائل اور ناظرین ترجمان القرآن کو متوجہ فرمایا ہے کہ ابتداً صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر وحی منزل کو لکھوالیا کرتے تھے اور کوئی بھی قرآن کی کوئی سورت یا کوئی آیت لکھ کر اپنے پاس نہیں رکھتا تھا۔ صرف زبانی تعلیم کا رواج تھا۔ صحابہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زبانی قرآن سن سن کر سیکھ سیکھ کر یاد کرلیا کرتے تھے۔ اس لئے ہر صحابی کو قرآن کی تعلیم زبانی ہی خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سیکھے ہوئے کسی صحابیؓ سے ہوا کرتی تھی۔ اس لئے ہر صحابیؓ کو اسی طرح قرآن یاد ہوا جس طرح قرآن اترا تھا۔

غرض مودودی صاحب نے سائل کے سوال کے دونوں ٹکڑوں کا تشفی بخش جواب دے دیا۔ کہ اختلاف قرآت کی وجہ تو یہ ہے کہ پہلے نہ حرفوں پر نقطے تھے نہ اعراب لگانے کا دستور تھا۔ اس لئے بے نقطہ واعراب عبارت کو کسی نے کسی طرح پڑھا۔ کسی نے کسی طرح پڑھا۔ اختلافات ہونے کی وجہ نقطوں اور اعراب کا نہ ہونا تھا یہ تو ماحصل تھا پہلی دونوں تاریخی حقیقتوں کا جس سے اختلافات قرآت کے پیدا ہونے کے اسباب پر روشنی ڈالی گئی اور کافی روشنی پڑ گئی۔

تیسری حقیقت کا بیان فرماکر آپ نے اس کا باعث بتادیا کہ ساری دنیا میں جو ایک ہی قرآن پونے چودہ سو برس سے علی سبیل التواتر ہر زمانے میں ہر شہر میں بلکہ ہر مسلم گھر میں چلا آرہا ہے جس میں ایک شوشے، ایک نقطے میں بھی اختلاف نہیں ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عہد نبوی میں بلکہ جمع صدیقیؓ کے قبل تک خلافت صدیقیؓ میں بھی قرآن مجید کی کتابت کوئی نہیں کرتا تھا۔ سب دوسرے سے زبانی سیکھتے اور یاد کرتے تھے بلکہ صدیق اکبرؓ نے بھی جو ایک نسخہ مصحف زید بن ثابت سے لکھوایا، اس کو بھی انہوں نے اپنے پاس مقفل ہی رکھا۔ کبھی کسی کو دکھایا تک نہیں کوئی اس میں پڑھتا کیا۔ حضرت صدیق اکبرؓ کے بعد بھی حضرت فاروق اعظمؓ کے پاس جو وہ مصحف صدیقیؓ پہنچا تو وہ اس کو اسی طرح کتاب مکنون سمجھ کر چھپائے رکھے رہے۔ ان کے بعد اسی طرح وہ مصحف حضرت عثمانؓ کو ملنا چاہیئے تھا۔ مگر ان کو نہ ملا۔ برخلاف قیاس اللہ جانے کیوں حضرت حفصہؓ کے پاس پہنچ گیا۔ اور وہاں بھی اسی طرح

مقفل ہی رہا۔ جب حضرت عثمانؓ نے ۳۰ھ میں حضرت حفصہؓ کے یہاں سے وہ مصحف یا صحف صدیقیؓ بقول ابن شہاب زہری منگواکر اس کی نقلیں کرائیں جب کہیں قرآن کی کتابی صورت لوگوں کی نظروں کے سامنے آئی۔ غرض مودودی صاحب کے فحوائے کلام سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ۳۰ھ تک قرآن کتابی صورت میں نہیں آیا تھا بجز مصحف صدیقیؓ کے جو برابر کتاب مکنون ہی رہا۔ کسی نے کبھی اس کی زیارت کی خواہش ظاہر کرنے کی بھی ضرورت نہیں سمجھی یا ہمت نہیں پڑی۔

سوال تو جہ، عہد عثمانیؓ نہیں، عہد فاروقیؓ تک یا عہد صدیقیؓ تک یا عہد نبوی ہی تک سہی صرف زبانی ہی تعلیم قرآن کا دستور تھا۔ کوئی شخص لکھتا ہی نہ تھا کہ لکھی کتاب میں نقطے اور اعراب نہ ہونے کی وجہ سے پڑھنے والا گھبراتا کہ کیا پڑھیں؟ اور ایک سے زیادہ پڑھنے والے اختلاف کرتے تو پھر یہ اختلاف قرآت کہاں سے آگیا؟

مودودی صاحب کی ایک تیسری حقیقت نے تو ان کی بیان کردہ پہلی دونوں تاریخی حقیقتوں کی دھجیاں اڑا کر رکھ دیں۔

یقیناً آپ کہیں گے کہ حضرت عثمانؓ کے وقت میں مسلمانوں کے پاس مصاحف تھے جبھی تو حضرت عثمانؓ نے جہاں جہاں مصحف بھیجا وہاں وہاں یہ بھی کہلا بھیجا کہ ہر شخص اپنے مصحف کو اسی کے مطابق کرلے اور جس نسخے میں زیادہ اختلاف ہو اس کو جلا دے۔ اس لئے اس تاریخی حقیقت سے کس طرح انکار کیا جائے گا پھر بخاری کی روایت ہے کہ

---

(۱) حسب حساب صحیح اور بقول ابن حجر ۲۵ھ میں۔ (تمنا)

چار انصاری صحابیوں نے عہد نبوی ہی میں مکمل قرآن کتابی صورت میں لکھ لیا تھا بلکہ آغاز نبوت ہی میں صحابہؓ اپنے پاس نازل شدہ آیات و سور لکھ لکھ کر رکھتے تھے۔ حضرت عمرؓ اپنی بہن کے یہاں مصحف دیکھ کر متعدد سورتوں کی مختلف آیتوں سے متاثر ہوئے تھے اور ایمان لائے تھے وہ مصحف حضرت خبیبؓ کا تھا جو وہاں لے کر وہ گئے تھے۔ اس لئے عہد نبوی میں قرآن کے لکھنے کا اور لکھ کر اپنے پاس رکھنے کا اور اس میں تلاوت کرنے کا بہت کافی دستور تھا۔ ہر لکھا پڑھا صحابیؓ اپنے پاس مصحف رکھتا تھا۔ امہات المومنینؓ میں سے ہر ایک کے پاس مصحف تھا۔ کتاب دیکھ کر پڑھنے کی ترغیب کیوں دی جاتی؟ اور آپ صحابہؓ کو قرآن ساتھ لے کر سفر کرنے سے کیوں منع فرماتے تھے؟ ان تمام باتوں سے تو صاف ثابت ہو رہا ہے کہ عہد نبوی میں قرآن کی کتابت کا عام دستور تھا۔ اور ہر لکھا پڑھا صحابیؓ قرآن لکھ کر اپنے پاس رکھتا تھا۔ اور ترغیب نبوی کے مطابق کتاب، دیکھ دیکھ کر پڑھتا تھا۔ تو وہ مودودی صاحب کی یہ تیسری حقیقت بھی تو ان دونوں پہلی تاریخی حقیقتوں کی طرح بالکل سراب ہی نکلی۔ تو پھر اصل حقیقت کیا ہے؟

میں اس کا جواب آپ کو آخر میں دوں گا۔ ابھی مودودی صاحب کی گہرافشانیوں کی سیر تو ختم کر لیجئے۔ مگر اپنے اس سوال کو اور میرے وعدے کو یاد رکھئے ۔ میں "اصل حقیقت" ہی کی سرخی کے ماتحت انشاء اللہ آپ کو تشفی بخش جواب دوں گا۔

مودودی صاحب اس کے بعد چوتھی تاریخی حقیقت بیان فرماتے ہیں کہ یہ بات تاریخ سے ثابت ہے کہ حضرت عثمانؓ نے قرآن کے جو مستند

نسخے لکھوا کر مملکت کے مختلف مراکز میں رکھوائے تھے ان کے ساتھ ایک ایک ماہر قرآت کو بھی مقرر کر دیا تھا تاکہ وہ ان نسخوں کو ٹھیک طریقے سے لوگوں کو پڑھنا سکھائے۔ مدینے میں زید بن ثابتؓ اس خدمت پر مقرر تھے۔ مکہ میں عبداللہ بن السائبؓ کو خاص طور پر اسی کام کیلئے بھیجا گیا تھا۔ شام میں مغیرہ بن شہاب، کوفے میں ابو عبدالرحمن السلمی اور بصرے میں عامر بن عبدالقیس اس منصب پر مامور کئے گئے تھے۔ ان کے علاوہ جہاں جو صحابی بھی حضور سے براہ راست یا آپ کے بعد قراء صحابہ سے قرآن کی پوری قرآت سیکھے ہوئے تھے ان کی طرف ہزارہا آدمی اس مقصد کے لئے رجوع کرتے تھے کہ قرآن کا صحیح تلفظ اور صحیح اعراب لفظ بلفظ ان سے سیکھیں۔ معلوم نہیں مودودی صاحب نے اس چوتھی بات کو جو ان کے اور بہت سے متقدمین ومتاخرین کے نزدیک تاریخ سے ثابت ہے اس کو "چوتھی تاریخی حقیقت" کہہ کر کیوں پیش نہیں فرمایا؟ مگر جب یہ تاریخ سے ثابت ہے تو یقیناً ان کے نزدیک یہ ضرور "چوتھی تاریخی حقیقت" ہے تو اس چوتھی تاریخی حقیقت کی حقیقت اگر آپ کو معلوم کرنا ہو تو میری کتاب "جمع قرآن" کے بغور مطالعہ کی زحمت گوارا کر لیجئے۔ آپ کو اس چوتھی حقیقت کی حقیقت بھی معلوم ہو جائے گی۔

---

(۱) معلوم نہیں یہ کہاں کی روایت ہے صحاح میں تو کہیں نہیں۔ مسند احمد میں بھی نہیں اور بقول ائمہ حدیث جو روایت مسند احمد میں نہیں تو اس کو ضرور جھوٹی روایت سمجھنا چاہئیے۔ غالباً "جمع القرآن" والی میری کتاب میں میرا اعتراض دیکھ کر مودودی صاحب نے اپنی طرف سے یہ بات بڑھائی ہے جس کا کوئی ثبوت وہ کسی روایت سے نہیں دے سکتے۔ حتیٰ کہ اتقان میں بھی اس کا کہیں ذکر نہیں۔ میرا اعتراض میری کتاب "جمع القرآن" میں دیکھئے۔

حقیقت یہ ہے کہ نقل مصاحف بعہد عثمانؓ والی حدیث ہو یا جمع صدیقؓ والی، بخاری میں یا ترمذی میں یا نسائی وغیرہ میں۔ بالکل موضوع اور منافقین کی من گھڑت ہے جو صحیح بخاری وترمذی ونسائی میں داخل کردی گئی ہے ان جامعین احادیث کی وفات کے بعد۔ جس پر مکمل بحث میری کتاب "جمع القرآن" میں موجود ہے۔ میرے اعتراضوں کا جواب میرے دلائل کی تردید آج تک کسی سے نہ ہوسکی۔ اور انشاء اللہ المستعان قیامت تک نہ ہوسکے گی۔

تاریخ کے نام پر افسانہ طرازی مودودی صاحب نے خود یا جس کتاب سے انہوں نے نقل مصاحف عثمانی کا واقعہ نقل کیا ہے اس کے مصنف نے یہ واقعہ تصنیف کیا ہے کہ حضرت عثمانؓ نے جو مملکت اسلامیہ کے مراکز میں مصاحف بھیجے تھے ہر جگہ اس مصحف کے ساتھ ایک قاری معلم بھی بھیجا تھا کہ وہ لوگوں کو صحیح تلفظ اور صحیح اعراب بتائے حالانکہ صحیح بخاری وغیرہ کتب احادیث معتبرہ میں کہیں قاریوں کے بھیجنے کا ذکر نہیں۔ صرف مصحف بھیجنے کا ذکر ہے اور ہر جگہ کے لوگوں کو یہ کہا گیا تھا کہ تم اسی نسخہ مصحف کے مطابق اپنے اپنے مصاحف کو بنالو اور جو مصحف اس کے خلاف ہو اس کو جلا دو۔ ہر جگہ کے لوگوں نے خلیفہ وقت کے حکم کی تعمیل کی بجز اہل کوفہ کے۔ اس لئے کہ حسب روایت ابن خلدون وغیرہ حضرت عبداللہ بن مسعود نے اپنے مصحف کو نہیں بدلا اور اپنے شاگردوں کو بھی تاکید کی کہ تم لوگ اپنے مصحف نہ بدلو۔ ہر شخص اپنے مصحف پر قائم رہے۔ حالانکہ یہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ پر ایک اتہام ہے وہ تو ۲۹ ھ بلکہ اس سے کچھ پہلے ہی کوفے سے

مدینے چلے آئے تھے۔۔ ۳۰ھ میں انہوں نے حضرت عثمانؓ کے ساتھ حج کیا تھا اور نقل مصاحف کا واقعہ جو کہا جاتا ہے وہ صحیح حساب سے ۳۰ھ کا ہے۔ اس وقت حضرت عبداللہ بن مسعود کوفہ میں موجود ہی نہ تھے جو اپنے شاگردوں کو کہتے کہ اپنے مصاحف کو ان کے حال پر رہنے دو۔ مصحف عثمانی کے مطابق نہ بناؤ۔ باقی رہا ابن حجر کا روایت کاذبہ کی حمایت میں یہ کہنا کہ نقل مصاحف کا واقعہ ۲۵ھ کا ہے ۳۰ھ کا نہیں تاکہ جو اقوال حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی طرف منسوب کئے گئے ہیں وہ صحیح ثابت ہوں بالکل غلط ہے جس کو ہم "جمع القرآن" میں لکھ چکے ہیں۔

انتخاب معلمین بقول مودودی صاحب مدینے کے لئے معلم قرآن حضرت عثمانؓ نے زید بن ثابت کو مقرر کیا۔ اور مکہ کے لئے عبداللہ بن سائب کو۔ اگرچہ زید بن ثابتؓ سے زیادہ باا‌ثر اور اعلم بالقرآن قریشی لب ولہجہ سے واقف صحابہ مدینہ میں موجود تھے ان کے ہوتے زید بن ثابتؓ کا انتخاب ہرگز مناسب نہ تھا۔ مگر چونکہ یہ کاتب وحی وکاتب مصحف صدیقی وناقل مصاحف بعہد عثمانی قرار دیئے گئے ہیں ان کی اس صحیح یا غلط شہرت کی بناء پر ان کا انتخاب غلط نہیں کہا جاسکتا ہے۔ اور عبداللہ بن سائبؓ مخزومی تھے تو سہی مگر قریشی غالباً نہ تھے۔ اس لئے کہ دو قبیلے مخزومی کہے جاتے ہیں جن میں سے ایک قریشی تھے سمعانی نے انساب میں ان کا ذکر کیا ہے اور متاخرین کے نام گنے ہیں۔ یہ تو صحابی تھے اور پھر مکہ کے قاری تھے ضرور ان کا نام بھی وہ اس ضمن میں لکھتے۔ اس کے علاوہ جو شخص مخزومی قریشی ہو اس کے نام کے ساتھ مخزومی قریشی تمیز کیلئے ضرور لکھتے ہیں۔ لیکن ان کا ان کے والد کا ان کے

خاندان کے متعدد اشخاص کا ذکر تہذیب التہذیب میں ہے لیکن کسی جگہ کسی کو بھی قریشی نہیں لکھا ہے۔ اس لئے قرینہ غالب یہی ہے کہ یہ غیر قریشی تھے۔ بہرحال چونکہ اہل کوفہ نے جو قاریوں کا جال ہر جگہ بچھایا تھا اس کے مطابق ان کو بھی مکہ کا قاری مشہور کیا گیا تھا۔ اور مجاہد جو انہیں کے والد کے آزاد کردہ غلام تھے اور مکہ معظمہ میں کوفیوں کے ایجنٹ بھی تھے انہی مجاہد کو عبداللہ بن السائب کا شاگرد قرار دے کر ان کی طرف بھی کچھ اختلاف قرآت کی نسبت کی گئی ہے۔ اس لئے صنادید قرآت ہی نے حضرت عبداللہ بن السائب کو مکے کا قاری مشہور کیا ہے۔ مودودی صاحب نے اس کو غنیمت سمجھ کر یہ لکھ دیا کہ حضرت عثمانؓ نے ان کو اپنے مصحف کے مطابق تعلیم قرآن کیلئے مکے کا قاری مقرر کیا تھا۔ اگر واقعی زید بن ثابتؓ مدینے کے اور عبداللہ بن السائب مکے کے قاری حضرت عثمانؓ کے مقرر کئے ہوتے اور دونوں کو مصحف عثمانی ہی کے مطابق تعلیم قرآن کا حکم ہوتا تو اہل مکہ واہل مدینہ کی قرآتوں میں کوئی اختلاف نہ ہوتا۔ باقی رہے ابو عبدالرحمن السلمی یہ کوفی تھے اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے شاگردوں میں سے تھے زیادہ سے زیادہ ایک تابعی تھے۔ کیا حضرت عثمانؓ کو کوئی صحابی اس وقت نہ ملتا تھا کہ ایک غیر قریشی تابعی کو تعلیم قرآن کی اہم خدمت پورے علاقے کے لئے سپرد کی؟ اور وہ بھی ایک کوفی ہی کو؟ یہی کوفی عبداللہ بن مسعودؓ کے "شاگردان رشید" تو اختلافات پیدا کر رہے تھے۔ یہاں تو مدینے سے کسی خاص قریشی صحابی کو تعلیم قرآن کے لئے بھیجنا تھا تاکہ وہ اختلافات مٹائے۔ اصل یہ ہے کہ ان کو بھی کوفی ملاحدہ نے اختلافات قرآت کے لئے استعمال کیا ہے

اور ان کا نام بھی اپنے دفتر میں ٹانک لیا ہے اور کوفے کا امام القرآء بناکر مشہور کیا ہے اس لئے مودودی صاحب نے بھی ان کو حضرت عثمانؓ کا مقرر کیا ہوا قاری بنادیا۔

باقی رہ گئے دو آدمی، مغیرہ بن شہاب جو شام کے لئے مقرر کئے گئے تھے اور عامر بن عبدالقیس جو بصرے کے لئے حضرت عثمانؓ کی طرف سے بقول مودودی صاحب مقرر کئے گئے تھے۔ یہ دونوں سرے سے صحابی ہی نہیں ہیں۔ کوئی مشہور و معروف تابعی بھی نہیں، نہ امام ذہبی ان کا ذکر کہیں کرتے ہیں نہ ابن حجر یہ دونوں کوفے کے قاریوں کے ساختہ وپرداختہ امام القراء ہیں۔ قاریوں کے زمرے میں ان دونوں کا نام دیکھ کر ان دونوں کو بھی حضرت عثمانؓ کا مقرر کردہ قاری بنادیا۔ اس وقت تو سینکڑوں صحابہؓ موجود تھے جنہوں نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن پڑھا تھا۔ ایسے گمنام غیر معروفوں کا تقرر ضرور قابل لحاظ ہے۔

اس کے بعد مودودی صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ

> ان عام معلمین قرآن کے علاوہ تابعین وتبع تابعین کے عہد میں ایک گروہ ایسے بزرگوں کا بھی پیدا ہوگیا جنہوں نے خصوصیت کے ساتھ قرآت قرآن میں اختصاص پیدا کیا یہ لوگ ایک ایک لفظ کے تلفظ طریق ادا اور اعراب کو معلوم کرنے کے لئے سفر کرکر کے ایسے اساتذہ کے پاس پہنچے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قریب تر نسبت تلمذ رکھتے تھے اور ہر ہر لفظ کی قرآت کے متعلق یہ نوٹ کیا کہ اسے انہوں نے کس سے سیکھا ہے۔ اور ان کے استاد نے کس سے سیکھا تھا؟ اسی

مرحلہ میں یہ بات تحقیق ہوئی کہ مختلف صحابیوں اور ان کے
شاگردوں کی قرآت میں کہاں کہاں اور کیا کیا اختلافات ہیں۔
ان میں سے کون سے اختلاف شاذ ہیں، کون سے مشہور ہیں،
کون سے متواتر ہیں۔ اور ہر ایک کی سند کیا ہے ؟ (مگر یہ
اختلافات کیوں پیدا ہوئے؟ اس کی وجہ ان بزرگوں سے کسی نے
نہیں پوچھی۔ تمنا) پہلی صدی کے دور آخر سے لے کر دوسری
صدی تک اس طرح کے ماہرین قرآت کا ایک گروہ کثیر
دنیائے اسلام میں موجود تھا۔ مگر ان میں سے خاص طور پر جن
لوگوں کا کمال علم تمام امت میں تسلیم کیا گیا ہے وہ حسب ذیل
سات اصحاب ہیں جو قرآء سبعہ کے نام سے مشہور ہیں۔

(۱) نافع بن عبدالرحمن المتوفی ۱۶۹ ھ اپنے وقت میں مدینے کے
رئیس القراء مانے جاتے تھے۔ ان کا سب سے زیادہ معتبر سلسلہ
تلمذیہ تھا کہ انہوں نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت
ابوہریرہؓ سے پورا قرآن پڑھا تھا۔ انہوں نے ابی بن کعب سے
اور انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے۔

واقعہ یہ ہے کہ سارے اختلافات قرآت کوفے کی ٹکسال میں گھڑے
جاتے تھے اور پھر اپنے مراکز ان ملاحدہ کوفیوں نے بنا رکھے تھے اور ہر
مرکز میں اپنے ایجنٹ مقرر کردیئے تھے پوری طرح سوچ بچار کر کہ کس
اختلاف کو کس کی طرف منسوب کیا جائے اور اس کے لئے کون کون سے
سلاسل اسناد جوڑے جائیں ۔ جب آپس میں بات طے کرلیتے تھے تو اس

کے مطابق ان خود ساختہ اختلاف قرآت کو خود ساختہ اسناد کے ساتھ مراکز میں بھیج دیتے تھے۔ سب سے پہلے "انزل القرآن علی سبعۃ احرف" قرآن سات حرفوں پر اتارا گیا ہے۔" یہ حدیث گھڑی جاچکی تھی اور اس کی اشاعت بھی پوری طرح کی جاچکی تھی لیکن یہ سب بہت بعد کو کم وبیش تیسری صدی میں ہوا۔ اس سے پہلے اختلاف قرآت کا مطلق وجود ہی نہ تھا صرف سازشی مصنفین اپنی کتابوں میں کہیں کہیں بعض اختلافات کا ذکر کر جاتے تھے مگر سبعۃ احراف والی حدیث کا پرچار البتہ پہلی صدی کے اواخر یا دوسری صدی کے آغاز سے شروع ہوگیا تھا تو اب ہم ان کے قراء سبعہ جو تمام ائمہ قرآت میں سب سے زیادہ ممتاز رہے اور ہیں، کی حقیقت ناظرین پر واضح کرتے ہیں۔ نافع بن عبدالرحمن جو ان لوگوں کے نزدیک مدینہ طیبہ کے امام القراء اور سب سے بڑے قاری تھے ان کا نام اوپر آچکا ہے ۔ اس لئے پہلے انہیں کا تذکرہ ہوجائے۔

قراء سبعہ کا تعارف

(۱) نافع بن عبدالرحمن بن ابی نعیم

یہ قبیلہ بنی لیث میں سے کسی شخص کے آزاد کردہ غلام تھے۔ اور بعضوں نے قبیلہ جعونہ کا غلام لکھا ہے اصفہانی تھے۔ ان کے والد ابو نعیم اور ان کے دادا کا نام عبدالرحمن تھا۔ ان کے والد اور ان کے دادا نے ساتھ ساتھ ہی اسلام قبول کیا تھا اس وقت یہ کمسن تھے ۔ ان کی خود کنیت ابو رویم بھی ہے اور ابو عبدالرحمن بھی۔ ان کے دادا کا اسلامی نام نعمان رکھا گیا تھا اور ابو نعیم کنیت۔ مگر کنیت ہی سے وہ زیادہ مشہور

ہوئے۔ نافع کی نسبت کبھی باپ کی طرف کبھی دادا کی طرف کی جاتی ہے اس لئے یہ نافع بن عبدالرحمن بھی کہے جاتے ہیں اور نافع بن ابی نعیم بھی ۔ حدیثیں تو یہ متعدد تابعین سے روایت کرتے ہیں مگر قرآت میں یہ اصل شاگرد ہیں عبدالرحمن بن ہرمز کے۔ اس لئے عبدالرحمن بن ہرمز کو بھی پہچان لیجئے۔ یہ لنگ کھاتے تھے اس لئے اعرج مشہور ہیں۔ ابو داؤد ان کی کنیت تھی ربیعہ بن الحارث بن عبدالمطلب الہاشمی کے غلام آزاد کردہ تھے۔ بعضوں نے محمد بن ربیعہ کا غلام لکھا ہے۔ ان کا مفصل تذکرہ تہذیب التہذیب جلد ۶، صفحہ ۲۹۰ سے صفحہ ۲۹۱ تک ہے۔ تذکرہ الحفاظ میں ہے کہ یہ کاتب المصاحف بھی تھے۔ قرآن مجید لکھا کرتے تھے۔ ۱۱۷ھ میں وفات پائی۔ ابو عمر الدانی جو مشہور امام قرآت ہیں ان کا قول تہذیب التہذیب میں نقل کیا ہے کہ انہیں سے نافع بن ابی نعیم نے قرآن کی قرآت زبانی سن کر حاصل کی تھی۔ عبدالرحمن بن ہرمز کے والد کا نام اسلام قبول کرنے کے بعد کیسان رکھا گیا تھا۔ اس لئے ان کو لوگ کہیں عبدالرحمن بن کیساں بھی کہتے ہیں بعضوں نے ان کا سال وفات ۱۱۰ھ لکھا ہے۔ غرض یہ بھی موالی ہی میں سے تھے۔ یہ متعدد صحابہؓ سے حدیثیں روایت کرتے ہیں اور ان سے متعدد محدثین حدیثیں لیتے ہیں مگر اس کا کوئی ذکر نہیں کرتا کہ انہوں نے کس سے قرآن پڑھا تھا؟ اور نہ یہ کوئی لکھتا ہے کہ نافع بن عبدالرحمن بن ابی نعیم کے سوا کیا اور بھی کسی نے ان سے قرآن پڑھا تھا؟ اگر اور بھی کسی نے ان سے قرآن پڑھا تھا تو وہ کون صاحب ہیں؟

ابو حمۃ محمد بن یوسف جو تقریباً ایک مجہول الحال شخص ہیں وہ ابو قرۃ

موسیٰ بن طارق سے روایت کرتے ہیں کہ نافع بن ابی نعیم کہتے تھے کہ میں نے ستر تابعین سے قرآن کی قرآت اخذ کی ہے۔ کاش ان ستر میں سے صرف سات کے نام ہی وہ بتادیتے۔ اس لئے کہ ان کی قرآت کی روایتیں جتنی ہیں تقریباً سب انہیں ابن ہرمز ایک غلام آزاد کردہ ہی سے ہیں۔ حدیثیں البتہ وہ اوروں سے روایت کرتے تھے۔ ابن حجر احادیث میں ان کے شیوخ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں ولنافع عن الاعرج نفسه مائة حديث اخرىٰ وعنه اخذ القراءة۔ اور نافع کے پاس (عبدالرحمن بن ہرمز) اعرج سے خاص ان سے سو حدیثیں دوسری تھیں۔ (یعنی جو اور شیوخ سے ان کو نہ ملی تھیں) اور انہیں سے نافع نے قرآۃ حاصل کی تھی۔ عنہ کے لفظ کا جملے سے پہلے آنا مفہوم حصر پیدا کرتا ہے۔ اس کو ادب عربی کے ابتدائی درجوں کے طلبہ بھی جانتے ہیں۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ نافع کو قرآت کے اختلافات کی واقفیت صرف عبدالرحمن بن ہرمز اعرج ہی سے حاصل ہوئی تھی اور نافع نے قرآن کی قرآتوں کو صرف انہیں سے پڑھا تھا۔ دیکھئے تہذیب التہذیب جلد ۱۰ صفحہ ۷، ۸، ۴۰۰ مگر اس حصر کے معنیٰ یہ نہیں ہیں کہ اور کسی سے انہوں نے قرآت کا فن حاصل ہی نہیں کیا۔ یہ حصر ان کے ان شیوخ کے مقابلے میں ہے جن کا ذکر ابن حجر نے تہذیب التہذیب میں ان کے ترجمے میں پہلے کیا۔ جو صحابہؓ کی اولاد یا اکابر تابعین تھے جن سے صرف حدیثیں انہوں نے لی تھیں۔ وہ لوگ بے چارے اختلافات قرآت سے کیا واقف جو ان سے قرآت کا فن سیکھتے۔ اس کے ماہرین تو صرف عجمی لوگ تھے جو عرب کے آزاد کردہ غلام تھے۔ جن کا اصل مرکز کوفہ تھا۔ مدینے کے قدیم باشندے جو عہد نبوی سے

مدینے میں رہے یا صحابہ کی اولاد میں سے جو مدینے ہی میں پیدا ہوئے یا وہ
موالی جو سچے مخلص مسلمان تھے اور جس خاندان سے متعلق ہوئے ان
کے ہوکے رہے۔ ان غریبوں کو تو اختلافات قرآت کا کچھ علم تھا ہی نہیں۔
اس لئے جن کا ذکر ابن حجر نے پہلے کیا ہے یہ حصر صرف انہی لوگوں کے
مقابل ہے۔ ورنہ بعض دوسرے آزاد کردہ غلاموں سے بھی نافع نے
قرآت کا فن حاصل کیا تھا جیسا کہ ابن حجر تہذیب التہذیب جلد ۱۱، صفحہ
۳۲۵ یزید بن روماں الاسدی ابو روح المدنی آل زبیر کے غلام آزاد کردہ
کے ترجمہ کے آخر میں لکھتے ہیں کہ انہوں نے عبداللہ بن عباس بن ابی
ربیعہ سے قرآن پڑھا تھا اور ان سے نافع بن ابی نعیم نے قرآن کا علم
حاصل کیا تھا مگر یہ عبداللہ بن عباس بن ابی اربعہ کون تھے؟ اس کا پتہ نہ
ملا کیونکہ حضرت عبداللہ بن عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہما تو ہو
نہیں سکتے۔ اور ابن ابی ربیعہ کا پتہ کہیں نہیں ملتا۔ اگر یہ کہا جائے کہ
" ابن ربیعہ " کا لفظ غلط ہے غلطی سے اتنا اضافہ طباعت میں ہوگیا ہے۔
مراد حضرت عبداللہ بن عباس ہی ہیں۔ تو یقیناً ان سے صرف قرآن ہی یہ
نہ پڑھتے وہ تو حدیثوں کے بحر ذخار تھے جس طرح اوروں سے حدیثیں سنی
تھیں اسی طرح ان سے حدیثوں کے سننے کا ذکر کرنے کے بعد لکھا جاتا کہ
اقراء علیہ القرآن یعنی اور ان سے قرآن بھی پڑھا تھا۔ جب ایسا نہیں ہے
ان سے صرف قرآن ہی پڑھا تھا تو یقیناً یہ عبداللہ بن عباس بن ابی ربیعہ
کوئی غیر معروف مجہول الحال شخص ہیں جن سے ائمہ رجال بالکل بے خبر
ہیں اور موالی ہی قسم کے ہیں جو کوفیوں کی طرف سے صرف اختلافات
قرآت کے ایجنٹ تھے۔ کوفے کے مرکز سے نافع بن ابی نعیم کے پاس

بھیجے گئے تھے۔ واللہ اعلم ۔ بہرحال نافع کے یہ استاد یزید بن رومان بھی آل زبیر کے غلام آزادہ کردہ ہی تھے۔ اور انہوں نے خود بھی قرآن ایک مجہول الحال ہی شخص عباس بن ربیعہ کے بیٹے عبداللہ سے پڑھا تھا۔ اور ان سے صرف نافع صاحب نے قرآن کی قرآت کا علم حاصل کیا۔

مودودی صاحب کی "علمی و تاریخی تحقیق"

مودودی صاحب اپنے اس زیر تنقید مضمون شائع شدہ ترجمان القرآن جلد ۵۲، عدد ۳ کے صفحہ ۱۷۷ میں نافع بن عبدالرحمن بن ابی نعیم کے متعلق خود تحریر فرماتے ہیں "متوفی ۱۶۹ھ" پھر لکھتے ہیں کہ

"ان کا سب سے زیادہ معتبر سلسلہ تلمذیہ تھا کہ انہوں نے حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت ابو ہریرہؓ سے پورا قرآن پڑھا۔" الخ

حضرت عبداللہ بن عباس کی وفات ۶۹ھ میں اور حضرت ابوہریرہؓ کی وفات ۵۷ھ میں ہوئی تھی ۔ نافع اور حضرت ابن عباس کی وفات کے درمیان پورے سو برس کا فاصلہ اور نافع اور حضرت ابوہریرہؓ کی وفات کے درمیان ایک سو سے بھی دو برس فاضل کا فاصلہ تھا۔ نافع کی عمر اگر کوئی غیر معمولی لمبی ہوئی تو ائمہ رجال ضرور اس کو لکھ دیتے۔ جیسا کہ عموماً معمر راویان احادیث کی عمریں لکھ یاد کرتے ہیں۔ صحیح طور سے تعین ہنیں کرسکتے جب بھی اتنا ضرور لکھ دیتے ہیں کہ انہوں نے سو سے زیادہ عمر پائی تھی۔ یا اس کے نام کے ساتھ "معمر" کا لفظ لکھ دیتے ہیں جس طرح نافع ہی کے شاگرد کے شاگرد مسطوعی کو "معمر" لکھا ہے اور ان کی عمر ایک سو دو برس بتائی ہے۔ نافع صاحب کی عمر کم از کم ۱۲۵

برس کی ہو جب کہیں یہ بات مانی جاسکتی ہے کہ نافع نے ان دونوں بزرگوں سے قرآن مجید پڑھا۔ مگر نافع کی اتنی بڑی غیر معمولی عمر ثابت کرنا ناممکن ہے۔

لیکن آج مودودی صاحب ہی یہ دعویٰ کررہے ہیں کہ نافع بن عبدالرحمن نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ و حضرت ابوہریرہؓ سے پورا قرآن پڑھا تھا۔ مودودی صاحب کے سوا کسی شخص نے بھی اس کا دعویٰ نہیں کیا۔ ائمہ رجال اپنی کتابوں میں نافع کا ترجمہ لکھتے ہیں مگر کسی نے بھی تو نہیں لکھا ہے جو مودودی صاحب فرمارہے ہیں۔ تو کیا علمی و تاریخی تحقیق کا ایک اصول یہ بھی ہے کہ کوئی بات جی سے گھڑ کر لکھ دی جائے؟ غرض یہ ثابت ہوگیا کہ مدینے میں نافع بن عبدالرحمن کوفیوں کے ایک ایجنٹ تھے جو چپ چاپ وہاں بٹھا دیئے گئے تھے کہ اکابر تابعین کے سامنے بیٹھ کر ان سے صرف حدیثیں سنا کرتے تھے تاکہ ان کے آگے اپنا رسوخ قائم رہے۔ قرآن انہوں نے ان اکابرین تابعین سے کبھی نہیں حاصل کیا۔ قرآت کے متعلق جو کچھ ذخیرہ ان کو ملا وہ اپنے جیسے آزاد کردہ غلاموں سے ملا یعنی اعرج (عبدالرحمن بن ہرمز) سے یا یزید بن رومان الاسدی سے ۔ یہ خود بھی ایک آزاد کردہ غلام تھے اور ان کے دونوں استاد بھی آزاد کردہ غلام ہی تھے اور یہ تینوں عجمی الاصل تھے۔ اور اختلافات قرآت کی سازشی انجمن کے ارکان اولی و خصوصی تھے۔ جو مدینے میں تو خاموش تھے مگر باہر ان کو مدینے کا قاری مشہور کیا گیا تھا۔ ورنہ مدینے میں جس کو قرآن پڑھنا تھا وہ صحابہؓ کی اولاد اور اکابر تابعین کو چھوڑکر ان عجمی غلاموں سے قرآن کیوں پڑھتا؟ کیا کوئی بتا سکتا ہے کہ صحابہؓ کی اولاد

یا اصاغر تابعین ہی میں سے جو عجمی الاصل نہ تھے ان میں سے کتنے لوگوں نے نافع صاحب اور ان کے دونوں استادوں سے قرآن پڑھا تھا؟ ھاتوا برھانکم ان کنتم صادقین

باقی ابو حمہ یمانی کا ابو قرۃ یمانی سے یہ روایت کرنا کہ ابو قرۃ سے نافع بن عبدالرحمن نے کہا تھا کہ میں نے ستر تابعیوں کے سامنے قرآن پڑھا ہے معلوم نہیں کہاں تک صحیح ہے۔ ابوحمہ محمد بن یوسف الیمانی صرف ابو قرہ موسیٰ ابن طارق الیمانی ہی سے حدیثیں روایت کرتے ہیں۔ قاری نہ وہ ہیں نہ یہ۔ ابو قرہ نے نافع عبدالرحمن سے صرف کچھ حدیثیں فقط سنی تھیں۔ ان سے ابوقرہ نے بھی قرآن نہیں پڑھا تھا۔ اور نہ ابن حجر تہذیب التہذیب جلد ۱۰، صفحہ ۳۴۹ میں ابو قرۃ کا ترجمہ لکھتے ہوئے جہاں روی عن فلاں فلاں کے ساتھ " نافع بن ابی نعیم " لکھا ہے وہاں ان کے بعد " وقراء علیہ القرآن " بھی ضرور لکھتے جس طرح نافع کے ترجے میں روی عن فلاں فلاں کے ساتھ اعرج کا ذکر کیا ہے تو چند ہی سطروں کے بعد و اخذ عنہ القرآن کہہ کر تصریح کردی ہے ۔ اس لئے کہ روی عن فلاں سے صرف روایت حدیث ہی سمجھی جائے گی۔ قرآت قرآن اس سے کوئی جاہل بھی نہیں سمجھ سکتا۔ اور کہا جاسکتا ہے کہ نافع نے ایک یمنی کے سامنے تنہائی میں یہ دعویٰ کردیا ہوگا کہ وہ تسلیم کرلے گا۔ کسی مدنی کے سامنے بھی اگر ایسا کہتے تو معلوم ہوتا۔ یا کسی مجمع میں کہتے۔

اور ابن وہب کی یہ روایت کہ لیث بن سعد کہتے تھے کہ ادرکت اھل المدینۃ و ھم یقولون قراء ۃ نافع سنۃ یعنی لیث بن سعد کہتے تھے کہ " میں نے اہل مدینہ کو یہ کہتے ہوئے پایا کہ نافع کی قرآت سنت

ہے۔ یعنی عہد نبوی سے اس وقت تک برابر سارے صحابہؓ وتابعین اسی کے مطابق پڑھتے آئے۔ مگر اگر ایسا ہو تو بھی کہنا یہ تھا کہ نافع کی قرآت وہی ہے جو قرآت مسنونہ ہے۔ کیونکہ نافع نے سو سے کچھ زیادہ بھی بالفرض عمر پائی ہو تو انہوں نے عہد خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم بھی نہیں دیکھا تھا۔ اگر اس وقت وہی قرآت پڑھی جاتی تھی جس کو نافع نے اختیار کیا تھا تو کیا اس وقت کے لوگ اس کو "نافع کی قرآت" ہی کہہ کر پڑھتے اور سمجھتے تھے؟ جو قرآت نافع کی پیدائش کے قبل سے جاری ہو اس کو نافع کی طرف منسوب کرنا تو اس قرآت کی توہین کرنا ہے مگر واقعہ اس کے خلاف ہے اس لئے کہ نافع کی پیدائش کے قبل کے لکھے ہوئے مصاحف اس وقت بھی موجود ہیں۔ حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ اور بعض دوسرے صحابہ یا اکابر تابعین کے مخطوطات۔ مگر ان میں سے ایک بھی نافع کی قرآت کے مطابق نہیں ہے۔ اس لئے یہ خلاف واقعہ بات ابن وہب (عبداللہ بن وہب المصری) نے لیث بن سعدالمصری کی طرف منسوب کرکے کیوں کہی؟ اور اگر واقعی لیث ہی نے ایسی بات جو بالکل خلاف واقعہ تھی ابن وہب سے کہی تھی تو کیوں کہی تھی؟ اس کی وجہ ظاہر ہے کہ عبداللہ بن وہب بھی قریش کے موالی میں سے تھے اور لیث بن سعد بھی۔ یہ دونوں قریش کے آزاد کردہ غلام تھے اور نافع بھی غلام تھے۔ اور نافع کے دونوں استاد بھی غلام تھے اور یہ سب عجمی تھے اور اختلاف قرآت کی تحریک ان غلاموں کی چلائی ہوئی تھی۔ عبداللہ بن وہب کی پیدائش ۱۲۵ھ کی تھی اور وفات ۱۹۷ھ میں، اور لیث بن سعد کی پیدائش ۹۴ھ میں اور وفات ۱۷۵ھ میں۔ دونوں ہی اصفہانی الاصل

تھے اور نافع بھی اصفہانی الاصل تھے۔ ابن وہب نے نافع کی قرآت کو رواج دینے کے لئے لیث کی طرف منسوب کرکے اس کی کوشش کی کہ مصر میں نافع کی قرآت جاری ہو اور مصر والے جو قرآت متواترہ مسنونہ پڑھ رہے ہیں اس کو حفص بن سلیمان الکوفی کی قرآت سمجھ کر چھوڑ دیں۔ مگر قرآن کی حفاظت کا وعدہ الٰہی ایسا نہیں ہے کہ قرآن کے کسی ایک نقطے یا اعراب کو بھی ادھر ادھر ہونے دے۔ اس لئے باوجود اتنے پروپیگنڈے اتنی جدوجہد اور ایسی گہری سازش کے بھی نہ مصر میں نافع کی قرآت چل سکی نہ مدینے میں اور نہ دنیا کے کسی حصے میں۔

و اللہ غالب علی امرہ و لکن اکثرالناس لایعلمون O (۱۲ : ۲۱)

اسی طرح بعض اکابر امت کی طرف جو نافع کی قرآت کی تعریف منسوب کی گئی ہے وہ یقیناً غلط منسوب ہے اور کسی کی طرف اگر نسبت صحیح کی گئی ہے تو اس کا قائل ضرور اسی طبقے کا ہوگا۔ البتہ متاخرین چونکہ فریب خوردہ تھے۔ اور وہ اختلاف قرآت کے دام تزویر میں پھنس چکے تھے اس لئے متاخرین جو کچھ بھی اختلاف قرآت یا کسی خاص قاری کی تعریف کریں وہ قابل اعتبار واستناد نہیں۔

قالون نافع بن عبدالرحمن کے تلامذہ جن کے ذریعے وہ قرآتیں بعد والوں کو ملی ہیں جو نافع کی طرف منسوب کی جاتی ہیں وہ صرف دو ہی ہیں جیسے ان کے استاد قرآن صرف دو تھے۔ باوجود اس کے کہ حدیثوں کے شیوخ خود نافع کے بھی دس بارہ سے زیادہ ہی ہیں اور ان کے ان دونوں تلامذہ کے شیوخ بھی نافع کے سوا بہت ہیں جن سے وہ دونوں حدیثیں

روایت کرتے تھے۔ غرض قرآن اور اس کی قرآتوں کی روایت کرنے والے صرف دو ہی آدمی ان کو ملے۔ (کیونکہ سازش کی راز داری اور من مانی خودساختہ قرآتوں کی رازدارانہ اشاعت کی پوری ذمہ داری لینے والوں کو ہی وہ اپنا شریک کار بناسکتے تھے) ایک تو عیسیٰ بن مینار جن کا لقب قالون ہے۔ تہذیب التہذیب جو صحاح کے راویوں کی کتاب ہے اس میں ان کا ذکر نہیں ہے۔ لسان المیزان جو خاص کرکے ضعیف و مجروح راویوں کی کتاب ہے اس میں ابن حجر نے ان کا ذکر کیا ہے۔ یہ تو نہیں مگر ان کے والد مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہ کے غلام آزاد کردہ تھے۔ احمد بن صالح المصری سے کسی نے پوچھا کہ ان کی حدیثیں کیسی ہیں؟ تو وہ ہنسے اور کہنے لگے کہ تم ہر کس و ناکس سے حدیث لے لیا کرتے ہو۔ مگر چونکہ بخاری میں ان کی حدیث موجود ہے اس لئے ان کے متعلق اس سے زیادہ ابن حجر نہیں لکھ سکے بلکہ توثیق کی کوشش کی ہے۔

ورش دوسرے راوی قرآت جو نافع کو ملے وہ ورش کے لقب سے مشہور ہیں جن کا ذکر ابن حجر نے کہیں نہیں کیا۔ ان کا پورا نام ابوسعید عثمان بن سعید ہے۔ یہ قبطی تھے مگر قریشیوں کے آزاد کردہ غلام تھے سلئے قریشی کہے جاتے ہیں۔ ١٩٧ھ میں وفات پائی۔ تو نافع بن عبدالرحمن بن ابی نعیم صاحب جو مدینے کے امام القرآء قرار دیئے گئے ہیں دونوں غلام - یہ خود غلام - ان کے دونوں شاگرد غلام، اور اس وقت کے اکابر بلکہ اصاغر مدینہ میں سے بھی کسی ایک شخص نے بھی ان سے قرآت حاصل نہیں کی۔ یہ صرف مدینے میں بیٹھے رہتے تھے اور کوفے والے ان کا پروپیگنڈہ کرتے تھے کہ یہ مدینے کے قاری ہیں۔ بلکہ یہ پروپیگنڈہ ان کی

وفات کے بعد سے شروع ہوا اور ان کو مدینے کا قاری اور امام القراء ان
کے مرنے کے بعد مشہور کیا گیا اور وہ بھی سو ڈیڑھ سو برس کے بعد بلکہ کچھ
اور مدت کے بعد نافع بے چارے تو مدینے کے معمولی لوگوں میں سے تھے
ان کی کوئی اہمیت وہاں نہ تھی ورنہ مدینے میں کتنے تاریخی واقعات ہوئے
ان کا یا ان کے والد ماجد کا کسی موقع پر بھی کوئی ذکر تاریخی کتابوں میں
ضرور آتا۔ نافع غریب کی وفات کے کم سے کم سو برس کے بعد ان کے سر
پر مدینے کے امام القراء ہونے کی پگڑی باندھی گئی ہے اور قالون اور ورش
جیسے گمناموں کو ان کا جانشین بنایا گیا۔ اور غالباً یہ دونوں بھی اپنے مرنے
کے بعد ہی نافع کے جانشین بنے ہوں گے۔ اس لئے کہ اختلاف قرآت کا
بازار لگایا گیا ہے چوتھی صدی کے اواخر میں اس سے پہلے بازار نہیں لگایا
گیا تھا۔ کوفے میں بیٹھے یاران طریقت بازار کا نقشہ بنارہے تھے اور
حضرت عبداللہ بن مسعودؓ پر جو یہ تہمت رکھی گئی تھی کہ جب حضرت
عثمانؓ کا بھیجا ہوا قرآن کوفے میں پہنچا تو انہوں نے اپنے شاگردوں کو اس
کے قبول کرنے سے منع کیا اور اختلافات کو باقی رکھنے کی تاکید کی۔ اس
لئے مختلف مصحف عبداللہ بن مسعودؓ، مصحف ابی ابن کعب مصحف سعد
بن ابی وقاص وغیرہ سب کوفے ہی میں ان لوگوں کے نام سے بنالئے گئے
تھے ابن جریر طبری کی وفات ۳۱۰ھ میں ہوئی اور ان کی زندگی تک
اختلاف قرآت کا وجود نہ تھا اس وقت عجمیوں اور موالی قسم کے لوگوں
نے صرف انزل القرآن علی سبعۃ احراف کا ڈھول پیٹنا کافی سمجھا تھا اور چھ
قرآتوں کے غائب ہوجانے کی وجہ یہ بتاتے تھے کہ حضرت عثمانؓ نے
امت کو قرآن میں اختلاف سے بچانے کے لئے چھ قرآتوں کو ترک کرادیا

تھا اور ضائع کرادیا اور صرف ایک قریش کی قرآت کو باقی رکھا ۔ اس لئے حضرت عثمان کے حکم سے چھ قرآتیں مٹا دی گئیں اور ایک ہی قرآت باقی رہی تو اب ان چھ قرآتوں کو تلاش کرنا غلط ہے۔ چنانچہ ابن جریر طبری اپنی تفسیر کے مقدمہ میں صفحہ ۲۵ پر لکھتے ہیں۔ "اگر کوئی پوچھے کہ تم کس کتاب اللہ میں ایسے حروف واحدہ ومفردہ پاؤ گے جو سات مختلف لغات سے پڑھے جاتے ہوں مگر معنیٰ میں متفق ہوں تو ہم تمہارے اس سوال کی صحت کو تسلیم کرتے ہیں اور اس کا جواب یوں دیتے ہیں کہ ہم نے یہ دعویٰ[1] کب کیا کہ وہ آج موجود ہیں۔ ہمیں تو صرف خبر دی گئی تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو یہ فرمایا تھا انزل القرآن علی سبعة احرف اس کے معنیٰ کیا کیا ہیں جو اخبار میں وارد ہیں، جس کا ذکر ہم[2] نے پہلے کیا۔ نہ وہ جو ہمارے مخالفین[3] اس کے بارے میں کہتے ہیں

---

(۱) اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جو ایک قرآت مخصوصہ ابن جریر کی طرف بھی منسوب کی جاتی ہے وہ بھی ابن جریر کی طرف ان کی وفات کے بعد بناکر منسوب کی گئی ہے۔ ابن جریر خود اس کے ذمہ دار نہیں۔

(۲) ابن جریر نے اس مقدمہ تفسیر میں اکاون طریق سے اس حدیث موضوع انزل القرآن علی سبعة احرف کی روایت اور اس کے معانی بھی اسی ضمن میں جو مروی ہیں لکھے ہیں۔ میں نے ان کی بھی تنقید کی ہے۔ مگر طوالت کے خوف سے اس کو اعجاز القرآن کی دوسری جلد کے لئے اٹھا رکھتا ہوں۔

(۳) ابن جریر کے مخالفین کون لوگ تھے جن کے نزدیک اختلافات موجود تھے۔ یہ وہی کوفے والے تھے جن سے ابن جریر کو اتفاق نہ تھا، ورنہ اور کون ہوسکتا ہے جن کو ابن جریر اختلاف قرآت کے متعلق اپنا مخالف کہیں۔ ابن جریر کے نزدیک سبعہ احرف میں سے چھ حروف باقی نہ رہے اور مخالفین کے نزدیک وہ سب باقی ہیں۔ ابن جریر نے انہیں کی تردید کی ہے اور وجوہات تردید اس سے پہلے بیان کی گئی ہیں۔

ان وجوہات کی بناء پر جس کو ہم نے پہلے بیان کیا تو اگر کہا جائے کہ پھر وہ چھ حروف جو اترے تھے ان کی عدم موجودگی میں ان کا کیا حال ہوگا۔ تم نے خود ان کی حدیثیں پیش کیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو خود پڑھا تھا اپنے صحابہ کو پڑھایا تھا۔ ان کو ان قرآتوں کے مطابق پڑھنے کا حکم فرمایا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان سب قرآتوں کو اپنے نبی پر اتارا تھا کیا وہ چھ قرآتیں منسوخ ہوگئیں یا اٹھ گئیں۔ تو ان کے منسوخ یا مرفوع ہوجانے کی کیا دلیل ہے؟ یا امت ان کو بھول گئی۔ اگر ایسا ہے تو ایک مامور یہ چیز کا ضائع کردینا ہے۔ جس کی حفاظت کا حکم تھا آخر اس مسئلے میں کون سا قول فیصل سمجھا جائے؟

تو اس کا جواب یہ دیا جائے گا کہ وہ نہ چھ قرآتیں منسوخ ہوئیں نہ مرفوع ہوئیں اور نہ امت ان کو بھولی۔ باوجود اس کے کہ وہ ان کے حفظ پر مامور تھی۔ اصل یہ ہے کہ امت حفظ قرآن پر مامور تھی اور اس کو یہ آزادی دی گئی تھی کہ ان سات قرآتوں میں سے جس قرآت پر بھی چاہے پڑھے، حفظ کرے۔ جس طرح کوئی شخص قسم کھا کر توڑ دے تو اس کو یہ اختیار ہے کہ تین کفاروں میں سے جس کفارے کو چاہے ادا کرے،

---

(۷) معلوم ہوتا ہے کہ کوفے کے یہ ملاحدہ ابن جریر کے پاس پہنچے تھے یہ سمجھ کر کہ یہ بھی عجمی ہیں اور شیعہ بھی ہیں یہ ضرور ہمارے ساتھ ہوجائینگے۔ مختلف مصاحف انہوں نے تیار کر رکھے تھے وہ دکھائے تھے یا ان کا ذکر کیا تھا اور عبداللہ بن مسعودؓ کے منع کرنے کا بھی ذکر کیا ہے کہ انہوں نے مصحف عثمانی کی اتباع کرنے سے منع کیا اور ہم لوگوں کو اپنے اپنے مصحف پر قائم رہنے کی تاکید کی، مگر ابن جریر ہزار شیعہ سہی۔ عجمی سہی، مگر موالی میں سے نہ تھے اور نہ ان ملاحدہ کی طرح ملحد تھے۔ اس لئے ان کے دام میں نہ آئے۔ ابن جریر نے ان کو اپنا یعنی مسلمانوں کا مخالف قرار دے کر ان کا ذکر کیا۔

چاہے غلام آزاد کرے، چاہے دس مسکینوں کو کھانا کھلادے یا کپڑے پہنادے۔ تو ان تین کفاروں میں سے جس کفارے کو بھی وہ ادا کرے گا اللہ کے حق سے اس بارے میں سبکدوش ہوجائے گا۔ اسی طرح امت کو یہ اختیار دیا گیا تھا کہ وہ ان سات حرفوں میں سے جس حرف پر بھی چاہے قرآن کو پڑھے اور یاد کرے۔ امت پر واجب تھا کہ سات حرفوں میں سے کسی ایک حرف پر بھی ثبات رکھے تو جب ایک حرف کے مطابق امت پڑھنے لگی تو باقی حروف خود بخود ترک ہوگئے۔ تو اگر پوچھا جائے کہ وہ کون سا باعث تھا کہ امت ایک حرف پر ثابت ہوگئی اور دوسرے چھ حروف ساری امت سے بالکل ترک ہوگئے؟ تو اس کی وجہ یہ ہے۔"

اس کے بعد ابن جریر نے جمع قرآن بعہد صدیقؓ کی روایت پھر نقل مصاحف بعہد عثمانیؓ کی روایت نقل کرکے یہ ثابت کیا ہے کہ جب حضرت عثمانؓ نے بتقاضائے مصلحت صحابہؓ کے مشورے سے اختلافات فی القرآن کی کثرت دیکھی تو صرف لغت قریش پر قرآن کو باقی رکھا اور باقی حروف کی چھ قرآتوں سے امت کو روک دیا اور ایسے مصاحف کو جو دوسری قرآتوں کے مطابق لکھے ہوئے تھے ضائع کرادیا۔ اس لئے چھ قرآتیں دنیا سے ناپید ہوگئیں اور ہر جگہ صرف ایک ہی قرآت کا مصحف ہمیں ملتا ہے۔

ابن جرید کی اس تصریح سے صاف ظاہر ہے کہ ان کے وقت تک اختلافات قرآت کے سات اسکول نہیں قائم ہوئے تھے اور قرآتوں کا بازار نہیں لگا تھا۔ صرف کوفے کے متعدد گھروں میں چپکے چپکے افسانہ اختلاف قرآت کی کھچڑی پک رہی تھی اور دسترخوان پر صرف موالی قسم

کے ایسے لوگ جو ان کے دام میں آچکے تھے یا آ سکتے تھے وہی بٹھائے جاتے تھے۔ مگر اسکول کا نقشہ کاغذ پر ضرور بن گیا تھا اور اپنا ایک آدمی ہر اسکول میں رکھ دیا گیا تھا۔ مگر جہاں وہ اسکول بنا تھا وہاں کے لوگ مدت تک اس اسکول سے کچھ واقف نہ ہوتے اور جو ہیڈ ماسٹر اسکول کا ہوتا وہ ایک طالب علم کی طرح وہاں کے محدثین کے پاس جاکر صرف حدیثیں سنا کرتا تھا۔ اس کا اسکول کوفے کے دارالندوہ میں ایک کاغذ پر ہوتا تھا۔ یہاں کچھ دنوں رہ کر ہر ہیڈ ماسٹر کو چپکے چپکے رازدارانہ اسکول چلانے کا طریقہ معلوم کرلینا پڑتا تھا۔

مختصر یہ کہ نافع صاحب کو ہمراز صرف دو شاگرد اختلاف قرآت کے ملے ایک تو قالون عیسیٰ بن مینا جو بالکل نپٹ بہرے تھے، پڑھنے والوں کے لبوں کی حرکت سے تلفظ کا اندازہ لگا کر تعلیم دیتے تھے۔ جیسا کہ ابن حجر نے لکھا ہے ۔ دوسرے ورش ابو سعید عثمان بن سعید۔ قالون کے بھی دو شاگرد قرار دیئے گئے۔ ابو نشیط اور حلوانی۔ اسی طرح ورش کے بھی دو شاگرد ازرق اور اصبہانی۔ پھر ابو نشیط کا ایک شاگرد ابو بکر مگر اس کے دو شاگرد ابن بویان اور قراز اور حلوانی کے دو شاگرد ابن مہران اور جعفر بن محمد اور ازرق کے دو شاگرد اسماعیل النحاس اور ابن سیف اور اصبہانی کے بھی دو شاگرد ابن جعفر اور مطوعی ۔ تو خیال فرمائیے ع تین دن مسہل سے پہلے تین دن مسہل کے بعد۔ تین مسہل، تین تبریدیں۔ یہ سب کے دن ہوئے؟ نافع کے دو استاد پھر نافع کے دو شاگرد تک تو آپ ایک حد تک جان گئے۔ اب ہر شاگرد کے دو شاگرد اور پھر ہر شاگرد کے دو شاگرد۔ ان اٹھارہ آدمیوں کے حالات پر بحث آسان نہیں۔ خصوصاً جب ان میں سے

بہتیرے مجہول الحال ہیں۔ دنیائے رجال میں جن کا کوئی ذکر نہیں اور جہاں ذکر ہے وہاں اس سلسلہ اسناد کے خلاف مذکور ہے۔ مثلاً حلوانی کو یہاں قالون کا شاگرد بتایا ہے مگر لسان المیزان جلد ۱ صفحہ ۲۲۷ میں ان کے استاد قرآت کا کہیں ذکر نہیں۔ ان کے صرف ایک شاگرد قرات کا ذکر ہے وہ ان دو میں سے کوئی بھی نہیں جن کو اس سلسلے میں ان کا شاگرد بتایا گیا ہے بلکہ ایک تیسرے شخص ابوالکرم شہزداری کو لکھا ہے۔ ان کا سال وفات ۵۰۷ ھ ہے ۔ اسی طرح اصبہانی کو ورش کا شاگرد بتایا ہے مگر لسان المیزان جلد ۴، صفحہ ۴۷۰ میں ان کو کیسائی کا شاگرد لکھا ہے ۔ ورش کا ذکر تک نہیں۔ اسی طرح مطوعی حسن بن سعید بن جعفر المعمر نے ایک سو دو برس کی عمر پائی تھی۔ انہوں نے ابن مجاہد اور اسحاق بن احمد الخزاعی سے قرآن پڑھا تھا۔ کسی اصبہانی کا شاگرد ان کو نہیں لکھا ہے۔ یہ لوگ بغیر ناموں کی تصریح کے قصداً حقیقت حال کو چھپانے کے لئے صرف کنیت یا لقب وغیرہ لکھ کر اشخاص کو نقاب پوش بنادیتے ہیں تاکہ ان کی شخصیت معلوم نہ ہو۔ انشاء اللہ آئندہ ان اشخاص پر روشنی ڈالی جائے گی۔ مگر سردست نافع، ان کے دونوں شیخ اور ان کے دونوں شاگردوں کا حال ہی حقیقت حال کے سمجھنے کے لئے کافی ہے۔

قیاس کن زگلستان من بہار مرا

(۲) عبداللہ ابن کثیر قاری مکہ

عبداللہ بن کثیر الداری المکی ابو سعید القاری مولی عمرو بن علقمۃ الکنانی۔ مکہ مکرمہ میں یہ عطر فروشی کرتے تھے۔ اہل مکہ عطر فروش کو

داری کہتے تھے۔ بعضوں نے لکھا ہے کہ نہیں۔ بلکہ وہ تمیم کی ایک شاخ داری بن ہانی کی اولاد میں سے تھے۔ اس لئے ان کو الداری کہتے ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب ۔ بہرحال یہ علقمۃ الکنانی کے بیٹے عمرو کے آزاد کردہ غلام تھے۔ ابو الزبیر المکی سے حدیث روایت کرتے تھے اور مجاہد بن جبیر سے بھی اور انہیں سے قرآن بھی پڑھا تھا اور ابوالمنہال عبدالرحمن بن مطعم سے اور عکرمہ حضرت ابن عباس کے آزاد کردہ غلام سے بھی حدیثیں روایت کرتے تھے۔

صرف ابو عمرو الدانی نے کہا ہے کہ انہوں نے قرآت حاصل کی تھی۔ عبداللہ بن السائب المخزومی سے مگر مشہور یہ ہے کہ انہوں نے مجاہد بن جبیر سے قرآت سیکھی تھی ۔ امام بخاری نے بھی یہی لکھا ہے کہ عبداللہ بن کثیر المکی نے قرآت مجاہد سے حاصل کی تھی۔

ایک صاحب عبداللہ بن کثیر بن المطلب بن وداعۃ السہمی بھی تھے اور دونوں ہمعصر تھے مگر سہمی فقط محدث تھے اور داری مکہ مکرمہ کے قاری مقرر کئے گئے تھے۔ ائمہ رجال نے دونوں کے بعض حالات میں خلط ملط کردیا ہے ۔ ابن ابی مریم ابن معین کا قول روایت کرتے ہیں کہ عبداللہ بن کثیر الداری القاری ثقۃ جس سے یہ ثابت ہوگیا کہ یہ عجمی الاصل ملک رے کے رہنے والے تھے۔ ۱۲۰ھ میں وفات پائی ۔ غرض صرف ابوعمرو الدانی نے بقول ابن حجران کو عبداللہ بن السائب المخزومی کا بھی شاگرد بتایا ہے۔ ابو عمرو الدانی متوفی ۴۴۴ھ کے سوا اور کوئی بھی متقدمین میں سے ان کو مجاہد کے سوا اور کسی دوسرے کا شاگرد قرآت میں نہیں بتاتا۔ بلکہ "یتسیر" میں ابوعمرو الدانی نے حضرت ابن عباس کے

ایک آزاد کردہ غلام مرداس کو بھی ان کا استاد قرآت بتایا ہے۔ لیکن "مرداس" نام کا کوئی شخص جو حضرت ابن عباس کا غلام آزاد کردہ ہو دنیائے رجال میں کہیں نظر نہیں آتا بالفرض اگر ہو اور کسی گوشہ گمنامی میں پڑا خراٹے لے رہا ہو تو وہ بھی ایک غلام آزاد کردہ ہی ٹھہرا۔ اور جو ایسا مجہول الحال ہو جس کا نام تک ائمہ رجال کی زبان پر نہیں آتا اس کا ذکر کیا؟

حقیقت یہ ہے کہ مجاہد سائب بن ابی السائب کے غلام آزاد کردہ تھے اس لئے مجاہد نے اپنے آقا سائب کے صاحبزادے عبداللہ سے قرآن پڑھ لیا ہو یہ ممکن ہے۔ سائب اور عبداللہ بن سائب دونوں باپ بیٹے صحابی تھے۔ عبداللہ بن السائب کی وفات ۶۵ ھ میں ہوئی تھی۔ حضرت عبداللہ بن عباس نے ان کے جنازے کی نماز پڑھائی تھی ۔ عبداللہ بن کثیر عبداللہ بن سائب کی وفات کے وقت بہت کم سن تھے۔ اس لئے ابن کثیر کا ابن سائبؓ سے قرآن پڑھنا اور قرآت حاصل کرنا صحیح نہیں ۔ ابن کثیر نے صرف اور صرف مجاہد بن جبیر سے قرآت کا فن حاصل کیا جیسا کہ امام بخاری اور سارے ائمہ رجال لکھتے ہیں۔ ابو عمرو الدانی جو ابن کثیر سے دو سو برس سے زیادہ بعد کے آدمی ہیں ابن کثیر کے اساتذہ کے حال سے اتنا واقف نہیں ہوسکتے جتنا امام بخاری اور دوسرے ان سے متقدم ائمہ رجال واقف ہوسکتے ہیں۔

دانی اور ان کی کتاب "تیسیر" ابوعمرو الدانی کی تصنیف ہے ہی نہیں بلکہ یاران طریقت نے ایک کتاب تصنیف کر کے ان کے نام سے ان کی وفات کے بعد منسوب کر کے اس کی متعدد نقلیں کر کے پھیلائی ہیں جس

کا پتہ خود کتاب " تیسیر " کی ورق گردانی سے بآسانی مل سکتا ہے۔ بیسیوں جگہ آپ قال ابو عمرو اور قال ابو عمرو الدانی کے الفاظ دیکھیں گے اگر اس کتاب کے مصنف خود ابو عمرو الدانی ہوتے تو وہ خود اپنے متعلق قال ابوعمرو الدانی کیوں لکھتے ؟ ہاں اگر دو شخصوں کے مکالمہ کا ذکر ہوتا اس طرح کہ " قال فلاں وقال عمرو " تو ممکن تھا کہ مصنف نے خود اپنا قول اپنے نام کی طرف منسوب کر کے لکھا ہو۔ مگر یہاں تو مکالمہ ومقادلہ کی صورت کہیں بھی نہیں۔ مسائل کتاب لکھنے میں قال ابو عمرو لکھنے کی کیا ضرورت تھی؟ اب یہ قال ابو عمرو اور قال ابو عمرو الدانی لکھنے والے کون صاحب ہیں جب تک ان کا صحیح نام ونشان نہ ملے اس وقت تک ان اقوال کی نسبت جو ابوعمرو الدانی کی طرف کی گئی اس کی صحت وعدم صحت کا فیصلہ کس طرح کیا جاسکتا ہے؟ مگر بہرحال ایسی کتاب قابل وثوق تو نہیں ہو سکتی یہی وجہ ہے کہ عبداللہ بن کثیر کے اساتذہ قرآت میں خلاف جمہور ائمہ رجال حضرت عبداللہ بن السائب رضی اللہ عنہ کا نام اس میں لکھ دیا گیا اور ایک مجہول نام " مرداس " حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے آزاد کردہ غلام کا نام بھی تعدد شیوخ ثابت کرنے کے لئے بڑھا دیا گیا ہے۔ بہرحال ابوعمرو الدانی بھی قرطبی تھے اور خاندان بنی امیہ کے آزاد کردہ غلام تھے۔ اتنا یاد رکھیئے کہ متقدمین ائمہ قرآت میں آپ تقریباً ۹۵ فیصدی موالی یعنی آزاد کردہ غلاموں ہی کو پائیں گے۔ اختلاف قرآت کا فتنہ ان غلاموں ہی کا پیدا کردہ تھا اور انہوں نے ایک زبردست سازش کے ماتحت یہ تحریک چلائی تھی۔

کتاب " تیسیر " اور اس کے مصنف ابو عمرو الدانی کا ذکر تو ضمناً آگیا۔

اب آپ عبداللہ بن کثیر کے اصل اور اکلوتے استاد مجاہد بن جبیر کا حال سنیئے کہ مکہ مکرمہ کے مرکزی اسکول کے ہیڈ ماسٹر بھی مجاہد بن جبیر ہی تھے عبداللہ بن کثیر تو ان کے ایک شاگرد تھے جن کے سر پر قرآت کی پگڑی باندھ دی گئی۔

مجاہد بن جبیر یہ سائب بن ابی سائبؓ کے غلام آزاد کردہ تھے۔ ان کی پیدائش ۲۱ ھ میں زمانہ خلافت حضرت فاروق اعظمؓ ہوئی۔ ۸۳ برس کی عمر میں ۱۰۳ ھ میں وفات پائی۔ تفسیر کے بڑے عالم سمجھے جاتے تھے کہتے تھے کہ حضرت ابن عباس کے سامنے تیس بار قرآن پڑھا۔ اعمش کوفی جو شیعہ بھی تھے اور ان کے شاگرد رشید بھی کہتے تھے کہ مجاہد کہتے تھے کہ "اگر ہم عبداللہ بن مسعود کی قرآت کے مطابق قرآن پڑھتے تو ہمیں اس کی حاجت نہ پڑتی کہ اکثر جگہ ابن عباس سے معنی مطلب پوچھ لیتے۔"

اگر اعمش کی یہ روایت صحیح ہے اور واقعی مجاہد نے ایسا کہا ہے تو تعجب اور سخت تعجب ہے کہ مجاہد نے اپنے کوفی اساتذہ وتلامذہ سے عبداللہ بن مسعود والا مصحف کیوں نہیں مانگ لیا تھا؟ ترمذی جلد دوم صفحہ ۱۳۸ مطبوعہ مجتبائی دہلی میں نقل مصاحف بعد حضرت ذوالنورینؓ والی روایت جو بخاریؒ میں امام زہری سے ہی مروی ہے۔ یہاں بھی انہی

---

(۱) نقل مصاحف بعہد عثمانی کی روایت امام بخاری موسیٰ ابن اسماعیل سے وہ ابراہیم بن سعد سے، اور وہ زہری سے روایت کرتے ہیں اور ترمذی محمد بن بشار سے وہ عبدالرحمن بن مہدی سے وہ ابراہیم بن سعد سے اور وہ زہری سے روایت کرتے ہیں۔ مگر ابراہیم بن سعد موسیٰ بن اسماعیل سے وہ سب باتیں نہیں کہتے جو باتیں وہ عبدالرحمن بن مہدی سے کہتے ہیں۔ شاید اس لئے موسیٰ بن اسماعیل سے نہ کہا کہ وہ منقریوں کے غلام آزاد کردہ تھے۔ اور بعض لوگوں نے ان کے متعلق

زہری سے روایت کی گئی ہے مگر متعدد مضامین کے اضافے کے ساتھ جن سے بے چارے بخاری کو بے خبر ہی رکھنا مناسب سمجھا گیا تھا بہرحال ترمذی میں یہ موجود ہے کہ عبداللہ بن مسعودؓ نے اپنے عراقی تلامذہ کو منع کردیا تھا کہ آپ مصاحف کو مصحف عثمانی کے مطابق کرکے ضائع نہ کرو بلکہ اپنے حال پر باقی رکھو اور مصحف عثمانی کے طرف داروں سے اپنے مصحف کو چھپائے رکھو۔ محفوظ رکھو کہ کہیں وہ چھین کر ضائع نہ کریں۔ اس لئے عبداللہ بن مسعودؓ کے سینکڑوں تلامذہ جو عراق میں تھے سب کے پاس حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا مصحف ضرور موجود ہوگا۔ کوفہ تو عراق

کچھ کلام بھی کیا ہے یا زہری نے ان سے بھی کہا ہو مگر ان کی ہمت نہ پڑی کہ امام بخاری سے یہ سب لغو باتیں کہہ دیں۔ بہرحال ترمذی کی روایت میں اصل روایت کے بعد تابوت اور تابوہ کا اختلاف بھی زید بن ثابت سے مروی ہے اور پھر عبداللہ بن مسعودؓ کی خفگی کا ذکر بھی ہے کہ انہوں نے اہل کوفہ کو پکار کر کہا کہ اے لوگو! ذرا انصاف کرو یہ چھوکرا (زید بن ثابت) کہ جب میں ایمان لایا تھا اس وقت یہ اپنے کافر باپ کی پیٹھ میں تھا۔ یہ تو جمع یا کتابت قرآن کے لئے بلایا جائے اور مجھ کو نظرانداز کردیا جائے۔ اس کے بعد ترمذی کی روایت کی عبارت ہے۔ **ولذالک قال عبداللہ بن مسعود** اور اسی غصے کی وجہ سے کہ جمع ونقل مصاحف کے وقت ان کو نظرانداز کیوں کیا گیا۔ عبداللہ بن مسعودؓ نے پکار کر کہا تھا کہ اے اہل عراق! **اکتموا المصاحف التی عندکم** تم اپنے مصاحف کو چھپائے رکھو **وغلوھا** اور اس کے ساتھ خیانت کرو۔ یعنی حضرت عثمانؓ جب اپنا مصحف بھیجیں کہ اپنے اپنے مصاحف کو اس کے مطابق بنالو اور جس مصحف میں اس سے اختلاف ہو اس کو دھو ڈالو یا جلا ڈالو تو تم لوگ اس حکم کو نہ ماننا۔ اپنے اپنے مصاحف کو ان کے اعمال سے چھپائے رکھو اور امیر المومنین کے حکم کی نافرمانی کرو اور اس طرح قرآن کے ساتھ خیانت کرو۔ اس کے بعد عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ قرآن میں ہے کہ جو شخص خیانت کرے گا تو جس چیز کی خیانت کی ہے اس کو لے کر قیامت کے دن بارگاہ الٰہی میں حاضر ہوگا۔ تم لوگ اپنے اپنے مصاحف کے ساتھ اللہ سے قیامت کے دن ملو۔ اس روایت سے یہ معلوم ہوگیا کہ کوفہ وعراق میں عبداللہ بن مسعودؓ کے تلامذہ کے پاس وہ سب قرآن عبداللہ بن مسعودؓ والا۔ ابی کعب والا اور جو کچھ بھی تھا سب موجود تھا۔ اور سب موجود رہا۔

کا مرکز فتنہ وفساد تھا اور اسی تلقین وتاکید ابن مسعودؓ کا حیلہ قائم کر کے تو کوفے ہی سے اختلاف قرآت کا طوفان امڈا۔ مجاہد بن جبیر کے کوفی اساتذہ میں سے عبداللہ بن سنجرہ الازدی الکوفی۔ عبدالرحمن بن ابی لیلیٰ الکوفی، اور پھر خود عبداللہ بن مسعودؓ کے صاحبزادے ابو عبیدہ عامر بن عبداللہ بن مسعود الکوفی وغیرہم جن میں سے ہر ایک حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا خاص شاگرد تھا سب سے نہیں تو ان کے صاحبزادے عامر سے تو ان کو عبداللہ بن مسعودؓ کا مصحف مل سکتا تھا۔ پھر ان کے خاص عقیدت کیش شاگردوں میں تو نوے فیصدی کوفی ہی تھے ۔ عطا ابن السائب الکوفی، فطر بن خلیفۃ الکوفی، حکم بن عتیبہ الکوفی، زبید الیامی الکوفی، سلمہ بن بہیل الکوفی، سلیمان الاعمش الکوفی ، منصور بن المعتمر الکوفی ، مسلم بن عمران البطس الکوفی، حبیب بن ثابت مولیٰ بنی اسدالکوفی، حسن بن عمرو الفقیمی الکوفی، ابوجعفر عثمان بن مغیرۃ الکوفی اور عمرو بن ذرالکوفی وغیرہم۔ اتنے کوفیوں کے جھرمٹ میں رہنے والا مجاہد بن جبیر اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے مصحف کے لئے ترستا رہے؟ ان میں سے تو ہر ایک کے پاس عبداللہ بن مسعودؓ کا مصحف موجود ہوگا۔ اگر یہ کسی سے بھی مانگتے تو متعدد نسخے اس مصحف کے ان کے پاس موجود ہو جاتے۔ مانگنے کی بھی ضرورت نہ تھی۔ صرف جو اعمش سے کہا تھا وہی کسی اور کوفی سے کہتے تو ان کو گوہر مقصود مل جاتا۔ اعمش چونکہ شیعہ تھے اس لئے انہوں نے ایک سنی سے اغماض کیا ورنہ ان کے پاس بھی ضرور ہوگا۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نہ ترمذی کی وہ روایت صحیح ہے کہ صرف اس غصے پر کہ ان کو جمع قرآن یا نقل مصاحف کے وقت کیوں نہ پوچھا

گیا۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے امیرالمومنین کے حکم ہی کو نہیں بلکہ سارے صحابہؓ کے خلاف اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد ضرار الگ بناکر قرآن مجید میں اختلافات کو قائم رکھنے اور لوگوں کو گمراہ کرنے کا سامان مہیا کردیا۔ اور اس غصے میں اپنے ساتھ اپنے شاگردوں کو بھی گمراہ کیا؟ نعوذ باللہ من ذالک حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی شان اس قسم کی کینہ پروری اور بغض وعناد سے بہت پاک و بالاتر تھی۔ یہ ساری باتیں ان پر بہتان ہیں۔ بلکہ جمع قرآن بعہد صدیقیؓ ونقل مصاحف بعہد عثمانیؓ کی روایتیں ہی سرے سے موضوع اور منافقین کی سازشوں کے ماتحت گھڑی گئیں اور صحیح بخاری وترمذی ونسائی ومسند احمد وغیرہ میں داخل کردی گئیں۔ خود امام بخاری وامام ابوعیسیٰ الترمذی و امام نسائی وامام احمد بن حنبل کا دامن تقدس ان روایتوں کی آلودگیوں سے جہاں تک میں سمجھتا ہوں یقیناً پاک ہے۔ اور عجب کیا ہے کہ مجاہد نے بھی ایسا نہ کہا ہو ۔ یہ سلیمان الاعمش شیعہ کوفی نے غریب مجاہد پر بہتان باندھا ہو۔ و اللہ اعلم بالصواب .بہرحال اتنی تصریح سے یہ فائدہ ہوا کہ اہل مکہ کے لئے جو قرآت کا اسکول بنایا گیا تھا اور اس کا ہیڈ ماسٹر مجاہد بن جبیر کو بنایا گیا تھا اس کا پتہ مل گیا کہ وہ کوفیوں کا ہی ساختہ پر داختہ تھا۔ مجاہد کے اصل استاد جو طریق کار سکھاتے تھے وہ بھی کوفی ہی تھے اور ان کے شاگردان رشید بھی تقریباً سب کے سب کوفی ہی تھے۔ مجاہد مکے میں رہتے تھے مگر ان سے قرآت کا فن کوفیوں کی جماعت سیکھتی تھی۔ اہل مکہ میں جو لوگ صحابہ کرامؓ کی اولاد میں تھے یا اکابر تابعین تھے ان کو کون سی ایسی ضرورت پڑی تھی کہ ایک غلام آزاد کردہ سے وہ قرآت سیکھتے۔ اسی

لئے آپ اہل مکہ میں ان کے تلامذہ ڈھونڈھیں گے تو ان میں بھی زیادہ تر موالی (آزاد کردہ غلام) یا کچھ دیہاتی عوام ہی کو پائیں گے۔ جیسے ابوالزبیر محمد بن مسلم المکی جو بنی اسد کے آزاد کردہ غلام تھے اور کوفے میں بنی اسد کا ایک مستقل محلہ تھا جن میں اکثریت شیعوں ہی کی تھی اور یہی محلہ وہاں سازش گاہ تھا۔ اور عبیداللہ بن ابی یزید المکی جو آل قارض بن شیبہ کے آزاد کردہ غلام تھے اور سیف بن سلیمان جو مخزومیوں کے آزاد کردہ غلام تھے اور عبداللہ بن کثیر الداری القاری جو مجاہد کے خاص شاگرد اور قرآنی اسکول کے اسسٹنٹ ہیڈ ماسٹر مکے میں مجاہدؒ کے ساتھ بنے اور مجاہد کے بعد قرآت کی پگڑی انہیں کے سر پر باندھ کر مکی اسکول کا مستقل ہیڈ ماسٹر انہیں کو بنادیا گیا۔ یہ بھی عمرو بن علقمۃ الکنانی کے آزاد کردہ غلام تھے۔ اس تفصیل سے آپ عبداللہ بن کثیر قاری مکہ سے تو پوری طرح واقف ہوگئے۔ اب ان شاگردان رشید کا حال بھی سن لیجئے۔

قنبل ان کے تلامذہ حدیث میں تو متعدد ہیں جن میں بعض ثقہ بھی ہیں مگر قرآت میں ان کے دو شاگرد قرآت والوں کے نزدیک مشہور ہیں جن میں سے ایک قنبل ہیں۔ ان کا پورا نام ونسب یہ ہے۔ محمد بن عبدالرحمن بن محمد بن خالد بن سعید بن جرجۃ المخزومی المکی۔ یہ

---

(۱) مودودی صاحب نے عبداللہ بن کثیر کو صرف حضرت عبداللہ بن السائب رضی اللہ عنہ کا شاگرد لکھ کر بڑی خیانت کی ہے۔ مجاہد بن جبیر جو ابن کثیر کے متفق علیہ اور مشہور استاد تھے ان کا ذکر تک نہ کیا اور ابو عمرو الدانی نے جو بلا دلیل خلاف جمہور اور خلاف قیاس بات لکھ دی۔ اسی کو لکھ دیا۔ کیا علمی تحقیق اسی کا نام ہے؟ کہ غلط کمزور خلاف قیاس ایک شخص واحد کا بلا دلیل قول تو نقل کیا جائے اور جمہور ائمہ رجال کا متفق علیہ قول ترک کردیا جائے؟

مخزومیوں میں سے کسی کے آزاد کردہ غلام تھے۔ "قنبل" ان کا لقب تھا۔
۱۹۵ھ میں پیدا ہوئے۔ قرآت کا فن ابوالحسن القواس وغیرہ سے سیکھا۔ مگر
عبداللہ بن کثیر سے ان کا قرآن مجید پڑھنا یا قرآت کا فن حاصل کرنا ائمہ
رجال نہیں لکھتے۔ "تیسیر" میں ابو عمرو الدانی ان کا سال وفات ۲۸۰ھ
لکھتے ہیں۔ ۲۹۱ھ ابن حجر نے لسان المیزان میں لکھا ہے اور یہ بھی لکھا
ہے کہ یہ اپنی وفات سے سات برس پہلے کچھ مختل الحواس ہوگئے تھے۔ اس
زمانہ اختلال میں ان سے لوگ قرآن مجید نہیں پڑھتے تھے۔ بہرحال ان کو
ائمہ رجال عبداللہ بن کثیر کا شاگرد نہیں لکھتے ہیں۔ ان کے ترجمہ میں بھی
ابن حجر لکھتے ہیں کہ انہوں نے قرآت کا فن احمد بن محمد بن عون القواس
(کمان ساز) النبال ابوالحسن المقری سے حاصل کیا تھا اور قواس کے ترجمے
میں بھی لکھتے ہیں کہ ان سے قنبل نے قرآت حاصل کی تھی مگر قواس
صاحب ممدوح نے قرآت کا فن ایک گمنام مجہول الحال شخص ابو الاخریط
وہب بن واضح سے حاصل کیا تھا۔ یہ نہ معلوم ہوسکا کہ ان ابوالاخریط
صاحب نے کس سے قرآت کا فن سیکھا تھا نہ یہ پتہ ملتا ہے کہ یہ کس قبیلے
کے رہنے والے تھے۔ لیکن ائمہ قرآت نے یہ التزام کیا ہے کہ ہر قاری کے
دو شاگرد کسی نہ کسی طرح ضرور پیش کردیئے جائیں۔ کیونکہ دو سے زیادہ
قرآت کے شاگرد کسی کے بھی مہیا ہوہی نہیں سکتے تھے۔ عبداللہ بن کثیر
کے دو شاگرد مل نہیں رہے تھے۔ صرف ایک شاگرد رشید ان کے تھے وہ
بھی بالواسطہ جن کا نام نامی ابھی آپ کے سامنے آتا ہے۔ اس لئے
زبردستی قنبل غریب کو جس نے کبھی ایک آیت بھی غالباً عبداللہ بن کثیر
کو نہیں سنائی ہوگی بلکہ ایک دوسرے کے شاگرد تھے۔ اپنی کتابوں میں

ان کو عبداللہ بن کثیر کا شاگرد لکھ دیا، لیکن یہ بھی مخزومیوں کے غلام آزاد کردہ ہی تھے اور مکے ہی میں رہتے تھے۔

بزی یعنی احمد بن محمد بن عبداللہ بن القسم بن البزہ بن نافع بن ابی بزہ۔ جو مکہ معظمہ میں مؤذن تھے۔ یہ بھی مخزومیوں کے آزاد کردہ غلام تھے ان کا مفصل ترجمہ ابن حجر نے لسان المیزان جلد ۱، صفحہ ۲۸۴ میں لکھا ہے۔ یہ منکرالحدیث، غیر ثقہ من گھڑت حدیثیں روایت کرنے والے تھے۔ جس کا یہ برتاؤ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہو کہ جھوٹی باتیں آپ کی طرف منسوب کرے وہ قرآن مجید کا احترام کہاں تک باقی رکھے گا۔ ہر صاحب عقل سلیم سمجھ سکتا ہے۔ انہیں من گھڑت حدیثوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ یہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے عکرمہ بن سلیمان سے سنا کہ وہ کہتے تھے کہ میں نے اسماعیل بن عبداللہ بن قسطنطین کے سامنے قرآن مجید پڑھا تو جب والضحیٰ پر میں پہنچا تو انہوں نے کہا کہ اللہ اکبر کہو یہاں سے ہر سورہ کے خاتمہ پر۔ میں نے بھی عبداللہ بن کثیر کے سامنے قرآن پڑھا تھا تو انہوں نے مجھ سے کہا تھا جب میں والضحیٰ پر پہنچا کہ تکبیر کہو یہاں سے ہر سورہ کے خاتمہ پر۔ اور عبداللہ بن کثیر نے ان کو خبر دی کہ انہوں نے مجاہد بن جبیر کے سامنے جب قرآن مجید پڑھا تھا تو اسی بات کا انہوں نے ان کو حکم دیا تھا اور خبر دی تھی کہ جب انہوں نے یعنی مجاہد نے ابن عباسؓ کے سامنے قرآن پڑھا تھا تو انہوں نے بھی مجاہد سے یہی کہا تھا اور حضرت ابن عباسؓ نے مجاہد سے کہا کہ مجھ کو ابی ابن کعبؓ نے اس کی خبر دی تھی اور ابی ابن کعبؓ نے ابن عباس سے کہا کہ مجھ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا حکم

فرمایا تھا۔

ابن حجر لکھتے ہیں کہ یہ حدیث غریب اور محدثین نے "بزی" کی اس حدیث سے انکار کیا ہے۔ ابوحاتم نے اس حدیث کو منکر قرار دیا ہے۔ غرض یہ حدیث محدثین اور نقادان حدیث کے نزدیک محض موضوع اور بزی صاحب کی من گھڑت ہے۔ ان کے سوا کوئی بھی اس کی روایت نہیں کرتا۔ مگر قرآت والوں کے ہاں یہ حدیث معتبر سمجھی جاتی ہے اور اس کو مسنون بلکہ بعضے سنت مؤکدہ قرار دے کر اس کی پابندی کرتے ہیں خصوصاً جو لوگ عبداللہ بن کثیر کے اسناد کے پابند ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ سنت نہیں بلکہ بدعت ہے اور اس کی پابندی یا اس کی حمایت کذب علی الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت اور سراسر گناہ اور گمراہی ہے لیکن اس روایت سے یہ بات تو ضرور ثابت ہوگئی کہ یہ بزی صاحب بھی عبداللہ بن کثیر کے بلاواسطہ شاگرد نہ تھے بلکہ یہ شاگرد تھے اسماعیل بن عبداللہ بن قسطنطین کے اور وہ شاگرد تھے عبداللہ بن کثیر کے ۔ مگر یہ اسماعیل بن عبداللہ بن قسطنطین کون ہیں اس کا پتہ نہیں مل سکا۔ ابن حجر امام ذہبی، کسی نے ان کا کچھ بھی ذکر کسی کتاب میں نہیں کیا ہے۔ یہ ابن قسطنطین بھی ابوالاغریط قنبل کے استاد الاستاد کی طرح بالکل مجہول الحال ہیں۔ اسی لئے یاران طریقت نے قنبل وبزی دونوں کو بلاواسطہ عبداللہ بن کثیر کا شاگرد لکھ دیا کہ جو دیکھے گا صحیح ہی سمجھ لے گا۔ کسی کو کیا پڑی ہے کہ خواہ مخواہ کرید کرے گا مگر کسی کو کیا خبر تھی کہ ایک ہزار برس کے بعد اللہ تعالیٰ اپنے ایک بندے تمنا عمادی کو اس کی توفیق دیگا کہ وہ اس فتنہ موالی کا پردہ چاک کر کے آفتاب قرآن کے

چہرہ تاباں سے غبار اختلافات دور کردے۔ وقد قال اللہ عزوجل ان الذین یلحدون فی ایاتنا لا یخفون علینا۔(۴۱ : ۴۰)

تو یہ معلوم ہوگیا کہ عبداللہ بن کثیر بھی آزاد کردہ غلام تھے۔ ان کے استاد مجاہد بھی مخزومیوں کے غلام تھے اور ان کے دونوں شاگرد بھی مخزومیوں کے غلام تھے۔ مکہ ومدینہ زادہما اللہ شرفاً دونوں کے عزوشرف کے باوجود دونوں کی قسمت دیکھئے کہ ان دونوں کو امام القرآت ملے تو موالی (آزاد کردہ غلام) ہی ملے۔ اولاد صحابہ واکابر تابعین میں سے کوئی شخص ایسا نہ تھا جو حرمین شرفین کی امامت قرآت کے منصب کا اہل ہوتا۔ عجمی الاصل یا آفاقی غیر قریشی مکہ مدینہ میں رہ کر ہزار قریشی لب ولہجہ سیکھیں مگر خود قریشیوں کا جو فطری وجبلی لب ولہجہ تھا وہ ان کو کہاں میسر آسکتا تھا۔ پھر جو لوگ بچپن سے بیسیوں بلکہ سینکڑوں صحابہ کو قرآن پڑھتے ہوئے سنتے آئے تھے اور خود پڑھتے رہے یہ موالی کبھی ان کو پاسکتے تھے؟ حاشا وکلا کبھی نہیں ۔ مگر یہاں تو موالیوں ہی کی سازش کے ماتحت اختلافات قرآت کی تحریک چلائی گئی تھی اس میں اولاد صحابہ واکابر تابعین کو کس طرح شریک کیا جاسکتا۔ مدینے میں نافع اور مکہ میں مجاہد کوفیوں کے دو ایجنٹ بٹھا دیئے گئے تھے کہ چپ چاپ اپنے پرتکلف زہد وورع کے ذریعے ان جگہوں کے اکابر واصاغر کے دلوں میں اپنا رسوخ قائم کئے رہیں۔ اکابر سے حدیثیں سنیں اور اصاغر سے صرف حدیثیں بیان کریں۔ قرآن مجید نہ لوگوں سے پڑھیں، نہ ان میں سے کسی کو پڑھائیں ۔ قرآن مجید کی تعلیم وتعلم اپنے حلقے سے باہر نہ ہو، کیونکہ جو اختلافات پھیلانا ہیں اگر ان کی رازداری آغاز میں نہ کی گئی اور اکابر تابعین و اولاد

صحابہؓ پر سازش کا راز کہیں کھل گیا تو پھر یہ سازش اور اس کے ماتحت اختلاف قرآت کی تحریک ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گی۔

حرمین شریفین کے دونوں اسکول قرآت اور ان کے ہیڈ ماسٹر اور اسٹوڈنٹوں کا حال تو آپ کو پوری طرح معلوم ہوگیا۔ اب دوسرے مقامات کے اسکولوں کا بھی معائنہ کرلیجئے۔

(۳) ابو عمرو بن العلا البصری التمیمی

ولادت ۶۸ھ وفات ۱۵۴ھ عمر ۸۶ سال

مودودی صاحب نے سال وفات ۱۵۵ھ لکھا ہے جو صحیح نہیں ہے اور بعضوں نے ۱۵۷ھ لکھ دیا ہے وہ بھی غلط ہے ۔ بہرحال یہ ابو عمرو بن العلاء بن عمار التمیمی بصرے کے رہنے والے تھے۔ ائمہ رجال ان کی توثیق کرتے ہیں۔ حسب تصریح ابن حجر (تہذیب التہذیب جلد ۱۲، صفحہ ۱۷۸) انہوں نے حمید بن قیس الاعرج یحییٰ بن یعمر، مجاہد بن جبیر، سعید بن جبیر، عکرمۃ البربری اور عبداللہ بن کثیر سے قرآن پڑھا تھا اور ان سے عبدالوارث بن سعید، حماد بن زید، معاذ بن معاذ، ہارون الاعور، یونس بن حبیب النحوی، یحییٰ بن المبارک الیزیدی ، ابوبکر البکراری، خارجہ بن مصعب اور عبدالوہاب بن عطا وغیرہم نے قرآن پڑھا تھا۔ تو اب پہلے ان کے شیوخ سے تعارف حاصل کرلیجئے اس کے بعد ان کے تلامذہ سے بھی مصافحہ کرلیجئے گا۔

حمید بن قیس الاعرج ابو صفوان المکی الاسدی۔ یہ اسدیوں میں سے کسی کے آزاد کردہ غلام تھے۔ مجاہد سے حدیث روایت کرتے ہیں۔ مگر ان

سے قرآن پڑھنے کا ذکر نہیں ہے بلکہ کوئی بھی یہ نہیں بتاتا کہ انہوں نے فن قرآت کس سے سیکھا۔ ان کے ترجمہ میں ان کو قاری و مقری بھی نہیں لکھا ہے۔ یہ بھی مذکور نہیں کہ ان سے ابو عمرو بن العلاء نے قرآن پڑھا تھا۔ ابو بکر عمرو بن العلاء سے ۲۴ برس پہلے ۱۳۰ھ میں وفات پائی۔

یحییٰ بن یعمر المروزی البصری۔ مرو کے رہنے والے تھے۔ بصرے میں آلیسے تھے۔ پھر مرو میں قاضی بھی مقرر ہوئے تھے۔ شراب منصّف پیتے تھے۔ اس لئے معزول کردیئے گئے تھے۔ بڑے ادیب ماہر عربیت عالم لغت اور مشہور نحوی تھے۔ حسین بن الولید، ہارون بن موسیٰ سے روایت کرتے ہیں کہ قرآن مجید پر سب سے پہلے نقطے انہوں نے لگائے۔ نحو میں ابوالاسود الدؤلی کے شاگرد تھے۔ ان کے سال وفات میں اختلاف ہے کسی نے ۱۲۹ھ کسی نے ۱۲۱ھ کے لگ بھگ لکھا ہے مگر صحیح قول یہ ہے کہ ان کی وفات ۸۹ھ میں عمرو بن العلا سے ۶۵ سال پہلے ہوئی تھی اس لئے ان سے عمرو بن العلاء کا پڑھنا ذرا مشتبہ ہے۔ خلاصۃ التہذیب صفحہ ۴۲۹

---

(۱) قرآن مجید پر نقطے لگانا اور بات ہے اور عربی رسم الخط میں نقطوں کا ایجاد کرنا اور بات ہے۔ اصل یہ ہے کہ کوفے والوں نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی وفات کے بعد بے نقطوں کے قرآن لکھنا شروع کیا اور مشہور کیا کہ عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا تھا کہ قرآن میں نقطے نہ دیا کرو۔ جس کی وجہ سے کوفہ بصرہ وغیرہ میں غیر منقوط قرآن مروج ہوگیا۔ لوگوں کو اس کا موقع مل گیا کہ یعلمون کو تعلمون پڑھیں۔ اس خرابی کو محسوس کرکے بصرے والوں میں سب سے پہلے یحییٰ بن یعمر نے اپنے مصحف پر نقطے لگائے پھر ان کے سمجھانے سے دوسروں نے بھی ایسا ہی کیا۔ یہ سمجھنا کہ یحییٰ بن یعمر بھی عربی رسم خط میں حروف پر نقطے لگانے کے موجد تھے غلط ہے۔ جس کی مفصل بحث میں اس مضمون کے آغاز میں کرچکا ہوں اور دلائل قطعیہ سے ثابت کرچکا ہوں کہ عربی رسم خط کے حروف جس نے وضع کئے تھے یہ ناممکن ہے کہ اس نے پہلے صرف حروف وضع کئے ہوں اور نقطے بعد والوں نے ایجاد کرکے لگائے ہوں۔

میں لکھا ہے کہ ۹۰ھ سے پہلے خراسان میں وفات پائی۔ اس لئے ۸۹ھ ہی میں وفات کی روایت صحیح ہے۔

مجاہد بن جبیر سے تو آپ پوری طرح واقف ہو چکے ہیں کہ وہ مخزومیوں کے آزاد کردہ غلام تھے اور کوفیوں کے ایجنٹ بن کر مکے میں اختلاف قرآت کی کھچڑی چپکے چپکے پکا رہے تھے۔ ان کے بعض حالات میں نے وہاں نہیں لکھے تھے وہ کمی یہاں پوری کردوں۔ تو بہتر ہے سنئے۔ ان کی تفسیر بہت مشہور ہے مگر ابن حجر ہتذیب التہذیب جلد ۸، صفحہ ۳۱۰ میں لکھتے ہیں کہ "مجاہد سے ان کی تفسیر قاسم بن ابی بزہ کے سوا اور کسی نے نہیں سنی تھی۔ جس نے بھی مجاہد کی تفسیر پائی ہے وہ قاسم بن ابی بزہ کی کتاب سے۔" اس لئے بروایت احادہی ان کی تفسیر دوسروں کو ملی ہے۔ اور جلد ۱۰، صفحہ ۴۳ ترجمہ مجاہد میں لکھتے ہیں کہ "ابو بکر بن عیاش نے اعمش سے پوچھا کہ لوگ مجاہد کی تفسیر سے پرہیز کیوں کرتے ہیں؟ تو اعمش نے جواب دیا کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے اہل کتاب سے پوچھ پوچھ کے تفسیر لکھی ہے۔ مجاہد نے ایک موقع پر کہا تھا کہ خرج علینا علی یعنی حضرت علیؓ ہم لوگوں کے سامنے آئے۔" یحییٰ بن معین مشہور محدث فرماتے ہیں کہ یہ کچھ بھی نہیں ہے بے اصل بات ہے مجاہد کی روایتیں حضرت علی سے مرسل ہیں۔ مجاہد حضرت سعد، حضرت معاویہ، حضرت کعب بن عجرہ، حضرت ابوہریرہ، اور حضرت عبداللہ بن عمر سے بھی جو روایت کرتے ہیں وہ مرسل ہیں۔ اسی طرح ابو سعید خدری اور رافع بن خدیج سے بھی بلا واسطہ ان کی روایتیں صحیح نہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہ پیشاب کر کے پاکی نہیں لیتے تھے۔ ترمذی نے یہ

بھی لکھا ہے کہ ان کا مدلس ہونا معلوم ہے اس لئے اگر عن فلاں عن فلاں کرکے بھی کسی حدیث کی روایت کریں تو ان کے سلسلہ اسناد کا فی الواقع متصل ہونا کوئی ضروری نہیں ہے یعنی ممکن ہے کہ تدلیس سے کام لیا ہو۔ اب وہاں کی اور یہاں کی سب باتیں ملاکر مجاہد کے حالات پر غور فرمالیجئیے۔

سعید بن جبیر بن ہشام الاسدی جو اسدیوں کے آزاد کردہ غلام تھے، کوفی تھے۔ ابن الاشعث کے ساتھ خلیفہ وقت عبدالملک بن مروان کے خلاف باغیانہ خروج کیا تھا۔ ابن الاشعث کو جب شکست ہوئی تو یہ بھاگ نکلے اور ادھر ادھر چھپتے پھرے آخر ایک مدت کے بعد مکہ معظمہ میں گرفتار ہوگئے۔ حجاج بن یوسف والئ عراق کے پاس لائے گئے۔ حجاج نے پہلے وہ احسانات جتائے جو ان کے ساتھ کئے تھے۔ انہوں نے قبول کیا کہ بے شک مجھ پر احسانات ہیں تو خروج کی وجہ پوچھی۔ انہوں نے کہا کہ ہم بیعت کرچکے تھے اس لئے مجبور ہوگئے۔ حجاج نے کہا کہ امیرالمومنین کی بیعت کا حق پورا کرنا مقدم تھا یا باغی کی بیعت کا حق پورا کرنا؟ ان کے پاس کچھ جواب نہ تھا۔ آخر ۹۵ھ میں (۴۹) برس کی عمر میں مارے گئے۔ مگر بڑے محدث اور ثقہ سمجھے جاتے ہیں مگر تھے یہ بھی بنی اسد کے آزاد کردہ غلام اور کوفی تھے۔ یہ بھی ایک بات سمجھنے کی ہے کہ جن جن لوگوں کو بغاوت یافتہ وفساد کے سبب سے حجاج نے قتل کیا تھا ان لوگوں کو اہل کوفہ نے بہت بڑھایا ہے کہ ایسے تھے اور ویسے تھے۔ پھر بھی ان کے علم وفضل کا کچھ لحاظ نہ کیا اور حجاج نے انہیں قتل کردیا۔ اور پھر باہر والوں نے بھی اہل کوفہ کی ہاں میں ہاں ملائی۔ حقیقت یہ ہے کہ الفتنۃ اشد

من القتل عراق فتنہ پردازوں سے بھرا ہوا تھا اور کوفہ ان کا اصل مرکز تھا یہ موقع اس کا نہیں کہ ہم کوفہ و عراق کی سازشوں اور وہاں کے فتنوں پر بحث کریں۔ انشاء اللہ کبھی موقع ملا تو اس پر مستقل طور سے قلم اٹھاؤں گا۔ اس وقت تو ہمیں فقط یہ دکھانا ہے کہ اختلافات قرآت کی تحریک سازش کا نتیجہ تھی اور عجمی الاصل غلاموں ہی نے یہ تحریک اٹھائی اور انہیں کے ہاتھوں پروان چڑھی۔ اور کوفہ میں اس تحریک کا خاص مرکز تھا۔ سعید بن جبیر چاہے محدثین کے نزدیک کتنے ہی بڑے محدث اور ثقہ ہوں مگر تھے عجمی الاصل ایک آزاد کردہ غلام، اور پھر کوفی تھے۔ مگر ان کے ترجمے میں اس کا ذکر نہیں ہے کہ یہ قاری یا مقری تھے۔ مگر اصطلاحی قاری نہ سہی لغوی حیثیت سے ہر محدث کو قاری و مقری ہونا چاہئیے اور عام اصطلاح کے اعتبار سے تو قاری حافظ قرآن کو کہتے تھے۔ اور ہر محدث حافظ قرآن ضرور ہوتا تھا جس کو قرآن یاد نہ ہو وہ حدیث کیا یاد کرے گا۔ مگر کسی نے یہ بھی نہیں لکھا کہ ابو عمرو بن العلاء نے یا کسی اور نے ان سے قرآن پڑھا تھا یا قرآت کا فن سیکھا تھا اور نہ قرین قیاس ہے کہ ابوعمرو بن العلاء کو ان سے قرآن پڑھنے کا وقت ملا ہو کیونکہ عبدالرحمن بن الاشعث نے ۱۴ جمادی الاخری ۸۳ ھ کو شکست کھائی تھی۔ ۸۳ ھ سے یہ برابر روپوش رہے اور ۹۵ ھ میں آخر مارے گئے۔ ابو عمرو بن العلاء کی پیدائش ۶۸ ھ کی ہے ابن الاشعث کی شکست کے وقت ابوعمرو پندرہ برس کے تھے۔ بلکہ حجاج بن یوسف نے سیستان کی مہم پر عبداللہ بن ابی بکرہ کی مدد کے لئے ۷۲ ھ میں بیس ہزار بصریوں کی فوج اور بیس ہزار کوفیوں کی فوج لے کر عبدالرحمن بن الاشعث کو سیستان کی طرف

بھیجا تھا۔ کوفیوں کی اسی فوج میں سعید بن جبیر بھی تھے اس مہم سے واپسی کے قبل ہی اسی سال عراقیوں نے ابن الاشعث کی سرکردگی میں خلافت سے بغاوت کی اور عبدالرحمن بن الاشعث کو خلیفہ تسلیم کر کے ابن الاشعث کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اس بیعت میں سعید بن جبیر بھی شریک تھے۔ اسی بیعت کا ذکر سعید بن جبیر نے اپنے قتل کے دن حجاج کے سامنے کیا تھا۔ غرض سعید بن جبیر ۷۲ھ سے پہلے بڑے محدث ہوں گے مجھ کو اس سے انکار نہیں مگر وہ ۷۲ھ سے سرگرم سیاست اور مرد میدان بغاوت رہے۔ ۷۲ھ میں ابو عمرو بن العلاء چار برس کے تھے۔ اور ۷۲ھ سے ۹۵ھ تک یعنی آغاز جہاد پھر ابتدائے بغاوت، پھر شکست، پھر روپوشی، پھر قتل تک ۲۳ برس کی مدت میں کچھ حدیثوں کی روایت کا موقع مل سکتا تھا۔ مگر اس کا موقع ملنا ممکن نہ تھا کہ وہ کسی کو پورا قرآن فن قرآت کے ماتحت ایک جگہ بیٹھ کر پڑھاتے۔ اس لئے سعید بن جبیر سے ابو عمرو بن العلاء کا قرآن پڑھنا اور فن قرآت سیکھنا بالکل ناممکن ہے

عکرمۃ البربری یہ عبداللہ بن عباسؓ کے آزاد کردہ غلام تھے اور مشہور محدث و مفسر تھے۔ حضرت ابن عباسؓ کے شاگرد تھے۔ مگر یحییٰ بن سعیدالانصاری عکرمہ کو کذاب کہتے تھے۔ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ اپنے غلام نافع سے کہتے تھے کہ جس طرح عکرمہ جھوٹی باتیں ابن عباس کی طرف منسوب کیا کرتا ہے اسی طرح تم بھی مجھ پر جھوٹی باتیں نہ لگایا کرو۔ امام مالک عکرمہ کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ آخر میں خوارج کا مسلک عکرمہ نے اختیار کر لیا تھا پہلے ریاضیہ بنے جو خوارج کا کسی قدر معتدل فرقہ تھا۔ اس کے بعد صفریہ بنے جو غالی و متعصب فرقہ تھا۔ ایک بار کچھ

لوگوں میں عکرمہ نے کہا کہ " ایک دن ابن عباس نے قرآن مجید کی یہ آیت پڑھی لم تعظون قوما الله مهلكم او معذبهم عذاباً شديداً(۷: ۱۶۴) اور فرمایا کہ میں نہیں جانتا کہ وہ قوم ہلاک ہوگئی یا اس کو نجات بخشی گئی (عکرمہ کہتے ہیں کہ) میں ان کو سمجھاتا رہا یہاں تک کہ وہ سمجھ گئے کہ اس قوم نے نجات پائی۔ تو ابن عباس نے (خوش ہوکر) مجھ کو پوشاک پہنائی۔" (تہذیب التہذیب جلد ۷، صفحہ ۲۶۵) یہ سراسر افتراء اور بہتان ہے حضرت ابن عباسؓ پر اور اس روایت سے حضرت شعبہ کے اس قول کی تصدیق بھی ہوتی ہے جو انہوں نے سفیان ثوری سے کہا تھا کہ كلما تقدمتم فى الحديث تاخرتم عن القرآن جہاں تک تم حدیث میں آگے بڑھوگے وہاں تک قرآن سے پیچھے ہٹتے جاؤگے۔ یعنی جن لوگوں کے سامنے عکرمہ نے یہ کہا تھا ان میں سے کسی کو بھی قرآن مجید یا کم سے کم سورہ اعراف کا اکیسواں رکوع یاد نہ تھا کہ وہ عکرمہ کو جھٹلاتا۔ اور نہ راوی کو یہ توفیق ہوئی کہ عکرمہ سے حکایت نقل کرنے سے پہلے قرآن مجید میں یہ آیت دیکھ لیتا۔ یہاں تک کہ حافظ ابن حجر نے بھی اپنی کتاب میں یہ روایت نقل کرنے کے وقت قرآن مجید کی اس پوری آیت پر غور کرنے کی ضرورت محسوس نہیں فرمائی۔ سورہ اعراف کا اکیسواں رکوع اسکی ایک سو تریسٹھویں آیت سے شروع ہوتا ہے اور ایک سو چھیاسٹھویں آیت پر بنی اسرائیل کی تین جماعتوں کے حالات ختم ہوجاتے ہیں۔ وہ چار آیتیں معہ ترجمہ حسب ذیل ہیں:

وسئلهم عن القرية التى كانت حاضرة البحر اذ يعدون فى السبت اذ تاتيهم حيتانهم يوم سبتهم شرعا ويوم

لایسبتون لا تاتیھم کذالک نبلوھم بما کانوا یفسقون ○ قالت امۃ منھم لم تعظلون قوما اللہ مھلکھم او یعذبھم عذاباً شدیداً قالوا معذرۃ الی ربکم و لعلھم یتقون ○ فلما نسوا ماذکروا بہ انجینا الذین ینھون عن السوء و اخذنا الذین ظلموا بعذاب بئیس بما کانوا یفسقون ○ فلما عتو عن مانھوا عنہ قلنا لھم کونوا قردۃ خاسئین ○

اور تم بنی اسرائیل سے اس بستی کا حال پوچھ لو جو سمندر کے کنارے آباد تھی۔ جب سنیچر (کے دن مچھلیوں کے شکار سے ممانعت کے بارے) میں زیادتیاں کررہے تھے کہ جب ان کے سنیچر کے دن مچھلیاں ان کے سامنے تیرتی جمع ہوجاتی تھیں اور جب سنیچر کا دن نہیں ہوتا تو مچھلیاں نہیں آتیں۔ ہم ان کو ان کی بدکرداری کی وجہ سے اس طرح آزماتے رہے۔ اور جب ان میں سے ایک جماعت نے (ان کی دوسری جماعت کو) کہا کہ تم لوگ ایسے لوگوں کو کیوں نصیحت کرتے ہو جن کو اللہ ہلاک کرنے والا ہے۔ یا کسی سخت عذاب میں مبتلا کردینے والا ہے تو ان نصیحت کرنے والوں نے کہا کہ ان کے رب کے آگے عذر کرنے کے لئے اور شاید یہ لوگ اللہ سے ڈریں۔ تو جب وہ نصیحتیں جو ان کو کی گئی تھیں وہ لوگ بھول گئے تو جو لوگ انہیں برائی سے روکتے تھے ہم نے ان کو بچالیا۔ اور ظالموں کو

ہم نے ان کی بدکرداری کے سبب سے ایک خوفناک عذاب
میں مبتلا کردیا۔ تو جب سرکشی کی انہوں نے اور نہ مانی وہ بات
جس سے منع کئے گئے تھے تو ہم نے کہا کہ ہو جاؤ ذلیل ورسوا
بندر۔

حضرت داؤد کے زمانے میں بنی اسرائیل تین جماعتوں میں بٹ گئے
تھے۔ ایک جماعت سرکش اور نافرمان تھی اور دو جماعتیں مومنین کی
تھیں۔ مگر مومنین کی دو جماعتوں میں سے ایک جماعت نے سرکشوں سے
ترک موالات کرکے بالکل علیحدگی اختیار کرلی تھی اور ایک جماعت ان
سرکشوں کے ساتھ رہتی تو تھی لیکن ان کو وعظ و نصیحت کرتی رہتی تھی ۔
بنی اسرائیل کو سنیچر کے دن مچھلیوں کے شکار سے منع کیا گیا تھا۔ ان کی
بستی سمندر کے کنارے پر واقع تھی۔ مچھلی کے شکار کے یہ عادی تھے۔ ان
کی آزمائش کے لئے سنیچر کے دن ہر طرف سمندر میں مچھلیاں ہی مچھلیاں
ان کو ملتی تھیں اور سنیچر گزرا اور ایک مچھلی پر بھی نظر نہیں پڑتی تھی۔
ان لوگوں نے حیلہ سازی کی کہ سنیچر کے دن سمندر کے قریب ایک گڑھا
کھود کر پانی بھرکر اس میں مچھلیوں کو ہکا کر جمع کرلیتے اور اتوار کو خوب
کھاتے۔ جو مومنین ان کے ساتھ رہتے تھے وہ ان کو بہت سمجھاتے اور
اس حیلہ سازی سے منع کرتے تھے تو وہ مومنین جو ترک موالات کرچکے
تھے۔ ان وعظ و نصیحت کرنے والی جماعت مومنین سے کہتے تھے کہ تم
لوگ ایسی قوم کو کیا نصیحت کرتے ہو؟ جو اللہ کے عذاب میں پڑنے والے
یا ہلاک ہونے والے ہیں۔ تو وہ کہتے تھے کہ ہم ان کے ساتھ کیوں ہیں

اس کیلئے ان کے رب کے آگے عذر پیش کرنے کیلئے کہ ہمارا مقصد ان کے ساتھ اسی قدر تھا کہ ان کو وعظ و نصیحت کرتے رہنے کا موقع ملے اور ہم امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرتے ہیں اور پھر یہ امید کرتے ہیں کہ یہ سب نہیں تو ان میں سے کچھ ہی سہی اللہ سے ڈریں اور اپنی بدکرداریوں سے توبہ کریں۔

مگر جب باوجود وعظ و نصیحت اور احکام خداوندی کی یاد دہانی، عذاب الہی و باز پرس آخرت سے تخویف کے وہ سرکش اپنی بدکرداری سے باز نہ آئے تو اللہ تعالیٰ نے ان نصیحت کرنے والے مومنین کو اس عذاب سے بچالیا اور وہی لوگ اس عذاب میں پڑے جو اپنی جانوں پر آپ ظلم کررہے تھے۔ وہ کون ساخوفناک عذاب تھا اس کو بھی بتادیا کہ وہ بندروں کی فطرت میں مسخ کردیئے گئے۔

ان تین جماعتوں میں سے جو مومنین ان ظالموں سے ترک موالات کرکے الگ ہوچکے تھے ان کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہ تھی کہ وہ بھی عذاب سے محفوظ رہے۔ وہ کیوں عذاب میں مبتلا ہوتے؟ نہ ان میں بدکرداری تھی نہ وہ بدکرداروں کے ساتھ تھے۔

البتہ جماعت مومنین مخلصین میں سے وہ لوگ جو ان بدکرداروں کے ساتھ ملے جلے رہتے تھے مگر ان کی بدکرداری میں شریک نہ تھے بلکہ ان کو بدکرداریوں سے روکتے، منع کرتے اور سمجھاتے رہتے تھے۔ خطرہ اگر تھا تو انہیں کے متعلق کہ ایسا نہ ہو عذاب آئے تو بدکرداروں کے ساتھ نیک کردار لوگ بھی اس میں مبتلا ہوجائیں۔ گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جائے۔ تو بتادیا گیا ایسا نہیں ہوا، ہم نے ان نصیحت کرنے والے مومنین

کو بچالیا۔ عذاب الہی یعنی بندر کی فطرت میں مسخ ہونے میں وہی لوگ مبتلا ہوئے جو بدکردار تھے۔

کس قدر صاف اور واضح چار مسلسل آیتیں ہیں۔ تینوں جماعتوں کا حال جن سے روز روشن کی طرح واضح ہے۔ حضرت ابن عباسؓ کو کس جماعت کے متعلق یہ خیال ہوا کہ "معلوم نہیں کہ ان کا حشر کیا ہوا۔ وہ عذاب میں پڑے یا ان کو نجات ملی؟" یہ سوال ان کے ذہن میں کس جماعت کے متعلق پیدا ہوا؟ فاسقین کو بائیکاٹ کرنے والے مومنین کے متعلق تو پیدا نہیں ہوسکتا تھا۔ یقیناً فاسقین کے متعلق پیدا ہوا ہوگا یا ان مومنین کے متعلق جو فاسقین کے ساتھ رہ کر ان کو وعظ و نصیحت کرتے رہتے تھے۔ تو دونوں کے متعلق صاف اعلان ہے کہ وعظ و نصیحت کرنے والے مومنین کو بچالیا گیا اور ظالموں کو مسخ کردیا گیا۔ پھر یہ سوال کیسا؟ اصل یہ ہے کہ عکرمہ صاحب کو قرآن مجید حفظ تو تھا نہیں۔ نہ قرآن مجید کی تلاوت کا معمول رکھتے تھے۔ درمیان آیت کا ایک ٹکڑا ذہن میں آگیا۔ مجمع تھا عوام کا اس کے متعلق ایک بات بناکر عوام کے سامنے کہدی جس سے اپنی بڑائی ظاہر ہو۔ مگر تعجب ہے کہ حافظ ابن حجر نے ان روایات کو ان آیات سے ملا کر کیوں غور نہیں فرمایا اور اس روایت کی تکذیب کیوں نہ کی۔ اس کا سبب وہی روایت پرستی ہے اس کی مثال اور بھی ملتی ہے اور مجھے یاد ہے کہ محدثین بعض وقت روایت لکھ لیتے ہیں مگر قرآن مجید کی آیت سے ملا کر غور نہیں کرتے۔ باوجودیکہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم تھا کہ جو حدیث ہم سے روایت کی جائے اس کو قرآن کے سامنے پیش کرو۔ قرآن کے مطابق ہو قبول کرو ورنہ رد کردو۔

تو جب اقوال منسوب برسول کو بغیر قرآنی کسوٹی پر کسے قبول کرنا جائز نہیں تو آثار وصحابہ کو بغیر قرآنی کسوٹی پر کسے کس طرح محدثین ومفسرین قبول کرتے رہے ۔ تعجب ہی تعجب ہے۔

ان حالات میں جن لوگوں نے عکرمہ بربری جو حضرت ابن عباسؓ کے غلام تھے۔ جن کو حضرت ابن عباسؓ نے اپنی زندگی میں آزاد بھی نہیں کیا تھا۔ اگر ان کو یحییٰ بن سعیدالانصاری بعض ائمہ رجال نے کذاب لکھا اور امام مالک ان سے بیزار رہتے تھے تو کیا غلط تھا؟

اور عکرمہ کو کسی نے بھی قاری ومقری نہیں لکھا ہے۔ نہ ان کے ترجے میں کہیں مذکور ہے کہ ان سے ابوعمرو بن العلاء یا کسی نے بھی قرآن پڑھا تھا۔ اس لئے ان سے بھی ابو عمرو بن العلاء کا فن قرآت سیکھنا صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ عکرمہ کی وفات کے متعلق مختلف اقوال ہیں۔ خود ان کی بیٹی کی روایت ۱۰۰ھ کی ہے ورنہ کسی نے ۱۰۵ھ کسی نے ۱۰۶ھ کسی نے ۱۰۷ھ اور کسی نے ۱۱۰ھ کہا ہے ۔ واللہ اعلم بالصواب

عبداللہ بن کثیر یہ ضرور قاری ومقری تھے اور کوفیوں کے قائم کردہ اسکول قرآت جو مکہ معظمہ کے کسی گوشے میں تھا اس کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ ممکن ہے ابوعمرو ابن العلاء نے انہیں سے قرآت کا فن حاصل کیا ہو اور بصرے کے قاریوں نے ان کے اساتذہ قرآن کی ایک فہرست بنا رکھی ہو جس کے مطابق ابن حجر نے ان کے ترجے سے اپنی کتاب میں وہ فہرست درج کرلی ۔ ان کو کیا پڑی تھی کہ خواہ مخواہ اس کی کرید کرتے کہ یہ فہرست صحیح ہے یا نہیں۔ قاریوں میں سے ان کے متقدمین نے اپنے یا اپنے شیوخ کے متعلق جو کچھ ائمہ رجال سے بیان کیا انہوں نے اس کو لکھ

لیا کہ " اہل البیت ادری بما فیہ " قرات کے اسکول کا حال یہ قراہی ہم
سے زیادہ جانتے ہیں جو ان اسکولوں کے ہیڈ ماسٹر یا کسی درجے کے ٹیچر یا
اسٹوڈنٹ ہیں یا رہ چکے ہیں اس لئے اپنے متعلق یا اپنے متقدمین کے
متعلق جو کچھ قاریوں نے بتایا ائمہ رجال نے لکھا۔ ابن حجر کا اس بناء پر
کوئی قصور نہیں ہے کہ انہوں نے ابو عمرو بن العلاء کے شیوخ میں ایسے
لوگوں کے نام کیوں لکھ دیئے جن سے ان کا قرآن پڑھنا مستبعد ہو۔

لیکن سوال ہے کہ جب عبداللہ بن کثیر کے خاص شاگرد بلاواسطہ ابو
عمرو بن العلاء تھے تو پھر عبداللہ بن کثیر کے جانشین اور ان کی قرآت کے
راوی دوسری جگہ سے مستعار کیوں لئے گئے؟ ابو عمرو بن العلاء ہی نہیں
بلکہ مکے کے رہنے والے شبل بن عباد المکی بھی عبداللہ بن کثیر کے شاگرد
تھے اور شجاع بن ابی النصر البلخی ابو النعیم المقری نے بھی قرآت کا فن
عبداللہ بن کثیر سے سیکھا تھا لیکن شجاع اور شبل یہ دونوں کسی کے آزاد
کردہ غلام نہیں تھے۔ قرآن پڑھنے کے لئے آئے سیدھا سادہا قرآن جس
طرح سب مسلمان پڑھتے تھے پڑھا دیا گیا۔ ان کو وہ اختلافات کا گر نہیں
بتاسکتے تھے۔ اور ان آزادوں پر اتنا اعتماد بھی نہ تھا کہ یہ دونوں سازش
میں شریک ہونگے اس لئے یہ جانشینی کے قابل نہ تھے۔ اور ابو عمرو بن
العلاء خود بصرے کے اسکول کے ہیڈ ماسٹر بنائے گئے تھے۔ وہاں سے لاکر
مکے کے اسکول میں ان کو بٹھادیا جاتا تو پھر بصرے کے لئے کسی کارآمد
دوسرے آزاد کردہ غلام کی تلاش کرنی پڑی اور سازش میں شریک ہونے
والے قابل اعتماد لوگوں کا زیادہ ملنا کچھ آسان نہ تھا۔ اس لئے مستعار ہی
سہی۔ کام چلانے کے لئے ایک شاگرد کے شاگرد کو پکڑ لیا گیا اور ایک

دوسرے کے شاگرد کو مستعار لے لیا گیا۔ اور اس طرح مکہ اور بصرہ دونوں جگہ کے اسکول چالو بنالئے گئے۔

(۴) عبداللہ بن عامر

(ولادت ۲۱ ھ وفات ۱۱۸ ھ)

زیادہ تر ائمہ رجال تو ۲۱ ھ ہی میں لکھتے ہیں مگر ان کے ایک شاگرد خالد بن یزید بن صالح بن صبیح المری نے ان کا سال ولادت ۸ ھ بیان کیا ہے مگر حافظ ابن حجر نے اس کو رُدِی کہہ کر ضعیف قرار دیا ہے۔ اس قول کا ضعف اس سے بھی ظاہر ہے کہ یہ نہیں معلوم کہ خالد بن یزید المرسی نے کس سے کہا تھا اور کس ذریعہ سے یہ روایت حافظ ابن حجر تک پہنچی اور خود خالد بن یزید کو اس کا سال ولادت کس سے معلوم ہوا؟ مگر مودودی صاحب نے اسی ضعیف قول کو نقل کیا ہے۔ اس حساب سے ان کی عمر ایک سو دس (۱۱۰) برس کی ٹھہرے گی مگر ائمہ رجال ان کو معمر لوگوں میں لکھتے نہیں ہیں۔ واللہ اعلم۔

ابن حجر تہذیب التہذیب جلد ۵، صفحہ ۲۷۴ میں لکھتے ہیں کہ انہوں نے قرآن مجید مغیرہ بن ابی شہاب سے پڑھا تھا۔ مودودی صاحب لکھتے ہیں مغیرہ بن شہاب بہرحال جناب مغیرہ ممدوح کے والد ماجد شہاب ہوں یا ابو شہاب، لیکن ائمہ رجال شہاب یا ابی شہاب کے صاحبزادے جناب مغیرہ کا کہیں ذکر نہیں کرتے ہیں۔ لے دے کے بس عبداللہ بن عامر کے ترجمے میں لکھ دیتے ہیں کہ انہوں نے مغیرہ بن ابی شہاب سے قرآن پڑھا تھا۔ افسوس ہے کہ عبداللہ بن عامر کو صحابہؓ میں سے کوئی بھی

ایسا نہ ملا جو ان کو قرآن پڑھا دیتا۔ انہوں نے قرآن پڑھنے کے لئے چنا بھی تو ایک غیر معروف مجہول الحال ہی شخص کو۔ اور مغیرہ بن ابی شہاب کے سوا اور کسی سے ان کے قرآن پڑھنے کا کوئی بھی ذکر نہیں کرتا۔ تیسیر میں ابو عمرو الدانی نے ان کا ایک استاد اور ڈھونڈ نکالا ہے۔ یعنی ابو درداء عویمر بن عامر مشہور صحابیؓ اور پھر مغیرہ بن ابی شہاب المخزومی کا نام لکھتے ہیں جو ایک مجہول الحال نامعلوم شخص تھے۔ لکھتے ہیں کہ انہوں نے حضرت عثمانؓ سے قرآن پڑھا تھا۔ پھر یہ بھی لکھتے ہیں کہ بعضوں نے کہا ہے کہ عبداللہ بن عامر نے بذات خود حضرت عثمانؓ سے قرآن پڑھا تھا۔ پھر یہ بھی لکھتے ہیں کہ یہ صحیح نہیں ہے۔ پھر لکھتے ہیں کہ شیخ ابو علی نے ہمیں خبر دی ہے کہ یہ صحیح ہے یعنی عبداللہ بن عامر کا حضرت عثمانؓ سے بذات خود قرآن مجید پڑھنا صحیح ہے۔ مگر یہ شیخ ابو علی کون ہیں؟ بغیر کسی تصریح کے ان کی شخصیت کس طرح متعین کی جائے اور پھر اس کو قاری و مقری بھی ہونا چاہئیے اور ابو عمرو الدانی کا ہمعصر ہونا بھی ضروری ہے تاکہ ابو عمرو الدانی کو وہ خبر دے سکے کسی نے سچ کہا ہے من جد و جد جوئندہ یابندہ۔ تھوڑی سی جستجو کے بعد میں نے شیخ ابو علی صاحب کا پتہ لگالیا۔ اب مجھ سے سنئے۔ ان ابو علی صاحب کا نام حسن بن قاسم ہے اور ان کا لقب "غلام الہراس" مشہور ہے۔ اہل عراق کے قاری تھے۔ ۳۷۴ھ میں پیدا ہوئے اور ۴۶۸ھ میں وفات پائی۔ ابو عمرو الدانی کی وفات ۴۴۴ھ میں ہے اس لئے دونوں میں ملاقات ہو سکتی ہے۔ انہی

نے ابو عمرو الدانی سے کہا ہوگا۔ مگر یہ کوئی معتمد علیہ شخص نہ تھے۔ اس لئے پہلے یہ لکھ دیا کہ حضرت عثمانؓ سے عبداللہ بن عامر کا قرآن پڑھنا جو بعض لوگ بیان کرتے ہیں صحیح نہیں ہے اس کے بعد ان کا قول بھی نقل کردیا۔ مگر سوال یہ ہے کہ کیوں صحیح نہیں ہے جب ۸ ھ میں پیدا ہوئے تھے تو حضرت عثمانؓ کی شہادت کے وقت چھبیس ستائیس برس کے ہوں گے۔ تئیس چوبیس برس کی عمر میں ممکن ہے کہ انہوں نے حضرت عثمانؓ سے قرآن پڑھا ہو۔ لیکن حضرت عثمانؓ کی شہادت ۳۵ ھ میں ہے۔ اور حضرت ابو الدرداءؓ کی وفات ۳۲ ھ میں ہے۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت سے دو ڈھائی برس پہلے۔ اس لئے اگر یہ عثمانؓ سے قرآن

---

(۱) ابن حجر لسان المیزان ب ۲، صفحہ ۱۴۵ میں ابو علی غلام الہراس حسن بن قاسم کا ترجمہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "ابو الفضل بن خیرون نے ذکر کیا ہے کہ ابو علی کے قرآتوں میں کچھ خلط ملط کیا ہے اور بعض ایسے اسناد کا دعویٰ کیا ہے جن کی کوئی اصلیت نہیں اور عجیب عجیب باتیں روایت کی ہیں۔ کسی نے ابو الفضل بن خیرون سے ایک بار ابو علی غلام الہراس کے بارے میں پوچھا کہ یہ ابوعلی الاہوازی سے روایت کرتے ہیں تو انہوں نے ابو غلام الہراس کے بارے میں کہا کہ یہ "سکھایا پڑھایا شخص ہے۔ بڑا جھوٹا ہے ایک بڑے جھوٹے سے روایت کرتا ہے۔" یعنی ابو علی غلام الہراس بھی کذاب ہے اور ابو علی الاہوازی بھی کذاب ہے۔ اور دونوں مشہور قاری ہیں۔ دونوں سے قرآتوں کی روایتیں قرآت کی کتابوں میں مذکور ہیں۔ ابو علی غلام الہراس کے ایک ہی شاگرد ابوالعز القلانسی کا ذکر ابن حجر نے کیا ہے مگر ان کا ذکر کہیں نہیں کیا ہے۔ نہ سمعانی، نہ ذہبی کوئی بھی ان کا ذکر نہیں کرتا غرض یہ بھی مجہول الحال ہیں۔ صرف ہبۃ اللہ بن المبارک السقطی نے ان کی بڑی مدح کی ہے مگر سمعانی اور ابن حجر نے لکھ دیا ہے کہ سقطی کے سوا جمہور غلام الہراس ابو علی کو کچھ اور کہتے ہیں جو سقطی کے قول کے خلاف ہے مگر یہ سقطی صاحب خود غلام الہراس سے زیادہ اعتبار سے ساقط ہیں۔ ابن حجر نے لسان المیزان جلد ۶، صفحہ ۱۸۹ سے صفحہ ۱۹۰ تک ان کا مفصل حال لکھ دیا ہے یہ ایسے لوگوں سے اپنی قرآت کی سند جوڑتے تھے جو ان کی پیدائش سے پہلے مر چکے تھے۔ بڑے جھوٹے تھے اس لئے نہ ان کی مدح کا اعتبار نہ ان کی قدح کا۔

نہیں پڑھ سکتے تھے تو پھر حضرت ابو الدرداءؓ سے بھی نہیں پڑھ سکتے تھے۔
اصل یہ ہے کہ ان کی عمر زیادہ کرنے کے لئے یہ روایت گھڑی گئی ہے کہ
ان کی ولادت ۸ ھ میں ہوئی تھی تاکہ حضرت ابو الدرداءؓ اور حضرت
عثمانؓ سے ان کا قرآن پڑھنا ممکن قرار دیا جاسکے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ
ان کی ولادت ۲۱ ھ میں ہوئی۔ یہ تو کوئی حدیث بھی حضرت ابوالدرداءؓ یا
حضرت عثمانؓ یا حضرت علیؓ سے روایت نہیں کرتے۔ پورا قرآن مجید ان
میں سے کسی سے بھی کس طرح پڑھ سکتے تھے۔ بچپن میں یہ اپنے وطن
دمشق میں رہے۔ تابعی تھے۔ متاخرین صحابہ سے حدیثیں روایت کرتے
تھے۔ انہوں نے تو حضرت عثمانؓ یا حضرت ابوالدرداءؓ کو دیکھا بھی نہ ہوگا
بلکہ حضرت علیؓ کی زیارت بھی نصیب نہ ہوئی ہوگی۔ تیسیر میں حضرت
ابوالدرداء سے ان کے قرآن پڑھنے کا ذکر سند کے لئے کافی نہیں ہوسکتا اور
نہ خالد بن یزید بن صالح سے بے سند روایت کہ ان کی پیدائش ۸ ھ میں
ہوئی تھی جمہور ائمہ رجال کے خلاف قابل تسلیم ہے۔

ابن حجر ان کے ترجمہ میں لکھتے ہیں کہ ان سے اسماعیل بن عبداللہ
بن ابی المہاجر نے قرآن پڑھا تھا اور ابو عبیداللہ مسلم بن مشکم نے اور
یحییٰ بن الحارث الذماری نے بھی۔ ابن الندیم نے "الفہرست" میں ان
کے بھائی عبدالرحمن بن عامر کو بھی ان کا شاگرد لکھا ہے اور سعید بن
عبدالعزیز اور ہشام بن عمار اور ثور بن یزید کو بھی۔ ابو عمرو الدانی نے
تیسیر صفحہ ۵ میں لکھا ہے کہ "قراء سبعہ میں سے ابن عامر الشامی یعنی بھی
عبداللہ بن عامر الحیصبی اور ابو عمرو کے سوا کوئی بھی خالص عرب نہیں
تھے۔ سب موالی یعنی آزاد کردہ غلام تھے۔" ابو عمرو یعنی ابو عمرو بن العلاء

بن عمار بن عبداللہ بن الیحصین بن الحارث بن الجلہم بن خزاعی بن مالک بن عمرو بن تمیم۔ ابو عمرو کا نام ریان یا عریان یا یحییٰ بتایا ہے یعنی یہ تمیمی بنی تمیم سے تھے۔ اس لئے عربی تھے۔ ابو عمرو بن العلاء نے تو ۲۵۴ھ میں کوفہ میں وفات پائی تھی اور عبداللہ بن عامر نے ۱۱۸ھ میں دمشق میں وفات پائی تھی۔ ابو عمرو بن العلاء تو کوفے ہی میں رہتے تھے۔ اہل کوفہ کی صحبت میں رہ کر "ہر کہ درکان نمک رفت نمک شد" کے مطابق کوفیوں کے رنگ میں رنگ گئے تھے۔ ان کا مفصل حال آپ پہلے سن چکے۔ عبداللہ بن عامر بہت متقدم ہیں۔ دمشق والوں نے ان کا صرف نام استعمال کیا ہے۔ جہاں تک قیاس رہنمائی کرتا ہے اس کی امید نہیں ہوئی کہ یہ خود اختلافات قرآت کی سازش میں شریک ہوں۔ خصوصاً جب یہ موالی میں سے بھی نہ تھے۔ خالص عرب تھے۔ جیسا کہ ابو عمرو الدانی نے لکھا ہے۔ مگر ابن السمعانی نے لفظ یحصبی کے تحت میں عبداللہ بن عامر کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ یحصب قبیلہ حمیر کی ایک شاخ تھی یہ لوگ حمص میں رہتے تھے۔ بعضوں نے یہ بھی کہا ہے کہ یحصب ایک قریہ تھا حمص کا۔ سمعانی لکھتے ہیں کہ مگر پہلا ہی قول صحیح ہے ممکن ہے یحصبیون کا قبیلہ حمص کے جس قریہ میں رہتا ہو وہ قریہ انہیں کے نام سے مشہور ہوگیا ہو۔ بہرحال نہ یہ قریشی تھے نہ حجاز کے رہنے والے تھے۔ اس لئے ان کو عرب کہدینے سے دھوکہ نہیں کھانا چاہئیے۔ غایت سے غایت موالی میں سے نہ تھے۔ یعنی کسی کے غلام آزاد کردہ نہ تھے۔ مگر نہ یہ ضروری ہے کہ جتنے موالی ہوں وہ سب قرآن واسلام کے خلاف سازش میں شریک ہوں۔ اور نہ یہ ضروری ہے کہ جتنے خالص عرب بلکہ حجازی

بلکہ قریشی ہوں وہ سب پکے مومن اور مخلص مسلم ہوں۔ ان کے دلوں میں ملحدانہ خیالات نہیں آسکتے۔ اچھے برے ہر طبقے، ہر قبیلے اور ہر جگہ کے لوگ ہر زمانے میں کم و بیش رہے ہیں۔ آخر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک میں خاص مدینے والوں میں بھی کچھ جگہ منافقین تھے۔ جس کی شہادت خود قرآن مبین دے رہا ہے۔ مختصر یہ کہ سات میں سے صرف دو کے عرب ہونے پر فخر کرنا یا اس کو غنیمت سمجھنا صحیح نہیں جبکہ پانچ کے موالی میں سے ہونے کا خود اعتراف ہے۔ پھر بھی میں عبداللہ بن عامر کو اختلاف قرآت کی سازش میں شریک نہیں سمجھتا ہوں بلکہ سمجھتا ہوں کہ شامیوں نے ان کو اپنی سازش میں شریک کرلیا ہے۔ ان کو بھی نہیں بلکہ ان کے نام کو ان کی وفات کے بعد۔ کیونکہ ان کی وفات کے وقت تک تو کوفے کے خاص خاص گھروں اور خاص خاص محلوں میں اختلاف قرآت کی کھچڑی چپکے چپکے پک رہی تھی اور روایتیں بن رہی تھیں۔ اسناد جوڑے جارہے تھے۔ الفاظ قرآنی کے اعراب اور نقطے کہیں رسم الخط کہیں الفاظ بدل بدل کے لکھے جارہے تھے۔ عبداللہ بن مسعودؓ اور ابی بن کعب وغیرہ رضی اللہ عنہم کے مصاحف مرتب کئے جارہے تھے۔ زیادہ سے زیادہ غیر منقوط بغیر اعراب کے مصاحف پرانے کاغذات پر لکھے جارہے تھے جن کی کتابت صحابہ میں سے کسی کی طرف منسوب کی جارہی تھی۔ یہ ثابت کرنے کیلئے کہ ابتداء ہی سے قرآن غیر منقوط بغیر اعراب کے چلا آرہا ہے۔ غرض ۱۱۸ھ کا زمانہ مختلف قرآتوں کی اشاعت کا نہ تھا بلکہ اشاعت کے لوازمات مہیا کرنے کا تھا۔ باقی رہا صرف قرآن کا پڑھنا یا پڑھانا۔ اس کا تو مدرسہ ہر مسلم گھر میں موجود تھا۔

ہر باپ اپنی اولاد کو، ہر شوہر اپنی بیوی کو اور ہر آقا اپنے غلاموں اور لونڈیوں کو قرآن پڑھاتا تھا۔ کسی قاری و مقری کی کہیں کوئی ضرورت ہی نہ تھی بجز ان ممالک کے جو فتح ہوتے جارہے تھے۔ اور جہاں اسلام اس وقت پھیل رہا تھا وہاں کے نو مسلموں کے لئے البتہ تعلیم قرآن کیلئے قاریوں اور مقریوں کی ضرورت تھی۔

اچھا اب عبداللہ بن عامر سے جن لوگوں نے اپنایا دوسروں نے ان کا رشتہ تلمذ جوڑا ہے ان سے بھی کسی قدر تعارف حاصل کرلیجئے ۔ تاکہ شامی اسکول قرآت کا حال بھی آپ کو معلوم ہوجائے مگر پہلے ایک بات سن لیجئیے۔

اہلحدیث اور قراء کا فکری اتحاد محدثین میں جامعین صحاح یا امام مالک امام احمد بن حنبل اور ان جیسے اکابر محدثین رضی اللہ عنہم اجمعین کی دیانت وخلوص میں ان کی وثاقت وعدالت میں کسی طرح کا شبہ نہیں کیا جاسکتا۔ اسی طرح ائمہ رجال کی تفتیش و تحیص اور دیانتدارانہ تحقیق و تدقیق سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔ مگر یہ سب حضرات انسان تھے اور انسان کی فطرت میں بھول چوک بھی ہے اور رعایت و مروت بھی ہے۔ محبت و عداوت بھی ہے اور بہت سی انسانی کمزوریاں بھی ہیں۔ ان محدثین وائمہ رجال رحمہ اللہ کو تمام انسانی کمزوریوں سے پاک و منزہ سمجھنا غلط ہی نہیں گناہ بھی ہے اور درحقیقت گناہ کبیرہ ہے۔ محدثین میں جو جامعین سنن ہیں یہ اس زمانہ کے لوگ ہیں جب فرقہ بندی مسلمانوں میں پیدا ہوچکی تھی۔ اس لئے فرقہ وارانہ تعصب ان میں نمایاں تھا۔ اکثر محدثین شافعی تھے۔ حنفیوں کے ساتھ ان کا تعصب کوئی ڈھکی چھپی بات

نہیں ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ شافعی تھے اسلئے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی طرف سے کچھ کھچاؤ رکھتے تھے۔ چنانچہ اپنی کتاب تاریخ صغیر میں ایک روایت لکھ گئے کہ نعیم بن حماد نے ہم سے بیان کیا کہ ہم سے فزاری نے کہا کہ میں سفیان (ثوری) کے پاس تھا کہ نعمان (امام ابو حنیفہ) کی وفات کی خبر پہنچی۔ تو سفیان نے کہا کہ الحمد للہ! اس شخص نے اسلام کی دھجیاں اڑا کر رکھ دی تھیں۔ اسلام میں اس سے زیادہ منحوس آدمی پیدا نہ ہوا۔" (تاریخ صغیر صفحہ ۱۷۴ مطبوعہ انوار احمدی الہ آباد) حالانکہ نعیم بن حماد کو خود امام بخاری رحمہ اللہ نے کتاب الضعفاء الصغیر صفحہ ۲۹ میں ضعیف لکھا ہے اور مشہور شارح صحیح بخاری حافظ ابن حجر تہذیب التہذیب جلد ۱۰ صفحہ ۴۶۲ میں اس نعیم بن حماد کو کذاب لکھتے ہیں اور صاف طور سے تحریر فرماتے ہیں۔ دو دو جگہ صفحہ ۴۶۲ میں بھی اور صفحہ ۴۶۳ میں بھی کہ

کان یضع الحدیث فی تقویۃ السنۃ و حکایات فی ثلب ابی حنیفہ کلھا کذب یعنی "نعیم بن حماد سنت کی تقویت کے لئے حدیثیں گھڑا کرتے تھے اور (امام) ابو حنیفہ کی تنقیص میں حکایتیں گھڑا کرتے تھے اور وہ سب جھوٹی ہوتی تھیں۔" اور فزاری صاحب جن کا نام مروان بن معاویہ ہے وہ بھی نعیم بن حماد سے کچھ کم نہ تھے مجہول لوگوں سے غلط سلط روایتیں کرتے تھے اور کبھی راویوں کے نام بھی بدل دیتے تھے اس لئے ان کے معروف و مجہول دونوں قسم کے شیوخ مشتبہ ہی حال میں تھے۔ چنانچہ ابن حجر تہذیب التہذیب جلد ۱، صفحہ ۱۶۰ میں لکھتے ہیں کہ یہ ابراہیم بن محمد سے روایت کرتے تھے مگر نام بدل کے یعنی ابراہیم کو عبدالوہاب قرار دے کر۔ مگر جلد ۱۰، صفحہ ۹۸ میں ان کے اوصاف حسنہ

کی تصریح کی ہے۔ غرض ائمہ حدیث ہوں یا ائمہ رجال کمزوریوں سے وہ بری نہ تھے۔ وہ ان قاریوں کی ریشہ دوانیوں کو دیکھ رہے تھے اور ایک حد تک سمجھتے بھی تھے مگر سازشیوں کی ایک بہت بڑی جماعت خود ان کے ساتھ بھی محدثین کی جماعت بن کر لگی ہوئی تھی جن میں سے کچھ ان کے تلامذہ تھے تو کچھ ان کے شیوخ واساتذہ بھی تھے۔ کچھ ان کے کاتب اور وراق (دفتری) تھے تو کچھ دوست احباب بھی تھے اور وہ سب قاریوں کے حامی تھے۔ اس لئے ان قاریوں کے خلاف کچھ بول نہیں سکتے تھے۔ بلکہ اختلاف قرآت کی کچھ روایتیں اپنی کتابوں میں لکھ لینے پر بھی مجبور ہوجاتے تھے۔ اور اگر وہ جامعین خود اپنی کتابوں میں اسی قسم کی روایتیں درج نہیں کرتے تھے تو ان کے کاتب ان کے وراق جن میں اکثریت سازشی ہی لوگوں کی تھی اور ان کے سازشی تلامذہ ان کے بعد ان کی کتابوں میں داخل کرکے ان کتابوں کی متعدد نقلیں کراکے مختلف جگہ پھیلا دیتے تھے۔ تاکہ وہی سازشی نسخہ کثیرالاشاعت ثابت ہوکر صحیح سمجھا جائے ۔ جن کے پاس اصل نسخے کی صحیح نقل ہو بھی تو وہ اپنی کتاب میں ان حدیثوں کی کمی سمجھ کر ان کو اپنی کتابوں میں داخل کرلیں۔ اگر محدثین قاریوں کی ان ریشہ دوانیوں کو اچھی نظر سے دیکھتے تو خود حدیث سے زیادہ اختلاف قرآت قرآن میں اس سرگرمی سے حصہ لیتے جس سرگرمی سے قاریوں کی جماعت حصہ لے رہی تھی ورنہ ان محدثین کا تعلق ان قرآء سبعہ کے ساتوں اسکولوں سے کیوں نہ ہوا؟ ان لوگوں نے ان اسکولوں میں سے کسی اسکول میں کیوں قرآن نہیں پڑھا؟ محدثین سے تو ایک دنیا آباد نظر آتی ہے اور قاریوں کو انگلیوں پر گن لیا جاسکتا ہے؟ کسی اسکول کے ہیڈ ماسٹر کو

دو ایک سے زیادہ اسٹوڈنٹ نہیں ملے۔ ادھر ادھر سے مانگے کے شاگرد وجانشین مہیا کئے جاتے رہے۔ یہ افلاس ان قاریوں میں آخر کیوں تھا؟ اس کی وجہ یہی تھی کہ عام طور سے مخلص مسلمانوں کو ان کی یہ ریشہ دوانیاں کچھ بھلی نہیں معلوم ہوتی تھیں۔ ابتداء میں جب تک سازش کو سازش نہیں سمجھے تھے انزل الفرقان علی سبعۃ احرف والی حدیث اور بعض اختلاف قرآت کی روایتیں لکھی تھیں یا ان کی کتابوں میں داخل کردی گئی تھیں۔ ان کو دیکھ کر بعد والے محدثین اور عامہ مسلمین ان کو صحیح سمجھ کر چپ تھے اور ان حدیثوں کو احادیث متشابہات سمجھ کر ان پر ایمان رکھتے تھے مگر جب اختلافات قرآت کا انبار لگنے لگا تو محدثین اور ان کے ساتھ عام مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت ان سے الگ تھلگ ہی رہی۔

ائمہ رجال بعض قاریوں کے حالات سے واقف نہ تھے تو دوسرے قاریوں سے پوچھ لیا کرتے تھے جو کچھ وہ بتا دیتے تھے یہ لکھ لیا کرتے تھے۔ " دروغ گو را حافظہ نباشد " بات اگر صحیح ہو تو جس سے بھی پوچھئے سب ایک ہی بات کہیں گے مگر جھوٹی بات میں ضرور اختلاف ہوگا۔ اس لئے کسی نے کسی کو کسی کا شاگرد لکھوادیا۔ کسی نے کسی کا کسی نے کسی کو کسی کا شاگرد لکھوادیا دوسرے نے اس کا الٹا لکھوادیا۔ کہ وہی شاگرد تھے اور یہی استاد تھے۔ ان باتوں کو ذہن نشین رکھتے ہوئے اب سنئے۔

اسماعیل بن عبیداللہ بن ابی المہاجر کے متعلق ابن حجر تہذیب التہذیب جلد ۵، صفحہ ۲۷۴ ترجمہ عبداللہ بن عامر بن یزید الحصبی المقری الدمشقی میں لکھتے ہیں قرآعلیہ اسماعیل بن عبید اللہ بن ابی المہاجر

و ابو عبیداللہ مسلم بن مشکم و یحییٰ بن الحارث الذماری - ان کے ترجے میں اس سے صاف ثابت ہورہا ہے کہ اسماعیل بن عبداللہ بن ابی المہاجر شاگرد تھے اور عبداللہ بن عامر استاد۔ مگر جلد ۱، صفحہ ۳۱۷ ترجمہ اسماعیل بن عبیداللہ بن ابی المہاجر المخزومی جو مخزومیوں کے غلام آزاد کردہ تھے۔ مگر نہ ان کو قاری لکھا ہے نہ مقری، نہ یہ قرآت کے فن میں کسی کے استاد تھے نہ شاگرد۔ اور حضرت انسؓ جیسے متعدد صحابہؓ سے حدیثیں روایت کرتے ہیں اگر ان کو قرآن پڑھنا ہی تھا تو صحابہ کو چھوڑ کر ایک دمشقی سے قرآن مجید پڑھنے کی انہیں کیا ضرورت تھی۔ اگرچہ یہ خود بھی دمشقی ہی تھے۔ بس صرف دونوں کو دمشقی دیکھ کر جو سن میں کم تھا اس کو شاگرد اور بڑے کو استاد قرار دے کر سلسلہ جوڑ دیا۔ حالانکہ یہ تو عبداللہ بن عامر سے کوئی حدیث بھی روایت نہیں کرتے۔

اور سنئیے تہذیب التہذیب جلد ۷، صفحہ ۲۲۸ عطیہ بن قیس الکلابی الدمشقی جو بنی عامر کے غلام آزاد کردہ تھے ان کے ترجے میں ابن حجر لکھتے ہیں بروایت عبدالواحد بن قیس (جو عروہ بن الزبیر یا عمرو بن عتبہ کے غلام آزاد کردہ تھے) کہ "لوگ اپنے مصاحف کو عطیہ بن قیس کی قرآت کے مطابق درست کرلیا کرتے تھے۔" یعنی عطیہ اس قدر مسلم الثبوت قاری تھے کہ لوگوں کو اپنے مصاحف پر جو یقینی بقول قراء مصحف عثمانی ہی ہوگا یا شاید مصحف عبداللہ بن مسعود یا مصحف ابی بن کعب کے مطابق لیکن ان میں سے کسی مصحف پر لوگوں کو اعتماد باقی نہ رہا تھا۔ جو قرآت عطیہ بن قیس نے اختیار کی تھی وہی قرآت سارے اہل دمشق کو بقول عبدالواحد بن قیس پسند آگئی تھی۔ مگر خود عطیہ نے یہ قرآت جو

دمشق میں اس قدر مقبول تھی کس سے حاصل کی تھی اس کا مطلق ذکر نہیں۔ حدیثیں یہ حضرت ابی بن کعب سے روایت کرتے تھے ان کا ذکر ضرور ہے۔ ان سے قرآن پڑھنے کا ذکر نہیں تو پھر ان کا وہ کون سا مصحف تھا کہ سارے دمشقیوں نے ان کے مصحف پر اپنے مصاحف کو قربان کردیا؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ عبدالواحد صاحب کی دروغ بانی اور اپنی پارٹی کے آدمی کا پروپیگنڈہ ہے اور کچھ نہیں عبدالواحد بھی دمشقی اور عطیہ بھی دمشقی۔ عطیہ بھی ایک غلام آزاد کردہ اور عبدالواحد بھی ایک غلام آزاد کردہ ۔ اس لئے اگر یہ سازش قرآت کے ارکان کا پروپیگنڈہ کریں تو کیا بعید از عقل ہے اور یہ عبدالواحد تھے بھی ایسے ہی کہ عجیب عجیب حدیثیں روایت کیا کرتے تھے۔ مشہور محدثین سے منکر حدیثیں " حدثنا " کہہ کر روایت کرتے تھے۔ حضرت ابوہریرہؓ کو دیکھا تک نہ تھا، مگر ان سے بے محابا روایت کیا کرتے تھے۔ اسی لئے محدثین نے ان کو متروک الحدیث لکھا ہے۔ تو پھر ان سے اپنی سازشی پارٹی کا جھوٹا پروپیگنڈہ کیا بعد از عقل ہے؟

(ان کے حالات تہذیب التہذیب جلد ۶، صفحہ ۴۳۹ میں دیکھئے)

۵۔ عاصم بن ابی النجود الکوفی

ان کو عاصم بن بہدلہ کہتے ہیں ۔ اسدیوں کے آزاد کردہ غلام تھے۔ اس لئے اسدی کہے جاتے ہیں۔ زر بن جیش الکوفی اور ابو عبدالرحمن السلمی سے قرآت حاصل کی اور ان سے اعمش اور منصور بن المعمر روایت کرتے ہیں یہ دونوں ان کے قرابت مند بھی تھے (دونوں شیعے تھے کوفے

میں بنی اسد کا اور ہمدانیوں کا محلہ خاص شیعوں کا محلہ تھا۔ اس لئے آپ ان عاصم صاحب کو بھی سمجھ سکتے ہیں کہ یہ کیا تھے۔ اور ان کے پروردہ اور شاگرد حفص کیا تھے) مگر ان کو لکھا ہے کہ کان عثمانیاً یعنی حضرت عثمانؓ کے حمایتیوں میں سے تھے۔ قوم کی اکثریت میں اعتبار و اعتماد پیدا کرنے کے لئے متعدد اسدی وہمدانی اور دوسرے اہل کوفہ ازرونے تقیہ عثمانی بن گئے تھے۔ مگر حدیث اپنے اصل مسلک کی بہت روایت کرتے تھے اس لئے خاص کر اسدیوں اور ہمدانیوں کے عثمانی بن جانے یا اپنے کو اہل سنت ظاہر کرنے سے دھوکا نہیں کھانا چاہئیے۔ محدثین نے لکھا ہے کہ حافظے کے بہت کمزور تھے حدیثیں یاد نہیں رکھتے تھے اسلئے ان کی حدیثوں میں نکرہ ہوتی تھی۔ ابن حجر لکھتے ہیں کہ حاتم نے کہا کہ **عندی محله الصدق صالح الحديث و ليس محله ان يقال هو ثقه** یعنی سچے تھے درست حدیثوں والے مگر ان کا یہ مقام نہیں ہے کہ ان کو ثقہ یعنی قابل وثوق کہا جائے [illegible] ہے۔ سچے بھی تھے۔ صالح الحدیث بھی تھے۔ تو اب ان کے ثقہ ہونے میں کون سی کسر رہ گئی تھی) چونکہ بخاری ومسلم میں ان کی روایتیں ہیں اس لئے ان پر رجال والے کھل کر کچھ لکھ نہیں سکتے۔ پھر کوفے کے قاریوں کے سرگروہ بھی تھے۔ ۱۲۷ھ یا ۱۲۸ھ میں ان کی وفات ہوئی۔

اساتذہ عاصم قرآت میں عاصم بن بہدلہ کے دو استاد تھے اور دونوں کوفی۔ ابو عبدالرحمن السلمی الکوفی جن کا نام عبداللہ بن حبیب بن ربیعہ ہے (بصیغہ تصغیر) جنگ صفین میں تو حضرت علیؓ کے ساتھ تھے مگر حضرت علی کی شہادت کے بعد خلافت جب حضرت معاویہؓ کی طرف

منتقل ہوگئی تھی تو عثمانی بن گئے تھے۔ رہے برابر کوفہ میں اور وہیں وفات پائی۔ ان کے والد ماجد حبیب بن ربیعہ السلمی صرف انہیں کے بیان کے باعث صحابی سمجھے جاتے ہیں ۔ خود ان کے سوا کسی اور کی شہادت ان کے والد کے صحابی ہونے کی نہیں ملتی۔ خود حضرت عمرؓ حضرت عثمانؓ حضرت حذیفہ بن الیمانؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور حضرت علی رضی اللہ عنہم اجمعین سب سے روایت کرتے ہیں۔ اس لئے ان سب روایتوں کو صحیح ثابت کرنے کے لئے ان کی تاریخ وفات کی تعین میں لوگوں نے بہت اختلاف کیا ہے اور جن کو اس کی فکر نہ تھی ان لوگوں نے صاف انکار کردیا ہے کہ حضرت عمرؓ تو بہت پہلے گزرے حضرت عثمانؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے بھی انہوں نے کچھ نہیں سنا۔ تو پھر حضرت حذیفہ بن الیمانیؓ سے بھی ان کا کچھ سننا قرین عقل نہیں۔ مگر ان کا ہر صحابی سے سماع ثابت کرنے کے لئے بعد والوں نے بہت کوشش کی ہے ان کا سال وفات کوئی ۷۰ ھ، کوئی ۷۲ ھ اور کسی نے ۸۵ ھ لکھا ہے اور آخر الذکر نے ان کی عمر نوے برس بتائی ہے اگر نوے برس کی عمر پائی اور ۸۵ ھ میں وفات پائی تو وفات نبوی کے وقت ان کو پندرہ برس کا ہونا چاہیئے اور صحابہ میں ان کا ذکر ہوتا اور اگر ۷۰ ھ یا ۷۲ ھ میں وفات پائی اور عمر نوے برس کی ہوتی تھی تو وفات نبوی کے وقت ان کو پچیس برس کا ہونا چاہئیے اور صحابہ میں ان کا ذکر ہوتا۔ ۷۰ ھ میں نوے برس کی عمر میں ان کا انتقال اس لئے بیان کیا گیا کہ حضرت عمرؓ حضرت عثمانؓ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم سے ان کا سماع بھی ثابت ہو اور عاصم بن بہدلہ کا ان سے قرآت سیکھنا بھی ثابت ہو۔ ۷۲ ھ میں اگر ان

کی وفات مان لی جائے اور عاصم بن بہدلہ کی وفات اگر ۱۲۷ھ ہی مان لیجئے تو دونوں کی وفات کے درمیان ۵۵ برس کا فاصلہ پڑتا ہے۔ خزرجی نے خلاصہ تہذیب التہذیب الیمانی میں عاصم بن بہدلہ کا سال وفات بروایت ۱۲۹ھ لکھا ہے اور کسی قول کو نقل نہیں کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک ۱۲۹ھ سال وفات صحیح ہے۔ تو عاصم کی وفات اور ابو عبدالرحمن کی وفات کے درمیان ۵۷ برس کا فاصلہ ہوتا ہے اور امام ذہبی کی کتاب طبقات القراء کا ذیل جو ابو المحاسن محمد بن علی الحسینی نے لکھا ہے اس میں ہے کہ عاصم بن بہدلہ سے اعمش نے قرآت حاصل کی اور عاصم نے اعمش سے حدیث لی اور دونوں میں قرابت قریبہ تھی مگر عاصم اعمش سے چار برس چھوٹے تھے۔ اعمش کے ترجے میں ان کا سال ولادت ۶۱ھ لکھا ہے اس حساب سے عاصم کا سال ولادت ۶۵ھ ٹھہرتا ہے تو جب ابو عبدالرحمن السلمی کی وفات ۷۲ھ میں ہوئی تھی تو اس وقت عاصم کی عمر صرف سات برس کی ٹھہرتی ہے۔ ممکن ہے کہ عاصم کے والد نے تبرکاً ان سے کچھ قرآن پڑھوا دیا ہو۔ ورنہ یہ عمر فن قرآت واختلافات قرآت سیکھنے کی نہیں ہے۔

زر بن حبیش باقی رہے عاصم کے دوسرے استاد زر بن حبیش۔ ان کی اور ان کے ایک اور ساتھی شقیق بن سلمہ ابو وائل الاسدی دونوں کی عجیب وغریب شخصیت ہے۔ دونوں کی عمروں میں تو باپ بیٹے ہی کا نہیں بلکہ دادا اور پوتے بلکہ پردادا اور پرپوتے کا فرق ہوسکتا ہے۔ مگر دونوں میں اس قدر یک دلی و یکجہتی تھی کہ دونوں ایک سال مرے۔ یعنی ۸۳ھ ہی میں دونوں کی وفات ہوئی۔ یہ دونوں اہل کوفہ کے نزدیک تابعین

میں سے تھے اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے خاص شاگردوں میں ان کا شمار کرتے ہیں۔ ان دونوں سے صرف اہل کوفہ ہی روایت کرتے ہیں کوئی ایک غیر کوفی بھی ان دونوں سے روایت نہیں کرتا۔ خیر ابو وائل سے ہمیں کام نہیں اسلئے زر بن حبیش کا حال سنیئے۔

کوفیوں ہی کی روایت سے علمائے رجال لکھتے ہیں کہ یہ زمانہ جاہلیت کے آدمی تھے ایک سو ستائیس برس کی عمر پائی۔ وفات ۸۳ ھ میں ہوئی۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ بعثت نبوی کے وقت یہ اکیس برس کے تھے۔ مگر یہ کہاں رہتے تھے کہاں پیدا ہوئے کسی کو کچھ معلوم نہیں۔ شقیق بن سلمہ ابو وائل بھی اسدی کہے جاتے ہیں اور زر بن حبیش بھی اور دونوں جاہلی ہونے کا دعویٰ رکھتے تھے۔ یا دونوں کو جاہلی کہا جاتا ہے ابو وائل کے بیان میں بتایا جاتا ہے کہ وہ کہتے تھے کہ میں نے جاہلیت کے چھ برس پائے تھے۔ جہاں تک غور کیجئے صاف پتا ملتا ہے کہ کوفے کے اسدیوں نے یہ دو نام گھڑ لئے تھے اور ان کو حضرت علی اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا خاص شاگرد قرار دے کر ان سے روایتیں منسوب کرکے پھیلائیں اسی لئے صرف کوفیوں ہی کو ان کے تلامذہ قرار دیا۔ کسی غیر کوفی کو ان کا شاگرد بتاتے تو راز کھل جاتا کوفے میں بعض ثقہ محدثین بھی تھے۔ مثلاً عامر بن شرجیل الشعبی الکوفی، ابراہیم النخعی الکوفی، سعید بن مسروق الثوری الکوفی وغیرہ ان لوگوں کے واسطے سے بھی ان کے بعد والے کوفیوں نے زر بن حبیش اور ابو وائل سے حدیثیں روایت کی ہیں یا بصرہ ومصر و شام وغیرہ کے منافقین نے۔ اس لئے زر بن حبیش اور ابو وائل سے روایت کرنے

والوں میں کوفے کے بعض ثقہ محدثین کے نام دیکھ کر دھوکا نہیں کھانا چاہئیے ان ثقہ راویوں کے بعد جن کے نام آتے ہیں ان کا حال دیکھنے سے حقیقت واضح ہوجائے گی انشاء اللہ تعالیٰ ۔

مختصر یہ ہے کہ زر بن حبیش وشقیق بن سلمہ ابو وائل دو فرضی شخصیتیں تھیں جن سے صرف کوفے ہی والے منسوب کر کرکے حدیث روایت کیا کرتے تھے۔ لیکن جب ان کے اصل شاگرد امام القراء ت حفص بن سلمان ہی قابل وثوق نہ ہوں تو پھر ان کے اوپر کے ناموں کی وثاقت ان کی روایات کی توثیق کی کیا ذمہ دار ہوسکتی ہے۔

عاصم کے دوسرے شاگرد حفص بن سلیمان القاری

حفص بن سلیمان الاسدی ابو عمیر البزار الکوفی القاری۔ ان کو غاضری بھی کہتے ہیں یعنی غاضر بن الملک بن ثعلبہ کی طرف بھی منسوب کئے جاتے ہیں۔ اور ان کو حفیص (بصیغہ تصغیر) بھی کہتے ہیں۔ یہ عاصم بن ابی النجود (جن کو عاصم بن بہدلہ بھی کہتے ہیں) کے ربیب یعنی ان کی بیوی کے پہلے شوہر کے بیٹے تھے۔ اس لئے عاصم بن بہدلہ الکوفی کی گود میں پلے اور انہیں سے قرآت بھی سیکھی اور ان سے حدیثیں بھی روایت کرتے تھے۔ امام احمد بن حنبل اور ابو حاتم نے ان کو متروک الحدیث قرار دیا ہے اور یحییٰ بن معین نے غیر ثقہ کہا۔ علی بن المدنی نے بھی ان کو ضعیف الحدیث کہا اور ان کو ترک کیا۔ امام بخاری، امام مسلم دونوں نے ان کو متروک الحدیث لکھا۔ صالح بن محمد نے کہا کہ ان کی حدیث نہ لکھی جائے ۔ و احادیث کلھا مناکید۔ ان کی ساری حدیثیں مستحق

انکار ہیں۔ (میں منکر کا ترجمہ لوگوں کے سمجھانے کو ہی کرتا ہوں) ساجی نے کہا کہ سماک وغیرہ سے باطل حدیثیں روایت کیا کرتے ہیں۔ ابن خراش نے کہا کہ کذاب متروک یضع الحدیث۔ یعنی بڑا جھوٹا ہے مستحق ترک ہے حدیث گھڑتا ہے ۔ ابو احمد حاکم نے کہا کہ یہ گئی گزری حدیث والے ہیں۔ امام شعبہ نے یحییٰ بن سعید سے کہا کہ مجھ سے ایک کتاب مستعار مانگ کرلے گیا مگر واپس نہیں لایا۔ دوسروں کی کتابیں لے کر ان سے حدیثیں نقل کرلیا کرتا تھا۔ احمد بن محمد الہندادوی یحییٰ بن معین سے روایت کرتے ہیں کہ (عاصم بن ابی النجود کے شاگردوں میں) حفص اور ابوبکر ، عاصم کی قرآت کے سب سے زیادہ جاننے والے ہیں۔ اور حفص ابوبکر سے زیادہ قرآت جاننے والا تھا۔ اور یہ کذاب تھا۔ ابن حبان نے کہا کہ یہ حدیثوں کے اسناد میں الٹ پلٹ کردیا کرتا تھا اور مرسل کو مرفوع بنا دیتا تھا۔ ابن جوزی نے موضوعات میں لکھا ہے کہ عبدالرحمن بن مہدی نے کہا کہ و اللہ لا تحل الروایۃ عنہ (قسم اللہ کی ان کی حدیث کا روایت کرنا جائز نہیں ہے) امام بخاری نے تاریخ اوسط میں ۱۸۰ ھ اور ۱۹۰ ھ کے درمیان ان کی وفات لکھی ہے (تہذیب التہذیب جلد ۲، صفحہ ۴۰۰) مگر مراۃ الجنان میں لکھا ہے کہ ۱۸۰ ھ میں نوے برس کی عمر پاکر وفات پائی جلد ۱، صفحہ ۳۷۸ ۔ مگر سوچئے تو جس کا برتاؤ حدیث رسول کے ساتھ اچھا نہ ہو تو قرآن مجید کے ساتھ اس کا برتاؤ کیا اچھا رہ سکتا ہے ۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

حفص کے تلامذہ ان کے ایک شاگرد کا نام عبیداللہ بن الصباح لکھا ہے مگر دراصل وہ عبید بن الصباح ہیں عبیداللہ بن الصباح کوئی شخص بھی

دنیائے رجال میں نہیں تھے۔ عبید بن الصباح الکوفی ایک صاحب ضرور تھے اور حفص بن سلیمان کے زمانے ہی میں تھے۔ اور کوفے ہی کے رہنے والے تھے حفص بن سلیمان کے ہمعصروں سے حدیثیں بھی روایت کرتے تھے۔ عیسیٰ بن المہمان البصری ثم الکوفی ابو العلاء کامل بن العلا الکوفی وغیرہ سے یعنی کوفیوں ہی سے روایت کرتے تھے اور ان سے بھی فقط اہل کوفہ ہی روایت کرتے تھے۔ علمائے رجال کے نزدیک غیر معلوم الحال محض معمولی سے راوی تھے مگر نہ ان کو قاری لکھا ہے نہ حفص بن سلیمان سے ان کا کوئی تعلق لکھا ہے نہ حفص کے تلامذہ میں ابن حجر یا ذہبی وغیرہا نے عبید بن الصباح، عبیداللہ ابن الصباح کا نام لکھا ہے مگر فن قرآت والے تو گمناموں ہی کو کھینچ کھینچ کر اپنے یہاں لے آتے ہیں۔

حفص کے دوسرے شاگرد جو بیان کئے جاتے ہیں عمرو بن الصباح ان کا بھی کتب رجال میں کہیں نام ونشان نہیں۔ عبیداللہ بھی "ابن الصباح" اور عمرو بھی "ابن الصباح" اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ اگر یہ دونوں اسمائے بے مسمیٰ نہیں ہیں بلکہ دو شخصیتیں ہیں تو غالباً دونوں ایک ہی باپ کے بیٹے ہوں اور اگر ہونگے تو پھر یہ دونوں بھی کوفے ہی کے ہونگے اور کسی کے آزاد کردہ غلام ہی ہونگے۔ یہ خود نہیں تو ان دونوں کے باپ صباح ہی سہی۔

(۶) حمزہ بن حبیب بن عمارۃ الزیات ابو عمارہ التیمی الکوفی

یہ بنی تمیم میں سے کسی کے آزاد کردہ غلام تھے عبدالرحمن بن مہدی جو بہت مشہور امام المحدثین تھے امام بخاری وغیرہ کے شیوخ میں تھے۔ وہ فرماتے تھے کہ اگر مجھ کو سیاسی اقتدار حاصل ہوتا تو جس کو حمزہ کی قرآت سے قرآن پڑھتے سنتا اس کی پیٹھ اور پیٹ کو (مارتے مارتے) درد سے بھر دیتا۔ کوفے اور حلوان کے درمیان لے جاکر تیل بیچا کرتے تھے۔ ابن حجر ان کے زہد وورع وعبادت وتقویٰ کی تعریف بھی لکھتے ہیں پھر لکھتے ہیں **وقد ذمه جاعة من اهل الحديث فى القراءة و ابطل بعضهم الصلوة باختياره من القراءة** یعنی اہل حدیث کی ایک بڑی جماعت نے قرآت کے متعلق ان کی مذمت کی ہے اور بعضوں نے تو ان کی قرآت سے نماز میں قرآن پڑھنے سے نماز کے باطل ہوجانے کا فتویٰ دیا ہے علامہ ساجی اور ازدی نے بھی ان کی قرآت کی مذمت کی ہے۔ حدیث میں بھی یہ کوئی پایہ نہیں رکھتے تھے۔ امام احمد بن حنبل بھی عبدالرحمان بن مہدی وغیرہ کی طرح ایسے امام کے پیچھے نماز کو مکروہ سمجھتے تھے جو حمزہ کی قرآت سے قرآن پڑھے۔ ابو بکر بن عیاش کہتے ہیں کہ حمزہ کی قرآت بدعت ہے۔ ابن درید نے کہا کہ میرا جی چاہتا ہے کہ حمزہ کی قرآت کو کوفے سے نکال باہر کردوں مگر یہ تو متقدمین کی رائیں تھیں ۔ قرآت حمزہ کے متعلق متاخرین نے کیا فیصلہ کیا؟ یہ بھی سن لیجئے۔ ابن حجر مذکورہ بالا باتیں لکھنے کے بعد کہتے ہیں کہ **قد انعقد الاجماع باخرة على تلقى قراءة حمزه بالقبول - و يكفى حمزة شهادة الثورى له فانه قال ما قرء حمزة حرفا الا باثر** - یعنی آخر میں لوگوں کا اجماع حمزہ کی قرآت کو

قبول کر لینے کا ہو گیا۔ اور حمزہ کے لئے سفیان ثوری کی (تنہا) یہ شہادت کافی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ حمزہ نے ایک حرف بھی ایسا نہیں پڑھا جو کسی نہ کسی اثر (یعنی کسی صحابی کے قول سے یا تقریر سے اور تقریر کا مطلب یہ ہے کہ کسی صحابی نے حمزہ والی مخصوص قرآت کو سنا اور خموش رہے) سے ثابت نہ ہو۔

مگر حمزہ کی ولادت ۸۰ ھ کی تو خود ابن حجر ہی لکھ رہے ہیں۔ بظاہر انہوں نے تو کسی صحابی کی صورت بھی نہیں دیکھی ہوگی۔ ان کے اساتذہ بلا استثناء سب کے سب کوفی، ان میں بھی زیادہ تر آزاد کردہ غلام اور زیادہ تر شیعے اور سفیان ثوری جو تنہا ان کے لئے صفائی کے گواہ بنے وہ بھی کوفی ہی تھے۔ مگر ان کے مذہب میں ضعفاء و مجروحین کی روایتیں بھی مقبول تھیں۔ اس لئے یہ کیوں دیکھتے کہ زیات یعنی حمزہ صاحب اپنی قرآت کے جو آثار پیش کرتے ہیں وہ کس قسم کے راویوں سے مروی ہیں۔ اور پھر معلوم نہیں واقعی سفیان ثوری نے ایسا کہا بھی تھا یا نہیں؟ سفیان ثوری کی وفات ۱۶۱ ھ میں ہوئی تھی اور ابن حجر متوفے ۸۰۲ ھ کی پیدائش اٹھویں صدی میں ہے۔ اس لئے سفیان ثوری تک اپنا سلسلہ اسناد ان کو لکھنا تھا۔ اور شاید سفیان ثوری کو بھی ابن حجر نے ذوالشہادتین سمجھ لیا کہ پوری جماعت محدثین کے خلاف صرف ایک شخص کی شہادت ایک مجرم کی حمایت میں کافی سمجھ لی۔ خود سفیان ثوری کی ولادت ۹۷ ھ میں ہوئی تھی کسی صحابی کی پرچھائیں تک انہوں نے نہیں دیکھی تھی۔ باقی رہے تابعین تو تابعین ہی میں قاتلین حضرت عثمانؓ اور قاتلین حضرت حسینؓ بھی تھے۔ وہ سب بھی تو آخر تابعی ہی تھے۔ معافقین

تو آ آکر تابعی ہی بنتے گئے تھے۔ اس لئے آنکھ بند کر کے تابعی ثقہ کہنے میں تو صحاح تک میں مکذوبات کا ایک معقول ذخیرہ رکھوا دیا۔ غرض سفیان ثوری کی وفات ۱۶۱ھ میں ہے۔ متاخرین تک ثوری کی یہ صفائی کی گواہی کن راویوں کے ذریعے پہنچی۔

سلیم بن عیسیٰ پھر حمزہ صاحب کو صرف ایک ہی شاگرد رشید ملے سلیم بن عیسیٰ الحنفی۔ بنی حنیفہ میں سے کسی کے آزاد کردہ غلام تھے، ان کی بدنامی کی وجہ سے کوئی اور ان کا شاگرد نہ ہوا۔ انہیں جیسا ایک آزاد کردہ غلام کسی طرح ان کو مل گیا۔

ان سلیم صاحب کے البتہ دو شاگرد ہوگئے خلاد بن خالد الشیبانی ابو عیسیٰ متوفی ۲۲۰ھ یہ حمزہ کے بھی خاص شاگرد تھے اور حمزہ کی قرآت کو آگے بڑھانے والے دراصل یہی تھے دوسرے خلف بن ہاشم جو طالب بن غراب البزاری کے نام سے بھی متعارف ہیں۔ انہوں نے حمزہ کی قرآت پر قناعت نہ کی دوسرے قاریوں کی قرات بھی سیکھی صرف حمزہ ہی کے ہو رہنا انہوں نے گوارہ نہ کیا۔

علی بن حمزہ بن عبداللہ بن قیس بن فیروز

الاسدی مولاھم الکوفی المعروف بالکسائی

یہ بھی اسدیوں میں سے کسی کے آزاد کردہ غلام تھے عجمی تھے۔ ان کے والد اور ان کے دادا ساتھ ساتھ مشرف بہ اسلام ہوئے تھے۔ یہ بھی ان کے ساتھ کمسنی ہی میں مشرف بہ اسلام ہوئے اور کوفے میں علوم دینیہ حاصل کرنے لگے۔ عربی زبان میں علم نحو میں بڑی مہارت پیدا کی اور علم

نحو میں کتاب بھی تصنیف کی۔ کوفے سے بغداد چلے گئے تھے ہارون رشید نے ان کو اپنے درباریوں کی تعلیم سپرد کردی۔ خلیفہ وقت امیرالمومنین کے صاحبزادوں کے استاد تھے اس لئے عوام پر ان کا ایک خاص اثر تھا اور عزت واحترام سے دیکھے جاتے تھے۔

کسائی نے قرآت حمزہ الزیات سے سیکھی اور چار باران سے قرآن پڑھا اور محمد بن عبدالرحمن بن ابی لیلیٰ متوفی ۱۴۸ ھ سے بھی قرآت سیکھی اور قرآن پڑھا حمزہ زیات سے تو آپ واقف ہوچکے محمد بن ابی لیلیٰ کوفی تھے اور کوفے کے قاضی بھی تھے اور فقہا میں شمار ہوتے تھے۔ بدحافظہ ہونے میں اپنی مثال آپ تھے۔ امام شعبہ نے کہا کہ ان سے زیادہ بدحافظہ میں نے کسی کو دیکھا ہی نہیں۔ سارے محدثین شیعہ سنی سب کا ان کے بدحافظہ ہونے پر اجماع ہے۔ مگر اہل سنت کے یاں یہ بدحافظہ ہونے کے سبب سے سند وحجت نہیں سمجھے جاتے۔ البتہ شیعوں کے یہاں ان کے بدحافظہ ہونے کے اعتراف کے باوجود ان کو سند وحجت سمجھا جاتا ہے غرض یہ شیعوں میں شیعے تھے۔ اور سنیوں میں سنی تھے۔ پھر آخر کوفی ہی تھے۔

اور کسائی کے تیسرے استاد عیسیٰ بن عمرالاسدی الہمدانی الکوفی متوفی ۱۵۶ ھ تھے۔ جو اسدیوں میں سے کسی کے آزاد کردہ غلام تھے۔ قرآت میں عاصم بن ابی النجود کے شاگرد تھے اور سلیمان الاعمش کے بھی شاگرد تھے۔ عاصم بن ابی النجود۔ اعمش اور یہ عیسیٰ بن عمر اور خود کسائی چاروں اسدیوں کے آزاد کردہ غلام تھے اور چاروں کوفی تھے۔

اور کسائی کے چوتھے استاد ابوبکر بن عیاش الاسدی الکوفی جو ۹۶ ھ میں

پیدا ہوئے تھے اور ۱۹۲ھ میں وفات پائی یہ بھی ایک اسدی واصل الاحدب کے آزاد کردہ غلام تھے اور کوفی تھے ۔ قال ابو نعیم لم یکن فی شیو خنا اکثر غلطا منه ابو نعیم کہتے ہیں کہ ہم لوگوں کے استادوں میں ان سے زیادہ غلطی کرنے والا کوئی نہ تھا ۔ روایت میں بہت غلطی کرتے تھے ۔ عاصم بن ابی النجود کے شاگرد رشید تھے ۔

اور کسائی کے پانچویں استاد سلیمان الاعمش الاسدی الکوفی تھے جو اسدیوں کے آزاد کردہ غلام تھے ۔ حضرت حسینؓ بن علیؓ کی شہادت کے دن یعنی یوم عاشورہ ۶۱ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۴۸ھ میں وفات پائی شیعہ تھے ۔ مگر متقدمین شیعوں میں سے تھے جب شیعہ مذہب میں سارے صحابہ سے بغض و عناد پیدا نہ ہوا تھا ۔ اور نہ سنی و شیعہ کے درمیان مذہبی بٹوارہ ہوا تھا ۔ کوفے میں اسدیوں اور ہمدانیوں کے دو محلے ہی خاص شیعوں کے محلے تھے جن میں غالب اکثریت شیعوں ہی کی تھی جمع احادیث میں دونوں مذہب کے علماء مل جل کر کام کر رہے تھے ۔ شیعوں نے بڑی ہوشیاری یہ کی کہ جمع احادیث کا کام تو اہل سنت ہی پر چھوڑ دیا مگر حدیثیں لا لا کر بذریعہ رواۃ جامعین تک پہنچانا اپنے ذمے رکھا ۔ اسی لئے جامعین احادیث متقدمین آپ اہل سنت ہی کو پائنگے مگر راویوں میں باوجود قلت تعداد کے شیعوں کو اہل سنت کے برابر تعداد میں پائینگے اور پھر ان کے مذہب میں تقیہ کیمتان واجبات دین میں سے ہے اس لئے کتنے شیعے سنیوں کے لبادے اوڑھ کر حدیثیں روایت کیا کرتے تھے اور وہ سنی سمجھے جاتے تھے ۔ جن کا تشیع معلوم ہوجاتا تھا ان کے بھی ظاہری زہد ودرع کا خیال کر کے اہل سنت جامعین حدیث ان کی روایتیں قبول

کرلیتے تھے۔ ابو اسحاق السبیعی کے ترجے میں ابن حجر تہذیب التہذیب جلد ۸، صفحہ ٦٦ میں لکھتے ہیں قال ابو اسحاق الجوزجانی کان قوم من اهل الکوفة لا تحمد مذاهبهم یعنی التشیع وهم رؤس محدثی الکوفة مثل ابی اسحاق والاعمش ومنصور وزبید وغیرهم من اقرانهم احتملهم الناس علی صدق السنتهم فی الحدیث ووقفوا عند ما ارسلوا لما خافوا ان لا یکون مخارجها صحیحة اما ابو اسحاق فروی عن قوم لا یعرفون ولم نتسه عنهم عند اهل العلم الا ما حکی ابو اسحاق عنهم فاذا رویٰ تلک الا شیاء عنهم کان التوقیف فی دلک عندی الصواب "
یعنی ابو اسحاق جوزجانی نے فرمایا کہ اہل کوفہ میں ایک جماعت تھی جن کا مذہب یعنی تشیع ناپسندیدہ سمجھا جاتا تھا جیسے ابو اسحاق السبیعی، سلیمان الاعمش، منصور بن معتمر اور زبید الیامی وغیرہ ان کی برادری کے لوگ، کہ لوگوں نے ان کی زبانی صداقت پر اعتماد کرکے ان کی حدیثیں برداشت کرلیں اور جہاں مرسل حدیثیں روایت کرنے لگے تو رک گئے۔ اس خوف سے کہ کہیں ان مرسل حدیثوں کا سرچشمہ غلط نہ ہو۔ مگر ابو اسحاق السبیعی تو ایسے لوگوں سے روایت کرتے ہیں جن کو اہل علم کچھ نہیں جانتے۔ جن کی حدیثیں لوگوں میں نہیں پھیلیں بجز اتنے بھر کے جتنی حدیثیں ان سے بھی ابو اسحاق روایت کرتے ہیں۔ تو جب ایسے لوگوں سے یہ روایت کریں تو میرے نزدیک ایسی حدیثوں سے رکے رہنا بہتر ہے۔"

امام ذہبی نے بھی میزان الاعتدال جلد ۱، صفحہ ۳۴۵ میں زبید بن الحارث الیامی کے ترجے میں اس قول کو نقل کیا ہے ۔ چنانچہ مالک بن

اغر مالک بن مالک ہیثم بن حسن ، یزید بن زید اور زید بن بقیع وغیرھم سے ابو اسحاق السبیعی کے سوا دنیا کا کوئی محدث روایت نہیں کرتا۔ اور نہ کوئی ان لوگوں سے کچھ واقف ہے کہ یہ لوگ کون تھے، بجزاس کے کہ ابو اسحاق السبیعی کے شیوخ خصوصی یا مصنوعی تھے اور امام ذہبی نے میزان الاعتدال جلد ا، صفحہ ۴۲۳ میں لکھا ہے قال ابن المبارک انما افسد حدیث اھل الکوفۃ ابن اسحاق و اعمشکم ھذا۔ اہل کوفہ کی حدیثوں کو غارت کردیا ابو اسحاق اور تمہارے اس اعمش نے ۔ بالکل اسی طرح کا قول معن بن عیسیٰ کا بھی اور متعدد محدثین کا منقول ہے ۔ مگر ان تمام باتوں کے باوجود اہل سنت رواداری سے کام لیتے رہے اور ان کی روایت کردہ حدیثوں کو اپنی کتابوں میں درج کرتے رہے۔ چنانچہ صحاح ستہ کی کون سی کتاب ہے جس میں ان لوگوں کی خاص کرکے ابو اسحاق اور اعمش کی حدیثیں نہیں ہیں۔

کچھ دنوں کے بعد بعض شیعوں نے بھی جمع حدیث کا کام شروع کیا وہ اہل سنت کی حدیثیں بھی اپنی کتاب میں درج کرنے پر مجبور تھے۔ جس طرح ابو عبداللہ الحاکم صاحب مستدرک نے مستدرک میں فضائل خلفائے راشدین وفضائل حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنھم اجمعین کی حدیثیں بھی درج کرلی ہیں۔ لیکن شیعے اس مشترک دین پر زیادہ دنوں تک قناعت نہ کرسکے اور سب سے پہلے ابو جعفر کلینی نے خالص شیعہ نقطہ نظر کی حدیثیں خاص شیعہ راویوں سے اہل سنت سے بالکل الگ ہوکر جمع کر ڈالیں جن کی کتاب اصول کافی اور فروع کافی کئی جلدوں میں ان کے خاص مذہب کی کتابیں ہیں۔ پھر ان کے دوسرے محدثین بھی اپنے خاص

مذہب کی حدیثیں اہل سنت سے قطع تعلق کر کے جمع کرنے لگے مگر جب تک جمع احادیث کا سلسلہ قائم رہا شیعے اہل سنت کے ساتھ بھی برابر کے شریک رہے اور اپنا الگ کام بھی کرتے رہے۔ اس لئے حدیث کی کوئی کتاب بھی خاص اہل سنت کی دنیا میں نہیں ہے جس طرح خاص شیعہ مذہب کی حدیث کی چار کتابیں صحاح اربعہ مشہور ہیں۔ کافی، تہذیب استبصار اور من لایحضرہ الفقیہ۔ کہ یہ چاروں کتابیں خاص شیعہ مذہب کی ہیں جن میں اہل سنت کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ مگر جتنی کتابیں اہل سنت کی کہی جاتی ہیں۔ موطا اور بخاری مسلم تک ہر کتاب میں شیعے برابر کے شریک ہیں اور ہر کتاب میں ان کا حصہ رسدی موجود ہے۔ فرق اس قدر ہے کہ وہ اپنی کتابوں میں جو کچھ کہتے ہیں کھل کر کہتے ہیں اور مشترک کتابوں میں جو کچھ اپنی سی کہتے ہیں۔ دبی زبان سے کہتے ہیں۔ گول مول الفاظ میں مفہوم ادا کرتے ہیں۔ کہنا مقصود کچھ اور ہے اور کہتے ہیں کچھ اور۔

مختصر یہ ہے کہ دنیا میں حدیثوں کی کوئی کتاب ایسی نہیں ہے جو خاص اہل سنت کے حدیثوں کا مجموعہ کہی جاسکے۔ ہر کتاب میں شیعوں کا حصہ رسدی موجود ہے۔ اس لئے کسی کتاب حتیٰ کہ بخاری و مسلم کو بھی خاص اہل سنت کی کتاب سمجھنا سخت غلطی بلکہ ظلم ہے۔ شیعہ ہی نہیں بلکہ خارجی معتزلہ قدریہ وجبریہ وجہمیہ ہر مذہب کی حدیثیں ان میں موجود ہیں۔ مگر شیعوں کے سوا کسی مذہب نے بٹوارہ کر کے اہل سنت سے علیحدگی نہیں اختیار کی نہ کسی اور مذہب والوں نے اپنی حدیثیں اہل سنت سے الگ ہو کر جمع کیں جبکہ شیعوں نے علیحدگی اور مکمل علیحدگی اختیار کی۔

بس اس کا فرق ہے اختلافات قرآت کی روایات میں آپ شیعے راویان حدیث کو بہت دیکھینگے ۔ " انزل القرآن علی سبعۃ احرف " والی وضعی حدیث کوفے ہی میں بنی اور یہیں سے شائع ہوئی۔ شیعے ہی اس کے ابتدائی راوی ہیں اور درمیان میں بھی شیعے راوی ملینگے۔ مگر بٹوارے کے بعد انہوں نے اس سے خود انکار کردیا۔ چنانچہ اصول کافی میں ان کا انکار موجود ہے کہ انزل من واحد علی حرف واحد۔ خدائے واحد کی طرف سے قرآن اترا ہے اور ایک ہی حرف ایک ہی قرآت پر اترا ہے اور یہی صحیح ہے ۔ منافقین جو شیعوں میں گھلے ملے تھے وہ تو تیسری صدی تک ختم ہوگئے تھے ۔ تھوڑے بہت ان کے ذریات رہ گئے تھے چوتھی پانچویں صدی میں تو اسلام سے نفاق کا وہ زور باقی نہیں رہا تھا۔ البتہ صحابہ اور امہات المومنین رضی اللہ عنھم اجمعین کے ساتھ بغض وعناد بڑھتا گیا۔ مگر نفس اسلام اور قران ورسول سے وہ بغض وعناد جو منافقین کو تھا عام شیعوں میں نہ رہا۔

حاصل بحث یہ ہے کہ اب اختلافات قرآت کے بانی قراء شیعہ اور ان کے تلامذہ کی فہرست کو دیکھ جائیں۔ اسی فیصد سے زیادہ آپ ان میں منافقین ہی کو پائینگے۔ اور اسی فیصد سے زیادہ غلاموں ہی کو پائینگے۔ اور عجمی الاصل ہی آپ کو ملینگے۔ اگر کوئی نظر بھی آئے گا تو وہ حجاز کا رہنے والا ہوگا قریشی تو کبھی نہیں ہوگا کسی دور دراز خطہ عرب کا ہوگا۔

آپ دیکھئے جو قرآن ساری دنیا میں ہر مسلم کے گھر میں موجود ہے عہد نبوی سے آج تک یکساں بغیر کسی اختلاف کے چلا آرہا ہے ۔ اس کو مشکوک ومشتبہ قرار دے کر مسلمانوں سے چھوڑوانے کی اور اس کی جگہ

اپنے خود ساختہ قرآن کو رواج دینے کی کیسی کیسی زبردست کوشش کی گئی۔ اگر اللہ کی حفاظت قرآن مجید کے شامل حال نہ ہوتی تو قرآن کب کا مسلمانوں سے چھن گیا ہوتا۔

(۱) یہ قرآن وہ ہے جس کو حضرت عمرؓ کے مشورے سے حضرت ابوبکرؓ نے حضرت زید بن ثابتؓ سے پہلے ایک مسودے کی صورت میں جمع کرایا تھا جو سترہ برس تک بے مصرف رکھا رہا۔

(۲) ۳۰ھ میں حضرت عثمانؓ نے اس کو چند لوگوں سے مرتب ومدون کرا کے اور اس کی نقلیں کرا کے تمام ممالک میں بھیجیں کہ ہر شخص اپنے مصاحف کو اسی کے مطابق بنالے اور مصاحف میں اختلاف باقی نہ رکھے۔

(۳) چار پانچ انصاری صحابہؓ نے بہ عہد نبوی ہی پورا قرآن جمع کر رکھا تھا۔ عبداللہ بن مسعودؓ، ابو درداء، ابی بن کعب زید بن ثابت اور معاذ بن جبل۔

(۴) حضرت عثمانؓ نے جو تمام اقطار وامصار اور اپنا مرتب کرایا ہوا مصحف بھیجا تو ہر جگہ کے لوگوں نے تو خلیفہ وقت کے حکم کے مطابق اپنے اپنے مصحف کو مصحف عثمانؓ کے مطابق بنالیا مگر اہل کوفہ کو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے منع کیا کہ تم لوگ اپنے اپنے مصحف کو علیٰ حالہ رہنے دو۔ مصحف عثمانی کے مطابق نہ بناؤ اور اہل کوفہ کے پاس عبداللہ بن مسعودؓ کا مصحف رائج تھا۔ مغیرہ کے پاس ابی بن کعب کا مصحف تھا بعض کے پاس ابو درداء کا بعض کے پاس معاذ بن جبل کا۔ چونکہ سب مصاحف عہد نبوی کے جمع کردہ تھے تو یقیناً مرضی نبوی کے مطابق ہی جمع کئے گئے تھے۔ اس لئے حضرت عثمانؓ کے ترتیب دادہ

مصحف سے زیادہ قابل اعتبار یہ سب مصاحف ٹھہرئے اور یہ سارے مصاحف اب صرف کوفہ ہی میں رہ گئے۔ دوسری جگہ کے لوگوں نے تو اپنے اپنے مصاحف کو مصحف عثمانی کے مطابق بنالیا۔ اس لئے اہل کوفہ جو اختلافات مصحف عثمانی سے رکھتے ہیں ان کے اختلافات ان مصاحف کے بارے میں ہیں جو عہد نبوی میں تعلیم نبوی وپسند نبوی کے مطابق جمع کئے گئے تھے اس لئے اہل کوفہ کی ہر قرآت مصحف عثمانی کی قرآت سے زیادہ مستند اور واجب الاتباع ہونا چاہئیے۔

(۵) انزل القرآن علی سبعۃ احرف کے مطابق ہر قرآت صحیح ہے مصحف عثمانی بھی غلط ہنیں ہے مگر عہد نبوی کے جمع شدہ کے مقابل عہد عثمانی کے جمع شدہ کی کیا اہمیت ہو سکتی ہے۔

(۶) نقطہ واعراب کا وجود ہی پہلے نہ تھا اس لئے نقطہ و اعراب کا فرق بھی جو اہل کوفہ بیان کریں وہ بعہد نبوی جمع کردہ مصاحف کے مطابق ہے اس لئے مصحف عثمانی سے زیادہ معتبر ہے۔

(۷) مصحف عثمانی حفص کی قرآت کے مطابق ہے اور حفص کی قرآت کوفے کی قرآتوں میں سے ایک کمزور شاخ ہے۔ نہ یہ قاری اہل مدینہ نافع کی قراء ت کے مطابق ہے اور نہ قاری اہل مکہ ابن کثیر کی قراء ت کے مطابق ہے۔ اور نہ بصرہ کے ایک آزاد عرب کی قرآت کے مطابق ہے تو کوفے کے ایک آزاد کردہ غلام عاصم بن بہدلہ کے پروردہ جس پر محدثین کذب و افتراء علی الرسول کا الزام عائد کرتے ہیں اسکی قرآت کے مطابق ہے۔ اس لئے رائج قرآتوں کو چھوڑ کر خواہ مخواہ مرجوع قرآت کیوں اختیار کی جائے؟

ان وجوہ کی بناء پر مسلمانوں کو مصحف عثمانی کو چھوڑ کر مصحف عبداللہ بن مسعودؓ کی قرآت کو اختیار کرنا چاہئیے اور ہر شخص کو لازم ہے کہ روایات کے مطابق سورہ فاتحہ اور معوذتین یعنی آخری دونوں سورہ فلق اور ناس قرآن سے نکال باہر کریں کیونکہ عبداللہ بن مسعودؓ کے قرآن میں یہ تینوں سور قرآن نہ تھے۔ اور فلاں آیت کو یوں بتائیے اور فلاں کو یوں۔ ورنہ وہ عہد نبوی کے جمع کردہ آپ کے تعلیم و پسند کے مطابق جمع کردہ قرآن پر حضرت عثمانؓ کے مرتب کئے ہوئے قرآن پر ترجیح دینے کا گنہگار ہوگا۔

اور پھر فلاں فلاں آیات کو بکری کھا گئی۔ اور فلاں آیت فلاں صحابی کے جنگ یمامہ میں شہید ہو جانے کے باعث اہنیں کے ساتھ وہ بھی شہید ہوگئی۔ چونکہ صرف اہنیں کو یاد تھی وہ سورہ احزاب سورہ بقرہ کے برابر اتری تھی مگر جس قدر ملا لوگوں نے لکھ لیا۔ اس قسم کی روایت شبہاتیہ ومکذوبات ابلیسیہ کو بھی اختلافات قرات کی بحث کے ساتھ ملا لیجئے تو پھر دیکھئے ایمان بالقرآن المجید کی کیا ہئیت کذائی باقی رہتی ہے۔

نقطوں کے وجود کے متعلق ایک اعتراض اور اس کا جواب

اختلافات قرآت کے متعلق میرے مضمون کے مطالعہ کے بعد دو مخلص عزیزوں نے کچھ شبہات لکھ کر بھیجے ہیں۔

پہلے عزیز لکھتے ہیں:۔

" زمانہ نبوی اور دور صحابہؓ کے متعدد مخطوطات دریافت اور دستیاب ہوچکے ہیں۔ جو تاریخی تواتر کی حیثیت سے اس علم

الیقین کے حامل ہیں کہ وہ ان ادوار کے اصل مخطوطات ہیں۔ مثلاً (۱) مکتوب نبوی بنام نجاشی (۲) مکتوب نبوی بنام منذر بن سامری (۳) مکتوب نبوی بنام مقوقس (مصر) ۔ (۴) مکتوب نبوی بنام اہل خیبر۔ (۵) مکتوب حضرت عمرؓ ۔ (۶) مدینہ منورہ کے ایک پہاڑ پر وہ کندہ تحریر جن میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ، حضرت ابوبکر صدیقؓ ، حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ کے اسمائے گرامی ہیں۔ وغیرہ وغیرہ ۔ پھر ابھی حال میں ہمام بن منبہ کا جو مجموعہ حدیث دریافت ہوا ہے ۔ ان کے علاوہ انہیں ادوار کے متعدد مختلف اشخاص و رجال اور قبیلہ وحکومت کے قلمی دستاویزات اور یہ سارے مخطوطات دنیا کے مختلف میوزیم اور لائبریریوں میں محفوظ ہیں اور ان میں سے بہتیرے مختلف مخطوطات کے فوٹو لے کر بطور نمونہ شائع ہوئے ہیں۔ ان میں سے کسی میں بھی نقطے والے حروف پر نقطے موجود نہیں ۔"

اس کے بعد جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ طوالت تحریر سے بچنے کے لئے حسب ذیل ہے۔

(۱) یا تو سب کو جعلی کہا جائے تو اس کو کوئی صاحب عقل سلیم ہرگز تسلیم نہیں کرے گا۔

(۲) سب تحریریں بغیر نقطوں کے لکھی جاتی تھیں۔ مگر قرآن باضابطہ نقطوں کے ساتھ لکھا جاتا تھا۔ تو اس دعوے کے لئے ٹھوس اور وزنی دلیل درکار ہے ۔ محض اعتقادی جذبات سے اپیل یا اشعار جاہلیت کی روشنی میں محض (یقیناً ایسا ہی ہوا ہوگا) کہہ دینے سے تحقیق کا حق ادا نہ

ہوگا۔ جس زمانے میں تحریر و خط کا جو رواج اور طرز ہوگا اسی کے مطابق ساری چیزیں مکتوب ہوں گی۔ چاہے وہ معمولی اور عام مراسلے ہوں یا کوئی اہم دستاویز۔ الخ۔"

میرے دوسرے عزیز مخلص نے یوں لکھا ہے۔

(۱) ابن جنی کے نقل کردہ اشعار اور ابن ندیم کی روایت ایسی دلچسپ خبریں ہیں کہ ہر پڑھنے والا پھڑک اٹھے گا میرے سامنے پہلی بار یہ تحقیق آئی ہے جو دل کو لگتی ہے۔ البتہ پہلے شعر کے دوسرے مصرعے میں ایک چیز کھٹکتی ہے۔ و اذا نقطت عین تذرف کالغین میں تذرف کو نقطت کی رعایت سے ماضی ہی ہونا چاہئیے اور جب یہ ماضی ہے تو تذرفت نہ ہونے کی کوئی معقول وجہ ہونی چاہئیے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ یہ لفظ مضارع تزرف ہے (جو دراصل تتذرف تھا) لیکن اس صورت میں وہ بات نہیں ہوتی جو ماضی میں ہے۔

(۲) ان باتوں کے علاوہ فیصلہ کن جو چیز ہو سکتی ہے وہ یہ ہے کہ قرآن مجید کے بعض قدیم ترین نسخے ہنوز دنیا میں موجود ہیں اگر ان کے ایک ایک صفحے کا بھی عکس فوٹو آجائے تو بات صاف ہو سکتی ہے۔

اس کے بعد مصحف عثمانی فلاں جگہ ہے اور مصحف علی فلاں جگہ۔ اس طرح متعدد مصاحف کی نشان دہی کے بعد لکھا ہے کہ " ان سب کو جعلی کہہ دینا یقیناً قابل تسلیم نہ ہوگا تو اگر

ایک ایک صفحے کا فوٹو بھی مہیا ہوجائے تو اس کا پتہ مل جائے گا کہ اس وقت کے مصاحف پر نقطوں کا دستور تھا یا نہیں۔"

الجواب

سب سے پہلے ہم دوسرے عزیز کے ایک اہم شبہے کا جواب دینا ضروری سمجھتے ہیں جو ابن جنیؒ کے پیش کردہ پہلے شعر کے دوسرے مصرعے کے متعلق ہے اس کے بعد پھر دونوں عزیزوں کا یکجائی جواب دیا جائے گا۔ کیونکہ عزیز اول کا شبہ اور عزیز دوم کا دوسرا شبہ ایک ہی ہے۔

اس مصرعہ میں کتابت کی دو غلطیاں ہوگئی ہیں۔ صحیح یوں ہے و اذا نقصلت عین تذرف کالغین سر مصرعہ پر واو وزن مصرعہ سے فاضل ازروئے زحاف خرم آیا ہے۔ زحاف خرم سے سر مصرعہ پر ایک سے چار حرفوں تک کا اضافہ ہوسکتا ہے۔ جو تقطیع میں حساب نہیں کیا جاتا اور عموماً اس اضافے کو لکھتے بھی نہیں ہیں۔ قرینے سے سمجھ لیتے ہیں اور اس کے مفہوم کے ساتھ مصرعہ کا مفہوم سمجھتے ہیں۔ یک حرفی اضافہ واو یا فے یا لام کا اگر ہو تو لکھتے بھی ہیں۔ مگر بہت کم۔ ابن جنیؒ کے املی میں واو موجود تھا اس لئے میں نے بھی لکھ دیا۔ مگر اذا کا دوسرا الف کتابت میں کاتب سے حذف ہوگیا۔ جس طرح تذرف کی فے پر جو رفع تھا اس کو انہوں نے فتحہ سے بدل دیا۔ اس تصریح کے بعد تو وہ اعتراض باقی نہ رہا؟ شبہے کا باعث تو اذ تھا کہ یہ ماضی ہی پر آتا ہے اور نقصلت ماضی ہے تو شرط کی طرح جزاء کا وقوع بھی زمانہ ماضی ہی میں ہونا چاہئیے۔ اگرچہ یہ کوئی ضروری نہیں ہے۔ مگر مناسب یہی ہے اب جبکہ یہ معلوم ہوگیا کہ یہاں

اذ نہیں ہے بلکہ اذا ہے اور اذا مستقبل ہی پر آتا ہے۔ ماضی پر آتا ہے تو اس کو بھی مستقبل بنا دیتا ہے تو پھر تذرف کا بصیغہ مستقبل جزاء میں آنا ہر طرح صحیح ٹھہرا۔ اور آپ کا شبہ بالکل رفع ہوگیا۔

زحاف خزم سے اہل ادب تو ضرور واقف ہیں۔ مگر جو لوگ صرف مولوی قسم کے ہیں یقیناً ناواقف ہوں گے۔ وہ سبعہ معلقہ کے پہلے قصیدے کی کوئی شرح دیکھ لیں۔ ورنہ لسان العرب جلد ۱۵، لغت خزم صفحہ ۶۷، ۶۸ دیکھ لیں جس میں مثالیں بھی مذکور ہیں۔

مگر اذ ہی رہے جب بھی شعر صحیح و فصیح ہے ۔ سورہ آل عمران کے چھٹے رکوع میں ارشاد ہے ۔ ان مثل عیسیٰ عند الله کمثل آدم خلقه من تراب ثم قال له کن فیکون مولویانہ نقطہ نظر سے تو فیکون کی جگہ فکان کہنا چاہیئے تھا۔ پھر فیکون کیوں کہا گیا؟ لیکن ایک ادیب سمجھ لے گا کہ یہاں مراد فجعل یکون ہے ۔ اسی طرح یہاں بھی تذرف سے مراد جعلت تذرف ہے ۔ اس لئے یہاں بھی ماضی ہی ہے ۔ مگر اس مثال سے ایک مولوی کی تشفی نہ ہوگی۔ کیونکہ اس آیت میں اذ نہیں ہے۔ ایسی مثال ہونی چاہیئے کہ " اذا " نہیں " اذ " آیا ہو ماضی پر اور اسکے بعد مضارع آیا ہو۔ تو لیجئے سورہ احزاب کی گیارہویں آیت دوسرے رکوع میں پڑھئے۔ اذ زاغت الابصار و بلغت القلوب الحناجر و تظنون بالله الظنونا یہاں اذ کے بعد زاغت اور بلغت دو دو صیغے " واحد مؤنث غائب بحث اثبات فعل ماضی معروف " کے ہیں۔ مگر فوراً ہی ان پر عطف ہوتا ہے صیغہ مضارع کا۔ مگر یہاں بھی و جعلتم تظنون مراد ہے۔ اس لئے شعر میں " واذ " ہی پڑھئے جب بھی شعر ہر حیثیت سے صحیح

بلکہ فصیح ہے۔

دوسرا شبہ مخطوطات قدیمہ پر نقطے نہیں نظر آتے، یا قدیم مصاحف پر بھی نقطے نہیں ہیں۔ تو نہ ہوں میں نے یہ کب کہا کہ زمانہ جاہلیت یا آغاز اسلام میں عربی لکھنے والے سب کے سب منقوط حروف پر نقطے ضرور لگاتے تھے۔ یا قرآن مجید کی کتابت کا آغاز جس وقت سے ہوا اسی وقت سے اس کے ہر منقوط حروف پر نقطے ضرور لگائے گئے۔ اگر میرا یہ دعویٰ ہوتا تو بے شک مخطوطات قدیمہ کے فوٹو اور مصاحف قدیمہ کا عکس حاصل کر کے مجھ کو قائل کیا جاسکتا تھا اور "فیصلہ کن اتمام حجت" کا سامان مہیا کیا جاتا۔

مودودی صاحب لکھتے ہیں۔ "یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جس رسم خط میں ابتداء نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے وحی کی کتابت کرائی تھی اور جس میں حضرت ابوبکرؓ نے پہلا مصحف مرتب کرایا تھا، اور حضرت عثمانؓ نے جس کی نقل بعد میں شائع کرائی تھی اس کے اندر نہ صرف یہ کہ اعراب نہ تھے بلکہ نقطے بھی نہ تھے کیونکہ اس وقت تک یہ علامات ایجاد نہیں ہوئی تھیں۔" اسی سلسلے میں تھوڑا آگے چل کر مودودی صاحب لکھتے ہیں۔

"پھر یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ قرآن میں اعراب لگانے کی ضرورت سب سے پہلے بصرے کے گورنر زیاد نے محسوس کی جو ۴۵ھ سے ۵۳ھ تک وہاں کا گورنر رہا تھا۔" اس نے ابوالاسود دوئلی سے فرمائش کی کہ وہ اعراب کے لئے علامات تجویز کریں اور انہوں نے یہ تجویز کیا کہ مفتوح حرف کے اوپر مکسور حرف کے نیچے اور مضموم حرف کے بیچ میں

ایک ایک نقطہ لگا دیا جائے۔

اس کے بعد عبدالملک بن مروان (٦٥ ھ سے ٨٦ ھ) کے عہد حکومت میں حجاج بن یوسف والئ عراق نے دو علماء کو اس کام پر مامور کیا کہ وہ قرآن کے متشابہ حروف میں تمیز کرنے کی کوئی صورت تجویز کریں۔ چنانچہ انہوں نے پہلی مرتبہ عربی زبان کے حروف میں بعض کو منقوط، بعض کو غیر منقوط کرکے اور منقوط کے اوپر یا نیچے ایک سے لے کر تین تک نقطے لگا کر فرق پیدا کر دیا۔ اور ابوالاسود کے طریقے کو بدل کر اعراب کے لئے نقطوں کے بجائے زیر زبر پیش کی وہ حرکات تجویز کیں جو آج مستعمل ہیں۔"

مجھ کو جو اختلاف ہے وہ مودودی صاحب کی خط زدہ عبارت خصوصاً اس میں جو الفاظ چوب خط لکھ دیئے ہیں ان سے ہے۔ مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ عہد خلفائے راشدین تک عربی رسم خط میں نقطوں کا وجود ہی نہ تھا۔ "کیونکہ اس وقت تک یہ علامات ایجاد نہیں ہوئی تھیں۔" ٦٥ھ سے ٨٦ ھ تک کے اندر ان کے نزدیک "پہلی مرتبہ عربی زبان کے حروف میں بعض حروف منقوط بنائے گئے۔" میں کہتا ہوں کہ یہ غلط ہے خلاف عقل ہے کہ عربی رسم خط کئی صدی پہلے ایجاد کیا جائے اور اس رسم خط کے نقطے کئی صدی کے بعد ایجاد کئے جائیں۔ نقطے نہ دینا اور بات ہے اور نقطے نہ ہونا اور بات ہے۔ اس لئے مخطوطات قدیمہ کے فوٹو وغیرہ کا ذکر کرکے اور مصاحف قدیمہ کے کم سے کم ایک صفحے کا عکس منگوانے کی فرمائش کرکے اصل بحث کو یا تو غتربود قصداً کیا جاتا ہے یا اصل بحث کو چونکہ سمجھا ہی نہیں ہے اس لئے اس طرح کی باتیں نادانستہ کی جارہی ہیں

جن سے اصل بحث نظروں سے اوجھل ہوجائے۔

نقطے بعض قدیم مصاحف پر بھی ہیں مگر اس کا کیا جواب ہے کہ کوئی کہہ دے یا لکھ دے کہ یہ نقطے بعد کو کسی نے لگا دیئے ہیں اور ایسا کہنے والے یا لکھنے والے اسی شہرت کی بناء پر کہتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ پہلے تو عربی رسم خط میں نقطے کا وجود ہی نہ تھا۔ ۶۵ ھ سے ۸۶ ھ کے اندر تو نقطے ایجاد ہوئے ہیں اس لئے اس سے پہلے کے لکھے ہوئے مصاحف پر اگر نقطے ہیں تو وہ یقیناً بعد کو کسی نے لگا دیئے ہیں۔ اس لئے اب کوئی شخص مخطوطات قدیمہ عربیہ کے فوٹو یا مصاحف قدیمہ کے فوٹو کا ذکر چھیڑ کر دوسروں کو دھوکا دینے کی کوشش نہ کرے۔

ایک قرین عقل بات یہ بخوبی ممکن ہے کہ اعراب کے لئے بھی پہلے نقطے ہی ہوں۔ مگر رنگین نقطے۔ تاکہ حروف منقوطہ کے نقطوں سے ممتاز رہیں مگر اس میں دشواری تھی کہ لکھنے کے وقت کئی رنگ کی روشنائی رکھنے کی ضرورت کاتب کو پڑتی تھی۔ اس لئے بعد کو اعراب کیلئے رنگین نقطوں کی جگہ وہ شکل اختیار کی گئی جو آج تک مستعمل ہے۔

نقطوں کی بحث ایک دھوکا ہے (۱) جب مودودی صاحب کو خود اعتراف ہے کہ قرآن مجید کی تعلیم عہد نبوی میں زبانی تلقین کے ذریعے ہوا کرتی تھی۔ صحابہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سن سن کر قرآن کی سور وآیات یاد کرتے تھے۔ آپ سے نمازوں میں برابر قرآن سنا کرتے تھے۔ تو پھر مصاحف میں حروف پر نقطے ہوئے تو کیا اور نہ ہوئے تو کیا۔ لعلموں اگر صرف لکھا ہوا ہو تو کوئی اس کو یعلمون پڑھے اور دوسرا

تعلمون پڑھے یہ ممکن ہے مگر جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صحابہ نے یعلمون ہی سنا ہے یائے تحتانیہ سے تو کوئی اس کو تعلمون تائے فوقانیہ سے کیوں پڑھنے لگا؟ مصحف میں نقطے نہ ہونے کے سبب سے صحابہؓ نے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا اور بار بار سنا تھا وہ کس طرح مشتبہ ہوسکتا ہے۔ اگر بالفرض ان میں کوئی شخص ضعیف الحافظ ہو اور اس کو یاد نہ رہا ہو کہ **ھو خیر مما یجمعون** میں **یجمعون** ہے یا **تجمعون** ۔ تو وہ جب کبھی کسی دوسرے کے سامنے تجمعون پڑھے گا وہ ضرور اس کو لقمہ دے گا اور اس کی تصحیح کردے گا۔ اگر وہ ضعیف الحافظہ کسی ایک کی تصحیح کو تسلیم نہ کرے گا تو وہ مصحح دو چار بلکہ دس بیس دوسرے لوگوں سے پچھواکر اس کی تشفی کردے گا۔ اس لئے ممکن ہی نہیں ہے کہ مصاحف میں نقطے نہ ہونے کے سبب سے صحابہؓ میں کبھی قرآت کا اختلاف ہوا ہو اور جب صحابہ میں اختلاف نہ ہوا تو صحابہؓ کے شاگردوں میں بھی اختلاف قرآت ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہوسکتی۔

ہاں چند لوگوں نے قرآن مجید نہ کسی صحابی سے پڑھا نہ کسی تابعی سے۔ بطور خود کسی غیر منقول اور بغیر اعراب والے مصحف میں وہ پڑھنے لگے۔ تو ضرور ان لوگوں کے پڑھنے میں بعض جگہ اختلاف ہوگا۔ مگر ان مختلف فیہ الفاظ میں سے وہی ایک لفظ صحیح ہوگا جو جماعت نہ کسی صحابی سے قرآن مجید پڑھا نہ کسی تابعی سے ان کی من گھڑت قرآتوں کا اعتبار ہی کوئی مسلمان کیوں کرنے لگا؟

غرض جب تعلیم القرآن کا اصل دارومدار زبانی تلقیٰ پر عہد نبوی وعہد صحابہ وعہد تابعین واتباع تابعین تک برابر رہا تو مصاحف کے منقوط و

غیر منقوط ہونے کا ذکر ہی محض دھوکا دینے اور ذہنوں کو منتشر کرنے کے لئے کیا جاتا ہے۔ امید ہے کہ آئندہ سے اختلاف قرآت کے اسباب بیان کرنے میں مصاحف قدیمہ کے منقوط و غیر منقوط ہونے کا کبھی ذکر نہ کیا جائے گا اور اس کا ذکر چھیڑنے والوں کے فریب میں کم سے کم ہمارے ناظرین کبھی نہ آئیں گے۔

و السلام علی من اتبع الھدیٰ

اختلافات قرآت کا پس منظر۔ تاریخ اور ماخذ

از جناب رحمت اللہ طارق فاضل حدیث مکہ مکرمہ

مودودی صاحب نے اپنی تفسیر اور دیگر تصانیف میں متعدد مقامات پر اختلاف قرأت کو ثابت کیا ہے اور اس نظریے کے مخالفین پر ایک گونہ طنز کیاہے۔ حال ہی میں انہوں نے (جون ۱۹۵۹ء کے ترجمان القرآن میں) اسی موضوع پر اپنے خیالات کو یکجا کرکے جامع صورت میں پیش کیاہے اور گویا اپنے موقف کو واضح صورت دے دی ہے۔

یوں تو مودودی صاحب کے علمی مقام سے سب آگاہ ہیں لیکن مذکورہ مقالہ میں انہوں نے جو انداز بیان اختیار کیا ہے اور اپنے موقف کو ثابت کرنے کے لئے جو طرز استدلال منتخب فرمایاہے اس سے وہ کسی بھی حق کی جستجو رکھنے والے کو مطمئن ہنیں کرسکے۔جہاں تک اس مسئلے میں شکوک وشبہات پیدا ہونے کا تعلق ہے وہ تو اس مقالے سے پہلے بھی موجودتھے۔کیونکہ جو بات عصمت قرآن کے قطعاً منافی ہو اس بات کو تسلیم کرلینے میں ہر اس سلیم العقل آدمی کو پس وپیش ہوگا جو قرآن کی ازلی وابدی صداقت اور پھر حفاظت و عصمت پر یقین رکھتاہے اور جس کا ایمان ہو کہ قرآن جس طرح سے "رسول عربی" پر نازل ہوا تھا بعینہٖ اسی طرح اب ہمارے پاس موجود ہے اس کے مطالب میں کوئی تبدیلی تو کیا ہوتی ہے اس کے فقروں، الفاظ اور حرکات کی ترتیب بھی وہی ہے کیونکہ اگر ہم ایسا تسلیم نہ کریں تو قرآن کے بہت سے دعوؤں کی تکذیب لازم آتی ہے۔

لو کان من عند غیراللہ لوجدوا فیہ اختلافاً کثیراً ○
(القرآن) ۴ : ۸۲

یعنی قرآن اگر غیراللہ کا کلام ہوتا تو اس میں بہت سا اختلاف پایا جاتا۔

ظاہر ہے کہ اس " اختلاف " میں صرف مطالب ومفاہم کا اختلاف ہی نہیں بلکہ الفاظ وقرآت کا اختلاف بھی شامل ہے۔اس قرآنی دعویٰ کی روشنی میں تو صرف یہی کہا جاسکتا ہے کہ قرآن اگر مفہوم کے اختلاف وتضاد سے پاک ہے تو قرآتوں کے اختلاف سے بھی پاک ہے۔ اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے خود اس کتاب کی حفاظت کا اعلان کیا ہے۔ انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون ○ (۱۵ : ۹)

اگر اس عظیم الشان دعویٰ کے باوجود بھی قرآن میں قرآتوں کے اختلاف کو تسلیم کرلیا جاتا ہے تو پھر آخر قرآن کی صداقت کا معیار کیا رہ جاتا ہے؟

اس سلسلے میں ہمارے علماء کی مساعی یہی ہیں اور انہوں نے اپنا فرض اسی کو گردانا ہے کہ زیادہ سے زیادہ دلائل سے اس خیال کی توثیق کی جائے۔ راقم السطور نے زمانہ طالب علمی میں اس خیال کے بارے میں عدم اطمینان کا اظہار کیا تو اساتذہ نے یہ کہہ کر چپ کرادیا کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں آپ ہی کے فرمان کے مطابق آیات قرآن کو مختلف الفاظ اور قرآتوں سے تلاوت کیا جاتا تھا۔ (ملاحظہ ہو طبری جلد اول صفحہ ۱۵ النشر فی القرآت العشر جلد ۱ صفحہ ۱۹ طبع مصر۔ تاویل مشکل القرآن ابن قتیبہ صفحہ ۲۶ طبع مصر)

راقم کے مشرق وسطیٰ کے سفر کے محرکات میں ایک یہ بھی تھا کہ اس خیال (اختلاف قرأت) کی اصل کا کھوج لگایا جائے۔ میرے ناتواں شانوں پر بیت اللہ کی قدیم لائبریری اور د ت کے کتب خانہ "ظاہریہ" کا بہت بڑا احسان ہے کہ ان عظیم علمی ذخیروں نے ایک حق وصداقت کی تلاش کرنے والے کی صحیح راہنمائی کی۔ بالاخر اس صداقت نے ظہور کیا کہ اختلاف قرأت کے افسانوں کے پیچھے بہت سارے تاریخی عوامل کار فرما ہیں اور آگے چل کر انہی عوامل نے تمام علوم قرآنی کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

تاریخ نے نظریات وشخصیات کے ساتھ ہمیشہ یہ بے انصافی روا رکھی ہے کہ مصنوعی اور وضعی خیالات وعقائد کی رنگ آمیزیوں سے اصل حقیقت کو عوام الناس کی نگاہوں سے چھپادیا ہے۔ خلفائے ثلاثہ کے بعد اسلام کی تاریخ میں جس فکری اور عملی انتشار کا سراغ ملتا ہے اس کے پس منظر میں بہت سے ایسے ہاتھ کارفرما تھے جن کی نشاندہی واضح طور پر نہیں کی جاسکتی۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ خاندان نبوت سے متعلقہ لوگ نسل پرستی کے زیر اثر اپنے تئیں خلافت کا زیادہ حقدار سمجھتے تھے لیکن وقتی موانعات اس راہ میں رکاوٹ بن گئے۔ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کی آویزش میں اس تحت الشعوری خیال نے واضح اور شعوری حیثیت اختیار کرلی ۔ چنانچہ تاریخ کے اسی موڑ پر پہنچ کر عامہ المسلمین کے ایک حصے نے اسلام کے بنیادی عقائد میں "خلافت" کو بھی لازمی عنصر قرار دے دیا اس گروہ کا خیال تھا کہ خلافت جیسے اہم معاملے کو امت کی صوابدید پر نہیں چھوڑا جاسکتا اور خلافت نہ صرف منصوص بلکہ

ورثے کی بنیاد پر ہونی چاہئیے۔ بناء علیٰ ہذا مسلمانوں کے اس گروہ نے علیؓ کو وصی رسولؐ گردانا اور اس نظریے کو فروغ دیا کہ جس طرح رسولؐ مامور من اللہ ہے اسی طرح اس کا جانشین بھی کم از کم مامور من الرسولؐ ہونا چاہئیے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ غیر فطری خیال کچھ عرصے کے بعد دب جاتا کیونکہ خلافت رسول اللہ کے خاندان میں ہو یا اس سے باہر مسلمانوں کے سواد اعظم نے کسی وقت بھی اسے جزو ایمان قرار نہیں دیا لیکن جب خلافت مکمل طور پر بنو امیہ کے سپرد ہوگئی اور اسلامی حکومت کی بنیادیں مضبوط ہونے لگیں تو ان عناصر نے جو وقتی طور پر حالات سے شکست کھا گئے تھے خلافت کے نظریے کو ایک سیاسی حربے کے طور پر استعمال کرنا شروع کردیا اور ایسا کرنا ان کا فطری حق تھا کیونکہ سیاسی اقتدار سے محرومی ایک ایسا زخم تھا جس کا مداوا کسی طرح نہیں ہوسکتا تھا اب اقتدار کی دوسری راہیں کھلی نہ دیکھ کر اس گروہ نے افکار کی دنیا پر شب خون مارا۔ عقائد میں تصرف ہوا تو عقائد کی تفسیر وتعبیر میں بھی تصرف ہونا لازمی تھا۔ چنانچہ عقائد کی ترجمانی کے ضمن میں اس گروہ نے اسلامی نصاب تعلیم میں ایسی غیر عقلی تبدیلیاں کیں کہ الامان والحفیظ ۔۔ اور پھر یہ ایک حقیقت ہے کہ احوال وظروف کا دھارا ہمیشہ یک رخا نہیں بہتا مگر لٹریچر وہ زندہ وپائندہ شے ہے جسے کوئی مٹا نہیں سکتا۔

قرآن کی جمع وتدوین کا عظیم کام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک ہاتھوں تکمیل پذیر ہوچکا تھا (اتقان صفحہ ۱۴۵ طبع مصر) دین مکمل ہوچکا تھا۔ کتاب مدون ہوچکی تھی۔ سورتوں کی ترتیب، آیات کے محل وقوع، زیر، زبر وغیرہ سیدالبشر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے

مبارک عہد میں خود آپ کی نگرانی میں حیطہ تحریر میں لائے جا چکے تھے
(اتقان صفحہ ۱۴۴ -- ۱۴۸) اختلاف کے رخنے ڈالنے کی سب راہیں مسدود
ہو چکی تھیں۔ قرآن کو الہی الواح میں "محفوظ" کے امتیازی لقب سے
موسوم کیا جا چکا تھا (بروج ۲۲) اب بجز اس کے کہ تعبیر کا ایک ایسا
متوازی نظام قائم کر دیا جائے جو فی نفسہ متضاد اور متناقض ہو۔ مقصود
یہ کہ تعبیر اور تفسیر کا تضاد اصل حقیقت کو مشکوک کر دے۔ چنانچہ اس
سلسلے میں جہاں اور بہت سے اقدام کئے گئے وہاں قرآن سے بھی صرف نظر
نہیں کیا گیا کہ درحقیقت اسلام کی اصلی قرآن ہی ہے۔

قرآن کے بارے میں اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ اس
میں سادہ ترین زبان میں سادہ ترین حقائق اور صداقتوں کا بیان ہے۔
اہل زبان اظہار مافی الضمیر کے لئے جس اسلوب بیان، جس طرز نگارش،
جس ایجاز واختصار، اشارہ وکنایہ، ندرت بیان، صنائع وبدائع لفظی
ومعنوی اور ضرب الامثال اور جس طریق فہمائش اور انداز تخاطب کو
اختیار کر سکتے ہیں۔ قرآن مجید نے بھی الہامی مطالب کو ذہن نشین کرانے
کے لئے ان تمام اصناف سخن کا التزام کیا ہے یہی وجہ ہے کہ عقائد سے
قطع نظر کرتے ہوئے قرآن کو ادب عالیہ میں سب سے بلند مقام دینے پر
تقریباً تمام اہل ادیان متفق ہیں۔ اس کا اسلوب بیان سادہ لیکن دل
نشین ہے۔ فقرے مختصر لیکن مطالب پر حاوی۔ پیرا ہائے بیان مختلف
لیکن ترجمانی حقیقت واحدہ کی، صداقت وہدایت کے تمام اصولوں کا منبع
انسانیت کے بنیادی قوانین کا سرچشمہ لسانیات میں لفظی تراکیب اور
اصول انشا کا ماخذ۔ بقول کسے

جمیع العلم فی القرآن لکن
تقاصر عنه افهام الرجال

"یعنی تمام علوم کا سرچشمہ تو قرآن ہی ہے یہ ہمارے شعور اور ادراک کی نارسائی ہے کہ ہم ان تک نہیں پہنچ سکتے۔"

بہرحال یہ ایک حقیقت ہے کہ قرآن میں حقیقی ومجازی الفاظ سے لے کر متشابہ و محکم قسم کے کلمات یعنی انشاء وادب کے تمام مدارج کا خیال رکھا گیا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید کے انہیں اوصاف کو آڑ بناکر طبع زاد تعبیرات وتفسیر کا ایک نظام قائم کیا گیا ہے اور خدمت قرآن کے نام پر بے شمار علوم قرآنی کا سلسلہ وجود پذیر ہوگیا اور علوم قرآنی کو ذیل کے اصناف میں تقسیم کیا گیا۔ لغات القرآن، تفسیر القرآن، اعراب القرآن، بدائع القرآن، نوادر القرآن، قصص القرآن، اسرار القرآن، احکام القرآن خواص القرآن، امثال القرآن، متشابہ القرآن، اور مجاز القرآن وغیرہ وغیرہ۔ سیوطی (متوفی ۱۵۰۵م) نے ایسے علوم کے اسی انواع شمار کئے ہیں۔ قرآن کی ترجمانی کا یہ سارا کام بہت ہی مستحسن اور قابل عزت ولائق صد تکریم ہے لیکن جب ہم تاریخی حقائق کی روشنی میں اصل محرکات کا کھوج لگاتے ہیں تو حقیقت کچھ اور ہی معلوم ہوتی ہے۔ اس لئے سیاسی مصلحتیں اس سارے عمل میں پس منظر کا کام کررہی تھیں۔ ان سے صرف نظر نہیں کیا جاسکتا اس کا مطلب یہ نہیں کہ مسلمانوں کو یہ مشورہ دیا جارہا ہے کہ سرے سے ہی علوم قرآنی سے مستغنیٰ و بدظن ہوجائیں۔ مقصود گفتگو یہ ثابت کرنا ہے کہ علوم قرآن اور اختلاف قرأت کے نظریے کا انحصار جن جن روایات پر ہے ان سب کے راوی یا ان

سے استناد کرنے والے اسی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جن کی سیاسی محرومیاں ان کو ہر وقت طالع آزمائی پر مجبور کرتی رہتی تھیں۔ یہاں اس بات کا ذکر کردینا بھی نامناسب نہیں کہ اس گفتگو میں روئے سخن کسی خاص گروپ یا فرقے کی طرف نہیں بلکہ اس سے مقصود چند حقائق کا برملا اظہار ہے۔ ان علوم کے اولین مصنفوں یا ان سیاسی نامرادوں کے افکار و نظریات نے آگے چل کر ہمارے پورے اسلامی اور تفسیری ڈھانچے کو اس قدر مفلوج کردیا کہ بعد میں آنے والے بڑے سے بڑے علماء بھی اس غلط فہمی کا شکار ہوگئے کہ ہو نہ ہو ان افکار ونظریات کی ضرور کوئی بنیاد ہوگی۔ مثلاً اختلاف قرأت کا فتنہ ہی لے لیجئیے جس کا مودودی صاحب جیسا شخص نہ صرف معترف اور معتقد ہے بلکہ سرگرم مبلغ اور پرجوش ناشر بھی ہے۔ اختلاف قرأت کے جواز میں مودودی صاحب وضاحت فرماتے ہیں کہ۔

" مختلف قرآتوں کو رد یا قبول کرنے کے لئے اہل فن کے درمیان جن شرائط پر قریب قریب مکمل اتفاق پایا جاتا ہے وہ یہ ہیں ۔ اول یہ کہ جو قرآت بھی ہو وہ مصحف عثمانی کے رسم الخط سے مطابق رکھتی ہو اس رسم الخط میں جس قرأت کی گنجائش نہ ہو وہ کسی حال میں قبول نہیں کی جائے گی مثلاً مصحف عثمانی میں اگر ایک لفظ " بعد " لکھا گیا ہے تو اس کی قرأت بَعُدَ اور بَعَّدَ تو قبول کی جاسکتی ہے مگر بعدت قبول نہیں کی جاسکتی۔ دوم یہ کہ یہ قرأت ایسی ہو جو لغت ، محاورے اور قواعد زبان کے خلاف نہ ہو اور عبارت کے سیاق وسباق سے مناسبت رکھتی ہو۔

(ترجمان القرآن جونؔ ۱۹۵۹ء صفحہ ۵۱)

مودودی صاحب کا ارشاد کسی وضاحت کا محتاج نہیں یعنی آپ فرما رہے ہیں کہ کسی قرأت کے صحیح ہونے کے لئے عثمانی رسم الخط سے مطابقت ضروری ہے۔ اس سے صیغہ امر کا بن جائے تو اور ماضی کے مفہوم میں تبدیل ہو جائے تو کوئی حرج نہیں ہے۔ مثلاً بٰعِدْ کا لفظ جو خاص انشا اور امر کے لئے قرآن مجید میں واقع ہوا ہے اسے اگر بَعَّدَ پڑھ کر انشاء سے خبر میں اور امر سے ماضی میں تبدیل کردیا جائے تو اصول اول کے لحاظ سے مودودی صاحب کے نزدیک قرآن ہی ٹھہرے گا۔ حالانکہ یہ بدیہی بات ہے کہ امر اور ماضی اپنے اپنے مدلول اور مفہوم کے بلحاظ قطعاً مختلف اور متضاد ہیں۔ پھر تعجب ہے کہ بَعَّدَ کی قرأت جسے مودودی صاحب مشہور اور متواتر قرار دے رہے ہیں۔ متقدمین نے اسے غیر مشہور اور غیر متواتر بلکہ خود ساختہ یا شاذ قرار دیا ہے۔ (ملاحظہ ہو القرأت الشاذۃ صفحہ ۱۲۱ طبع مصر، تفسیر بحر المحیط جلد ہفتم صفحہ ۲۷۳)

اب اصول دوم ملاحظہ ہو جس سے مترشح ہوتا ہے کہ لغت، محاورے اور عبارت کے سیاق وسباق سے اگر مناسبت پائی جائے تو وہاں بھی قرأت میں اختلاف جائز ہے مثلاً اگر الحمد للہ رب العالمین (باء کی زیر کے ساتھ پڑھنے کی بجائے) باء کی زبر کے ساتھ پڑھا جائے تو کوئی باک نہیں کیونکہ اصول دوم کے مشمولات کے عین مطابق ہے اور رسم الخط میں متجانست (ہم جنسی) مستزاد۔ یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ مختلف قرأتیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم فرمائی تھیں یا قاریوں کی دست اندازی سے وجود پذیر ہوئیں؟ اس کے جواب میں مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ " فی الواقع حضور ہی نے بعض الفاظ

مختلف طریقوں سے پڑھے اور پڑھائے ہیں اور ان مختلف قراتوں میں درحقیقت تضاد نہیں ہے بلکہ غور کرنے سے ان میں بڑی گہری معنوی مناسبت اور افادیت پائی جاتی ہے۔" (ترجمان القرآن جون ۱۹۵۹ء صفحہ ۵۲ سطر ۷ تا ۹)

لیکن یہ فرمایا جائے کہ اس بے بنیاد مفروضہ کے بعد یہ فیصلہ کیونکر ہوگا کہ جو قرآن ہمارے پاس موجود ہے وہ من وعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دیا ہوا ہے۔۔۔؟ اب آپ گہری مناسبت اور عدم تضاد کا نمونہ ملاحظہ فرمالیں۔

(۱) او یکون لک بیت من زخرف (اسرآء ۹۳) کو بیت من ذھب (قرآت مجاہد مکی متوفی ۱۰۲م، طبری جلد دہم صفحہ ۱۰۲)

(۲) بیضآء لذۃ للشاربین (صافات ۴۶) کو صفرآء لذۃ للشاربین (۳) ان الیاس لمن المرسلین (صافات ۱۲۳) اور وسلام علی الیاسین (صافات ۱۳۰) کو ان ادراس لمن المرسلین - اور - ادریس لمن المرسلین - وسلام علی ادریسین (طبری جلد ۲۳ صفحہ ۳۱، ۵۶، احیاء غزالی جلد ۱ صفحہ ۲۷۶)

اب مودودی صاحب فرمائیں کہ بیضآء (سفید) اور صفرآء (پیلے) میں کیا معنوی مناسبت ہے؟ اور الیاس اور ادریس میں عدم تضاد کی کون سی نوع ہے؟ مودودی صاحب طے شدہ مفہوم کی عقلی دلائل سے پشتیبانی کرتے ہوئے یہ ذہن نشین فرمانا چاہتے ہیں کہ "عقل بھی کہتی ہے کہ جبرئیل نے (مالک اور ملک یوم الدین) دونوں قرآتوں کے ساتھ یہ لفظ

حضور کو سکھایا ہوگا (ہوگا قابل غور ہے) اور حضور اس لفظ کو کبھی ایک طرح اور کبھی دوسری طرح پڑھتے ہوں گے۔ (ہوں گے ملاحظہ ہو) "
(سطر ۱۵ تا ۱۷)

یعنی اس طرح مودودی صاحب یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جبرئیل اور حضرت باری تعالیٰ نے ان متضاد المفہوم قرآتوں کا خود ہی حکم دیا ہوا ہے لیکن جب حقیقت الامر اسی طرح تھی تو پھر ہوگا اور ہوں گے کے فرضی اور قیاسی الفاظ سے اتنے عظیم نظریے کو تقویت پہنچانا اہل علم کو زیب نہیں دیتا۔ اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ آنجناب ابھی تک اس معاملے میں ظن و تخمین کی وادی کی سیاحت فرما رہے ہیں۔ بہرحال حضرت ہم آپ کو کس طرح باور کرائیں کہ "اجماع امت" اور "خبر متواتر" کا سہارا ہمیشہ انہی لوگوں نے لیا ہے جن کے علم وبصیرت میں گہرائی نہیں تھی اور جن پر اپنے استدلال کی خامیاں واضح اور استنباط کی کمزوریاں عیاں تھیں اور جن کا یقین تھا کہ ایسے حضرات اجماع امت اور خبر متواتر کا اسراف کئے بغیر اپنا مطلب نہیں نکال سکتے۔ اجماع امت میں دین بننے کی صلاحیت ہے؟ یہ کہیں واقع ہوا بھی ہے؟ کتنے مسائل ہیں جن پر حقیقی اجماع ہوا ہے؟ فرد واحد کے اختلاف سے اجماع کی پوزیشن کیا رہ جاتی ہے ؟ یہ اور اس قسم کے دیگر سوالات کو حل کئے بغیر اجماع امت کا بے جا استعمال علمی دنیا میں کوئی وقعت نہیں رکھتا۔ مشورۃً عرض کروں گا کہ اجماع امت کے ضمن میں قاضی شوکانی کی شہرہ آفاق کتاب ارشاد الفحول صفحہ ۶۳ تا ۸۰ ۔ ملاحظہ فرمائے گا۔

اسی طرح قرآن کے باہر خبر متواتر کا وجود قلیل ونادر ہے اس کا سہارا لینا یا تواتر کے ایسے معنی کرنا جس سے سلف صالحین آشنا نہیں تھے سراسر مہذب دھولس ہے۔ ہم مانتے ہیں کہ مالک اور ملک کی طرح ارجلکم کی دوسری قرأت بھی متواتر ہے کیونکہ آپ کا ارشاد ایسا ہے اور آپ کا ارشاد بجا! لیکن بخدا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی طرف سے کسی بھی آیت کریمہ کے الفاظ کو دو یا دو سے زائد قرآتوں سے نہ تو تلاوت فرمایا ہے اور نہ ہی ایک ہی لفظ کے ایک ہی مقام پر دو متضاد مفہوم متعین فرمائے ہیں۔ اس نبی اکبر واعظم اس ذات اقدس واکرم کی طرف ایسی بات کی نسبت کرنا وہ جسارت ہے جس کا ارتکاب ایک مؤمن صادق کے لئے ہرگز مناسب نہیں ہے۔

ہاں تو آپ فرما رہے تھے کہ ارجلکم (لام کے زبر۔ فتحہ) اور ارجلکم لام کی زیر کسرہ) کے ساتھ دونوں متواتر اور مشہور قرأتیں ہیں اور ان کے مفہوم میں کوئی تضاد نہیں ہے یعنی بقول آپ کے بے وضو آدمی کو وضو کرنا ہو تو اسے پاؤں دھونا چاہئیے باوضو اگر تجدید وضو کرے تو وہ صرف مسح پر اکتفا کرے۔ (ترجمان صفحہ ۵۳ سطر ۳) کاش۔ یہی نکتہ اگر سنی حضرات کے دماغ میں آجاتا اور یہی توجیہ شیعہ اخوان کو سوجھتی جو آپ پر منکشف ہوئی تو یقیناً تیرہ سو سال کا جھگڑا کبھی کا نپٹ گیا ہوتا۔

مودودی صاحب آپ تو فروری ۵۹ء کے ترجمان القرآن میں اپنی اس تحقیق کے برعکس فرما چکے ہیں کہ "پاؤں کا دھونا ہی صحیح ہے کیونکہ احادیث اور عقل اسی خیال کے مؤید ہے اور جو صحابہؓ ارجلکم (لام مکسور کی متواتر قرأت کے مطابق صرف مسح کرتے تھے ان کی یہ اپنی رائے تھی

(ترجمان فروری صفحہ ۵۲ سطر ۲۰)

سوال یہ ہے کہ جب ایک قرأت متواتر ہے تو اس کا علم صرف دو تین صحابہ تک کیوں محدود رہا؟ اور پھر جب وہ ایک متواتر قرأت سے پاؤں کا مسح کرنا ہی اخذ کر رہے ہیں تو انہیں تنہا اپنی رائے کا متبع کیونکر کہا جارہا ہے؟ کھلی ہوئی بات ہے کہ مودودی صاحب اختلاف قرأت میں معنوی مناسبت اور گہرے ربط کے قائل ہیں۔ خاص کر زبر، زیر اور الفاظ کے اختلاف کو آپ چنداں مضر خیال نہیں فرماتے مثلاً اهدنا صراط المستقیم اور ارشدنا الصراط المستقیم میں یا اذا ضربتم فی سبیل فتبینوا اور فتثبتوا۔ یا بل عجبت۔ (تا پر زیر) اور عجبت (تا پر پیش) میں۔ آپ کے نزدیک کوئی فرق نہیں ہے۔ حالانکہ قرآن نے جب فرمایا ہے کہ یہاں فتبینوا (نساء ۹۴) ہے تو حمزہ کسائی خلف، حسن اور اعمش قاری کو کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ اسے بدل کر فتثبتوا بنادیں؟ کتاب الدیانات ابو عاصم النبیل متوفی ۹۰۶ م صفحہ ۱۴، ۱۵ طبع قاہرہ ۱۳۲۳ھ)

اب ہم بتائیں گے کہ اختلافات قرآت کے موضوع پر سب سے پہلے کس نے لکھا؟ کیونکہ اس کے بغیر ہمارا یہ دعویٰ بے دلیل رہ جائے گا کہ سیاسی محروموں نے تعبیر کا ایک ایسا متوازی نظام قائم کردیا جس نے اصل حقیقت کو مشکوک کرکے اسلام اور قرآن کا ڈھانچا ہی تبدیل کردیا۔

اختلافات قرأت کا پہلا مصنف

مشہور ہے کہ اس موضوع پر سب سے پہلے ابوعبیدہ قاسم بن سلام (متوفی ۸۳۱ م) نے "کتاب القرآت" کے نام سے ایک تصنیف یادگار

چھوڑی ہے۔ لیکن تاریخی شواہد اور مستند لٹریچر کے مطالعہ سے واضح ہوجاتا ہے کہ اس عنوان اور موضوع پر سب سے پہلے شیعی محدث ابان بن تغلب (متوفی ۷۵۸ م) نے ابو عبیدہ سے ستر اسی سال پہلے لکھا اور پھر یکے بعد دیگرے ذیل کے شیعہ اہل علم نے اس موضوع پر طبع آزمائی کی۔ (۱) سعد بن ابو جعفر بن محمد بن سعدان عرف ضریر (متوفی ۸۴۵ م) (۲) محمد بن حسن ابن ابی سارہ عرف ابو جعفر رواسی کوفی (۷۹۶ م) استاذ فراد کسائی اور یہ معلوم ہے کہ رواسی کا طریقہ قرأت بھی مستقل ہی تھا۔ان کےعلاوہ (۳) حمزہ بن حبیب زیات کوفی شیعی نے بھی کتاب القرأت نامی کتاب لکھی ہے جس کا ابھی ابھی تعارف عرض کروں گا۔

ان شواہد سے معلوم ہوا کہ تضاد قرأت کے عنوان اور موضوع پر قرون اولیٰ میں صرف شیعہ اہل علم ہی نے لکھا اور دوسرے لفظوں میں قرآنی تسوید وتوفیق کے وہی مجاز کل تھے۔

حمزہ زیات

مودودی صاحب قرآن کے ضمن میں جس سند کو قابل اعتماد سمجھتے ہیں وہ آپ کے نزدیک وہی ہے جس میں حمزہ بن حبیب زیات واقع ہے بلکہ آپ ابن زیات کے سلسلہ سند کو خاص فرماکر تحریر فرماتے ہیں کہ حمزہ عن الاعمش، عن یحییٰ بن وثاب، عن زر بن جیش، عن علی وعثمان وابن مسعود (ترجمان جون ۵۹ ء صفحہ ۵۰ سطر ۵، ۶)

اب اس خاص سلسلہ سند کا حال بھی سن لیجئیے۔

(۱) حمزہ بن حبیب زیات (متوفی ۷۷۳ م) بہ تحقیق علامہ طوسی شیعی

(متوفی ۱۰۶۸م) خالص شیعہ تھے۔ امام ازری، امام ساجی، یزید بن ہارون عبدالرحمن بن مہدی، امام احمد بن حنبل ، سلیمان بن ابی شیخ اور احمد بن سنان جیسے ائمہ رجال کو حمزہ مذکور کی قرآتوں پر سخت اعتراضات تھے اور لوگوں کو اس کے قرآن سے بچنے کی تلقین کرتے اور کہتے تھے کہ اس کی قرأت لغو ہے۔ امام ابوبکر بن عیاش ، حماد بن زید اور یزید بن ہارون اس کی قرأت کو قواعد عرب کے خلاف جانتے اور اس کے مطابق قرأت کرنا بدعت سمجھتے اور لوگوں کو اس کی اقتداء میں ادا کردہ نمازوں کے اعادہ کا حکم دیتے تھے۔ (ملاحظہ ہو میزان الاعتدال وغیرہ) اتنی واضح جرح کی موجودگی میں بھی مودودی صاحب اگر قرآن کے معاملہ میں حمزہ کو امین سمجھتے ہیں تو یہ آپ کی ایسی خوش فہمی ہے جس کا ہم گنہگار کوئی جواز مہیا نہیں کرسکتے۔

(۲) سند کے دوسرے خاص راوی سلیمان بن مہران عرف (اعمش اسدی متوفی ۷۶۴م) کوفی بڑے پائے کے محدث اور عالم تھے لیکن تمام اوصاف حسنہ کے باوجود محدثین نے اسے فاسد یا ھالک فی الحدیث (حدیث کو تباہ وبرباد کرنے والا) یعنی دبے الفاظ میں کذاب کا سرٹیفکیٹ عطا کیا ہے علاوہ یہ بڑے راسخ العقیدہ شیعہ بھی تھے ملاحظہ ہو کتاب المعارف ابن قتیبہ صفحہ ۲۰۶ طبع مصر یا تنقیح المقال علامہ مامقامنی جلد دوم صفحہ ۶۵ تا ۶۶ طبع نجف سائز کلاں) جب وہ حدیث میں کذاب تھے تو اس کے ذریعہ جو قرآن ہمارے پاس پہنچا وہ یقیناً ایک خاص سند ہی کا معجزہ ہے۔

(۳) سند کے تیسرے راوی یحییٰ بن وثاب اسدی کوفی متوفی (۷۲۰

م) کوفہ کے محلہ بنی اسد کے کبار شیعہ میں سے تھے (ملاحظہ ہو کتاب المعارف صفحہ ۲۳۰، لقد رجال علامہ تفرشی مطبوعہ طہران صفحہ ۳۷۶ تنقیح المقابل جلد سوم صفحہ ۳۲۲)

(۴) سند کے چوتھے خاص راوی امام زر بن جیش ابوالمریم اسدی کوفی (متوفی ۶۷۰ م ، ۵۲ ھ) سیاسی اور مذہبی طور پر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے خاص الخاص حمایتی اور شیعہ تھے تاہم اہل سنت نے آپ سے بہت کچھ حاصل کیا ہے (تنقیح المقال فی احوال الرجال جلد اول صفحہ ۴۳۸ طبع ۱۳۴۹ ھ ، لقد الرجال علامہ تفرشی صفحہ ۱۳۶ طبع طہران) یہ تھا حمزہ کا خاص الخاص اور صحیح ترین سلسلہ قرآت جسے ہمارے اکابر اور حضرت مولانا بڑے وثوق سے قابل تمسک سمجھتے آرہے ہیں!!

ایک وضاحت

اختلاف قرأت کے ضمن میں ہم یہ عرض کرنا بھول گئے کہ بعض حضرات معصومانہ انداز سے یہ کہہ کر مطمئن ہوجاتے ہیں کہ یہ مختلف قرأتیں صرف قرن اول میں تلاوت کی جاتی تھیں جو کہ بعد میں آہستہ آہستہ متروک ہوتی چلی گئیں اور ان کا کتب تفاسیر میں موجود ہونا یا ان کی بنیاد پر مسائل کا اختلاف معلوم کرنا مضر نہیں ہے ؟ ایسے حضرات کی خدمت میں التماس ہے کہ اگر قرن اول ہی میں ان کی تلاوت کی جاتی اور مسائل میں ان کے مفہوم کے مطابق اخذ و استنباط کیا جاتا تھا تو آج کونسی وجہ مانع ہے کہ آپ زبان سے تو ان قرأتوں کو ضروری نہ سمجھیں مگر عملی طور پر آپ کے نزدیک وہی متروک قرأتیں اصل قرآن پر بھی فوقیت

رکھیں، حقیقت یہ ہے کہ امام ابن تیمیہ (متوفی ۱۳۲۸م) غیر مبہم الفاظ میں تصریح فرما چکے ہیں کہ موجودہ قرآن کے علاوہ جتنی قرأتیں بھی ہیں وہ احکام شرع میں ہر وقت قابل اعتبار ہیں فرماتے ہیں کہ غیر عثمانی قرآتوں کا اعتبار اس وقت اور بھی ضروری ہوجاتا ہے جب کہ ان تمام قرآتوں کا تعلق شریعت اور احکام سے ہو۔ (رفع الملام مطبوعہ آداب پریس قاہرہ ۱۳۱۸ھ، صفحہ ۴۱) امام ابو شامہ (متوفی ۱۲۶۸م) تو منکرین اختلاف قرآت سے اس قدر خفا ہیں کہ قطعی گمراہ کہنے میں بھی کوئی باک محسوس نہیں کرتے۔ بہر حال

فکر ہر کس بقدر ہمت اوست

اعراب القرآن

اعراب کے معنی ہیں الفاظ پر زیر، زبر اور پیش لگانا۔ سلف صالحین کا تو یہ عقیدہ تھا اور ہر مسلمان کا بھی عقیدہ ہونا چاہئیے کہ یہ بنیادی اور عظیم کام خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سرانجام دے گئے تھے بلکہ آپ ؑ نے حکم دیا تھا کہ اعربو القرآن یعنی قرآن پر اعراب لگاؤ (بیہقی، ابویعلی بحوالہ مشکوۃ صفحہ ۱۸۰) جامع صغیر جلد ۱ صفحہ ۳۸، منتخب کنزالعمال جلد ۱ صفحہ ۳۸۶ تاریخ خطیب جلد ۸ صفحہ ۷۷ بغیۃ الوعاۃ صفحہ ۴۵۰ فضائل ابن کثیر صفحہ ۲۰۱ وغیرہ) لیکن حدیث اور تاریخ کے اس عظیم ثبوت کے باوجود مودودی صاحب واقعات کو غلط رخ پر ڈال کر مسلمانوں کو ایسے مغالطے کا شکار بنا رہے ہیں جس کی آگے چل کر کسی حال میں بھی تلافی نہیں ہوسکتی۔ یعنی آپ فرما رہے ہیں کہ ۶۵ھ تک قرآن کے حروف بلکہ پورے اہل عرب ہی عام حروف عربی کے لئے اعراب کے

نام سے آشنا نہ تھے۔ ابوالاسود دولی نے زیاد کے حکم سے پہلے پہل نقطوں کی شکل میں حروف کے اوپر، نیچے اور بیچ میں ایک ایک نقطہ رکھ کر زیر، زبر پیش سے مسلم اہل عرب کو ۴۵ھ سے ۵۳ھ کے اندر کسی دن آشنا کیا (ترجمان صفحہ ۴۶) یعنی مودودی صاحب اس تاریخی مغالطے کی اس خوبی سے توثیق بلکہ تائید فرمارہے ہیں۔ جیسے نوشتہ جبرئیل کی حمایت مطلوب ہو لیکن ہمیں افسوس ہے کہ مودودی صاحب کی یہ غیر منصفانہ تحقیق علمی لحاظ سے تشنہ اور تحقیقی لحاظ سے نہ صرف نامکمل بلکہ قرآن کے متعلق بنیادی تصور یعنی حفاظت قرآن کے بھی خلاف ہے۔ کیا مودودی صاحب یہ فرما سکتے ہیں کہ ابوالاسود سے پہلے اہل عرب فن اعراب سے قطعاً ناآشنا تھے؟ (خوف خدا کو ملحوظ رکھ کر) کیا وہ بتائیں گے کہ زیاد نے کب یہ خدمت اس کے سپرد کی تھی؟ اور پھر ابوالاسود نے وثوق کے ساتھ کس سنہ میں اس خدمت کو سرانجام دیا؟ کیا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعراب القرآن فرمایا تو آپ اعراب کے موجودہ مفہوم سے واقفی ناآشنا تھے؟ (معاذ اللہ)

ابوالاسود کا تعارف

مودودی صاحب کے ہیرو ابوالاسود دولی جس کا اصل نام بڑے بڑوں کو معلوم نہیں۔ یہ نام سے زیادہ کنیت سے معروف تھے۔ بہت بڑے پائے کے ادیب اور شاعر وبالاتفاق شیعہ مسلک کے داعی اور ترجمان تھے اور حضرت امیر معاویہؓ کی شان میں ہجو کرنا مستزاد۔ اس کے اصل نام کا کوئی پتہ نہیں (شاید مودودی صاحب کو معلوم ہو) لوگ اسے

(۱) ظالم بن عمرو بن سفیان بن جندل بن یعمر بن حنش بن ثعلبہ بن عدی بن دیل بھی کہتے تھے اور (۲) عمرو بن عثمان یا (۳) عثمان بن عمرو کے نام سے بھی جانتے تھے۔ حافظ ابن حجر نے تو پہلے نام کو ترجیح دی ہے۔ بہرحال یہ ۶۸۱م میں فوت ہوئے اور خالص شیعہ تھے (ملاحظہ ہو تہذیب التہذیب جلد ۱۲، صفحہ ۱۱ طبع دکن) اسی نے بہ تحقیق مودودی صاحب بصرے کے (اموی) گورنر زیاد (متوفی ۶۷۵م) کے حکم سے قرآن پر اعراب لگائے۔

کیا اس واقعہ کی تکذیب کے لئے اتنا کافی نہیں ہے کہ ایک اموی گورنر قرآن کے معاملہ میں ایک غالی شیعہ کا ہرگز انتخاب نہیں کرسکتا۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ ابوالاسود نے کوئی ایسا فرمان حاصل کرلیا ہوگا لیکن پھر بھی ہم تنہا اس کی دیانت پر کس طرح اعتماد کرسکتے ہیں۔ جبکہ اس نے کسی غیر شیعہ عالم کے تعاون سے نہیں بلکہ اپنے ہی ہم مشرب غالی شاگرد اور بار بار سزا یافتہ شرابی یحییٰ بن یعمیر عدوانی اسدی، بصری (متوفی ۷۳۷م ۱۲۰ھ یا ۷۴۶م ۱۲۹ھ) کے مشوروں سے یہ کام تکمیلی مراحل تک پہنچایا۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱۱، صفحہ ۲۰۷) یہ یاد رہے کہ ہمارے نزدیک سرے سے یہ واقعہ ہوا ہی نہیں ہے صرف مودودی صاحب کی خاطر ہم نے تھوڑی دیر کے لئے اسے تسلیم کرلیا ہے (نوٹ) یحییٰ مذکور کی شیعہ کتب رجال میں تفصیل موجود ہے۔

مناسب ہوگا کہ اس مقام پر دو ایک ان قاریوں کی نشاندہی بھی کی جائے جنہوں نے قرآن میں تحریف و تصحیف کے پروگرام کے پیش نظر ۹۳۵م و ۹۳۴م کے لگ بھگ قرآن کے اعراب کا از سرنو جائزہ لے

کر سینکڑوں آیات کے نئے اعراب تجویز کرکے اپنے اپنے مدارس فکر سے جاری کئے میرا اشارہ مشہور مفسر ابن جریر طبری کے شاگرد قاری ابن شنبوذ شیعی اور اس کے پرزور حامی قاری ابو بکر العطار شیعی (متوفی ۹۶۵ م کی طرف ہے۔ ابن شنبوذ نے تو گرفتاری کے بعد بظاہر اعتراف کرلیا (اخبار مکہ ازرقی شائع کردہ ولیسٹن فیلڈ جلد ا صفحہ ۷، تذکرۃ الحفاظ ذہبی جلد ۳ صفحہ ۲۱۷) لیکن عطار اپنے استاد ابن شنبوذ کی گمراہ کن قرأت اور تجویز کردہ اعراب پر تادم زیست قائم رہا۔ کیونکہ وہ شنبوذی اکیڈمی کا پرزور حامی اور جان نثار تھا۔ (یاقوت حموی طبع مارگلیوتھ جلد ۶ صفحہ ۳۰۰ و ۵۰۰ بغیہ الوعاۃ صفحہ ۳۶، ابن الاثیر جلد ۸ صفحہ ۲۲۱، ابن تغری بردی (طبع جانپول جلد ۲ صفحہ ۸۹ وغیرہ) ان ہی کا ایک اور ساتھی قاری ابی محمد اسحاق خزاعی بھی نامور محرف ہو گزرا ہے۔ اس تحریفی پارٹی کے علاوہ دسویں صدی میلادی میں روایات کے بل بوتے پر جس شخص نے نئے عزم اور نئے ارادے سے تمام قرآن کے اعراب بدل ڈالے وہ محمد بن مقلہ شیعی (متوفی ۹۴۱ م) تھا۔ یعنی شنبوذی اور عطاری فتنہ کے دوش بہ دوش مقلی فتنہ بھی پرورش پا رہا تھا۔ ابن مقلہ چونکہ ماہر خطاط تھا لہذا اس نے اس غرض کے لئے کوفی رسم الخط کو آلہ کار بنایا یعنی اس میں ترمیمات کرکے خط ابن مقلہ کے نام سے ایک نئے رسم الخط کی داغ بیل ڈالی۔ اس عیار نے پوری مہارت سے قرآن کے نسخے (جدید خط میں) کتابت کرائے اور لوگوں میں تقسیم کردیئے (ملاحظہ ہو مذاہب التفسیر الاسلامی طبع مصر ۶۴، ۶۵)

ان تاریخی شواہد کی موجودگی میں ہم کیونکر باور کریں کہ یہ جو

ہمارے دینی لٹریچر میں تضاد قرأت کے سینکڑوں نمونے پائے جاتے ہیں ان تحریفی پارٹیوں کی دستبرد سے محفوظ رہ گئے ہوں گے؟ کیا اگر وہ قرآن تک آسانی سے پہنچ سکتے تھے تو یہ تصنیفات کے انبار ان کی دسترس سے باہر تھے؟

یہ یاد رہے کہ فن اعراب سے عرب جاہلیت والے بخوبی آشنا تھے مودودی صاحب کا ذہن شاید اس طرف منتقل نہ ہوسکا (ملاحظہ ہو ابن ندیم صفحہ ، طبع جلی مصر)

نقاط القرآن

دنیا کے لٹریچر میں تنہا ادب اور انشاء کے لحاظ سے ہی دیکھا جائے تو قرآن حکیم یہاں بھی تمام لٹریچر پر فائق نظر آئے گا اور یہ فوقیت کسی زبان کو اس وقت تک حاصل نہیں ہوسکتی تاوقتیکہ وہ کلی طور پر پختہ ، کامل واکمل نہ ہو یعنی بول چال سے لے کر تحریر تک کے ہر عیب اور نقص سے پاک نہ ہو۔ اسی بناء پر ہی تو قرآن حکیم عربی مبین (نحل ۱۰۳) یعنی صاف، ستھری اور واضح عربی ہے جس کے نہ تو املا میں کوئی الجھاؤ ہے اور نہ تحریر میں ابہام !! لیکن یہ بڑا مسئلہ ہوگا کہ ہم بغیر دلیل کے یہ تسلیم کرلیں کہ عربی کے واضعین زبان کے ایسے قواعد سے ناآشنائے محض تھے جوکہ ایجاد و تخلیق کے ابتدائی مراحل میں ان کے سامنے ہونے چاہئیے تھے؟ فرض کرو ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ عربی اپنی ایجاد کے وقت سے لے کر اسلام کی نصف صدی تک یوں ہی بے قاعدہ اور بے نقط زبان رہی تو فرمایا جائے کہ آخر وہ کونسا طریق فہمائش تھا جس سے اجنبی لوگ بے

تکلف با۔ تا۔ ثا اور جیم، حا و خا وغیرہ حروف میں امتیاز کرتے ہیں ۔ راقم الحروف نے ایک ایف اے پاس سے بطور امتحان سورہ نور کی آیت ۲۶ بغیر نقطوں کے لکھ کر اسے پڑھنے کے لئے کہا تو اس نے طیب کو طبیب (ڈاکٹر) اور خبیث کو حبیب (درست) پڑھا۔ اسی طرح نقطوں کے بغیر مشرکین اور متبرکین، موحدین اور موجدین ۔ رحمت اور زحمت۔ غافل اور عاقل میں کونسی وجہ امتیاز باقی رہ جاتی ہے؟ اب فرمایا جائے کہ اتنی ناقص اور ناپختہ زبان میں قرآن کی حفاظت اور اشاعت کی کیا صورت نکالی گئی ہوگی؟

حقیقت یہ ہے کہ جو زبان اپنے مطالب اور مفاہیم ادا کرنے میں ناپختہ وناکمل ہو اسے "مبین" صاف منجھی ہوئی اور مکمل کہا ہی نہیں جاسکتا۔ اب یہ مودودی صاحب کے اختیار میں ہے کہ ایک بے سند مفروضہ کو ثابت کرنے کے لئے محض اپنی شخصیت اور علمی بلند مقام سے ناجائز فائدہ اٹھاکے حاملین قرآن کو یہ تاثر دے دیں کہ

اہل عرب "حروف کے لئے نقطے بھی ہونے چاہئیں" اس کو کبھی محسوس نہ کرسکتے تھے۔ بلکہ اسلامی عہد میں بھی صحابہؓ، رسولؐ، جبرئیل یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے بھی نقطوں کی ضرورت عربی حرف تہجی کے لئے محسوس نہیں کی۔ پہلی مرتبہ عبدالملک کے حکم سے حجاج نے دو گمنام عالموں کے ذریعے یہ بے ضرورت ایجاد کرکے دنیائے عرب کو اس کی ضرورت سے آشنا کردیا۔ (ترجمان القرآن کا خلاصہ)

مودودی صاحب نے بیک جنبش قلم کسی زبان کے ان بنیادی اجزاء کا ہی انکار کردیا جو اس کی تشکیل میں عنصر فعال کی حیثیت رکھتے ہیں۔

لیکن یہ فرمایا جائے کہ (۱) اللہ، رسولؐ وجبرئیلؑ کا (منفی انداز میں) منشاء آپ پر کیونکر منکشف ہوا؟ (۲) اسلامی عہد کے ۵۶ سال تک لفظی اشتباہ اور التباس کو دور کرنے کا کیا ذریعہ تھا؟ (۳) اگر بخیال آپ کے تضاد قرأت کے بنیادی اسباب میں سے ایک سبب یہ بھی تھاکہ حروف بے نقطہ لکھے جاتے تھے تو اس حالت میں حفاظت قرآن کے الہی وعدے (حجر ۹) کی کیا پوزیشن رہ جاتی ہے۔ (۴) قرآن کے متعلق تمام مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ اس میں نہ تو اضافہ کی گنجائش ہے اور نہ ہی حذف کا امکان یعنی زبر، زیر اور ایک ایک نقطہ تک اس کا محفوظ ہے۔ پھر یہ صورت کہاں سے نکال لی گئی کہ کروڑوں اعراب اور اتنے ہی نقطے اس قرآن میں اضافہ کئے گئے جسے خدا نے یوں ہی چھوڑ دیا تھا؟

(۵) وہ دو گمنام عالم جو قرآن پر اضافہ اور تکمیل کے لئے مامور کئے گئے تھے عبدالملک (متوفی ۱۵،۷ م) اور حجاج بن یوسف (متوفی ۱۸،۷ م) نے ان کا نام کیونکر صیغہ راز میں رکھا؟ اس مفروضے کو تسلیم کرلینے کے لئے آپ کے پاس کیا سند ہے؟ ہمارے خیال میں اس طبع زاد مفروضہ کی تکذیب کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ اتنی اہم ایجاد اور عظیم کام سرانجام دینے والوں کا نام و پتا آپ قیامت تک نہیں بتاسکتے۔ مودودی صاحب دراصل اس بدگمانی میں مبتلا ہیں کہ اگر اپنے لٹریچر کی حقیقی غلطیاں تسلیم کرلی گئیں تو لامحالہ معترضین کی بہت سی باتیں ماننی پڑیں گی اور یہ علمی پندار کے منافی ہوگا لیکن بندہ پرور ایسے معترضین پر لعنت بھیجیئے کہ وہ تو آپ کی کسی بات کا بھی اعتبار نہیں کریں گے لیکن ضد میں آکر قرآن کے متعلق ایسا غیر ضروری لٹریچر پیش کرنا یا پھر طبع زاد مفروضات پر اس

حد تک ایمان لے آنا کہ وہ فرمودہ خدا ہوں ، قرآن کی عظمت اور عصمت کو مجروح کرنے کے علاوہ بڑے انتشار کا موجب ہوگا کیا آپ نے سوچا بھی ہے کہ علمی مذاکرات میں خدا و جبرئیل کو طبع زاد نظریات کا پابند بتانا کتنا جرم عظیم ہے؟

افسوس ہے کہ ہم عرب جاہلیت کے اشعار ، کتبات اور خط حمیری (عربی خط کے ماخذ) کے چربے اس اشاعت میں شامل نہیں کر سکے لیکن اگر حیات مستعار نے چند روز اور وفا کی تو انشاء اللہ کسی وقت ان کے فوٹوز لے کر قارئین پر اس حقیقت کو بے نقاب کردیا جائے گا کہ عرب اسلام سے پہلے ہی نقطہ کے مفہوم سے آشنا تھے اور وہ برابر مشتبہ حروف میں امتیاز کے مواقع پر اس کا استعمال کرتے رہے۔

زیادات القرآن

کہا جاتا ہے قرآن میں بعض کلمات کسی اضافے کے محتاج ہیں اور وہ اضافہ دراصل قرآن ہی تھا مگر درج ہونے سے رہ گیا ۔ مشہور ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت ابی بن کعبؓ کے مصاحف میں یہ ضمیمے موجود تھے جنہیں بعد میں محفوظ کرلیا گیا تھا۔ ذیل میں ایسے ہی اضافوں کے چند نمونے درج کئے جاتے ہیں۔

(۱) فما استمتعتم به منهن فاتوهن اجورهن (نساء ۲۴)

اجورهن کے بعد الیٰ اجل مسمی پڑھا جاتا تھا تاکہ متعہ کا قرآنی جواز نکل آئے (العقیدة الشریعیة فی الاسلام صفحہ ۲۰۲ طبع مصر)

(۲) لن تبتغوا فضلا من ربکم (البقرة ۱۹۸) کے بعد " فی مواسم الحج "

(کشاف صفحہ ۱۸۵، جلد ۱) (۳) النبی اولی بالمومنین من انفسھم وازواجہ امھاتھم (احزاب-۶) کے بعد و ھو ابلھم (کشاف جلد ۲ صفحہ ۲.۶) (۴) سورہ مجادلہ کی ۷ ویں آیت یوں تلاوت کی جاتی تھی۔ ما یکون من نجوی ثلاثۃ الا اللہ رابعھم و لا اربعۃ الا اللہ خامسھم و لا خمسۃ الا اللہ سادسھم و لا اقل من ذالک و لا اکثر الا اللہ معھم اذا اخذا فی التناجی (تفسیر کبیر صفحہ ۱٦۲ جلد ۸ طبع بولاق ۱۲۸۹ ھ) (۵) و امرأتہ قائمۃ (ہود - ۷۱) و امرأتہ قائمۃ و ھو قاعد (مذاہب تفسیر صفحہ ۲۳ طبع مصر) (٦) یامرون بالمعروف و ینھون عن المنکر (عمران ۱.۴) کے بعد و یستعینون باللہ علی ما اصابھم (طبری جلد ۴، صفحہ ۲۴ طبع مصر) (۷) و جئت بایۃ من ربکم فاتقوا اللہ (آلِ عمران ۵۰) کے ساتھ فاتقوا اللہ من اجل ما جئتکم بہ و اطیعون فیما دعوتکم الیہ (کشاف جلد ۱ صفحہ ۱۴۸) وغیرہ یہ تمام زیادات ابن شنبوذ ؒ نے اپنے مصحف میں درج کئے تھے اور ان کا حال آپ معلوم کر چکے - یہ تفصیل کا مقام نہیں۔ ورنہ ہم بتا دیتے کہ ابی بن کعب اور عبداللہ بن عباس کے سلسلہ ہائے اسناد میں ۹۹ فیصد کس کیمپ کے راوی محو عمل تھے۔

تفسیر القرآن

قرآن چونکہ خالص عربی زبان میں نازل ہوا تھا اور ادھر عہد نبوی سے لے کر خلفائے راشدین کے زمانہ تک اطراف واکناف عالم میں قرآن

واسلام کی اشاعت دن بدن بڑھ رہی تھی، نومسلم عجمیوں کے لئے قرآن فہمی کے لئے اہل زبان کی طرف رجوع کرنا لازمی امر تھا اندریں حالات ضرورت تھی کہ آیات الٰہی کی فہمائش کے لئے کوئی طریق کار تجویز کیا جاتا اور یہ طریق کار تعبیر تھا تفسیرالقرآن سے۔ کتنا مبارک اقدام ہے تفسیر القرآن بیان کرنا؟ لیکن بدقسمتی سے ہوا یہ کہ ہر لفظ کی تشریح اور ہر آیت کی تفسیر میں تضادؔ وتخالف کا وہ بارود بھر دیا گیا کہ کسی سلیم العقل کے لئے باور کرنا مشکل ہو چلا کہ ان تفاسیر کے اندر قرآنی آیات کے جو مطالب اور جو مفاہیم بیان کئے جاتے ہیں کیا واقعی قرآن ان کا محتاج ہے؟ اور پھر یہ بھی یقین کرالیا گیا کہ ایسی تفسیر خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے منقول ہے ذیل میں بطور مثال دو آیات کی تفسیر ملاحظہ ہو۔

(۱) و القناطیرالمقنطرۃ من الذھب و الفضۃ (عمران ۱۴)

" یعنی انسان کے لئے مرد وعورت کے رشتہ میں اولاد میں، چاندی وسونے کے قنطاروں میں، چنے ہوئے گھوڑوں میں، مویشیوں میں اور کھیتی باڑی میں دل کا اٹکاؤ اور خوشنمائی رکھ دی گئی ہے۔"

یہ قنطار کیا ہے؟ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سوال کے جواب میں فرمایا کہ ایک ہزار اوقیہ (وزن) کا ایک قنطار ہوتا ہے (احمد وابن ماجہ) اور حضرت ابوہریرہ (متوفی ۶۷۶ م) فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم (متوفی ۶۳۲ م) نے قنطار کی تشریح میں بارہ ہزار اوقیہ فرمایا ہے۔ (حاکم)

(۲) فخذ اربعۃ من الطیر فصرھن الیک (بقرۃ ۲۶۰) " یعنی اے ابراہیم چار پرندے لے لو اور لے کر پھر کیا کرو؟ یہاں " صرھن "

نے الجھن پیدا کردی۔ حضرت ابن عباسؓ (متوفی ۱۶۸۸) فرماتے ہیں کہ صرھن کے معنیٰ ہیں "قطعھن" یعنی انہیں ذبح کردو (ابن جریر جلد سوم صفحہ ۳۷) آگے چل کر اس معنی کے برعکس مکرر ابن عباسؓ کا ارشاد ہے کہ صرھن کے معنیٰ ہیں اوثقھن یعنی ان پرندوں کو زندہ باندھ لو (حوالہ مذکور) ذبح نہ کرو۔ یہ تھا نمونہ تفسیرالقرآن کا۔ یعنی جو بات آپ سمجھنا چاہیں اسے بھاری پتھر کی طرح چوم کر دور ہٹ جائیں اب دیکھنا یہ ہے کہ اس موضوع پر سب سے پہلے کس گروہ کے افراد نے خامہ فرسائی کی۔ مورخ ابن الندیم (متوفی ۹۹۵م) کی تصریح یہ ہے کہ تفسیرالقرآن سب سے پہلے سعید بن جبیر تابعی کوفی (متوفی ۷۱۲م) نے لکھی اور سعید کے متعلق شیعہ مؤرخین اور نسابین کا دعویٰ ہے کہ وہ خالص شیعہ تھے۔ چنانچہ علامہ جلال الدین بن مطہر (متوفی ۱۳۲۶م) نے خلاصہ الاقوال میں اور علامہ ابوعمر کشی نے کتاب الرجال میں سعید مذکور کو بدلائل شیعہ ثابت کیا ہے۔ نیز ملاحظہ ہو قرب الاسناد حصہ سوم مصنفہ حمیری (متوفی ۷۸۹م)۔ بلکہ امویوں کے خلاف بغاوت کرکے اشعث شیعہ سے مل جانے کے جرم ہی میں حجاج نے اسے قتل کرادیا تھا (کتب رجال) سعید کے بعد سدی کبیرہ اسماعیل بن عبدالرحمن کوفی ابو محمد قرشی (متوفی ۴۴ھ) اور سدی صغیر محمد بن سائب بن بشیر کلبی (متوفی ۷۷۲م) اور جابر بن یزید الجعفی (متوفی ۴۴ھ) نے قرآن مجید کی تفاسیر لکھیں۔ یہ تمام حضرات فن تفسیر کے امام مانے جاتے ہیں اور یہ وہ زمانہ تھا جبکہ اہل سنت اس فن سے ناآشنائے محض تھے۔ امام ذہبی (متوفی ۱۳۴۸م) اور حافظ بن حجر (متوفی ۱۴۴۹م) نے آئمہ مذکورین کا شیعہ کے علمائے کبار

میں شمار کیا ہے ۔ خود شیعہ مؤرخین ان حضرات کا نام بحیثیت اول المفسرین نہایت فخر اور احترام سے لیتے اور شیعہ کا علوم قرآنی میں تقدم ثابت کرنے کے لئے انہی کو پیش کرتے ہیں (ملاحظہ ہو ابن قتیبہ (متوفی ۸۸۹ م) علامہ نجاشی اور ابو جعفر طوسی (متوفی ۱۰۶۸م) کی تصریحات) ۔

ان سب سے زیادہ جامع صورت میں تمام علوم قرآنی پر محیط تفسیر امام ابو عبداللہ محمد بن عمر عرف واقدی (متوفی ۸۲۱ م) نے " الرغیب فی علوم القرآن " نامی لکھی اور واقدی کا شیعہ ہونا بالاتفاق مسلم ہے ۔

فضائل قرآن

قرآن مجید کی آیات اور سوروں کے فضائل میں جتنی روایات ہیں ان میں سے فی ہزار ایک بھی صحیح نہیں ہے ۔ آپ آیۃ الکرسیؔ پڑھیں تو " جن " تابع ہوجائیں گے ۔ " واقعہ " پڑھیے تو بھوک نہیں لگے گی " قل ھواللہ " پھونکیے تو دنیا بدل جائے گی ۔ الغرض قرآن میں جتنا بھی معجزاتی اور کراماتی رنگ بھرا ہوا ہے اس کا تعلق فضائل قرآن سے ہے ۔ ادھر

آیۃ الکرسی کے انہی شیعہ فضائل کا کرشمہ ہے کہ مسلمانوں کا کوئی ڈرائنگ روم ایسا نہیں ہے کہ جہاں اس آیت کا طغریٰ زینت دیوار نہ ہو ۔ بڑے بڑے شیعہ بزار صاحبان علم و فضل کے در و دیوار اس آیت کے طغروں سے سجے ہیں بظاہر اس میں کچھ حرج نہیں لیکن شیعہ شعار کا نباہ بھی تو ایک جرم ہے ۔ شیعہ کے ہاں اس کی فضیلتوں کا باعث اس آیت کا آخری ٹکڑا ہے ۔ " ھو العلی العظیم " ان کی باطل مراد کے مطابق بات یوں ہے کہ اوپر جس ہستی کی شان بیان ہوئی ہے ۔ یہ " وہی عظمت والا علی ہی تو ہے ۔ " ان کے گھروں اور اداروں میں ایسے طغرے ہوتے ہیں جن میں باقی متن سے ہٹ کر یہ ٹکڑا نمایاں اور بڑا کرکے لکھا ہوتا ہے ۔ ان کے ہاں ایک شیر (اسد) کا نقش ہوتا ہے جس کی باڈی میں پوری آیت لکھی ہوتی ہے ۔ وہاں ان کا مطلب ہوتا ہے کہ علیؓ ، اسد ہے اور یہ آیت اسی شیر کی شان بیان کرتی ہے ۔

شیعہ کا دعویٰ ہے کہ اس موضوع پر لکھنے میں بھی انہی کا تقدم ہے کیونکہ سب سے پہلے امام رضا (متوفی ۸۱۸ م) کے صحابی حسن بن علی بن ابی حمزہ بطائنی اور محمد بن خالد برقی نے پھر امام حسن عسکری (متوفی ۸۱۸ م) کے مصاحب ابو عبداللہ احمد بن محمد بن لیسار بصری اور کلینی (متوفی ۹۳۹ م) کے استاد علی بن ابراہیم احمد بن محمد بن عمار کوفی (۹۵۵ م، ۳۴۶ ھ) نے فضائل قرآن پر لکھا۔ امام عسکری کے ایک اور مصاحب کا نام بھی تاریخ میں ثبت ہے جس نے اس موضوع پر طبع آزمائی کی ان کا اسم گرامی محمد بن مسعود عیاشی ہے۔ فضائل کی ساری کہانیاں شیعیت کے شعبہ باطنیت کے طفیل پھیلیں۔

جلال الدین سیوطی ۱۵۰۵ م) نے امام شافعی (۸۲۰ م) کو بھی فضائل قرآن کا مصنف قرار دے دیا ہے لیکن امام رضا کے مصاحب بطائنی اور برقی آپ سے پہلے اس پر لکھ چکے تھے۔ علاوہ ازیں شیعہ نے اس ضمن میں جتنی روایات لی ہیں ان کا مآخذ حضرت ابی ابن کعب صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی بتائی جاتی ہے اور ابی کو یہ حضرات طرفدار اور شیعان علی میں سے شمار کرتے ہیں۔ چنانچہ سید علی بن صدرالدین المدنی (۱۷۰۵ م، ۱۱۱۸ ھ) نے الدرجات الرفیعہ فی طبقات الشیعہ میں ائمہ اہل بیت کی تصریحات سے ثابت کیا ہے کہ آپ شیعہ تھے (حالانکہ صحابہ کرام کے متعلق ایک مسلمان گروہ بندی جیسا مکروہ تصور بھی ہنیں کر سکتا۔

ناسخ، منسوخ قرآن

علم الہیٰ میں کوئی نقص نہیں ہے اسے اپنے بندوں کی مصلحتوں اور تقاضوں کا ولادت سے لے کر قبر تک کا علم ہے ۔ غیر محدود علم ہے، سب پر حاوی علم ہے، خشک کا علم ہے تر کا علم ہے ، بر کا علم ہے بحر کا علم ہے۔ اس نے کوئی ایسا حکم نہیں دیا جو آج تو بندوں کے حسب حال ہو مگر آگے چل کر ان کے تقاضوں کے برعکس ہوگیا۔ اس نے کوئی ایسی آیت نہیں اتاری جو کچھ عرصہ کے بعد معطل اور باطل قرار پائی جائے اس نے کسی ایک کتاب میں ایک ہی امر سے متعلق دو متضاد حکم نہیں دیئے تاکہ تلاوت بھی کئے جائیں اور ان سے متضاد مفہوم بھی مستنبط ہوتا رہے۔ اور پھر ایک منسوخ بھی ہو؟ بہرحال یہ عقیدہ کہ آج بھی قرآن کا ایک حصہ تلاوت کئے جانے کے باوجود منسوخ الحکم ہے علمائے راسخین نے اسے ایک ثانیہ کے لئے بھی تسلیم نہیں کیا۔ یہ علاوہ اس کے کہ اس موضوع پر بھی امام جعفر صادقؑ کے صحابی، جناب عبداللہ بن عبدالرحمن اصم مسمعی نے اور پھر صدر اول کے ایک دوسرے شیعہ عالم، دارم بن قبیصہ بن نہشل بن مجمع عرب ابوالحسن تمیمی الدارمی (صحابی امام رضا) نے کتاب "الوجود والنظائر" اور کتاب "الناسخ والمنسوخ" لکھیں اسی طرح شیعہ کے جلیل القدر مجتہد حسن بن فضال (متوفی ۸۳۸ء ۲۲۴ھ) اور احمد بن محمد بن عیسیٰ قمی نے بھی اس عنوان سے کتابیں تصنیف کیں۔ اس مقام پر سیوطی کو اعتراض ہے کہ ناسخ ومنسوخ کے اولین مصنف حسن بن فضال کے ہم عصر ابوعبیدہ قاسم بن سلام (متوفی

۸۳۸ م ۲۲۴ھ) ہیں لیکن تاریخی شواہد سیوطی کے ادعاء کے برعکس جاتے ہیں کیونکہ ابوعبیدہ ، اصم مستعی بلکہ وارم بن قبیصہ سے بھی عرصہ بعد نمودار ہوا۔

ناسخ ومنسوخ کا دائرہ عمل چونکہ بے حد وسیع ہے اس لئے مثال کے طور پر ہم نے کوئی آیت پیش نہیں کی بہرحال اس میں بھی شیعہ ہی کا تقدم ثابت ہے۔

احکام القرآن

سنیوں کا دعویٰ ہے کہ احکام القرآن کے نام اور موضوع پر سب سے پہلے امام شافعی (۸۲۰ م) اور آپ کے بعد طبقات النحاۃ کے مصنف امام قاسم بن اصبغ بن یوسف بیانی قرطبی اخباری لغوی (متوفی بعمر ۹۳ سال ۹۵۰ م ، ۲۴۰ھ) نے کتابیں لکھیں۔

لیکن شیعہ کے دعویٰ اور ابن ندیم کی الفہرست میں تصریح سے ثابت ہوتا ہے کہ سب سے پہلے امام باقر کے صحابی محمد بن سائب کلبی (متوفی ۷۶۲ م ، ۱۴۶ھ) نے " احکام القرآن " تالیف کی اور یہ ظاہر ہے کہ کلبی کی وفات کے وقت امام شافعی کی عمر صرف چار سال تھی۔ یہ یاد رہے کہ کلبی نے یہ کتاب حضرت ابن عباسؓ سے روایت کی ہے جس کے خود ساختہ ہونے میں ادنیٰ سا شبہ بھی نہیں ہوسکتا۔

غرائب القرآن

سیوطی نے کتاب الاوائل میں تصریح کی ہے کہ سب سے پہلے ابوعبید معمر بن مثنیٰ (متوفی ۸۲۳ م) نے غرائب القرآن لکھی لیکن یاقوت حموی (متوفی ۱۲۲۸ م) نے معجم الادباء اور خود سیوطی نے "بغیہ الوحاة" میں بوضاحت لکھا ہے کہ ابان بن تغلب (۷۵۸ م) ہی غرائب القرآن کے پہلے مصنف ہیں۔ ابان کے بعد جن شیعی اہل علم نے غرائب القرآن لکھے ان کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں:۔

(۱) ابو عثمان مارنی شیعی (متوفی ۸۴۳ م ۲۲۸ ھ) (۲) علامہ ابن درید کوفی لغوی شیعی (متوفی ۹۳۲ م، ۳۲۱ ھ) اور ابن درید سے پہلے امام ابوبکر بجستانی محدث (متوفی ۸۶۴ م) نے بھی غرائب القرآن کے نام سے جدول وار ایک قیمتی تصنیف کی تھی جوکہ ۱۹۰۷م میں مصر سے شائع ہو چکی ہے اور خاکسار کے پاس بھی ہے۔

نوادرات قرآن

کسی لفظ میں ایسا مفہوم پیدا کرنا یا کسی عبارت سے وہ معنی نکالنے جس میں ندرت اور قلت پائی جائے اسے نادر کہا جاتا ہے۔ یہ ایک نہایت احتیاط طلب اور پرخطر موضوع ہے۔ ہر کس وناکس اگر اس میں دلچسپی لینے لگا تو قرآن بازیچہ اطفال ہوکر رہ جائے گا۔ اب جس وقت یہ ایک پرخطر فن ہے تو جو لوگ بے باکانہ اس سے دلچسپی لے رہے ہیں وہ نہایت ہی مہلک راہ پر گامزن ہیں۔

قرآن میں ایک لفظ ہے " بغتۃ " یعنی قیامت " اچانک " ہوگی بس
اب کیا تھاکہ یار لوگوں نے اس کا تعین ہی کردیا۔ یعنی بغتۃ کے عدد نکال
کر یہ معنی پیدا کردیئے گئے کہ نزول آیت کے اٹھارہ سو دو برس بعد
قیامت قائم ہوجائے گی۔ آگے چل کر اس کے مفہوم میں اور بھی
وسعت پیدا کردی گئی یعنی صحابہ اور آئمہ یا دیگر اشخاص کے مناقب
ومثالب تک کو اس کی ذیل میں لایاگیا پھر جو کسر رہ گئی وہ صوفیاء کے
اسرار ورموز سے پوری کردی گئی۔ ذیل میں صرف مناقت اور مثالب کی
چند مثالیں دے کر نوادرات کا تعارف کرایا جائے گا لیکن پہلے آپ
نوادرات نویسوں کے اسمائے گرامی ملاحظہ فرمالیں۔

(۱) امام حسن عسکری (متوفی ۸۷۳ م) کے مصاحب احمد بن محمد
سیاری بصری (۲) ابوالحسن محمد بن احمد بن محمد عرف الحارثی شیعی (۳) شیخ
علی ابن ابراہیم بن ہاشم شیعی (۴) علی بن حسین بن فضال (۲۲۴ ھ)
شیعی (۵) ابو نصر عیاشی شیعی وغیرہ۔ ابن ندیم نے ان کے علاوہ اور نام
بھی تحریر کئے ہیں۔

اب آپ " نوادرات " ملاحظہ فرمائیں۔

(۱) سورہ مائدہ کا ۹۱ آیت میں ہے کہ " بلاشبہ ابلیس کی یہ تمنا ہے
کہ تمہارے درمیان شراب نوشی اور قمار بازی کے ذریعے دشمنی اور
عداوت پھیلائے اور اس طرح ذکر الہیٰ سے روکے۔" یہاں شراب نوشی
سے ابوبکرؓ اور قمار بازی سے عمرؓ مراد ہیں۔ (تفسیر مذاہب صفحہ ۲۱۳ طبع
مصر)۔

(۲) بنی اسرائیل کو جس گائے کے ذبح کرنے کا حکم دیاگیا تھا اس

سے مخالفین علیؑ یعنی عائشہ (متوفاۃ ۶۹۸ م) طلحہؓ (شہید ۶۵۶ م) اور زبیرؓ (شہید ۶۵۶ م) مراد ہیں۔ (تاویل مختلف الحدیث نیور صفحہ ۸۶ طبع مصر)۔

(۳) سورہ نساء کی آیات (۵۱ و ۵۲) سے مراد غاصب معاویہؓ (متوفی ۶۸۰ م اور عمر بن العاصؓ (متوفی ۶۶۳ م) ہیں) اصول کافی مصنفہ کلینی مرحوم ۹۳۹ م صفحہ ۲۷۱ھ طبع مصر) (۴) سورہ نور کی پینتیسویں آیت میں " المصباح " سے مراد حسن (۶۶۹ م) اور المصباح فی الزجاجہ سے حسین شہید (۶۸۰ م) شجرۃ المبارکہ سے ابراہیمؑ (۲۲۰۱ ق م) لا شرقیہ ولا غربیہ سے دین ابراہیم (جوکہ یہودی تھے اور نہ نصرانی ، " نور علی نور " سے امام کے بعد دوسرا امام " یھدی اللہ لنورہ " سے ائمۂ اہل بیت۔ " من یشاء " سے وہ ائمہ جو ان اوصاف کے حامل تھے مراد ہے۔ تفسیر علامہ ابی الحسن علی بن ابراہیمؒ معروف قمی (سلام) مطبوعہ طہران صفحہ ۶۵۶) (۵) " و اوحی ربک الی النحل " (نحل ٦٨) سے اہل بیت مراد ہیں اور یخرج من بطونھا شراب (۶۹) سے مراد ہے وہ قرآن جو اہل بیت کے منہ سے نکل رہا ہے (کتاب الاغانی صفحہ ۳۰ جلد ۳) ۔ (۶) سورۃ البلد ۶ تا ۸ میں " عینین " سے رسول اللہ ، " لساناً " سے علی " شفتین " سے حسن و حسین اور " ھدیناہ النجدین " سے شبیر وشبر کی ولایت مراد ہے (قمی صفحہ ۷۲۶ م) (۷) سورہ حجر آیت ۸۷ میں " مثانی " کی تفسیر امام ابو جعفر (۷۳۱ م) سے یوں منقول ہے " مثانی " سے مراد ہمارا خاندان ہے جسے اللہ نے نبی عطا فرمایا۔ اور ہم وجہ اللہ ہیں جو تمہارے درمیان پھر رہے ہیں جس نے ہمیں پہچانا جنت اس کا مقام ہے اور جس نے ہنیں پہچانا جہنم اس کا

ٹھکانا ہے۔ (قمی صفحہ ۲۵۳)۔ (۸) سورہ زمر آیت ۵۶ میں "نوراللہ" اور "جنت اللہ" وغیرہ صفات خداوندی سے امام علی مراد ہیں قمی صفحہ ۲۴۹ یا صفحہ ۵۷۹)۔ (۹) اعراف ۴۴ میں آخرت میں منادی کرنے والے سے حضرت علی مراد ہیں جو اپنے مخالفین پر لعنت کا اعلان کریں گے۔ (قمی صفحہ ۱۱۶) اسی طرح (۱۰) سورہ توبہ میں آذان من اللہ سے مراد علی ہیں یعنی خداج اکبر کی طرف جو بلا رہے ہیں تو اس سے مراد علی کی طرف بلانا ہے۔

ذیل میں آپ سنی نوادرات بھی ملاحظہ فرمالیں اور اندازہ کرلیں کہ پیشرو اور بانیوں کا اثر بعد میں آنے والوں پر کتنا گہرا ہوتا ہے؟ سورہ فتح کی ۲۹ ویں آیت میں "اخرج شطاہ" سے مراد ابو بکر (متوفی ۶۳۴ م) "فآزرہ" سے عمرؓ (شہید ۶۴۴ م) "فاستغلظ" سے مراد عثمانؓ (شہید ۶۵۵ م) اور "فاستوی علی سوقہ" سے علیؓ (شہید ۶۶۱ م) مراد ہے (تفسیر مذاہب صفحہ ۳۳۲ طبع مصر) سورہ عصر کی حضرت ابی ابن کعبؓ یوں تفسیر فرماتے تھے۔ ان الانسان لفی خسر سے ابوجہل (مقتولہ در بدر ۶۲۳ م) "الا الذین امنوا" سے ابو بکرؓ "وعملوا الصالحات" سے عمر "وتواصوا بالحق سے عثمان اور "وتواصوا بالصبر" سے مراد علی ہیں (بروایت امام ابوالحسن الراعدی نیساپوری، (۱۰۷۵ م) بحوالہ ریاض النضرۃ جلد ۱ صفحہ ۳۴ تفسیر رازی جلد ۸، صفحہ ۵۹۲ طبع بولاق مصر)۔

بلاغۃ القرآن

بلاغت قرآن پر تفصیل سے لکھنے کا یہ محل نہیں ہے پھر مضمون

کی تنگ دامانی تو مانع ہے ہی قرآن کیا ہے؟ فاتحہ سے لے کر والناس تک بلاغت، سراپا بلاغت، تمام بلاغتوں کا ماخذ وضاحتوں کا منبع لیکن اس موضوع پر بھی سب سے پہلے جس بزرگ نے قلم اٹھایا ایک شیعہ ہی تھے۔ میری مراد علامہ ابوالفتح عثمان بن جنی شیعی (متوفی ۱۰۰۲م، ۲۹۳ھ) کی ذات گرامی ہے۔ آپ نے بلاغت القرآن پر لکھا اور بلاغت کے نشہ میں اس قدر بہہ گئے کہ خود قرآن میں بھی آپ کو بلاغت کی غلطیاں نظر آنے لگیں چنانچہ سورہ یوسف کی آٹھویں آیت میں خیر حفظاً۔ آپ کے نزدیک بلاغت کی رو سے غلط ہے۔ خیر حفظاً (خا کی زیر) ہونا چاہئیے وغیرہ یہ بحث کا مقام نہیں ورنہ آپ کو معلوم ہوجاتا کہ ابن جنی یہاں خود ہی غلطی پر ہیں!! ابن جنی کے بعد ایک سنی مسلمان امام عبدالقادر جرجانی (متوفی ۱۰۷۸م) نے اس عنوان پر لکھا آپ کی بے نظیر تالیفات مفتی عبدہ کے شاگرد رشید علامہ سید رضا نے شائع کردی ہے۔ بلاشبہ امام جرجانی نے قرآن کا حق ادا کیا ہے جزاک اللہ ۔ تاہم وہ بشر تھے پھر پیشرو شیعہ مصنف کے خیالات سے استفادہ بھی لازمی امر تھا!! بہرحال بلاغت کے فن شریف تک کو شیعہ نے ترتیب دیا اور اس میں بھی انہی کا تقدم ثابت ہے۔

گزشتہ صفحات میں آپ نے دیکھ لیا کہ میں نے اپنی حد تک محنت اور جانفشانی سے اختلاف قرأت اور علوم قرآن کا پس منظر تاریخ اور مآخذ کا کھوج لگایا ہے۔ اب فیصلہ قارئین پر چھوڑ دینا مناسب ہوگا کہ وہ غیر جانبداری کا فرض باحسن طریق سرانجام دے سکتے ہیں۔ مودودی صاحب کا ہمارے دل میں جو احترام ہے وہ اس تبصرے کی وجہ سے کم نہیں ہوا

کیونکہ آپ کی بہت سی خوبیوں اور کمالات کا اعتراف کرنا علمی رواداری کا متقاضی ہے لیکن یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب اختلاف قرأت کے مؤلفین جامعین اور مصنفین شیعہ ہی تھے تو اب ہمارے لئے رد و قبول کا کونسا معیار ہونا چاہئیے ۔ خاص کر جبکہ ہمارے بہت سے عالم بھی اس تحریک کے افکار ونظریات کا بری طرح شکار ہوں؟

یہ سوال بے حد اہم اور بنیادی ہے اسے نظرانداز کرنا ہماری علمی موت کے مترادف ہوگا کیونکہ شیعہ دراصل ابتداء اسلام ہی سے سیاسی ، ثقافتی اور علمی اعتبار سے دیگر تمام فرقوں پر فائز و متفوق تھے ۔ ان کی بہت سی علمی خدمات ایسی ہیں جو کسی دوسرے ذریعہ سے ہم تک نہیں پہنچ سکتی تھیں ۔ اس حد تک تو ہمیں ان کا شکر گزار ہونا چاہئیے لیکن اس اعتراف کے بعد کہ اگر یہ گروہ نہ ہو تو ہم تمام علوم قرآنی کے ذخیرے سے محروم رہ جاتے ہمارے لئے سوائے اس کے چارہ کار نہیں کہ ہم علوم قرآنی کے معاملے میں ان سے اخذ وقبول میں محتاط رہیں اور اختلاف قرأت میں تو یہاں تک احتیاط کی ضرورت ہے کہ ان کی حلفیہ مرویات پر بھی اعتبار نہ کرنا چاہئیے ۔ اور اس ضمن میں ہمارا مسلمانوں کو وہی مشورہ ہے جوکہ سلف صالحین اپنی وصایا میں لکھ گئے تھے ۔ حافظ ابن حجر (متوفی ۱۴۴۹م) فرماتے ہیں کہ :۔

" خارجی یا رافضی یا کوئی اور (بدعتی) عمداً خواہ نیک نیتی سے اپنے مسلک کی حدیث بیان کرے (یا تائید بھی مطلوب نہ ہو) تو بھی قبول نہ کرنی چاہئیے کیونکہ وہ حدیث ہی ایسی بیان کرے گا جو اس کے عقیدے اور خیال

تقویت پہنچاتی ہوگی۔" (نزہۃ النظر مطبوعہ علمی دہلی صفحہ ۷۳)

اس مشورے کے بعد مسلمانوں کو چاہئیے کہ وہ پوری جرأت اور دلیری کے ساتھ اپنی تفاسیر کا جائزہ لیں اور ان میں تمام علوم کے متعلق مرویات کے بیان کرنے والے اشخاص کا محاسبہ کریں لیکن یہ محاسبہ تنہا اس نقطہ نظر سے نہ ہو کہ روایت میں کتنے شیعہ ہیں کیونکہ شیعہ کے علاوہ دوسرے راوی بھی تو تھے جن کا کام غلط فہمی پھیلانا یا انتشار کو فروغ دینا تھا۔ امید ہے کہ اس طرح تیرہ سو سال گزر جانے کے باوجود آپ اصل حقیقت کو پالیں گے۔ **الذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا** اور حقیقت کا پالینا بھی قرآن مجید کا معجزہ ہی ہے۔ کیا آپ خود نظم قرآن سے قرآن سمجھنا چاہتے ہیں؟ کیا آپ اس کے لئے آمادہ ہیں؟

غیرت قرآن اور علمی تقاضے آج کے مسلمانوں سے یہی سوال کرتے ہیں۔

عربی حروف کے لئے نقطے کب ایجاد ہوئے

تاریخ، لغت اور اشعار جاہلیت کی روشنی میں

تحقیق از جناب رحمت اللہ طارق۔ دارالحدیث مکہ المکرمہ

ریسرچ اور تحقیق کے میدان میں شاذونادر ہی کوئی گروہ ایسا ہوگا جو تبلیغی مقاصد بھی رکھتا ہو اور مخالف پر تنقید کرتے وقت حق وانصاف کا دامن بھی اس کے ہاتھ سے چھوٹنے نہ پایا ہو۔ اس کلیہ کی صداقت اس وقت اور بھی نکھر کر ہمارے سامنے آجاتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ مستشرقین یورپ نے اپنے تبلیغی مقاصد کے پیش نظر اسلام پر جتنا کچھ مواد فراہم کیا ہے اس میں اسّی فیصد اسلام اور پیغمبر اسلام، بالخصوص قرآن مجید پر طعن وتشنیع ہی کا مواد ملے گا۔ کیونکہ شروع ہی سے ان کا مطمح نظر یہی رہا ہے اور اپنی تحقیقات کا محور اسی کو گردانا ہے کہ جس وار سے بھی قرآن لاریب فیہ، کی پوزیشن مشکوک ومشتبہ ہوسکتی ہے اسے مختلف انداز سے استعمال کیا جائے۔ چنانچہ عربی ہجاء کے اٹھائیس حروف میں سے بائیس کے قریب متشابہ حروف ہیں یعنی اگر نقطے اڑا دیئے جائیں تو ان میں امتیاز کی کوئی صورت باقی نہیں رہتی۔ اب اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ جب عربی خط اپنے ابتدائی ادوار میں "بے نقط" تھا تو ان متشابہ حروف میں امتیاز کرنے کی کیا صورت ہوسکتی تھی؟ چنانچہ اس مزعومہ عقیدے کی بنا انھوں نے یہ اعتراض کھڑا کر دیا کہ "قرون اول میں جب نقطوں کا رواج نہیں تھا یا اہل عرب اس سے آشنا ہی نہیں تھے تو قرآن کے سیکڑوں بلکہ ہزاروں جو قاری اپنی صوابدید کے مطابق پڑھا کرتے تھے وہ یا تو صحیح مانے جائیں یا سب کے سب غلط، صحیح ماننے کی صورت میں "تواتر" کا سوال ختم ہوجانا چاہئے اور غلط ماننے کے بعد صحت کا معیار باقی نہیں رہتا۔ مقصد یہ کہ قرآن حمید کی عصمت

حفاظت اور عظمت کا جو سکہ بیٹھ گیا ہے اسے کسی طرح نقصان پہنچایا جائے لیکن ــــ "پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا"ــــ فلسفۂ ابن رشد صدیوں سے یورپ کے رگ و پے میں سرایت کر چکا تھا اس کا اثر زائل کرنے کے لئے قرآن سے یوں بدلہ لینا خفت، سبکی اور جہالت کی بدترین مثال ہے۔ تاہم اتنا کہہ کر ہم بھی سستی گلو خلاصی کے قائل نہیں ہیں۔ اگر اعتراض معقول ہے اور اپنے اندر وزن رکھتا ہے تو حالی عقیدت سے ہٹ کر علمی بنیادوں پر گفتگو کرنی چاہیئے، پھر بارے غنیمت ہے کہ غیر مسلم مشینریوں نے جاہلی لٹریچر کے وجود سے نہ تو انکار کیا ہے اور نہ ہی جاہلی شواہد سے استدلال کو رد سمجھا ہے۔

عرصہ ہوا میں نے قرآن سے متعلق چند مضامین تحریر کئے تھے جو بحمد اللہ اپنے موضوع میں منفرد اور مواد میں سیر حاصل تھے۔ انہی میں ایک ذیلی عنوان نقاطِ قرآن تھا۔ اور یہی حصہ جو متعلقہ معلومات بروقت دستیاب نہ ہونے کے سبب زیادہ مبہم غیر واضح اور تشنہ تھا جس کی وجہ متعلقہ مواد کا نہ ملنا تھا۔ چنانچہ میں نے مسلسل ایسے مواد کی تلاش جاری رکھی جو تصویر کے دوسرے رخ کی پوری وضاحت پیش کر سکے۔

آج الحمد للہ اس سلسلہ میں فکر و نظر کی کتنی وادیاں طے کرنے اور تحقیق و جستجو کے کتنے راستوں پر آبلہ پائی کرنے کے بعد اس کا ماحصل متلاشیانِ حق و صداقت کے سامنے پیش کرنے کے قابل ہو گیا ہوں۔ مضمون کی ترتیب اور بیسیوں کتابوں کی فراہمی اور حرم مکی کی وسیع و عریض لائبریری سے استفادہ۔ پھر اخذ و استنباط کے لئے شواہد اور جاہلی لٹریچر سے متعلق دواوین کی تلاش اور پھر مقصد کے تعین میں جتنی محنت صرف ہوئی اس کا بدلہ یہی چاہتا ہوں کہ جن کے دل میں اسلام، قرآن اور سنت کی قدر اور محبت ہے وہ اسے کسی سوءِ ظن پر محمول نہ کرتے ہوئے پورے شغف اور انہماک سے پڑھیں یہ ایک طالبانہ علمانہ پیش کش ہے اور پھر اردو میں اپنی نوعیت کا یقیناً پہلا مقابلہ ہے جس میں غلطی کا امکان ہو سکتا ہے۔ آپ اسے غور سے پڑھیے، ممکن ہے آپ غلطیوں کی اصلاح میں معاون و مددگار ثابت ہو سکیں۔

وباللہ التوفیق۔

نوٹ :- یہ قطعاً غیر مذہبی اور غیر سیاسی مقالہ ہے آپ صرف علمی نقطۂ نظر سے تعاون فرمائیں۔

اُمیّت کا مفہوم یہاں ضمناً اس بات کی وضاحت کر دی جائے کہ اصل مضمون یعنی "عربی خط میں نقطوں کا رواج" سے پہلے اُمیّت کا مفہوم اور عربی خط کی ابتداء پر دو ذیلی اور تعارفی نوٹ دیئے جاتے ہیں تاکہ آگے چل کر" مضمون کا اصل حصہ آپ کی دلچسپی کا باعث بن سکے؟ وہو ہذا۔

عام طور پر ہمارے ہاں اُمیت (ان پڑھ ہونے) کو فضائل نبوّت میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس سے بحث نہیں لیکن اس سے یہ اخذ کرنا کہ تمام عرب تھے ہی اَن پڑھ تو اس کی صحت مشتبہ اور صداقت غیر یقینی ہے امام ابن فارس ابوالحسین۔ احمد بن فارس بن زکریا (متوفی ۳۹۵ھ ۱۰۰۴م) نے اس نظریہ کی شدید مخالفت کرتے ہوئے " الصاحبی" میں سینکڑوں صحابہ اور مشرکین کے نام گنوائے ہیں جو پڑھے لکھے اور مختلف علوم و فنون میں اچھی دسترس رکھنے والے تھے اور بعد میں لکھا ہے کہ وما العرب فی قدیم الزمان الا کنحن الیوم فما کل یعرف الکتاب والخط والقرأۃ یعنی قدیم زمانے کے عرب ہماری ہی طرح تھے، جس طرح ہم میں سے ہر شخص لکھا پڑھا نہیں ہوتا اسی طرح ان میں بھی سب کے سب نہ تو ان پڑھ تھے اور نہ ہی پڑھے لکھے۔ (الصاحبی جلد ۸ ص۱۱ طبع مصر ۱۹۱۰ء)

بعض لوگ اور خاص کر مستشرقین جب یہ ثابت کرتے ہیں کہ قرآن نے جاہل طبقہ کو للکارا اور انہیں ہی ہر میدان میں دعوت مقابلہ دیتا رہا وہ اگر کسی مہذب یا تعلیم یافتہ سوسائٹی کو مخاطب کرتا تو یقیناً اس کی اعجازی طاقت کا پول کھل جاتا۔ تو وہ اپنی تائید میں قرآن حکیم کی ان آیات (آل عمران ۲۰، ۷۵، جمعہ ۲) سے بھی استدلال کرتے ہیں یعنی ان میں " امیین " کا لفظ مذکور ہوا ہے جس سے صاف مترشح ہوتا ہے کہ وہ ان پڑھ ہی تھے وغیرہ۔ لیکن ہماری رائے میں یہاں امیت سے مراد کتابی امیت ہے علمی امیت نہیں۔ یعنی قرآن سے پہلے ان کے پاس ایسی دینی کتاب نہیں

تھی جس طرح کہ اہلِ کتاب یہود و نصاریٰ کے پاس تورات و انجیل تھے۔ علامہ حسنین محمد مخلوف "کلمات القرآن" میں امیین کے ذیل میں ایک جگہ لکھتے ہیں "مشرکی العرب" یعنی عرب کے مشرک (ص۳۴۲) دوسری جگہ تحریر کرتے ہیں " العرب المعاصرین له (۴) یعنی وہ عرب جو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم عصر تھے (ص۳۴۶) پھر یہ نہ صرف ہماری یا مفتی مخلوف کی اپنی رائے ہے بلکہ قرآن حمید کی ذیل کی آیت سے بھی یہی کچھ مستفاد ہوتا ہے۔ وَمِنْهُمْ أُمِّيُّونَ لَا يَعْلَمُونَ الْكِتَابَ إِلَّا أَمَانِيَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ فَوَيْلٌ لِلَّذِينَ يَكْتُبُونَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيهِمْ ثُمَّ يَقُولُونَ هَٰذَا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ لِيَشْتَرُوا بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا فَوَيْلٌ لَهُمْ مِمَّا كَتَبَتْ أَيْدِيهِمْ وَوَيْلٌ لَهُمْ مِمَّا يَكْسِبُونَ (بقرہ ۷۸ تا ۷۹)

حاصل ترجمہ یہ کہ۔ ان میں ایک فریق ایسا بھی تھا جو امی یعنی علم کتابی سے نا آشنا تھا ہاں جھوٹ موٹ کا تو انہیں علم تھا (لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ صرف) ان کا اپنا ظن (فاسد) تھا پس جو لوگ جلب منفعت کے لئے اپنے ہاتھوں کی تحریر کو کتاب اللہ کہہ کر لوگوں کو سستے داموں بیچتے ہیں۔ ان کے حال پر نہایت افسوس ہے (بلکہ) ان کا یہ عمل اور جو کچھ انہوں نے اس (عمل) کے ذریعہ کمایا سب سامان ہلاکت کی تمہید ہے۔

اب یہاں اگر کتابی امیت مقصود نہ ہوتی تو اللہ تبارک وتعالےٰ ان کے لکھنے کی خبر کیونکر دیتا؟ حقیقت یہ ہے کہ وہ دین کا انکار کر رہے تھے اور دین ہی سے جہالت کے بعد ان کا امی ہونا ہو سکتا تھا۔۔۔ وہ نفس تعلیم سے آشنا تھے مگر صاحب کتاب نہیں تھے یعنی کتابی امی تھے۔ مفسر ابن جریر طبری (۳۱۰ھ/۹۲۳ء) اپنی اسناد سے حضرت عبداللہ بن عباسؓ (متوفی ۶۸ھ) سے روایت کرتے ہیں کہ الامیون قوم لم یصدقوا رسولا ارسله الله ولا کتابا انزله الله فکتبوا کتابا بایدھم ثم قالوا لقوم سفلة جهال هذا من عند الله وقال قد اخبر انهم یکتبون بایدیھم ثم سماهم امیین لجحودهم کتاب الله و رسوله یعنی امیوں سے وہ قوم مراد ہے جس نے نہ تو کسی رسول کی تصدیق کی اور

نہ ہی کسی کتاب الٰہی پر ایمان لے آئی (اس کے باوجود) اپنے ہاتھوں سے کتاب لکھ کر نچلے درجہ کے جاہلوں سے کہتے تھے کہ یہ کتاب الٰہی ہے۔ (حضرت ابن عباسؓ نے مزید کہا کہ) اللہ تبارک نے خبر دی کہ وہ اپنے ہاتھوں سے لکھتے تھے پھر بھی انہیں امی کہا (یعنی ان پڑھ) یہ اس لئے کہ وہ دراصل حقیقی اَن پڑھ نہیں تھے۔ کتاب اللہ اور رسول اللہ کے انکاری تھے (تفسیر طبری شائع کردہ محمود محمد شاکر جلد دوم صفحہ ۲۵۸، ۲۵۹)

نیز المرأۃ فی الشعر الجاھلی ڈاکٹر احمد محمد خوفی طبع مصر صفحہ ۳۳۳، ۳۳۴) ان آیات الٰہی کے علاوہ بعض لوگ "امیت" کے ثبوت میں ارشادات نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) کا سہارا بھی لیتے ہیں یعنی ان کا کہنا ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لکھنے سے نہ صرف منع فرمایا بلکہ لکھے ہوئے کو محو کرا دیا[1]۔ لیکن ایسے حضرات کی خدمت میں التماس ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے اتنے سوء ظن کی کوئی ضرورت نہیں ہے آپ کے کسی بھی ارشاد کو ایسے غلط مفہوم پر محمول کرنا نہ صرف خوف خدا سے بعید ہے بلکہ علمی دیانت داری کے بھی منافی ہے قرآن حکیم میں نٓ۔ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُونَ۔ یعنی قلم اور قلم سے تحریر کی ہوئی چیزوں کو گواہ بنا کر "علم اور تحریر کی نہ صرف حوصلہ افزائی کی گئی ہے بلکہ درپردہ لکھنے اور پڑھنے کا حکم بھی دیا گیا ہے۔ کیا ایسے حکم کی موجودگی میں رسول اللہ اپنی امت کو اَن پڑھ بنا سکتے تھے؟ صلی اللہ علیہ وسلم۔ امام خطیب بغدادی (متوفی ۴۶۳ھ) نے "تقیید العلم" میں پہلے تمام ان احادیث کا باسند ذکر کیا ہے جن میں لکھنے کی ممانعت ہے پھر اثبات کی احادیث لا کر بعد میں جو تبصرہ کیا ہے وہ ہمارے خیال میں ارشادات نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بہترین توجیہ ہو سکتی ہے۔ خطیب کہتا ہے کہ

"ان دونوں قسم کی احادیث کو ملانے سے واضح ہو جاتا ہے کہ صدر اول میں جن لوگوں نے کتابت کو ناپسند کیا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ کوئی اور تصنیف کتاب اللہ کے ہم پلہ قرار نہ پا جائے اور یہ کہ لوگ کتاب اللہ کے

---

[1] یہ صرف احادیث (غیر از قرآن) کے لکھنے کے متعلق تھا مطلق کتابت کے متعلق نہیں تھا۔ قرآن کریم کی کتابت میں خود نبی اکرمؐ نے جس قدر اہتمام فرمایا اس کی وضاحت کی ضرورت نہیں۔

ماسوا کسی اور تحریر میں منہمک ہو کر کتاب اللہ سے بے نیاز نہ ہو جائیں
اسی بنا پر ہی قدیم مقدس کتابوں (تورات و صحیفہ دانیال وغیرہ) کی
تلاوت سے صحابہ کو روک دیا گیا تھا کیونکہ ان میں (اس وقت)
حق و باطل، صحیح اور فاسد کا امتیاز مشکل ہو چلا تھا اب صرف قرآن
ہی کافی تھا اور اسے ہی ان پر مھیمن (نگراں) بنایا گیا تھا۔ پھر یہ
وجہ بھی کہ صدر اول میں ایسے فقیہ (سمجھدار) کاتبوں کی قلت تھی جو
وحی اور غیر وحی میں امتیاز کرنے پر قادر ہو سکتے۔ کیونکہ عربوں کی
اکثریت تفقہ فی الدین ہی میں جب فائق نہیں تھی اور نہ ہی انہیں
دین کی نفسیات کا علم رکھنے والے صحابہ اور علماء کی صحبت نصیب تھی
(تفقہ فی الکتابت تو دور کی چیز رہی) تو ایسے میں اندیشہ تھا کہ یہ لوگ
جو کچھ صحائف (کاپیوں) میں لکھا ہوا پاتے اسے قرآن ہی سے ملحق
کر دیتے۔ اور پھر آہستہ آہستہ یہ عقیدہ رکھنے لگ جاتے کہ جو کچھ
ان صحائف میں شامل ہے وہ کلام الرحمان ہی ہے۔

(تقیید العلم ص۵۷ طبع دمشق ۱۹۴۹ء)

خطیب نے اس توجیہ میں کہا ہے کہ فقیہ کاتبوں کی قلت تھی یہ نہیں کہا کہ عام
طور پر کوئی کتابت جانتا ہی نہ تھا۔

امید ہے کہ حضرت ابن عباسؓ کی تفسیر کی روشنی میں امیت کا مفہوم واضح
ہو چکا ہوگا۔ اب آپ عربی خط کی ابتدار کی طرف آئیے۔

عربی خط کی ابتدار

نقطوں سے پہلے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ عربی خط کی
ابتدار کب سے ہوئی؟ کیونکہ جب تک کسی چیز کی ابتدا
معلوم نہ ہو عوارض اور لوازمات کا علم غیر ضروری ہو جاتا ہے ہمارے خیال میں
اس سوال کا جواب نہ صرف مشکل ہے بلکہ محال بھی ہے کیونکہ عرب روایات اور
مستشرقین کے اقوال اس قدر باہم متضاد، متعارض اور مختلف فیہ ہیں جن کی روشنی
میں یہ فیصلہ کرنا نہ صرف دشوار بلکہ مایوس کن ہے تاہم عرب روایات کی رو سے

جہاں تک ظن غالب کا تعلق ہے اس کی ابتدا ہجرت نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) سے دو سو سال پہلے لخمی ایمپائر کے کالیڈی مرکز حیرہ (موجودہ کوفے سے ۲ ½ میل کے فاصلہ کے مقام پر) سے ہوئی (دراصل شاہان بنو لخم یمن سے نکل کر شام اور فلسطین چلے آئے تھے اور یہاں پہنچ کر انھوں نے نئی سلطنت کی داغ بیل ڈالی تھی)۔ اور انہوں نے "انبار" سے عربی خط سیکھا۔ انبار کالیڈیا میں فرات کے شمالی کنارے پر ایک قدیم اور متمدن شہر تھا جسے ۶۳۳ء میں حضرت خالد بن الولیدؓ نے فتح کیا۔ اور انبار نے یمن کے حمیری خط کے نقل اتاری۔ حمیری یمن کے قدیم باشندے تھے جو سینکڑوں برس سے اپنی امتیازی خصوصیات اور علوم و فنون میں کامل دست گاہ رکھنے سے مشہور تھے۔ انہوں نے آخری وقت میں قسطنطین دوم (رومی ایمپائر کا نمائندہ ۳۶۱ء) کے عہد میں عیسائیت قبول کی۔ بہرحال حمیری خط کی ابتدا قحطانی عرب کے بولان قبیلہ کے تین افراد نے کی۔ بولان کا مورث اعلیٰ عضین بن عمرو بن الغوث بن طی بن داد بن زید بن یشجب بن عریب بن زید بن کہلان تھا۔ اس قبیلہ کے جن تین افراد نے عربی خط کو سنوارا اور نقطے ڈالے ان کے نام "نقطین" کے عنوان میں ملاحظہ فرمایئے۔ (نیز مزید تفصیل کے لئے ذیل کی کتابیں ملاحظہ ہوں۔ فتوح البلدان ص ۴۷۶ و ۴۷۷، کتاب المصاحف ص ۴، ۵، العقد ابن عبدربہ ص ۲۴، الوزرا والکتاب ص ۱۲، ۱۴۔ ادب الکاتب صولی ص ۲۸ تا ۳۰۔ ابن فارس الصاحبی ص ۷۔ التنبیہ علی حدوث التصحیف قلمی تیموری کتب خانہ مصر ص ۳۰ تا ۳۵ صبح الاعشیٰ ص ۳، ۱۱۔ تاریخ اللغات السامیہ ولفنسن ص ۱۶۲، ۱۶۱۔ مجلۃ کلیۃ الآداب مئی ۱۹۳۵ء۔ ابن الندیم ص ۶ تا ۸ وغیرہ۔

ان تاریخی نصوص (و تصریحات) سے واضح ہوا کہ جس طرح ہجرت نبویؐ سے دو سو سال پہلے۔ اہل حیرہ سے عربی خط کا آغاز ہوا۔ اتنا ہی عرصہ پہلے انبار اور حمیری قبیلہ اس کی ابتدا کر چکے تھے۔ یعنی دوسری تا تیسری صدی میلادی کے قریب ادھر عرب روایات کی تائید ان حجری نقوش اور بردی کے چیتھڑوں پر لکھی ہوئی عبارتوں سے بھی ہوتی ہے جن کا زمانہ دو سو دس مسیح سے شروع ہو کر پانچسو گیارہ مسیحی

تک پہنچتا ہے۔ چنانچہ اس وقت تیسری صدی مسیحی تک کے جو نقوش دریافت ہوئے ہیں ان کی تعداد پانچ بتائی جاتی ہے۔ اور وہ یہ ہیں۔

۱۔ وہ تحریر جو سقوط سلع کے بعد ۱۰۰ھ میں لکھی گئی (یعنی ۲۱۰ء میں) اس کا طرز تحریر اسلامی خط کے ابتدائی دور سے ملتا جلتا ہے۔ حتیٰ کہ پہلی سطر کا چوتھا لفظ (بن) اور پانچویں سطر کا پہلا لفظ (یعلی) اسلامی عربی خط کے بالکل مشابہ ہے۔

۲۔ دوسری تحریر جو پہلی تحریر کی طرح وادئ سینا کے فران جزیرہ میں دریافت ہوئی اس پر سقوط سلع کے بعد ۱۲۶ھ درج ہے (یعنی ۲۳۶ء) اس کی پہلی سطر کا لفظ (سلم) اور آخری سطر کا لفظ (بن) صاف پڑھے جاتے ہیں۔

۳۔ تیسری تحریر بھی وادئ سینا میں دریافت ہوئی جس پر سقوط سلع کے بعد ۱۴۵ھ درج ہے (یعنی ۲۵۳ء) اس کی پہلی سطر کا دوسرا لفظ (کلب) اور اسی سطر کے دو آخری لفظ (بن عمرو) موجودہ عربی خط سے ملتے جلتے ہیں۔

۴۔ چوتھا نقش شمالی حجاز (مدینہ منورہ سے تقریباً ۳ سو میل) کی وادی حجر کے "مدائن صالح" میں برآمد ہوا جس کی تاریخ سقوط سلع کے بعد ۱۶۲ھ کی طرف لوٹتی ہے (یعنی ۲۶۷ء) اس کی پہلی سطر کا آخری لفظ (بن) اور تیسری سطر کا پہلا لفظ (عبد) اور چھٹی سطر کا آخری لفظ (لعن) اور نویں سطر کا دوسرا لفظ وہی (لعن) صاف پڑھا جاتا ہے۔

۵۔ ان سب سے جو نقش بعد میں دریافت ہوا وہ حوران منطقہ کے ام الجمال گاؤں میں بغیر تاریخ کے ملا ہے لیکن کانٹ (DEVOGUE) وغیرہ کے خیال میں یہ نقش ۲۷۰ء میلادی کا ہے۔ اس کی دوسری سطر کا دوسرا لفظ ایک نام (سلی) اور اسی سطر کا آخری لفظ (جذیمہ) اور تیسری سطر کا پہلا لفظ (ملک) ہے جو بالکل صاف لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

چوتھی صدی مسیحی اس صدی میں صرف ایک ہی تحریر۔ حوران منطقہ کے مرکزی شہر نمارہ میں عرب کے بادشاہ امرؤالقیس بن عمرو کی قبر سے دریافت ہوئی ہے۔ کہنے کو تو پوری صدی کی یہ ایک ہی تحریر ہے

لیکن عربی رسم الخط کی تاریخ میں اس کی اہمیت اور قدر و قیمت سابقہ تمام تحریروں سے زیادہ ہے کیونکہ اس کے اکثر بلکہ قریب قریب سب کے سب الفاظ اپنی ہیئت ترکیبی اور صورت خطی کے لحاظ سے اسلام کے ابتدائی رسم الخط کے مشابہ ہیں اس کی پہلی سطر کا دوسرا تا ساتواں کلمہ اس طرح ہے۔ "تفس امرالقیس بن عمرو ملك العرب" اور دوسری سطر کا پہلا تا چھٹا کلمہ اس طرح ہے۔ " وملك الاسدین و نزدو ۔ وملوکهو وهریب مذ جحو" اور تیسری سطر کا پہلا اور پانچواں تا آخر کلمہ اس طرح ہے۔ " الشعوب..... فلم یبلغ ملك مبلغه " اور چوتھی سطر کا پہلا، دوسرا اور تیسرا لفظ اس طرح ہے " عکدی (قوت) هلك ۔ سنة "

الغرض یہ تحریر صورت خطی کے علاوہ زبان اور ادب وصوت کے لحاظ سے بھی زیادہ تر عربی ہی ہے بلکہ یہ تاریخ کے ایسے مرحلہ میں پہنچا دیتی ہے جس کی رو سے ہم عربی خط کے تدریجی ارتقاء اور تبدیلیوں کا صحیح اندازہ بھی کر سکتے ہیں۔ اس کے بعد آخر میں سقوط سلع کے بعد ۲۲۳ھ یعنی ۳۲۸ء درج ہے۔

چھٹی صدی میلادی اس صدی کے تا حال دو نقش ملے ہیں پہلا نقش قنسرین اور فرات کے مابین " زبد " کے کھنڈرات میں دریافت ہوا جس کی تاریخ ۵۱۱ء میلادی کی طرف لوٹتی ہے یہ نقش تین زبانوں یونانی سریانی اور عربی میں کندہ کرایا گیا تھا اس کا رسم الخط اسلامی عہد کے کوفی رسم الخط کے مشابہ ہے بلکہ چند ایک کے ماسوا اس کے تمام تر الفاظ بھی عربی ہی ہیں۔ الا یہ کہ اس کے بعض حروف ابھی تک صحیح طور پر نہیں پڑھے جا سکے۔ مثلاً پہلی سطر اس طرح ہے "...... الاله شرحو بر ـــــ منفو .... برامریٔ القیس" دوسری سطر یوں ہے " وشرحو بر سعد و وسترو وشریحو "

دوسرا نقش سقوط سلع کے بعد ۴۶۳ھ یعنی ۵۶۸ء میلادی کا ہے جو شام کے شمالی علاقے میں جبل دروز سے متصل حران (شہر) کے " لجا " گرجا گھر میں

ملا ہے اس پر یونانی اور عربی میں اس طرح لکھا ہوا ہے۔ پہلی سطر "انا شرحیل بن ظلمو لبنیتُ ھذا المرطول"۔ دوسری سطر "ستہ ۴۶۳" تیسری سطر "خیبر" چوتھی سطر "بعام"۔ ولفنسن، تاریخ اللغات السامیہ (ص ۱۹۲) میں لکھتا ہے کہ امراء بنی غسان میں سے حارث بن ابی شمر نے خیبر کو تاخت و تاراج کرکے لوگوں کو غلام بنایا اور غلام بنا کر پھر رہا کرکے شام کی طرف رُخ کیا اس تحریر میں اسی واقعہ کا ذکر ہے۔

ان نقوش میں پانچویں صدی میلادی کا نقش نہیں ملا۔ اور یہی وہ خلا ہے جسے علمائے لسانیات پُر کرنے کی ان تھک محنت کر رہے ہیں کیونکہ اس کے بغیر عربی تحریر کی تاریخ کا تسلسل غیر مربوط ہو جاتا ہے لیکن عرب کے ریتلے صحرا، پہاڑی غار اور سینکڑوں تباہ شدہ شہر جو کھدائی کے انتظار میں ساکت وصامت کھڑے ہیں ان کی کھدائی نہ صرف اس تسلسل کو ٹوٹنے سے بچالے گی بلکہ بہت سے اسرار وغوامض سے بھی نقاب کشائی کی توقع کی جاسکتی ہے۔

ان تمام تحریروں اور نقوش کے عکس بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ "چربے" "کتاب" مصادر الشعر الجاہلی مصنفہ ڈاکٹر ناصر پی، ایچ، ڈی، قاہرہ (طبع اول ۱۹۵۶ء ص ۲۶، ۲۸، ۳۰ پر ملاحظہ ہوں) ان نقوش سے اتنا پتہ چلا کہ عربی خط اسلام سے بلا واسطہ دو سو سال اور بالواسطہ چار سو سال پہلے رائج ہو چکا تھا۔ اور واضعوں کے بلند مذاق کی وجہ سے تمام عیوب ونقائص سے اسے پاک وصاف رکھنے کی کوشش کی گئی تھی۔ پاک وصاف سے مراد۔ خط کی نوک وپلک یا تہذیب مراد نہیں ہے بلکہ وہ عیب جو ایک کثیر التشابہ زبان میں ہو سکتے ہیں۔ اس کے بعد اسلامی عہد کا آغاز ہوتا ہے یہاں پہنچ کر ہمیں اگرچہ مایوسی ہوتی ہے کہ مسلمانوں کی بے توجہی سے قرن اول کا اتنا قیمتی اثاثہ یوں لاپروائی کی نذر ہو گیا کہ آج ہم پورے وثوق سے کلام پاک کا کوئی نسخہ بھی موجود نہیں پاتے[۱]

۱؎ غالباً یہ کہنا مقصود ہے کہ نبی اکرمؐ کے عہد مبارک کا لکھا ہوا قرآن کریم کا کوئی نسخہ اس وقت تک دریافت نہیں ہوا۔

تاہم اتنا غنیمت ہے کہ تاریخ کے بے رحم ہاتھوں سے بچ بچا کر اس مبارک عہد کی دو تحریریں اس وقت بھی ہمارے پاس موجود ہیں اور اب ہم عربی تاریخ کے ضمن میں اخذ نتائج اور استنباط میں بھٹک نہیں سکتے۔ پہلی تحریر حضرت عثمانؓ بن عفان (شہید ۳۵ھ/۶۵۵م) کے زمانے کی ہے جس پر اکتیس ۳۱ ہجری کی تاریخ درج ہے۔ یعنی ۶۴۳ء میلادی۔ یہ تحریر "عربک میوزیم" قاہرہ میں زیر ۹ محفوظ ہے۔

دوسری تحریر بحمداللہ اس سے بھی قبل کی ہے یعنی غزوۂ خندق ۵ھ ہجری مطابق ۶۲۷ء) کی جو کہ مدینہ منورہ کی سلع پہاڑی کی جنوبی چوٹی سے برآمد ہوئی۔ (تفصیل ملاحظہ ہو مصادر الشعر الجاہلی ص۲۴ تا ص۳۳)

اس تفصیل سے آپ نے اتنا تو معلوم کر لیا کہ عربی خط کی ابتدا اسلام سے بہت پہلے ہو چکی تھی۔ اب رہا یہ سوال کہ ان کتبات و نقوش میں سے اکثر ایسے ہیں جو نقطوں سے عاری ہیں۔ تو اس کے متعلق ذیل کی معروضات حاضر ہیں۔ اور یہی وہ معروضات ہیں جن کے لئے آپ کو انتظار کی زحمت اٹھانی پڑی۔

نقطوں کی ابتداء

سابقہ سطور میں دس کتابوں کے حوالے سے یہ ثابت کیا جا چکا ہے کہ عربی خط کی ابتدا اسلام سے محتاط اندازے کے مطابق چار سو سال پہلے ہو چکی تھی اور اسے مہذب بنانے، درجۂ کمال تک پہنچانے اور لفظی تشابہ دور کرنے والے بولان قبیلہ کے تین افراد تھے۔ ان تین افراد میں سے ایک کا نام عامر بن جدرہ تھا جس نے عربی خط میں نقطوں کا اضافہ کیا۔ یہ روایت فنی لحاظ سے اگرچہ اتنا فائدہ نہیں دے سکتی جتنا کہ مطلوب ہے۔ تاہم تاریخی طور پر ہم آسانی سے اتنا سمجھ سکتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ الاعجام (نقطوں) کے موجودہ مفہوم سے آشنا ضرور تھے۔ اور کہ یہ لفظ (الاعجام) اپنے اسی مفہوم میں حضرت ابن عباسؓ سے پہلے بھی رائج، مشہور اور معروف تھا۔ یا کم از کم حضرت ابن عباسؓ سے نچلا راوی اس کے مفہوم سے پوری طرح واقف تھا اور اسی طرح لوگوں کے لئے بھی یہ لفظ اسی مفہوم میں اجنبی نہیں تھا۔ جب ہی تو انھوں نے راوی کی سنی اور سن کر اسے تسلیم کر لیا۔

بہر حال یہ بات کہ نقطوں کے موجد حجاج بن یوسف (متوفی ۹۵ھ ۷۱۴ء) یا یہ شہرت کہ ابوالاسود دولی (متوفی ۶۹ھ ۶۸۸ء) تھے قطعاً غلط اور ثبوت کے لحاظ سے تاریخ پر افترا ہے۔ کیونکہ نقطوں اور عربی خط کی ابتدا ان کے پیدا ہونے سے پانچسو سال پہلے ہو چکی تھی۔ مشہور مورخ و نساب اور لغوی امام احمد بن علی بن احمد معروف (متوفی ۸۲۱ھ ۱۴۱۸ء) اپنی شہرۂ آفاق کتاب "صبح الاعشیٰ جلد سوم ص۱۵۵ پر لکھتا ہے کہ

"والظاهر ما تقدم يعني ان الاعجام موضوع مع وضع الحروف اذ يبعد ان الحروف قبل ذالك مع تشابه صورها كانت عرية عن الى حين نُقّط المصحف"۔ یعنی اوپر کی تفصیل سے معلوم ہوا کہ جوں ہی عربی کے حروف وضع کئے گئے تھے نقطے بھی ساتھ ہی وضع کئے گئے کیونکہ یہ بعید از عقل ہے کہ صوری مشابہت کے باوجود عربی حروف کو اس وقت تک نقطوں سے خالی رکھا گیا جب تک کہ مصحف پر نقطے نہیں ڈالے گئے؟ (نیز ملاحظہ ہو مفتاح السعادۃ ومصباح السیادۃ لاحمد بن مصطفےٰ عرف طاش کبرے زادہ متوفی ۹۶۸ھ ۱۵۵۹ء جلد اول ص۸ طبع مصر)

مصحف نبوی پر بھی نقطے تھے

سلف صالحین کا یہی عقیدہ تھا اور ہر مسلمان کا یہی عقیدہ ہونا چاہئے کہ قرآن مجید پر زبر، زیر، پیش (اور نقطوں) جیسا بنیادی اور عظیم کام آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود ہی سرانجام دے گئے تھے (اتقان ص۱۴۲ تا ص۱۴۷) بلکہ آپ نے اپنی امت کو حکم دے دیا تھا کہ اعربوا القرآن۔ یعنی قرآن پر اعراب لگاؤ (بیہقی، ابویعلی بحوالہ مشکوٰۃ ص۱۸۱، جامع صغیر جلد اول ص۴۸، منتخب کنز العمال جلد اول ص۳۸۶، تاریخ خطیب جلد ۸ ص۷۷، بغیۃ الوعاۃ ص۱۵۶، فضائل ابن کثیر ملحق بہ تفسیر ابن کثیر ص۲۰ وغیرہ) یہاں اعراب سے مراد تحریر کے تمام وہ قواعد و ضوابط ہیں جو عہد نبویؐ میں رائج تھے۔ تنہا زبر، زیر، پیش نہیں۔ کیونکہ حقیقی تشابہ نقطوں ہی سے دور ہو سکتا تھا۔

بہرحال اس امرنبویؐ کے مطابق مصاحف نبویؐ پر نقطے لگائے گئے لیکن اس کے بعد پھر کیا ہوا؟ اس کی تفصیل عرض ہے۔ امام شمس الدین محمد بن عرف جزری (متوفی ۸۳۳ھ/۱۴۲۹ء) لکھتے ہیں کہ ثم ان الصحابۃ رضی اللہ عنہم لما کتبوا تلک المصاحف جردوھا من "النقط" والشکل لیحتملہ مالم یکن فی العرضۃ الاخیرۃ مما صح عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم یعنی بعد میں جب صحابہ کرامؓ نے نبویؐ مصاحف کو لکھنا شروع کیا تو انھوں نے نقطے اور دیگر علامات کو اڑا دیا کیونکہ جو الفاظ مختلف قرأتوں سے پڑھنا ثابت تھے (کہاں ثابت تھے؟ ثبوت ندارد۔۔۔ طارق) ـــــ اب دیکھنا یہ تھا کہ ان الفاظ کو آخری مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کس طرح تلاوت فرمایا۔ تاکہ مجمع علیہا فیصلہ کے بعد ہی آخری قرأت کو ضبط تحریر میں لایا جائے۔ (اور نقطوں سے اس چیز کا پہلے ہی تعین ہوجاتا تھا جو کہ ناقلین کو منظور نہیں تھا)۔ (النشر فی القرأت العشر طبع دمشق جلد اول ص۳۲ تا ص۳۳ طبع قاہرہ ص۳۳)

امام جزری نے مذکورہ کتاب اختلاف قرأت کو ثابت کرنے کے لئے لکھی ہے مگر "نقاط" کے ضمن میں انہیں یہ اعتراف کرنا ہی پڑا کہ صحابہ کرامؓ نے حذف کردیئے تھے (رسول اللہؐ نے لگوا دیئے تھے) حضرت عبداللہ بن مسعودؓ (متوفی ۳۲ھ/۶۵۲ء) فرماتے ہیں کہ جردوا القرآن لیربوفیہ صغیرکم ولاینأ عنہ کبیرکم۔ یعنی قرآن کو نقطوں سے صاف کردو تاکہ چھوٹے بھی اسی طرح پڑھتے رہیں اور بڑے بھی دور نہ جائیں، مقصد یہ کہ انھیں ذہن پر زور دے کر الفاظ حل کرنے پڑیں گے اور اس طرح وہ قرآنی ماحول ہی کے ہو جائیں گے یعنی کسی بہانے قرآن ہی ان کی دلچسپی کا مرکز ہوگا۔ بہرحال حضرت ابن مسعودؓ کے اسی جردوا کی تفسیر میں امام زمخشریؒ (متوفی ۵۳۸ھ/۱۱۴۳ء) لکھتے ہیں کہ اراد تجریدہ عن "النقط" والفواتح والعشور لئلا ینشأ نشئ فیری انھا من القرآن۔ یعنی جردوا سے ان کی مراد یہ ہے کہ قرآن کو نقطوں اور سورتوں کے تعارفی فقروں مثلاً "سورۃ الفاتحۃ مکیۃ وہی سبع آیات" اور ہر دس آیات کے بعد (اس زمانے میں) ایک آیت لگانے کا جو رواج تھا انھیں

حذف کرنا چاہیئے کیونکہ آگے چل کر کسی کے دل میں یہ خیال پیدا نہ ہو کہ یہ بھی عین قرآن ہی ہیں (الفائق زمخشری جلد اول ص۱۰۶ طبع مصر) یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان (اعربوا) اور عمل (تلك المصاحف) کے برعکس ان علامات و رموز کو اڑا دیا گیا۔ خیر اس سے بحث نہیں۔ تاہم ان دو حوالوں سے اتنا تو واضح ہو ہی گیا کہ حجاج اور دو ولی سے پہلے ہی صحابہ کرامؓ "نقطوں" کے موجودہ مفہوم سے بخوبی واقف تھے۔

اور یہ کہ یہ نقطے آں حضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے مصاحف پر باقاعدہ لگائے گئے تھے لیکن نقل ثانی کے وقت یا بالفاظ دیگر آں حضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد نقطوں کو جان کر حذف کر دیا گیا۔ (روایات کی روشنی میں۔ طارق)

یہاں یہ وضاحت کر دی جائے کہ بعض لوگوں نے "تجریل" سے مراد تفسیر، تشریح، حدیث یا قصہ وغیرہ بھی لی ہے یعنی ان چیزوں کو قرآن سے الگ کر دیا جائے لیکن امام جزری اور امام زمخشری کی طرح قاضی ابوبکر محمد بن عبداللہ ابن العربی (متوفی ۵۴۳ھ) نے بھی تجرید سے نقطے ہی مراد لئے ہیں اور اس پر اس نے تفصیل سے لکھا ہے کہ اس طرح صحابہ کرامؓ اختلاف قرأت کا حق محفوظ رکھنا چاہتے تھے۔ کیونکہ نقطے ڈالنے سے قرأت کا خود بخود تعین ہو جاتا تھا تفصیل ملاحظہ ہو۔

العواصم من القواصم لابن العربی طبع الجیریا (جلد دوم ص۱۹۶-۱۹۷)

صحابہ کرام نقطے لگاتے تھے

امام ابوزکریا یحیٰ بن زیاد عرف فرالنحوی (متوفی ۲۰۷ھ) روایت کرتے ہیں کہ سفیان بن عیینہ (متوفی ۱۹۸ھ) نے اپنی سند سے اس میں حدیث بیان کی کہ کتب فی حجر لسر۔ ولوبیس (الحدیث) یعنی ایک پتھر پر یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے۔ اب جو میں دیکھتا ہوں تو زید بن ثابت (متوفی ۴۵ھ) نے پہلے لفظ پر چار نقطے ڈال دیئے یعنی سین پر تین نقطے ڈال کر شین بنا دیا اور ر[illegible] پر ایک نقطہ ڈال کر زا میں تبدیل کر دیا۔ اسی طرح دوسرے لفظ میں نقطوں کے

علاوہ سین کے بعد ھار کا اضافہ کر کے لحہ یتسنہ بنا دیا (معانی القرآن فرّاء جلد اول صـ ۱۷۲،۱۷۳،۱۷۴ طبع مصر) کیا حضرت زید بن ثابتؓ نقطوں کا علم نہ رکھتے تھے یوں ہی قرآن میں سین کو شین اور راء کو زا بنا لیتے تھے؟ کیا یہ کام بغیر واقفیت کے ممکن ہو سکتا تھا؟ ہمارے خیال میں حضرت زیدؓ چونکہ کاتب الوحی تھے۔ جس طرح مصاحف نبویؐ میں نقطے ڈالنے سے مشق ہو گئی تھی بعد میں بھی جب کہیں کوئی لفظ بے نقط لکھا پاتے تو سنت نبویؐ کے مطابق فوراً بانقط بنا دیتے تھے لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ۔ اور صحابہؓ سے بڑھ کر اسوۃ الرسولؐ کا زیادہ پابند کون ہو سکتا تھا؟

تابعین کی اطلاع

عبداللہ بن سلیمان بن اشعث ابن داؤد سجستانی متوفی ۳۱۶ھ اپنی سند کے ساتھ بیان کرتا ہے کہ

الحجاج بن یوسف غیّر فی مصحف عثمان احد عشر حرفا ......
وکانت فی یونس (۲۲) ھوالذی ینشرکم فغیّرہ یسیّرکم یعنی حجاج بن یوسف نے عثمانی مصحف کے گیارہ حروف بدل دیئے مثلاً سورۂ یونس کی بائیسویں آیت میں ہے کہ ینشرکم (یعنی۔ یا۔ نون اور شین) تو حجاج نے بدل کر یسیرکم (یعنی یا۔ سین پھر یاء) بنا دیا (کتاب المصاحف طبع مصر ۱۹۳۶ء صـ ۴۹، صـ ۱۱۷)

اس روایت سے معلوم ہوا کہ حجاج سے پہلے ہی نقطے ڈالنے کا رواج تھا اور حجاج اسے بخوبی سمجھتا تھا کیونکہ اگر سابقہ (عثمانی) مصحف میں نقطے نہ ہوتے تو اسے کس طرح پتہ چلتا کہ یہاں ینشرکم ہے اسے یسیرکم بنا دینا چاہئے۔؟ بالآخر اس تشابہ کو دور کرنے کی حضرت عثمانؓ نے نقاط کے بغیر تو کوئی صورت تجویز نہیں کی ہوگی۔ اور جب نقاط ڈالے تب ہی حجاج کا تغیر و تبدل سمجھ میں آسکتا ہے ہر حال یہ روایت بھی اس نظریہ کی تکذیب کرتی ہے کہ حجاج ہی کے حکم سے نقطے ایجاد ہوئے۔ وغیرہ۔

تاریخی شہادت ثبوت کے لحاظ سے وہی بات پختہ اور مدلل کہی جاسکتی ہے جو دعوے کے ساتھ اپنے اندر دلیل بھی رکھتی ہو۔ یہ بات کہ صحابہ کرامؓ نقطوں سے اچھی طرح واقف تھے اس کی تصدیق اس وثیقہ سے ہوسکتی ہے جو ۲۲ھ ہجری میں (عمر بن الخطاب (شہید ۲۳ھ) کے زمانے) ورق بردی پر یونانی اور عربی زبان میں لکھا گیا یہ وثیقہ متلاشیان حق وصداقت اور شیدایان تاریخ کے لئے اطمینان اور تسکین کا موجب ہے کہ اس کے بعض حروف معجم و بانقط ہیں مثلاً۔ خاء ۔ ذال۔ زاء ۔ شین اور نون ۔ اس وثیقہ کے عکس بمعہ تعارفی نوٹ و ترجمہ کے لئے ملاحظہ ہو ڈاکٹر گراہمن کی کتاب

FROM THE WORLD OF ISLAMIC PAPYRI

Pt. II (a) P. 82, 113, 114

اس ضمن میں قرن اول کا ایک اور نقش جو حضرت امیر معاویہؓ (متوفی ۶۰ھ) کے عہد میں ۵۸ھ ہجری میں لکھا گیا تھا۔ بین ثبوت ہے اس بات کا کہ اس وقت نقطے ڈالنے کا عام رواج تھا کیونکہ حضرت معاویہؓ کی اس تحریر پر جو کہ طائف سے برآمد ہوئی ہے واضح طور پر نقطے لگے ہوئے ہیں اس کا عکس زیر ۱۸ ڈاکٹر جی، سی، مائلز کے مقالہ بعنوان EARLY ISLAMIC INSCRIPTIONS NEAR TAIF IN THE HIJAZ JENST (1948) پر ملاحظہ ہو

(بحوالہ مصادر الشعر الجاہلی ص۴۲)

لغت اور اشعار جاہلیت سے استدلال ابن السید بطلیوسی (متوفی ۵۲۱ھ) لکھتے ہیں کہ

فاذا نقطتہ قلت وشمتہ وشما۔ ونقطتہ نقطا واعجمتہ اعجاما ورقمتہ ترقیما یعنی عرب نقطہ کے لئے وشم، عجم۔ نقط اور ترقیم کے الفاظ استعمال کرتے تھے۔ مثلاً جب کہنا ہوتا کہ وشمتہ اعجمتہ اور رقمتہ تو اس سے مراد لیتے تھے نقطتہ یعنی یہ تینوں لفظ نقطے کے مترادف استعمال کئے جاتے تھے، ہوسکتا تھا کہ ابن السید بطلیوسی کی اس شہادت کو درخور اعتنا نہ سمجھا جاتا لیکن وہ اپنی تائید

یں جاہلیت کے تین بڑے شاعروں ابی ذویب (متوفی ۶۴۸ء) مرقش بن سعد بن مالک حیری اور طرفہ بن العبد (مولود ۵۴۳ء و مقتول ۵۶۹ء) کے ابیات کو بھی پیش کرتا ہے۔ ابوذویب جو جاہلیت اور اسلام کا شاعر تھا کہتا ہے کہ ؎

برقم ووشم کما نمنمت بمشیمھا المزدھاۃ الھدی

یعنی حمیری کاتب نے قرضے کی میعاد والے کاغذ کی تحریر پر نقطے ڈال کر ایسا مزین بنا دیا جیسے عروسہ کسی قیمتی ہدیہ کو سوزن کاری سے منقش بنا کر پیش کرتی ہے۔

مرقش کا بیت ہے ؎

الدار قفر والرسوم کما رقش فی ظھر الادیم قلم

یعنی خالی مکان کے نقوش و آثار ایسے نظر آرہے ہیں جیسے کسی نے ادیم (جاہلیت کا کاغذ) پر قلم سے نقطے ڈال دیئے ہوں۔ اور طرفہ کہتا ہے کہ

کسطور الرق رقشہ بالضحی مرقش یشمہ

یعنی دوپہر کے وقت کاغذ پر کسی لکھنے والے نے نقطے ڈال دیئے ہوں۔

(الاقتضاب بطلیوسی ص ۹۳)

ہوسکتا تھا کہ ہم ابن السید بطلیوسی کی رائے کو عجلت اور جلد بازی پر محمول کرتے اور وشم، ترقیم اور ترقیش کو صرف حسن خط سے تعبیر کرتے لیکن جب ہم دیکھتے ہیں کہ علامہ یوسف بن سلیمان ابو الحجاج عرف الاعلم الشنتمری (متوفی ۱۰۸۳ء) طرفہ مذکور کے بیت کی تشریح میں فرماتے ہیں کہ و قولہ کسطور رق شبہ رسوم الربع بسطور الکتاب و معنی رقشہ زینہ وحسنہ بالنقط۔ (دیوان طرفہ طبع یورپ ۱۹۰۰ء مع شرح شنتمری ص ۷۹) یعنی رقش کے معنے ہیں نقطوں سے خط کو مزین و خوبصورت بنانا۔

اس سے آگے چلئے تو علامہ ابو علی اسماعیل بن القاسم بن غیدون عرف القالی بغدادی (متوفی ۳۵۶ھ ۹۶۷ء) کی تحقیق سے بھی یہی کچھ مستفاد ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ رقشت الکتاب رقشا و رقشتہ اذا کتبتہ و نقطتہ میں نے کتاب کو مرقش کیا یعنی لکھا اور نقطے ڈالے (الامالی للقالی جلد ۲ ص ۲۳۶

طبع مصر) اس کے بعد علامہ قالی نے بھی طرفہ کا وہی بیت پیش کیا جو اپنی تائید میں دیگر ائمہ اور اہل لسان پیش کرتے آئے۔

عرب جاہلیت کے تمام بانقط اور بے نقط خط

عرب جاہلیت والے خوبصورت یعنی بانقط خط کو کئی ناموں سے یاد کرتے تھے مثلاً ترقیش، ترقیم، نمنمہ، وشم اور تنمیق (ملاحظہ ہو دیوان الہذلیین جلد اول ص۶۴، ص۶۵، المؤتلف والمختلف ص۲۷ دیوان حاتم الطائی ص۲۳، دیوان سلامہ بن جندل ص۱۵) یعنی خوبصورت خط کی علامت یہ ہوتی تھی کہ وہ بانقط ہوتا تھا۔ اور بدصورت خط کی علامت یہ ہوتی تھی کہ وہ بے نقط ہوتا تھا۔ چنانچہ ایسے خط کو "مشق" کہتے تھے۔ مشق کے معنی ہیں اتنی جلدی میں لکھا ہوا جس میں نقطوں کی پرواہ نہ کی گئی ہو۔ حضرت عمر بن الخطابؓ کا ارشاد ہے کہ بدترین خط "مشق" ہے (الصولی ادب الکاتب ص۵۶) ابن سیرین (متوفی ۱۱۰ھ/۷۲۸ء) کہتے تھے کہ قرآن مجید خط مشق میں لکھنا مکروہ ہے جب کہا گیا کہ کراہت کی وجہ کیا ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ یہ خط نقائص کا مجموعہ ہے تم دیکھتے نہیں کہ اور تو اور الف جو کہ اپنی ہیئت کے لحاظ سے نمایاں ہوتا ہے اس کا بیڑہ بھی غرق ہو جاتا ہے۔ (المصاحف ص۱۳۴ طبع مصر) ابن السید بطلیوسی الاقتضاب (طبع ۱۹۰۱ء بیروت) میں لکھتے ہیں کہ انبار کے لوگ مہین اور بے نقاط خط کے عادی تھے (یعنی کچہری خط لکھتے تھے) اور حیرہ والے پختہ خط (یعنی بانقط) کو پسند کرتے تھے اور بعد میں وہی خط مصاحف کے لئے منتخب ہوا اور اہل شام جلی لکھتے تھے (ص۸۹) نیز لکھتے ہیں کہ جلدی اور کھینچ کر لکھنے میں خط کے کسی قاعدے اور قانون کا پاس نہیں رہتا جیسے خط مشق (کچہری) میں دیکھا گیا ہے۔

نقطے نہیں بھی لگائے جاتے تھے

مضمون کی ابتداء میں جن دریافت شدہ نقوش و تحریرات کی نشاندہی کی گئی ہے ان کی تصویروں سے پتہ چلتا ہے کہ یہ لوگ نقطے نہیں بھی ڈالتے تھے۔ اب ذیل میں اس کی وجوہات ملاحظہ ہوں۔

(الف) یہ تحریریں اس وقت کی ہیں جب عربی زبان کو ابھی "مبین" کے امتیازی وصف سے نہیں نوازا گیا تھا اس وقت کی عربی نہ تو اتنی وسیع زبان تھی جس میں ہر موضوع پر اظہار خیال اور پھر بذریعہ تحریر اظہار مافی الضمیر کی گنجائش نکل آتی۔ اور جب تک کوئی زبان وسعت اختیار نہیں کرتی اس کے الفاظ نہایت تھوڑے، جانے پہچانے اور محدود ہوتے ہیں۔ ایسے میں تشابہ کا اندیشہ کم رہتا تھا اور اگر رہتا بھی تھا تو اہل زبان سیاق وسباق سے لفظ کی صحیح پوزیشن اور مراد معلوم کر سکتے تھے۔

(ب) نقش نمارہ (۳۲۸ء) کے عکس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ نہایت تنگ اور گھنی سطور میں لکھنے کے عادی تھے اور ایسے الفاظ کا انتخاب کرتے تھے جو اسماء، اعلام یا غیر متشابہ قسم کے ہوتے۔ ایسے میں اگر وہ نقطے ڈال دیتے تو قاری کے لئے ایک نئی الجھن یہ پیدا ہو جاتی کہ یہ نقطے کسی اوپر کے لفظ کے ہیں یا نچلی سطر کے کسی لفظ کے۔ اس فنی صعوبت سے بچنے کے لئے وہ یا تو بانقط الفاظ کا انتخاب ہی نہیں کرتے تھے اور اگر کرتے بھی تھے تو آسان قسم کا تشابہ ہوتا تھا۔ (مصادر الشعر الجاہلی صلا) دراصل اہل زبان کے لئے بے نقاط الفاظ کا انتخاب کرنا اتنا دشوار نہیں جتنا ہم خیال کر رہے ہیں۔ فیضی نے غیر اہل زبان ہو کر بے نقاط تفسیر لکھنے کا مصمم ارادہ کر لیا اور وہ اس حد تک کامیاب رہا کہ خود اہل زبان بھی حیران رہ گئے۔ اب دیکھئے کہ ایک مقام پر اسے بڑی دشواری یہ پیش آئی کہ یوسف علیہ السلام کے تعارف میں ابن یعقوب لکھنا تھا مگر ابن یعقوب کے تمام تر معجم و بانقط حروف تھے لہٰذا اس سے بچنے کے لئے قطع نظر بے ادبی کے اس نے "ولد الاعمیٰ" لکھ دیا۔ پس جب ایک اجنبی زبان کا اہل علم کوشش کر کے بے نقاط الفاظ تلاش کر سکتا ہے تو کیا اہل زبان اس پر قادر نہیں تھے؟

(ج) ایک زمانے میں یہ رواج پڑ گیا تھا کہ بانقاط و بے نقاط تمام کلمات کو بے نقاط ہی لکھا جائے تاکہ قاری کی عقل کا امتحان ہو اور وہ اس معمہ کو خود

ہی حل کرے۔ چنانچہ یہ رواج اس قدر زور پکڑ گیا کہ، عقلاء امراء اور علماء کے باہمی مکاتبات میں اگر نقطے ڈال دیئے جاتے تو اسے صریح توہین اور دوسرے کی بے عزتی تصور کیا جاتا۔ یعنی مرسل الیہ یہ سمجھتا کہ مرسل نے اسے غبی یا جاہل تصور کر لیا ہے تاہم اس دور میں بھی عوام کے لئے با نقط تحریر کا تھوڑا بہت رواج تھا۔ اس کی پوری تفصیل امام ابوبکر صولی لغوی (متوفی ۹۴۶ء م) کی ادب الکاتب طبع سلفیہ سنہ ۱۳۴۱ھ مصر ص۵۷، ص۵۸) پر ملاحظہ ہو۔